جو دردِ دل سے اور آہوں سے اور اشکوں سے منبر پر
کرے شرحِ محبت پھر نہ کیوں جادو بیانی ہو
(حضرت والا دامت برکاتہم)

حضرت والا کے سامنے مجلس میں کی گئی اشعار کی تشریحات وتقریرات کا مجموعہ

عِرفانِ محبت
شرح
فیضانِ محبت

جلد دوئم

مجموعہ کلام

شیخ العرب والعجم

عارف باللہ حضرت اقدس مولانا شاہ حکیم محمد اختر صاحب دامت برکاتہم

شارح

حضرت مولانا مفتی محمد امجد صاحب فاضل دیوبند

استاذ الحدیث دار العلوم آزادول جنوبی افریقہ

خلیفہ و مجاز بیعت

شیخ العرب والعجم

عارف باللہ حضرت اقدس مولانا شاہ حکیم محمد اختر صاحب دامت برکاتہم

خانقاہ اِمدادیہ اشرفیہ

فہرست

عنوان	صفحہ نمبر
پیش لفظ	۲۱
آتش غم کی ترجمانی ہے	۲۲
حسن فانی سے دھوکہ نہ کھائیے	۲۲
آہ وفغاں بلاوجہ نہیں ہوتی	۲۳
دیکھتے ہی دیکھتے رونقِ گلشن ننگِ خزاں بن گئے	۲۴
اللہ والوں کی اپنی دنیا الگ ہوا کرتی ہے	۲۵
ایمان کی شمع کیسے جلتی ہے	۲۵
آہ ونالوں کی تاثیر کسی تقریر سے کم نہیں	۲۶
دل کی پاسبانی اور دردِ نسبت کا حصول	۲۷
باغ ایمان کی باغبانی اہلِ دل کا کام ہے	۲۷
پاگئی جان سلطانِ جاں کو	۲۸
قطب بینی اور کتب بینی کی تاثیر جدا جدا ہے	۲۹
اللہ والوں کی لذت کو سلاطین دنیا کیا جانیں	۳۰
مالک کائنات پر بھروسہ ہر مشکل کا حل ہے	۳۰
افراط وتفریط توکل کے منافی ہے	۳۱
خورشیدِ سماء اور خورشیدِ جاں کا فرق	۳۲
عیش وعشرت کے دیوانے آہِ صحرا کے مزوں کو کیا جانے	۳۳
نکھرتا ہے کہیں رنگِ گلستاں باغبانی سے	۳۴
گلستانِ معرفت کا رنگ ابرِ رحمت کے پانی سے نکھرتا ہے	۳۴

لندن و پیرس کی اہلِ دل کی نگاہ میں کوئی وقعت نہیں	۳۵
نمک پاروں کے نمکین پانی سے تشنہ لبی ختم نہیں ہوسکتی	۳۶
قلب ونظر کی پاسبانی سے حصولِ نسبت آسانی	۳۷
سینہ میں نور ہوتو منبر پر نور برستا ہے ورنہ نہیں	۳۹
رضائے حق میں اپنی آرزو ہر وقت فانی ہو	۴۱
اہلِ مجلس کی اشک باری سے داستانِ عاشق کی قدردانی	۴۲
باغِ دل میں باغبانی اور قلب ونظر کی پاسبانی سے حصولِ نسبت یقینی ہے	۴۲
اسرارِ محبت کا بیان محبت کے بعد ہی ممکن ہے	۴۵
ذرۂ دردِ دل ہفت اقلیم سے بڑھ کر ہے	۴۷
عاشقِ صادق کی کہانی دُکھ بھری کیوں نہ ہو؟	۴۷
گرم بازاری عشق	۵۰
اشکہائے خون سے گرم بازاری عشق	۵۰
خونِ آرزو سے خونِ جگر کرکے شجرِ محبت کا پھل دار ہونا	۵۱
صحبتِ اہل اللہ کے چند اہم فوائد	۵۲
شکوک وشبہات کی بنیاد حقائق سے لاعلمی ہے	۵۴
مصائب کی بنیادی وجہ معاصی کا پھیلاؤ ہے	۵۵
ملفوظ شاہ ہردوئی رحمہ اللہ	۵۶
عذابِ الٰہی کی تین قسمیں	۵۷
ہر قدم پر حیاتِ نو کیسے حاصل ہو	۶۱
شہید کی چالیس اقسام	۶۱
ہر قدم پر سر کا زیرِ خنجر ہونا مثالوں کی روشنی میں	۶۴

چمن میں ہوں مگر آہ بیابانی نہیں جاتی	۶۸
بہارِ جانِ چمن ہو تو چمن کی کیا حاجت؟	۶۹
دریائے علم و معرفت میں طغیانی کا راز	۷۰
اللہ کے دیوانوں کی چاک گریبانی	۷۱
مزاجِ عقل و مزاجِ عشق کا فرق	۷۳
صدقِ دل سے توبہ کے بغیر پریشانیوں سے نجات ممکن نہیں	۷۴
دریائے اُلفت کا بے مثال ساحل	۷۴
عیادت کرنے کے فائدے	۷۵
کسی مخلص کی ضائع کوئی قربانی نہیں جاتی	۷۸
کسی بھی مخلص کی قربانی ضائع نہیں جاتی ہے	۷۸
قبولیتِ عمل کی شرائط	۸۰
اللہ کی معافی اور بندہ کی پشیمانی	۸۲
بتوں کی بے وفائی پھر بھی نفس کی نادانی	۸۴
پچپن میں بچپن کی عادتیں	۸۴
گدڑی پوش ہو کر تاج پوشوں سے زیادہ عزت	۸۵
محبت کی ایک نرالی ادا	۸۵
لباسِ فقر میں بھی شانِ سلطانی نہیں جاتی	۸۷
رخِ عارف کی تابانی اور دردِ دل کی ترجمانی	۸۸
خوئے بیابانی اور مزاجِ صحرا نوردی	۸۸
محبت کی ہزاروں شاخوں میں تقسیم	۹۰
فتنۂ دلکش میں بھی شانِ ربانی کا باقی رہنا	۹۰

اہل اللہ پیری میں بھی رشکِ جوانی ہوا کرتے ہیں	۹۲
قلوب اولیاء میں مستی وجولائی کا عالَم	۹۳
لباسِ فقر میں شانِ سلطانی	۹۴
مشاہدۂ حق میں استغراقی کیفیت اور اس کا حدیث سے ثبوت	۹۴
لباس عقل میں بھی چاک دامانی کا راز	۹۵
مجاز......ایک سراب	۹۶
کسی کے در پے تو یارب یہ پیشانی نہیں جاتی	۹۷
حسرتوں کی پامالی پر قربِ ربانی کی تابانی	۹۸
بلعم بن باعورا کی عبرتناک حکایت	۱۰۰
حضرت فضیل بن عیاض رحمہ اللہ کا واقعہ	۱۰۱
سایۂ شیخ کامل بھی فضلِ الٰہی کا اثر ہے	۱۰۲
سنت اللہ اور قدرت اللہ کا فرق تخلیق کی چار قسموں کی روشنی میں	۱۰۳
ملفوظ شاہ ہردوئی رحمہ اللہ ''دین سیکھنا اور پڑھنا''	۱۰۴
بتوں کی بے وفائی مگر پھر بھی یہ نادانی کیسی؟	۱۰۵
نفسانی اور ربانی محبتوں کی بارہ نشانیاں	۱۰۶
عورتوں کی بیعت اور اپنے شیخ سے استفادہ کی صورت	۱۰۷
خرد اور عقل کی باہمی رسہ کشی	۱۰۹
گناہوں پر ندامت کی کرامت محبوبیت ہے	۱۱۰
میری تمام امیدوں کا مرکز صرف میرے مولیٰ کا در ہے	۱۱۲
اللہ نے سب کچھ مفت میں دیا ہے پھر کسی سے مفت لینے کا خیال کیسا؟	۱۱۳
حاسد بوجہِ حسد میری آہ نہیں پہچان سکتا ہے	۱۱۶

مالک کا کرم ہو تو بندگی کا لطف نصیب ہوتا ہے	۱۱۷
بڑی سے بڑی مشکل میں بھی اُمید پنہانی نہیں جاتی	۱۱۸
مجھ کو جینے کا سہارا چاہیے	۱۲۰
مؤمن کی حیات کا سہارا اللہ کی یاد اور اس کی راہ کا غم ہے	۱۲۰
اللہ کے سہارے کے بعد کسی سہارے کی ضرورت نہیں	۱۲۱
طوفانوں میں لذتِ فریاد کا کیا کہنا!	۱۲۳
آہوں سے بڑی جلدی بگڑی سنور جاتی ہے	۱۲۳
غیر کی پرواہ کرنا انبیاء و اولیاء کا طریقہ نہیں ہے	۱۲۴
ایک نیو مسلم کا عبرت آموز واقعہ	۱۲۶
میری خالی جھولی میں اپنی رحمت و محبت کی بھیک ڈال دیجئے	۱۳۱
گریۂ بے کار	۱۳۱
نعرۂ مستانہ مارا چاہیے	۱۳۲
میری زندگی کے لیے نعرۂ مستانہ اور غم کا مارا چاہیے	۱۳۲
حالات جہاں کا ستایا ہوا ماہ پارا	۱۳۳
حضرت والا کی تمنا حضرت میر صاحب کی صورت میں پوری ہوئی	۱۳۴
شمشیر عشق کا مقتول بھی شہید ہے	۱۳۵
اللہ کا عاشق گروہِ عاشقاں کے ساتھ رہنے کو پسند کرتا ہے	۱۳۷
گلستاں ہو یا بیاباں یادِ یار ہی درکار ہے	۱۳۸
تمہیں عشرت مبارک ہو میرا مطلوب حسرت ہے	۱۳۹
دل میں محبت کا تیر مار کر زندگی بنتی ہے	۱۴۲
جان دے دی میں نے ان کے نام پر	۱۴۲

عشقِ حق کی بدولت جان، جان دینے والے کو دے دی گئی	۱۴۳
میری ناکامی ہی کامیابی ہے	۱۴۴
عاشقِ خدا اکرام واحترام کا طالب نہیں ہوتا ہے	۱۴۵
عاشق بدنام اور دشنام	۱۴۶
عشق کی راہ میں آلام ہے آرام نہیں	۱۴۷
تقدیر بدل جاتی ہے مضطر کی دعا سے	۱۴۸
کشتیٔ دین وایمان کا ناخدا بس خدا ہی ہے	۱۴۹
عاصی اگر تائب ہو تو پھر سزا کیسی؟	۱۵۱
زاہدِ خشک تسلیم ورضا کی لذت کو کیا جانے	۱۵۳
ٹینشن کا علاج خودکشی نہیں ہے	۱۵۵
کھانے کے درجات اور ان کے احکام	۱۵۶
اہلِ نظر سے نظر کو ذوقِ نظر اور جگر کو زخمِ جگر مل جاتا ہے	۱۵۸
نازونعم کے پروردہ بھی دعاؤں اور سنتوں کے محتاج ہیں	۱۵۹
تیرے عاشق کو لوگوں نے سمجھا ہے کم	۱۶۰
جانِ عالم کو پانے کے بعد عالَم نظروں سے گر جاتا ہے	۱۶۰
نابالغ کو بلوغ کی لذت کی کیا خبر	۱۶۲
رات کی تاریکیوں سے صبح ہوتی ہے عیاں	۱۶۳
تلخ مزاج بیوی کا واقعہ	۱۶۴
اولیاء اللہ حلم وتواضع کا پیکر ہوتے ہیں	۱۶۵
عفوودرگذر میں اللہ کی نرالی شان	۱۶۶
ابرار واولیاء کون؟ علامہ عینی رحمہ اللہ کی زبانی	۱۶۷

لب خنداں دیکھ کر دھوکہ نہ کھائیے	۱۶۹
تصوف کی حقیقت اور ہمارے اکابر	۱۷۰
ظاہرداری کا نام ولایت نہیں ہے	۱۷۱
متبع سنت اولیاء اللہ کے بعض خاص احوال وصفات	۱۷۲
جعلی پیروں کے مخصوص احوال اور مصنوعی بزرگی کی ایک جھلک	۱۷۵
محبتِ الٰہی کی حقیقت مرضیٔ مولیٰ پر ہر لحہ فدا رہنا ہے	۱۷۶
جملہ شعبہائے حیات میں اسلام پر عمل لازم ہے	۱۷۷
ایک اہم تنبیہ	۱۷۸
ایمانی کیفیات کم وبیش ہوتی رہتی ہیں	۱۸۰
آنسو اگر تھم بھی جائے تب بھی	۱۸۰
اپنے مالک کو راضی کریں خوب ہم	۱۸۲
ایمان ومحبت سے خالی انسان حیوان سے گیا گذرا ہے	۱۸۳
خود میری داستاں میری زبانی سنو تو بات ہی الگ ہے	۱۸۵
خاکِ تن میں دردِ دل نہ ہو تو مثل خاک ارض بے قیمت ہے	۱۸۷
ناجائز محبتوں کے ساتھ کبھی جائز محبتوں کو بھی چھوڑنا پڑتا ہے	۱۸۸
اللہ راضی ہو تو عزت نصیب ہوتی ہے	۱۸۹
مقبولینِ بارگاہِ حق کی پہچان	۱۹۰
آخرت کا سفر اکیلے اور تنہا کرنا ہے	۱۹۲
کلمۂ توحید کا اہم سبق	۱۹۲
حق تعالیٰ کی نظرِ کرم ہی سے قیمت وحیثیت ہے	۱۹۴
دردِ دل بس اہلِ دل سے ہی ملتا ہے	۱۹۵

اصلاح وتزکیۂ کے باب میں ہمارے اکابر کا حال اور موجودہ افسوسناک صورتحال	۱۹۶
کائنات کا ہر ذرّہ وجودِ خالق پر دلیل ہے	۱۹۸
ایمان دل میں سما جائے تو پھر رنگ لائے	۱۹۹
صحابۂ کرام کے چند ایمان افروز واقعات	۲۰۰
صحابہ کے لیے آسمان کا برسنا اور سمندر میں راستہ بنانا	۲۰۱
شیخ سے مکمل استفادہ مناسبت پر موقوف ہے	۲۰۳
شیخ کی سختیاں مرید کے نفع کے لیے ہیں	۲۰۴
غیر منکر پر نکیر خود منکر اور گناہ ہے	۲۰۴
ایک ایسی حدیث جو ہر وقت پیش نظر ہو تو زندگی کے تمام غموں کے لیے کافی ہے	۲۰۶
دستگیری حق	۲۰۷
عشق جب بے زبان ہوتا ہے	۲۰۷
عشقِ بے زبان رشکِ صد ہا بیان	۲۰۸
مقصود صحبت اہل اللہ ہے نہ کہ تقریر و بیان	۲۰۹
صحبت اہل اللہ پر محبوبیت کا وعدہ ہے	۲۱۰
مومن بحالت سجدہ فرش پر رہتے ہوئے عرش پر ہوتا ہے	۲۱۱
حاملِ دردِ دل کی زبانِ بسمل کا بیانِ دردِ دل	۲۱۲
بدگمان ہمیشہ محروم رہا کرتا ہے	۲۱۳
صرف دو گناہوں پر اللہ تعالیٰ سے اعلان جنگ کی وعید ہے	۲۱۵
اہل اللہ سے بدگمانی اور ان پر اعتراض بدنصیبی کی نشانی ہے۔	۲۱۵
بلاوجہ بدگمانی حرام اور ناجائز ہے	۲۱۶
نظر شیطان کا زہر آلود تیر ہے	۲۱۸

نظر بڑے بڑے بہادروں کو زیر کر دیتی ہے	۲۲۰
صالح مؤذنِ بغداد کا عبرتناک واقعہ	۲۲۰
آہ! آج کا مسلمان اور بدنظری کے گناہ سے لاپرواہی	۲۲۱
اکابر واسلاف اُمت کی حفاظتِ نظر کے سلسلہ میں احتیاط	۲۲۲
اخلاص کے بغیر منزل نہیں مل سکتی	۲۲۴
اخلاص کی ایک الہامی حکمت	۲۲۵
شتر باں حکمراں کیونکر بنے؟	۲۲۶
صحابہ مسلمان ہو کر معزز تھے تو ہم خوار کیوں؟	۲۲۷
منزل قرب سے گذرے بغیر نشان منزل نہیں بن سکتے	۲۲۹
اللہ کے ہوتے ہوئے کسی کی کیا پرواہ	۲۲۹
دردِ دِل کا امام ہوتا ہے	۲۳۲
خالق جسے جذب فرمالے پھر اس کی اڑان کا کیا پوچھنا	۲۳۲
رہبر کے ساتھ ساتھ عشق امام ہو تو نفس بے لگام نہیں ہوتا	۲۳۴
مسجدِ درِ دِل میں امامتِ درِ دِل	۲۳۵
طالبین کا بفیضِ مرشد کامل کاملین بن جانا	۲۳۶
اصل تو اللہ کا لطف ہی کارفرما ہوتا ہے	۲۳۷
تشکر اور تکبر ایک دوسرے کی ضد ہیں	۲۳۹
اصل جام تو شراب محبت الٰہیہ کا جام ہے	۲۴۰
یہ عشق کی بے نظامی کیوں؟	۲۴۱
ذکر وتقویٰ کے دوتار ہوں تو روشنی ضرور پیدا ہوگی	۲۴۲
گر خدا چاہے تو پہلے عاشق ابرار ہو	۲۴۴

معیار عشق سنت کی تابعداری اور بدعت سے بیزاری ہے	۲۴۵
احیائے سنت کی اہمیت پر بعض اسلاف کے اقوال	۲۴۶
کشف والہام سے متعلق مکتوب شیخ الاسلام مدنی رحمہ اللہ	۲۴۸
متبع سنت ہی کے محبوب ہونے پر ایک عقلی دلیل	۲۴۸
سنت کے مطابق گفتار ورفتار کیسی ہوا کرتی ہے؟	۲۴۹
آہ! آج ہم اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتیں	۲۵۱
ارشاد حضرت مولانا منظور نعمانی ''اب دیوبندیت بریلویت سے ایک بالشت کے فاصلہ پر''	۲۵۲
ختم یٰسین شریف کی شرعی حیثیت	۲۵۳
بدعتی ایجاد بدعت سے دو دعوے کرتا ہے	۲۵۴
مجدد الف ثانی کے سنت کی اہمیت پر بعض مکاتیب	۲۵۶
سلف صالحین کا بدعت سے سخت نفرت کا نمونہ	۲۵۷
ہر منصف اور عادل کے لیے حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ کا ارشاد مشعلِ راہ ہے	۲۵۷
مکمل اور جامع دین ہوتے ہوئے نئی چیزوں کی ضرورت کیا ہے؟	۲۵۹
بطور علاج کوئی عبادت مقرر کرنا اور اس کی حقیقت	۲۶۰
عشق کامل کی علامت کاملہ	۲۶۱
صحبت مرشد کے مفید ہونے کی شرطیں	۲۶۲
عاشق آشنائے یار اور بیگانۂ اغیار ہوتا ہے	۲۶۳
نفس مٹادو اور مولیٰ کو پالو	۲۶۴
پیرانِ پیر حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے زمانہ کا واقعہ	۲۶۵
فیضِ شیخِ کامل	۲۶۷
رحمت کا تری سر پہ مرے آبشار ہو	۲۶۷

چشم کی اشکباری پر رحمت کی آبشاری	۲۶۸
نفس کی چاہتیں جہنم میں لے جانے والی ہیں	۲۶۸
شہوت کا گناہ آج ایک وبائی مرض ہے	۲۶۹
ذکر سے رطب اللسانی، ایک جامع نصیحت	۲۷۰
ذکر اللہ کے فضائل	۲۷۱
ذکر اللہ کی اصل حقیقت	۲۷۱
قرآن کی اصطلاح میں اہل عقل کون لوگ ہیں؟	۲۷۲
کافر اور بدکار کی زندگی دنیا میں تلخ اور تنگ ہونے کی حقیقت	۲۷۵
گناہوں سے فرار اور مولیٰ کی یاد سے قرار لقائے مولیٰ کی پہچان ہے	۲۷۶
گناہوں کی جگہوں سے دور بھاگئے	۲۷۷
مغفرت مولیٰ کے کرم کا صدقہ ہے	۲۸۱
اولیاء اللہ دنیا و آخرت کے غموں سے محفوظ ہوتے ہیں	۲۸۲
اللہ والوں کے بےخوف و بےغم ہونے پر سوال و جواب	۲۸۳
اولیاء اللہ کی تعریف اور علامات	۲۸۴
ولایت حاصل کرنے کا طریقہ	۲۸۶
زندگی کے دو رُخ	۲۸۸
جام و مینا کی ہے فراوانی	۲۸۸
کارِ شیطانی کا ترک فضل رحمانی کی نشانی ہے	۲۸۹
یہ شعر دعویٰ مع دلیل ہے	۲۹۰
دردِ دل کی دولت صرف ربانی کو ملتی ہے	۲۹۱
خلق خود پکار اٹھتی ہے	۲۹۲

حدیث پاک میں ریاکاروں کے لیے ایک اہم نصیحت	۲۹۳
میرے شیخ اول حضرت مسیح الامت کی وفات پر ایک ہندو کا قول	۲۹۴
مؤمنین کے قلوب اللہ والوں کی طرف پھیر دیئے جاتے ہیں	۲۹۵
بعض اولیاء اللہ گمنام ہوتے ہیں	۲۹۵
صحبت شیخ کامل گرچہ حاصل مگر فسق سے ہے دور منزل	۲۹۷
تصوفِ حق اور تصوفِ باطل پر ایک نظر	۲۹۸
واقعۂ تصوف باطل	۲۹۹
نسبت مفید ہے مگر کافی نہیں	۲۹۹
شیخ سے قرب جسمانی کے ساتھ اصل تعلیمات کی اتباع ہے	۳۰۰
حضرت والا کے فیض کی تاثیر مثل اپنے مرشد کے ہے	۳۰۱
یقینی طور پر کسی کی ولایت کا قائل ہونا جائز نہیں	۳۰۲
عارف تو اپنی مستیٔ قلب میں مست رہتا ہے	۳۰۳
جام عرفانی نصیب ہو تو جینے کی حلاوت ہے	۳۰۴
خاص مضمون عطائے الٰہی ہے	۳۰۵
دلِ شکستہ میں جام و مینا کی فراوانی	۳۰۶
بزم عارف کی مستی و جولانی	۳۰۷
اہل ساحل کو موج دل کی طغیانی پر رشک کیوں؟	۳۰۸
علم وحی اور چلہ کشی کی دلیل	۳۱۰
حصولِ کیف احسانی کا مرکز خانقاہ ہے	۳۱۱
خونِ حسرت کے بدلے ذوقِ ایمانی	۳۱۲
بیعت لینے کی حقیقت	۳۱۳

کیا بیعت کے بغیر کامل اصلاح نہیں ہوسکتی؟	۳۱۴
میں نے غم بھی بہت اُٹھائے ہیں	۳۱۵
داغ حسرت وخون آرزو کا کرشمہ	۳۱۵
مہمان کے مناسب مکان کا انتظام	۳۱۶
شریعت کی پابندیوں سے کوئی باہر نہیں ہے	۳۱۷
عشق مجازی ایک وبائی مہلک بیماری ہے	۳۱۸
حرام آرزوؤں سے وہ نہیں ملتے	۳۱۹
بخشش صرف فضل خداوندی سے ہوگی	۳۲۰
اُڑ گیا رنگ حسنِ فانی کا	۳۲۲
ناز وانداز والوں کا رنگ اڑ گیا	۳۲۲
اڑ گیا رنگ حسنِ فانی کا	۳۲۳
دنیا کی لذتیں دھوکہ ہیں	۳۲۴
اگر غفلت واُمید نہ ہوتی تو دنیا ویران خانہ بن جاتی	۳۲۶
کوئی کمپیوٹر دنیوی واخروی زندگی میں پرسنٹیج نہیں نکال سکتا	۳۲۷
آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑا محسن ہمارا کوئی نہیں	۳۲۸
محبوب ومحبوبہ پر جان وایمان قربان کرنے کی بات کرنا	۳۲۹
دل بہلانے کا سامان ختم ہوا تو پھر؟	۳۲۹
دعویٰ وتحدیث نعمت اور اکمل وافضل کا فرق	۳۳۱
شیخ صرف ذریعہ ہے دینے والا اکیلا اللہ ہے	۳۳۲
یہ دعا کہ میرا حشر میرے شیخ کے ساتھ ہو	۳۳۲
میری گفتگو پر ایک شبہہ اور اس کا جواب	۳۳۳

تصویر کا دوسرا رخ اور دو افسوسناک قصے	۳۳۴
مستی خمرِ آسمانی	۳۳۵
ہے عجم اس کا پھر مدینے میں	۳۳۶
میر صاحب کا سفینہ نگینہ سے بہتر	۳۳۶
حلاوتِ حیات اور دردِ نسبت	۳۳۷
مومن زندہ اور کافر مردہ کیوں؟	۳۳۸
انسان اشرف المخلوقات کیوں؟	۳۳۹
علمی و عملی سب کمالات حق تعالیٰ کی دین ہیں	۳۴۰
میر مرنا نہ حسن فانی پر	۳۴۴
عشق مجازی کا مؤثر علاج	۳۴۴
حضرت والا کے اشعار سن کر ایک شاعر کا تأثر	۳۴۵
خاک پر منزل آسماں مل گئی	۳۴۷
عشقِ بتاں سے رخصت پر صاحبِ آسمان سے قربت ملتی ہے	۳۴۷
حب جاہ بھی ایک بت ہے	۳۴۹
ثناءِ خلق کا ملنا نعمت اور بشارت ہے	۳۴۹
اولیاء و مشائخ سے للہ محبت کی عظیم فضیلت	۳۵۰
معرفت و محبت کا دینا کسی پیر کے بس میں نہیں	۳۵۱
صحبت رہبر سے خاک پر منزل آسماں	۳۵۳
حضرت جلال آبادی کی مجلس کا احقر کا ایک واقعہ	۳۵۵
آہ و نالوں سے مٹ گئے ظلمات	۳۵۸
حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم کی موت سے محبت	۳۵۹

مخلوق پر مرو تو آفات اور خالق پر فدا ہو تو انعامات	۳۶۰
شہدا کے فضائل اور ان کی خصوصی حیات برزخی	۳۶۱
نارِ شہوت کو نورِ حق سے بجھاؤ	۳۶۳
وہی لمحہ بہارِ زندگی ہے	۳۶۴
اللہ تعالیٰ کی محبت کا غم ہی متاعِ زندگی ہے	۳۶۴
دستِ جنوں کی طاقت دیکھئے	۳۶۵
رشک کرتا ہے زمیں پر آسماں	۳۶۷
عطائے دوست بہرِ دوستاں	۳۶۸
اس کی راہ کی بے قراریاں کیا ہی خوب ہیں	۳۶۹
تم نے دیکھی برکتِ آہ و فغاں	۳۷۰
ظاہری دنیوی علوم حقیقی علم کا مصداق نہیں	۳۷۰
علم کا مصداقِ حقیقی، علمِ وحی ہے	۳۷۲
انسان کا وصفِ امتیازی اور حیوانات کا نظامِ زندگی	۳۷۲
قبولیتِ دعا یقینی مگر شرائط کے ساتھ	۳۷۴
صحبتے با اہلِ دل با عاشقاں	۳۷۷
اللہ والوں سے دشمنی اپنی تباہی و بربادی ہے	۳۷۸
حضرت والا کی دو خاص ادائیں چشمِ گریاں اور قلبِ بریاں	۳۷۹
حسرتیں دل کی ہیں دل میں میہماں	۳۸۱
بعض مجاہدات پر انعامِ ربانی	۳۸۱
میری حسرتیں تمہاری عشرتوں کے لیے قابلِ رشک ہیں	۳۸۳
چشمِ تر نعرہ ہو چاک گریباں پایا	۳۸۵

عشقِ اصنام سے پشیمان ہوئے	۳۸۵
دعوتِ حق کے واسطے محفل دوستاں ملی	۳۸۷
حضرت ایوب علیہ السلام خزاں میں خوشبوئے بوستاں پا رہے تھے	۳۸۸
حضرت ایوب علیہ السلام کی دعا صبر کے خلاف نہیں	۳۹۰
اللہ ہی کے سامنے آہ وزاری ہو	۳۹۱
اثر ظاہر ہوا آہِ سحر کا	۳۹۴
آہِ سحر کی برکت سے دشمن کی نظر بدل جاتی ہے	۳۹۴
ترکِ عشقِ مجازی کے انعامات	۳۹۶
نہ کر توہین تو تاثیر آہ بے زبانی کی	۳۹۸
دولت راز دانی ہو تو دنیائے فانی پھر کہاں	۳۹۹
جغرافیۂ حسن کا برا حال وانجام	۴۰۰
اہل دل سے بدگمانی اپنی ناکامی ومحرومی ہے	۴۰۱
آہ بے زبانی کی تاثیر کو ناداں کیا جانے	۴۰۳
صحبت شیخ کی ضرورت کی حکیمانہ وجہ	۴۰۴
احقر کا واقعہ اور علاج وساوس کا آزمودہ نسخہ	۴۰۵
سایۂ شیخ تاحیات سر پر رکھئے	۴۰۷
خوب گزریں گے تیرے لیل ونہار	۴۰۸
حسن سے بیزاری اور اختر کی تیمار داری	۴۰۹
حضرت والا کی تربیت کی اہم باتیں	۴۱۱
مقامِ مؤمن	۴۱۳
میر رکھا ہے کیا نظاروں میں	۴۱۳

حسنِ فانی کے عاشق کو حرم میں بھی سکون نہیں ملتا	۴۱۳
لبِ دریا ہے کوہ کا دامن	۴۱۵
آج رونقِ گلشن چہرے کل تنگِ دشت و دمن ہو جائیں گے	۴۱۵
راہِ حق کے کانٹے رشکِ ریحان و سنبل ہیں	۴۱۷
مبارک مجھے میری ویرانیاں ہیں	۴۱۹
ظاہر میں شاہبازیاں اور باطن میں خفاشیاں	۴۲۰
عاصیوں کی تحقیر حرام ہے	۴۲۱
معصیتوں سے راہ میں دشواریاں ہوتی ہیں	۴۲۱
عشقِ حق دوائے دلِ سالکاں ہے	۴۲۲
میری ویرانیاں ہی میری آبادیاں ہیں	۴۲۳
زمیں کو کام ہے کچھ آسماں سے	۴۲۵
کیا ہے ربط اپنے آسماں سے	۴۲۷
اللہ کے عشاق کو دنیا کے رنگ و بو سے کیا مطلب	۴۲۷
ربِ دو جہاں ہی بلائے دو جہاں سے بچا سکتا ہے	۴۲۸
نہیں کچھ فائدہ اس گلستاں سے	۴۳۱
اللہ کے در کو مضبوطی سے پکڑنا تمام مسائل کا حل ہے	۴۳۱
خار و گل اور ظلمت و روشنی میں فرق کیجئے	۴۳۲
زمیں میری ہو جیسے آسماں میں	۴۳۳
بزمِ دوستاں کون سی بزم ہے	۴۳۴
میرا بیاں ترجمانِ دردِ نہاں	۴۳۴
داستانِ عاشقاں چراغِ راہِ منزل ہوا کرتی ہے	۴۳۵

گلوں کے دامنوں سے لپٹے رہنے کے فائدے	۴۳۶
نفع کا مدار باہمی مناسبت پر ہے	۴۳۷
خلّاقِ چمن سے ربط ہو تو ہر وقت چمن کی بہار ملے گی	۴۳۷
ذرا دیکھو تو فیض خانقاہی	۴۳۸
قوتِ شہوت و غضب پر کنٹرول کے فوائد	۴۳۹
دربارِ الٰہی اور آہِ سحر گاہی کا گہرا ربط ہے	۴۴۲
سلطان بلخ نے شاہی کے بدلے فقیری کیوں لی؟	۴۴۳
شہوت کے گناہ سے حفاظت کا طبی علاج	۴۴۴
باہی و جاہی مٹاؤ تو پھر عشقِ الٰہی پاؤ	۴۴۶
دشت کو خواب گاہ کرتا ہوں	۴۴۷
پھرتا ہوں دل میں دردِ محبت لیے ہوئے	۴۵۰
گلشنِ جنت دور مگر خالقِ جنت دل میں موجود	۴۵۰
صحرا ہو یا دامنِ کوہ میری جنت میرے ساتھ ہے	۴۵۱
مشعلِ سنت ہو تو پھر راہ بھٹکنا ممکن نہیں	۴۵۲
اللہ کے باوفا بندے ہر سانس اُس کے سایہ کے نیچے ہیں	۴۵۳
اولیاء کی صورت ہو تو اپنے تو اپنے غیر بھی احترام کرتے ہیں	۴۵۳
ڈاڑھی کی شرعی حیثیت احادیث مبارکہ کی روشنی میں	۴۵۴
کسریٰ کے قاصدوں سے حضور ﷺ کا منہ پھیر لینا اور ہمارے لیے عبرت	۴۵۵
صورت شفاعت کے قابل نہ ہوئی تو	۴۵۷
ایرانی اور مرزا قتیل کا واقعہ	۴۵۷
جادوگروں پر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے مشابہت کا اثر	۴۵۸

جب نبی ﷺ محبوب تو آپ کی ہر ادا بھی محبوب	۴۵۹
ڈاڑھی کٹا کر کھلم کھلا اللہ کا باغی بننا	۴۵۹
حضرت میر صاحب دامت برکاتہم کو لذتِ حیات مل گئی	۴۶۱
انعامِ خونِ آرزو	۴۶۱
پھرتا ہوں دِل میں درد بھرا دِل لیے ہوئے	۴۶۲
میرا سفر و حضر اور خلوت وجلوت اللہ پر فدا ہے	۴۶۲
اہل دل اللہ والوں کے بعض خاص احوال کا تذکرہ	۴۶۳
نفس کے بندے	۴۶۵
آہ وفغاں کا آسرا لیتی ہے جانِ ناتواں	۴۶۶
اللہ کی خوشی میں دنوں جہاں کی خوشی ہے	۴۶۷
آہ وفغاں کے آشیاں پر برق نہ گراؤ ورنہ	۴۶۷
خالقِ حیات پر فدا ہو کر اعتراف قصور بڑا اعالی وصف ہے	۴۶۸
اہلِ دل کی زمین وآسمان جدا ہوتے ہیں	۴۷۰
تدفینِ عشق	۴۷۱
میری آہ دل کے یہی ہیں منازل	۴۷۱
آہِ عاشق کو لبِ دریا اور دامنِ کوہ کی تلاش ہے	۴۷۱
خاک تن خاکِ ارض میں شامل	۴۷۲
مجالس ذکر اللہ کے چند فوائد	۴۷۴
صفائی قلب کے بعد قرآن کا مزہ ہی الگ ہے	۴۷۴
عالم ومعلم ہو کر بھی عالم ومعلم نہ ہوئے	۴۷۶
ایک نہایت مجرب اور آزمودہ عمل	۴۷۸

پیش لفظ

الحمدللہ! اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم اوراس کی خاص توفیق کا ثمرہ ہے کہ ''عرفانِ محبت'' جلداوّل کی طرح دوسری اور تیسری جلد کا کام بھی پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا ہے اوراس طرح ان تین جلدوں میں مکمل ''فیضانِ محبت'' کی نظموں کی توضیح وتشریح ہو چکی ہے۔

دوسری اور تیسری جلد میں خاص طور پر اس امر کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ اشعار کی تشریح کے ساتھ ساتھ بعض نظموں کے مشکل الفاظ کی لغوی تشریح بھی کردی گئی ہے، جس کی ضرورت اس وقت سامنے آئی جب بعض حضرات کی طرف سے ''عرفانِ محبت'' جلداوّل کے منظرِعام پر آنے کے بعد اس جانب توجہ دلائی گئی کہ بعض الفاظ مشکلہ کے لغوی معانی بھی لکھ دیئے جائیں تو کتاب زیادہ مفید رہے گی۔ اس پر ان مخلصین حضرات کے توجہ دلانے کا شکریہ ادا کرنے کے ساتھ ساتھ خاص طور پر اس سلسلہ میں اپنے رفیق محترم جناب حضرت مفتی ارشاد صاحب دامت برکاتہم کا دل کی گہرائیوں سے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ مکمل دوسری اور تیسری جلدی کے الفاظ مشکلہ کی لغوی تحقیق کا کام انہوں نے بحسن وخوبی انجام دیا ہے اور گوکہ مفتی صاحب اپنی تدریسی ذمہ داریوں میں مصروف تھے مگر پھر بھی انہوں نے احقر کی درخواست پر اس کام کی ذمہ داری لے لی اور تقریباً دو ماہ کے اندر اس کو مکمل فرمادیا ہے۔ اللہ تعالیٰ مفتی صاحب کی اس سعی کو نفعِ خلق اور رضائے خالق کا ذریعہ بنادے۔ آمین اوراسی طرح میرے لیے ضروری ہے کہ اپنے دوساتھیوں (جناب محمد عمر اور سید طیب صاحبان) کا بھی شکریہ ادا کروں کہ انہوں نے ان دنوں جلدوں کی کمپوزنگ میں شب و روز خوب محنت کی اور مجھے جب بھی یہ تشریحات کمپوز کرانے کی ضرورت ہوئی تو وہ فوراً تشریف لائے اور بڑی مستعدی اور اخلاص کے ساتھ میرا خوب ساتھ دیا۔ اللہ تعالیٰ ان دونوں حضرات کی اس سعی کو مشکور فرما کر ذخیرۂ آخرت بنادے اور ہمیشہ ان کی اس صلاحیت کو دینی کاموں کے لیے قبول فرمائے۔ آمین

اور احقر اپنے اس پیش لفظ کے ختام کو ختام المسک بناتے ہوئے اپنے محبوب شیخ و مرشد عارف باللہ حضرت اقدس مولانا شاہ حکیم محمد اختر ادام اللہ کا عظیم احسان وکرم کا ذکر کرنا بھی ضروری سمجھتا ہے کہ محض توفیق الٰہی اور حضرت والا کی خاص دعاؤں اور توجہات کی بدولت احقر اس کتاب کی تشریح کے کام کو انجام دے سکا ورنہ اس طرح کی صلاحیت سے احقر اپنے کو بالکل خالی پاتا ہے اور اس کام کو پورا کرنا ناممکن نہ سہی مگر مشکل ضرور تھا۔ حضرت والا نے احسان فرمایا کہ اپنے سامنے احقر کو کھڑا کرتے اور پھر ارشاد فرماتے کہ چلو! اشعار پڑھو اوران کی تشریح کرو اوراس طرح ہوتے ہوتے تقریباً پوری کتاب کی تشریح مکمل ہوگئی۔ اس لیے یہ کتاب درحقیقت حضرت والا کی موجودگی میں کی گئی تقاریر کا مجموعہ ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمارے شیخ کا سایۂ تادیر ہمارے سروں پر قائم رکھے اور حضرت والا کے علوم ومعارف سے ہم سب کو نفع اُٹھانے کی توفیق عطا فرمادے اور حضرت والا کی عمر میں اور علم میں برکت عطا فرمائے اور دونوں جہان کی عافیت وراحت کو حضرت والا کے لیے اور حضرت کے جملہ خدام اور محبین کے لیے مقدر فرمادے۔ آمین یارب العالمین۔

محمد امجد قاسمی

مدرس دارالعلوم آزادول، جنوبی افریقہ

آتشِ غم کی ترجمانی ہے

حسن فانی ہے عشق فانی ہے کون کہتا ہے جاودانی ہے
وقفہ وقفہ سے آہ کی آواز آتشِ غم کی ترجمانی ہے
کیا بھروسہ مجازِ عالم کا عشق ان کا ہی غیرفانی ہے
راہ تقویٰ کے غم کا کیا کہنا دوستو! رشک شادمانی ہے
خونِ حسرت سے آہ و نالوں سے اپنی دنیا الگ بنانی ہے
اپنی خوشیوں کے خون سے اے دل شمع ایمان کی جلانی ہے
آہ سے اور چشمِ تر سے آہ کیسی تقریر بے زبانی ہے
دردِ نسبت کی دوستو تدبیر ہر نفس دل کی پاسبانی ہے
مشغلہ اہلِ دل کا اے اختر باغِ ایماں کی باغبانی ہے

مشکل الفاظ کے معانی: **جاودانی**: ہمیشہ رہنے والا۔ **آتش غم**: اللہ تعالیٰ کی محبت کی آگ۔ **مجاز**: عشق بازی۔ **غم**: گناہ سے بچنے کا غم۔ **شادمانی**: خوشی، رشک شادمانی یعنی خوشی کو بھی جس پر رشک آئے۔ **خونِ حسرت**: حرام تمناؤں کا خون کر دینا۔ **آہ و نالوں**: اللہ تعالیٰ کو یاد کر کے رونا۔ **شمع**: موم بتی۔ **چشم تر**: روتی ہوئی آنکھیں۔ **بے زبانی**: اللہ والوں کا ایک خاص وصف جس میں ان کی خاموشی میں بھی ان کے پاس بیٹھنے والوں کو نفع ہوتا ہے۔ **دردِ نسبت**: اللہ تعالیٰ سے تعلق کی وجہ سے اللہ والوں کا اپنے دل پر تکلیف برداشت کرنا مگر گناہ نہ کرنا۔ **تدبیر**: طریقہ۔ **نفس**: سانس۔ **پاسبانی**: حفاظت۔ **مشغلہ**: کام یا مصروفیت۔

حسنِ فانی سے دھوکہ نہ کھایئے

حسن فانی ہے عشق فانی ہے
کون کہتا ہے جاودانی ہے

یوں تو اس شعر میں ذکر کردہ مضمون حضرت والا کی کتاب میں جگہ جگہ آرہا ہے اور اس کی مضرتیں اور تباہ کاریاں بھی مختلف عنوانات سے اس کتاب عرفان محبت کے اندر موقع بموقع مذکور ہوئی ہیں مگر اس شعر میں حسن فانی کی فنائیت کا تذکرہ کرنا ایک خاص وجہ سے ہے اور وہ یہ کہ عشاقِ مجازی کا حسنِ مجازی پر قربان ہونے کا انداز بظاہر یہ بتاتا ہے کہ گویا ان کا یہ عشق پرستی کا کھیل ہمیشہ رہنے والا ہے۔

تو حضرت والا فرماتے ہیں کہ اے حسن فانی پر مرنے والو! تم اپنی حالت سے دھوکا کھا رہے ہو اپنے اس دھوکے سے نکلو اور اس حسن پسندی پر حقیقت پسندانہ غور کرو کہ جس معشوق اور معشوقہ پر تم جان دینے کی باتیں کر

رہے ہو اور ان کے مل جانے کو اپنی تسکین کا سامان سمجھ رہے ہو اور منزل کو پا لینے کے مترادف قرار دے رہے ہو یہ سب سوائے دھوکے کے کچھ نہیں۔ تاریخ پر غور کرو اور پھر اس کے انجام کو سوچو سوائے فنا کے اور کچھ نہیں اور خود تمہارا محبوب اور محبوبہ ایسی حالت میں پہنچنے والا ہے کہ تم کو اس کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہ ہوگا اور پھر قبر میں ہزاروں کیڑے مکوڑے اس پر چاروں طرف سے لپٹے ہوئے ہونگے اور سوائے مٹی کے ڈھیر اور ذروں کے ساری چمک اور رنگت اڑ چکی ہوگی کیا ہی خوب حضرت والا نے اس کی ترجمانی دوسرے اشعار میں یوں فرمائی ہے ؎

پھول مرجھا گئے چاندنی ڈھل گئی
اپنا انجام بھی کہہ گئی ہر کلی
بے نشاں بے نشاں ہو گئے ہر نشاں
قبر میں خاک چھانی مگر کیا ملی
رس بھری آنکھ تھی زلف کالی ملی
ہاں بلا بھی مگر اس سے کالی ملی
میرؔ دنیائے فانی میں ہر سو ملی
بے کلی بے کلی بے کلی بے کلی

اس لیے اے وہ لوگو! جو اپنے کردار اور حالت سے یہ بتا رہے ہو کہ تم نے اس حسن کو ہمیشہ باقی رہنے والا سمجھ لیا ہے اور تمہارا معاملہ اس کے ساتھ ویسا ہی نظر آ رہا ہے اس دھوکے سے نکلو اور اللہ تعالیٰ کے جمالِ لازوال پر فدا ہو جاؤ جسے کبھی فنا نہیں ہے تا کہ تمہیں بھی بقا حاصل ہو۔

آہ و فغاں بلا وجہ نہیں ہوتی

وقفہ وقفہ سے آہ کی آواز
آتشِ غم کی ترجمانی ہے

یعنی جو لوگ اپنے سینے میں اللہ تعالیٰ کی محبت کا غم لیے ہوئے ہیں اور واقعی معنوں میں انہوں نے گناہوں اور حرام کاموں سے بچنے میں اپنے دل پر رنج و غم کے پہاڑ اٹھائے ہیں تو پھر ان کے قلب میں اللہ تبارک وتعالیٰ اپنی محبت کی آگ ہی نہیں بلکہ آتش فشاں پیدا کر دیتا ہے اور ان کی زبان سے تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد آہ آہ نکلنا اسی اندرونی دردِ محبتِ خداوندی کا ترجمان ہوتا ہے۔ دراصل بات تو یہ ہے کہ یہ ایک ایسا کیف ہے جس کی حقیقت کو لغت بیان کرنے سے قاصر و عاجز ہے۔ جیسا کہ عربی کا جملہ ہے مَنْ لَّمْ یَذُقْ لَمْ یَدْرِ کہ جو چکھے گا نہیں وہ جانے گا بھی نہیں۔ اس کے سمجھنے کی آسان صورت بس ایک ہے ؎

قریب جلتے ہوئے دل کے اپنا دل کر دے
یہ آگ لگتی نہیں ہے لگائی جاتی ہے

کبھی یہ ترجمانی آہ و فغاں سے ہوتی ہے تو کبھی اشک بار آنکھوں سے ہوتی ہے جو اندر کے سوز اور تڑپ کا پتہ دیتی ہے۔

دیکھتے ہی دیکھتے رونقِ گلشن ننگِ خزاں بن گئے

کیا بھروسہ مجازِ عالم کا
عشق ان کا ہی غیر فانی ہے

حسن مجازی نہ تو باقی رہنے والا ہے اور نہ اس کا کسی بھی طرح کوئی بھروسہ اور ٹھکانا ہے چند لمحوں میں انسان کسی سخت قسم کی بیماری کا شکار ہو جائے یا کچھ دن کے لیے دست وغیرہ کا عارضہ لاحق ہو جائے یا خون میں کوئی بیماری پیدا ہو کر بدن میں مختلف قسم کے رنگ و نشانات پڑ جائیں تو دیکھتے ہی دیکھتے سارا حسن اڑ چکا ہوتا ہے اس لیے فانی بتوں کو دل دینا نہایت غیر دانشمندانہ حرکت اور بڑی ناعاقبت اندیشی ہے۔

پھر اگر کوئی بیماری اور عارضہ لاحق نہ بھی ہو تو آخر عمر کے ڈھلنے کے ساتھ ہی اس حسن کو بھی زوال آجاتا ہے اور بڑھاپے کی عمر میں چہرے کی ساری خوبصورتی ڈھل چکی ہوتی ہے اور وہ کتابی چہرے اب نظرِ التفات کے قابل بھی نہیں رہتے جیسا کہ اس کی فنائیت کا حضرت نے دوسری جگہ پر یوں نقشہ کھینچا ہے ؎

ہونٹوں پہ ان کے مونچھ ہیں گالوں پہ ڈاڑھیاں
اب سب ختم ہیں عشق و جنوں کی کہانیاں
پٹری ہی جب اکھڑ گئی حسن و جمال کی
اب کس طرح چلیں گی محبت کی گاڑیاں
جو تھے شگفتہ و تر و تازہ بہ شکلِ گل
دورِ خزاں میں اب ہیں وہ کانٹوں کی جھاڑیاں

ہاں بے شک! اللہ تعالیٰ کی ذات عالی کے ساتھ کی جانے والی پاکیزہ اور صاف ستھری محبت ہر آن قلب میں نئی تر و تازگی پیدا کرتی رہتی ہے اور اللہ تعالیٰ کے جلوے دل میں روز افزوں نظر آتے ہیں اور عمر گزرنے کے ساتھ ساتھ انوارات و تجلیاتِ الٰہیہ اہلِ دل کے چہروں پر بہت صاف اور نمایاں نظر آتی ہیں اور ان کے چہروں کی رنگت اور تر و تازگی دن بہ دن زیادہ ہی ہوتی رہتی ہے یہاں تک کہ وہ اسی حال میں اللہ کو پیارے ہو جاتے ہیں جیسا کہ عارف ہندی حضرت خواجہ صاحب نے حضرت تھانوی کے متعلق کچھ یوں ارشاد فرمایا ؎

چمکتی ہیں آنکھیں دمکتا ہے چہرہ
بڑھاپے میں بھی جانِ جاں ہو رہے ہیں

راہ تقویٰ کے غم کا کیا کہنا
دوستو! رشک شادمانی ہے

یعنی جب بندہ گناہوں سے بچتا ہے تو بے شک اس کے دل پر زور تو پڑتا ہے اور اسے وقتی غم اور صدمہ تو پہنچتا ہے لیکن اس کا یہ غم اہل دنیا کی ہزاروں خوشیوں کے لیے باعثِ رشک ہوتا ہے کیونکہ اس غم سے دل کو قرار اور اطمینان میسر آتا ہے اور چین وسکون کی عجیب دولت حاصل ہوتی ہے جب کہ گناہوں میں پڑ کر حاصل کی جانے والی خوشی دل کی بے چینی کا سبب ہوتی ہے اس لیے اہل اللہ کا یہ غم رشک شادمانی فرمایا گیا۔

اللہ والوں کی اپنی دنیا الگ ہوا کرتی ہے

خونِ حسرت سے آہ و نالوں سے
اپنی دنیا الگ بنائی ہے

ظاہر ہے اس شعر کا منشا یہ تو نہیں ہے کہ کوئی بھی انسان اس کائنات سے نکل کر کسی اور عالم میں پہنچ کر زندگی گزارے اور دنیوی حیات کے ساتھ جیتا رہے بلکہ اس تعبیر کا منشاء اور مقصد یہ ہے کہ جس طرح دنیا میں رہنے والے لوگ اللہ تعالیٰ کی نافرمانیوں کے ساتھ مصالحت اور (Compromise) کر کے چلنا چاہتے ہیں اور وہ دنیا کی رنگ رلیوں میں کھوئے نظر آتے ہیں فکر آخرت سے زیادہ ان کو اپنی دنیا کا غم کھائے جاتا ہے اور ہر وقت انہیں انہی دنیوی خوشیوں کی فکر پڑی رہتی ہے لیکن حضرت والا فرماتے ہیں کہ ہمیں تو ناجائز اور حرام خوشیاں چھوڑ کر اور دل پر تقویٰ کا غم اٹھا کر اور اللہ کے لیے آہ وزاری کر کے اپنے دل میں اپنے خالق کو بسا لینا ہے اور ہر آن اس کی یاد میں مست رہنا ہے کہ جس کے بعد انسان کو اپنے اردگرد کا کوئی خیال وفکر باقی نہیں رہتا اور نہ ہی ماضی پر کوئی حسرت و افسوس اور مستقبل کا کوئی اندیشہ اس کے دل کی دنیا میں خلل ڈال پاتا ہے بلکہ یہ کہنا بالکل بجا ہے اور واقعی معاملہ یہی ہے کہ اہل اللہ عام لوگوں کے ساتھ اس دنیا میں رہتے ہوئے اپنی دنیا الگ بنائے ہوئے ہوتے ہیں۔

ایمان کی شمع کیسے جلتی ہے

اپنی خوشیوں کے خون سے اے دل
شمع ایمان کی جلائی ہے

عجیب وغریب تشبیہ اختیار فرمائی گئی ہے کہ جس طرح کسی برتن میں تیل رکھ کر اور اس میں بتی لگا کر چراغ کو

روشن کیا جاتا ہے اور پھر اس سے لوگ روشنی کا فائدہ اٹھاتے ہیں اسی طرح میں اپنی خوشیوں کا خون کر کے اس سے چراغ روشن کروں گا اور اپنے قلب میں ایمان کی شمع جلاؤں گا جس سے میرے قلب وقالب اور دل و جان منور اور روشن ہو جائیں گے اور یہ ایک سچی حقیقت ہے جس کی گواہی خود قرآن دے رہا ہے، قرآن کریم کی مختلف آیات اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مختلف احادیث میں یہ بات مذکور ہے کہ:

﴿اتَّقُوْا فِرَاسَةَ الْمُؤْمِنِ فَإِنَّهُ يَنْظُرُ بِنُوْرِ اللهِ﴾

(سنن الترمذی، تفسیر القرآن عن الرسول، ومن سورۃ الحجر)

گناہوں کو چھوڑنے کے نتیجے میں اور اللہ کی نافرمانیوں سے بچنے کی بدولت حق سبحانہٗ وتعالیٰ قلب میں ایمان کا نور اور روشنی یعنی بصیرت قلبی عطا فرما دیتے ہیں اور دل و دماغ منور و روشن کر دیتے ہیں جیسا کہ اسی کتاب میں بعض دوسرے مواقع پر اس مضمون کو تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔ اپنی حرام خوشیوں کا خون کیے بغیر اور ناجائز تمناؤں کو چھوڑے بغیر گو کہ فی نفسہٖ ایمان دل میں موجود رہتا ہے مگر اس میں جلا اور روشنی پیدا نہیں ہوتی اور آدمی قلبی بصیرت سے ہمیشہ محروم رہتا ہے۔

آہ و نالوں کی تاثیر کسی تقریر سے کم نہیں

آہ ہے اور چشمِ تر ہے آہ

کیسی تقریر بے زبانی ہے

اہل اللہ کی مجلس میں بیٹھنے والے لوگ جب ان کی آہیں سنتے رہتے ہیں اور آنکھوں سے جاری آنسوؤں کا مشاہدہ کرتے رہتے ہیں تو خود یہ حالت ایک طرح سے زبان بن جاتی ہے اور جس طرح مقرر تقریر کے ذریعے اپنی بات پیش کر کے سامعین کے دل و دماغ میں اتارتا ہے اور ان کو اپنی بات کا حامی بنا لیتا ہے اور لوگ سن کر اس سے متاثر ہوتے اور نفع اٹھاتے ہیں۔

ٹھیک بالکل اسی طرح اہل اللہ کی صحبت میں جب چشم گریاں پر لوگوں کی نظر پڑتی ہے اور درد بھرے دل کی ترجمانی اس کی آہ و فغاں کے ذریعے سے لوگوں کے کانوں تک پہنچتی ہے تو یہ حالت بھی سامعین کے دلوں پر اثر انداز ہونے میں کسی تقریر سے کم نہیں ہے گو کہ یہ بیان نہیں مگر بیان سے بڑھ کر اثر رکھتی ہے آخر جو چھوٹا بچہ ہوتا ہے جس کو ابھی تک قوت گویائی حاصل نہیں ہوئی ہوتی وہ بھی تو اپنے دل کی مرادیں اسی طرح کچھ آہ و بکاء کر کے اپنے والدین کے سامنے پیش کر دیتا ہے اور اپنی اندرونی حالت یا کوئی دلی تقاضہ اپنی حالت و کیفیت کے ذریعے والدین کے سامنے رکھ دیتا ہے اس لیے حضرت والا نے فرمایا کہ یہ تقریر بے زبانی ہے۔

دل کی پاسبانی اور دردِ نسبت کا حصول

دردِ نسبت کی دوستو تدبیر
ہر نفس دل کی پاسبانی ہے

یعنی اپنے دل کے اندر اللہ تعالیٰ کی محبت کا درد حاصل کرنے کے لیے آسان صورت یہی ہے کہ ہر سانس اپنے دل کی نگہبانی رکھے اور اسے ایک لمحے کے لیے بھی اللہ تعالیٰ کی یاد سے غافل نہ ہونے دے کہ اس غفلت کے نتیجے میں خدا تعالیٰ کی نافرمانی اور معصیتوں میں مبتلا ہو جائے گا کیونکہ ہر معصیت درحقیقت قلبی غفلت ہی کا نتیجہ ہوتی ہے تو ہر وقت اپنے دل کی نگرانی کرتا رہے غیر حق تعالیٰ کی طرف کسی بھی طرح کے خوف وطمع کے قبیل سے سوچ دل میں قائم نہ ہو یہاں تک کہ مخلوق کے نفع وضرر سے اور ان کی مدح وذم سے دل کو بالکل خالی کرلے اور اس میں ایک لمحے کے لیے بھی مخلوق کا گذر باقی نہ رہے اور جن مخلوقات کے حقوق خالق نے ہمارے ذمہ لگائے ہیں وہ بھی اسی خالق کو دل میں رکھتے ہوئے اور اس کا حکم سمجھتے ہوئے ادا کیے جائیں اور جس طرف قدم اٹھانے سے خالق ''جل و علا'' نے ہم کو روک دیا ہے اس طرف بڑھنے کا خیال بھی دل میں نہ آئے

اور ظاہر ہے جب دل کی پاسبانی اور نگرانی کی جائے گی تو پھر بدن کے سارے اعضاء بھی ہر سانس اللہ تعالیٰ کے حکم کے تابع رہیں گے کیونکہ دل پورے بدن کا بادشاہ ہے جس طرف جس عضو کو دل پھیرتا ہے وہ اس طرف پھر جاتا ہے اور جس طرف سے روکتا ہے وہ اس طرف سے رک جاتا ہے اسی لیے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دل کے ٹھیک رہنے پر پورے جسم کے ٹھیک رہنے اور اس کے بگڑنے پر پورے جسم کے بگڑنے کی خبر دی ہے لہٰذا خلاصہ یہ نکلا کہ اللہ تعالیٰ کی محبت کا دردِ نسبت دل میں حاصل ہونے کا یہی طریقہ ہے کہ ہر لمحہ دل کی غفلت سے مکمل پاسبانی اور حفاظت ہو حضرت شاہ محمد احمد پرتا بگڈھی کی دردِ نسبت کی ترجمانی دیکھئے ؎

نسبت اسی کا نام ہے نسبت اسی کا نام
ان کی گلی سے آپ نکلنے نہ پائیے

باغِ ایمان کی باغبانی اہلِ دل کا کام ہے

مشغلہ اہلِ دل کا اے اخترؔ
باغِ ایماں کی باغبانی ہے

دنیا میں اگر کوئی پھولوں پھلوں کا باغ ہو تو اس کی باغبانی کے لیے مختلف ظاہری اور مادی چیزیں اختیار کرنی پڑتی ہیں تو وہ قائم رہتا ہے اور پھولتا پھلتا ہے کبھی تو اس کو پانی سے سیراب کرنا پڑے گا کبھی اس میں غیر ضروری

گھاس وغیرہ اگ جانے کے سبب ان کو وہاں سے اکھاڑ کر صاف کرنا پڑتا ہے کبھی ان میں کھاد ڈالنا پڑتا ہے اور دوسری مختلف تدابیر اس کی باغبانی کے لیے استعمال کرنی پڑتی ہیں ورنہ وہ سب درخت مردہ ہو کر پھول وپھل دینا چھوڑ دینگے کچھ اسی طرح سے ہمارے دلوں کا بھی معاملہ ہے کہ اگر اس میں اللہ تعالیٰ کی محبت کا لگا ہوا باغ جو ایمان کی شکل میں وہاں موجود ہے اس کی صحیح طرح باغبانی نہ کی جائے اور اس کو حرام خوشیوں اور لذتوں کے خون سے سیراب نہ کیا جائے تو پھر وہ مضمحل اور پژمردہ ہوتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ اس کے پھول وپھل جو عبادات اور طاعات کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں وہ پھول وپھل دینا چھوڑ دیتا ہے اور اس لیے اہل اللہ اسی باغ ایمان کی باغبانی کرتے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ یہ کام اہلِ دل اہل اللہ ہی کا خاصہ ہے محض کتابوں کے پڑھ لینے یا بیانات اور تقریروں کے سن لینے سے یہ کام بالکل نہیں ہو پاتے اس لیے خود اللہ تبارک وتعالیٰ نے امت کو کتاب عطا فرما کر ایک نبی بھی عطا فرمایا جس سے ہم سنت اللہ کا اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اصل صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے قلوب میں باغ ایمان کی باغبانی جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی اور پھر اس کے پھول وپھل حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی عبادات ومجاہدات اور قربانیوں کی شکل میں ظاہر ہوئے۔

پا گئی جان سلطان جاں کو

پائے گا جو بھی قطبِ زماں کو ... پائے گا جان میں جانِ جاں کو
جانے کیا تاج سلطانیت بھی ... لذت قرب آہ و فغاں کو
اپنے مالک پہ کر لو بھروسہ ... چھوڑ دو فکر ایں فکر آں کو
جانے کیا ماہ و خورشید و انجم ... جو دیا حق نے بندوں کی جاں کو
پالیا کر کے ترک تمنا ... مطلع قرب خورشید جاں کو
آہ فیض غلامیِ مرشد ... پا گئی جان سلطان جاں کو
دونوں عالم سے پاؤ گے بہتر ... لذتِ نامِ ربِ جہاں کو
جانیں کیا اہل غفلت جہاں میں ... قرب اہل محبت کی شاں کو
لذت آہ صحرا کی اختر ... کیا خبر بلبلِ گلستاں کو

مشکل الفاظ کے معانی:۔ **قطب**: اللہ تعالیٰ کی دوستی کا ایک مقام۔ **جانِ جاں**: اللہ تعالیٰ۔ **سلطانیت**: بادشاہت۔ **لذت**: مزا۔ **قرب**: نزدیکی۔ **آہ وفغاں**: اللہ تعالیٰ کی محبت میں رونا۔ **فکر ایں فکر آں**: یہ فکر اور وہ فکر یعنی تمام فکریں۔ **ماہ وخورشید وانجم**: چاند، سورج اور ستارے۔ **حق**: اللہ تعالیٰ۔ **ترکِ تمنا**: حرام خواہشات کو چھوڑ کر۔ **مطلع**: طلوع ہونے کی جگہ۔ **سلطانِ جاں**: اللہ تعالیٰ۔ **اہل غفلت**: گناہگار لوگ۔ **اہلِ محبت**: اللہ تعالیٰ سے محبت کرنے والے۔

قطب بینی اور کتب بینی کی تاثیر جدا جدا ہے

پائے گا جو بھی قطبِ زماں کو
پائے گا جان میں جانِ جاں کو

حکیم الامت تھانوی رحمہ اللہ کے متعلق یہ بات منقول ہے کہ انہوں نے یہ بات ارشاد فرمائی تھی میں نے کتب بینی کے ساتھ قطب بینی بھی کی ہے یعنی کتابوں کے مطالعہ کے ساتھ ساتھ اہلِ دل اولیاء اللہ کی صحبت اٹھائی ہے حضرت مولانا یعقوب صاحب نانوتوی، حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمہ اللہ اور حضرت علامہ رشید احمد گنگوہی ان حضرات کی خاص طور پر حضرت تھانوی پر نظرِ عنایت اور توجہات رہی ہیں اس لیے شعر کا منشا یہ ہے کہ قلب میں حقیقی ایمان کا مزہ اور اللہ تعالیٰ کو پالینے کی حقیقی لذت جب ہی نصیب ہوتی ہے جب کوئی آدمی اپنے وقت کے شیخ کامل ا مصلح و مرشد صاحب دل اہل اللہ سے وابستہ ہوجائے اس وابستگی اور تعلق اور اصلاحی رابطے کے بعد اس کو محسوس ہوگا کہ میں اپنی جان میں جانِ جاناں کو پارہا ہوں یعنی میرے دل میں مجھے اللہ تعالیٰ کی تجلیات خاصہ کے ساتھ ان کی موجودگی کا احساس ہورہا ہے۔ شیخ کامل کی رہبری میں راستہ صرف آسانی ہی کے ساتھ نہیں بلکہ مزیداری کے ساتھ طے ہوتا ہے اور منزل مقصود میسر آجاتی ہے۔

رہ گیا قطب زماں کا لفظ جو اس شعر میں استعمال کیا گیا ہے تو درحقیقت قطب زمانہ یہ بندوں کے اللہ تعالیٰ سے تعلق اور قرب خاص کے مراتب اور درجات میں سے ایک خاص درجے کا نام ہے جس کو ملا علی قاری رحمہ اللہ مرقاۃ میں اس طرح ذکر فرمایا:

﴿قَالَ الشَّيْخُ زَكَرِيَّا رَحِمَهُ اللّٰهُ فِيْ رِسَالَتِهِ الْمُشْتَمِلَةِ عَلٰى تَعْرِيْفِ غَالِبِ أَلْفَاظِ الصُّوْفِيَةِ الْقُطْبُ وَيُقَالُ لَهُ الْغَوْثُ هُوَ الْوَاحِدُ الَّذِيْ هُوَ مَحَلُّ نَظَرِ اللّٰهِ تَعَالٰى مِنَ الْعَالَمِ فِيْ كُلِّ زَمَانٍ أَيْ نَظْرًا خَاصًّا يَتَرَتَّبُ عَلَيْهِ إِفَاضَةُ الْفَيْضِ وَاسْتِفَاضَتِهِ فَهُوَ الْوَاسِطَةُ لِذٰلِكَ بَيْنَ اللّٰهِ تَعَالٰى وَبَيْنَ عِبَادِهِ فَيَقْسِمُ الْفَيْضَ الْمَعْنَوِيَّ عَلٰى أَهْلِ بِلَادِهِ بِحَسْبِ تَقْدِيْرِهِ وَمُرَادِهِ﴾

(مرقاۃ المفاتیح، ج: ۱۰، ص: ۱۲۸، مکتبۃ امدادیۃ)

شیخ زکریا رحمہ اللہ نے اپنے ایک رسالے میں جس میں اکثر صوفیہ کے الفاظ کی تعریف کی گئی ہے لفظ قطب کے متعلق یہ بات ارشاد فرمائی کہ قطب اور غوث ایک ہی چیز ہے ہر زمانے میں اللہ تبارک وتعالیٰ کا خاص منظور نظر بندہ جس کو اللہ تعالیٰ سارے عالم میں سے اپنا فیض جاری کرنے کے لیے منتخب فرماتے ہیں اور وہ اللہ تعالیٰ سے فیض حاصل کرتا ہے اور اللہ کے بندوں میں واسطہ بن کر اس فیض کو تقسیم کرتا ہے اور اپنے ملک والوں پر جتنی اس کی قدرت و طاقت اور ہمت وسعت حق تعالیٰ کی مشیت اور فیصلے کے مطابق ہوتی ہے وہ فیض پہنچاتا رہتا ہے۔

رہ گیا صحبت اہل اللہ کی اہمیت کا مضمون اس کو احقر نے عرفان محبت کی آخری جلد میں سکون دل در مجلس اہلِ دل والی نظم کے تحت کسی قدر تفصیل کے ساتھ لکھ دیا ہے اور مختلف دوسرے مقامات پر بھی اختصار کے ساتھ مذکور ہے۔

اللہ والوں کی لذت کو سلاطین دنیا کیا جانیں

جانے کیا تاج سلطانیت بھی
لذت قرب آہ و فغاں کو

یعنی بادشاہوں کو کچھ مادی اور ظاہری منافع تو حاصل ہوتے رہتے ہیں اور لوگوں کی نگاہوں میں ظاہری عزت وعظمت بھی خوب مل جاتی ہے دنیا کے عیش وعشرت کے سامان بھی وافر مقدار میں ان کے پاس جمع رہتے ہیں مگر اللہ تعالیٰ سے قرب کی جو لذت ہے اس کی تو ان کو ہوا بھی نہیں لگتی بلکہ حقیقت تو یہ ہوتی ہے جس کو حضرت والا نے دوسرے مقام پر یوں تعبیر فرمایا ہے ؎

شاہوں کے سروں پر تاج گراں سے درد سا اکثر رہتا ہے
اور اہل وفا کے سینوں میں اک نور کا دریا بہتا ہے

یہی تو وہ بات ہے جس کو حضرت ابراہیم بن ادہم نے قسم اٹھا کر کے بڑے تاکیدی انداز سے فرمایا کہ:

﴿قَالَ اِبْرَاهِیْمُ بْنُ اَدْهَمَ: وَاللّٰهِ اَنَا لَفِیْ لَذَّةٍ لَوْعَلِمَهَا الْمُلُوْکُ لَجَادَلُوْنَا عَلَیْهَا بِالسُّیُوْفِ﴾

(فتح الملهم، ج:۱، ص:۶۳۲)

خدا کی قسم ہم ایسی لذت میں ہیں کہ اگر سلاطین دنیا کو اس کی خبر ہو جائے تو تلواروں کے ذریعے سے اس کے لیے ہم سے لڑنے لگیں۔

مالک کائنات پر بھروسہ ہر مشکل کا حل ہے

اپنے مالک پہ کر لو بھروسہ
چھوڑ دو فکر ایں فکر آں کو

بندے کو چاہیے کہ اپنے اصل مقصد میں لگے اور وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنا اور ہر وقت اس کے راضی کرنے والے اعمال کرنا ہے پھر باقی دوسری اس کی فکریں، یہ کیسے ہوگا، وہ کیسے ہوگا اس کے سلسلے میں ان فکروں کو دل میں کوئی جگہ نہ دے بس اللہ تعالیٰ پر توکل اور بھروسہ کرے تو خود اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر لے گا کہ یہ ساری فکریں اللہ تعالیٰ اس کے اوپر سے ہٹا دیں گے۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے توکل اور اللہ پر بھروسے کی جو حقیقت بیان فرمائی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ کسی بھی چیز کے اسباب کو اختیار کرو اور نتیجے کو اللہ پر چھوڑ دو۔ نتیجہ اپنی پسند اور چاہت کے مطابق ہو تو بھی

راضی اور خوش رہے اور اس کے خلاف ہو تو بھی بے چین اور پریشان نہ ہو۔ چنانچہ حدیث شریف میں ہے کہ:

﴿قَالَ رَجُلٌ یَا رَسُوْلَ اللهِ اَعْقِلُهَا وَاَتَوَكَّلُ اَوْ اُطْلِقُهَا وَاَتَوَكَّلُ قَالَ اعْقِلْهَا وَتَوَكَّلْ﴾

(سنن الترمذی، کتاب الزھد عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم)

ایک صحابی نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اونٹ کے متعلق دریافت فرمایا کہ میں باندھوں اور پھر اللہ پر بھروسہ کروں یا کھلا چھوڑ دوں اور پھر اللہ پر بھروسہ کروں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ پہلے اونٹ کو باندھو اور پھر اللہ پر بھروسہ کرو۔

جس سے یہ اصول معلوم ہوا کہ پہلے سبب حفاظت اختیار کرنا ہے اور پھر اللہ پر بھروسہ کرنا ہے تو جب بھی اہل حق علماء کی کتابوں میں توکل اور بھروسے کا لفظ بولا جاتا ہے اس کا معنی یہی ہوتا ہے کہ ہر چیز کا سبب اختیار کر کے نتیجہ اللہ کے حوالے کر دیا جائے جیسے مال حلال کا سبب تجارت، زراعت، ملازمت، صنعت وحرفت وغیرہ کو اختیار کر کے پھر اپنے معاش اور روزی کی فکر کو اللہ پر چھوڑ دیا جائے زیادہ گہرائی میں پڑ کر رات و دن کی بے چینی و پریشانی اپنے دل و دماغ پر سوار نہ کرے بلکہ مطمئن رہے اور مختصر سے اسباب اپنانے کے بعد اللہ پر بھروسہ کر لے اور اپنے مقصد حیات یعنی اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اس کے دین کی اشاعت وغیرہ میں لگ جائے۔

لہٰذا یہ بات ثابت ہوگئی کہ علماء اور صوفیاء اہل حق گھر اور کاروبار کو اور اسباب کے اختیار کرنے کو چھوڑنے کی بات نہیں کہتے کیونکہ یہ سنت اللہ کے اور دنیا کے دار الاسباب ہونے کے فطری تقاضے کے خلاف ہے بلکہ صحیح بات یہ ہے جو احقر نے عرض کی ہے اس لیے نہ تو اسباب کو چھوڑنا چاہیے نہ ان کے پیچھے اس قدر انہماک سے پڑنا چاہیے کہ ہر وقت اسی کی فکر سوار ہو گویا اس کی دو جانب ہیں، افراط وتفریط۔ ان دونوں سے بچ کر اعتدال والی راہ اختیار کرنے چاہیے یہی حضرت والا کا اس شعر میں منشا ہے۔

افراط وتفریط توکل کے منافی ہے

حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ جن بزرگوں کے متعلق ایسے واقعات ملتے ہیں کہ وہ جنگلوں میں چلے گئے اور وہاں تنہائیوں میں جا کر اللہ اللہ کرتے رہے وہ ایسے اہل حق اللہ والے تھے کہ جن کے اوپر حقوق واجبہ نہیں تھے یعنی وہ غیر شادی شدہ تھے اور ان کے بیوی بچے نہ تھے یا انہوں نے اس کا کوئی شرعی معقول انتظام کیا تھا اس لیے ایسے حضرات کی اتباع محض ان کے قصے پڑھ کر اور سن کر نہیں کرنی چاہیے یہی وجہ ہے کہ کتابوں کو پڑھ کر اللہ تعالیٰ کا راستہ آسانی سے طے نہیں ہوتا اور منزل تک انسان جلدی نہیں پہنچتا بلکہ افراط وتفریط کا شکار ہو کر کسی ایک سمت میں پڑا رہ جاتا ہے اور ساری عمر منزل تک پہنچنا نصیب نہیں ہوتا جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک حدیث شریف میں منقول ہے:

﴿وَعَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ خَطَّ لَنَا رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَطًّا ثُمَّ قَالَ هٰذَا سَبِيْلُ اللهِ ثُمَّ خَطَّ خُطُوْطًا عَنْ يَّمِيْنِهٖ وَعَنْ شِمَالِهٖ وَقَالَ هٰذِهٖ سُبُلٌ عَلٰى كُلِّ سَبِيْلٍ مِّنْهَا شَيْطَانٌ يَّدْعُوْ اِلَيْهِ وَقَرَأَ: وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ (الآية)﴾

(رواہ احمد والنسائی والدارمی، مشکوٰۃ المصابیح: ص ۳۰)

ترجمہ: نبی کریم علیہ السلاۃ والسلام نے ایک مرتبہ ایک لمبا خط کھینچا اور پھر اس کے دائیں اور بائیں جانب بہت سے چھوٹے چھوٹے خطوط کھینچے اور پھر یہ ارشاد فرمایا کہ یہ جو لمبا خط ہے یہ تو میرا راستہ ہے اور یہ جو دائیں بائیں چھوٹے چھوٹے خطوط ہیں یہ سب گمراہی اور افراط وتفریط والوں کے راستے ہیں اس لیے جو اس سیدھی راہ پر چل رہا ہوگا پس وہی میرے راستے پر چلنے والا ہے۔ اور دوسرے راستوں پر شیطان بیٹھا ہوا ہے جو اس کی طرف بلا رہا ہے اور یہ آیت پڑھی: وأن هذا صراطي مستقيمًا (الآية)

صاحبو! اسی لیے تو حفظ حقوق اور حفظ حدود دین کے اندر بہت زیادہ اہمیت کے حامل ہیں اور بلکہ یوں کہیے کسی کام کے دین میں شمار ہونے کے لیے یہ دونوں چیزیں معیار اور کسوٹی ہیں۔ چنانچہ حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہ کے مواعظ میں باقاعدہ طور پر حفظ حدود اور حفظ حقوق کے اوپر وعظ موجود ہیں بکثرت یہ بات دیکھنے میں آتی ہے کہ جو لوگ دین پر عمل کرنے کے شوقین ہوتے ہیں وہ جذبات میں آکر دین کے کسی کام میں لگ جاتے ہیں اور اپنے ذمہ عائد حقوق اور فرائض کی پرواہ نہیں کرتے اور دین کے اس کام کی جو حدود مقرر ہیں ان سے تجاوز کر گزرتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دونوں صورتوں میں وہ دین کے کام کرنے والے نہیں ہوتے تو بھلا ان کو ان کی منزل یعنی اللہ کی رضا کیسے نصیب ہوسکتی ہے۔

خورشیدِ سماء اور خورشیدِ جاں کا فرق

جانیں کیا ماہ و خورشید و انجم
جو دیا حق نے بندوں کی جاں کو
پا لیا کر کے ترک تمنا
مطلع قرب خورشید جاں کو

چاند اور سورج کی روشنی اور آسمان کے طلوع ہونے والے ستاروں کی چمک دنیا جہاں کے ظاہر کو روشن کرتی ہے مگر بندہ مومن کی جان کو عطا ہونے والا نورِ معرفت باطن کو منور اور روشن کر دیتا ہے جس کی روشنی کا یہ اثر ہوتا ہے کہ باطل کے سارے اندھیرے راستے سے چھٹ کر صاف ہو جاتے ہیں اور قبر وحشر کی بھیانک ظلمات اور تاریکیوں میں ایمان کی یہ روشنی کارآمد اور نافع ہوگی اور ایک ظاہری اثر یہ ہوتا ہے کہ انسان کا اندر ایمان کے انوار

سے چمک اٹھتا ہے جس کی بدولت اللہ تبارک وتعالیٰ کی تجلیاتِ خاصہ کا قلب پر ورود ہوتا ہے تو پھر آفتاب ومہتاب کی روشنی کی کچھ حیثیت نہیں رہتی اور جتنا جتنا سالک اپنی حرام تمناؤں اور خواہشات کو دل پر زور رکھ کر چھوڑتا رہتا ہے اتنا ہی اس کی جان کو اللہ تعالیٰ کا قربِ خاص عطا ہوتا رہتا ہے اور وہ اس کے غیر فانی نور سے چمکتی جاتی ہے۔

آہ! فیضِ غلامیِ مرشد
پا گئی جان سلطانِ جاں کو
دونوں عالم سے پاؤ گے بہتر
لذتِ نامِ ربِ جہاں کو
جانیں کیا اہلِ غفلت جہاں میں
قربِ اہلِ محبت کی شاں کو

یعنی میرے شیخ ومرشد کی صحبت وخدمت اور ان کی توجہات اور دعاؤں کی برکت سے مجھ پر اللہ تعالیٰ نے یہ فضل فرما دیا ہے کہ میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ میرے دل میں اللہ تعالیٰ کا قرب موجود ہے اور وہ ذات عالی اپنی تجلیاتِ خاصہ کے ساتھ جلوہ فرما ہے جس کی برکت سے حق تعالیٰ نے دل و جان میں کیسی پاکیزگی وصفائی عطا فرمادی کہ جس وقت میں اللہ تعالیٰ کا نام لیتا ہوں اور اللہ کو پکارتا ہوں اور اللہ اللہ کا ذکر کرتا ہوں تو مجھے دونوں عالم کے مزے ہیچ نظر آتے ہیں اور یہ امر واقعی ہے کہ اللہ کے نام کی لذت ایسی ہی چیز ہے مگر بس شرط یہی ہے کہ ہمارے دل وجان گناہوں کی گندگی اور غلاظت سے پاک ہوں اور وہ غفلتوں اور گناہوں کے زہر سے آلودہ نہ ہوں۔

عیش وعشرت کے دیوانے آہِ صحرا کے مزوں کو کیا جانے

لذتِ آہِ صحرا کی اختر
کیا خبر بلبلِ گلستاں کو

جن لوگوں کی ساری زندگی دنیا کے عیش وعشرت اور حرام وفانی لذتوں میں گذر گئی ہو اور انہوں نے کبھی اللہ کے لیے گناہوں کو چھوڑ کر اور اپنے دل کو توڑ کر دیکھا ہی نہ ہو اور نہ ہی کبھی اللہ تعالیٰ کو آہ وزاری کے ساتھ پکارا ہو تو وہ اس لذت سے کیا آشنا ہو سکتے ہیں جس طرح کہ وہ بلبل جو ہمیشہ گلستاں میں رہتی ہو اسے صحراؤں کی آہ وزاری کی لذت کی کیا خبر۔

حقیقت یہ ہے کہ جب خدا کے سچے بندے اپنی شکستہ دلی کے ساتھ بے سروسامانی کے عالم میں مخلوق سے ناامیدی اور بے چارگی کی حالت میں سارے علائقِ دنیویہ سے دل خالی کر کے اور اپنے ارمانوں کا خون پی کر اللہ کی

بارگاہ میں آہ وفغاں کرتے ہیں تو دنیا وآخرت کی کوئی چیز ان کو وہ لذت عطا نہیں کرسکتی جو ان کو اس گھڑی حاصل ہو رہی ہوتی ہے بس یہی خلاصہ ہے حضرت کے آخری شعر کا۔

نکھرتا ہے کہیں رنگِ گلستاں باغبانی سے

اگر پانی نہ پائیں گل یہ ابر آسمانی سے
نکھرتا ہے کہیں رنگِ گلستاں باغبانی سے

اسے لندن کے رنگِ گل کی کچھ حاجت نہیں ہوتی
جسے ملتا ہے دردِ دل خدا کی مہربانی سے

نہ دیکھو ان نمک پاروں کو تم ہرگز نہیں دیکھو
کہ یہ تشنہ لبی جاتی نہیں نمکین پانی سے

نہیں برباد کرتا ہے وہ اپنے دیدہ و دل کو
ملی نسبت جسے قلب و نظر کی پاسبانی سے

بہ فیضِ ذکرِ حق وہ کیف ذاکر دل میں پاتا ہے
کہاں ممکن ہے پائے گا وہ فانی گلفشانی سے

اگر دردِ محبت دل میں واعظ کے نہیں اختؔر
حقیقت پا نہیں سکتے ہو اس کی خوش بیانی سے

مشکل الفاظ کے معانی:۔ **ابر:** بادل۔ **حاجت:** ضرورت۔ **نمک پاروں:** نمک کے ٹکڑے مراد حسین۔ **تشنہ لبی:** پیاس۔ **دیدہ و دل:** آنکھ اور دل۔ **نسبت:** اللہ تعالیٰ کا بندے سے اور بندے کا اللہ تعالیٰ سے خاص تعلق۔ **ذکر حق:** اللہ تعالیٰ کا ذکر۔ **کیف:** مزا۔ **گلفشانی:** پھول جھڑنا، مراد فنا ہونے والے حسین چہرے۔ **واعظ:** تقریر کرنے والا۔ **خوش بیانی:** اچھی تقریر۔

گلستانِ معرفت کا رنگ ابرِ رحمت کے پانی سے نکھرتا ہے

اگر پانی نہ پائیں گل یہ ابر آسمانی سے
نکھرتا ہے کہیں رنگِ گلستاں باغبانی سے

حضرت والا کے مختلف مواعظ میں یہ بات موجود ہے کہ دنیا کے ظاہری ایئرکنڈیشن انسان کی کھال تو ٹھنڈی کرسکتے ہیں لیکن اللہ کی نافرمانیوں کی وجہ سے اس کے دل میں لگی ہوئی بے چینیوں کی آگ سے پیدا ہونے والی گرمی کو ٹھنڈا نہیں کرسکتے، دل کا چین وسکون اللہ تعالیٰ کو راضی کرکے اس کی یادوں میں زندگی گزار کر حاصل ہوتا

ہے۔اسی کو حضرت والا اپنے مخصوص انداز سے بیان فرمارہے ہیں جب باغ کے لیے باغبان کوششیں تو کرتا رہے اور صفائی ستھرائی اور اس کی دیکھ بھال تو جاری رکھے لیکن آسمان سے پانی برس کر اس کی جڑوں کو سیراب نہ کردے اور پانی اندر تک سرایت نہ کر جائے جس کے نتیجہ میں حق تعالیٰ ان پھولوں کو خاص رنگ و روغن عطا فرماتے ہیں اور ان کو بہترین قسم کی پھولوں کی خوشبوؤں کا مرکز بناتے ہیں تو جب تک اللہ کی طرف سے یہ سیرابی کا انتظام نہ ہو تو اس باغبان کی باغبانی سے گلستاں کا رنگ نہیں نکھر سکتا بلکہ وہ مرجھاتا جائے گا اور کچھ دنوں کے بعد بالکل نیست ونابود ہو جائے گا۔

سو اگر انسان کے قلب میں اللہ تعالیٰ کی محبت اور اس کی معرفت نہ ہو اور اس کی زندگی اللہ کے ذکر سے خالی ہو تو دل کی بے چینی بڑھتے بڑھتے یہاں تک پہنچ جائے گی کہ دنیا کا ظاہری چین وسکون بھی مٹتا نظر آئے گا۔

اس لیے کہ اصل چین وسکون کا تعلق دل سے ہے تو دل کی بے چینی کے ساتھ جسم کا سکون بھی جاتا رہتا ہے اس کو ایک مثال سے اس طرح سمجھئے کہ کسی شخص کو پھانسی کی سزا سنائی گئی ہو اور اسے دو دن کے بعد تختہ دار پر لٹکایا جانے والا ہے اب اس سے پہلے اگرچہ اسے ہر طرح کے کھانے پینے اور عیش وآرام دیئے جائیں مگر وہ یہی کہے گا کہ مجھے کوئی سکون حاصل نہیں ہے اور وہ بہت ہی بے چین اور پریشان ہوگا۔

لندن و پیرس کی اہلِ دل کی نگاہ میں کوئی وقعت نہیں

اسے لندن کے رنگِ گل کی کچھ حاجت نہیں ہوتی
جسے ملتا ہے دردِ دل خدا کی مہربانی سے

حضرت والا کے یہ اشعار چونکہ انگلینڈ کی سرزمین پر باٹلی سے بلیک برن جاتے وقت موزوں ہوئے تھے اس لیے بطور مثال لندن کا ذکر آیا ورنہ مقصود یہ ہے کہ کوئی بھی حسن وخوبصورتی کا شہر اور عیش وعشرت کی جگہ اللہ والوں کی نگاہ میں کوئی اہمیت نہیں رکھتی اور نہ اس کے ساتھ ان حضرات کو کسی بھی طرح کی دلچسپی ہوتی ہے کیونکہ خود گلوں کو رنگت اور مہک دینے والا اللہ ان کے دلوں میں موجود ہوتا ہے تو ہر طرح کے حسن اور خوبصورتی کا مرکز جو دل میں لیے پھرتے ہوں پھر انہیں لندن و پیرس کے ہوٹلوں اور کشمیر اور مری کی پہاڑیوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہوسکتی ہاں یہ الگ بات ہے کہ یہ لوگ ایسے مواقع پر اپنے اللہ کی قدرت کا مشاہدہ کرنے اور مخلوق کے ذریعے سے خالق کی معرفت حاصل کرنے جایا کرتے ہیں ورنہ فی الحقیقت وہ تجلیاتِ الٰہیہ میں ایسے مست وسرشار ہوتے ہیں کہ ان کو ذہنی ٹینشن دور کرنے کے لیے ہولیڈے (Holiday) منانے اور سیر وتفریح کی ضرورت نہیں ہوتی۔

نمک پاروں کے نمکین پانی سے تشنہ لبی ختم نہیں ہوسکتی

نہ دیکھو ان نمک پاروں کو تم ہرگز نہیں دیکھو
کہ یہ تشنہ لبی جاتی نہیں نمکین پانی سے

ابھی ابھی حضرت والا کے وعظ میں ہم سب نے یہ بات سنی کہ ایک گناہ کر کے پھر سے اس کو دوبارہ اس نیت سے کرنا کہ کچھ سکون مل جائے اور پھر نہ کروں گا یہ سراسر حماقت اور بے وقوفی ہے کہ اپنے معشوق اور معشوقہ پر بس ایک نظر ڈال دوں تا کہ دل کو ذرا سکون مل جائے کیونکہ بالکل رہا نہیں جارہا ہے اور بس پھر اس مرتبہ کے بعد توبہ کرلوں گا پھر دوبارہ نظر نہ ڈالوں گا یا صرف لاسٹ (last) مرتبہ کوئی فلم دیکھ لوں اور بس یہ آخری مرتبہ دیکھنا ہوگا کیونکہ طبیعت اس کے دیکھنے کے لیے بہت بے چین ہے تو حضرت والا نے ارشاد فرمایا کہ یہ ایسا ہے کہ آگ پر پٹرول چھڑک کر آگ بجھانے کی تمنا کرنا کیونکہ گناہ میں جہنم کی خصوصیت ہے جس کو حضرت والا نے یوں ارشاد فرمایا کہ برانچ میں ہیڈ آفس کی خصوصیات ہوتی ہیں اس لیے گناہوں میں ویسی ہی بے چینی کا خاصہ ہے جیسی انسان کو جہنم میں ہوگی اس لیے اس شعر میں بڑے پیارے انداز میں یہ بات ذکر کی گئی ہے کہ تم ان نمک پاروں کو دیکھ رہے ہو اور تمہاری یہ تشنہ لبی ختم نہیں ہورہی ہے بلکہ مزید پیاس بڑھتی جارہی ہے تو پیاس نمکین پانی سے نہیں جائے گی لہٰذا اگر تم بار بار دیکھو گے تو یہ پیاس اور بڑھتی چلی جائے گی اور جیسے جہنم هَلْ مِن مَّزِيْدٍ، هَلْ مِن مَّزِيْدٍ کچھ اور ہے کچھ اور ہے کہہ کر مانگتی رہے گی یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس پر اپنا قدم رکھ دینگے جس کا معنیٰ حضرت والا نے بحوالہ علامہ قسطلانی یہ ذکر فرمایا ہے کہ اپنی ایک خاص تجلی فرمادینگے تب وہ یہ کہنا بند کرے گی۔

تو دنیا میں جو انسان کا نفس ہے جب انسان گناہ کرتا ہے یہ بھی جہنم کی طرح سے هَلْ مِن مَّزِيْدٍ، هَلْ مِن مَّزِيْدٍ مانگتا رہتا ہے اسی لیے اگر کسی فاسق وفاجر کو جو کہ فانی بتوں کا عاشق ہو یہ پتہ چل جائے کہ پیرس اور لندن کے فلاں ہوٹل میں پچیس حسینائیں مصر سے آئی ہیں اور پچیس لبنان سے اور پچیس روس سے اور پچیس کشمیر سے تو اس کا نفس یہ چاہے گا کہ ان تمام سو کی تعداد سے اپنی حرام خواہش پوری کرے اور اگر پھر مزید کوئی بچی ہو اور اسے علم ہوجائے تو وہ اس کے لیے بے چین اور مضطرب رہے گا اور اس کا نفس هَلْ مِن مَّزِيْدٍ، هَلْ مِن مَّزِيْدٍ کرتا رہے گا اس لیے حضرت والا فرماتے ہیں کہ تم بھی اللہ کے قدم کو اپنے دل میں رکھ لو یعنی اللہ کے ذکر میں لگ جاؤ اللہ کی طرف متوجہ ہوجاؤ توبہ کے ذریعے سے اس کو دھولو تا کہ اس کی مزید مزید کی پکار ختم ہوجائے دوبارہ وہی گناہ کر کے اس کے تسلی دینے کی کوشش نہ کرو یہ شیطان کی طرف سے ایک چال ہے اور نفس کا ایک دھوکا ہے گناہ کی تلافی کبھی دوسرے گناہ سے اور دوسرے کی تیسرے سے ہرگز نہیں ہوسکتی یہ تو جرم بالائے جرم کرنا ہے اور آگ کی چنگاری کو شعلہ بنانا ہے تو بھلا بے چینی ختم ہونے کا کیا سوال پیدا ہوسکتا ہے۔

حضرت والا علی الاعلان فرماتے ہیں کہ اختر کا پوری زندگی کا تجربہ ہے کہ جو لوگ گناہوں کی دلدل سے نکل کر دین کی طرف آئے تو انہوں نے سکون کا سانس لیا اور خود انہوں نے یہ بتایا کہ ایسا لگتا تھا کہ ہم سخت آگ کی گرمی میں جھلس رہے تھے کہ اچانک ٹھنڈے سائے میں آگئے ہیں۔

قلب ونظر کی پاسبانی سے حصولِ نسبت بآسانی

نہیں برباد کرتا ہے وہ اپنے دیدہ و دل کو
ملی نسبت جسے قلب و نظر کی پاسبانی سے

نمک پاروں کو محض نہ دیکھنے سے اور قلب ونظر کی پاسبانی سے سالک کو کیا ملتا ہے اسے کون سی دولت ہاتھ آتی ہے؟ اس کے بارے میں ارشاد فرمایا جارہا ہے کہ قلب ونگاہ کی حفاظت سے نسبت مع اللہ حاصل ہوجاتی ہے جس کا خلاصہ دوامِ طاعات اور کثرتِ ذکر ہے۔

بعض نادان ان سب باتوں کو صوفیوں کی اور تصوف کی بات سمجھتے ہیں اور معمولی سمجھ کر ان سے صرف نظر کرتے ہیں اور وہ بزبان خود یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ نظر ڈال لینے سے کچھ نہیں ہوتا اور نامحرم عورتوں کو دیکھنے سے کوئی خاص ضرر اور نقصان نہیں ہے لیکن احقر قرآن سے یہ ثابت کرسکتا ہے کہ جو آدمی اپنی نظر بچائے گا تو اس کی برکت سے وہ جنت میں داخل ہوجائے گا تو کیا جنت میں داخل ہوجانا کوئی معمولی نعمت ہے۔

نظر بچانے سے جنت کا ملنا قرآن کریم سے ثابت ہوتا ہے، قرآن کریم کی آیات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نظر بچانا اتنا بڑا عمل ہے کہ انسان کو جنت میں پہنچا دیتا ہے۔ کیسے؟ ہمارا پالنے والا اللہ ہمارے بدن کے اعضاء و جوارح کے خواص کو جتنا جاننے والا ہے اتنا ہم خود نہیں جانتے کیوں کہ وہ پیدا کرنے والا ہے۔ اس نے قرآن میں اعلان فرمایا:

﴿قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ﴾

(سورة النور، اية: ۳۰)

ترجمہ: آپ مسلمان مردوں سے کہہ دیجئے کہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں (یعنی جس عضو کی طرف مطلقاً دیکھنا ناجائز ہے اس کو بالکل نہ دیکھیں اور جس کو فی نفسہٖ دیکھنا جائز ہے مگر شہوت سے جائز نہیں اس کو شہوت سے نہ دیکھیں) اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں (یعنی ناجائز محل میں شہوت رانی نہ کریں جس میں زنا اور لواطت سب داخل ہے) یہ ان کے لیے زیادہ صفائی کی بات ہے۔

اللہ تعالیٰ کے کلام میں جو ترتیب ہوتی ہے اسمیں بہت سی حکمتیں اور اسرار ورموز چھپے ہوتے ہیں تو پہلے نظر بچانے اور پھر ''حفظ فروج'' شرم گاہوں کو بچانے کی بات فرمائی، کیونکہ جب انسان نگاہ بچائے گا تو شرم گاہ بچے گی۔

آگے دیکھیں اللہ نے کیا فرمایا ذٰلِکَ اَزْکٰی لَھُمْ یہ تمہارے لیے قلب کی صفائی ستھرائی، نفس کے تزکیہ اور طہارت کا بہت بڑا ذریعہ ہے ازکیٰ اس سے بہت زیادہ تزکیہ حاصل ہوتا ہے۔

اورقرآن کی دوسری آیت ہے قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَکّٰھَا کامیاب ہوگئے وہ لوگ کہ جنھوں نے نفس کا تزکیہ کرلیا ادھر آیت سے ثابت ہوا کہ نگاہ بچانے سے شرمگاہ بچی، نگاہ اور شرمگاہ کے بچنے سے تزکیہ حاصل ہوا ادہر ثابت ہوا تزکیہ سے فلاح ملی۔ اور فلاح جن لوگوں کو ملے گی قرآن کریم میں ان کے بارے میں آیا:

﴿اَلَّذِیْنَ یَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ ھُمْ فِیْھَا خٰلِدُوْنَ﴾

(سورۃ المؤمنون، آیۃ: ۱۱)

ترجمہ: جولوگ جنت الفردوس کے وارث ہوں گے اور اُس میں ہمیشہ رہیں گے۔

قرآن پاک سے ثابت ہوتا ہے کہ نظر بچانا اتنا بڑا انعام ہے اور اتنی بڑی نعمت ہے جسکو حاصل ہوجائے۔ ان شاء اللہ نظر بچانے کی دولت سے نفس کو بڑی صفائی ستھرائی اور بڑی پاکیزگی حاصل ہوتی ہے اور بس جس کا نفس مزکیٰ مجلی ہوگیا تو قرآن کہتا ہے کہ وہ جنت میں چلا جائے گا جیسا کہ ایک دوسرے مقام پر ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَاُدْخِلَ الْجَنَّۃَ فَقَدْ فَازَ﴾

(سورۃ آل عمران، آیۃ: ۱۸۵)

ترجمہ: تو جو شخص دوزخ سے بچالیا گیا اور جنت میں داخل کیا گیا سو پورا کامیاب وہ ہوا۔

جس کو جہنم سے بچالیا گیا جنت میں داخل کردیا گیا فَقَدْ فَازَ بس وہ کامیاب ہوگیا تو کامیابی قرآن میں اس سے ثابت ہوئی اور کامیابیوں کا معنیٰ ہے کہ وہ جنت والے ہیں لہٰذا نظر بچانے سے جنت میں جانا ثابت ہوا اس لیے یہ معمولی اور ہلکی بات نہیں۔

اور یہ بات اور عرض کرتا چلوں جو میں نے اب تک عرض نہیں کی کہ نظر بچانا یہ بشرط شئی کے درجے میں مطلوب ہے یہ تین درجے ہوتے ہیں (۱) ایک کو کہتے ہیں بشرط شئی (۲) ایک کو کہتے ہیں بشرط لاشئی (۳) ایک کو کہتے ہیں لابشرط شئی ایک درجہ اطلاق وابہام ایک درجہ تجرید ایک درجہ تقیید (قید کرنا) مطلب کیا ہے؟ یعنی غض بصر کے حکم سے یہ مطلوب ہے کہ آپ بالقصد نظر کو نیچا کرکے چلیں یہ نہیں کہ بس ہم چل رہے ہیں اگر نظر پڑ گئی ''تو پڑ گئی'' نہیں تو نظر نیچی کرلی بلکہ مقصود یہ ہے کہ یَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِھِمْ نیچے ہی کرکے چلو! اطلاق اور ابہام کے درجے میں نہ چلو! بلکہ نیچے ہی کرکے چلنا ہے ادھر ادھر دیکھنا نہیں ہے حفاظت کا طریق یہی ہے اسی طرح حفاظت ہوتی ہے ورنہ حفاظت نہیں ہو پاتی بلکہ انسان کی نگاہیں اور دل دونوں برباد ہوتے ہیں کیونکہ جب وہ حرام کاریوں میں پڑکر غیر محرم کی طرف نظر ڈالتا ہے، ٹیلی ویژن، وی سی آر، انٹرنیٹ، فلمیں، میگزین اور روڈوں سڑکوں پہ چلنے والی سب نامحرم عورتوں یا حسین امردوں کو دیکھتا ہے تو پھر اس کا دل محفوظ نہیں رہتا ہے کیونکہ اگر آپ کو دارالسلامت کو بچانا ہو،

کیپٹل کو بچانا ہو راجدھانی کو بچانا ہو تو جو چاروں طرف سرحدیں اور بارڈرز ہیں ان کو بچایئے! ان پر مضبوطی کے ساتھ طاقتور فوج جا کھڑا کیجئے کہ کوئی دشمن ادھر سے نہ آجائے تو دوستو پھر راجدھانی کی بھی حفاظت رہے گی حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ فرماتے ہیں یہ جو نگاہیں ہیں ان کی مثال بالکل ایسی ہی ہے جیسا کہ بارڈر جب ان کے اندر سے کوئی چیز گزر کے آئے گی تو پھر آپ کہاں سے دل کو بچا پائیں گے۔

آپ نے اگر بارڈر کی حفاظت نہیں کی تو اب دل کی کہاں سے حفاظت ہوگی اور جسے نگاہوں اور دل کی حفاظت کے ذریعے سے نسبت مع اللہ کا خزانہ مل جاتا ہے وہ ایک لمحہ ایک سیکنڈ گوارا نہیں کرے گا کہ میں اپنے اللہ کو ناراض کروں اور ادھر ادھر اپنی نظریں ڈالوں اور اپنے اس خزانے کو گنوا دوں۔

عارف ہندی حضرت خواجہ صاحب کا شعر ؎

دین کا دیکھ ہے خطر
اٹھنے نہ پائے ہاں نظر
کوئے بتاں میں تو اگر
جائے تو سر جھکائے جا

بہ فیضِ ذکرِ حق وہ کیف ذاکر دل میں پاتا ہے
کہاں ممکن ہے پائے گا وہ فانی گلفشانی سے

یعنی اللہ تعالیٰ کے ذکر سے دل میں حقیقی سکون میسر آتا ہے اور ذاکر ہر گھڑی عجیب کیف و سرور میں رہتا ہے جو کہ اللہ تعالیٰ کی محبت و معرفت کی گلفشانی سے ہی حاصل ہوسکتا ہے فانی اور عارضی گلفشانی جو دنیا کی باغ و بہار میں ہوتی ہے اس سے دل کو وہ کیف و سرور نہیں مل سکتا جیسا کہ مختلف واقعات اس پر شاہد ہیں۔

سینۂ میں نور رہو تو منبر پر نور برستا ہے ورنہ نہیں

اگر دردِ محبت دل میں واعظ کے نہیں اختر
حقیقت پا نہیں سکتے ہو اس کی خوش بیانی سے

صرف الفاظ کو عمدہ اور شاندار اور خوب فصیح و بلیغ بنالینے سے دلوں کی کایا نہیں پلٹتی، بس کچھ وقتی طور پر واہ واہ ہوجاتی ہے لیکن زندگی میں انقلاب ان اہل اللہ اور ان رجال اللہ کے ذریعے آتا ہے جو نفوس قدسیہ لیے ہوئے اور ان کو مزکّٰی و مجلّٰی کرائے ہوئے ہوتے ہیں۔ فارسی کا مقولہ ہے ؎

از دل خیزد بر دل ریزد

جس بوتل میں خوشبو ہی نہ ہو تو اسے کھول کر اہل مجلس کو معطر نہیں کیا جا سکتا ہے اور جو چراغ خود روشن نہ ہو وہ دوسروں کو روشن نہیں کر سکتا اس پر حضرت والا کی کتاب آئینہ محبت کا یہ شعر ہے ؎

کیوں آہ میں کچھ تاثیر نہیں کیا عشق کا دل میں تیر نہیں

جب نور نہیں خود ہی دل میں منبر پہ وہ کیا برسائیں گے

اور جو لوگ اللہ کی معرفت و محبت کا چراغ اپنے سینے میں لیے ہوئے ہوں تو ان کا حال کچھ یوں ہوتا ہے ؎

جب شمعِ محبت دل میں لیے محفل میں ہو کوئی صاحبِ ضوء

پھر عشقِ خدا کے پروانے خود اڑ کے وہاں آجائیں گے

اس لیے اس میں ہم سب کے لیے نصیحت ہے کہ واعظ بننے کا شوق وجذبہ رکھنے کے ساتھ ساتھ اپنے وعظ میں تاثیر پیدا کرنے کے لیے اور اپنے سینے سے انوارات کی بارش اہل مجلس پر برسانے کے لیے خود اپنے قلب وجگر میں حق تعالیٰ کی شمع محبت جلائیں اور اس کے قرب کے پھولوں کی خوشبوؤں سے دل ودماغ کو معطر کریں پھر یہ نظر آئے گا کہ جس طرح شمع کی طرف پروانے اُڑے چلے آتے ہیں اسی طرح اللہ کی محبت کے پروانے ہماری طرف اُڑے آرہے ہیں۔

رضائے حق میں اپنی آرزو ہر وقت فانی ہو

کسی عاشق کی جب بھی داستاں اس کی زبانی ہو
تو اہلِ دل کے اشکوں سے نہ کیوں پھر قدر دانی ہو

اسے تقویٰ کا اور نسبت کا پھل ملنا یقینی ہے
کہ جس کے باغِ دل میں اہلِ دل سے باغبانی ہو

جو دردِ دل سے اور آہوں سے اور اشکوں سے منبر پر
کرے شرحِ محبت پھر نہ کیوں جادو بیانی ہو

ولایت اہلِ دل کی صحبتوں سے گو میسر ہے
مگر یہ شرط ہے قلب و نظر کی پاسبانی ہو

نہیں آساں ہے اسرارِ محبت کو بیاں کرنا
مگر واعظ کے دل کو بھی تو حاصل رازدانی ہو

ملا کرتا ہے دردِ دل بڑی خونِ تمنا سے
رضائے حق میں اپنی آرزو ہر وقت فانی ہو

فدا لیکن ہے اس ذرہ پہ ہفت اقلیم کی دولت
بصورت دردِ دل دل میں اگر دردِ نہانی ہو

ہزاروں غم اٹھائے جس نے ان کی راہ میں اخترؔ
نہ پھر کیوں دکھ بھری اے دوستو اس کی کہانی ہو

مشکل الفاظ کے معانی:۔ **عاشق**: اللہ تعالیٰ کا عاشق۔ **اشکوں**: آنسو۔ **نسبت**: اللہ تعالیٰ کا بندے سے اور بندے کا اللہ تعالیٰ سے خاص تعلق۔ **اہلِ دل**: اللہ والے۔ **شرحِ محبت**: اللہ تعالیٰ کی محبت کی باتیں۔ **جادو بیانی**: تقریر میں جادو جیسا اثر ہونا۔ **ولایت**: اللہ تعالیٰ کی دوستی۔ **میسر**: حاصل ہونا۔ **پاسبانی**: حفاظت۔ **اسرارِ محبت**: اللہ تعالیٰ کی محبت کے راز۔ **رازدانی**: راز سے واقف ہونا۔ **خونِ تمنّا**: ناجائز تمناؤں پر عمل نہ کرنا۔ **رضائے حق**: اللہ تعالیٰ کی خوشنودی۔ **ہفت اقلیم**: سات بادشاہتیں۔ **دردِ نہانی**: دل میں چھپا ہوا اللہ تعالیٰ کی محبت کا درد۔

اہلِ مجلس کی اشک باری سے داستانِ عاشق کی قدردانی

کسی عاشق کی جب بھی داستاں اپنی زبانی ہو
تو اہلِ دل کے اشکوں سے نہ کیوں پھر قدردانی ہو
جو دردِ دل سے اور آہوں سے اور اشکوں سے منبر پر
کرے شرحِ محبت پھر نہ کیوں جادو بیانی ہو

اللہ تعالیٰ کے راستے کا غم اٹھائے ہوئے سچا خدا کا عاشق جس پر بہت سے مجاہدات گزرے اور اس کو دین کے لیے قربانیاں دینی پڑیں مگر وہ اللہ کی محبت میں جما رہا دین کے تقاضوں پر قائم رہا تو اس کا دل اللہ کی محبت سے گھائل اور زخمی ہوتا ہے اور اس کی مثال ایسے مریض کی ہوتی ہے جو درد و تکلیف میں مبتلا ہوا اور اپنا اندرونی گزرنے والا حال کسی ڈاکٹر کے سامنے پیش کر رہا ہو تو اس کے بیان کی کیفیت کچھ الگ ہی ہوتی ہے اس لیے اہلِ محبت محبت کی ترجمانی کرتے ہیں اور اپنے دل کا حال کہتے ہیں اس لیے سامعین اشک باری کر کے اس عاشق کی داستان کی قدردانی کرتے ہیں اور اس کی گفتگو سے مجمع پر رقت طاری ہو جاتی ہے اور اپنے گناہوں پر ندامت کے جذبات دل میں ابھرنے لگتے ہیں اور یوں ان کی داستان سن کر یہ خود بھی اہلِ دل کی صفوں میں آ کھڑے ہوتے ہیں۔

باغِ دل میں باغبانی اور قلب و نظر کی پاسبانی سے حصولِ نسبت یقینی ہے

اسے تقویٰ کا اور نسبت کا پھل ملنا یقینی ہے
کہ جس کے باغِ دل میں اہلِ دل سے باغبانی ہو
ولایت اہلِ دل کی صحبتوں سے گو میسر ہے
مگر یہ شرط ہے قلب و نظر کی پاسبانی ہو

حکیم الامت تھانوی نور اللہ مرقدہ تحریر فرماتے ہیں کہ اللہ والوں سے اخلاص کے ساتھ تعلق رکھنے والا کبھی محروم نہیں رہتا بلکہ ایسے شخص کو جو صحیح شرائط کے ساتھ اہلِ دل سے وابستہ ہو یعنی صحیح احوال کی اطلاع اور پھر شیخ کی تعلیمات اور ہدایات کی پوری پوری اتباع مکمل اخلاص و اعتماد کے ساتھ اپنی تجویز کو فنا کر کے انقیاد و فرمانبرداری کی صورت میں پابندی کے ساتھ کرتا ہو تو وہ ضرور منزل تک پہنچ جاتا ہے اور اسے تقویٰ و نسبت مع اللہ کی دولت حاصل ہو جاتی ہے۔

اور اگر وہ کاملین میں سے نہ بنے تو تائبین میں تو شامل رہتا ہے اور اس کے نتیجے میں کل قیامت کے دن جب کاملین پر اللہ کا فضل ہوگا تو اس تعلق کی برکت سے یہ بھی محروم نہیں رہے گا۔ چنانچہ حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے

یہ حدیث شریف نقل فرمائی ہے:

﴿عَنْ أَبِیْ ذَرٍّ أَنَّهُ قَالَ یَا رَسُوْلَ اللهِ الرَّجُلُ یُحِبُّ الْقَوْمَ وَلَا یَسْتَطِیْعُ أَنْ یَعْمَلَ كَعَمَلِهِمْ قَالَ أَنْتَ یَا أَبَا ذَرٍّ مَعَ مَنْ أَحْبَبْتَ﴾

(سنن ابی داؤد، کتاب الادب، باب اخبار الرجل الرجل بمحبته ایاہ)

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ایک شخص کسی جماعت سے محبت رکھتا ہے اوران کے برابر عمل وعبادت نہیں کرسکتا آپ نے فرمایا اے ابوذر تم اسی کے ساتھ ہوگے جس سے محبت رکھتے ہوگے اور ترمذی میں صفوان بن عسال کی روایت سے یہ الفاظ ہیں کہ آدمی اسی کے ساتھ ہوگا جس سے محبت رکھتا ہوگا۔ (التکشف، صفحہ:۳۲۸)

صاحبو! کیا اللہ والوں سے محبت اور تعلق رکھنے اوران کی صحبت وخدمت میں رہنے کا یہ کوئی کم فائدہ ہے کہ باوجود اپنے کوتاہ عمل ہونے کے قیامت کے دن اللہ کے فضل وکرم کے سائے میں ان کے ساتھ ان سے محبت رکھنے والے بھی اٹھائے جائیں گے۔

بس اتنی بات ضروری ہے کہ یہ تعلق محض اللہ کے لیے ہونا چاہیے یعنی اس تعلق کی بنیاد اللہ تعالیٰ کی رضا ہو کوئی غرض دنیوی نہ ہو جیسے مثلاً شہرت کا ملنا یا اپنا نام چمکانا یا بزرگوں کے پاس آنے والے مال داروں سے اپنے تعلقات اور دوستیاں بڑھانا یا کوئی اور دوسری قسم کا مادی نفع پیش نظر نہ ہو تب ہی یہ فائدہ حاصل ہوگا یہاں تک کہ بعض روایات میں یہ آیا ہے کہ جو اللہ کے لیے آپس میں محبت رکھے ان میں سے ایک مشرق میں رہنے والا ہو اور دوسرا مغرب میں رہنے والا ہو تو جَمَعَ اللهُ بَیْنَهُمَا یَوْمَ الْقِیَامَةِ کہ اللہ ان کو قیامت کے دن اکھٹا کردے گا۔

میرے دوستو! ہمارے باغ دل میں اہلِ دل سے باغبانی کی صورت جب ہی ہوسکتی ہے کہ ہم ان کی تعلیمات وہدایات پر عمل پیرا ہوں اور اپنی رائے کو بیچ میں داخل نہ کریں مزاج میں خودرائی نہ ہو ورنہ ساری زندگی بھی اگر کوئی شخص اہلِ دل اولیاء کے پاس رہتا رہے اور اپنی رائے پر چلتا رہے تو اسے کوئی ترقی نہیں ہوتی اور اس کے حال دل میں کوئی تغیر نہیں آتا جیسا کہ خانقاہوں میں اللہ والوں کے پاس بہت سے رہنے والے عمر بھر رہ کر بھی وصول الی اللہ کی منزل نہیں پاتے اور اس پر تعجب کیا جب کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس مبارک میں آنے والے منافقین اخلاص واتباع کے فقدان کی وجہ سے تاعمر محروم رہے اور ان کی شقاوت سعادت میں تبدیل نہیں ہوئی اس لیے اس صحبت وخدمت کے صحیح نافع ہونے کے لیے ان شرائط کا ہونا لازمی ہے اخلاص واعتماد واطلاع واتباع۔ رہ گیا قلب ونظر کی پاسبانی اور ان کی حفاظت کا مضمون تو یہ عنقریب اوپر کے صفحات میں بھی گزر چکا اور مختلف دوسرے مواقع پر اسی کتاب میں تفصیل سے مذکور ہے۔

اور یہ ہمارے حضرت والا کی زندگی کا خاص مضمون ہے اور دین کے بہت سے شعبوں میں سے منکرات سے روک ٹوک کو حضرت نے اپنا خاص زندگی کا مشن بنایا اور اس میں بھی خاص طور پر عشقِ مجازی اور حسن پرستی کے خلاف زیادہ تر تقریریں اور بیانات فرمائے جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے احقر کے دل میں ایک خاص بات ڈالی جو یہاں قارئین کے نفع کے لئے سپردِ قلم کررہا ہوں اور حضرت والا کے سامنے اس کو سنا کر تصویب و تائید کے بعد یہ قدم اٹھا رہا ہوں اور وہ یہ کہ روایات سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ شیطان نے انسان کو بہکانے کے لیے جو مختلف چیزیں اس کو ڈھیل دیے جانے کے بعد اس کے سامنے پیش کی گئی ان تمام چیزوں میں سے عورتوں کو انسان پر ڈالنے والے اپنے جال کے طور پر پسند کیا تھا جیسا کہ الفاظ حدیث ہیں:

﴿النِّسَاءُ حَبَائِلُ الشَّيْطَانِ﴾

(مشکوۃ المصابیح، کتاب الرقاق، ص: ۳۴۳)

کہ عورتیں شیطان کے جال ہیں اور دوسری طرف نظر کے متعلق ارشادِ نبوی ہے:

﴿اِنَّ النَّظَرَ سَهْمٌ مِنْ سِهَامِ اِبْلِيْسَ مَسْمُوْمٌ﴾

(کنز العمال)

بے شک یہ نظر ابلیس کے زہریلے تیروں میں سے ایک تیر ہے۔

اب اس پس منظر میں احقر عرض کرتا ہے کہ حضرت والا کی زندگی بھر کی کوششوں کا ہدف اور نشانہ بالکل شیطان کی چالوں اور مکاریوں اور اس کے جالوں اور شرارتوں سے مسلمانوں کو بچانے کے لیے سب سے مضبوط اور سخت ہے، اور گویا جو دشمن کا اصل ہدف اور نشانہ ہے جس سے وہ بہ سہولت مسلمانوں کو دین سے دور کر دیتا ہے وہ یہی مضمون ہے جس کے خلاف حضرت کی زندگی کی ساری کوششوں کا رخ ہے، ٹی وی، وی سی آر، انٹرنیٹ، ٹیلی ویژن، فلمیں، اور دوسری عریانیت اور بے حیائی کی شکلوں والے ماہنامے اور جریدوں اور میگزینوں اور رسالوں وغیرہ سے مسلمانوں کو بچا کر ان کے قلب و نگاہ کی حفاظت کا اہم کام انجام دینا یہ شیطان کو اس کے اصل منصوبے میں ناکام کرنا ہے اس لیے اس اعتبار سے دین کی اس محنت کا کرنا ڈائریکٹ اپنے دشمن شیطان سے مقابلہ کرنا ہے اور اپنے بھائیوں کو اس کی سازش اور مکر سے بچانا ہے تو اس لیے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ان شاء اللہ یہ محنت اللہ کی بارگاہ میں بہت زیادہ مقبول اور باعث اجر و ثواب ہوگی۔

فواحش، بدکاری، زنا اور اس کے مقدمات دنیا کی اُن مہلک بُرائیوں میں سے ہے جن کے مہلک اثرات صرف اشخاص و افراد کو نہیں بلکہ قبائل اور خاندانوں کو اور بعض اوقات بڑے بڑے ملکوں کو تباہ کر دیتے ہیں۔ اس وقت دنیا میں جتنے قتل و غارت گری کے واقعات پائے جاتے ہیں اگر صحیح تحقیق کی جائے تو اکثر واقعات کے پس منظر میں کوئی عورت اور شہوانی جذبات کا جال نظر آئے گا۔ یہی وجہ ہے کہ جب سے دنیا پیدا ہوئی ہے اس میں کوئی

قوم، کوئی مذہب، کوئی خطہ ایسا نہیں جو اس کی بُرائی اور مہلک عیب ہونے پر متفق نہ ہو۔ دنیا کے اس آخری دور میں یورپین اقوام نے اپنی مذہبی حدود اور قدیم وقومی روایات سب کو توڑ کر اگرچہ زنا کو اپنی ذات میں کوئی جرم ہی نہیں رکھا، تمدّن ومعاشرت کو ایسے سانچوں میں ڈھال دیا ہے جن میں ہر قدم پر جنسی انارکی اور فواحش کو دعوتِ عام ہے، مگر ان کے ثمرات ونتائج کو وہ بھی جرائم سے خارج نہ کر سکے۔ عصمت فروشی، زنا بالجبر، منظرِ عام پر فحش حرکات کو تعزیری جرم قرار دینا پڑا، جس کی مثال اس کے کچھ نہیں کہ کوئی شخص آگ لگانے کے لیے سوختہ کا ذخیرہ جمع کرے، پھر اس پر تیل چھڑکے، پھر اس میں آگ لگائے اور جب اس کے شعلے بھڑکنے لگیں تو ان شعلوں پر پابندی لگانے اور روکنے کی فکر کرے۔

ہنڈیا پکانے کے لیے اس کے نیچے آگ جلائے، پھر اس کے اُبال اور جوش کو روکنا چاہے۔ اس کے خلاف اسلام نے جن چیزوں کو جرائم اور انسانیت کے لیے مضر قرار دے کر قابلِ سزا جرم کہا ہے، ان کے مقدمات پر بھی پابندیاں عائد کیں اور ان کو ممنوع قرار دیا ہے۔ اس معاملے میں مقصودِ اصلی زنا اور بدکاری سے بچانا تھا تو اس کو نظر نیچی رکھنے کے قانون سے شروع کیا۔ عورتوں مردوں کے بے محابا اختلاط کو روکا، عورتوں کو گھروں کی چار دیواری میں محدود رکھنے کی ہدایت کی اور ضرورت کے وقت باہر نکلنے کے لیے بھی برقع یا لمبی چادر سے پورا بدن چھپا کر نکلنے اور سڑک کے کنارے چلنے کی ہدایت کی، خوشبو لگا کر یا بجنے والا زیور پہن کر نکلنے کی ممانعت کی، پھر جو شخص ان سب حدود وقیود اور پابندیوں کے حصار کو پھاند کر باہر نکل جائے اس پر ایسی سخت عبرت آموز سزا جاری کی کہ ایک مرتبہ کسی بدکردار پر جاری کر دی جائے تو پوری قوم کو مکمل سبق مل جائے۔

(معارف القرآن، جلد: ۷، صفحہ: ۲۰۴)

اسرارِ محبت کا بیان محبت کے بعد ہی ممکن ہے

نہیں آساں ہے اسرارِ محبت کو بیاں کرنا
مگر واعظ کے دل کو بھی تو حاصل رازدانی ہو

مختلف روایات میں یہ مضمون آیا ہے کہ جب بندہ تمام گناہوں سے بچ کر اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری کرتا رہتا ہے تو اسے اللہ تعالیٰ خاص علوم اور اسرار ومعرفت کا خزانہ دل میں عطا فرما دیتے ہیں جیسا کہ اس روایت سے معلوم ہوتا ہے:

﴿مَنْ أَخْلَصَ لِلّٰهِ أَرْبَعِيْنَ صَبَاحًا ظَهَرَتْ يَنَابِيْعُ الْحِكْمَةِ مِنْ قَلْبِهٖ عَلٰى لِسَانِهٖ﴾

(مسند الشهاب القضاعي)

جس آدمی نے چالیس دن (چلہ) اللہ تعالیٰ کی اخلاص کے ساتھ عبادت کی اور تمام گناہوں سے بچتا رہا تو اللہ تعالیٰ اس کے دل سے حکمت کے سرچشمے اس کی زبان کے ذریعہ ظاہر فرما دیتے ہیں۔

اکثر بزرگوں سے چلہ نشینی کا اہتمام منقول ہے۔ یہ حدیث اُس کی اصل ہے۔ بزرگوں کے کلام میں منصوص ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بعض خاص بندوں کو بعض علوم وہ عطا ہوتے ہیں جو نہ منقول ہیں نہ مکتسب ہیں، کبھی اُس کو علم وہبی سے تعبیر کرتے ہیں، کبھی علمِ اسرار کہتے ہیں اور خود اُن سے اس قسم کے دقائق وحقائق منقول بھی ہیں جو اُن سے پہلے کسی کی زبان سے نہیں نکلے۔ یہ حدیث ایسے علوم کی تحقیق اور اعتبار کی اصل ہے۔ (التکشف :صفحہ ۳۹۹)

ایک روایت میں یوں ارشاد فرمایا:

﴿مَنْ عَمِلَ بِمَا عَلِمَ وَرَّثَهُ اللّٰهُ عِلْمَ مَا لَمْ يَعْلَمْ﴾

(مرقاۃ المفاتیح، کتاب الدعوات، باب جامع الدعاء)

یعنی جو آدمی اپنے علم پر عمل کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ پھر اسے بہت سا ایسا علم خاص اپنے پاس سے عطا فرماتے ہیں جو اسے اپنی محنت اور کسب سے حاصل نہیں تھا ایسے ہی علم کو علم لدنی کہتے ہیں۔

مثال کے طور پر ہم یہاں مجلس میں بیٹھے ہوئے ہیں اور روزانہ آتے جاتے ہیں تو اگر ہم التزام اور پابندی کے ساتھ معمول بنالیں کہ جو بھی علم حاصل ہوگا اور جن گناہوں کے بارے میں معلومات ہوتی رہے گی اس پر عمل کرتے رہیں گے اور ہر گناہ کو پوری ہمت وطاقت کے ساتھ چھوڑ ڈالیں گے تو پھر اللہ تعالیٰ قلب کو اپنے اسرار محبت عطا فرمادیتے ہیں جب ایسا عالم منبر پر بیٹھتا ہے تو پھر وہ اسرار محبت سامعین کے سامنے بھی پیش کرتا ہے لیکن جب خود واعظ کے دل کو اسرارِ الٰہیہ کی راز دانی حاصل نہ ہو تو پھر وہ دوسروں کے سامنے کیسے بیان کرسکتا ہے جو بعض لوگ بزرگوں کی نقل کرنا چاہتے ہیں اور اپنے بیانات میں ویسی تاثیر نہ ہونے اور ان علوم کے عطا نہ ہونے پر کڑھتے اور بے چین رہتے ہیں ان کے لیے شعر میں یہ سبق ہے کہ اگر تم اسرار محبت کو بیان کرنا چاہتے ہو تو خود پہلے حامل درد محبت ہو جاؤ اور راز دان اسرارِ الٰہیہ بن جاؤ۔

ملا کرتا ہے دردِ دل بڑی خونِ تمنا سے
رضائے حق میں اپنی آرزو ہر وقت فانی ہو

یعنی ہر قدم پر، زندگی کے ہر سانس میں اللہ تعالیٰ کے حکم کی خلاف ورزی نہ ہونے پائے اگرچہ اپنی آرزو اور تمنا اس کے خلاف ہو اور اس کام کے کرنے کو خوب جی چاہ رہا ہو مگر اپنی تمنا کا خون کردینا چاہیے تو پھر دردِ دل نصیب ہوتا ہے چاہے طبیعت پر کتنا ہی زور پڑے مگر اللہ کو ہر صورت میں راضی رکھے۔

ذرۂ دردِ دل ہفت اقلیم سے بڑھ کر ہے

فدا لیکن ہے اس ذرہ پہ ہفت اقلیم کی دولت
بصورت دردِ دل دل میں اگر دردِ نہانی ہو

ہفت اقلیم کی دولت اگر کسی کو حاصل ہو لیکن اس کے دل میں اللہ تعالیٰ کی کامل اور راسخ محبت نہ ہو تو یہ سمجھو کہ اس کو جو کچھ حاصل ہے وہ سب باہر باہر کا ہے اس کا اندر خالی ہے جس کو ایک مثال سے اس طرح سمجھئے جو حضرت والا نے معارف مثنوی میں پیش فرمائی۔

اس وقت جبکہ قلعہ کے اندر کوئی چشمہ نہ ہو اور اہل قلعہ صرف بیرونی نہروں سے پانی حاصل کرتے ہوں اور اچانک دشمن کی فوج باہر سے نہروں کو بند کردے۔ تو اہل قلعہ کی زندگی کے لیے اسی قلعہ کے اندر ایک کھارا چشمہ باہر کے سیکڑوں دریائے جیحون سے بہتر ہوگا اسی طرح زندگی میں حواس خمسہ کے ذریعہ انسان عیش حاصل کررہا ہے اور موت آنکھ، کان، ناک، زبان اور جلد (باصرہ سامعہ، شامہ، ذائقہ، لامسہ) کے ذریعے باطن میں درآمد ہونے والی لذتوں کے راستوں کو کاٹ دیتی ہے اور جو یہ حواس ہیں وہ دنیا کی لذتوں کو محسوس کرنے سے عاجز اور معطل ہوجاتے ہیں۔

قضا کے سامنے بیکار ہوتے ہیں حواس اکبر
کھلی ہوتی ہیں گو آنکھیں مگر بینا نہیں ہوتیں

اب مردہ کی زبان شامی کباب کے لطف سے معطل ہے اس کی آنکھیں بچوں کو دیکھنے سے عاجز ہیں، کان ریڈیو کے نغمات نہیں سن سکتے زبان بے زبان ہورہی ہے کیا بے کسی کا عالم ہے اس وقت اگر روح میں تعلق مع اللہ کا کوئی کھارا چشمہ بھی ہوتا یعنی ناقص طاعات کا ضعیف نور بھی ہوتا تو یہ لذات فانیہ کے ان سینکڑوں دریائے شیریں سے جو بذریعہ حواس خمسہ اندر داخل ہورہے تھے بہتر ہوتا اور اس بے کسی کے وقت روح کو اس سے انس وسکون حاصل ہوتا حق تعالیٰ اپنی رحمت سے سب مسلمانوں کو چندروزہ بہار زندگی کے دھوکہ سے محفوظ فرماویں اور آخرت کی باقی ودائمی اور غیر فانی نعمتیں اور اعمال صالحہ کی توفیق عطا فرماویں، آمین۔

عاشقِ صادق کی کہانی دُکھ بھری کیوں نہ ہو؟

ہزاروں غم اٹھائے جس نے ان کی راہ میں اخترؔ
نہ پھر کیوں دکھ بھری اے دوستو اس کی کہانی ہو

احقر تشریح کے طور پر عرض کررہا ہے کہ ہمارے حضرت والا دامت برکاتہم نے ان حسین اور حسیناؤں سے نظروں کی حفاظت کے سلسلے میں تو بہت زیادہ غم اُٹھائے ہیں اور اس راہ کے مجاہدوں سے گزرے ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ حضرت میر صاحب دامت برکاتہم نے ایک روز حضرت والا کے حالاتِ زندگی ذکر کرتے ہوئے یہ

بات ارشاد فرمائی کہ تقریباً سولہ سال تک حضرت کے پیچھے ایسے حاسدین لگے رہے جو طرح طرح سے آپ کے طعنے دیتے تھے اور حضرت کی طرف سے حضرت کے شیخ شاہ عبدالغنی پھولپوری رحمہ اللہ کو بدظن کرنے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ جس کے نتیجے میں حضرت والا کو بہت زیادہ غم اور صدمہ پہنچتا تھا، یہی ایذائے خلق کا غم جو حضرت نے بہت زیادہ اُٹھایا ہے اور یہ حضرت والا کے کلام میں مختلف مواقع پر بہت صاف جھلکتا نظر آتا ہے۔ اور بالکل واضح طور پر محسوس ہوتا ہے کہ حضرت والا کے مجاہدات میں ایذائے خلق کا غم بھی بہت زیادہ شامل ہے۔ اور اس طرح کے معاملات اپنے اللہ کے سامنے پیش کرنا بُرا نہیں ہے۔ ہاں! لوگوں سے جا کے بتانا اور اُن کے سامنے فریادیں کرنا اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں۔ جیسا کہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام اپنا اس طرح کا کوئی بھی حال بارگاہِ خداوندی میں پیش کیا کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت یعقوب علیہ السلام کو جب اُن کے دوسرے بیٹوں نے طعنہ دیا کہ آپ یوسف کے بارے میں اتنے فکرمند اور پریشان کیوں ہوتے ہیں؟ آپ بالکل گھلے جا رہے ہیں۔ تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے یہ ارشاد فرمایا: ''اِنَّمَا اَشْكُوْا بَثِّيْ وَحُزْنِيْ اِلَى اللّٰهِ'' کہ میں اپنے رنج و غم کی شکایت اور اُس کا اظہار و فریاد اپنے رب سے کر رہا ہوں اور مجھے اپنے رب کی طرف سے اُن باتوں کا علم ہے جن کو تم نہیں جانتے ہو۔ اس لیے میں اپنا رنج و غم تمہیں نہیں سناتا بلکہ اپنے اللہ کو سناتا ہوں۔ جیسا کہ جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی دعاؤں میں اس طرح کے جملے منقول ہیں جن سے اس مضمون کی وضاحت اور اچھی طرح سے ہو جاتی ہے۔ ''مناجاتِ مقبول'' میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں میں ایک دعا بھی یہ شامل ہے:

﴿اَللّٰهُمَّ اِلَيْكَ اَشْكُوْ ضُعْفَ قُوَّتِيْ وَقِلَّةَ حِيْلَتِيْ وَهَوَانِيْ عَلَى النَّاسِ يَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ اِلٰى مَنْ تَكِلُنِيْ اِلٰى عَدُوٍّ يَّتَهَجَّمُنِيْ اَمْ اِلٰى قَرِيْبٍ مَلَّكْتَهٗ اَمْرِيْ اِنْ لَّمْ تَكُنْ سَاخِطًا عَلَيَّ فَلَآ اُبَالِيْ غَيْرَ اَنَّ عَافِيَتَكَ اَوْسَعُ لِيْ﴾

(مناجات مقبول، ص ۳۹، مکتبۃ العلم، لاہور پاکستان)

یا اللہ! تجھی سے شکایت کرتا ہوں اپنے ضعفِ القویٰ ہونے کی اور لوگوں کی نظروں میں کم وقعتی کی، اے ارحم الراحمین کس کے سپرد کرتا ہے تو مجھے آیا کسی دشمن کے کہ سینہ زوری کرے مجھ سے یا کسی عزیز کے قبضے میں دے دے تو اس کے میرے سب کام اگر تو غصہ نہ ہو تو مجھ کو اس کی کچھ پرواہ تو نہیں مگر پھر بھی تیرے امن میں مجھ کو زیادہ گنجائش ہے۔

گویا جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں یہ راہ دکھلائی کہ ہمارا رب جس حال میں رکھے ہم کو اُس پر راضی رہنا چاہیے لیکن اللہ تعالیٰ سے اللہ کی عافیت اور امن ہی کی درخواست کرنی چاہیے اور ہم بندے بحیثیت بندے ہونے کے اسی کے مکلف ہیں کہ اللہ سے عافیت مانگیں۔ بس اگر اُس کے بعد غیر اختیاری طور پر کوئی تکلیف اور پریشانی لاحق ہو جائے یا ایذائے مخلوق کا سامنا کرنا پڑ جائے اور یا اہلِ خاندان، رشتہ داروں، بھائیوں بہنوں اور اہل و عیال کی طرف سے کوئی ناگوار بات پیش آ جائے تو اُس کو منجانب اللہ سمجھ کر اپنی خیر و مصلحت کا تصور کرتے ہوئے برداشت کرنا چاہیے، کیونکہ اس کے برداشت کرنے اور ان غموں کو اُٹھانے میں اللہ تعالیٰ کا قربِ خاص عطا

ہوتا ہے۔ جس کی جانب حضرت والا شعر میں اشارا فرما رہے ہیں اور اسلام کی تعلیم بھی یہی ہے کہ دوسروں کو معاف کرتے ہوئے اپنے حقوق کو درگزر کرنے کے ساتھ زندگی گزارو جس کے بدلے میں اللہ تعالیٰ ہمیں عزت اور رفعت عطا فرماتے ہیں۔ چنانچہ حدیث شریف میں اس طرح سے آیا:

﴿مَا نَقَصَتْ صَدَقَةٌ مِنْ مَّالٍ وَمَا زَادَ اللهُ عَبْدًا بِعَفْوٍ إِلَّا عِزًّا وَمَا تَوَاضَعَ أَحَدٌ لِلّٰهِ إِلَّا رَفَعَهُ اللهُ﴾

(صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ والآداب، باب استحباب العفو والتواضع)

کہ صدقہ کی وجہ سے کبھی بھی مال میں کمی نہیں آتی اور اللہ تبارک وتعالیٰ بندے کو معاف کرنے سے عزت و رفعت میں ہی اضافہ فرماتے ہیں اور جو بھی اللہ کے لیے تواضع اختیار کرے اُس کو حق تعالیٰ سربلندی عطا فرماتے ہیں۔

البتہ یہ ذہن میں رہنا چاہیے کہ تواضع وہی اللہ کی بارگاہ میں معتبر ہے جو حقیقت پر مبنی ہو اور دل سے ہو ورنہ آج کل عام طور پر تواضع کے جملے بولتے ہیں اور ظاہر میں یوں کہتے ہیں کہ میں کچھ نہیں ہوں، اور میری آپ کے سامنے کوئی حیثیت نہیں، اور میں تو معمولی درجے کا آدمی ہوں، لیکن اگر کوئی شخص ٹھیک اسی وقت میں کوئی ایسی ناگوار بات کہہ دے جو بظاہر اُن کی شان کے مناسب نہ ہو تو فوراً جوش میں آکر چہرے کا نقشہ اور رنگ بدل جاتا ہے اور زبان سے ناشائستہ الفاظ نکلنا شروع ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ اگر حقیقت میں تواضع ہوتی تو پھر اس کی شان میں گستاخی کرنے والے سے یوں کہتے کہ جناب! آپ ہی صحیح کہہ رہے ہیں اور جو کچھ میں صورتاً دِکھ رہا ہوں یہ تو اللہ تعالیٰ کی ستاری اور پردہ پوشی ہے ورنہ میرے اندر تو بے شمار عیوب اور نقائص بھرے ہوئے ہیں۔ اور خود تم نے بھی جو کہا ہے میں تو اس سے بھی گیا گزرا ہوں۔

یہی حقیقت میں تواضع کہلاتی ہے اور ہر مؤمن کا وصف لازم بھی یہی ہے کیونکہ جب تک ایمان پر خاتمہ نہ ہو تو اپنی کوئی بھی حیثیت ذہن کے اندر مقرر کر لینا یہ دھوکہ اور جہالت پر مبنی ہے۔ کسی نے تبلیغ یا خانقاہ میں کتنے ہی چلّے لگا لیے ہوں اور کیسے ہی دین پر زندگی گزر رہی ہو اور رات و دن عبادات میں اُس کے اوقات خرچ ہو رہے لیکن جب تک یہ حقیقت دل میں موجود نہ ہو تو وہ شخص متواضع نہیں کہلاتا۔ جیسا کہ ایک مرتبہ حضرت مولانا یوسف لدھیانوی رحمہ اللہ کو کسی نے آکر کچھ بُرا بھلا کہا۔ تو مولانا نے جواب میں یہ ارشاد فرمایا کہ میں قسم کھا کے کہتا ہوں جتنا بُرا تم نے مجھے کہا ہے میں تو اُس سے بھی زیادہ اپنے کو گیا گزرا خیال کرتا ہوں۔

اسی لیے دوستو! مخالفتیں اور ایذاءِ خلق مانگنی تو نہیں چاہیے لیکن جب آئیں تو سمجھو کہ اس میں اللہ نے ہماری کوئی نہ کوئی خیر چھپا کر رکھی ہے بس ہم اللہ پر نظر رکھیں اور جو طریقہ اسلام نے دیا ہے اکرام کا اس پر مضبوطی سے قائم رہیں کہ ان کا حق ادا کرتے رہیں اپنا حق بھلاتے رہیں، اپنے فرائض بھول جائیں ان کے حقوق یاد رکھیں۔ بہت میٹھا اور بہت شاندار طریقہ ہے، جس کی برکت سے ساری تلخیاں مٹھاس میں بدل جاتی ہیں۔ خلق کے حقوق ادا کرتے رہیں اپنے حقوق خلق سے بھول کر خالق کی طرف نظر رکھیں اور اپنے فرائض یاد رکھیں تو ان شاء اللہ

سب شیر وشکر بن کے رہیں گے۔ ساری چیزیں کچھ دنوں کی ہوتی ہیں، بعد میں اللہ تعالیٰ سب کو تابع کر دیتے ہیں اور ایسے بندوں کو اپنی جانب سے خصوصی عزت وعظمت عطا فرماتے ہیں۔

گرم بازاری عشق

اشکہائے خون سے جب چشم تر کرتا ہوں میں
عشق کا بازار دل میں گرم تر کرتا ہوں میں

جب بتان حسن سے صرف نظر کرتا ہوں میں
درد کی لذت سے راہ عشق سر کرتا ہوں میں

کر کے خونِ آرزو خونِ جگر کرتا ہوں میں
اپنی آہوں کا اثر یوں تیز تر کرتا ہوں میں

ہر قدم پر تاکہ حاصل ہو حیات نو مجھے
ہر قدم پر زیر خنجر اپنا سر کرتا ہوں میں

مشکل الفاظ کے معانی:۔ اشکہائے **خون**: خون کے آنسو۔ **چشم تر**: آنکھوں کا گیلا ہونا۔ **بتان**: بت کی جمع یعنی تمام نامحرم۔ **صرفِ نظر**: نظر بچانا۔ **راہِ عشق**: اللہ تعالیٰ کی محبت کا راستہ۔ **حیات نو**: نئی زندگی۔

اشکہائے خون سے گرم بازاری عشق

اشکہائے خون سے جب چشم تر کرتا ہوں میں
عشق کا بازار دل میں گرم تر کرتا ہوں میں

جب اللہ تعالیٰ کے لیے بندہ گناہوں سے بچنے کا غم دل پر اٹھاتا ہے بے شک اسے دل میں بڑا غم اور صدمہ ہوتا ہے کیونکہ اس نے اپنی آرزوؤں کا خون کیا ہوتا ہے تو پھر دل میں اللہ تعالیٰ اپنا عجیب محبت کا درد عطا فرماتے ہیں اور بہت ہی خصوصی محبت خداوندی اور عشق کی دولت میسر ہوتی ہے اور پھر آنکھوں سے جو آنسو نکلتے ہیں بلا شبہ وہ اشکہائے خون کہلانے کے قابل ہوتے ہیں کیونکہ وہ حسرتوں کا خون کر کے دل کے ٹوٹنے کے نتیجے میں آنکھوں سے جاری ہوتے ہیں جیسا کہ مختلف مقامات پر اشعار کے تحت یہ مضمون گزر چکا۔

خونِ آرزو سے خونِ جگر کر کے شجرِ محبت کا پھل دار ہونا

جب بتانِ حسن سے صرف نظر کرتا ہوں میں
درد کی لذت سے راہِ عشق سر کرتا ہوں میں
کر کے خونِ آرزو خونِ جگر کرتا ہوں میں
اپنی آہوں کا اثر یوں تیز تر کرتا ہوں میں

یہ مضمون بھی اس روایت سے ماخوذ ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ جب آدمی اپنی نظر کو بچاتا ہے تو دل میں ایمان کی حلاوت پاتا ہے اسی کو حضرت والا نے درد کی لذت سے تعبیر کیا ہے جس کے نتیجے میں راہِ عشق خداوندی بڑی تیزی کے ساتھ طے ہو جاتی ہے۔

اور اگلے شعر کا خلاصہ اور نچوڑ بھی یہی ہے کہ اپنی آرزوؤں اور امیدوں کا خون کر کے قلب و جگر کے ٹکڑے کر ڈالتا ہوں جس کی بدولت دل میں عشق کی آگ بھڑک جاتی ہے جو کہ آہ و فغاں کی شکل میں پھر ظاہر ہوتی ہے جتنا درجے کسی نے اپنے قلب وجگر کا خون کیا ہوا تنا اس کی آہوں کا اثر تیز سے تیز تر ہو جاتا ہے۔

ان اشعار میں حضرت والا کا یہ پیغام ہے کہ گناہ کی لذتوں کو چھوڑ دو! چاہے جتنا طبیعت پر زور پڑے اب بہت سے مسلمانوں کے گھروں میں یہ معمول ہے کہ عشاء کے بعد کھانا کھایا اور سارے خاندان والے کرسیوں اور صوفوں کے اوپر ٹی وی دیکھنے بیٹھے ہیں اور مختلف چینل چلا رکھے ہیں اور اس میں بیٹھے ہوئے پتہ نہیں کیسے کیسے غلط سلط پروگراموں کو دیکھ رہے ہیں، پھر صورت حال کچھ یوں ہوتی ہے کہ ان سب حاضرین میں سے یکے بعد دیگرے اُٹھ کر اپنے سلیپنگ روم میں جا کے سو جاتے ہیں، پھر اخیر میں دورہ جاتے ہیں، وہ کون ہوتے ہیں؟ کبھی بھائی اور بہن کبھی بھابی اور دیور اور بالآخر شیطان اپنے قبیح ارادوں اور عزائم میں کامیابی اختیار کر لیتا ہے، جاؤ جا کے دارالافتاء میں مفتی صاحب سے پوچھو تو وہ آپ کو بتائیں گے کہ آج کل ایسے استفتا بھی بکثرت آرہے ہیں کہ بھائی بہن سے ملوث ہو گیا یا اہل اللہ کے پاس جا کر ان سے حالات کا پتہ لگایئے کیونکہ ان کو سب سے زیادہ حالات کا پتہ ہوتا ہے۔ اس لیے کہ جو حقائق اور واقعات ہیں وہ کبھی بذریعہ خطوط اور کبھی بذریعہ فون اور انٹرنیٹ آئے دن ان کے سامنے طالبینِ اصلاح کی طرف سے آتے رہتے ہیں۔

کچھ لوگ یوں سوچتے ہیں کہ یہ علماء اور مفتی حضرات تو ایک کمرے میں مدرسے کی چہار دیواری میں رہتے ہیں، ان کو دنیا کا کیا پتہ؟...... اس لیے یہ تو بس تقریر کرتے ہیں ان کو حالات کا پتہ نہیں ہے حالانکہ اہل اللہ سب سے زیادہ حالات جانتے ہیں، کیونکہ جب لوگ ان کے پاس دعائیں کرانے آتے ہیں یا مسائل پوچھنے آتے ہیں تو جن حالات سے وہ گزر رہے ہوتے ہیں وہ ان کے سامنے بیان کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔

میرے دوستو! ان کے پاس روزانہ دنیا بھر سے کتنے خطوط آتے ہیں ان میں سارے احوال لکھے جاتے ہیں، ایک قصہ نہیں، دو قصے نہیں، اٹھا کر دیکھئے! روزانہ کتنے قصے پیش آتے ہیں، اس لیے ان گناہوں اور حرام لذتوں کو چھوڑنا اپنی اصلاح کے لیے لازم اور ضروری ہے جب تک انسان انہیں نہیں چھوڑے گا ایمان کی تکمیل نہیں ہوتی اور تب تک اس کو ایمان کی حلاوت اور مٹھاس نصیب نہیں ہوتی اسی لیے اہل اللہ سے محبت کیجاتی ہے اور ان کی صحبت اختیار کی جاتی ہے تاکہ گناہوں کا چھوڑنا آسان ہو جائے۔

صحبتِ اہل اللہ کے چند اہم فوائد

﴿عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ أَنَّ رَجُلاً قَالَ يَا رَسُوْلَ اللهِ أَسْأَلُكَ عَنْ عَلَامَةِ اللهِ فِيْمَنْ يُرِيْدُ وَعَلَامَتِهِ فِيْمَنْ لَا يُرِيْدُ فَقَالَ لَهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَيْفَ أَصْبَحْتَ قَالَ أَصْبَحْتُ أُحِبُّ الْخَيْرَ وَأَهْلَهُ وَمَنْ يَعْمَلُ بِهِ وَإِنْ عَمِلْتُ بِهِ أَيْقَنْتُ بِثَوَابِهِ فَإِنْ فَاتَنِيْ مِنْهُ شَيْءٌ حَنَنْتُ إِلَيْهِ قَالَ هٰذِهِ عَلَامَةُ اللهِ فِيْمَنْ يُرِيْدُ وَعَلَامَتُهُ فِيْمَنْ لَا يُرِيْدُ وَلَوْ أَرَادَكَ بِالْأُخْرٰى هَيَّأَكَ لَهَا ثُمَّ لَمْ يُبَالِ فِيْ أَيِّ وَادٍ هَلَكْتَ﴾

(کنز العمال و التکشف، ص ۴۰۲)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے عرض کیا: ''یارسول اللہ! مجھے کچھ ایسی نشانی بتائیے جس سے میں اندازہ لگاؤں کہ وہ کون لوگ ہیں جنہیں اللہ چاہتے ہیں اور وہ کون ہیں جنہیں اللہ نہیں چاہتے۔'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس شخص سے یہ سوال کیا: ''بتاؤ! تم نے کس حال میں صبح کیا؟'' اس شخص نے عرض کیا: ''یارسول اللہ! میں نے اس حال میں صبح کی کہ میں خیر اور اہل خیر کو پسند کرتا ہوں اور اُن لوگوں کو جو اس پر عمل کرتے ہیں۔ یعنی دیندار اور نیک لوگوں کو اور اگر میں اس خیر پر عمل کروں تو مجھے اس کے ثواب کا یقین دل میں رہتا ہے۔ اور اگر وہ مجھ سے چھوٹ جائے تو میں اُس کے کرنے کا شوق رکھتا ہوں۔ ارشاد فرمایا: ''یہی اللہ کی علامت ہے اُن لوگوں کے بارے میں جن کو اللہ چاہتے ہیں اور اُن لوگوں کے بارے میں یہی نشانی ہے جن کو اللہ نہیں چاہتے اور اگر اللہ تعالیٰ تیرے ساتھ خیر کے علاوہ دوسرا کچھ چاہتے تو تجھے اس کے لیے مہیا اور تیار کردیتے اور پھر اللہ تعالیٰ پرواہ نہ کرتے کہ تم کون سی وادی میں ہلاک ہو چکے ہو۔''

اس حدیثِ پاک سے یہ بات معلوم ہوئی کہ دل میں خیر کی تمنا رکھنا اور اہلِ خیر کو محبوب رکھنا یہ اللہ تعالیٰ کے یہاں مقبولیت کی نشانی ہے۔ یہی بات حضرت تھانوی نے تحریر فرمائی ہے کہ اس حدیث میں مقبولیت کی علامت صراحتاً مذکور ہے اور فرمایا کہ علامتِ مقبولیت حدیث میں منصوص ہے۔ (التکشف، صفحہ:۴۰۲)

اور اہل اللہ سے محبت پر خود حلاوت ایمان کا وعدہ ہے، جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

﴿عَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثَلَاثٌ مَنْ كُنَّ فِيْهِ وَجَدَ حَلَاوَةَ الْإِيْمَانِ أَنْ يَكُوْنَ اللهُ وَرَسُوْلُهُ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِمَّا سِوَاهُمَا وَأَنْ يُحِبَّ الْمَرْءَ لَا يُحِبُّهُ إِلَّا لِلّٰهِ وَأَنْ يَكْرَهَ أَنْ يَعُوْدَ فِي الْكُفْرِ كَمَا يَكْرَهُ أَنْ يُقْذَفَ فِي النَّارِ﴾

(فتح الباری لابن حجر، کتاب الاکراہ، باب من اختار الضرب و القتل الهوان علی الکفر)

یعنی تین باتیں ایسی ہیں جس میں وہ ہوں گی، ان تین باتوں کی وجہ سے وہ ایمان کی حلاوت کو پالے گا ان میں سے ایک بات تو یہ ہے کہ اللہ اور اُس کا رسول اُس کو ان دونوں کے ماسواء ہر شے سے زیادہ محبوب ہو جائے، اور دوسری یہ کہ وہ کسی بھی انسان سے محض اللہ کے لیے محبت کرنے والا ہو اور تیسری یہ کہ کفر میں لوٹنا اسے اتنا ناگوار ہو کہ جتنا آگ میں اور جہنم میں ڈال دیا جانا اس کو ناگوار ہوتا ہے۔

الحمد للہ! یہاں خانقاہ میں جتنے بیٹھے ہیں ہم سب کے لیے یہی گمان رکھتے ہیں کہ یہ سب اللہ کے لیے محبت والے بیٹھے ہیں اسی لیے میں تو اپنے ذہن میں یہ سوچتا ہوں! اور زبان سے کہتا بھی ہوں کہ یہ سارا عشاق خدا تعالیٰ کا مجمع ہے، اللہ کے عاشقوں اور اللہ تعالیٰ کے چاہنے والے لوگوں کا مجمع ہے اور اگر ایک دوسری روایت کی روشنی میں دیکھیں تو معلوم ہو جائے گا کہ یہ اللہ کے محبوبین کا بھی مجمع ہے۔ موطا امام مالک کی روایت ہے:

﴿وَجَبَتْ مَحَبَّتِيْ لِلْمُتَحَابِّيْنَ فِيَّ وَ الْمُتَجَالِسِيْنَ فِيَّ وَ الْمُتَزَاوِرِيْنَ فِيَّ وَ الْمُتَبَاذِلِيْنَ فِيَّ﴾

(مؤطا مالک، کتاب الجامع، باب ما جاء فی المتحابین فی، ص: ۷۴۳)

میری محبت واجب ہوگئی ایسے لوگوں کے لیے جو میرے لیے آپس میں محبت رکھتے ہیں اور میری رضا کے لیے ایک دوسرے کے پاس اٹھتے بیٹھتے ہیں اور میری رضا کے لیے ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں اور زیارت کرتے ہیں اور میرے لیے ایک دوسرے پر خرچ کرتے ہیں۔ یہاں خانقاہ میں ساری باتیں ہیں تو یہ حدیث کیا بتا رہی ہے؟ کہ جو لوگ اس محبت کو لیے ہوئے یہاں پر بیٹھے ہیں وہ محبوبینِ حق تعالیٰ بن گئے، خود اللہ تعالیٰ نے اعلان کر دیا ضرور بضرور وہ میرے محبوبین ہیں اور اس روایت سے پتہ چلا کہ ان کو ایمان کی حلاوت ملے گی جو اللہ کے لیے محبت رکھتے ہوں اور ملا علی قاری رحمہ اللہ نے یہ بات نقل کی ہے:

﴿وَقَدْ وَرَدَ اَنَّ حَلَاوَةَ الْاِيْمَانِ اِذَا دَخَلَتْ قَلْبًا لَا تَخْرُجُ مِنْهُ اَبَدًا فَفِيْهِ اِشَارَةٌ اِلٰى بِشَارَةِ حُسْنِ الْخَاتِمَةِ﴾

(مرقاۃ المفاتیح، کتاب الایمان، ج: ۱، ص: ۱۰۰)

اور یہ بھی الگ سے مضمون وارد ہوا ہے کہ جب حلاوتِ ایمانی کسی دل کو ملتی ہے تو پھر اس سے کبھی بھی نکلتی نہیں جب کبھی نہیں نکلتی تو وہ زندگی کی گھڑی بھی اس گھڑی میں سے ہے جس میں ہماری موت آئے گی، ان شاء اللہ تعالیٰ اس حلاوت کو لیے ہوئے ہم سب دنیا سے جائیں گے۔

اور پھر ملا علی قاری آگے فرماتے ہیں فَفِيْهِ اِشَارَةٌ اِلٰى بَشَارَةِ حُسْنِ الْخَاتِمَةِ اس میں اشارہ ہے کہ

اس انسان کا خاتمہ اچھا ہوگا تو اللہ والوں کی صحبت کا ایک بڑا انعام یہ ملا کہ انسان کا خاتمہ ایمان کے اوپر ہو رہا ہے اسی لیے ایمان پر خاتمے کے سات مدلل نسخے جو حضرت نے بیان فرمائے ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے۔

شکوک وشبہات کی بنیاد حقائق سے لاعلمی ہے

آج لوگ شکوک وشبہات میں پڑے رہتے ہیں کہ اللہ والوں سے ملنے میں اپنے آپ کو کونے میں ڈال دینا ہے اور کوئی کہتا ہے کہ یہ پیری مریدی کیا چیز ہے ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔ ہمیں اس میں یہ اشکال ہے اور وہ اشکال ہے؟ مجھے تو اس میں یہ اشکال اور وہ اشکال ہے۔ میں اللہ تعالیٰ کی توفیق پر بھروسہ کر کے اور حضرت والا کی دعاؤں کی برکت سے یہ عرض کرتا ہوں آپ آئیں! تشریف لائیں اور اپنے اشکالات پیش کریں اگر ہم نے یہ ثابت نہ کر دیا کہ اس خانقاہ والے تصوف کا ایک ایک مسئلہ قرآن وسنت سے ثابت ہے تو آپ خانقاہ چھوڑ کر چلے جائیے گا اور ہم بھی آپ کے ساتھ تائب ہو جائیں گے، اور اگر ثابت کر دیا گیا تو پھر آپ کو ہر لحاظ سے تسلیم کرنا پڑے گا عملاً، قولاً، اعتقاداً۔

یاد رکھنا! حضرت مجدد تھانوی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ اگر ابن قیم اور ابن تیمیہ بھی آج ہوتے تو وہ میرے تصوف کو مانتے۔ حضرت مولانا منظور نعمانی رحمہ اللہ کی ایک کتاب ہے تصوف کیا ہے؟ اگر کچھ طلبہ یہاں بیٹھے ہوئے ہوں تو ان سے عرض کرتا ہوں کہ ذرا اس کتاب کا مطالعہ کر کے دیکھیں۔ اس کتاب میں حضرت مولانا نعمانی رحمہ اللہ نے ابن قیم اور ابن تیمیہ کے بہت سارے ارشادات نقل کیے ہیں جن کو پڑھ کر یہ اندازہ ہو جائے گا کہ جس تصوف کا ان بزرگوں نے انکار کیا ہے وہ کونسا تصوف ہے؟ وہ والا تصوف ہے جو فلاسفہ، زنادقہ، مبتدعہ کا تصوف ہے جو جاہلانہ و زندیقانہ عقائد کا مجموعہ ہے وہ درحقیقت اس کے منکر ہوئے ہیں لیکن جس تصوف کا خلاصہ اتباع شریعت وسنت ہو جو کہ ان تمام مشائخ اہل حق کی خانقاہ میں ہے، یاد رکھیے! اسکا کوئی کسی زمانے میں آج تک منکر نہیں ہوا ہے۔

اسی لیے حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے صاف فرمایا کہ جو کچھ سنت وشریعت کے خلاف ہو ہم اس کو تصوف نہیں سمجھتے اور اس سے اللہ کا وصول انسان کو نصیب نہیں ہو سکتا ہے، بہرحال یہ باتیں ضمناً آگئیں تو حضرت کا جو مضمون ہے وہ یہ ہے کہ اپنی آرزوئیں اور تمناؤں کا خون کرو! خون کرنے کے نتیجے میں قلب میں ایک عجیب حلاوت ہوگی اللہ تعالیٰ اس دل کو اپنی خاص تجلیات کے ساتھ تعمیر کرتے ہیں اور خود اللہ تعالیٰ اس دل کے اندر تشریف لاتے ہیں، اس لیے پھر اس دل کی لذت کا کیا عالم ہوگا؟ اس لیے حضرت نے فرمایا کہ درد کی لذت سے راہِ عشق سر کرتا ہوں میں۔

صاحبو! احقر ایک مثال کے ذریعے سے لذت دردِ محبت اور لطفِ خونِ آرزو پیش کرتا ہے جس سے ہم سب کو واسطہ پڑتا رہتا ہے اور وہ یہ کہ ایک تو وہ حج وعمرہ ہے جو آپ نے نگاہ بچا کر کیا ہو آپ دیکھیں گے کہ رات کو آپ کو رونا بھی آئے گا، دعاؤں میں بھی مزہ آئے گا، طواف میں بھی ایک عجیب لطف آئے گا۔ اس کے برخلاف

دوسرے وہ لوگ ہیں کہ جو طواف بھی کر رہے ہیں تو ادھر ادھر غیر محرموں کو دیکھ رہے ہیں تو ایسے لوگ دل سے بے چین اور پریشان ہو جائیں گے اور دل دل میں یہ کہیں گے کہ میں اتنی عبادات کر رہا ہوں پھر بھی مجھے سکون کیوں نہیں نصیب ہو رہا ہے؟

مصائب کی بنیادی وجہ معاصی کا پھیلاؤ ہے

میرے دوستو! آج امت کا بنیادی مسئلہ یہی ہے کہ سورۂ یٰس پڑھی جا رہی ہے اشراق واوابین بھی پڑھی جا رہی ہے اور صبح وشام میں مختلف ختمات اجتماعی اور انفرادی طور پر ہو رہے ہیں اور تسبیحات صبح وشام بھی پڑھی جا رہی ہیں اور معمولات وظائف کی بھی پابندی ہو رہی ہے۔

لیکن دوسری طرف گناہوں اور خدا کی نافرمانیوں کی صورت حال یہ ہے کہ وہی شخص سورۂ یٰس اور اشراق پڑھنے کے بعد آفس میں جا کر نامحرم عورتوں اور جوان لڑکیوں کے ساتھ بلا تکلف ہنسی مذاق اور دل لگی میں بھی دن بھر مصروف ہے اور ان کے ساتھ خلوتوں اور تنہائیوں میں ملاقات کرنے کو بھی معیوب نہیں سمجھا جا رہا ہے صبح سے شام تک ان کے ساتھ ہنسی مذاق کرنا عام معمول زندگی بن گیا ہے جس کا ایک خراب نتیجہ ہماری نگاہوں کے سامنے یہ ہے کہ معاشرے میں طلاق کی تعداد بہت ہوگئی ہے۔

اور ایسا کیوں نہ ہو جب ہم صبح سے شام تک جا کر عورتوں سے دل لگی کرتے ہیں اور ہماری عورت گھر سے نکل کر آفس میں جا کر دوسرے غیر محرموں کے ساتھ دن بھر خدا کی نافرمانی کر کے ان سے بے تکلف گفتگو اور ہنسی مذاق میں گزارتی ہے تو ہم نے خود سکون کا کونسا سامان اپنے گھر میں چھوڑا ہے؟ ایک طرف تو ہم اپنے دل اور نگاہ کو ناپاک کر رہے ہیں دوسری طرف ہماری بیوی، تو جب ہم شام کو گھر میں اکھٹے ہوں گے تو لڑائی نہیں ہوگی تو کیا ہوگا؟ اختلاف نہیں ہوگا تو کیا ہوگا؟

میرے عزیزو! دوستو! لوگ آج اختلاف کے مسئلے کو لیکر بہت پریشان ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ گھر میں بالکل چین نہیں ہے گھر گھر جھگڑا ہے کوئی سکون نہیں۔ بات دراصل یہ ہے جب کسی درخت کی شاخیں خشک ہونے لگیں تو شاخوں کو تر کرنے کی فکر نہ کیجئے بلکہ دیکھئے! اس درخت کی شاخیں خشک کیوں ہو رہی ہیں؟ ظاہر ہے کہ اس کے خشک ہونے کی وجہ یہ ہے کہ درخت کی جڑ میں پانی نہیں ہے۔ تو اس درخت کو سرسبز وشاداب رکھنے کے لیے اس کی جڑ کو پانی دیجئے تب خود بہ خود شاخیں ہری بھری ہو جائینگی اور وہ درخت پھول وپھل دے سکے گا۔

اس لیے یہ جو اختلاف اور جھگڑے ہو رہے ہیں ...... ان کے اسباب اور وجوہ پر غور کیجئے کہ کیا ہیں؟ میرے گھر میں کون کون سے گناہ ہیں؟ کہیں تصویریں تو نہیں ہیں؟ بے پردگی تو نہیں ہے؟ ٹی وی، وی سی آر وغیرہ تو گھر میں نہیں ہے؟

ایک اچھے دین دار شخص نے ہماری دعوت کی اور وہ بزرگان دین کی دعوت کرتے ہی رہتے ہیں، احقر جیسے ہی کمرے میں جا کے بیٹھا تو میں نے دیکھا کہ مختلف قسم کی تصوریریں ہی تصویریں طاقوں میں بجی رکھی ہیں اور دیواروں پر لٹکی ہیں۔ میں نے ان سے کہا بھائی یہ کیا ہے؟ تو انہوں نے فوراً وہ تصوریں ہٹادیں پھر اتفاق سے دوسری مرتبہ میں گیا تو ایک چھوٹے سے فریم کے اندر اپنے بچے کی تصویر کرا کر رکھے ہوئے تھے پھر احقر نے ان کو سمجھایا اور ان سے یہ عرض کیا کہ یہ بھی تصویر ہے اس کو بھی ہٹادو اور لوگ یوں کہتے ہیں کہ ہمارے گھر میں چین وسکون نہیں۔

ملفوظ شاہ ہردوئی رحمہ اللہ

حضرت شاہ ہردوئی رحمہ اللہ نے عجیب بات ارشاد فرمائی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کا ٹرک ہمارے گھروں پر سامنے راستے میں کھڑا ہوا ہے اور اندر داخل ہونا چاہتا ہے مگر معاصی اور نافرمانیوں کا ٹرک راستہ روکے ہوئے ہے جو اسے اندر آنے نہیں دے رہا ہے' بالکل گھر میں اندر گناہوں سے بھرا ہوا ٹرک لدا کھڑا ہے۔ وہ راستہ نہیں دیتا ہے ورنہ اللہ کی رحمت کے خزانے ہم پر برسنے کے لیے تیار ہیں۔ اس لیے یہ کہنا غلط نہیں کہ یہ سب کچھ ہمارا اپنا کیا ہوا ہے اور اس کے ذمہ دار ہم خود ہیں۔

صاحبو! یہ گھروں کے جھگڑے اور آپس کی رنجشیں اور اختلافات اور ذہنی الجھنیں اور دماغی پریشانیاں محض کوئی اتفاقی معاملات نہیں ہیں بلکہ یہ درحقیقت ہماری بداعمالیوں کی سزا ہے اس لیے جب ایسے حالات کا سامنا ہو تو فوراً توبہ کرنی چاہیے اور غور کرنا چاہیے! اور اپنے اعمال کا فوری جائزہ لے کر اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع ہونا چاہیے تو ان شاء اللہ یہ حالات قائم نہیں رہ سکتے۔

اس کا عذاب ہونا قرآن کریم میں یوں مذکور ہے:

﴿قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلَىٰ أَنْ يَبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ أَوْ مِنْ تَحْتِ أَرْجُلِكُمْ أَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَيُذِيقَ بَعْضَكُمْ بَأْسَ بَعْضٍ﴾

(سورۃ الانعام، آیۃ ۶۵)

ترجمہ: آپ صلی اللہ علیہ وسلم (یہ بھی) کہئے کہ (جس طرح وہ نجات دینے پر قادر ہے اسی طرح) اس پر بھی وہی قادر ہے کہ تم پر (تمہارے کفر وشرک کی وجہ سے) کوئی عذاب تمہارے اوپر سے بھیج دے (جیسے پتھر یا ہوا یا بارش طوفانی) یا تمہارے پاؤں تلے (جو زمین ہے اس) سے (ظاہر کردے، جیسے زلزلہ یا غرق ہو جانا اور ان عذابوں کے اسباب قریبہ تو اللہ کے سوا کسی کے اختیار میں نہیں، کبھی نہ کبھی ایسا ہوگا خواہ دنیا میں یا آخرت میں) یا کہ تم کو (اغراض کے اختلاف سے مختلف) گروہ گروہ کر کے سب کو (آپس میں) بھڑادے (یعنی لڑوادے) اور تمہارے ایک کو دوسرے کی لڑائی (کے ذریعہ مزہ) چکھادے۔

عذابِ الٰہی کی تین قسمیں

یہاں عذابِ الٰہی کی تین قسموں کا ذکر ہے۔ایک جو اوپر سے آئے، دوسرے جو نیچے سے آئے، تیسرے جو اپنے اندر سے پھوٹ پڑے۔ پھر لفظ عَذَابًا کو اس جگہ تنوین کے ساتھ نکرہ لا کر عربی قواعد کے اعتبار سے اس پر متنبہ کر دیا کہ ان تینوں قسموں میں بھی مختلف قسمیں اور صورتیں ہوسکتی ہیں۔

مفسرین نے فرمایا کہ اوپر سے عذاب آنے کی مثالیں پچھلی اُمتوں میں بہت سی گذر چکی ہیں، جیسے قومِ نوح علیہ السلام پر بارش کا سخت سیلاب آیا اور قومِ عاد پر ہوا کا طوفان مسلّط ہوا، اور قومِ لوط علیہ السلام پر اوپر سے پتھر برسائے گئے، بنی اسرائیل پر خون اور مینڈک وغیرہ برسائے گئے، اصحابِ فیل نے جب مکہ پر چڑھائی کی تو پرندوں کے ذریعہ اُن پر ایسی کنکریں برسائی گئیں جن سے وہ سب کے سب کھائے ہوئے بھوسہ کی طرح ہو کر رہ گئے۔

اسی طرح نیچے سے آنے والے عذاب کی بھی پچھلی قوموں میں مختلف صورتیں گذر چکی ہیں۔قومِ نوح علیہ السلام پر تو اوپر کا عذاب طوفان، بارش کے ساتھ اور نیچے کا عذاب زمین کا پانی اُبلنا شروع ہوگیا۔غرض اوپر اور نیچے کے دونوں عذاب میں بیک وقت گرفتار ہوگئے، اور قومِ فرعون پاؤں تلے کے عذاب میں غرق کی گئی، قارون بھی مع اپنے خزانوں کے اسی عذاب میں گرفتار ہوا اور زمین کے اندر دھنس گیا۔

اور حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما اور مجاہد رحمہ اللہ وغیرہ ائمۂ تفسیر نے فرمایا کہ اوپر کے عذاب سے مراد ہے کہ ظالم بادشاہ اور بے رحم حکام مسلّط ہو جاویں، اور نیچے کے عذاب سے مراد یہ ہے کہ اپنے نوکر، غلام اور خدمت گار یا ماتحت ملازم بے وفا، غدّار، کام چور، خائن جمع ہو جاویں۔

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چند ارشادات سے بھی حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کی اس تفسیر کی تائید ہوتی ہے۔ مشکوٰۃ شریف میں بحوالۂ شعب الایمان بیہقی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد منقول ہے: ''کَمَا تَکُوْنُوْنَ یُؤَمَّرُ عَلَیْکُمْ''، یعنی جیسے تمہارے اعمال بھلے یا بُرے ہوں گے ویسے ہی حکام اور امراء تم پر مسلّط کیے جائیں گے، اگر تم نیک اور اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار ہوگے تو تمہارے حکام وامراء بھی رحم دل، انصاف پسند ہوں گے، اور تم بدعمل ہوگے تو تم پر حکام بھی بے رحم اور ظالم مسلّط کر دیئے جائیں گے۔ مشہور مقولہ **اَعْمَالُکُمْ عُمَّالُکُمْ** کا یہی مفہوم ہے۔

اور مشکوٰۃ میں بحوالۂ حلیہ ابی نعیم روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہے کہ میں اللہ ہوں، میرے سوا کوئی معبود نہیں، میں سب بادشاہوں کا ملک اور بادشاہ ہوں، سب بادشاہوں کے قلب میرے ہاتھ میں ہیں، جب میرے بندے میری اطاعت کرتے ہیں تو میں ان کے بادشاہوں اور حکام کے قلوب میں ان کی شفقت ورحمت ڈال دیتا ہوں اور جب میرے بندے میری نافرمانی کرتے ہیں تو میں ان کے

حکام کے دل اُن پر سخت کر دیتا ہوں، وہ ان کو ہر طرح کا بُرا عذاب چکھاتے ہیں، اس لیے تم حکام اور امراء کو بُرا کہنے میں اپنے اوقات ضائع نہ کرو، بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع اور اپنے عمل کی اصلاح کی فکر میں لگ جاؤ تاکہ تمہارے سب کاموں کو درست کر دوں۔

اسی طرح ابوداؤد، نسائی میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ کسی امیر اور حاکم کا بھلا چاہتے ہیں تو اس کو اچھا وزیر اور اچھا نائب دے دیتے ہیں کہ اگر امیر سے کچھ بھول جائے تو وہ اس کو یاد دلا دے اور جب امیر صحیح کام کرے تو وہ اس کی مدد کرے، اور جب کسی حاکم و امیر کے لیے کوئی بُرائی مقدر ہوتی ہے تو بُرے آدمیوں کو اس کے وزراء اور ماتحت بنا دیا جاتا ہے۔

ان روایات اور آیتِ مذکورہ کی متذکرہ تفسیر کا حاصل یہ ہے کہ انسان کو جو تکالیف اور مصائب اپنے حکام کے ہاتھوں پہنچتے ہیں وہ اوپر سے آنے والے عذاب ہے، اور جو اپنے ماتحتوں اور ملازموں کے ذریعہ پہنچتے ہیں وہ نیچے سے آنے والا عذاب ہے، یہ سب کوئی اتفاقی حادثہ نہیں ہوتے، بلکہ ایک قانونِ الٰہی کے تابع انسان کے اعمال کی سزا ہوتے ہیں۔ حضرت سفیان ثوری رحمہ اللہ نے فرمایا کہ جب مجھ سے کوئی گناہ سرزد ہو جاتا ہے تو میں اس کا اثر اپنے نوکر اور اپنی سواری کے گھوڑے اور باربرداری کے گدھے کے مزاج میں محسوس کرنے لگتا ہوں کہ یہ سب میری نافرمانی کرنے لگتے ہیں۔ مولانا رومی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ ؎

خلق را با تو چنیں بدخو کنند
تاترا ناچار رو آنسو کنند

یعنی اللہ تعالیٰ دنیا میں تمہارے بالادست حکام یا ماتحت ملازموں کے ذریعہ تمہارے خلافِ مزاج، تکلیف دہ معاملات کا ظاہری عذاب تم پر مسلّط کر کے درحقیقت تمہارا رُخ اپنی طرف پھیرنا چاہتے ہیں تاکہ تم ہوشیار ہو جاؤ اور اپنے اعمال کو درست کر کے آخرت کے عذابِ اکبر سے بچ جاؤ۔

خلاصہ یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی تفسیر کے مطابق حکام کا ظلم و جور اوپر سے آنے والا عذاب ہے، اور ماتحت ملازموں کی بے ایمانی، کام چوری، غدّاری، نیچے سے آنے والا عذاب ہے، اور دونوں کا علاج ایک ہی ہے کہ سب اپنے اپنے اعمال کا جائزہ لیں اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور بے راہ روی سے باز آجائیں تو قدرت خود ایسے حالات پیدا کر دے گی کہ یہ مصیبت رفع ہو، ورنہ صرف مادّی تدبیروں کے ذریعہ ان کی اصلاح کی اُمید اپنے نفس کو دھوکہ دینے کے سوا کچھ نہیں، جس کا تجربہ ہر وقت ہو رہا ہے ؎

خویش را دیدیم و رسوائیِ خویش
امتحانِ ما مکن اے شاہ بیش

اوپر اور نیچے کے عذاب کی جو مختلف تفسیریں آپ نے ابھی سنی ہیں درحقیقت ان میں کوئی اختلاف نہیں کیونکہ لفظ عَذَابًا جو اس آیت میں آیا ہے درحقیقت ان تمام تفسیروں پر حاوی ہے۔ آسمان سے برسنے والے پتھر، خون، آگ اور پانی کا سیلاب اور بالادست حکام کا ظلم و جور یہ سب اوپر سے آنے والے عذاب میں داخل ہیں، اور زمین شق ہو کر کسی قوم کا اس میں دھنس جانا یا پانی زمین سے اُبل کر غرق ہو جانا، یا ماتحت ملازموں کے ہاتھوں مصیبت میں مبتلا ہو جانا یہ سب نیچے سے آنے والے عذاب ہیں۔

تیسری قسم عذاب کی جو اس آیت میں ذکر کی گئی ہے وہ یہ ہے اَوْ یَلْبِسَکُمْ شِیَعًا، یعنی تمہاری مختلف پارٹیاں بن کر آپس میں بھڑ جائیں، اور باہم ایک دوسرے کے لیے عذاب بن جائیں۔

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جا رہے تھے۔ ہمارا گذر مسجد بنی معاویہ پر ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف لے گئے اور دو رکعت نماز پڑھی، ہم نے بھی دو رکعت ادا کی۔ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم دعاء میں مشغول ہو گئے اور بہت دیر تک دعاء کرتے رہے۔ اس کے بعد ارشاد فرمایا کہ میں نے اپنے رب سے تین چیزوں کا سوال کیا۔ ایک یہ کہ یہ میری اُمت کو غرق کر کے ہلاک نہ کیا جائے، اللہ تعالیٰ نے یہ دعاء قبول فرمائی۔ دوسری یہ کہ میری اُمت کو قحط اور بھوک کے ذریعہ ہلاک نہ کیا جائے، یہ بھی قبول فرمالی۔ تیسری دعاء یہ کی کہ میری اُمت آپس کے جنگ وجدل سے تباہ نہ ہو، مجھے اس دعاء سے روک دیا گیا۔ (مظہری بحوالۂ بغوی)

اسی مضمون کی ایک حدیث حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے منقول ہے، جس میں تین دعاؤں میں سے ایک دعاء یہ ہے کہ میری اُمت پر کسی دُشمن کو مسلّط نہ فرمادے جو سب کو تباہ و برباد کر دے، یہ دعاء قبول ہوئی اور آپس میں نہ بھڑ جائیں اس دعاء کو منع کر دیا گیا۔

ان روایات سے ثابت ہوا کہ اُمتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام پر اُس قسم کے عذاب تو نہ آئیں گے جیسے پچھلی اُمتوں پر آسمان یا زمین سے آئے جس سے اُن کی پوری قوم تباہ و برباد ہو گئی، لیکن ایک عذاب دنیا میں اس اُمت پر بھی آتا رہے گا، وہ عذاب آپس کی جنگ وجدل اور فرقوں اور پارٹیوں کا باہم تصادم ہے۔ اس لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُمت کو فرقوں اور پارٹیوں میں منقسم ہو کر باہمی آویزش اور جنگ وجدل سے منع کرنے میں انتہائی تاکید سے کام لیا ہے۔ اور ہر موقع پر اس سے ڈرایا ہے کہ تم پر خدا تعالیٰ کا عذاب اس دنیا میں اگر آئے گا تو آپس ہی کی جنگ وجدل کے ذریعہ آئے گا۔

سورۂ ہود کی ایک آیت میں یہ مضمون اور بھی زیادہ وضاحت سے آیا ہے: "وَلَایَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِیْنَ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّکَ"، "یعنی لوگ ہمیشہ آپس میں اختلاف ہی کرتے رہیں گے بجز ان لوگوں کے جن پر اللہ تعالیٰ

نے رحمت فرمائی۔''

اس سے واضح ہوا کہ جو لوگ آپس میں (بلا وجہ شرعی) اختلاف کرتے ہیں وہ رحمتِ خداوندی سے محروم یا بعید ہیں۔

ایک آیت میں ارشاد ہے کہ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا، دوسری آیت میں ارشاد ہے کہ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا ان تمام آیات و روایات کا حاصل یہ ہے کہ اختلاف بڑی منحوس اور مذموم چیز ہے۔ آج دینی اور دنیوی ہر حیثیت سے مسلمانوں کی پستی اور بربادی کے اسباب پر غور کیا جائے تو اکثر مصائب کا سبب یہی آپس کا اختلاف اور تشتت نظر آئے گا۔ ہماری بداعمالیوں کے نتیجہ میں یہ عذاب ہم پر مسلّط ہو گیا کہ وہ قوم جس کا مرکز اتحاد ایک کلمہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ تھا، اس کلمہ کو ماننے والا زمین کے کسی خطّہ میں ہو، کسی زبان کا بولنے والا ہو، کسی رنگ کا ہو، کسی نسل و نسب سے متعلق ہو سب بھائی بھائی تھے۔ کوہ و دریا کی دشوار گذار منازل ان کی وحدت میں حائل نہ تھیں، نسب و خاندان، رنگ و زبان کا تفاوت ان کی راہ میں رکاوٹ نہ تھا، ان کی قومی وحدت صرف اس کلمہ سے وابستہ تھی۔ عربی، مصری، شامی، ترکی، ہندی، چینی کی تقسیمیں صرف شناخت اور تعارف کے لیے تھیں اور کچھ نہیں۔ بقول اقبال مرحوم ؎

درویشِ خدا مست نہ شرقی ہے نہ غربی
گھر اُس کا نہ دلّی نہ صفاہان نہ سمرقند

آج دوسری قوموں کی دسیسہ کاریوں اور مسلسل کوششوں نے پھر ان کو نسلی اور لسانی اور وطنی قومیتوں میں بانٹ دیا، اور پھر ان میں سے بھی ہر ایک قوم و جماعت اپنے اندر بھی تشتت اور انتشار کا شکار ہو کر مختلف پارٹیوں میں بٹ گئی۔ وہ قوم جس کا شعار غیروں سے بھی عفو و درگذر اور ایثار تھا اور جھگڑے سے بچنے کے لیے اپنے بڑے سے بڑے حق کو چھوڑ دیتی تھی، آج اس کے بہت سے افراد ذرا ذرا سی حقیر و ذلیل خواہشات کے پیچھے بڑے سے بڑے تعلق کو قربان کر دیتے ہیں، یہی وہ اغراض و اہواء کا اختلاف ہے جو قوم و ملّت کے لیے منحوس اور اس دنیا میں نقد عذاب ہے۔ (معارف القرآن، جلد:۳، صفحہ ۳۵۸-۳۶۳)

مجھے تعجب ہوتا ہے کہ اگر کسی کی اولاد نافرمان ہے اس کو ڈنڈے تو مار رہا ہے، گھر سے تو نکال رہا ہے اور ساری تدبیریں کر رہا ہے لیکن بندہ خدا دو آنسو اللہ تعالیٰ کے سامنے نہیں گراتا کہ اے اللہ یہ میرے اعمال کا عذاب ہے جو میں اولاد کی شکل میں چکھ رہا ہوں خدایا! مجھے اس عذاب سے بچا۔

اگر اختلافات گھر میں ہیں تو فوراً غور کرے کیا کمی ہے؟ کیا وجہ ہے کہ مجھ سے کیا گڑبڑ ہو رہی ہے؟ اور اس کی فوراً اصلاح کریں ان شاء اللہ آپ دیکھیں گے کہ آپ کے گھر کے سارے افراد باہم شیر و شکر ہو جائیں گے

زندگی مزے دار بن جائے گی اور اگر اس کے بعد بھی کوئی ناموافق صورت حال سامنے رہی تو آپ کا قلب بالکل مطمئن رہے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار بندے کا دل کبھی بے چین نہیں ہوتا انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام پر بھی حالات آتے ہیں لیکن ان کے قلوب بالکل مطمئن رہتے ہیں بے چینی اور پریشانی کا وہاں کوئی گزر نہیں اور یہ اطمینانِ قلبی اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے جب مومن بندہ اللہ کو ناراض نہیں کرتا ہے بلکہ اس کو راضی وخوش کرتا ہے، اللہ تعالیٰ بھی اس کے دل کو بے چین نہیں کرتے۔

ہر قدم پر حیاتِ نو کیسے حاصل ہو

ہر قدم پر تاکہ حاصل ہو حیات نو مجھے
ہر قدم پر زیرِ خنجر اپنا سر کرتا ہوں میں

یہ اللہ تعالیٰ کی محبت کا خنجر ہے جس کے سامنے میں اپنا سر پیش کرنے کو تیار ہوں اگرچہ میں ذبح ہو جاؤں اور اس راہ میں مر جاؤں تو یہ شہید محبت کہلاتا ہے، حدیث پاک سے اس کا ثبوت ہے شہید صرف اس کو نہیں کہا جاتا کہ جو اللہ کے راستے میں لڑتے ہوئے مر جائے بلکہ شہید کی بہت ساری اقسام ہیں۔ جیسا ملا علی قاری رحمہ اللہ نے مرقاۃ شرح مشکوٰۃ میں ذکر فرمایا ہے۔ انہوں نے بہت ساری اقسام اس کی مفصلاً نقل کی ہیں، حضرت شیخ نے بھی نقل کی ہیں اور ڈاکٹر عبدالحی صاحب رحمہ اللہ کی کتاب ''احکامِ میت'' صفحہ: ۱۱۲ تا صفحہ: ۱۱۶ پر شہید کی ۴۲ قسمیں ذکر کی گئی ہیں۔

شہید کی بیالیس اقسام

شہیدوں کی دوسری قسم جنہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت کے مطابق آخرت میں تو درجہ شہادت نصیب ہوگا اور ان کے ساتھ شہیدوں کا سا معاملہ ثواب اور اعزاز واکرام کا کیا جائے گا لیکن دنیا میں ان پر شہیدوں کے احکام جاری نہیں ہوتے یعنی ان کا غسل وکفن عام مسلمانوں کی طرح کیا جاتا ہے شہیدوں کی طرح نہیں۔

شہیدوں کی اس قسم میں جو مسلمان داخل ہیں ان کی چالیس سے زیادہ قسمیں ہیں لیکن ان سب کا ذکر کسی ایک حدیث میں یکجا نہیں ملتا متفرق احادیث میں ان کا ذکر آیا ہے، اسی لیے ان سب احادیث کو جمع کرنے کے لیے علماء محققین نے مستقل رسالے تالیف فرمائے ہیں۔ علامہ ابن عابدین شامی رحمۃ اللہ علیہ نے ان تحقیقات کا خلاصہ اپنی شہرہ آفاق کتاب ''حاشیہ رد المحتار'' میں درج فرما دیا ہے ہم یہاں اسی کا لبِ لباب نقل کرتے ہیں۔ اس قسم میں مندرجہ ذیل مسلمان داخل ہیں:

(۱)...... وہ بے گناہ مقتول جو شہید کی قسم اوّل (یعنی جس پر دنیا میں غسل وکفن کے اعتبار سے شہید کے احکام جاری ہوں) میں اس لیے داخل نہ ہو کہ جو شرطیں اس کے لیے بیان کی گئی ہیں ان میں سے کوئی شرط اس میں مفقود ہو، مثلاً وہ مقتول جو مجنون، نابالغ یا جنبی ہو یا حیض ونفاس والی عورت ہو اور وہ مقتول جس کے قتل کے عوض میں

قصاص واجب نہیں بلکہ مالی عوض یعنی دیت (خون بہا) واجب ہوتا ہے اور وہ مقتول جو باغیوں، ڈاکہ زنی یا حربی کافروں کے ہاتھوں مارا جائے مگر زخم لگنے کے بعد کوئی امر راحت اور تمتع زندگی کا اسے حاصل ہوا ہو ان سب صورتوں میں مقتول اگرچہ شہید کی قسم اول میں داخل نہیں مگر قسم دوم میں داخل ہے یعنی آخرت میں اسے درجہ شہادت نصیب ہوگا۔ دنیا میں شہید کے احکام جاری نہ ہوں گے۔ (درمختار و شامی)

(۲)...... جس نے کسی کافر، باغی یا ڈاکو پر حملہ کیا مگر وار خطا ہو کر خود کو لگ گیا جس سے موت واقع ہوگئی۔ (درالمختار)

(۳)...... مسلم ممالک کی سرحد کا پہرہ دینے والا جو وہاں طبعی موت مر جائے۔

(٤)...... جس نے صدقِ دل سے اللہ کی راہ میں جان دینے کی دعا کی ہو، پھر وہ طبعی موت مر جائے۔

(۵)...... جو خود کو یا اپنے گھر والوں کو ظالموں سے بچانے کے لیے لڑتا ہوا مارا جائے۔

(٦)...... جو اپنا مال ظالموں سے بچانے یا چھڑانے کے لیے لڑتا ہوا مارا جائے۔

(۷)...... حکومت کا مظلوم قیدی جو قید کی وجہ سے مر جائے۔

(۸)...... جو (ظلم سے بچنے کے لیے) روپوش ہوا اور اسی حالت میں مر جائے۔

(۹)...... طاعون سے مرنے والا۔ اس میں وہ شخص بھی داخل ہے جو طاعون کے زمانے میں طاعون کے بغیر ہی وفات پا جائے بشرطیکہ جس بستی میں ہو وہیں ثواب کی نیت اور صبر کے ساتھ ٹھہرا رہے راہ فرار اختیار نہ کرے۔

(۱۰)...... پیٹ کی بیماری (استسقاء یا اسہال) میں وفات پانے والا۔

(۱۱)...... نمونیہ کا مریض۔

(۱۲)...... سل کا مریض۔

(۱۳)...... مرگی کے مرض سے یا کسی سواری سے گر کر ہلاک ہونے والا۔

(١٤)...... بخار میں مرنے والا۔

(۱۵)...... جس کی موت سمندر میں الٹیاں (متلی، قے) لگنے سے واقع ہوئی ہو۔

(۱٦)...... جو شخص اپنی بیماری میں چالیس مرتبہ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحَانَكَ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ کہے اور اسی بیماری میں وفات پا جائے۔

(۱۷)...... جس کی موت اچھو لگنے سے ہوئی ہو۔

(۱۸)...... جس کی موت زہریلے جانور کے ڈسنے سے ہوئی ہو۔

(۱۹)...... جسے کسی درندے نے پھاڑ ڈالا ہو۔

(۲۰)...... آگ میں جل کر مرنے والا۔

(۲۱)...... پانی میں ڈوب کر مرنے والا۔

(۲۲)...... جس پر کوئی عمارت یا دیوار وغیرہ گر پڑی ہو۔

(۲۳)...... جس عورت کی موت حالتِ حمل میں ہوجائے۔

(۲۴)...... نفاس والی عورت جس کی موت ولادت کے وقت ہوئی ہو یا ولادت کے بعد مدت نفاس ختم ہونے سے پہلے۔

(۲۵)...... جو عورت کنواری ہی وفات پاجائے۔

(۲۶)...... جو عورت اپنے شوہر کے کسی اور عورت سے تعلق (زوجیت وغیرہ) کے غم پر صبر کرے اور اسی حالت میں مرجائے۔

(۲۷)...... وہ پاکباز عاشق جو اپنا عشق چھپائے رکھے اور غمِ عشق سے مرجائے۔

(۲۸)...... جسے غریب الوطنی میں موت آجائے۔

(۲۹)...... دین کا طالب علم۔

(۳۰)...... وہ مؤذن جو محض ثواب کے لیے اذان دیتا ہو۔ (تنخواہ یا اجرت مقصود نہ ہو)

(۳۱)...... اپنے بیوی بچوں کی خبر گیری کرنے والا جو اُن کے متعلق اللہ کے احکام بجالائے اور ان کو حلال کھلائے۔

(۳۲)...... سچا دیانتدار تاجر۔

(۳۳)...... جو تاجر مسلمانوں کے کسی شہر میں کھانے کی چیزیں (طعام) پہنچائے۔

(۳۴)...... جس نے اپنی زندگی مدارات (اچھے سلوک) میں گذاری ہو (یعنی برے لوگوں کے ساتھ بھی شرعی حکم کے بغیر برا سلوک نہ کرتا ہو)

(۳۵)...... اُمت کے بگاڑ کے وقت سنت پر قائم رہنے والا۔

(۳۶)...... جو رات کو باوضو سوئے اور اسی حالت میں انتقال ہوجائے۔

(۳۷)...... جمعہ کے دن وفات پانے والا۔

(۳۸)...... جو شخص روزانہ پچیس بار یہ دعا کرے کہ ''اَللّٰھُمَّ بَارِکْ لِیْ فِی الْمَوْتِ وَفِیْمَا بَعْدَ الْمَوْتِ'' اے اللہ! میرے لیے موت میں بھی برکت دے اور موت کے بعد کے حالات میں بھی۔

(۳۹)...... جو چاشت کی نماز پڑھے اور ہر مہینہ تین روزے رکھے اور وتر نہ سفر میں چھوڑے نہ اقامت میں۔

(۴۰)...... ہر رات سورۂ یٰسین پڑھنے والا۔

(۴۱)...... جو شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر سو مرتبہ درود شریف پڑھے۔ (بظاہر روزانہ پڑھنا مراد ہے)

(۴۲)...... امام ترمذی نے حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص نے صبح کے وقت ''اَعُوْذُ بِاللّٰہِ السَّمِیْعِ الْعَلِیْمِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ'' تین مرتبہ پڑھا

شام تک استغفار کرتے رہتے ہیں اور جس نے یہ کلمات اور آیتیں شام کو پڑھیں تو صبح تک اس کا بھی یہی درجہ ہے۔

اسی میں سے ایک حدیث پاک ہے کہ:

﴿مَنْ عَشِقَ وَ كَتَمَ وَ عَفَّ ثُمَّ مَاتَ فَهُوَ شَهِيْدٌ﴾

(مرقاۃ المفاتیح، کتاب الجنائز، باب عیادۃ المریض)

کہ کسی شخص کو کسی سے عشق ہو گیا پھر اس کو چھپایا اور پاک دامن رہا بالکل کسی سے کوئی اظہار نہیں کیا لیکن زور بہت پڑا کیونکہ شدید عشق میں پھنس گیا تھا یہاں تک کہ اس کو موت آ گئی اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں **وھو شھید** کہ وہ شہید ہے تو دوستو! ہر قدم پر اپنی آرزوؤں کا خون کر کے چلنا اور اپنی گردن کو اللہ کے سامنے پیش کر دینا کہ اے اللہ! میں اپنی ساری خواہشات کا خون کرنے کے لیے حاضر ہوں تو اسے ہر قدم پر حیاتِ نو یعنی نئی زندگی عطا ہوتی ہے، لیکن خاص قسم کی حیات یعنی اس میں لطف اور مزہ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے انسان کو لگتا ہے کہ آنے والی گھڑی میں مجھے جو حیات حاصل ہوئی وہ پچھلی گھڑی میں نہیں تھی اور آنے والی گھڑی میں مجھے جو مزے اور لطف حاصل ہوئے وہ میں نے زندگی میں کبھی نہیں چکھے تھے اس کو یہ محسوس ہوتا ہے، حضرت تائب صاحب اسی کو فرماتے ہیں ۔

ہر لمحہ شہادت کا مزہ اور ہی کچھ ہے
نظروں کی حفاظت کا مزہ اور ہی کچھ ہے
ہر پل غمِ حسرت کا مزہ اور ہی کچھ ہے

جب انسان نظروں کی حفاظت کرتا ہے تو اسے اس کے نتیجے میں گویا کہ ہر لمحہ ہر گھڑی ایک طرح کی شہادت مل رہی ہوتی ہے یعنی معنوی اور حکمی شہادت تو حضرت والا بھی اس شعر میں اسی مضمون کو بیان فرماتے ہیں اور یہی انسان حقیقت میں اللہ کا ولی اور نیک بندہ ہے چاہے آپ اسے صوفی کہہ لو، چاہے اللہ والا کہہ لو، چاہے نیک بندہ کہہ لو، چاہے ولی کہہ لو، چاہے متقی کہہ لو، چاہے ذاکر شاغل کہہ لو! قطب، غوث، ابدال کہہ لو! چاہے آپ جو بھی کہہ لو کل پوری مومن کی زندگی کا خلاصہ یہ ہے کہ ہر سانس اور ہر قدم پر اللہ تعالیٰ کا جو حکم ہے بس اس حکم کو بجا لائے، یہ پوری شریعت وولایت کا خلاصہ ہے حضرت فرما رہے ہیں ہر قدم پر جس قدم پر جو حکم ہو۔

ہر قدم پر سر کا زیرِ خنجر ہونا مثالوں کی روشنی میں

مثال کے طور پر آپ بیوی کے پاس جا رہے ہیں اللہ تعالیٰ کا یہی حکم ہے، مسکرا کے، اچھے انداز سے، بشاشت کے ساتھ اپنی بیوی کے پاس جاؤ! ملو! بس اب آپ کو اسی میں ثواب مل رہا ہے اور جب آپ مسجد میں ہیں خشوع وخضوع کے ساتھ آپ نماز پڑھنے کھڑے ہوئے، شریعت کا حکم ہے کہ اب بیوی وغیرہ کا کوئی دھیان دل میں نہیں آنا چاہیے! خالص اللہ تعالیٰ کی طرف نظر کر کے گویا کہ اللہ نے آپ کو حکم دیا کہ میرے بندے! نماز پڑھو!

میں دیکھتا ہوں اور اللہ تعالیٰ دیکھ رہے ہیں کہ کیسی نماز ہے۔ جیسا کہ اگر ہم دنیا کے بادشاہوں کے سامنے ہوں اور ہمارا چہرہ دائیں بائیں جانب پھرا ہوا ہو اور اس سے کوئی درخواست کر رہے ہوں، چہرہ ادھر پھرا ہوا ہے اور سامنے بیٹھے ہیں اور اس سے درخواست پیش کی جارہی ہو؟ تو دھتکار کے مار دیئے جائیں گے کہ جاؤ کیا کر رہے ہو؟ اللہ تعالیٰ کے لیے چہرہ اور دل برابر ہے اگر ہمارا دل دائیں بائیں ہو اور نماز میں ہم کھڑے ہوئے ہوں تو کیا نماز ہے؟ رہ گئی یہ بات کہ وسوسوں کا آنا، خیالات کا آنا یہ برا نہیں لیکن لانا یا جمانا برا ہے۔ اگر آجائیں تو اس میں کوئی حرج نہیں، اس کے درپے نہ ہوں اور نہ اس سے پریشان ہوں۔

اور حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے عجیب اس کا علاج بیان فرمایا کہ جو الفاظ نماز میں پڑھے جاتے ہیں، ان کے معانی کا استحضار پہلے نمبر پر شروع کردو! اور فلسفہ کا قاعدہ مسلمہ (اصول) ہے کہ انسان کا دل ایک وقت میں دو چیزوں کی طرف متوجہ نہیں ہوتا تو بس جب معانی کا استحضار ہوگا تو عند اللہ آپ کی نماز خشوع وخضوع والی بن گئی۔ اور اگر معانی نہ جانتا ہو تو کوشش کر کے سیکھ لے اور ورنہ تو الفاظ پر غور کرلے اور دھیان رکھے تو بھی خشوع وخضوع حاصل ہو جائے گا۔ بس یہی تشریح ہے حضرت والا کے ذکر کردہ اس مضمون کی کہ ہر قدم پر میں اپنا سر زیرِ خنجر کرتا ہوں۔

اسی طرح اس کی ایک مثال معاملات کے سلسلے میں سمجھئے کہ مثلاً شریعت نے ایسی بیع وشراء (خرید و فروخت) کو ممنوع اور ناجائز قرار دیا ہے جس کی بنیاد ضرر یعنی نقصان اور غرر یعنی دھوکے پر ہو، کسی کو نقصان پہنچانا یا دھوکا دینا اس سے بیع میں فساد پیدا ہو جاتا ہے۔ بحمد اللہ تعالیٰ احقر ایک دینی مدرسے کا مدرس ہونے کے ساتھ ساتھ کسی درجہ تجارت کے ساتھ بھی تعلق رکھتا ہے۔ چنانچہ ایک مرتبہ ایسی صورت پیش آئی (اور یہ تاجروں کو پیش آتی رہتی ہے) کہ ایک سامان خریدنے کے بعد بڑی مدت تک دکان پر پڑا رہا اور بالکل فروخت نہیں ہوتا تھا تو ایک دن بیٹھے ہوئے مجھے یہ خیال آیا کہ اس کے بیچنے کی ایک بہت اچھی ترکیب ہے جس کے نتیجے میں جلدی سے بک جائے گا اور وہ یہ کہ ہمارا فلاں دکان دار کسٹمر (Customer) اور خریدار ہے تو ایسا کرتا ہوں کہ ان کے پاس دو تین حضرات کو بطور خریدار بھیجتا ہوں آج تم جاؤ! اور اس سے یہی سامان مانگو، اگلے دن دوسرے کو بھیجوں گا کہ تم جاؤ! اور یہ سامان مانگو! تیسرے دن تیسرے کو بھیجوں گا جا کے یہ سامان مانگو، جب کئی دن تک اس سے یہی سامان مانگا جائے گا تو اس کے دل میں اس کی تلاش پیدا ہو جائے گی اور پھر چند دن کے بعد اس کے پاس یہ سیمپل (Sample) بھیجوں گا کہ آپ کو یہ آرڈر (Order) کرنا ہے کہ دیکھو ہمارے پاس یہ مال ہے اگر آپ کو ضرورت ہو تو بتلایئے؟ تو وہ بہت جلد آرڈر (Order) کرے گا کہ اس کے تو روزانہ بہت کسٹمر (Customer) آرہے ہیں بہت خریدار آرہے ہیں جلدی اس کو خریدو! تو اس ناجائز طریقے اور دھوکا دہی کے ذریعے میرا تو سارا سامان بک جائے گا۔ مگر اس بھائی کو دھوکہ دے کر کتنے بھاری نقصان کا سامنا ہوگا۔

بہر حال یہ خیال دل میں سرسری طور پر آیا لیکن اللہ تعالیٰ نے مجھ پر فضل فرمایا اور میرے دل میں اللہ نے فوراً یہ ڈالا کہ یہ تو عملی دھوکا ہے اگر چہ میں نے کوئی جملہ نہیں بولا اور کوئی جھوٹ نہیں بولا لیکن یہ عملی طور پر میں نے خریدار کو دھوکا دیا ہے اللہ تعالیٰ تو جانتے ہیں سو الحمد للہ، ثم الحمد للہ، فضل الٰہی، توفیق الٰہی سے فوراً دل میں استغفر اللہ! پڑھا کہ کیا کرنے جا رہے ہو؟ جب وہ مال خرید کے اسٹاک اس کے پاس پڑا رہے گا اور کوئی خریدار خریدنے نہیں جائے گا تو اس کے دل سے جو آہ نکلے گی وہ بائع اور سیل مین کو چیر کے رکھ دے گی۔

دوستو! اللہ والا بننا اتنا آسان نہیں ہے کہ بس تسبیح پڑھی اور یہ کیا وہ کیا سورہ یٰس پڑھی اور کچھ ختمات اور معمولات اور اوراد و وظائف پورے کر لیے گئے اور ولی بن گئے بلکہ اگر آپ تجارت کرتے ہیں تو آپ کو یہ مسائل بھی سیکھنے چاہیے! بظاہر خوش ہوں گے کہ میرے پاس اتنا دو سو کا اسٹاک تھا، سارا بک گیا مگر شریعت کی خلاف ورزی کر کے، خدا کے حکم کو توڑ کر بیچ دینا گھر میں تباہی و بربادی کا ذریعہ بنے گا۔ اسی لیے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بازار میں کسی تاجر کو تجارت کے لیے اجازت نہیں دیتے تھے جب تک کہ وہ کتاب البیوع کے مسائل نہ بتا دے اور آج ہم ایسے بزنس میں لگے ہوئے ہیں کہ مسائل شریعت کا کچھ علم نہیں ہے جس کا جو جی چاہ رہا ہے وہ کر رہا ہے۔ میری یہ دو باتیں یاد رکھئے! آپ اپنے دماغ سے خود سوچئے کہ میں کسی کو دھوکا تو نہیں دے رہا ہوں اور میں کسی کو نقصان تو نہیں پہنچا رہا ہوں۔

اسی طرح تجارتی معاملات کی ایک اور مثال ذہن میں آتی ہے کہ مثلاً یہ اطلاع ملنے پر کہ کوئی شخص باہر سے بڑی مقدار میں کھانے پینے کی اشیاء غلہ وغیرہ لے کر آیا ہے اور ابھی کراچی ایئرپورٹ پر پہنچا ہے پہلے ہی اس کے پاس پہنچ کر اس کے مارکیٹ میں جانے سے قبل تمام مال سستے داموں میں خرید لیا جبکہ ادھر لوگوں کو مارکیٹ میں ان اشیاء کی قلت کی وجہ سے بڑی ضرورت کا سامنا ہے اور بظاہر کئی مہینے تک کہیں سے مال آنے کی امید نہیں ہے اس نے سارا مال خرید لیا اور ابھی وہ سودا بیچنے والا مارکیٹ میں آیا بھی نہیں۔ اب یہ خریدار اپنی منشا کے مطابق قیمتوں میں اضافہ کر کے مال فروخت کرے گا، اسی موقع کے لیے اللہ تعالیٰ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

﴿لَا يَبِيعُ حَاضِرٌ لِبَادٍ دَعُوا النَّاسَ يَرْزُقُ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ مِنْ بَعْضٍ﴾

(سنن الترمذی، کتاب البیوع، باب ما جاء لا یبیع حاضر لباد)

ارے بھائی! پہلے سے یہ سب چکر مت چلاؤ! اور لوگوں کو چھوڑ دو کہ اللہ بعض سے بعض کو رزق دیں تاکہ پرائز (Prize) میں اور قیمتوں میں تسہیل، ترخیص رہے، سستا بکے، اب تم لے کے سارا جمع کر کے پوری مارکیٹ میں دادا بن کے بیٹھ گئے کہ اب مجھ ہی سے سب کو لینا پڑے گا تو میں دو گنا، تین گنا قیمت کر کے بیچوں گا یہ سارے مسائل جاننے کے ہیں، اللہ والا بننا اسی کو کہتے ہیں۔ الحمد للہ! اللہ تعالیٰ نے ہمارا دین کامل و مکمل کر دیا اور زندگی کے

تمام شعبوں کے لیے احکام عطا فرمائے ہیں۔

اسی لیے حضرت مجدد تھانوی رحمہ اللہ نے تو فرمایا کہ جب میں اپنے متعلقین میں سے کسی کے اندر معاملات میں کوتاہی دیکھتا ہوں تو میرے دل کو شدید تکلیف ہوتی ہے اور اگر وظائف میں کوتاہی دیکھتا ہوں تو اتنی تکلیف نہیں ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ کسی آدمی کو جانچنے کے لیے ان تین باتوں سے جانچو، معاملات کے ذریعے، نمبر۲ سفر میں ساتھ رہ کر نمبر۳ پڑوسی بن کر۔

میرے دوستو! حضرت والا کے پاس آ کر دین سیکھنا چاہیے! کہ دین کے کیا کیا تقاضے ہیں۔ ہم انکو پورا کر رہے ہیں یا نہیں؟ ایک ایک قدم پر شریعت کو دیکھنا! لاکھوں کا نفع ہو بھاڑ میں جائے! اگر اللہ ناراض ہوتے ہیں اور حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے کے خلاف ہے۔ تو پھر لاکھوں یا کروڑوں کا نفع ہو تو بھی ایک طرف پھینک دیں اور یہ یقین رکھیں کہ ہزار میں اللہ تعالیٰ وہ برکت دیں گے جو ان دھوکے والے اور غیر شرعی طریقے سے کمائے جانے والے لاکھوں میں نہیں ملے گی وہ لاکھ گھر میں آ کے بے چینی پیدا کریں گے، امراض کا سبب بنیں گے، جھگڑوں اور اختلافات اور دماغی ٹینشن اور ڈپریشن کو جنم دیں گے، آج کتنے ہی دولت والوں کو جا کر دیکھ لیجئے ذرا بھی سکون نہیں ہے۔ کیونکہ ان چیزوں کی کوئی پرواہ نہیں کرتے بس مال آنا چاہیے! چاہے جیسے بھی ہو، حدیث پاک میں ہے قیامت میں یہ سوال بھی ہوگا:

﴿عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا تَزُوْلُ قَدَمَا ابْنِ اٰدَمَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ حَتّٰى يُسْئَلَ عَنْ خَمْسٍ عَنْ عُمُرِهٖ فِيْمَآ اَفْنَاهُ وَعَنْ شَبَابِهٖ فِيْمَآ اَبْلَاهُ وَعَنْ مَّالِهٖ مِنْ اَيْنَ اكْتَسَبَهٗ وَفِيْمَآ اَنْفَقَهٗ وَمَاذَا عَمِلَ فِيْمَا عَلِمَ﴾

(رواہ الترمذی، ابواب صفۃ القیمۃ)

حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ قیامت کے دن آدمی کے پاؤں جنبش میں نہ آئیں گے جب تک اس سے یہ پانچ باتیں دریافت نہ کر لی جائیں گی۔ اس سے پوچھا جائے گا کہ اپنی عمر کو کس کام میں صرف کیا؟ اپنی جوانی کس کام میں ختم کی؟ مال کیونکر کمایا اور کیونکر خرچ کیا؟ اور جو علم حاصل کیا تھا اس کے موافق کیا عمل کیا؟

کہاں سے کمایا؟ اور کما کر کہاں خرچ کیا؟ ہم سمجھتے ہیں بس اب تو یہ سب ہمارا ہے جیسے جہاں چاہیں خرچ کر دیں لیکن یہ یاد رکھنا کہ یہ دونوں سوال باقاعدہ علیحدہ علیحدہ ہوں گے اور ان کا جواب دینا ہوگا۔ اس لیے شعر کا خلاصہ نکل کر سامنے آیا کہ مومن کا سر ہر قدم پر اللہ کے حکم کے سامنے جھکا ہوا ہو۔

چمن میں ہوں مگر آہ بیابانی نہیں جاتی

چمن میں ہوں مگر آہ بیابانی نہیں جاتی
یہ کیا آتش ہے آہوں کی فراوانی نہیں جاتی

میں گلشن میں ہوں لیکن فیض ہے یہ شیخ کامل کا
کہ میرے قلب سے ہوئے بیابانی نہیں جاتی

نہ جانے کتنی نہریں میرے دریاء سے ہوئیں جاری
مگر پھر بھی میرے دریاء کی طغیانی نہیں جاتی

رفو کرتا ہے دامن کو اگرچہ ان کا دیوانہ
گریباں سے مگر چاکِ گریبانی نہیں جاتی

مزاج عقل کو الفت ہے اپنے ساز و سامان سے
مزاج عشق سے بے ساز و سامانی نہیں جاتی

خرد کہتی ہے باتیں مختصر کر ان سے اے ناداں
محبت کی مگر تمہید طولانی نہیں جاتی

نہیں کرتا ہے صدق دل سے توبہ جو گناہوں سے
کسی بھی حال میں اس کی پریشانی نہیں جاتی

مرے دریائے الفت کا عجب ساحل ہے اے اخترؔ
کہ ساحل پر بھی ان موجوں کی طغیانی نہیں جاتی

مشکل الفاظ کے معانی:۔ **چمن**: باغ۔ **آہِ بیابانی**: ویرانے میں جا کر رونا۔ **آتش**: اللہ تعالیٰ کی محبت کی آگ۔ **فراوانی**: زیادہ ہونا۔ **گلشن**: باغ۔ **ھوئے بیابانی**: ویرانے کا سناٹا۔ **طغیانی**: طوفان۔ **رفو کرنا**: پھٹے ہوئے کپڑے کو جوڑنا۔ **دیوانہ**: اللہ تعالیٰ کا عاشق۔ **چاک گریبانی**: اللہ تعالیٰ کا عشق و محبت۔ **خرد**: عقل۔ **تمھید**: کسی بات کو سمجھانے کے لیے کوئی بات کہنا۔ **طولانی**: لمبائی۔ **صدقِ دل**: سچے دل سے۔ **الفت**: محبت۔

بہارِ جانِ چمن ہو تو چمن کی کیا حاجت؟

چمن میں ہوں مگر آہ بیابانی نہیں جاتی
یہ کیا آتش ہے آہوں کی فراوانی نہیں جاتی
میں گلشن میں ہوں لیکن فیض ہے یہ شیخ کامل کا
کہ میرے قلب سے ہوئے بیابانی نہیں جاتی

جہاں جنگلوں میں کوئی نہیں ہوتا تھا، نہ آس پڑوس میں کوئی رہنے والا تھا، نہ ہی دنیا داری کے چکروں اور مشغلوں کا وجود تھا نہ ادھر ادھر کے مسائل اور نہ کسی قسم کے علائق دنیویہ بلکہ وہاں بالکل خالی فضا ہوتی تھی، نیچے زمین اور اوپر آسمان۔

صرف ایک اللہ کی ذات عالی کے سوا ظاہری طور پر بھی کچھ نہ ہوتا تھا اور ایسے مقام پر میرے شیخ حضرت شاہ عبدالغنی پھولپوری رحمہ اللہ یادِ الٰہی میں مشغول رہتے تھے کچھ یوں صورت حال تھی جس کو مولانا رومی کے شعر سے سمجھا جاسکتا ہے۔

آہ راجز آسمان ہمدم نہ بود
راز را غیر خدا محرم نہ بود

اور وہ ہی صحرانوردی ہے جس کو اقبال مرحوم نے بڑے ایمان افروز انداز سے صحابہ کے تذکرہ کے وقت یوں ذکر فرمایا ہے۔

غرض میں کیا کہوں تجھ سے کہ وہ صحرانشیں کیا تھا
جہاں گیر و جہاں دار و جہاں بان و جہاں آرا

تو جیسے خربوزہ خربوزے کو دیکھ کر رنگ پکڑتا ہے اسی طرح آدمی اللہ والوں کے پاس رہ کر جلدی اللہ والا بنتا ہے اور محبت میں ترقی ہوتی ہے کیونکہ اَلْجِنْسُ یَمِیْلُ اِلَی الْجِنْسِ کا اصول مسلم ہے کہ جنس، جنس کی طرف مائل ہوتی ہے خود انسان کے دل کے اندر جب محبت کا داعیہ پیدا ہوتا ہے تو وہ اسے اللہ والوں کے پاس کھینچ کر لاتا ہے ان کو دیکھ کر انسان خود بخود ترقی کرتا رہتا ہے تو اس لیے چونکہ حضرت والا دامت برکاتہم کو اپنے شیخ کی صحبت میں اس آہ بیابانی سے واسطہ پڑا تھا اور قلب میں اللہ کی محبت کی آگ لگی ہوئی تھی جس کی ترجمانی بار بار نکلنے والی آہوں سے ہوتی تھی اور دل دنیا کی ظاہری زیب و زینت سے ایسا اچاٹ ہو چکا تھا۔ کہ گلشن میں رہتے ہوئے بھی اس کے ساتھ دل لگتا نہ تھا اور وہی قلب کا عالم رہتا تھا جو جنگل کی ہوئے بیابانی کی مستی میں دل میں سما چکا تھا ایک موقع پر حضرت والا نے اسی آہ بیابانی کے منظر کو بہت دل سوز انداز میں یوں پیش فرمایا ہے۔

پھر نعرۂ مستانہ ہاں اے دل دیوانہ
زنجیر علائق پر پھر ضرب ہو رندانہ
پھر اشک بداماں ہو پھر چاک گریباں ہو
پھر صحرا نوردی کا دھرا کوئی افسانہ
کیوں رشک گلستاں ہے خاموشی ویرانہ
صحرا کی طرف شاید پھر ہے رخ دیوانہ

ان تمام اشعار کا خلاصہ اور نچوڑ اہل اللہ کے قلوب میں عطا کی ہوئی اللہ تعالیٰ کی غایت درجہ محبت کے ایک خاص اثر کو ذکر کرنا ہے اور وہ یہ کہ ان کا دل دنیوی علائق سے صرف درجہ ضرورت میں تعلق رکھتا ہے یعنی بوقت ضرورت اور بقدر ضرورت دنیا کو استعمال کرتے ہیں مگر دلی طور پر دنیا اور اس کے متعلقات سے وہ لوگ دور بھاگتے ہیں۔

دریائے علم و معرفت میں طغیانی کا راز

نہ جانے کتنی نہریں میرے دریا سے ہوئیں جاری
مگر پھر بھی میرے دریا کی طغیانی نہیں جاتی

اس شعر کا مطلب یہ ہے کہ جو نہر کسی دریا کے محدود پانی کے ساتھ جڑی ہوئی ہو تو جب اس دریا سے وہ محدود پانی ختم ہو جائے گا اس نہر کے اندر بھی پانی ختم ہو جائے گا لیکن جس کا کنکشن (Conection) اور رابطہ کسی غیر محدود نظر آنے والے سمندر کے ساتھ ہو تو پھر وہاں سے ایسی نہریں بہتی ہیں کہ وہ ختم نہیں ہوتیں اسی لیے اس شعر میں ان علماء اور طلباء علوم دینیہ کے لیے سبق ہے کہ جو اپنی محدود معلومات پر فخر کر کے بیٹھے ہیں کہ میں بڑا علامہ ہوں اور بہت بڑا عالم ہوں بلکہ درحقیقت بڑا عالم وہ ہے کہ جس کے علم کا کنکشن (Conection) و تعلق حق تعالیٰ کی صفت علیم کے فیض کے ساتھ جڑ جائے پھر دیکھیں کہ کیسی علوم کی نہریں جاری ہوں گی کہ پوری پوری رات بیانات ہوں گے اور جب صبح کو منبر سے اٹھے گا تو اس کو ایسا محسوس ہوگا کہ ابھی تو میرے سامنے بہت سے علوم کے دریا ہیں جن کو میں نے بہایا ہی نہیں بس چند قطرے ہی پیش کیے ہیں۔

حضرتِ والا کے آج ہی کے وعظ میں یہ بات تھی کہ حضرت تھانوی نے وعظ کہتے کہتے ایک چیخ ماری اور فرمایا ہائے امداد اللہ! اور ارشاد فرمایا کہ میرے دل میں یہ خیال آیا کہ یوں کہوں۔

من مجمل از جمال حاجیم
من مکمل از کمال حاجیم

مجھے جو کچھ جمال و کمال ملا یہ سارا میرے حاجی صاحب کی برکات اور ان کے فیوض ہیں وہیں سے سب

کچھ ہوا۔ مگر اس میں اپنے کمال اور تزکیہ کا دعویٰ معلوم ہوتا تھا اس لیے یہ کہنا درست معلوم نہ ہوا۔ تو کسی نے پوچھا حضرت یہ ہائے امداد اللہ آپ نے کیوں فرمایا؟ اس پر ارشاد فرمایا کہ اتنے علوم کی بارش تھی کہ مجھے سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کس کو بیان کروں اور کس کو چھوڑ دوں اور یہ سب کچھ حضرت حاجی صاحب کی برکات اور فیوض کا اثر تھا۔

جب انسان کے قلب کا تعلق اور رابطہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ قوی ہوتا ہے تو پھر علوم کی بارش ایسے ہی ہوتی ہے اور یہی علوم وہبی کہلاتے ہیں اور یہ تعلق جب ہی ہوتا ہے جبکہ سارا غیر دل سے نکل کر دل بالکل صاف ہو جائے تو بس پھر انسان رٹنے اور کتابوں سے یاد کرنے کا پابند نہیں رہتا ہے بلکہ خود حق تعالیٰ شانہ اس کی زبان پر علوم و حکم کی نہریں جاری فرما دیتے ہیں اور وہ کتنے ہی علوم بیان کر دے اور خوب طویل تقریریں کر دے لیکن پھر بھی اس کے علوم کی موجوں میں طغیانی برقرار رہتی ہے۔ جیسا کہ کتاب میں بعض مقامات پر اس کی تفصیل حدیث شریف کی روشنی میں گذری ہے۔

چنانچہ حضرت والا کے ہزاروں مواعظ اور بے شمار کتابیں اس حقیقت کی واضح طور پر ترجمانی کرتی ہیں کہ اس دریا سے کتنی نہریں جاری ہو چکی ہیں اور ابھی تک علوم کا حال دل کے اندر ٹھاٹیں مارتے سمندر کی طرح ہے اور یہ معاملہ ہر دور کے اہل حق علمائے کرام اور مشائخ عظام کے ساتھ رہا ہے جیسا کہ ماضی قریب کے دور میں اس کی مثال حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ کی شخصیت ہے جن کی زبان و قلم سے بلاشبہ علوم و معارف کے دریا جاری ہوئے ہیں۔

اللہ کے دیوانوں کی چاک گریبانی

رفو کرتا ہے دامن کو اگرچہ ان کا دیوانہ
گریباں سے مگر چاکِ گریبانی نہیں جاتی

عربی کا مشہور مقولہ ہے کُلُّ اِنَاءٍ یَتَرَشَّحُ بِمَا فِیْهِ کہ ہر برتن سے وہی ٹپکتا ہے جو اس میں موجود ہوتا ہے اس کی روشنی میں شعر کا مطلب یہ ہے کہ میں اپنے کو کتنا ہی چھپانے کی کوشش کروں اور اپنے کو اس طرح رکھوں کہ لوگ مجھے اللہ کی محبت کا دیوانہ نہ سمجھیں اور اندازہ نہ لگا سکیں کہ میرے اندرونِ قلب کی صورت حال کیا ہے لیکن مجھ سے یہ حقیقت چھپتی نہیں ہے بلکہ وہ خود بخود ظاہر ہو کر رہتی ہے اس کی مثال بالکل ایسے ہی ہے جیسے جب کہیں خوشبو ہو اور آپ خوشبو کو کسی کمرے کے اندر رکھ دیں تو پھر وہ خود پھوٹے گی اور مہکے گی اور سب کو معطر کر دے گی ٹھیک اسی طرح جس سینے میں اللہ کی محبت کا درد آ چکا ہو وہ اس کو کتنا ہی مخفی رکھنے کی کوشش کرے مگر وہ خود ظاہر ہو کر رہتا ہے۔

میں نے اپنے دار العلوم دیوبند میں پڑھنے کے زمانے میں ایک بزرگ حضرت مولانا صدیق باندوی رحمہ اللہ کو دیکھا جنھوں نے اپنے کو بے حد مٹا رکھا تھا اور ظاہری طور پر اپنے کو بالکل چھپایا تھا لیکن طلباء دار العلوم دیوبند حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی آمد پر ایسے ٹوٹ پڑتے تھے اور دوسرے لوگ بھی اس قدر عزت کرتے تھے کہ

جس کا کسی کو وہم وگمان بھی نہیں ہوتا تھا۔ چنانچہ ایک مرتبہ حضرت مرادآباد میں تشریف لائے تو لوگ ہر طرف سے ملنے کے لیے اس قدر بے چین اور مشتاق تھے کہ ہر ایک حضرت سے مصافحہ کرنا چاہتا تھا اور شہر کے بڑے بڑے اصحابِ دولت وثروت اور رئیس لوگ حضرت کی زیارت اور مصافحہ کے لیے چاروں طرف اکھٹا تھے جیسا کہ کسی وزیر یا بادشاہ کی آمد کے موقع پر ہوا کرتا ہے۔

اس کے برخلاف ایسے بھی لوگ ہوتے ہیں کہ اندر سے بالکل خالی ہوتے ہیں اور ظاہر میں بزرگوں کی شکل وصورت اختیار کر کے خود بزرگ بننا چاہتے ہیں مگر انہیں کوئی مانتا ہی نہیں۔ نہ وہ عزت اور عقیدت ان کے متعلق لوگوں کے دلوں میں ہوتی ہے اسی لیے اصلی بزرگی اور ولایت دلوں میں اللہ تعالیٰ کی عظمت و بزرگی پیدا کر لینا ہے اور اسی سے قوی تعلق کر لینے کا نام ہے جیسا کہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دلوں کی کایا پلٹ گئی تھی اور اس میں صرف خدائے وحدہ لاشریک لہ کی ایک اکیلی ذات موجود تھی باقی کسی کا گزر بسر نہ تھا جس کے نتیجے میں ان کے نام سے قیصر وکسریٰ اپنے تخت پر بیٹھے ہوئے تھرتھراتے اور کانپتے تھے اور جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بیت المقدس کی فتح کے موقع پر کچھ ظاہری شان وشوکت اور رعب و دبدبے کی صورت اختیار کرنے کی بات کہی گئی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسی پیوند لگی ہوئی قمیص کو پہنے ہوئے یہ تاریخی جملے ارشاد فرمائے **نحن قوم اعزنا اللہ بالاسلام** ہم وہ لوگ ہیں جن کی دونوں جہان کی عزت وعظمت کا راستہ صرف اسلام ہے اور ہماری سرخروئی اور کامیابی صرف اسلام کی بدولت ہے۔

اور یہی اصول قیامت تک کے لیے قائم اور برقرار رہے گا کہ جب بھی ہم عزت وغلبہ پائیں گے اسلام ہی کی بدولت پائیں گے دوسری کسی بھی صورت سے مسلمانوں کو عزت ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوسکتا جبکہ ہائے افسوس! آج کا مسلمان مغرب کی تہذیب اور طور طریقے اور ان کے طرز زندگی اپنانے اور ان کے شانہ بشانہ چلنے میں اپنی کامیابی سمجھے ہوئے ہے جو سراسر دھوکا ہے اور قرآن وسنت اور اسلام کی تاریخ سے ناآشنائی کا نتیجہ ہے اوپر بتایا ہوا عزت وسرخروئی کا راستہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا ہے جو کہ خلفاء راشدین میں سے ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

﴿فَعَلَيْكُمْ بِسُنَّتِي وَ سُنَّةِ الْخُلَفَآءِ الرَّاشِدِيْنَ الْمُهْدِيِّيْنَ﴾

(المشکوٰۃ، کتاب الایمان، باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ، ص:۳۰)

تم میرے طریقے اور خلفاء راشدین مہدیین کے طریقہ کو لازم پکڑ لو۔ ان کا قول مستند اور دلیل ہے، اس لیے حقیقت یہی ہے کہ ہم وہ لوگ ہیں جن کو اللہ نے اسلام کی بدولت عزت دی ہے۔ سر کے بالوں سے لے کر پیروں کے ناخن تک ہماری زندگی میں اسلام ہونا چاہیے پھر دیکھیں کہ عزت کیسی ملتی ہے پھر اپنے تو اپنے غیر بھی عزت کرنے لگتے ہیں۔

مزاجِ عقل و مزاجِ عشق کا فرق

مزاج عقل کو الفت ہے اپنے ساز و سامان سے
مزاج عشق سے بے ساز و سامانی نہیں جاتی
خرد کہتی ہے باتیں مختصر کر ان سے اے ناداں
محبت کی مگر تمہید طولانی نہیں جاتی

جو لوگ دنیوی لحاظ سے ہوشیاری اور عقل مندی کے تقاضوں پر چلنے والے ہیں وہ ہر وقت دنیوی ساز و سامان اور عیش و آرام کی خاطر سوچ و فکر میں ڈوبے رہتے ہیں اور ان کا مبلغ علم اور منتہائے جد و جہد بس دنیائے حقیر کی کچھ پونجی جمع کر لینا ہوا کرتا ہے جب کہ جن کے دلوں پر اللہ کی محبت کی چوٹ لگ گئی اور دنیا کی فنائیت ان کے دل و دماغ میں رچ اور بس گئی تو وہ ہر آن اور ہر گھڑی بس اپنے اللہ کو راضی کرنے کی فکر میں دیوانہ وار کوشاں رہتے ہیں اور ہر قول و فعل میں ان کا مطمحِ نظر اور محورِ غور و فکر بس یہی ایک بات ہوتی ہے ان کی نگاہ میں چٹائی اور بوریا اور قالین اور صوفے میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔

جب بندہ اللہ سے ہم کلام ہوتا ہے تو اپنے محبوب سے کلام کو طول دینا پسند کرتا ہے جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ نے پوچھا:

﴿وَمَا تِلْكَ بِيَمِينِكَ يٰمُوسٰى ۝ قَالَ هِيَ عَصَايَ أَتَوَكَّؤُا عَلَيْهَا وَأَهُشُّ بِهَا عَلٰى غَنَمِي وَلِيَ فِيهَا مَآرِبُ أُخْرٰى ۝﴾

(سورۃ طٰہٰ، آیات: ۱۷-۱۸)

ترجمہ: اور حق تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے یہ بھی فرمایا کہ) یہ تمہارے داہنے ہاتھ میں کیا چیز ہے اے موسیٰ! انہوں نے کہا یہ میری لاٹھی ہے میں (کبھی) اس کا سہارا لگاتا ہوں اور (کبھی) اس سے اپنی بکریوں پر (درختوں کے) پتے جھاڑتا ہوں اور اسمیں اور بھی کام (نکلتے) ہیں۔

میرے دوستو! جب اللہ سے بندہ راز و نیاز کی باتیں کرتا ہے کہ اے اللہ! تو نے یہ نعمتیں دیں اور فلاں فلاں نعمت عطا فرمائی اور آپ نے میرے لیے ایسا کیا، آپ کا فلاں انعام ہے، فلاں انعام ہے اور خوب اللہ سے مناجات اور گفتگو میں لگا ہوا ہے جیسا کہ حضرت شاہ عبد الغنی پھول پوری گھنٹوں تک دعائیں کرتے تھے اور آہیں بھرتے تھے اور تھوڑی دیر بعد کہتے تھے یا ربی معاف کر دیجئے...... اے میرے رب مجھے معاف کر دینا، اے میرے رب مجھے معاف کر دینا جب بندے کو عشق و محبت ہوتی ہے تو پھر اپنے اللہ سے ایسے ہم کلام ہوتا ہے کہ وہ ہمکلامی چھوٹتی نہیں ہے لمبی اور مزید لمبی ہوتی جاتی ہے اور اللہ والوں کی شان تو حقیقت میں ایسی ہوتی ہے کہ وہ اپنے

مولیٰ سے دل ہی دل میں باتیں کرتے رہتے ہیں اور یہ ایک ایسا راز ہے جس کو وہ اور ان کا اللہ جانتا ہے، تیسرا کوئی نہیں جانتا ہے۔

صدقِ دل سے توبہ کے بغیر پریشانیوں سے نجات ممکن نہیں

نہیں کرتا ہے صدق دل سے توبہ جو گناہوں سے
کسی بھی حال میں اس کی پریشانی نہیں جاتی

چونکہ گناہوں کا خاصہ اور اثر یہ ہے کہ گناہگار دنیا اور آخرت کی بے چینیوں اور پریشانیوں میں مبتلا کیا جاتا ہے اور اس کے دل کا چین وسکون چھین لیا جاتا ہے اور وہ ایک پریشانی سے فارغ نہیں ہوتا کہ دو چار پریشانیوں میں اور ناخوش گوار واقعات میں اس کو مبتلا کر دیا جاتا ہے جیسا کہ یہ بات قرآن کی مختلف آیتوں اور مختلف احادیث میں مذکور ہے کہ گناہوں پر آخرت کے عذاب کے ساتھ ساتھ دنیا میں بھی مختلف نوع کے عذاب آتے ہیں اس لیے اگر بندہ گناہوں سے صدق دل سے توبہ کر لے اور متقی بن جائے تو پھر اس کے لیے قرآن کریم کا یہ وعدہ ہے:

﴿وَمَنْ يَتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ اَمْرِهٖ يُسْرًا﴾
(سورۃ الطلاق، آیۃ:۴)

ترجمہ: اور جو کوئی ڈرتا رہے اللہ سے کر دے وہ اس کے کام میں آسانی۔ (معارف القرآن، جلد:۸، صفحہ:۴۷۲)

یعنی جو تقویٰ اختیار کرے تو اللہ تعالیٰ اس کے سارے معاملات میں آسانیاں پیدا کر دینگے تو دوستو! دنیا کے سارے مسائل اور مصائب سے نجات کا واحد حل اور صرف ایک ہی راستہ ہمارے اللہ کی طرف سے مقرر ہوا ہے اور وہ یہ ہے کہ تمام گناہوں سے دور رہنا اور جب گناہوں سے دور رہیں گے تو جتنی غلاظتیں اور گندگیاں ہیں ان سے تو حفاظت ہو جائے گی، اور اس کے ساتھ ساتھ فرائض اور واجبات اور سنن موکدہ ہیں ان کو ادا کر لیا جائے تو بس یہ بندہ ولی بن گیا اور حضرت فرماتے ہیں کچھ ذکر واذکار وغیرہ مختصر طور پر کر لیے جائیں تو یہ اللہ تعالیٰ کا کامل ولی بن جائے گا۔

دریائے اُلفت کا بے مثال ساحل

مرے دریائے الفت کا عجب ساحل ہے اے اخترؔ
کہ ساحل پر بھی ان موجوں کی طغیانی نہیں جاتی

جس طرح اللہ تعالیٰ کی ذات غیر محدود ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کی صفات بھی غیر محدود ہیں اور اسی طرح اللہ تعالیٰ کی محبت کا جو راستہ ہے یہ بھی غیر محدود ہے اسی لیے دوسرے شعر میں حضرت نے فرمایا یہ وہ سمندر ہے جس کا ساحل نہیں یعنی اللہ کی محبت کا سمندر ایسا سمندر ہے جس کا ساحل نہیں لیکن سمندر کی موجوں میں چلتے ہوئے ہی اللہ تعالیٰ ساحل کا مزہ دیتے رہتے ہیں۔ اللہ والے ہر گھڑی اللہ سے ڈرتے رہتے ہیں اور ہر آن خوف زدہ رہتے

ہیں لیکن اسی خوف کے اندر اللہ انہیں ایک ایسی خوشی اور لطف عطا فرماتے ہیں کہ جس کی نافرمانوں کو ذرا بھی ہوا نہیں ہوتی اس لیے کہ آرزوؤں کے ٹوٹنے اور ناجائز تمناؤں کے پورا نہ ہونے پر جب دل ٹوٹتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے قلب پر اپنے قرب کی ایسی خاص تجلیات ڈالتے ہیں کہ جن کا لطف اور مزہ دونوں جہان سے بڑھ کر ہوتا ہے۔ اسی لیے چونکہ مریض کا دل ٹوٹا ہوا ہوتا ہے تو جو اس کی عیادت کے لیے جائے تو وہ وہاں اللہ کو پاتا ہے جیسا کہ مشکوٰۃ شریف ابواب الجنائز کے حاشیہ میں یہ بات لکھی ہوئی ہے۔

عیادت کرنے کے فائدے

اس ضمن میں احقر کے دل میں ایک بات آتی ہے کہ مریض کی عیادت کی نیتیں پیش کروں جیسا کہ مختلف کتابوں میں لکھی ہوئی ہیں۔ سو جب کسی مریض کے پاس جائیں تو درج ذیل امور کا خیال رکھا جائے:

(۱)...... یہ نیت کریں کہ مریض کی عیادت سے مجھے اللہ مل جائیں گے۔ جیسا کہ حدیث شریف میں یہ مضمون مختلف کتابوں میں موجود ہے۔ اس لیے کہ مریض کا دل ٹوٹا ہوا ہوتا ہے اور جن لوگوں کا دل ٹوٹا ہوا ہوتا ہے تو ایسے منکسر المزاج مسکین کے پاس اللہ تعالیٰ موجود ہوتے ہیں۔

﴿كَمَا رُوِىَ أَنَا عِنْدَ الْمُنْكَسِرَةِ قُلُوبُهُمْ لِأَجْلِىْ قَالَ الطَّيِّبِىُّ وَفِى الْعِبَارَةِ إِشَارَةٌ إِلٰى أَنَّ الْعِيَادَةَ أَكْثَرُ ثَوَابًا مِنَ الْإِطْعَامِ وَالْإِسْقَاءِ الْآتِيَيْنِ حَيْثُ خَصَّ الْأَوَّلَ بِقَوْلِهٖ وَجَدْتَنِىْ عِنْدَهٗ فَإِنَّ فِيْهِ إِيْمَاءً إِلٰى أَنَّ اللهَ تَعَالٰى أَقْرَبُ إِلَى الْمُنْكَسِرِ الْمِسْكِيْنِ﴾

(مرقاۃ المفاتیح شرح مشکاۃ المصابیح، کتاب الجنائز، باب عیادۃ المریض)

(۲)...... اس بیماری سے حفاظت حاصل ہوجائے گی۔ جیسا کہ حدیث شریف میں وعدہ آیا ہے کہ بیمار کے پاس جا کر اگر یہ دعا پڑھے تو جتنی بھی عمر اس کو حاصل ہوجائے مگر وہ بیماری اس کو نہیں لگے گی بس اتنا خیال رہنا چاہیے کہ بیمار کے پاس یہ دعا بلند آواز سے نہ پڑھی جائے: "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ عَافَانِیْ مِمَّا ابْتَلَاکَ بِہٖ وَ فَضَّلَنِیْ عَلٰی کَثِیْرٍ مِّمَّنْ خَلَقَ تَفْضِیْلًا"

﴿عَنْ سَالِمِ بْنِ عَبْدِ اللهِ بْنِ عُمَرَ عَنِ ابْنِ عُمَرَ عَنْ عُمَرَ أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ رَأٰى صَاحِبَ بَلَاءٍ فَقَالَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِىْ عَافَانِىْ مِمَّا ابْتَلَاكَ بِهٖ وَفَضَّلَنِىْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقَ تَفْضِيْلًا إِلَّا عُوْفِىَ مِنْ ذٰلِكَ الْبَلَاءِ كَائِنًا مَا كَانَ مَا عَاشَ﴾

(سنن الترمذی، کتاب الدعوات عن رسول اللہ، باب مایقول اذا رأی مبتلی)

(۳)...... مریض کے دل کو تسلی دے کر خوش کرنا جیسا کہ حضرت ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ مومن کے دل کو خوش کرنا عبادت ہے۔ اِدْخَالُ السُّرُوْرِ فِیْ قَلْبِ الْمُؤْمِنِ عِبَادَۃٌ اور اس کے لیے لَا بَأْسَ طُھُوْرٌ پڑھنا بھی عبادت ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے جیسا کہ حدیث پاک میں آیا ہے کہ:

﴿عن ابن عبَّاس رَضِيَ اللهُ عَنهُما أنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيهِ وَسَلَّم دَخَل عَلَى أعرابِيٍّ يَعُودُهُ قال وَكَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيهِ وَسَلَّم إذا دَخَل عَلَى مَرِيْض يَعُودُهُ قال لا بَأْس طَهُورٌ إنْ شَاءَ اللهُ فقال لهُ لا بَأس طَهُورٌ إنْ شَاءَ الله قال قُلْتُ طَهُورٌ كَلَّا بَلْ هِيَ حُمّى تَفُورُ أو تَثُورُ عَلَى شَيْخ كَبِير تُزِيْرُهُ القُبُورَ فقال النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيهِ وَسَلَّم فَنَعَم إذًا﴾

(صحيح البخاري، كتاب المناقب، باب علامات النبوة في الاسلام)

(٤)......اپنے ایک مسلمان بھائی کا حق ادا کرنا۔حدیث پاک میں ہے:

﴿عَن عَلِيٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيهِ وَسَلَّم لِلمُسْلِمِ عَلَى الْمُسْلِمِ سِتٌّ بِالْمَعْرُوْف يُسَلِّمُ عَلَيهِ إذا لَقِيَهُ وَيُجِيْبُهُ إذا دَعَاهُ وَيُشَمِّتُهُ إذا عَطَسَ وَيَعُودُهُ إذا مَرِضَ وَيَتْبَعُ جَنَازَتَهُ إذا مَاتَ وَيُحِبُّ لَهُ مَا يُحِبُّ لِنَفْسِه﴾

(سنن الترمذي، كتاب الادب، باب ماجاء في تشميت العاطس، ج:٢، ص:١٠٢)

(۵)...... صبح کو کسی بیمار کی عیادت کرنے سے شام تک ستر ہزار فرشتوں کا اپنے واسطے دعا کرنے کی ڈیوٹی پر لگا دینا اور شام کو عیادت کرنے سے صبح تک یہی معاملہ چنانچہ آپ اور ہم جو مجلس میں آنے والے حضرات ہیں اگر حضرت والا کے پاس آتے وقت دوسری نیتوں کے ساتھ ساتھ عیادت اور مزاج پرسی کی نیت بھی کر لیں تو مفت میں ہمیں ستر ہزار فرشتوں کی دعاؤں کا خزانہ حاصل ہو جائے گا۔جیسا کہ حدیث شریف میں ہے:

﴿عَنْ عَلِيٍّ قَالَ مَا مِنْ رَجُلٍ يَعُوْدُ مَرِيْضًا مُمْسِيًا إلَّا خَرَجَ مَعَهُ سَبْعُوْنَ أَلْفَ مَلَكٍ يَسْتَغْفِرُوْنَ لَهُ حَتَّى يُصْبِحَ وَكَانَ لَهُ خَرِيْفٌ فِي الْجَنَّةِ وَمَنْ أَتَاهُ مُصْبِحًا خَرَجَ مَعَهُ سَبْعُوْنَ أَلْفَ مَلَكٍ يَسْتَغْفِرُوْنَ لَهُ حَتَّى يُمْسِيَ وَكَانَ لَهُ خَرِيْفٌ فِي الْجَنَّةِ﴾

(سنن ابي داؤد، كتاب الجنائز، باب في فضل العيادة على وضوء)

(٦)......اگر کوئی قرابت دار ہو تو صلہ رحمی کی نیت کر کے رشتہ جوڑنے کا ثواب حاصل کرنا جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جو رشتہ کو جوڑتا ہے اللہ اس کو اپنے سے جوڑ لیتے ہیں۔حدیث شریف میں ہے کہ:

﴿عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيهِ وَسَلَّم قَالَ إنَّ الرَّحِمَ شِجْنَةٌ مِنَ الرَّحْمٰنِ فَقَالَ اللهُ مَنْ وَصَلَكِ وَصَلْتُهُ وَمَنْ قَطَعَكِ قَطَعْتُهُ﴾

(صحيح البخاري، كتاب الأدب، باب من وصل وصله الله)

(۷)......اللہ تعالیٰ کے یہاں جنت میں اس کا ایک گھر تیار ہونا جیسا کہ روایت میں آیا ہے کہ جب کوئی کسی بیمار کی مزاج پرسی کے لیے جاتا ہے تو اس کو یوں خطاب ہوتا ہے:

﴿عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيهِ وَسَلَّم مَنْ عَادَ مَرِيْضًا أَوْ زَارَ أَخًا لَهُ فِي اللهِ نَادَاهُ مُنَادٍ أَنْ طِبْتَ وَطَابَ مَمْشَاكَ وَتَبَوَّأْتَ مِنَ الْجَنَّةِ مَنْزِلًا﴾

(سنن الترمذي، كتاب البر والصلة، باب ماجاء في زيارة الاخوان)

جو کسی بیمار کی عیادت کرے یا اپنے کسی بھائی کی اللہ کے لیے زیارت کرے۔ تو اس کو ایک پکارنے والا فرشتہ پکار کر کہتا ہے کہ خوش رہ اور تیرا چلنا اچھا ہوا اور تو جنت میں اپنا مقام بنالے۔

(۸)...... جنت کی نعمتوں اور پھلوں میں رہنا اور اس کے راستہ پر لگ جانا۔

﴿عَنْ ثَوْبَانَ مَوْلٰی رَسُوْلِ اللهِ صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ عَادَ مَرِیْضًا لَمْ یَزَلْ فِیْ خُرْفَةِ الْجَنَّةِ حَتّٰی یَرْجِعَ﴾

(صحیح مسلم، کتاب البر والصلة والآداب، باب فضل عیادة المریض)

(۹)...... جہنم سے ستر سال کی مسافت کی دوری کے بقدر دور کر دیا جانا۔ جیسا کہ حدیث شریف میں ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جس شخص نے اچھی طرح سے وضو کر کے ثواب کی نیت سے اپنے مسلمان بھائی کی عیادت کی تو اُسے ستر سال کی مسافت کی دوری جہنم سے دور کر دیا جاتا ہے اور بعض حضرات نے وضو کی قید نہیں ذکر کی۔

﴿عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِکٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ تَوَضَّأَ فَأَحْسَنَ الْوُضُوْءَ وَعَادَ أَخَاهُ الْمُسْلِمَ مُحْتَسِبًا بُوْعِدَ مِنْ جَهَنَّمَ مَسِیْرَةَ سَبْعِیْنَ خَرِیْفًا قُلْتُ یَا أَبَا حَمْزَةَ وَمَا الْخَرِیْفُ قَالَ الْعَامُ قَالَ أَبُوْ دَاوٗدَ وَالَّذِیْ تَفَرَّدَ بِهِ الْبَصْرِیُّوْنَ مِنْهُ الْعِیَادَةُ وَهُوَ مُتَوَضِّئٌ﴾

(سنن أبي داؤد، کتاب الجنائز، باب في فضل العیادة علی وضوء)

(۱۰)...... اتباع سنت کی نیت سے کہ مجھ کو سنت کی اتباع کی فضیلت حاصل ہو جائے۔ اس لیے کہ عیادت حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اہم سنتوں میں سے ہے۔ اور اس کی بدولت عند اللہ محبوبیت حاصل ہوتی ہے جو کہ ہمارا مقصدِ حیات ہے۔

دوستو! اس میں ایک بات اور کہتا چلوں اللہ تعالیٰ کو اپنے بندوں سے اتنی محبت ہے کہ جب ان کے بندے کو دیکھنے گئے تو اللہ نے ہمیں اپنا محبوب بنالیا اب آج گھروں میں چھوٹی چھوٹی باتوں پر لڑائی اور جھگڑے ہو رہے ہیں، میرے بھائی! یوں سوچ کر کے برداشت کرلیا کرو، کہ یہ میرا بھائی اور یہ میری بیوی ہے یہ میرے رشتہ دار ہیں اور جیسا کہ حدیث پاک میں ہے:

﴿اَلْخَلْقُ عِیَالُ اللهِ فَاَحَبُّ الْخَلْقِ اِلَی اللهِ مَنْ اَحْسَنَ اِلٰی عِیَالِهٖ﴾

(مشکاة المصابیح، کتاب الاداب، باب الشفقة والرحمة)

کہ ساری مخلوق اللہ کا کنبہ ہے تو ہر انسان، اللہ تعالیٰ کا بندہ ہے اگر میں نے ذرا برداشت کیا تو اللہ مجھے اپنا محبوب بنالیں گے کیونکہ کوئی باپ ہو آپ اس کے بیٹے کو درگزر کریں اور حسن سلوک کریں اس سے دوستی رکھیں تو بیٹے کی دوستی سے آپ باپ کے یہاں دوست بن جائیں گے اور بلکہ ایک ترکیب ہے جو کوئی آپ سے بہت زیادہ حسد کرتا ہو تو ایک تو آپ اس کیلئے دعا شروع کر دیں۔

اور اس کے بچوں سے الفت ومحبت کا اظہار کرنے لگیں کبھی کچھ کھانے پینے کی چیز دے دیا کریں تو ان شاء اللہ رفتہ رفتہ اس کا حسد کم ہوتا چلا جائے گا۔

کسی مخلص کی ضائع کوئی قربانی نہیں جاتی

کسی مخلص کی ضایع کوئی قربانی نہیں جاتی
کسی کے قلب سے جو آہ پنہانی نہیں جاتی

اگر چہ معاف کردیتے ہیں وہ اپنی محبت سے
مگر میں کیا کروں میری پشیمانی نہیں جاتی

بتوں کی بے وفائی کا کیا ہے تجربہ تو نے
مگر اے نفس پھر بھی تیری نادانی نہیں جاتی

ترا بچپن یہ پچپن میں مجھے حیرت ہے اے ناداں
بڑھاپے میں بھی تیری خوئے طفلانی نہیں جاتی

عجب دُرویش ہیں تیرے کہ گدڑی پوش ہو کر بھی
بہ فیض نور نسبت شان سلطانی نہیں جاتی

محبت میں کبھی ایسے بھی دن آتے ہیں اے اختر
کہ رونے پر بھی غم کی اشکباری نہیں جاتی

مشکل الفاظ کے معانی:۔ **آہِ پنہانی**: دل کا رونا۔ **پشیمانی**: ندامت۔ **بتوں**: بت کی جمع مراد تمام نامحرم عورتیں اور حسین لڑکے۔ **خوئے طفلانی**: بچکانہ عادت۔ **شانِ سلطانی**: بادشاہوں کی شان۔ **اشکباری**: آنسو بہانا۔

کسی بھی مخلص کی قربانی ضائع نہیں جاتی ہے

کسی مخلص کی ضائع کوئی قربانی نہیں جاتی
کسی کے قلب سے جو آہ پنہانی نہیں جاتی

حضرت والا دامت برکاتہم کا یہ کلام ہے جس کا عنوان ہے کسی مخلص کی ضائع کوئی قربانی نہیں جاتی۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے قرآن پاک میں اعلان فرمایا:

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ﴾

(سورۃ التوبۃ: اٰیۃ ۱۲۰)

اللہ تعالیٰ محسنین کے اجر کو ضائع نہیں کرتے۔ اس کا معنیٰ یہ نہیں ہوتا کہ ایک انسان اخلاص کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرر ہا ہے اور یہ خیال کرر ہا ہے کہ اس کے ذہن اور سوچ کے مطابق اس پر مرتب ہونے والے نتائج جلد سے جلد حاصل ہو جائیں یا جو کچھ وہ اپنے ذہن میں سوچے ہوئے ہے وہ اسی کے مطابق مل جائے اور اسے حاصل

ہو جائے قربانی کے ضائع نہ ہونے کا یہ معنیٰ نہیں ہے بلکہ اس کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس پر اجر و ثواب تو ضرور دینگے مگر بہت سی مرتبہ بندہ اپنے لیے جلد بازی میں کوئی چیز تجویز کرتا اور سوچتا ہے کہ میں تقویٰ اختیار کر رہا ہوں اور نیک بن گیا ہوں تو اب مجھے میری فلاں فلاں ضرورت مل جانی چاہیے لیکن اللہ سبحانہ وتعالیٰ جانتے ہیں کہ دنیا میں اس کو اس کے مقاصد اور ضروریات میں سے کونسی دی جانی چاہیے اور کیا کچھ آخرت کے لیے ذخیرہ کر کے رکھ لینا چاہیے تو آخرت میں جو ملے گا یہ ضائع ہونا نہیں ہے بلکہ دائمی نعمت اور راحت کی صورت تو آخرت ہی میں ملنا ہے اس لیے روایت میں ہے کہ وہ لوگ کہ جن کو دنیا میں ہر طرح کی عافیت اور راحت ملی تھی وہ قیامت کے دن جب ان لوگوں کو دیکھیں گے کہ جو کبھی مرض میں، کبھی کسی مصیبت میں، کبھی کسی الجھن میں مبتلا ہوتے رہتے تھے اور اسی طرح ان کی زندگی کٹ گئی جب وہ آخرت میں دیکھیں گے کہ مصیبت میں مبتلا لوگوں کو جو اجر و ثواب دیئے جا رہے ہیں یہ تو بہت زیادہ ہیں تو وہ کہیں گے:

﴿ يَوَدُّ اَهْلُ الْعَافِيَةِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ حِيْنَ يُعْطٰى اَهْلُ الْبَلَاءِ الثَّوَابَ لَوْ اَنَّ جُلُوْدَهُمْ كَانَتْ قُرِضَتْ فِي الدُّنْيَا بِالْمَقَارِيْضِ ﴾

(سنن الترمذي، كتاب الزهد، باب ماجآء في ذهاب البصر)

کہ کاش! ان کی کھالوں کو دنیا میں قینچیوں سے کاٹا جاتا یعنی اسی طرح سے وہ بھی مصائب میں مبتلا رہتے کیونکہ اتنا اجر و ثواب دیکھیں گے کہ اس کی کثرت کو دیکھ کر یہ تمنا پیدا ہوگی۔ جیسا کہ ایک دوسری روایت میں ہے:

﴿ قَالَ إِبْرَاهِيْمُ بْنُ مَهْدِيَ السَّلَمِيُّ عَنْ أَبِيْهِ عَنْ جَدِّهِ وَكَانَتْ لَهُ صُحْبَةٌ مِنْ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ إِنَّ الْعَبْدَ إِذَا سَبَقَتْ لَهُ مِنَ اللهِ مَنْزِلَةٌ لَمْ يَبْلُغْهَا بِعَمَلِهِ ابْتَلَاهُ اللهُ فِيْ جَسَدِهِ أَوْ فِيْ مَالِهِ أَوْ فِيْ وَلَدِهِ قَالَ أَبُوْ دَاوُدَ زَادَ ابْنُ نُفَيْلٍ ثُمَّ صَبَّرَهُ عَلٰى ذٰلِكَ ثُمَّ اتَّفَقَا حَتّٰى يُبْلِغَهُ الْمَنْزِلَةَ الَّتِيْ سَبَقَتْ لَهُ مِنَ اللهِ تَعَالٰى ﴾

(سنن أبي داؤد، كتاب الجنائز، باب الأمراض المكفرة للذنوب)

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ کبھی بندہ اپنے عمل سے اس درجے پر نہیں پہنچ پاتا جو اللہ نے اس کے لیے مقرر فرمایا ہے یعنی بہت اونچا مقام تو پھر اللہ تعالیٰ اسے کسی جانی یا مالی نقصان یا اولاد میں کمی کی مصیبت میں مبتلا کرتے ہیں اور پھر اسے صبر کی توفیق دے کر اسے اس درجہ پر پہنچا دیتے ہیں۔

ہم یہ سمجھتے ہیں کہ میں نیک بھی بن گیا اور دعائیں بھی کر رہا ہوں لیکن پھر یہ کیا ہو رہا ہے میں اپنی دعاؤں کا اثر دنیا میں کیوں نہیں دیکھ رہا ہوں۔ دراصل بات یہ ہے کہ تمہاری دعائیں بھی قبول اور تمہاری نیکیاں بھی۔ قبول وہ سب ضائع نہیں ہو رہی ہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے تمہارا جو مقام رکھا ہے اور جو اونچا مرتبہ آخرت میں تمہارے لیے طے کیا ہے اللہ تعالیٰ تمہیں اس پر لے جانا چاہتے ہیں جب دنیا میں آنکھ بند ہو کر آخرت میں آنکھ کھلے گی اور وہ مرتبہ اور

مقام تمہیں نظر آئے گا تو پتہ چلے گا کہ واقعی اللہ تعالیٰ کسی کے اجر کو ضائع نہیں کرتے اور قربانی ضرور رنگ لاتی ہے۔

اور یہ اللہ تعالیٰ کا کرم ہے کہ جس کو ہم قربانی سمجھتے ہیں اس پر اللہ اجر دیتے ہیں ورنہ خود ہم کو اس قربانی کے عطا کرنے والے وہ بھی تو اللہ تعالیٰ ہی ہیں۔ اگر بندہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں جان دیدے یا مال دے دے تو جان اور مال دینے کی توفیق بھی تو ہمیں اسی اللہ نے دی ہے تو وہ خود اللہ کا ممنون کرم ہے اور اللہ کا ہم اس پر شکر ادا کریں کہ اے اللہ جو توفیق دی ہے یہ آپ کا فضل و کرم ہے ورنہ ہم خود اپنی چاہت سے یہ قربانی پیش نہیں کر سکتے تھے اور پھر اس کی نسبت ہماری طرف کر کے ہمیں اس پر اجر و ثواب دے رہے ہیں۔

قبولیتِ عمل کی شرائط

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَمَنْ أَرَادَ الْآخِرَةَ وَسَعَىٰ لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُولَٰئِكَ كَانَ سَعْيُهُم مَّشْكُورًا﴾

(سورة الاسراء، اية: ١٩)

ترجمہ: اور جو شخص (اپنے اعمال میں) آخرت (کے ثواب) کی نیت رکھے گا اور اس کے لیے جیسی کوشش کرنی چاہیے ویسی ہی کوشش بھی کرے گا۔

مطلب یہ ہے کہ ہر کوشش بھی مفید نہیں بلکہ کوشش صرف وہی مفید ہے جو شریعت اور سنت کے موافق ہو کیونکہ حکم ایسی ہی کوشش اور عمل کا دیا گیا ہے اور جو عمل اور سعی شریعت و سنت کے خلاف ہو وہ مقبول نہیں) بشرطیکہ وہ شخص مومن بھی ہو سو ایسے لوگوں کی یہ سعی مقبول ہوگی غرض اللہ کے یہاں کامیابی کی شرطیں چار ہوئیں اول تصحیح نیت یعنی خالص ثواب آخرت کی نیت ہونا جس میں اغراض نفسانی شامل نہ ہو۔ دوسرے اس نیت کے لیے عمل اور کوشش کرنا صرف نیت و ارادہ سے کوئی کام نہیں ہوتا جب تک اس کے لیے عمل نہ کرے تیسرے تصحیح عمل یعنی سعی و عمل کا شریعت اور سنت کے مطابق ہونا کیونکہ مقصد کے خلاف سمت میں دوڑنا اور کوشش کرنا بجائے مفید ہونے کے مضر اور نقصان دہ ہے۔ اور چوتھی شرط جو سب سے اہم اور سب کا مدار ہے وہ تصحیح عقیدہ یعنی ایمان ہے ان شرائط کے بغیر کوئی عمل اللہ کے نزدیک مقبول نہیں۔

اس آیت میں سعی و عمل کے ساتھ لفظ سَعْيَهَا بڑھا کر یہ بتلا دیا گیا ہے کہ ہر عمل اور ہر کوشش نہ مفید ہوتی ہے نہ عند اللہ مقبول بلکہ عمل و سعی وہی معتبر ہے جو مقصد آخرت کے مناسب ہو اور مناسب ہونا یا نہ ہونا یہ صرف اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ہی بیان سے معلوم ہو سکتا ہے اس لیے جو نیک اعمال خود رائی اور من گھڑت طریقوں سے کیے جاتے ہیں جن میں بدعات کی عام رسوم شامل ہیں وہ دیکھنے میں کتنے ہی بھلے اور مفید نظر آئیں مگر آخرت کے لیے سعی مناسب نہیں اس لیے نہ وہ اللہ کے نزدیک مقبول ہیں اور نہ آخرت میں کارآمد۔

اور تفسیر روح المعانی نے سَعۡیَهَا کی تشریح میں سعی کے مطابق سنت ہونے کے ساتھ یہ بھی لکھا ہے کہ اس عمل میں استقامت بھی ہو یعنی عمل مفید مطابق سنت بھی ہو اور اس پر استقامت اور مداومت بھی ہو۔ بدنظمی کے ساتھ کبھی کرلیا کبھی نہ کیا اس سے پورا فائدہ نہیں ہوتا۔

پھر حضرت والا نے شعر میں لفظ مخلص استعمال فرمایا اس لفظ کے استعمال میں حضرت نے اس مضمون کی طرف اشارہ فرمایا ہے جو مختلف کتابوں میں ان الفاظ کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ اگرچہ صحیح قول کے مطابق یہ حدیث نہیں ہے، مگر دوسرے دلائل قرآن و حدیث سے ثابت ہے اور حضرت تھانوی کے خطبات الجمعہ میں بھی مذکور ہے:

﴿اَلۡخَلۡقُ کُلُّهُمۡ هَلۡکٰی اِلَّا الۡعَامِلُوۡنَ وَالۡعَامِلُوۡنَ کُلُّهُمۡ هَلۡکٰی اِلَّا الۡعَالِمُوۡنَ وَالۡعَالِمُوۡنَ کُلُّهُمۡ هَلۡکٰی اِلَّا الۡمُخۡلِصُوۡنَ وَالۡمُخۡلِصُوۡنَ عَلٰی خَطَرٍ عَظِیۡمٍ﴾

(مرقاۃ الفاتیح، کتاب الآداب، باب البر والصلۃ)

کہ تمام لوگ ہلاکت اور خسارے میں ہیں مگر وہ لوگ جو عالم ہوں اور وہ علماء بھی ہلاکت اور خسارے میں ہیں بجز ان کے جو اس علم پر عمل کرنے والے ہوں اور وہ عمل کرنے والے بھی ہلاکت میں اور خسارے میں ہیں سوائے ان لوگوں کے جو کہ مخلص ہوں اور مخلصین خطرہ عظیم پر ہیں۔

تو دوستو! جب عمل اللہ کی رضا کے لیے اخلاص کے ساتھ کیا جائے تب ہی وہ معتبر ہے اور وہی عمل ہے جس پر (عنداللہ) اللہ تعالیٰ کے یہاں اجر ملے گا اسی لیے اِنَّ اللّٰهَ لَا یُضِیۡعُ اَجۡرَ الۡمُحۡسِنِیۡنَ یعنی اللہ تعالیٰ محسنین کے اجر کو ضائع نہیں فرماتے'' ارشاد فرمایا گیا ہے۔ آیت میں محسنین کا معنی و مطلب وہی لوگ ہیں جو خالص اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے دینی اعمال کرتے ہوں اور جنہوں نے غیر اللہ کو اس میں بالکل شامل نہ کیا ہو کیونکہ اگر غیر اللہ نیت میں شامل ہو تو علماء نے لکھا ہے کہ پھر وہ احسان نہیں ہے صفت احسان میں ضروری ہے کہ صرف اللہ کی ذات پیش نظر ہو اور صرف اللہ کی ذات مقصود ہو تو پھر ایسے مخلص بندے کی قربانی اللہ تعالیٰ ضائع نہیں فرماتے اسی لیے اللہ کے راستے میں جو اپنی خواہشات، ناجائز تمناؤں، آرزوؤں کو قربان کرتے ہیں اور یہ تلخ اور کڑوے گھونٹ پیتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کے قلب کو ایک ایسی آہ پنہانی عطا فرماتے ہیں کہ وہ آہ ان اہلِ دل اللہ والوں کے چہروں سے چمکنے اور آنکھوں سے چھلکنے لگتی ہے اور ان کے حالات اور کیفیات سے ظاہر ہو جاتی ہے اور یہ جو آہ اور دردِ محبت ہے یہ انبیاء علیہم الصلاۃ والسلام کی وراثت ہے، حضرات انبیاء کو یہ عطا ہوئی چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سجدے میں گر گر کس طرح آہیں بھرتے تھے پھر حضرات صحابہ کرام میں حضرت ابوبکر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ جیسا انسان جن کو جنت کی بشارت دی گئی اور کیا کچھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی فضیلت کے متعلق ارشاد نہیں فرمایا لیکن اللہ تعالیٰ کی عظمت وجلال کا جب دل پر غلبہ ہوتا تھا تو پھر وقتی طور پر سب مبشرات بھول جایا کرتے تھے اور تھوڑی دیر کے لیے ان سے

ذہول ہو جاتا تھا اور اتنی اللہ تعالیٰ کی عظمت ان کے قلب پر چھائی تھی کہ ایک دن صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اپنی زبان پکڑے بیٹھے تھے اور کھینچ رہے تھے ایک صحابی کے پوچھنے پر جواب ارشاد فرمایا:

﴿عَنْ زَيْدِ بْنِ أَسْلَمَ عَنْ أَبِيْهِ أَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ دَخَلَ عَلٰى أَبِيْ بَكْرِ الصِّدِّيْقِ وَهُوَ يَجْبِذُ لِسَانَهُ فَقَالَ لَهُ عُمَرُ مَهْ غَفَرَ اللّٰهُ لَكَ فَقَالَ أَبُوْ بَكْرٍ إِنَّ هٰذَا أَوْرَدَنِي الْمَوَارِدَ﴾

(مؤطا مالک، کتاب الکلام، باب ما جآء فيما يخاف من اللسان)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے ہاں تشریف لے گئے تو دیکھا کہ وہ اپنی زبان کو کھینچ رہے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ذرا ٹھہر و تو اے ابوبکر! اللہ تعالیٰ تمہیں معاف فرمائیں (یہ کیا کر رہے ہو؟) تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ میری زبان نے مجھے ہلاکت کی جگہوں میں لا کھڑا کیا ہے۔

حالانکہ یہ وہ لوگ تھے کہ ایک جملہ بھی ان کا بے مقصد اور فضول نہیں نکلتا تھا تو حضرت فرماتے ہیں جب کوئی یہ قربانی دے گا اللہ تعالیٰ قلب میں یہ دردِ محبت عطا فرما دیں گے اور پھر اسی سے آہ و فغاں ظاہر ہوتی ہے۔

اللہ کی معافی اور بندہ کی پشیمانی

اگر چہ معاف کر دیتے ہیں وہ اپنی محبت سے
مگر میں کیا کروں میری پشیمانی نہیں جاتی

اوپر کے مصرعے میں حضرت والا دامت برکاتہم نے اللہ تعالیٰ کی سنت اور اس کے وعدوں کا بیان فرمایا ہے جو ایک تائب کی توبہ پر اللہ تعالیٰ نے کیے ہیں اگر توبہ کے ابواب کھول کر انسان پڑھ لے تو اسے یہ محسوس ہوگا کہ اگر میں 24 گھنٹے بھی گناہوں میں گزار رہا ہوں اور ساٹھ اور ستر سال کی ساری عمر اسی طرح گناہوں میں گزاری اور اتنے گناہ کیے ہوں کہ اس زمین سے لے کر آسمان کی جو یہ چھت ہے وہاں تک ہو جائیں اور ساری زمین گناہوں سے بھر جائے بِقُرَابِ الْاَرْضِ خَطِيْئَةً میرے پاس لے کر کوئی آئے اور پھر وہ مجھ سے معافی مانگتا ہوا آئے تو بھی میں اس کے سارے گناہوں کو معاف کر دیتا ہوں اور ایک جگہ روایت میں ہے وَ لَا اُبَالِيْ اور میں پرواہ نہیں کرتا اور اتنے بڑے گناہ گار کو بھی بخش دیتا ہوں اور مجھ سے کوئی پوچھنے والا نہیں کہ پوچھے کہ اتنے بڑے گناہ گار کو کیوں معاف کر دیا؟ جیسا کہ حدیثِ قدسی میں یوں ارشاد فرمایا گیا ہے:

﴿عَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى يَا ابْنَ اٰدَمَ إِنَّكَ مَا دَعَوْتَنِيْ وَرَجَوْتَنِيْ غَفَرْتُ لَكَ عَلٰى مَا كَانَ مِنْكَ وَلَا اُبَالِيْ. يَا ابْنَ اٰدَمَ لَوْ بَلَغَتْ ذُنُوْبُكَ عَنَانَ السَّمَآءِ ثُمَّ اسْتَغْفَرْتَنِيْ غَفَرْتُ لَكَ وَلَا اُبَالِيْ. يَا ابْنَ اٰدَمَ إِنَّكَ لَوْ أَتَيْتَنِيْ بِقُرَابِ الْأَرْضِ خَطَايَا ثُمَّ لَقِيْتَنِيْ لَا تُشْرِكُ بِيْ شَيْئًا لَأَتَيْتُكَ بِقُرَابِهَا مَغْفِرَةً﴾

(سنن الترمذی)

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے انسان! تو جب تک مجھ سے دعا کرتا رہے گا اور اُمید رکھے گا میں تجھے معاف کرتا رہوں گا جو بھی خطا تجھ سے ہو اور مجھے کوئی پرواہ نہیں۔ اور اے انسان! اگر تیرے گناہ آسمان کی چھت تک پہنچ جائیں پھر تو مجھ سے مغفرت چاہے تو بھی تجھے بخش دوں گا اور مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں ہے۔ اے انسان! تو اگر میرے پاس زمین بھر کر خطائیں لائے اور پھر تو مجھ سے اس حال میں ملے کہ میرے ساتھ کسی چیز کو شریک نہیں ٹھہراتا تو بھی تجھ سے زمین بھر کر مغفرت کے ذریعہ ملوں گا۔

کیونکہ میں کامل خودمختار ہوں مجھے اختیارِ کلی ہے میرے سوا اور کوئی دوسرا خدا نہیں ہے جو مجھ سے سوال کرے یا میرا کوئی پاٹنر (partner) اور شریک نہیں ہے کہ جو مجھ سے پوچھے کہ اتنے گناہ گار کو کیوں معاف کیا۔

آہ! کیسا پیارا ہمارا اللہ ہے یہ تو حضرت نے اللہ تعالیٰ کے یہاں جو بندوں کے ساتھ معاملہ ہے اس کو ذکر کیا ہے کہ اللہ غفور ہے اور آگے قرآن کریم میں لفظ ودود بھی آیا ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے **وَهُوَ الْغَفُوْرُ الْوَدُوْدُ** سبحان اللہ! دونوں مبالغے کے صیغے ہیں کہ جو بہت معاف کرنے والا، جو اپنے بندوں سے بہت محبت کرنے والا ہے اور ایک جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاِنِّیْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدٰی﴾

(سورۃ طٰہٰ، آیۃ: ۸۲)

ترجمہ: اور میری بڑی بخشش ہے اس پر جو توبہ کرے اور یقین لائے اور کرے بھلا کام پھر راہ پر رہے۔

(معارف القرآن، ج۱ صفحہ ۱۲۷)

لیکن آگے حضرت فرماتے ہیں کہ بندے کو بھی تو چاہیے کہ ہر وقت اپنے کئے ہوئے کے اوپر پشیمان اور نادم و شرمندہ رہے اور زندگی کے اخیر سانس تک اپنے سے صادر ہوئی خطاؤں اور غفلتوں اور گناہوں پر نادم رہے کیونکہ ہم سے حق عبادت کہاں ادا ہوا؟ اور کہاں حق معرفت ادا ہوا؟ ان سب تقصیرات پر اللہ کے سامنے آہ وزاری کرتا رہے اسی لیے اللہ والا بننے کی حقیقت کیا ہے؟ میں تو یہ عرض کرتا ہوں کہ بس اپنے نقائص اور معائب کھل کر اس طرح سامنے آجائیں کہ اپنی حقیقت کا پتہ چل جائے، اپنی حیثیت و قیمت کا حال دل پر واضح ہو جائے اسی لیے یہ ایک سچی حقیقت ہے کہ اللہ والے جو ہوتے ہیں وہ اندر سے ایسے ہو جاتے ہیں کہ ہر وقت پشیمان اور نادم اور مقام توبہ میں رہتے ہیں ہم سب کو ہر وقت اسی طرح رہنا چاہیے کیونکہ ہماری عبادت بھی اس قابل ہے کہ ہم اس پر اللہ سے توبہ کریں اور غفلتوں کی معافی مانگیں کہ جس طرح ہمیں کرنی چاہیے ہم اس طرح نہیں کر پائے جب بندہ ہر وقت مقام توبہ میں رہے گا اور توبہ پر محبوبیت کا وعدہ ہے تو ان شاء اللہ سے موت بھی آئی گی تو محبوب خدا ہوگا۔

بتوں کی بے وفائی پھر بھی نفس کی نادانی

بتوں کی بے وفائی کا کیا ہے تجربہ تو نے
مگر اے نفس پھر بھی تیری نادانی نہیں جاتی

بتوں سے حضرت والا کی مراد غیر محرم عورتیں اور امرد (بے ریش حسین لڑکے) ہیں ان سے عشق اور تعلق کا نتیجہ بے وفائی کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے جیسا کہ حضرت والا کے مختلف اشعار کے ضمن میں یہ مضمون بکثرت آیا ہے اور حقیقت تو یہ ہے کہ وفا کی صحیح حقیقت سے دنیا کا ہر ذرہ خالی ہے اس لیے کہ ہم اس سے بہت جلد جدا ہو کر سب کچھ یہیں چھوڑ کر چلے جانے والے ہیں اس لیے دنیا کے چکروں میں لگنا اور اپنے کو پھنسانا یہ بہت بڑی نادانی ہے۔

بچپن میں بچپن کی عادتیں

ترا بچپن یہ بچپن میں مجھے حیرت ہے اے ناداں
بڑھاپے میں بھی تیری خوئے طفلانی نہیں جاتی

جب انسان عمر رسیدہ ہو جاتا ہے تو پھر اس کے اندر سے بچپن کی خصلتیں دور ہو کر وقار اور عزت واحترام اور سمجھ بوجھ دور اندیشی جیسی صفات پیدا ہو جاتی ہیں مگر جو شخص اپنی عمر کا ایک بڑا حصہ گزر جانے اور عالم آخرت سے قریب ہونے کے باوجود دنیا کے چکروں میں مشغول و مصروف اور اس کے فانی بتوں کے ساتھ دل اٹکائے ہوئے ہو تو یہ کس قدر افسوس اور تعجب کی بات ہے اور یہ بالکل ایسے ہی ہے کہ ایک شخص اپنی گاڑی مشرق کی طرف لیے جارہا ہو اور اس کی نظر مغرب کی جانب میں ہو تو کیا اس کی تباہی اور انجام کی بربادی میں کوئی شک ہوگا حضرت عارفی فرماتے ہیں ؎

قدم سوئے عقبیٰ نظر سوئے دنیا
کہاں جا رہے ہو کدھر دیکھتے ہو

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس امت کی عمر کے متعلق ارشاد فرمایا:

﴿أَعْمَارُ أُمَّتِي مَا بَيْنَ سِتِّيْنَ إِلَى سَبْعِيْنَ﴾

(سنن الترمذی، کتاب الدعوات، باب اعمار الامۃ)

میری امت کی عمریں ساٹھ اور ستر کے درمیان ہیں جس کی مراد اور مفہوم یہ ہے کہ اکثر حضرات اس سے متجاوز نہیں ہونگے اس لیے پچپن اور ساٹھ برس میں پہنچنے کے بعد انسان دنیا کو چھوڑنے اور آخرت میں پہنچے کے قریب ہو جاتا ہے جس کا فطری نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ زیادہ سے زیادہ بھرپور طریقے سے رات و دن آخرت کے لیے تیاری پر لگ جائے اور جو چیز آخرت میں کام آنے والی ہے اس کو زیادہ سے زیادہ ساتھ لینے کی کوشش کرے یعنی اللہ کی خوب عبادت اور دین کے کاموں میں مشغولیت اور ذکر و تلاوت، توبہ و استغفار، صلوٰۃ و مناجات وغیرہ کا خوب اہتمام

رکھے کیونکہ یہی سب چیزیں آخرت میں ساتھ جانے والی ہیں باقی سب کچھ یہیں رہ جانے والا ہے مگر افسوس کہ پچپن میں پہنچنے کے بعد بھی ہماری حالت وہی بے فکری اور غفلت کی رہتی ہے جیسا کہ بچپن میں آدمی کی عادت ہوا کرتی ہے اسی صورت حال پر حضرت والا اس شعر میں اظہار افسوس فرما رہے ہیں۔

گدڑی پوش ہو کر تاج پوشوں سے زیادہ عزت

عجب درویش ہیں تیرے کہ گدڑی پوش ہو کر بھی
بہ فیض نور نسبت شان سلطانی نہیں جاتی

اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے ان خاص بندوں کے لیے جو اپنے مولیٰ پر سب کچھ قربان کر دیتے ہیں اور اپنے قلب میں اللہ تعالیٰ کی محبت کا درد رکھتے ہیں اور انہیں خاص نسبت مع اللہ کی شان حاصل ہوتی ہے فقیری میں بھی بادشاہی کا مزہ ہوتا ہے اور وہ بظاہر درویش ہو کر بھی کسی سلطان سے کم نہیں ہوتے بلکہ دنیا کے بادشاہوں سے بڑھ جاتے ہیں کیونکہ سلاطین دنیا کو انسانوں کے ظاہر پر حکومت حاصل ہوتی ہے جب کہ اہل اللہ کو لوگوں کے دلوں پر بادشاہت حاصل ہو جاتی ہے اور ہر طرف سے لوگ دل و جان اللہ والوں پر قربان کرنے کے لیے تیار نظر آتے ہیں اور ایسی عزت واحترام لوگوں کے دلوں میں منجانب اللہ ڈال دیا جاتا ہے کہ جو دنیا میں کسی کے لیے حاصل نہیں ہوتا جیسا کہ کئی احادیث مبارکہ اور مختلف آیتوں میں بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ وعدہ مذکور ہے کہ جب بندہ اللہ کا ہو جاتا ہے اور پورا پورا تقویٰ اختیار کر لیتا ہے تو اسے اللہ تعالیٰ اپنا محبوب بنا لیتے ہیں اور پھر اہل دنیا کے دلوں میں اس کی محبت ڈال دی جاتی ہے۔ چنانچہ اپنے بزرگوں کی پوری تاریخ ہماری نگاہوں کے سامنے ہے کہ انہوں نے اپنے کو اللہ کے لیے مٹایا اور اپنے سینوں میں نسبت مع اللہ کا خزانہ حاصل کیا تو ادھر اہل دنیا ان کی ایسی عزت کرنے لگے کہ جو بادشاہوں کو بھی نصیب نہیں ہوتی جیسا کہ کتاب میں دوسرے مختلف مقامات پر آیات واحادیث نقل کی گئی ہیں۔

محبت کی ایک نرالی ادا

محبت میں کبھی ایسے بھی دن آتے ہیں اے اختر
کہ رونے پر بھی غم کی اشکباری نہیں جاتی

حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگی میں غور سے مطالعہ کرنے کے بعد یہ بات واضح ہو کر سامنے آتی ہے کہ اکثر صحابہ کرام کو اللہ تعالیٰ کے خوف اور اس کی یاد میں رونے کی صفت حاصل تھی اور وہ راتوں میں اللہ کے سامنے کھڑے ہو کر اور سجدہ ریز ہو کر گزارا کرتے تھے اور دعاؤں میں بہت زیادہ آہ وفغاں کیا کرتے تھے اور احقر کے ناقص علم کے مطابق جب بھی کسی صحابی نے دوسرے صحابی کو روتا ہوا دیکھا اور پھر وجہ دریافت کی تو تقریباً ہر ایک

کے جواب سے یہی بات پتہ چلتی ہے کہ ان کے گریہ وبکا کا سبب کبھی بھی کوئی دنیا کا معاملہ اور مادی رنج وغم نہیں ہوا کرتا تھا۔کوئی مالی نقصان پیش آجانے یا کوئی دنیاوی مفاد فوت ہوجانے کی وجہ سے وہ لوگ رونے کے عادی نہیں تھے بلکہ جب بھی کوئی صحابی روتا ہوا ملا تو وجہ دریافت کرنے پر یہی بات سامنے آئی کہ آخرت کا کوئی غم ان کے گریہ و بکا کا سبب ہے اور کوئی دینی فکر ان کو رلا رہی ہے۔کبھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فراق اور جدائی کا اندیشہ، کبھی اپنے اعمال کو سوچ کر آخرت میں پیش آنے والے واقعات کا تصور کبھی ماضی میں گزرے ہوئے زمانے کو سوچ کر اس پر ندامت اور کبھی تن تنہا آخرت کا طویل سفر کرنے کی فکر، کبھی دنیا کی محبت کا خیال، تو کبھی قبر کی منزل کا ڈر وغیرہ وغیرہ جیسے امور حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو رلایا کرتے تھے۔

جب کہ آج کی صورت حال اس سے بالکل مختلف نظر آتی ہے کہ جدھر جاؤ آہ وزاری کرنے والے تو ملیں گے مگر جو رو رہیں ہیں سب کے سب مالی معاملات اور دنیوی عیش وعشرت میں نقصان اور کمی کا درپیش ہونا اور دوسری دنیوی اور مادی وجوہات کی وجہ سے روتے ہوئے نظر آئیں گے۔جس کی وجہ سے دل ودماغ پریشانی کا شکار رہتے ہیں اور زندگی میں مایوسی اور اداسی چھائی رہتی ہے۔

بس اس موقع پر یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ جسے اپنے لیے رلاتے ہیں تو پھر اس کو دوسروں کے در پر رونے کا موقع نہیں آنے دیتے اور جسے آخرت کے غم میں رونے کی سعادت میسر آتی ہے اسے دنیا کے غموں میں پڑ کر گریہ وزاری سے بچالیا جاتا ہے اور اسے اس رونے میں ایسا کیف وسرور اور مزہ نصیب ہوتا ہے کہ عین روتے وقت ہنسنے کا مزہ اور اللہ کی راہ کے غموں کو اٹھانے کے وقت خوشیوں کا مزہ نصیب ہوتا ہے اور یہ کیفیت اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندے کو ملنے والی ایک عظیم الشان نعمت ہے جس میں کبھی وہ حالت ہوتی ہے جو اس شعر میں مذکور ہے کہ اللہ کے سامنے خوب رو لینے کے باوجود بھی دل بھرتا نہیں ہے بلکہ مزید سے مزید رونے کو جی چاہتا ہے جس کے نتیجے میں دل کو بڑی ٹھنڈک اور سرور حاصل ہوتا ہے جیسا کہ مولانا رومی نے اس تمنا کا اظہار اس طرح سے کیا ؎

اے دریغا اشک من دریا بدے
تا نثار دلبر زیبا شدے

اور جیسا کہ حضرت خواجہ صاحب نے اسی کو یوں فرمایا ہے ؎

ہو گئی خشک چشم تر بہہ گیا ہو کے خوں جگر
رونے سے دل مرا مگر ہائے ابھی بھرا نہیں

لباس فقر میں بھی شان سلطانی نہیں جاتی

کبھی گو شان دردِ دل کی پہچانی نہیں جاتی
رخ عارف سے لیکن شان سلطانی نہیں جاتی

زمانہ ہو گیا گلشن میں رہتا ہوں مگر پھر بھی
مری فطرت سے کیوں خوئے بیابانی نہیں جاتی

ہزاروں شاخ میں تقسیم کر ڈالا محبت نے
مگر پھر بھی مرے دریا کی طغیانی نہیں جاتی

ہزاروں فتنہ دلکش میں ہوتے ہیں گھرے لیکن
جو ربانی ہیں ان کی شان ربانی نہیں جاتی

عناصر مضمحل پیری سے اہل اللہ کے بھی ہیں
مگر چہرے سے ان کے پھر بھی تابانی نہیں جاتی

اٹھا جاتا نہیں ہے بے سہارے پھر بھی یہ کیا ہے
کہ ان کے قلب سے مستی و جولانی نہیں جاتی

بظاہر فقر ہے دامن میں لیکن کیا ہے باطن میں
کہ جس سے پھر بھی ان کی شان سلطانی نہیں جاتی

کہوں میں کس طرح سے شان ان اللہ والوں کی
لباس فقر میں بھی شان سلطانی نہیں جاتی

گئے تھے بھول مرشد پھول پوری نام بھی اپنا
حضور حق میں اپنی ذات پہچانی نہیں جاتی

محبت کی کرامت میں نے اختر یہ بھی دیکھی ہے
لباس عقل میں بھی چاک دامانی نہیں جاتی

مشکل الفاظ کے معانی: رُخ: چہرہ۔ **تابانی:** چمک۔ **گلشن:** باغ۔ **بیابانی:** صحرا یا ویرانے میں رہنے کی عادت۔ **دلکش:** دل کو کھینچنے والے فتنے۔ **ربانی:** اللہ والے۔ **عناصر:** ٹکڑے۔ **مضمحل:** کمزور۔ **پیری:** بڑھاپا۔ **مستی و جولانی:** اللہ تعالیٰ کی محبت کی کیفیت اور مزا۔ **فقر:** غربت۔ **باطن:** دل۔ **شانِ سلطانی:** بادشاہوں والی شان۔ **حضورِ حق:** اللہ تعالیٰ کے دربار میں حاضری۔ **چاکِ دامانی:** دامن پھٹا ہوا ہونا۔

رخِ عارف کی تابانی اور دردِ دل کی ترجمانی

کبھی گو شان دردِ دل کی پہچانی نہیں جاتی
رخِ عارف سے لیکن شانِ سلطانی نہیں جاتی

اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے خاص بندوں کو جنہیں اپنا دردِ دل عطا فرماتے ہیں اور اپنے قرب کی لذت سے آشنا کرتے ہیں تو ان کے چہروں پر ایسے انوارات وتجلیات رکھ دیتے ہیں کہ دوسرے لوگ ان کو دیکھتے ہی فوراً مرعوب اور متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ پاتے ہیں اور ان کے چہروں ہی پر اللہ تعالیٰ عجیب شان سلطانی کے اثرات رکھ دیتے ہیں جس کی بنیاد راتوں کی آہ وزاری اور تلاوت وعبادت وغیرہ ہے یہاں تک کہ اللہ والوں کی عمریں جتنی بڑھتی جاتی ہیں ان کے چہرے پر یہ تجلیات اور انوارات میں اضافہ ہی اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے کہ اپنے تو اپنے غیر بھی جب ان کے چہرے پر نظر ڈالتے ہیں متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے۔

خوئے بیابانی اور مزاجِ صحرانوردی

زمانہ ہو گیا گلشن میں رہتا ہوں مگر پھر بھی
مری فطرت سے کیوں خوئے بیابانی نہیں جاتی

یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ نے میرے اوپر یہ فضل فرمایا ہے کہ گلشن میں رہنے کے باوجود میں اپنی ابتدائی زندگی کے زمانے کے جونقوش عبادت وریاضت میرے قلب پر اپنے شیخ کی صحبت میں رہ کر جم گئے تھے وہ اسی طرح قائم اور برقرار ہے یعنی ظاہری طور پر کچھ دنیا کی چیزیں اور راحت وآرام کا سامان میسر آجانے کے باوجود میرا دل ان کے ساتھ وابستہ اور جڑا ہوا نہیں ہے بلکہ وہی جنگلوں میں رہ کر اللہ تعالیٰ کا نام لینے کا مزہ اور اپنے شیخ حضرت شاہ عبدالغنی پھولپوری کی معیت میں جو راتوں کی عبادتیں اور تلاوت ومناجات کے پر کیف مناظر دل میں رچے اور بسے تھے وہ آج بھی اسی طرح قائم ہے اور کیوں نہ ہو جب کہ دل کی صورت حال یہ ہے کہ اس سے یہ دنیائے دوں گر چکی ہے ؎

یہ جہاں گر گیا نگاہوں سے
جب کھلا حال دارِ فانی کا

حضرت تھانوی رحمہ اللہ اس حدیث شریف کے تحت اسی مضمون کو اس طرح تحریر فرماتے ہیں:

﴿عَنِ الزُّهْرِيِّ قَالَ حَدَّثَنِيْ عَطَاءُ بْنُ يَزِيْدَ اللَّيْثِيُّ أَنَّ أَبَا سَعِيْدِ الْخُدْرِيَّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ حَدَّثَهُ قَالَ قِيلَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ أَيُّ النَّاسِ أَفْضَلُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مُؤْمِنٌ يُجَاهِدُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِنَفْسِهِ وَمَالِهِ قَالُوْا ثُمَّ مَنْ قَالَ مُؤْمِنٌ فِيْ شِعْبٍ مِنَ الشِّعَابِ يَتَّقِي اللّٰهَ وَيَدَعُ النَّاسَ مِنْ شَرِّهِ﴾

(صحیح البخاری، والتکشف، ص: ۲۹۷)

حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ کسی نے (حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے) سوال کیا کہ یارسول اللہ! سب سے افضل کون شخص ہے؟ آپ نے فرمایا جو مؤمن اپنی جان و مال سے اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والا ہو۔ سوال کیا گیا کہ پھر کون شخص افضل ہے؟ آپ نے فرمایا جو شخص (پہاڑ کی) گھاٹیوں میں سے کسی گھاٹی میں رہتا ہو، اللہ سے ڈرتا ہو اور خلق کو اپنے شر سے فارغ کر رکھا ہو۔

اکثر اہل اللہ کی عادت رہی ہے کہ خلق سے اختلاط کم رکھا ہے اور گوشہ نشین رہے ہیں۔ اس حدیث سے اس کی اجازت اور ایک درجہ میں فضیلت ثابت ہوتی ہے اور حدیث میں اس کے محل کی طرف بھی اشارہ ہے کہ جب اختلاط میں احتمال ایصال شر الی الخلق کا ہو اور اسی پر قیاس کیا جائے گا وصول شر من الخلق کو اور نیز حدیث مذکور ہی میں یہ اشارہ بھی ہے کہ جس شخص سے خیر و نفع عام زیادہ متوقع ہو اُس کے لیے اختلاط افضل ہے۔ چنانچہ مؤمن مجاہد کو صاحبِ عزلت سے افضل فرمایا اور یہی خلاصہ ہے تحقیق کا مسئلہ مجوث عنہا میں کہ جس شخص سے مسلمانوں کو نفع پہنچتا ہو اُس کے لیے جلوت بہتر ہے اور جس سے نفع متعلق نہ ہو اور جلوت میں احتمال اضرار یا تضرر کا ہو اُس کے لیے خلوت بہتر ہے۔ (التکشف، صفحہ ۲۹۷)

اب یہاں ایک سوال ذہن میں آتا ہے کہ جب خلوت محبوب ہے اور جلوت میں رہ کر خوئے بیابانی نہیں جاتی تو پھر آخر گلشن میں رہ کر ایسی جلوت اختیار کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ بلکہ کسی صحرا و جنگل میں اور یا لبِ دریا اور دامنِ کوہ میں پہنچ کر اللہ تعالیٰ کو یاد کیا جائے اور وہیں زندگی گزاری جائے تو اُس کا جواب بھی اس مذکورہ حدیث کی شرح میں آگیا ہے کہ جس کے جلوت میں رہنے اور مخلوق سے اختلاط و میل و جول میں اُن کو نفع پہنچانے اور تبلیغِ دین کی نیت ہو تو پھر اُس کو یہیں رہنا زیادہ اجر و ثواب کا باعث ہوگا۔ اگرچہ دل کا حال خلوت و یکسوئی کے ساتھ وابستہ ہو۔ جیسا کہ جملہ اہل اللہ کی شان یہی ہوتی ہے۔

اور بس یہی فرق ہے اہل اللہ اور اہل دنیا میں کہ وہ گلشن میں ہوتے ہوئے خوئے بیابانی کے حامل رہتے ہیں اور اہل دنیا کو جب گلشن میسر آتا ہے اور ان کو ظاہری طور پر دنیا کے مال و دولت مل جاتے ہیں تو پھر وہ اپنے فقر و فاقہ اور بے بسی اور بے کسی کے حالات کو بھول کر دولت کے نشے میں مست ہو جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کو بھول بیٹھتے ہیں اور اس طرح دنیا ان کے دل میں گھس کر ان کی تباہی اور بربادی کا سبب بنتی ہے بالکل ٹھیک اسی طرح جیسے کشتی کے لیے پانی باہر رہنے کے بجائے اندر داخل ہو جائے تو پھر وہ کشتی اور کشتی والے سب غرق ہو کر ہلاک ہو جائیں گے۔

اس لیے اس شعر میں یہ سبق ہے کہ بندہ کسی بھی حال میں ہو اپنے اللہ کو فراموش نہ کرے اور ہمیشہ اپنا دل اللہ تعالیٰ کی ذات عالی کے ساتھ وابستہ رکھے اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ظاہری حالات بہت خوش گوار اور عمدہ کر دیئے جائیں تو بھی اپنے دل میں ان کی وجہ سے کوئی بڑائی اور تعلّی نہ آنے پائے دل سے ہر حال میں متواضع ہی

رہے اور اپنے اندر خوئے بیابانی لیے رہے جیسا کہ وہ تمام صحابہ کرام جن کو اللہ تعالیٰ نے دنیا میں مال و دولت عطا فرمایا تھا مگر ان کے دل اللہ تعالیٰ کی عظمت و محبت کی وجہ سے متواضع تھے۔

محبت کی ہزاروں شاخوں میں تقسیم

ہزاروں شاخ میں تقسیم کر ڈالا محبت نے
مگر پھر بھی مرے دریا کی طغیانی نہیں جاتی

اللہ تعالیٰ کی محبت ایسی چیز ہے کہ جسے حاصل ہو جاتی ہے وہ ہر طرح سے اللہ پر فدا ہونے کو اپنی سعادت سمجھتا ہے اور اپنی ادائے محبت مختلف شکلوں میں اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کرتا ہے کسی کو دیکھو تو اپنی گردن خدا کی راہ میں کٹا کر ادائے محبت دکھا رہا ہے تو کوئی تختہ دار پر لٹک کر اپنی وفاداری کا ثبوت پیش کر رہا ہے جب کہ کوئی اپنی سلطنت و حکومت چھوڑ کر اللہ کی محبت میں فقیری کو ترجیح دے رہا ہے تو کسی کو اپنی قوم کی طرف سے ملک بدر کیا جا رہا ہے لیکن اللہ تعالیٰ کی محبت میں سچا خدا کا عاشق ایسا مست و سرشار دکھائی دیتا ہے کہ ہر طرح کی قربانی دے کر اس کے دل میں جذبات محبت اسی طرح منڈلاتے رہتے ہیں۔

کیا ہی خوب حضرت نے اس کو تعبیر کیا ہے کہ مجھے محبت نے ہزاروں شاخوں میں تقسیم کر ڈالا کہیں گریہ و بکا ہے تو کہیں تلاوت و مناجات کی لذت سے محظوظ ہو رہا ہوں کہیں وعظ و بیان کے ذریعے اپنے جذبات محبت کو پیش کر رہا ہوں تو کہیں تصنیف و تالیف میں اپنے درد دل کی کہانی لکھنے پر مجبور ہوں کہیں اللہ کے عاشقوں کے بھرے مجمع میں اللہ اللہ کر کے اپنے محبوب کی یادوں میں مشغول ہوں تو کہیں دل ہی دل میں چپکے چپکے رو رو کر اپنے اللہ سے فریاد کر رہا ہوں۔

غرض یہ کہ محبت کی ہزاروں شاخوں میں تقسیم ہونے کے باوجود مجھے اپنے دل میں حاصل دریائے محبت خداوندی کی طغیانی میں کوئی کمی نظر نہیں آتی بلکہ دن بدن اور ترقی ہی محسوس ہو رہی ہے اور یہی اس محبت کا خاصہ ہے کہ جتنا محبوب پر ادائے محبت دکھائی جائے اتنی ہی وہ روز بروز بڑھتی جاتی ہے اور اللہ کی طرف سے محبت کے نئے رنگ عطا ہوتے رہتے ہیں اس لیے جتنے حضرت والا کے مواعظ در دِ محبت ہیں یہ سب در حقیقت اسی محبت خداوندی کے مختلف الوان ہیں۔

فتنۂ دلکش میں بھی شانِ ربانی کا باقی رہنا

ہزاروں فتنۂ دلکش میں ہوتے ہیں گھرے لیکن
جو ربانی ہیں ان کی شان ربانی نہیں جاتی

بشر بہ حیثیت بشر ہونے کے بشری تقاضوں سے خالی نہیں ہو سکتا اگرچہ وہ ولایت کے کسی بھی مقام پر پہنچ جائے اس لیے جس طرح فتنوں کا سامنا دوسرے عام مومنوں کو ہوتا ہے اسی طرح جو اللہ کے خاص بندے علمائے ربانیین ہیں وہ بھی اس سے گزرتے ہیں اور کیسے ہی مجاہدات ہوں ان کے ذریعے سے تقاضوں کو معدوم کر دینا مقصود ہی نہیں ہوتا اس لیے جس نوع کے بھی فتنے سامنے آئیں وہ ہر آدمی کے لیے چیلنج ہوتے ہیں اور اس کو اپنی

طرف کھینچنے اور دعوت دینے والے ہوتے ہیں بس اتنا فرق ہوتا ہے کہ جو ربانی ہیں وہ اپنے رب کی توفیق سے ایسے موقع پر اپنی شان ربانی کی بدولت عافیت اور حفاظت کے ساتھ ان فتنوں کی زد میں آنے سے اپنے کو بچا لیتے ہیں اور یہی اصل تقویٰ ہے اور یہی مقصود خداوندی ہے خواجہ صاحب نے اسی کو فرمایا ہے ؎

بہت گو ولولے دل کے ہمیں مجبور کرتے ہیں
تری خاطر گلے کا گھونٹنا منظور کرتے ہیں

اسی بات کو حضرت والا نے بڑے خوب انداز سے اپنے ایک وعظ میں اس طرح تعبیر فرمایا کہ انسان میں خواہشات تو برقرار رہیں گی خواہ وہ کتنا ہی بڑا ولی بن جائے کیونکہ اگر خواہشات نہ رہیں تو پھر تقویٰ کی بریانی نہیں پک سکتی، تقویٰ کی بریانی اسی طرح بنتی ہے کہ خواہشات کی لکڑیوں کو گرما کر پھر ان میں اللہ کی محبت کی آگ لگائی جاتی ہے اس آگ کے اوپر تقویٰ کی بریانی تیار ہو کر بڑی پرلطف اور باذائقہ بن جاتی ہے اور اگر خواہش ہی نہ ہو فرض کیجئے کہ ایک شخص نابینا ہے اب وہ کسی نامحرم کو دیکھ ہی نہیں سکتا اور اس سے یوں کہا جائے کہ خبردار کسی حسین کی طرف نظر نہ ڈالنا تو یہ بات اس کے حق میں فضول ہوگی اس لیے خواہشات بھی ہوں اور چاروں طرف سے فتنے بھی گھیرے ہوں اور پھر اللہ کے خوف سے اپنے کو ان فتنوں اور خدا کی نافرمانیوں میں مبتلاء نہ کرے اور جو بھی طبیعت پر غم ہوا سے اٹھالے۔

اسی لیے قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے جہاں غصہ پینے والوں کی تعریف فرمائی ہے تو اس مقام پر (والکاظمین الغیظ) فرمایا ہے" العادمین الغیظ "نہیں فرمایا جس کا مطلب یہ ہے: "کظم فم القربة" یعنی مشک کے منہ کو بند کرنا تو انسان کے اندر غصہ تو بھرا ہوا ہو اور جذبات غیظ وغضب تو موجود ہوں لیکن ان کو اوپر سے دبا دے اور ان پر قابو پائے اور کنٹرول کرے یہ صفت قابل تعریف ہے غصے کو ختم کرنا نہ مقصود ہے اور نہ ممدوح ورنہ اگر ایسا ہوتا تو اللہ تعالیٰ تعریف کرتے ہوئے یہ بات ارشاد فرماتے کہ جو لوگ غصے کو ختم کر چکے ہیں اور مادہ غیظ و غضب کو اپنے اندر سے نکال چکے ہیں وہ میرے متقی بندے ہیں اگر کوئی شخص اس کوشش میں لگا رہے کہ میں اپنے اندر سے غیظ وغضب کو بالکل ختم اور فنا کر دوں تو یہ بشری فطرت سے ٹکراؤ ہے اور انسانی بشری امور و اوصاف میں سے ایک وصف کا فقدان ہے جس کی وجہ سے مجاہدہ متحقق نہیں ہوتا جس پر قرآن وحدیث میں بہت سے وعدے کئے گئے ہیں کہ جس مجاہدے پر بندے کو مشاہدہ حق عطا کیا جاتا ہے۔

اور یہ مجاہدہ کرتے کرتے دل کی آنکھیں کھل جاتی ہیں جسے بصیرت اور نسبت کہتے ہیں اور دوسرے لفظوں میں اسی کو تاج ولایت کہتے ہیں جو ایک بار پہنائے جانے کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے پھر واپس نہیں لیا جاتا۔

﴿عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ...... وَسَأَلْتُکَ هَلْ يَرْتَدُّ أَحَدٌ مِنْهُمْ عَنْ دِيْنِهِ بَعْدَ أَنْ يَدْخُلَ يَعْنِي فِيْهِ سَخْطَةً لَهُ فَزَعَمْتَ أَنْ لَا وَكَذٰلِکَ الْإِيْمَانُ إِذَا خَالَطَ بَشَاشَةَ الْقُلُوْبِ﴾

(بخاری و مسلم و التکشف، ص: ۳۹۴)

ابن عباس رضی اللہ عنہ سے اُس حدیث کے ضمن میں جس میں ہرقل شاہ روم کی گفتگو ابوسفیان کے ساتھ منقول ہے (اور صحابہ کی جانب سے ہرقل کے ان اقوال پر انکار نہیں کیا گیا جن سے ان اقوال کا صحیح ہونا ثابت ہوتا ہے) یہ مضمون بھی مروی ہے۔ ہرقل ابوسفیان سے کہتا ہے کہ میں نے تم سے یہ سوال کیا کہ آیا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دین سے بعد اُس کے قبول کرنے کے کوئی مسلمان اُن کے دین سے ناخوش ہوکر مرتد ہوتا ہے، تم نے جواب دیا کہ نہیں اور ایمان کی یہی کیفیت ہوتی ہے جب اُس کی تازگی قلوب میں رچ جاتی ہے۔

اور یہی مضمون دوسرے عنوان سے مشہور ہے کہ **الواصل لایرجع** یعنی بعد وصول وفنا کے پھر راجع اور مردود نہیں ہوتا۔ اس حدیث سے اس کی صاف تائید ہوتی ہے اور گو یہ ہرقل کا قول ہے مگر جب سلف نے اس پر انکار نہیں کیا تو اس قول کی صحت سلف کے تسلیم سے ثابت ہوئی اور جو سالکین بگڑ گئے ہیں وہ واقع میں مقصود تک پہنچے ہی نہ تھے۔ گو ظاہر نظر میں وہ واصل سمجھے جائیں۔

یہ حق تعالیٰ کا ایسا عطیہ اور تحفہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مل جانے کے بعد عموماً سنت اللہ یہی ہے کہ واپس نہیں لیا جاتا اس لیے آپ نے نہیں سنا ہوگا کہ فلاں بزرگ بزرگ تھے اب نہیں رہے، یا فلاں شخص اللہ والے تھے اب اللہ والے نہیں رہے مگر اس سے ایسے لوگ مراد ہیں جو کہ واقعی اولیاء اللہ بن جاتے ہیں اور جنہیں حق تعالیٰ کا خصوصی قرب مل جاتا ہے جن کے لیے حدیث پاک میں حفاظت کا وعدہ فرمایا گیا ہے۔

اگر ہم غور سے دیکھیں تو ایسے ہی کچھ اصول دنیا میں بھی کارفرما نظر آتے ہیں کہ جب کسی کا نام ایک مرتبہ (کسی بھی ''والا'' کے ذریعے پڑ جاتا ہے تو پھر تمام لوگوں کے درمیان اس کا پورا خاندان اسی نام کے ساتھ جانا پہچانا جاتا ہے۔ جیسے سبزی والا، عطر والا، کپڑے والا، سونے والا، بس بالکل ٹھیک اسی طرح جو شخص ایک مرتبہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مخلوق کی زبان پر ''اللہ والا'' کہلوا دیا جاتا ہے تو پھر سنت اللہ یہی رہی ہے کہ وہ مرتے دم تک اللہ والا ہی رہتا ہے الّا ماشاء اللہ بہت ہی کم اس کے خلاف کوئی واقعہ سنا جاتا ہے۔

اہل اللہ پیری میں بھی رشکِ جوانی ہوا کرتے ہیں

عناصر مضمحل پیری سے اہل اللہ کے بھی ہیں
مگر چہرے سے ان کے پھر بھی تابانی نہیں جاتی

اسی بات کو حضرت مولانا رومی نے بڑے پیارے انداز سے ذکر کیا ہے کہ جس طرح شراب کا نشہ اس کے پرانا ہونے کے ساتھ بڑھتا رہتا ہے۔ اسی طرح اللہ والوں کی شرابِ محبت کا نشہ بھی ان کی عمر کے ساتھ ساتھ بڑھتا رہتا ہے اور دن بہ دن عبادات میں ترقی اور اضافہ ہونے کی بدولت ان کے چہروں پر خاص نور اور تابانی نظر آتی ہے۔

چنانچہ قرآن کریم میں حضراتِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے متعلق اس طرح سے آیتِ شریفہ میں آیا ہے

کہ سِیۡمَا هُمۡ فِیۡ وُجُوۡهِهِمۡ مِّنۡ اَثَرِ السُّجُوۡدِ، یعنی نماز اُن کا ایسا وظیفۂ زندگی بن گیا ہے کہ نماز اور سجدہ کے مخصوص آثار اُن کے چہروں سے نمایاں ہوتے ہیں۔ مراد ان آثار سے وہ انوار ہیں جو عبدیت اور خشوع و خضوع سے ہر متقی عبادت گزار کے چہرہ پر مشاہدہ کیے جاتے ہیں۔ پیشانی میں جو نشان سجدہ کا پڑ جاتا ہے وہ مراد نہیں۔ خصوصاً نمازِ تہجد کا یہ اثر بہت زیادہ واضح ہوتا ہے۔ جیسا کہ ابن ماجہ میں بروایت جابر رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

﴿مَنۡ کَثُرَتۡ صَلٰوتُهٗ بِاللَّیۡلِ حَسُنَ وَجۡهُهٗ بِالنَّهَارِ﴾

(سنن ابن ماجة، کتاب اقامة الصلوة والسنة فیها، باب ماجآء فی قیام اللیل)

یعنی جو شخص رات میں نماز کی کثرت کرتا ہے دن میں اس کا چہرہ حسین پُرنور نظر آتا ہے اور حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اس سے مراد نمازیوں کے چہروں کا وہ نور ہے جو قیامت میں نمایاں ہوگا۔ (معارف القرآن، جلد:۸، صفحہ:۹۳)

اسی لیے دنیادار لوگوں کی عمریں بڑھ جانے کے بعد ان کے چہروں پر بڑھاپے میں جوانی کا رنگ و روغن جا چکا ہوتا ہے اور جاذبیت و کشش ماند پڑ جاتی ہے جب کہ اہل اللہ کے پُرنور چہرے مزید سے مزید چمکتے اور دمکتے رہتے ہیں اگرچہ ان کے بدن کے ظاہری اعضاء بھی پیری اور بڑھاپے میں جسمانی ضعف کا شکار ہو جاتے ہیں اور تجربہ یہی ہے کہ اس میں کمی کے بجائے اضافہ ہی ہوتا رہتا ہے جیسا کہ اپنے بزرگوں کے بعض واقعات احقر نے اسی کتاب عرفانِ محبت کے دوسرے مقام پر ذکر کیے ہیں کہ انگریز اور بہت سے غیر مسلم ان کے چہروں کو دیکھ کر یہ کہنے لگے کہ یہ تو حضرت عیسیٰ کی طرح معلوم ہو رہے ہیں اور یہ کوئی عام انسان نہیں ہے۔

قلوبِ اولیاء میں مستی و جولانی کا عالَم

اٹھا جاتا نہیں ہے بے سہارے پھر بھی یہ کیا ہے
کہ ان کے قلب سے مستی و جولانی نہیں جاتی

یعنی اہل اللہ جسمانی ضعف کا شکار ہو جانے کے باوجود اپنی باطنی بصیرت اور قوت اور دریائے محبت خداوندی میں مستی و جولانی کے لحاظ سے ضعیف اور کمزور نہیں ہوتے جس کو احقر یہ عرض کر سکتا ہے کہ یہ اللہ والوں کی ایک کرامت ہے اور ان کے سچا اور برحق ہونے کی ایک نشانی اور دلیل ہے کہ ایسے بندگانِ خدا انتہائی ضعیفی اور پیری کے عالم میں بھی عقل و دماغ کی سلامتی اور سوچ وفکر کی درستگی ان کے حافظہ کے بقا کے ساتھ موجود رہتی ہے کہ بڑے بڑے جوانوں کو اپنے نازک سے نازک مسائل اور پیچیدہ اور الجھے ہوئے حالات میں انہیں سے مشورے لینے پڑتے ہیں اور ان کی اتباع کرنے میں ہی ان کو کامیابی نظر آتی ہے اس لیے ہوش وحواس اور عقل وذہن کا محفوظ رہنا اسے اللہ والوں کی ایک کرامت کہا جا سکتا ہے اسی کا اثر ہے کے ہر اگلے دن میں ان کی عبادات میں اضافہ اور

طاعات کی کثرت دیکھنے میں آتی ہے جو اس بات کا پتہ دیتی ہے کہ ان کے قلب میں مستی و جولانی میں کمی کے بجائے اضافہ ہی اضافہ ہے۔ چنانچہ ہم نے یہی حالات ان بعض بزرگوں کے یہاں دیکھے جن کے ساتھ میں رہنے سہنے، اٹھنے بیٹھنے کا موقع ملا جیسے حضرت مسیح الامت جلال آبادی رحمہ اللہ، حضرت مفتی محمود الحسن گنگوہی رحمہ اللہ اور حضرت مولانا شاہ ابرار الحق صاحب اور دیگر حضرات اکابر سب ہی اس وصف میں برابر تھے۔

لباسِ فقر میں شانِ سلطانی

بظاہر فقر ہے دامن میں لیکن کیا ہے باطن میں
کہ جس سے پھر بھی ان کی شان سلطانی نہیں جاتی
کہوں میں کس طرح سے شان ان اللہ والوں کی
لباسِ فقر میں بھی شان سلطانی نہیں جاتی

گو کہ ظاہر میں اہل اللہ فقیر بھی ہوں مگر وہ اپنے باطن میں بادشاہ ہوتے ہیں اور اس کا راز یہ ہے کہ انہوں نے اپنے قلب میں اللہ لے لیا ہے اور چونکہ اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے غناء اور بے نیازی ایک صفت ہے تو وہ لوگ ساری مخلوق سے بے نیاز ہو جاتے ہیں حکومت و بادشاہت ان کی نگاہوں میں کوئی حیثیت نہیں رکھتی بلکہ جب احکم الحاکمین اور سارے بادشاہوں کا بادشاہ ان کے دلوں میں موجود ہو تو پھر اہل دنیا خود ان کے غلام اور خادم بن جاتے ہیں اور دل سے وہ توقیر و تعظیم کرتے ہیں اور ایسا جان و مال فدا کرنے کو تیار رہتے ہیں کہ جو بادشاہوں کے لیے بھی رعایا کے دلوں میں بات نہیں ہوتی اس لیے وہ فقیر ہو کر شان سلطانی سے زندگی گزارتے ہیں، کیونکہ ان کو اللہ کی طرف سے مخلوق کے دلوں پر حکومت حاصل ہوتی ہے۔

مشاہدۂ حق میں استغراقی کیفیت اور اس کا حدیث سے ثبوت

گئے تھے بھول مرشد پھول پوری نام بھی اپنا
حضورِ حق میں اپنی ذات پہچانی نہیں جاتی

دراصل اس میں ایک قصے کی طرف اشارہ ہے اور وہ یہ کہ حضرت عارف باللہ شاہ عبد الغنی رحمہ اللہ کے یہاں دفتر کا کام کاج دیکھنے کے لیے ایک شخص مقرر تھا جسے ہم منشی کہتے ہیں اس کو ایک بار کچھ کاغذات پر دستخط کرانے کی ضرورت پیش آئی تو وہ کاغذات حضرت کے پاس لے کر حاضر ہوا اور درخواست کی کہ حضرت اس پر دستخط فرمادیں حضرت سوچتے ہی رہے اور اپنا نام یاد نہ آیا پھر کچھ دیر کے بعد اسی سے پوچھا کہ میرا نام کیا ہے؟ پھر اس نے نام بتایا تو حضرت کو اپنا نام یاد آیا اور دستخط فرمائے۔

یہ بات اللہ والوں کو غایت استغراق کی حالت میں پیش آتی ہے جو ایک ایسی کیفیت ہے جس میں بندہ اللہ

تعالیٰ سے اتنا قریب ہوتا ہے اور مشاہدہ حق میں ایسا مستغرق ہوتا ہے کہ اسے اپنے ماورا کسی بھی شے کی کوئی خبر نہیں رہتی اپنے اردگرد سے بالکل غافل ہوجاتا ہے اور اس کا مأ خذ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ قصہ ہے جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے یہ پوچھا: من انتِ؟ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے جواب دیا: انا عائشة۔ پھر ارشاد فرمایا: ''من عائشة؟ تو حضرت عائشہ نے جواب دیا: بنت ابی بکر۔ پھر ارشاد فرمایا: من ابو بکر؟ تو جواب دیا کہ ابن ابی قحافة۔ الغرض ان سب سوالات کے بعد حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا انتہائی درجے حیرت میں تھی کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب ارشاد فرمایا کہ اے عائشہ! میں بعض خاص اوقات میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ انتہائی قرب کے مقام مشاہدۂ ذاتِ باری تعالیٰ میں مستغرق ہوا کرتا ہوں۔ یہی وہ چیز ہے جو اپنے اپنے درجاتِ قرب کے اعتبار سے اولیاء اللہ کو استغراقی کیفیت کی صورت میں پیش آتی رہتی ہے کہ اس درجہ حضور ذاتِ حق ہوتا ہے کہ اس میں اپنی ذات بھی نہیں پہچانی جاتی ہے۔

لباس عقل میں بھی چاک دامانی کا راز

محبت کی کرامت میں نے اختر یہ بھی دیکھی ہے
لباس عقل میں بھی چاک دامانی نہیں جاتی

جب تک آدمی کو اللہ تعالیٰ سے محبت نہیں ہوتی تو وہ یا تو اپنی طبیعت کے تقاضوں پر چلتا ہے یا عقلی دلائل سے رہنمائی کہنا چاہتا ہے اور ایمانی تقاضے مغلوب رہتے ہیں لیکن جب دل اللہ تعالیٰ کی محبت سے لبریز ہوجاتا ہے تو پھر اس کی ہر سوچ وفکر اسی کے تابع ہوجاتی ہے اور یہی انسان کی کامیابی کی دلیل ہے جس کو حضرت تھانوی نے مختصر اور جامع الفاظ میں یوں تعبیر فرمایا کہ بحمد اللہ میں نے اپنی طبیعت کو عقل کے، اور اپنی عقل کو شریعت کے تابع کر دیا ہے۔ اس کو ایک مثال سے اس طرح سمجھئے کہ ایک بیمار آدمی ہے اور اس کے سامنے بڑا قیمتی اور لذیذ کھانا رکھا ہے جس کھانے سے اس کے ڈاکٹر نے اسے منع کیا ہے اب طبیعت کہتی ہے کہ اس کو کھاؤ مگر عقل کہتی ہے کہ اس کو نہ کھاؤ تو بعض لوگ طبیعت کے تقاضے پر عمل کر کے نقصان اٹھاتے ہیں جب کہ دوسرے لوگ عقل کے تقاضے کے مطابق عمل کر کے مضرت اور نقصان سے بچ جاتے ہیں لیکن کہیں کسی مقام پر شریعت کے حکم کے سامنے مومن بندے کو عقل مغلوب کر کے اس کا تقاضہ چھوڑنا پڑتا ہے جیسا مثلاً بینک میں ایک لاکھ جمع کرنے سے بطور سود کے دوگنا یعنی دو لاکھ ملیں گے، دھوکا دے کر سامان فروخت کر دینے میں میرے بے کار سامان کے اچھے پیسے مل جائیں گے تو عقل ہوشیاری کا سبق پڑھا رہی ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت اور ایمان کا رشتہ ہمیں منع کر رہا ہے۔

بس یہی وہ مقام ہے کہ جہاں آکر یہ پتہ چلتا ہے کہ کون اللہ کا بندہ ہے اور اس کے کہنے پر چلتا ہے اور کون اپنی عقل کو سب کچھ سمجھ کر اس کے مطابق اپنی زندگی ڈھالتا ہے اور یہی وہ چیز ہے جس کو حضرت تھانوی نے فرمایا کہ

طبیعت کو عقل کے اور عقل کو شریعت کے تابع کر دینا چاہئے جو لوگ بہت بڑے عقل مند بنتے ہیں اور اپنی عقل کے سامنے شریعت کے حکم کو پیچھے ڈال دیتے ہیں ان کو مستقبل میں حسرت و افسوس کے سوا اور کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ یہاں تک کہ بعض لوگ دین کے کسی بھی حکم کو جب تک عقل کے ذریعے نہ سمجھ لیں تو اُس پر نہ یقین کرنے کو تیار ہوتے ہیں اور نہ عمل کی طرف مائل ہوتے ہیں جبکہ یہ اس قدر باطل اور غلط نظریہ ہے کہ جس کا باطل ہونا بالکل بدیہی ہے کیونکہ دین کی باتوں کا تو کیا کہنا آج ہمیں دنیا ہی کی خود کتنی باتیں عقل سے سمجھ میں نہیں آتیں۔

حضرت مفتی تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم نے بڑے مدلل اور عمدہ انداز سے اپنے ایک وعظ میں اس طرح ارشاد فرمایا کہ اگر ہر چیز عقل سے سمجھ میں آجاتی تو میں ایسے عقل کے ماننے والوں کو یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ وہ ان دو باتوں میں فرق کر کے عقل کے طور پر مجھے سمجھائیں کہ آخر اپنے گھر کا ایک جوان بیٹا نکاح کر کے کسی باہر کی جوان لڑکی کو گھر کے مال و دولت اور خزانوں میں شریک کر لیتا ہے جبکہ خود اُس کے گھر میں اُس کی بہن انہی تمام بدنی اعضاء کے ساتھ موجود ہے جن کو لے کر آنے والی باہر کی لڑکی ہے۔ کیا عقل کے ذریعے سے کبھی ان دونوں باتوں میں فرق سمجھا جاسکتا ہے؟ کہ ایک طرف طبیعت کا بالکل میلان نہیں ہوتا اور دوسری کے ساتھ خلوت تک کو حرام قرار دیا گیا ہے۔

اور ہمارے روزمرہ کے مشاہدہ میں یہ بات آتی ہے کہ وضو ٹوٹنے کی جگہیں اور ہیں اور جن اعضاء کو دھویا جاتا ہے وہ الگ ہیں تو کیا وجہ ہے کہ نقضِ طہارت کی تلافی کی صورت انہی جگہوں کو دھلنے کے ساتھ نہیں رکھی گئی جو بظاہر عقل سے سمجھ میں آنے والا مسئلہ نہیں ہے۔ لیکن کیا کوئی دنیا کا ایمان رکھنے والا انسان اس کے عقلی طور پر سمجھ میں نہ آنے کی وجہ سے وضو میں دھوئے جانے والے اعضاء کو چھوڑ کر طہارت حاصل کرنے کے لیے اپنی شرمگاہ کو دھلنا ضروری سمجھ کر طہارت حاصل کرتا ہے یا کیا اس طرح سے طہارت حاصل ہو سکتی ہے؟ کبھی بھی نہیں۔ تو پھر ہر چیز کو عقل سے سمجھ کر آگے قدم بڑھانا یہ انتہائی غیر دانشمندانہ طریقہ ہے۔

اور سچی بات تو یہ ہے کہ عقل کہتی ہے کہ دنیاداری اور ظاہری حالت کو بناؤ اور ترقی دو اور محبت کہتی ہے کہ اپنے اللہ پر دیوانہ وار مرمٹو، صبح و شام اسی کے گیت گاؤ اسی کی پاکی اور بڑائی بیان کرو اور اسی کا نام لے کر اپنے قلب و جگر کو ٹھنڈک اور تازگی بخشو۔ اس لیے اللہ والوں سے عقلمندی میں بھی محبت کے تقاضے نہیں چھوٹتے یہی مطلب ہے کہ لباس عقل میں بھی میری چاک دامانی نہیں جاتی کیونکہ محبت محبوب پر فدا ہونے کی طرف بلاتی ہے اور عقل اپنے بنانے سنوارنے کی فکر میں لگائے رکھتی ہے۔

مجاز......ایک سراب

آہ میرے شباب کا عالم ۔۔۔ اور دل کے کباب کا عالم
تھا مگر سب سراب کا عالم ۔۔۔ لبِ دریا حباب کا عالم

مشکل الفاظ کے معانی:۔ شباب: جوانی۔ سراب: دھوپ کے وقت میں دور فاصلے پر پانی ہونے کا شبہ ہونا، مراد دھوکہ۔ لبِ دریا: دریا کے کنارے۔ حباب: بلبلہ۔

کسی کے در پہ تو یا رب یہ پیشانی نہیں جاتی

کبھی حسرت کے سر سے اس کی حرمانی نہیں جاتی
کوئی سمجھائے پھر بھی دل کی حیرانی نہیں جاتی

مگر دل کے تقاضوں سے جو توبہ کی کسی دل نے
تو دل سے قرب ربانی کی تابانی نہیں جاتی

خدا کے فضل کا سایہ جنہیں حاصل نہیں ہوتا
یہ دیکھا ہے کہ ان کی خوئے شیطانی نہیں جاتی

بہ فیض مرشد کامل ملا جو فضل رحمانی
تو پھر اس نفس امارہ کی کچھ مانی نہیں جاتی

بتوں کی بے وفائی کا ہوا ہے تجربہ تجھ کو
مگر اس تجربے سے تیری نادانی نہیں جاتی

حسینوں کی نگاہوں میں کسی کی پارسائی سے
بہ جرم عشق نفسانی پشیمانی نہیں جاتی

خرد نے گو کیا ہے میرے دامن کو رفو ہر دم
مگر کیوں عشق کی یہ چاک دامانی نہیں جاتی

گناہوں پر ندامت سے یہ توبہ کی کرامت ہے
کہ تائب سے کبھی ان کی مہربانی نہیں جاتی

ہمارا مرکز امید رحمت آپ کا در ہے
کسی کے در پہ تو یا رب یہ پیشانی نہیں جاتی

مرے دل کو جو بخشی تو نے آہوں کی فراوانی
مگر حاسد سے میری آہ پہچانی نہیں جاتی

مرے مالک کرم سے آپ نے جس پر نگاہ ڈالی
پھر اس کی بندگی سے شان ربانی نہیں جاتی

کبھی مشکل میں بھی پڑتا ہے اختر تو بحمداللہ
خدا کے فضل سے امید پنہانی نہیں جاتی

مشکل الفاظ کے معانی:۔ **حسرت**: خواہش پوری نہ ہونے پر غم ہونا۔ **حرمانی**: محرومی۔ **قربِ ربّانی**: اللہ تعالیٰ کی نزدیکی۔ **تابانی**: چمک۔ **خوئے شیطانی**: شیطانی عادت۔ **فضلِ رحمانی**: اللہ تعالیٰ کا فضل۔ **نفسِ امّارہ**: گناہوں کا بہت زیادہ تقاضہ کرنے والا نفس۔ **بتوں**: نامحرم عورتیں اور حسین لڑکے۔ **عشقِ نفسانی**: نفسانی عشق۔ **پشیمانی**: ندامت۔ **خرد**: عقل۔ **رفو**: پھٹے ہوئے کپڑے کو جوڑنا۔ **دامانی**: دامن پھٹا ہوا ہونا۔ **تائب**: توبہ کرنے والا۔ **فراوانی**: کثرت۔ **شانِ ربّانی**: اللہ والوں والی شان۔ **اُمیدِ پنہانی**: دل پر امید ہونا۔

حسرتوں کی پامالی پر قربِ ربانی کی تابانی

کبھی حسرت کے سر سے اس کی حرمانی نہیں جاتی
کوئی سمجھائے پھر بھی دل کی حیرانی نہیں جاتی
مگر دل کے تقاضوں سے جو توبہ کی کسی دل نے
تو دل سے قربِ ربانی کی تابانی نہیں جاتی

اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسان کے اندر ایک دل رکھا ہے اور اس ایک دل کو اپنی ایک اکیلی ذات کے لیے بنایا ہے۔ میرے شیخ اول حضرت مسیح الامت جلال آبادی رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے کہ ''ایک زبان اور ایک دل ایک اللہ کے لیے ہے''، سو جو شخص اس دل کے اندر اللہ کے غیر کو بسائے گا اور فانی حرام لذتوں کو دل میں جگہ دے گا تو یہ دل پھر ہمیشہ حیران و پریشان رہے گا حسرت وافسوس اور بے چینی و پریشانی دل کو ہر سمت سے گھیرے رہے گی، لیکن جب بندہ اپنے دل کو اللہ کے لیے خالی کرے گا اور اس میں آنے والے ایسے تقاضے اور خواہشات جو اللہ تعالیٰ کی مرضی کے خلاف ہو پوری ہمت اور قوت کے ساتھ جان کی بازی لگا کر ان پر عمل نہیں کرے گا اور جو کچھ تھوڑا بہت ان تقاضوں پر عمل ہو گیا ہو اس سے پکی اور سچی توبہ کرلے گا تو ایسے دل کو اللہ تعالیٰ اپنا قرب نصیب فرما دینگے چنانچہ پھر وہ قربِ ربانی کی تابانی اور اس کے جلووں کا مشاہدہ کرے گا۔

مگر اس کلام کا یہ مطلب نہیں ہے کہ دل کے تقاضوں کو ختم کرنے کی فکر میں لگ جائے اس لیے کہ ایسا کبھی بھی ممکن نہیں ہے، قرآن کریم میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوٰهَا﴾
(سورۃ الشمس، آیۃ ۸)

ترجمہ: پھر اس کی بدکرداری اور پرہیزگاری (دونوں باتوں) کا اس کو القاء کیا (یہ اسناد باعتبار تخلیق کے ہے یعنی قلب میں جو نیکی کا رجحان ہوتا ہے یا جو بدی کی طرف میلان ہوتا ہے دونوں کا خالق اللہ تعالیٰ ہے۔ گو القاءِ اول میں فرشتہ واسطہ ہوتا ہے اور ثانی میں شیطان پھر وہ رجحان و میلان کبھی مرتبۂ عزم تک پہنچ جاتا ہے جو کہ انسان کے قصد واختیار

سے صادر ہوتا ہے۔ اسی قصد و اختیار پر عذاب وثواب مرتب ہوتا ہے جس کے بعد صدورِ فعل بہ تخلیقِ حق ہوتا ہے اور کبھی عزم تک نہیں پہنچتا وہ معاف ہے۔ (معارف القرآن، جلد:۸، صفحہ:۷۵۴)

اور پھر اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰىۙ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰىؕ﴾

(سورۃ النازعات، آیات: ۴۰-۴۱)

ترجمہ: اور جو کوئی ڈرا ہوا اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے سے اور روکا ہو اس نے جی کو خوش کرنے سے سو بہشت ہی ہے اس کا ٹھکانہ۔ (معارف القرآن، جلد:۸، صفحہ:۶۶۱)

یعنی اپنے نفس پر کنٹرول کیا اور اس کو حکم خدا کا تابع بنا دیا تو پھر جنت اس کا ٹھکانا ہے اس لیے اس کلام کا منشاء دل کے تقاضوں کو ختم کر دینا نہیں ہے بلکہ کتنی ہی شد و مد سے گناہوں کا تقاضا ہونے کے باوجود اس کے اوپر عمل نہ کرنا ہے اور یہی بارگاہ خداوندی میں مطلوب ہے اور اسی کے اوپر بندے کے لیے سب وعدے ہیں۔

یہی تو وجہ ہے کہ اس دنیا کو متاع الغرور کہا گیا ہے یعنی یہ دھوکے کا سامان اور فریب کا گھر ہے جس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ اس کا ظاہر جو نظر آ رہا ہے اس کا باطن ویسا نہیں ہے۔ چنانچہ ظاہر کے اعتبار سے یہ بہت اچھی اور خوشنما معلوم ہوتی ہے بڑی وفادار اور پائیدار دکھائی دیتی ہے کام آنے والی اور ضرورتیں پوری کرنے والی دکھائی دیتی ہے دل کے سکون اور چین کا سامان معلوم ہوتی ہے، لیکن حقیقت میں اندر سے ایسی نہیں ہے اسی لیے جب انسان کا نفس اس کی طرف چلتا اور بڑھتا ہے تو ہمارا مہربان اللہ ہمیں حکم دیتا ہے:

﴿يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَلَا يَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ﴾

(سورۃ فاطر، آیۃ:۵)

ترجمہ: اے لوگو! بے شک اللہ کا وعدہ ٹھیک ہے سو نہ بہکائے تم کو دنیا کی زندگانی اور ایسا نہ ہو کہ تم کو دھوکے باز شیطان اللہ سے دھوکے میں ڈال دے۔

یہ دنیا کی زندگی تمہیں ہرگز دھوکے میں نہ ڈال دے اور کہیں شیطان تمہیں اس دنیا کے جالوں میں نہ پھنسا دے اور نفس کی خواہشات اور تقاضوں میں پڑ کر تم دھوکے کا شکار نہ ہو جاؤ بلکہ جب اللہ کے حکم کے خلاف کسی بھی دنیوی چیز کی جانب طبیعت کا رجحان اور میلان ہو اور وہ کتنی ہی خوب سے خوب تر نظر آئے تو سمجھ لینا چاہیے کہ اس میں ہمارا دین و دنیا کا نقصان چھپا ہوا ہے گو کہ ظاہر میں بہت خوب معلوم ہو رہی ہے اسی لیے تو دنیا کو ''حُلْوَةٌ خَضِرَةٌ'' فرمایا گیا۔

﴿عَنْ اَبِیْ سَعِيْدِ الْخُدْرِيِّ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ الدُّنْيَا حُلْوَةٌ خَضِرَةٌ وَاِنَّ اللّٰهَ مُسْتَخْلِفُكُمْ فِيْهَا فَيَنْظُرُ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ فَاتَّقُوا الدُّنْيَا وَاتَّقُوا النِّسَآءَ فَاِنَّ اَوَّلَ فِتْنَةِ بَنِیْ اِسْرَائِيْلَ كَانَتْ فِی النِّسَآءِ وَفِیْ حَدِيْثِ ابْنِ بَشَّارٍ لِيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ﴾

(صحیح مسلم، کتاب الذکر والدعاء، باب اکثر اہل الجنۃ الفقراء)

بے شک دنیا بڑی میٹھی اور سرسبز و شاداب اور اللہ تعالیٰ تم کو اس میں اپنا نائب بنانے والا ہے، پھر دیکھے گا کہ تم کس طرح سے عمل کرتے ہو، لہٰذا دنیا سے بچ کر رہنا اور خاص طور پر عورتوں سے بچنا کیونکہ بنی اسرائیل کا سب سے پہلا فتنہ عورتوں کے ہی اندر سے واقع ہوا جس کی تفصیل شراحِ حدیث نے اس طرح لکھی ہے اور ہمارے حضرت والا نے اُسے اپنی کتاب ''روح کی بیماریاں اور اس کا علاج'' میں نقل فرمایا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے۔

بلعم بن باعورا کی عبرتناک حکایت

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی روایت ہے کہ ایک علام مقتدا جس کا نام ''بلعم بن باعورا'' ملک شام بیت المقدس کے قریب کنعان کا رہنے والا تھا۔ بعض روایت میں ہے کہ بنی اسرائیل میں سے تھا۔ جب غرق فرعون اور فتح مصر کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کو قوم جبارین سے جہاد کا حکم ملا تو جبارین خائف ہوئے اور جمع ہو کر بلعم بن باعورا کے پاس آئے اور دعا کی درخواست کی کہ ہمارے مقابلہ سے حق تعالیٰ ان کو واپس فرمادیں۔

بلعم بن باعورا کو اسمِ اعظم معلوم تھا، اس کے ذریعہ جو دعا کرتا تھا، قبول ہوتی تھی۔ بلعم نے کہا: ''افسوس! وہ اللہ کے نبی ہیں، ان کے ساتھ اللہ کے فرشتے ہیں، میں ان کے خلاف کیسے بددعا کرسکتا ہوں، اس سے تو میرا دین اور میری دنیا دونوں تباہ ہو جائیں گے۔''

ان لوگوں نے جب بے حد اصرار کیا تو بلعم نے کہا: ''اچھا! میں حق تعالیٰ سے اس نوع کی اجازت لیتا ہوں۔'' اس نے کوئی عمل یا استخارہ کیا، جواب میں اس کو بتلایا گیا کہ ہرگز ایسا نہ کرے۔ اس نے قوم کو بتلایا کہ مجھے بددعا کرنے سے روک دیا گیا۔ اس وقت قوم جبارین نے بلعم کو بڑا ہدیہ پیش کیا جو درحقیقت رشوت تھی، اس نے ہدیہ قبول کرلیا۔ پھر اس قوم کے لوگ اس کے پیچھے پڑ گئے اور اس کی بیوی نے بھی مشورہ دیا کہ رشوت قبول کرلو، پس وہ بیوی اور مال کی محبت میں اندھا ہو گیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کے خلاف بددعا کرنے کے لیے اپنے گدھے پر سوار ہو کر حسبان پہاڑی کی طرف چلا جس کے قریب حضرت موسیٰ علیہ السلام کا لشکر مقیم تھا راستہ میں کئی مرتبہ گدھا گرا جسے وہ مار مار کر اٹھاتا رہا یہاں تک کہ جب یہ سلسلہ دراز ہوا اور بلعم بھی اپنے گدھے کو مار مار کر اٹھاتا ہوا پریشان ہو گیا تو حق تعالیٰ نے اپنی قدرت سے گدھے کو گویائی عطا کی چنانچہ گدھا بولا کہ ''نادان بلعم! تجھ پر افسوس ہے کیا تو یہ نہیں دیکھتا کہ تو کہاں جا رہا ہے تو مجھے آگے چلانے کی کوشش کر رہا ہے اور ملائکہ آگے آکر مجھے پیچھے دھکیل رہے ہیں۔ بلعم نے جب چشم حیرت سے گدھے کو بولتے دیکھا تو بجائے اس کے کہ اس تنبیہ پر اپنے ارادے سے باز آتا گدھے کو وہیں چھوڑ کر پہاڑ پر چڑھا اور بددعا کرنے لگا۔ اس وقت قدرتِ الٰہیہ کا عجیب کرشمہ یہ ظاہر ہوا کہ جو کچھ وہ کلمات بددعا نکالتا تھا وہ کلمات جبارین کے لیے نکلتے تھے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے نکلتا ہی نہ تھا۔ پس قومِ جبارین کے لوگ گھبرا گئے اور چلّا اُٹھے کہ تو ہمارے خلاف بددعا کر رہا ہے۔

بلعم نے کہا: ''میں کیا کروں، میری زبان میرے اختیار سے باہر ہوگئی ہے۔'' نتیجہ یہ ہوا کہ اس قوم پر تباہی آئی اور بلعم کو یہ سزا ملی کی کہ اس کی زبان لٹک کر سینے پر آ گئی۔ اسی عذاب کا قرآن حکیم میں ذکر ہے:

﴿فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ﴾

(سورۃ الاعراف، پارہ: ۹، رکوع: ۲۲)

پس بلعم کا حال ایسا ہے جیسے کتا کہ اس پر بوجھ لادو تو ہانپنے لگے اور اگر چھوڑ دو تو بھی ہانپے۔ پھر بلعم نے کہا: ''اے میری قوم! اب تو میری دنیا اور آخرت تباہ ہوگئی، مگر ہم تمہیں ایک چال بتاتے ہیں جس کے ذریعہ تم موسیٰ علیہ السلام اور ان کے لشکر پر غالب آ سکتے ہو، وہ چال یہ ہے کہ تم اپنی حسین لڑکیوں کو مزیّن کر کے بنی اسرائیل کے لشکر میں بھیج دو، یہ لوگ مسافر ہیں، گھروں سے مدت کے نکلے ہوئے ہیں، اس تدبیر سے اگر یہ حرام کاری میں مبتلا ہو گئے تو ان پر قہر و عذاب نازل ہوگا اور پھر یہ قوم فاتح نہیں ہوسکتی۔'' بلعم کی یہ شیطانی چال ان کی سمجھ میں آ گئی اور اس تدبیر سے بنی اسرائیل کا ایک شخص فتنہ میں مبتلا ہو گیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بہت روکا، مگر نہ مانا جس کے نتیجے میں بنی اسرائیل پر طاعون کا سخت عذاب آیا اور ستر ہزار بنی اسرائیل مر گئے۔ بعدازاں جس شخص نے بُرا کام کیا تھا اس جوڑے کو قتل کر کے منظرِ عام پر ٹانگ دیا کہ سب لوگوں کو عبرت حاصل ہو اور سب نے توبہ کی، اس وقت یہ عذاب رفع ہوا۔

بہر حال جس شخص کو اپنے دل میں اللہ تعالیٰ کے قرب کا خزانہ مطلوب ہو اور اس دولت سے مالا مال ہونا چاہتا ہو تو اس کا ایک ہی راستہ ہے کہ تمام خواہشات نفسانیہ اور دل کے گندے تقاضوں سے مکمل طور پر توبہ کر کے اللہ کے در کو مضبوطی سے پکڑ لے تو اسی وقت اس کو اپنے قلب میں ایک جلا اور روشنی محسوس ہوگی۔

حضرت فضیل بن عیاض رحمہ اللہ کا واقعہ

احقر کو اس پر ایک واقعہ یاد آیا کہ ایک اپنے زمانے کا بڑا ڈاکو جس کے نام سے لوگ ڈر جایا کرتے تھے ڈاکا ڈالنے کی نیت سے چلے جا رہے تھے اتنے میں کسی گھر سے ان کو قرآن کریم کی یہ آیت کانوں میں پڑ گئی:

﴿اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ﴾

(سورۃ الحدید، آیۃ: ۱۶)

ترجمہ: کیا وقت نہیں آیا ایمان والوں کو کہ گڑگڑائیں ان کے دل اللہ کی یاد سے۔

تو ادھر سے وہ بولے ''حَانَ ذَالِکَ الْوَقْتُ یَا رَبِّیْ!'' اے میرے اللہ! وہ وقت آ پہنچا جب اللہ کے ذکر کے سامنے اہلِ ایمان کے دل کانپ جاتے ہیں سو انہوں نے اسی وقت توبہ کی اور یہ فیصلہ کیا کہ جہاں جہاں سے میں نے جن کے مالی حقوق لے رکھے ہیں ان سب کی واپسی کروں گا چنانچہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو مقربین بارگاہ میں شمار کر لیا گیا اور آج تاریخ میں انہیں امت کے بڑے بزرگوں کی فہرست میں شمار کیا جاتا ہے جن کا نام

حضرت فضیل بن عیاض رحمۃ اللہ تعالیٰ ہے۔

حسن کا انتظام ہوتا ہے
عشق کا یونہی نام ہوتا ہے
کار فرما تو لطف ہے ان کا
ہم غلاموں کا نام ہوتا ہے

اہل دنیا کے نزدیک اس طرح کے واقعات اتفاقی کہلاتے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ یہ منجانب اللہ اپنے بندے کی رشد و ہدایت کے لیے ایک غیبی انتظام ہوتا ہے نہ وہ وہاں سے گزرتے، اور نہ آیت سنتے، اور نہ ہی ہدایت نصیب ہوتی مگر کیوں نہ ہوتی؟ اور کیوں ایسا سب کچھ نہ ہوتا؟ جب کہ حق تعالیٰ کی طرف سے ان کے حق میں یہی فیصلہ تھا اسی لیے قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے اکثر دعاؤں کے موقع پر اپنی ذات عالی کو رب کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے اور نمازوں کے اندر بھی اللہ کی ربوبیت کا ذکر سب سے زیادہ آیا ہے جس کا منشا و مقصد احقر کے ذہن نارسا میں یہی آتا ہے کہ بندے کو یہ بات اچھی طرح مستحضر ہو جائے کہ میں اس کے جسم و روح دونوں کا رب ہوں اس لیے اس کے جسم اور روح کو نقصان دہ چیزوں سے بچانا اور نفع بخش چیزوں کا عطا کرنا یہ میرا کام ہے تو جس کو دنیا میں جس بہانے سے بھی رزق و روزی مل رہی ہے اور اللہ کی معرفت و محبت نصیب ہو رہی ہے اسے اپنے مجاہدات یا اپنی عقلمندی اور ذہانت کی طرف منسوب نہ کرے بلکہ اپنے پالنے والے اللہ کی شانِ ربوبیت کا اثر سمجھے۔

سایۂ شیخ کامل بھی فضلِ الٰہی کا اثر ہے

خدا کے فضل کا سایہ جنہیں حاصل نہیں ہوتا
یہ دیکھا ہے کہ ان کی خوئے شیطانی نہیں جاتی
یہ فیض مرشد کامل ملا جو فضل رحمانی
تو پھر اس نفسِ امارہ کی کچھ مانی نہیں جاتی

یہ مضمون حضرت والا نے کئی مقام پر ذکر فرمایا ہے جس کا خلاصہ نہایت اعتدال پر مبنی دین کا صحیح مزاج پیش کرنا ہے کہ اصل اصلاح قلب اور تزکیۂ نفس اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ہوتا ہے، لیکن اللہ کی سنت اس طرح جاری ہے کہ کچھ رجال اللہ دنیا میں ہوتے ہیں جن کی صحبت میں حق تعالیٰ یہ تاثیر رکھ دیتے ہیں کہ انسان بڑی تیزی کے ساتھ نفس امارہ کی غلامی سے نجات پا جاتا ہے اور اس کی خوئے شیطانی اس سے چھوٹتی نظر آتی ہے اس لیے ہر شخص اپنے اصلاح و تزکیہ کی اصل نسبت تو اللہ تعالیٰ کے فضل ہی کی طرف کرے لیکن سبب کے درجے میں صحبت شیخ کی جانب کرنا بھی عین شکر نعمت ہے جو کہ مرضی خداوندی کے مطابق ہے جیسا کہ قرآن کریم کی آیت ہے:

﴿وَلَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ مَا زَكٰى مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَبَدًا وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَآءُ﴾
(سورۃ النور، اٰیۃ: ۲۱)

ترجمہ: اگر تم پر اللہ کا فضل و کرم نہ ہوتا تو تم میں سے کوئی کبھی بھی (توبہ کر کے) پاک صاف نہ ہوتا لیکن اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے (توبہ کی توفیق دے کر) پاک وصاف کر دیتا ہے۔ (معارف القرآن، جلد:۶،ص:۳۶۹)

اور دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ نے یوں ارشاد فرمایا:

﴿لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ﴾
(سورۃ اٰل عمران، اٰیۃ: ۱۶۴)

ترجمہ: اللہ نے احسان کیا ایمان والوں پر جو بھیجا ان میں رسول انہی میں کا پڑھتا ہے ان پر آیتیں اس کی اور پاک کرتا ہے ان کو یعنی شرک وغیرہ سے اور سکھلاتا ہے ان کو کتاب اور کام کی بات۔

اول آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کا بیان فرمایا ہے اور دوسری آیت میں اپنی سنت کا بیان فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ جس کا چاہیں اپنی قدرت سے تزکیہ فرما دیں مگر سنت اللہ یہی ہے کہ کچھ رجال اللہ کے ذریعے تزکیہ کرایا جاتا ہے اس مضمون کی بہت تفصیل حضرت مفتی شفیع صاحب نے معارف القرآن (۱) میں اس آیت کے ضمن میں ذکر فرمائی ہے۔

سنت اللہ اور قدرت اللہ کا فرق تخلیق کی چار قسموں کی روشنی میں

اس مقام پر بعض لوگوں کو اس طرح شبہ ہوتا ہے کہ کیوں صاحب اللہ تبارک وتعالیٰ کو اس پر پوری قدرت ہے کہ وہ بغیر کسی شیخ ومرشد کے ہماری اصلاح وتزکیہ فرما دے لہٰذا ہمیں پیری مریدی کے چکر میں پڑنے کی کوئی ضرورت نہیں اور بیعت واصلاح کے سلسلے میں داخل ہونے کی کوئی حاجت نہیں۔

تو ایسے حضرات کی خدمت میں احقر یہ عرض کرنا چاہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کی طرف نظر رکھتے ہوئے تو دنیا کی ہر چیز ممکن ہے مگر ہم قدرت اللہ کو نہیں دیکھیں گے بلکہ دنیا میں رہتے ہوئے سنت اللہ کی طرف دیکھنا لازم وضروری ہے۔ اس کو ایک مثال سے سمجھئے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں اپنی قدرتِ تخلیق کی چار قسمیں ذکر فرمائی ہیں:

(۱)...... حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو خالی مٹی سے بغیر کسی توالد وتناسل کے سلسلے کے پیدا فرمایا۔

﴿ان مثل عیسٰی عند اللہ کمثل ادم خلقہ من تراب ثم قال لہ کن فیکون﴾

(۲)...... حضرت حوا کو حضرت آدم علیہ السلام کی بائیں پسلی سے بغیر عورت کے پیدا فرمایا۔

﴿ذٰلِكَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ قَوْلَ الْحَقِّ الَّذِيْ فِيْهِ يَمْتَرُوْنَ﴾

اور ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ان اللہ یبشرک بکلمۃ منہ اسمہ المسیح عیسیٰ بن مریم﴾

(۳)...... حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو صرف اُن کی والدہ حضرت مریم سے بغیر والد کے پیدا فرمایا۔

﴿وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا﴾

(٤)...... مرد و عورت کے آپس میں بطریق نکاح ایک دوسرے سے ملنے کے نتیجے میں اولاد کے وجود میں آنے کا سلسلہ قائم فرمایا گیا اور یہی قیامت تک کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی سنت قرار دی۔

﴿وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالاً كَثِيرًا وَّنِسَآءً﴾

اوّل تینوں قسمیں اللہ تبارک وتعالیٰ کی قدرت کاملہ کا اظہار ہے لیکن اگر کوئی شخص اس قدرت کو سامنے رکھتے ہوئے یوں دلیل پیش کرے کے میں شادی نہیں کروں گا اور مجھے اولاد کی ضرورت ہے تو اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر ہیں کہ مجھے بغیر شادی کے اولاد دے دیں اور اس پر اللہ تعالیٰ کی مذکورہ قدرت سے استدلال کرنے لگے اور ساری عمر اس کی انتظار میں گزر جائے اور تمام دنیا کے قطب وابدال اس کے لیے دعائیں بھی کرلیں اور وہ خود بھی تمام کوششیں اختیار کرے مگر اسے مرتے دم تک اولاد نصیب نہیں ہوسکتی اور اس کی اس بات کو بے عقلی اور گمراہی کہا جائے گا حالانکہ عقیدے کے لحاظ سے ہم سب یہ بات مانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس پر قادر ہے مگر چونکہ اللہ تعالیٰ نے دنیا میں اولاد عطا کرنے کے لیے اپنی سنت اس کو قرار نہیں دیا ہے تو ہمارا اس پر نظر کر کے چلنا جائز نہیں۔

پس بالکل اسی طرح اصلاح وتزکیہ نفس کا معاملہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اتنی قدرت رکھتے ہیں کہ بغیر نبی کو بھیجے اور بغیر قرآن کے نازل کیئے ہوئے خود ہی انسانوں کے دلوں میں ہدایت اتار دیتے اور انہیں مزکیٰ ومجلیٰ کر کے جنت میں داخل فرمادیتے مگر اس دنیا کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی سنت یہ قرار دی کہ میں کتاب اللہ بھی نازل کروں گا اور اس کے ساتھ رجال اللہ کو بھی بھیجوں گا جن کے ذریعے امت کا تزکیہ ہوگا اور کتاب ان تک پہنچے گی لہٰذا اس سے صاف معلوم ہوگیا کہ اگر کوئی شخص حقیقت میں اپنے تزکیہ نفس کا متمنی اور فکرمند ہو تو اسے اہل اللہ اور مشائخ کی صحبت ومعیت ضرور اختیار کرنی پڑے گی تبھی دین پر چلنا اور صحیح طور پر عمل کرنا اور مقبول بارگاہ خداوندی بننا آسان ہوگا۔

ملفوظ حضرت شاہ ہردوئی رحمہ اللہ ''دین سیکھنا اور پڑھنا''

حضرت شاہ ابرار الحق ہردوئی رحمہ اللہ اپنے خاص انداز میں کبھی یوں فرماتے تھے کہ ایک ہے دین کا پڑھنا اور دوسرے ہے دین کا سیکھنا صحیح دین دار بننے کے لیے اور اس پر عمل کرنے کے لیے محض اس کا پڑھ لینا کافی نہیں بلکہ سیکھے ہوؤں سے اس کو سیکھنا پڑے گا اور پھر یہ بات ارشاد فرماتے تھے افسوس کہ آج امت ہر چیز کو پڑھنے کے بعد سیکھنے کے لیے تیار ہے اور کسی کو اس میں کوئی اشکال نہیں۔ ڈاکٹری کی تعلیم کے بعد اس کی عملی پریکٹس

(Prectis) کے لیے مستقل سال دو سال لگائے جاتے ہیں اسی طرح گاڑی کی ڈرائیونگ (Driving) اور جہاز کے اڑانے کا معاملہ یہاں تک کہ سلائی اور بنائی جیسے چھوٹے معاملات میں بھی کسی استاذ کو مقرر کر کے سب کچھ سیکھا جاتا ہے اگرچہ پہلے کتابوں اور رسالوں میں یہ سب چیزیں پڑھ لی ہوں، اس میں کسی کو اشکال نہیں ہوتا۔

مگر افسوس کی بات ہے کہ جب دین کے معاملے میں عالم دین ہو جانے کے بعد اس کو دین سیکھنے کی نصیحت کی جاتی ہے تو پھر یہ سارے اشکالات کھڑے ہو جاتے ہیں جو درحقیقت اس لیے پیدا ہوتے ہیں کہ نفس و شیطان ہمیں پورا دین دار مخلص ایمان والا اللہ کا ولی بننا دیکھنا نہیں چاہتے اس لیے وہ اس راہ میں طرح طرح کے اعتراضات اور اشکالات دل میں ڈال دیتے ہیں ورنہ کیا وجہ ہے کہ یہی سب اشکالات دنیا کے دوسرے فنون کے معاملے میں پیدا نہیں ہوتے۔

جب کہ بدیہی اور واضح سی بات ہے کہ جو شخص کسی راستے پر چلا ہوا ہے اور اس راستے کے نشیب و فراز سے واقف ہے تو اس کی معیت میں چلنے سے راستے کی تمام مشکلات آسانی میں بدل جائیں گی اور خطرات سے بآسانی حفاظت ہو جائے گی ورنہ نئے چلنے والے مسافر کو راستے کی پوری معلومات نہ ہونے کی وجہ سے طرح طرح کی مشکلات اور پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑے گا اللہ تعالیٰ ہمیں دین کی صحیح فہم اور سمجھ عطا فرمائے۔

بتوں کی بے وفائی مگر پھر بھی یہ نادانی کیسی؟

بتوں کی بے وفائی کا ہوا ہے تجربہ تجھ کو
مگر اس تجربے سے تیری نادانی نہیں جاتی
حسینوں کی نگاہوں میں کسی کی پارسائی سے
یہ جرم عشق نفسانی پشیمانی نہیں جاتی

حضرت والا اس شعر میں ان لوگوں کو تنبیہ فرما رہے ہیں کہ جو کسی لڑکے اور لڑکی کی ناجائز محبت میں پڑ کر اپنی جوانی اور زندگی کو ضائع کر دیتے ہیں جب کہ بکثرت ایسے واقعات سامنے آتے ہیں کہ آج تم کسی کے عاشق اور کوئی تمہارا معشوق ابھی چند ہی دن کے بعد ایسا رخ بدلتا ہے کہ وہ تمہارا معشوق تمہیں چھوڑ کر کسی اور جانب عشق و محبت کے ہاتھ پھیلا دیتا ہے اور تم تکتے کے تکتے کھڑے رہ جاتے ہو۔ ایک دو واقعہ نہیں اس نوع کے بے شمار واقعات ہیں۔

اور جو عاشق و معشوق آپس میں یہ کہتے ہیں میری جان اور مال اور سب کچھ تجھ پر قربان اور میرے لیے سب کچھ تم ہو اور اس جیسے دوسرے بے شمار جملے اور باتیں آپس میں کرتے ہیں انہیں اس حقیقت سے واقف ہونا چاہیے کہ تمام انسانوں کے قلوب صرف ایک اللہ وحدہ لاشریک لہ کے قبضے میں ہیں وہ جس طرح چاہتے ہیں دلوں کو پھیر دیتے ہیں اس لیے خود ہمارے اپنے دل اپنے قبضے میں نہیں ہیں یہی وجہ ہے کہ صبح ہو جائے تو شام کی خبر نہیں اور

شام ہوتو صبح کی خبر نہیں کہ اس دل میں کیا انقلاب برپا ہوا اور اس کا رخ کدھر پھر جائے تو بہت بڑی نادانی اور ناسمجھی کی بات ہے کہ انسان خدا سے غافل ہو کر ایسے جملے زبان سے نکالے اور انتہائی درجے ناعاقبت اندیشی ہے کہ اپنے خالق و مالک اللہ کے لیے ایسے جملے استعمال کرنے کے بجائے فانی مخلوق کی خاطر اس طرح کے جذبات پیش کرے جن کا انجام بالآخر فنا اور ختم ہو جانا اور مٹ کر خاک میں مل جانا ہے۔

اور اگر یہ بے وفائی کبھی اپنے اختیار سے بھی نہ ہو تب بھی حوادثات زمانہ کے پیش آ جانے کے نتیجے میں اب تمہارا محبوب و معشوق ایسا ہو جاتا ہے کہ کل تک جان دے دینے کی بات کر دینے والا عاشق اب اسے ایک نظر دیکھ لینا بھی گوارا نہیں کرتا اور جب ان کے چہروں کی کشش اور جاذبیت ختم ہو جاتی ہے تو پھر عشق کا یہ سارا کھیل ماند پڑ جاتا ہے اور بے حیائی اور بدکاری میں گزری ہوئی زندگی اب ایک دوسرے کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہتی۔

اس سے بھی آگے بڑھ کر احقر عرض کرتا ہے کہ اگر یہ بھی تسلیم کر لیا جائے کہ مرتے دم تک ان کا عشق بھی صحیح سالم اور حسن بھی صحیح سالم رہا اور یہ عشق کی گاڑی برابر چلتی رہی لیکن اے ظالم! غیر اللہ کو دل دے کر تو نے اتنا بھی نہیں سوچا کہ جب یہ مر کے دنیا سے چلا جائے گا یا تو اس سے پہلے دنیا سے روانہ ہوگا تو اس کے آگے بھی وفاداریوں کی گاڑی چل سکے گی؟ یا سب کچھ یہیں ختم ہے؟ جب کہ زندگی تو اصل آگے ہی کی زندگی ہے اور وہ طویل زندگی ہے اس لیے اصل اپنا عشق و محبت اللہ تعالیٰ کی ذات عالی کے ساتھ ہونا چاہیے جس کی وفا کا معاملہ ایسا ہے کہ دنیا اور برزخ اور قیامت تک ہر قدم اور ہر موڑ پر ہمارے کام آنے والا ہے حضرت والا بڑے درد بھرے انداز سے فرماتے ہیں کہ افسوس رات دن کے اس تجربے سے اور آنکھوں دیکھی صورت حال سے تمہاری ناعاقبت اندیشی اور نادانی اور ناسمجھی ختم نہیں ہو رہی ہے۔

نفسانی اور ربانی محبتوں کی بارہ (ایک درجن) نشانیاں

کبھی یہ نفسانی عشق ایسے رنگ و روپ میں ظاہر ہوتا ہے اور ایسی شکلوں میں وجود میں آتا ہے کہ یہ عاشق اپنے ذہن میں یہ تصور کرتا رہتا ہے میری یہ محبت اللہ کے لیے ہے اور میرا یہ تعلق دین کی غرض سے ہے جب کہ حقیقت میں اندرونی طور پر اس میں نفسانیت شامل ہوتی ہے اسی لیے صحیح اللہ والا شیطان کے ایسے باریک حیلوں سے چونکنا اور ہوشیار رہتا ہے اور حق تعالیٰ اس کے قلب میں فوراً اس کا احساس ڈال دیتے ہیں جس کے بعض آثار و قرائن علماء نے لکھے ہیں:

(**۱**)......اس سے گفتگو میں نفس کو خاص حظ اور سرور ملتا ہو اور خوب جی لگتا ہو۔

(**۲**)......اس سے دوری اختیار کرنے میں طبیعت اسی کی طرف مائل رہتی ہو اور دل و دماغ پر اس کا خیال چھایا رہتا ہو۔

(**۳**)......چند دن ملاقات نہ ہونے کی صورت میں دل میں بے چینی و پریشانی بڑھ جاتی ہو اور اس سے ملنے کے لیے

انتہائی بے چین اور پریشان رہنے لگے کہ سونے کے وقت نیند غائب اور کھانے کے وقت بھوک مفقود رہنے لگی ہو۔

(۴)......اس سے ملتے وقت خاص وضع بنانے اور نرم ونازک انداز سے الفاظ بنا کر گفتگو کرنے کو جی چاہتا ہو۔

(۵)......نمازوں اور دوسرے دینی کاموں میں دل میں اس کا خیال رہنے لگا ہو۔

(۶)......ہر وقت اس سے ملاقات کی تمنا دل میں رہتی ہو اس کی جدائی طبیعت کو ناپسند ہو۔

(۷)......اس کی ادائیں اور نقل وحرکت اگرچہ غیر شرعی ہوں مگر دل میں بہت اچھی لگتی ہوں۔

(۸)...... عنوان بہ عنوان اس کے تذکرہ کو جی چاہتا ہو جو اس کا تذکرہ کرے تو اس تذکرہ کرنے والے سے اسے قرب ومحبت محسوس ہو۔اور نفس کو ایک خاص مزہ ملتا ہو خواہ اس کے دنیوی اور غیر شرعی امور ہی کا تذکرہ ہو رہا ہو۔

(۹)......اس پر مال خرچ کرنے اور کھلانے پلانے کو جی چاہتا ہو۔

(۱۰)......اس کی جدائیگی اور فراق کے تصور سے جی گھبراتا ہو اور ملاقات کی خبر اور تصور سے دل کو خاص خوشی محسوس ہو۔

(۱۱)......اس سے خلوت میں ملنے کا حریص ہو۔

(۱۲)......اس کی ذات سے وابستہ تمام چیزوں سے دل میں محبت محسوس ہو اور اس کا شہر اور گاؤں اس کے گلی کوچے اس کے رشتہ دار اور بھائی بہن وغیرہ سے دل میں ایک طرح کا لگاؤ اور تعلق محسوس ہو اور اندر اندر نفس کو اس میں مزہ اور لذت محسوس ہو۔

یہ تقریباً ایک درجاً علامات اور نشانیاں ہیں جو کہ ایک تھرمامیٹر ہے جن کو پڑھ کر اور اپنے اوپر منطبق کر کے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ میرا یہ تعلق اللہ کے لیے ہے یا نفس کی خاطر ہے مگر ظاہر ہے کہ ہمیں خود جانچنے اور پرکھنے کا اختیار صرف انہی مواقع پر ہے جہاں شریعت نے صاف صاف واضح طور پر اس تعلق کے نفسانی ہونے کو نہ بتا دیا ہو ورنہ عورتوں سے تنہائی میں ملنا یا بے ریش خوبصورت لڑکوں سے ملاقات کرنا یہ صراحتاً غیر شرعی تعلق ہے فوری طور پر اس کا ترک واجب ہے اور اس کو باقی رکھنا حرام ہے۔

عورتوں کی بیعت اور اپنے شیخ سے استفادہ کی صورت

اب رہ گئی یہ بات کہ امرد لڑکے یا غیر محرم لڑکیاں اگر کسی شیخ کامل متبع سنت وشریعت سے مستفید ہونا چاہیں تو شریعت نے اس کے طریقے اور حدود کیا مقرر فرمائی ہیں؟ اس جواب یہ ہے کہ:

(۱)......ان کے مواعظ اور کتابوں سے مستفید ہوں۔

(۲)......خط لکھتے وقت اپنے کسی محرم رشتہ دار مثلاً والد، بھائی یا شوہر وغیرہ کے دستخط کا التزام کیا جائے، اگرچہ وہ پورا خط نہ پڑھیں مگر ان کے دستخط کے بغیر اپنے شیخ کو خط نہ بھیجے۔

(۳)......امرد لڑکا تنہائی میں شیخ سے نہ ملے۔

(٤)...... نامحرم عورت کم سے کم اور بقدر ضرورت گفتگو کرے۔

(٥)...... جانبین میں گفتگو میں نرم لہجہ اختیار کرنے سے گریز کیا جائے گو کہ ادب کا خیال قائم رہے۔

(٦)...... اگر شیخ مناسب سمجھے تو جانبین کی حفاظت کے لیے اور نفس وشیطان کے مکر سے بچنے کی احتیاطی تدبیر کے طور پر ایسے وقت میں فون پر بات کیا کرے جب تنہائی نہ ہو۔ پہلے ہی سے ایسا وقت مقرر کرے۔

بعض ایسی چیزیں جو غیر اہل حق مشائخ کے یہاں پائی جاتی ہیں یعنی عورتوں سے بے پردہ ہونا اور ان کے ساتھ مصافحہ کرنا اور ان کے ساتھ بے محابہ گفتگو کرنا یا خلوت و یکسوئی اختیار کرنا یہ سب امور خلاف شرع ہیں جن کا طریقت اور تصوف سے کوئی تعلق نہیں ہے کیونکہ ان میں سے کوئی ایک بات بھی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں یہاں تک کہ بعض احادیث شریفہ میں جہاں عورتوں کی بیعت کا ذکر ہے یہ بات وضاحت کے ساتھ مذکور ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم عورتوں سے بیعت کے وقت مصافحہ نہیں فرماتے تھے بلکہ صرف زبانی بیعت کرنے پر اکتفاء فرماتے تھے: چنانچہ مشکوٰۃ کی حدیث ہے:

﴿عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ فِیْ بَیْعَةِ النِّسَاءِ اَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ کَانَ یَمْتَحِنُهُنَّ بِهٰذِهِ الْاٰیَةِ (یٰاَیُّهَا النَّبِیُّ اِذَا جَآءَکَ الْمُؤْمِنٰتُ یُبَایِعْنَکَ) فَمَنْ اَقَرَّتْ بِهٰذَا الشَّرْطِ مِنْهُنَّ قَالَ لَهَا قَدْ بَایَعْتُکِ کَلَامًا یُکَلِّمُهَا بِهٖ وَاللهِ مَا مَسَّتْ یَدُهٗ یَدَ امْرَأَةٍ قَطُّ فِی الْمُبَایَعَةِ﴾

(مشکاۃ المصابیح، کتاب الجهاد، باب الصلح، ص: ٣٥٣)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا قسم کھا کر فرماتی ہیں کہ عورتوں کی بیعت کے سلسلہ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ معاملہ تھا کہ صرف زبانی بیعت فرماتے تھے کبھی کسی عورت کا ہاتھ بیعت کے سلسلے میں نہیں چھوا۔

یہی بات حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ نے نقل فرمائی۔ اور صحیح بخاری میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے اس بیعتِ نساء کے متعلق فرمایا کہ عورتوں کی یہ بیعت صرف گفتگو اور کلام کے ذریعہ ہوئی، مردوں کی بیعت سے فارغ ہونے کے بعد کوہِ صفا پر عورتوں سے بیعت لی اور پہاڑ کے دامن میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ کو دہرا کر نیچے جمع ہونے والی عورتوں کو پہنچا رہے تھے جو اس بیعت میں شریک تھیں۔ (معارف القرآن، جلد: ۸، صفحہ: ۴۱۶)

اور اس کی بہترین صورت بیعتِ عثمانی ہے یعنی غائبانہ بیعت جس کو حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے ایک حدیث کے تحت یوں ذکر فرمایا ہے:

﴿عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ اِنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَامَ یَعْنِیْ یَوْمَ بَدْرٍ فَقَالَ اِنَّ عُثْمَانَ انْطَلَقَ فِیْ حَاجَةِ اللهِ وَحَاجَةِ رَسُوْلِ اللهِ وَاِنِّیْ اُبَایِعُ لَهٗ فَضَرَبَ لَهٗ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ بِسَهْمٍ وَلَمْ یَضْرِبْ لِاَحَدٍ غَابَ غَیْرَهٗ﴾

(سنن ابی داؤد، کتاب الجهاد، باب فیمن جاء بعد الغنیمة لاسهم له)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم یوم بدر میں کھڑے ہوئے اور ارشاد فرمایا کہ عثمان (رضی اللہ عنہ) اللہ ورسول کے کام میں گئے ہوئے ہیں، اُن کے لیے میں بیعت کرتا ہوں۔

بیعت غائبانہ بزرگوں میں یہ رسم شائع ہے کہ اگر طالب بدون حاضری خدمت شیخ کے درخواست بیعت کی کرے تو غائبانہ اُس کی بیعت قبول کر لیتے ہیں۔ یہ حدیث بیعت غائبانہ میں صریح ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ حاضر نہ تھے، مگر اُن کی رضا ورغبت کی وجہ سے ان کو بیعت فرمالیا اور گو یہ بیعت قتال کی تھی لیکن اقسام بیعت میں اس امر میں فرق کا کوئی قائل نہیں۔ اور یہ غائب ہونا بوجوہ علالت صاحبزادی حضور صلی اللہ علیہ وسلم بضرورت اُن کی تیمارداری کے تھا جو حضرت عثمان رضی اللہ کے نکاح میں تھیں۔ (التکشف، صفحہ:۲۹۸)

لہٰذا جو جعلی پیروں کے یہاں عورتوں سے متعلق خلاف شریعت وسنت معاملات ہوتے ہیں ان کا اسلامی تصوف اور طریقت سے کوئی تعلق نہیں کیونکہ جو چیز سنت وشریعت کے بال برابر بھی خلاف ہو وہ اسلامی تصوف نہیں ہے۔ چنانچہ بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ **لَوْ نَظَرْتُمْ اِلٰی رَجُلٍ اُعْطِیَ مِنَ الْکَرَامَاتِ حَتّٰی یَرْتَقِیَ فِی الْھَوَآءِ فَلَا تَغْتَرُّوْا بِہٖ حَتّٰی تَنْظُرُوْا کَیْفَ تَجِدُوْنَ عِنْدَ الْاَمْرِ وَالنَّھْیِ وَحِفْظِ الْحُدُوْدِ وَاَدَاءِ الشَّرِیْعَۃِ وَقَالَ اَبُوْ حَفْصٍ مَنْ لَّمْ یَزِنْ اَفْعَالَہٗ وَاَقْوَالَہٗ فِیْ کُلِّ وَقْتٍ بِالْکِتَابِ وَالسُّنَّۃِ فَلَا تَعُدُّہٗ فِیْ دِیْوَانِ الرِّجَالِ** دونوں اکابر کا حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ وحضرت ابوحفص کے اقوال کا خلاصہ یہ ہے کہ اصل چیز امر ونہی کا خیال اور سنت وشریعت کی پیروی ہے ورنہ ہواؤں میں اڑنا بھی بے کار اور لغو ہے جس کا ولایت اور بزرگی سے کوئی تعلق نہیں ہے، بس مردانِ خدا وہی لوگ ہیں جو ہر لحہ قرآن وسنت کے مطابق عمل کرتے ہوں۔

یعنی اصل کسی آدمی کی ولایت اور تقویٰ کا مدار اتباع سنت وشریعت پر ہے کرامتوں کے ظہور پر نہیں ہے جبکہ عام طور پر لوگ اس سے دھوکا کھا جاتے ہیں اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ جو جتنی کرامتوں والا ہو وہ اتنا ہی بڑا بزرگ ہے حالانکہ صحیح بات یہ ہے کہ جو ہر قدم پر سنت وشریعت کا متبع ہو سب سے بڑا ولی وہی ہے۔

خرد اور عقل کی باہمی رسہ کشی

خرد نے گو کیا ہے میرے دامن کو رفو ہر دم
مگر کیوں عشق کی یہ چاک دانائی نہیں جاتی

یہ مضمون کتاب میں مختلف مقامات پر مذکور ہے اس میں دو لفظوں کا استعمال کیا جاتا ہے ایک خرد اور دوسرا عشق اختصار کے ساتھ اس کا حاصل یہ ہے کہ عشق کا تقاضہ اپنے اللہ پر سب کچھ قربان کر دینا اور اپنی ظاہری حالت بنانے اور سنوارنے سے بالکل لاپرواہ اور بے فکر ہو جانا ہے جب کہ عقل یہ چاہتی ہے کہ اپنی ظاہری حالت کو بہتر سے بہتر بنایا جائے اور کچھ اپنی توجہ اور سعی وکوشش اس طرف خرچ کی جائے گو کہ اس میں کوئی حرج نہیں مگر اللہ کے

عاشقوں کو اتنا بھی گوارہ نہیں ہوتا اس لیے وہ ہر وقت چاک دامانی کی حالت میں نظر آتے ہیں جس کی وجہ سے اہل دنیا ان کو بے وقوف اور مجنوں وغیرہ کے لقب دیتے ہیں۔

گناہوں پر ندامت کی کرامت محبوبیت ہے

گناہوں پر ندامت سے یہ توبہ کی کرامت ہے
کہ تائب سے کبھی ان کی مہربانی نہیں جاتی

حدیث پاک میں آتا ہے:

﴿اَلتَّائِبُ حَبِیْبُ اللّٰہِ﴾
(التیسیر بشرح الجامع الصغیر)

جو بندہ توبہ کر لیتا ہے وہ اللہ کا محبوب بن جاتا ہے۔اسی طرح قرآن میں اللہ تعالیٰ نے اعلان فرمایا:

﴿اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ﴾
(سورۃ البقرۃ، اٰیۃ:۲۲۲)

کہ بے شک اللہ توبہ کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔اسی لیے بندے کو توبہ کی توفیق دینا ہی اس پر اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم اور مہربانی کا اثر ہے اس لیے جسے توبہ کی توفیق مل گئی ہو اسے یہ سمجھ لینا چاہیے کہ ان شاء اللہ اس کی توبہ بارگاہ الٰہی میں قبول بھی ہوگی اس پر حضرت والا دامت برکاتہم عالیہ کی دارالعلوم آزادول کے بیان میں ذکر کردہ ایک بات یاد آئی اور وہ یہ کہ توبہ کا سرکاری مضمون وہ ہے جو حضرت آدم علیہ السلام کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان الفاظ میں عطا فرمایا (رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْلَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَکُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ) اس لیے اپنے گناہوں کی معافی چاہنے کے لیے سب سے بہتر انہیں قرآنی الفاظ میں دعا کرنا ہے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا مشہور قول یہی ہے کہ جو کلمات توبہ حضرت آدم علیہ السلام کو دیئے گئے وہ یہی مذکورہ بالا کلمات تھے۔

بعض سلف سے پوچھا گیا کہ جس شخص سے کوئی گناہ سرزد ہو جائے وہ کیا کرے؟ تو فرمایا وہی کام کرے جو اس کے پہلے والدین آدم وحواء علیہما السلام نے کیا، کہ اپنے کیے پر ندامت اور آئندہ نہ کرنے کے عزم کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے معافی کے لیے عرض کیا کہ (رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا) یعنی ہمارے پروردگار ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کر لیا ہے اگر آپ معاف نہ کریں ہم پر رحم نہ کریں تو ہم سخت خسارہ والوں میں داخل ہو جائیں گے، اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا کہ (رَبِّ اِنِّیْ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ فَاغْفِرْلِیْ) یعنی اے میرے پالنے والے میں نے اپنی جان پر ظلم کر لیا ہے، تو آپ ہی میری مغفرت فرمایئے اور حضرت یونس علیہ السلام سے جب لغزش ہوگئی تو عرض کیا کہ: (لَآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَکَ اِنِّیْ کُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ) یعنی اللہ کے سوا کوئی لائق عبادت نہیں، آپ ہر برائی سے پاک ہیں، میں ظلم کرنے والوں میں داخل ہو گیا ہوں۔مطلب یہ ہے کہ مجھ پر رحم فرمایئے۔(معارف القرآن، جلد:۱، صفحہ ۲۰۰)

اور حضرت والا نے ارشاد فرمایا ہے کہ تائب سے کبھی ان کی مہربانی نہیں جاتی۔ دراصل ان مختلف حدیثوں کے مضمون کی ترجمانی ہے کہ جن میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا ہے کہ اگر ستر مرتبہ بھی ایک دن میں ہی گناہ کرتا رہے اور توبہ کرے پھر بھی بخش دیا جاتا ہے۔ چنانچہ حدیث شریف میں ہے:

﴿عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ سَمِعْتُ النَّبِیَّ صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ إِنَّ عَبْدًا أَصَابَ ذَنْبًا وَّرُبَّمَا قَالَ أَذْنَبَ ذَنْبًا فَقَالَ رَبِّ أَذْنَبْتُ وَرُبَّمَا قَالَ أَصَبْتُ فَاغْفِرْ لِیْ فَقَالَ رَبُّهٗ أَعَلِمَ عَبْدِیْ أَنَّ لَهٗ رَبًّا یَغْفِرُ الذَّنْبَ وَیَأْخُذُ بِهٖ غَفَرْتُ لِعَبْدِیْ ثُمَّ مَكَثَ مَا شَآءَ اللهُ ثُمَّ أَصَابَ ذَنْبًا أَوْ أَذْنَبَ ذَنْبًا فَقَالَ رَبِّ أَذْنَبْتُ أَوْ أَصَبْتُ اٰخَرَ فَاغْفِرْهُ فَقَالَ أَعَلِمَ عَبْدِیْ أَنَّ لَهٗ رَبًّا یَغْفِرُ الذَّنْبَ وَیَأْخُذُ بِهٖ غَفَرْتُ لِعَبْدِیْ ثُمَّ مَكَثَ مَا شَآءَ اللهُ ثُمَّ أَذْنَبَ ذَنْبًا وَّرُبَّمَا قَالَ أَصَابَ ذَنْبًا قَالَ قَالَ رَبِّ أَصَبْتُ أَوْ قَالَ أَذْنَبْتُ اٰخَرَ فَاغْفِرْهُ لِیْ فَقَالَ أَعَلِمَ عَبْدِیْ أَنَّ لَهٗ رَبًّا یَغْفِرُ الذَّنْبَ وَیَأْخُذُ بِهٖ غَفَرْتُ لِعَبْدِیْ ثَلَاثًا فَلْیَعْمَلْ مَا شَآءَ﴾

(صحیح البخاری، کتاب التوحید، باب قول الله تعالٰی یریدون ان یبدلوا کلام الله)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ایک انسان نے گناہ کیا اور پھر یوں کہاں اے اللہ مجھ سے گناہ ہو گیا ہے، آپ مجھے معاف کر دیجئے۔ پھر اُس کے رب نے جواب میں یہ کہا کہ کیا میرا بندہ یہ بات جانتا ہے کہ اُس کا کوئی رب ہے جو گناہ پر پکڑتا بھی ہے اور اگر چاہتا تو معاف بھی کر دیتا ہے۔ میں نے اپنے اس بندے کو بخش دیا۔ پھر یہ شخص کچھ دنوں تک اسی حال میں ٹھہرا رہا جتنا اللہ نے چاہا اور پھر گناہ میں مبتلا ہوا پھر سے اسی طرح کہا کہ اے اللہ! مجھ سے گناہ ہو گیا الخ یہاں تک کہ تین مرتبہ اسی طرح سلسلہ ہوا تو اللہ تعالیٰ آخر میں فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے بندے کو تیسری بار بھی بخش دیا اور اب وہ جو چاہے کرے یعنی اگر وہ اس طرح گناہ کرتا رہے گا کہ گناہ کے ساتھ توبہ کو ملا لیا کرے تو وہ جتنا بھی اور جب تک بھی کرے گا میں بھی اُتنا ہی معاف کرتا رہوں گا۔ بندہ گناہ کرنے سے تھک سکتا ہے لیکن اللہ معاف کرنے سے نہیں تھکتے، کیونکہ اللہ کی رحمت بندے کے گناہ سے بہت زیادہ بڑھ کر ہے۔

اور حقیقت یہ ہے کہ توبہ کرنے والا بندہ اگر حالت توبہ میں دنیا سے رخصت ہو جائے تو وہ بھی قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے نیک صالح بندوں کے ساتھ اٹھایا جائے گا اس پر یاد آیا کہ حافظ عبدالولی بہرائچی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو لکھا کہ حضرت میرا حال بہت خراب ہے نہ جانے قیامت کے دن میرا کیا حال ہو گا حضرت نے تحریر فرمایا کہ ان شاء اللہ بہت اچھا حال ہو گا اگر کاملین میں نہ اٹھائے گے تو ان شاء اللہ تائبین میں ضرور اٹھائے جاؤ گے اور یہ بھی بڑی نعمت ہے اور فرمایا کہ یہ ہمارے سلسلہ کی برکت ہے جو لوگ اللہ والوں سے جڑے رہتے ہیں محروم نہیں رہتے۔ (باتیں ان کی یاد رہیں گی، صفحہ: ۱۴۰)

اس لیے کہ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نیک بندوں کا جہاں شمار فرمایا اس میں تائبین کا خاص ذکر

فرمایا ہے اس لیے اس میں کیا شبہ ہوسکتا ہے کہ تائب سے اللہ تعالیٰ کی مہربانی اور اس کا خاص فضل وکرم کبھی جدا نہیں ہوتا حضرت والا نے کیا ہی خوب فرمایا ؎

جس کو استغفار کی توفیق حاصل ہو گئی
پھر نہیں جائز یہ کہنا کہ وہ بخشیدہ نہیں

یہاں تک کہ حضرت والا دامت برکاتہم نے ''توبہ کے آنسو'' والے وعظ میں یہ بات بیان فرمائی ہے کہ ملا علی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ایک صاحبِ کشف بزرگ نے کہا کہ ابلیس نے جو کہا تھا: '' اَنْظِرْنِیْ'' کہ مجھے مہلت دیجئے قیامت تک آپ کے بندوں کو گمراہ کرنے کے لیے لیکن اگر یہ ظالم ''اُنْظُرْ اِلَیَّ'' کہہ دیتا ایک نظرِ رحمت مجھ پر ڈال دیجئے تو یہ بخش دیا جاتا۔

میری تمام امیدوں کا مرکز صرف میرے مولیٰ کا در ہے

ہمارا مرکزِ امیدِ رحمت آپ کا در ہے
کسی کے سامنے تو یا رب یہ پیشانی نہیں جاتی

قرآن کریم میں اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿اَلَیْسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبْدَہٗ﴾
(سورۃ الزمر، اٰیۃ: ۳۶)

ترجمہ: کیا اللہ اپنے بندے کو کافی نہیں ہے۔

اسی طرح ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَکَفٰی بِاللّٰہِ وَلِیًّا وَّکَفٰی بِاللّٰہِ نَصِیْرًا﴾
(سورۃ النساء، اٰیۃ: ۴۵)

ترجمہ: اللہ تعالیٰ ولی ہونے اور حامی ومددگار ہونے کے لیے کافی ہیں۔

اس مضمون کی بے شمار آیتیں قرآن کریم میں نازل ہوئی ہیں جن کا حاصل اور خلاصہ یہ ہے کہ مومن کے ایمان کا تقاضہ ہے کہ وہ صرف اللہ تعالیٰ کے در کو خوب مضبوطی کے ساتھ پکڑے اور ہر قسم کی امید ورجا اسی در کے ساتھ وابستہ رکھے کسی بھی غیر اللہ کے ساتھ ہماری کوئی امید اور خوف وابستہ نہیں ہونا چاہیے ہر گھڑی اللہ تعالیٰ کی رحمت پر نظر ہو اور اسی سے اپنے سارے معاملات دنیا اور آخرت کے مانگتا رہے کیونکہ وہ اکیلا اللہ اپنے بندوں کی ہر ضرورت کے لیے کافی ہے اور پھر اللہ تعالیٰ کا یہ اعلان ہے کہ:

﴿اَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِیْ بِیْ﴾

کہ میں اپنے بندے کے ساتھ ویسا ہوتا ہوں جیسا وہ مجھ پر گمان کرتا ہے، سو ہم اللہ تعالیٰ کے در کے ساتھ جس قدر مضبوط گمان قائم کریں گے اور جیسا یقین اللہ کی ذات عالی کے ساتھ قائم کریں گے اللہ تعالیٰ بھی ویسا ہی معاملہ فرماتے ہیں۔

بس شرط یہ ہے کہ اپنے آنکھوں کے مشاہدہ کو اللہ تعالیٰ کی غیب کی خبر کے یقین پر ترک کر دے اور بالکل چھوڑ دے اس موقع پر اگر مگر کا معاملہ نہ کرے جو اللہ تعالیٰ کے وعدوں میں تردد اور شک کرنے والوں کا شیوہ اور عادت ہے جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی خاص مدد ایسے لوگوں کے ساتھ نازل نہیں ہوتی یہی تو وجہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پہلے میدانوں میں اترتے اور سمندروں میں اپنے گھوڑوں کو ڈالتے اور پھر اللہ کی مدد اترتے ہوئے اور وعدے پورے ہوتے ہوئے نظر آتے تھے اور سمندروں میں راستے بنتے چلے جاتے تھے ایسا نہیں کہ پہلے دیکھیں کہ راستہ بن گیا ہے یا نہیں؟ اور پھر اس میں قدم رکھتے اور اس کے برخلاف جب کہ آج کا مسلمان اپنی آنکھوں کے مشاہدہ کے خلاف سینکڑوں اگر مگر دل میں چھپائے ہوئے ہوتا ہے جو درحقیقت خدا کے وعدوں پر یقین کی کمی کی ترجمانی کرتے ہیں اور جس کی وجہ سے خدا کی مدد اٹھ جاتی ہے ورنہ حالت یہی ہونی چاہیے کہ نہ کسی اور کے سامنے جھکنا ہے اور نہ کسی سے مانگنا ہے زندگی گزارنے کا سہارا بس اپنے اللہ کا رحم و کرم ہونا چاہیے۔

اللہ نے سب کچھ مفت میں دیا ہے پھر کسی سے مفت لینے کا خیال کیسا؟

ایک دن ایک شخص مجھ سے کہنے لگے کہ فلاں شخص سے اگر تعلق ہو جو کہ اس دکان کا مالک ہے تو پھر وہ دکان سے کچھ تھوڑا بہت سامان لینے کی صورت میں علماء اور طلباء کو مفت میں دے دیتا ہے اس لیے کبھی کبھی ان سے ملاقات کرا کر اپنا تعارف کرا لینا چاہیے کچھ تعلق قائم رکھنا چاہیے تاکہ اور دوسرے مواقع پر بھی ضرورت پڑنے کی صورت میں وہ کام آ سکتے ہیں خاص طور پر ہر سال کچھ لوگوں کو ان کی طرف سے حج و عمرہ پر بھیجنے کا انتظام ہوتا ہے تو مفت میں حج و عمرہ کرنے کا بھی موقع ہاتھ آ سکتا ہے اس لیے کبھی کبھی ان سے ملنے کے لیے آتے رہنا چاہیے۔

تو اس پر احقر نے ان ساتھی سے عرض کیا کہ جہاں تک ان سیٹھ صاحب کی علماء و طلباء کو کچھ سامان مفت میں دینے کی بات ہے تو اس سلسلے میں تو اتنا عرض ہے کہ ہمیں بحمد اللہ اللہ تعالیٰ نے اپنا در دکھایا اور پوری زندگی ہماری ساری ضرورتیں اور دوسری ہزاروں نعمتیں اللہ تعالیٰ نے اپنے خزانوں سے ہمیں مفت ہی میں تو نصیب فرمائی ورنہ ہم نے اللہ تعالیٰ کو ان کے بدلے کے طور پر کوئی عوض پیش نہیں کیا جس کی بدولت اللہ تعالیٰ پر لازم ہو گیا ہو کہ وہ ہمیں اس کا بدلہ بطور اجرت کے پیش کریں بلکہ اس سے آگے بڑھ کر بات تو یہ ہے کہ ہمارا سارا وجود ہی ہمیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے مفت میں ملا ہوا ہے تو پھر کسی مخلوق سے دو چار دن کی کوئی ضرورت مفت میں پوری کرنے کی توقع اور امید رکھنا اور کچھ ضرورتوں کو مخلوق کے رحم و کرم پر چھوڑ دینا یہ اللہ تعالیٰ کے درِ رحمت کے ساتھ وابستگی کی کمی کا نتیجہ ہوگا

جوحق تعالیٰ کو انتہائی نا گوار ہوگا۔ تو احقر کے جواب کا خلاصہ یہ تھا کہ جب اللہ تعالیٰ نے ہمیں ساری ہی نعمتیں مفت میں عطا فرمارکھی ہیں تو ہم دو ایک نعمتوں کو کسی انسان سے مفت لینے کے واسطے اس کے در پر کیوں جائیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی کامل بندگی اور سچی وفاداری کے خلاف ہے اور اللہ کی ناراضگی کا باعث ہے۔

اس کو ایک مثال سے یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ ایک شخص ہے جس کے والد اپنے علاقے کے نہایت مال و دولت والے آدمی ہیں مختلف قسم کی دولتوں اور نعمتوں کے خزانوں کے مالک ہیں اب اس کی اولاد میں سے کوئی اس علاقے کے کسی معمولی درجہ کے آدمی کے پاس جا کر اپنی ضرورتوں کا سوال کرنا شروع کر دے اور ان سے اپنی حاجتیں مانگنا شروع کر دے تو غور کرنے کی بات ہے کہ اس کے والد کو اطلاع ہونے کی صورت میں کس قدر رنج اور غم ہوگا اس کا صحیح اندازہ لگانا بھی مشکل ہے اور وہ اپنے اس بیٹے سے انتہائی ناراضگی اور غصہ کا اظہار کرے گا۔

کہ جب تو میرے ساتھ وابستہ ہے اور میرے بیٹے ہونے کی نسبت تجھے حاصل ہے اور میرے پاس کسی چیز کی کوئی کمی نہیں ہے تو پھر تو نے کسی اور کے در پر جا کر اس طرح کیوں سوال کیا؟

کیا تجھے اس میں کچھ شک تھا کہ میرے پاس یہ سب دولت وخزانے ہیں؟

یا تجھے اس میں شک تھا کہ تو مجھ سے مانگے گا اور میں تجھے نہیں دوں گا؟

یا تیرا یہ گمان تھا کہ تو جتنا مجھ سے مانگنا چاہتا ہے اتنی مقدار میرے پاس نہیں ہے؟

یا تو نے اپنے والد کی نسبت زیادہ رحمت وشفقت کسی دوسرے کے در پر دیکھی؟

اگر یہ سب باتوں کے جواب میں اس بیٹے کی طرف سے اپنے باپ کو جواب کے طور پر ہاں کہہ دیا جائے تو اس کے والد کو شدید تکلیف اور رنج وغم کا سامنا ہوگا اور اس کے دل کو بہت ہی صدمہ اور احساس ہوگا کہ جب کہ ساری دنیا کو میں صبح شام تقسیم کرتا ہوں اور یہ میرا بیٹا دوسروں کے در پر بھیک مانگتا پھرتا ہے۔

صاحبو! ایمان والو! اس مثال میں غور کر کے ہم تھوڑا سا اپنے حالات کا جائزہ لیں کہ ہم اپنے خالق کے در رحمت کو چھوڑ کر دوسروں سے لینے اور مانگنے کی جو عادت ڈالے ہوئے ہیں یہ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں جتنی بھی ناپسند کہی جائے وہ کم ہے کیونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ سب سے زیادہ غیرت والے ہیں اور لامحدود خزانوں والے ہیں اور بلا استحقاق اپنے بندے پر رحم وکرم کا معاملہ فرما کر اسے صبح وشام بے شمار نعمتیں عطا فرماتے رہتے ہیں جن کو اگر ہم شمار کرنا چاہیں اور ان کی حیثیت وقیمت کا اندازہ لگانا چاہیں تو نہ شمار کر سکتے ہیں اور نہ ہی اندازہ لگا سکتے ہیں جب کہ یہ ساری نعمتیں اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے بلا کسی عوض کے اپنے بندوں کو مفت میں ملی ہوئی ہیں۔

کیا کوئی ہے جو یہ دعویٰ کر سکے کہ میں نے اللہ سے جو کچھ لیا ہے اس کا بدل اللہ کو پیش کر دیا۔ ایسا کبھی بھی نہیں ہوسکتا اور یہ کسی انسان سے ممکن ہی نہیں۔

پھر اپنی کسی مختصر سی ضرورت یا معمولی سے کسی سامان کے خاطر کسی دولت انسان سے کوئی امید وطمع رکھنا اور مفت میں لینے کی خواہش دل میں رکھنا اور محض اس مقصد کے لیے اس سے اپنا تعلق پیدا کرنا اللہ تبارک و تعالیٰ کی رحمت سے دوری کا سبب ہوگا اور خاص عنایت خداوندی ایسے بندے کے سر سے اٹھ جائے گی۔

مفت میں حج وعمرہ کے لیے مالداروں سے تعلق پر ایک نظر

رہ گیا مفت میں ہر سال حج وعمرے کا معاملہ تو اس سلسلے میں یہ بات ذہن میں رہنی چاہئے کہ حج وعمرہ بذاتِ خود کوئی مقصود چیز نہیں ہے بلکہ مومن کا مقصود اصلی اللہ تعالیٰ کو راضی کرنا ہے اسی لیے تمام عبادات مشروع ہوئی ہیں۔ لہٰذا ہمارے جس عمل سے اللہ تعالیٰ راضی نہ ہوتے ہوں خواہ بظاہر اس کے ذریعے ہمیں بڑی عبادت انجام دینے کا موقع میسر آرہا ہو ایسا عمل قابل ترک ہے اور ظاہر ہے کہ اہل علم وفقہ حضرات کو دنیاداروں امراء وحکام کے دروازوں پر جانے سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کثرت سے روایات میں منع فرمایا ہے اگرچہ ہم ان سے زبان کے ذریعے سے کوئی سوال نہ کر رہے ہوں مگر دل میں کچھ ملنے کا لالچ اور امید رکھنا جس کو اصطلاح شریعت میں ''اشراف نفس'' کہا جاتا ہے یہ بھی منع ہے۔

بالفاظ دیگر یوں کہئے کہ ایک سوال زبان سے ہوتا ہے اور ایک دل سے، سو جس طرح کسی سے بلاضرورت شدیدہ زبان سے سوال کرنا منع ہے ٹھیک اسی طرح دل کا سوال بھی منع ہے یعنی کسی سے امید وطمع رکھنا اور ایسی شکل اختیار کرنا کہ وہاں سے کچھ حاصل ہو جائے اور اللہ تعالیٰ عالم الغیب ہیں ہمارے دل کے حال کو خوب جاننے والے ہیں اس لیے دل میں بھی کسی مخلوق سے کسی قسم کے نفع کے امید نہیں رکھنی چاہیے بلکہ ہمارا مرکزِ امید صرف اللہ کا در ہونا چاہیے اور اللہ تعالیٰ جو کچھ عنایت فرمائیں اس کا شکر ادا کیا جائے اور جب تک حاصل نہ ہو تو صبر اختیار کیا جائے۔

البتہ اس موقع پر یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ کبھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی دنیا کی نعمت مال ودولت وغیرہ کسی کے ذریعے سے حاصل ہو رہی ہو اور اس میں نہ دل کا لالچ ہو اور نہ زبان کا سوال ہو تو پھر اس کو رد نہیں کرنا چاہیے جیسا کہ ایک روایت میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

﴿كَانَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُعْطِيْنِى الْعَطَآءَ فَأَقُوْلُ أَعْطِهِ مَنْ هُوَ أَفْقَرُ إِلَيْهِ مِنِّىْ فَقَالَ خُذْهُ إِذَا جَآءَكَ مِنْ هٰذَا الْمَالِ شَىْءٌ وَأَنْتَ غَيْرُ مُشْرِفٍ وَّلَا سَائِلٍ فَخُذْهُ وَمَا لَا فَلَا تُتْبِعْهُ نَفْسَكَ قَالَ سَالِمٌ فَلِاَجْلِ ذٰلِكَ كَانَ [illegible] اللهِ لَا يَسْأَلُ اَحَدًا شَيْئًا وَلَا يَرُدُّ شَيْئًا اُعْطِيَهُ﴾

(صحيح البخارى، كتاب الزكوة، باب من اعطاه الله شيئًا من غير مسئلة)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھ کو کچھ ہدیہ دیتے میں عرض کرتا کہ یہ ایسے شخص کو دیجئے جو مجھ سے زیادہ اس کا حاجت مند ہو آپ فرماتے کہ اس کو لے لو اور جو مال بھی اس قسم کا

تمہارے پاس آوے اس طرح سے کہ نہ تو تم اس میں کسی کے دست نگر ہو اور نہ کسی سے سوال کیا ہو تو تم اس کو لے لو اور اپنی ملک بنالو پھر اگر چاہو تو کھاؤ اور اگر چاہو تو خیرات کرو اور جو نہ آوے تو اپنے نفس کو اس کے پیچھے مت ڈالو حضرت سالم کہتے ہیں کہ اسی لیے حضرت عبداللہ کا معمول تھا کہ نہ تو کسی سے کچھ مانگتے تھے اور نہ آئی ہوئی چیز کو پھیرتے تھے روایت کیا ہے اس کو بخاری و مسلم ونسائی نے۔

اسی پر فارسی کا ایک مقولہ ہے: ''چون نیاید طمع نکند و چون بیاید منع نکند و چوں بگیرد جمع نہ کند''۔ یعنی کہ جب نہ آئے تو طمع ولالچ نہ کرے اور جب آئے منع نہ کرے اور جب لے لے تو جمع نہ کرے۔ (التکشف: ۴/۱۲۷)

حاسد بوجہِ حسد میری آہ نہیں پہچان سکتا ہے

مرے دل کو جو بخشی تو نے آہوں کی فراوانی
مگر حاسد سے میری آہ پہچانی نہیں جاتی

یہ ایک خاص محبت کا مقام ہے جس میں اللہ تعالیٰ کا قربِ قلب میں اتنا زیادہ ہوتا ہے اور محبت کی ایسی آگ لگی ہوتی ہے کہ اللہ کا یہ عاشق ہر دم آہ وفغاں کرتا رہتا ہے مگر جو شخص خود اس حال سے گزرا نہ ہو یا کسی رقابت اور حسد کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے سچے عاشق کو ماننے کے لیے تیار نہ ہو تو پھر اس آہ وفغاں پر بھی تنقید اور تبصرے اور طرح طرح کی طعن وتشنیع آنے لگتی ہے اور ایسا بکثرت دیکھا جاتا ہے کہ جہاں اولیاء اللہ کو دل سے ماننے والوں کی ایک جماعت ہوتی ہے وہیں کچھ لوگ اپنی محرومی قسمت اور شقاوت وبدبختی کی وجہ سے ان سے بغض وحسد کی آگ میں جلنے لگتے ہیں اور یہ معاملہ انبیاء واولیاء سب کے ساتھ پیش آنا اللہ تعالیٰ کی سنت وعادت سے ہے جیسا کہ قرآن کریم میں کئی مواقع پر ایسی آیتیں مذکور ہیں کہ ہم نے اپنے تکوینی نظام کے تحت اپنے نبیوں کے لیے کچھ مجرمین میں سے دشمن بنائے کبھی بھی ان سے گھبرانا نہیں چاہیے بلکہ یہی سمجھتا رہے کہ یہ بے چارے ایک درجے میں معذور ہیں کہ ان کو میری حالت کا صحیح ادراک نہیں ہے۔ اور درحقیقت یہ چیزیں بچند وجوہ مؤمن کے ایمان اور ولی کی ولایت میں ترقی کا ذریعہ ہوا کرتی ہیں۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب آپ کی قوم کی طرف سے ایذائیں پہنچائی گئیں خاص طور پر طائف کے مقام پر مخالفین کی طرف سے سخت ایذاؤں کا سامنا ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی جملہ ارشاد فرمایا تھا:

﴿اَللّٰهُمَّ اهْدِ قَوْمِيْ فَاِنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾

(شعب الایمان للبیہقی)

کہ اللہ میری قوم کو ہدایت دے دیجیے کیونکہ وہ جانتے نہیں ہیں بس ٹھیک اسی طرح سے جب اللہ کے کسی ولی اور سچے عاشق کے اندرونِ قلب لگی ہوئی محبتِ خداوندی کی آگ کی حقیقت کو کوئی نہ پہچان سکے اور قدردانی کرنے کے

بجائے بغض وحسد کا معاملہ کرے تو ہمیں بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اسی سنت پر عمل کرنا چاہیے۔

مالک کا کرم ہو تو بندگی کا لطف نصیب ہوتا ہے

مرے مالک کرم سے آپ نے جس پر نگہ ڈالی
پھر اس کی بندگی سے شانِ ربانی نہیں جاتی

جس پر اللہ تعالیٰ کی خاص کرم کی نظر پڑ جاتی ہے تو پھر یہ ایک سچی حقیقت ہے کہ اسے جتنی بھی نعمتیں ملیں لیکن سب سے بڑی نعمت اللہ تعالیٰ یہ عطا فرماتے ہیں کہ اس کی زندگی کا ہر لمحہ اپنی یادوں کے ساتھ جوڑ دیتے ہیں اور وہ ہر وقت مختلف انداز اور طریقوں سے اپنے اللہ کی یاد میں لگا رہتا ہے اس کا دل دنیا سے اچاٹ اور آخرت کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ جس پر اپنی نظر کرم ڈال دیتے ہیں اسے اپنی طرف جذب فرما لیتے ہیں اور یہ جذب والا راستہ نہایت آسان اور اونچا راستہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی اس آیت میں ذکر فرمایا:

﴿اَللّٰهُ يَجْتَبِيٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ﴾

(سورۃ الشوریٰ، آیۃ:۱۳)

ترجمہ: اللہ اپنی طرف جس کو چاہے کھینچ لیتا ہے (یعنی دین حق قبول کرنے کی توفیق دیتا ہے) اور جو شخص (خدا کی طرف) رجوع کرے اس کو اپنے تک رسائی دے دیتا ہے۔ (معارف القرآن، جلد:۷، ص:۶۷۵)

(۱)...... جس بندہ کو چاہتا ہے اللہ تعالیٰ اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ اس طریق کا نام ''طریق جذب'' ہے۔

(۲)...... اور ہدایت دیتا ہے اس بندہ کو جو اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع وتوجہ اختیار کرتا ہے۔ اس طریق کا نام ''طریق سلوک'' ہے۔

سلوک فعل اختیاری ہے اور جذب امر غیر اختیاری، پس بندہ سلوک کا مکلّف ہے لیکن عادۃ ہر سالک کو بھی اس کے مجاہدات کے صلہ میں من جانب اللہ جذب نصیب ہو جاتا ہے کیونکہ بغیر عنایت ویاریِ حق کے کسی کا کام نہیں بنتا۔ جذب اور سلوک ہر دو طریق بہر حال فضل ہی سے موصل الی المقصود اور مثمر للقرب ہوتے ہیں۔

ذرۂ سایۂ عنایت بہتر است
از ہزاراں کوشش طاعت پرست

حق تعالیٰ کی عنایات کا ایک ذرہ سایہ طاعت پر ناز کرنے والے کی ہزاروں کوششوں سے افضل ہے۔

صحابہ رضی اللہ عنہم اور اطاعت رسول صلی اللہ علیہ وسلم

حافظ ابو القاسم طبرانی نے اپنی سند سے حضرت جریر ابن عبد اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ایک بصیرت افروز

قصہ نقل کیا ہے کہ ایک دفعہ حضرت جریر رضی اللہ عنہ نے اپنے غلام کو ایک گھوڑا خرید لانے کا حکم دیا۔ وہ تین سو درہم میں گھوڑا خرید لایا اور گھوڑے کے مالک کو رقم دلوانے کے لیے ساتھ لے آیا۔ حضرت جریر رضی اللہ عنہ کو طے شدہ دام بھی بتلائے گئے اور گھوڑا بھی پیش کر دیا گیا۔ آپ نے اندازہ کیا کہ گھوڑے کی قیمت تین سو درہم سے کہیں زائد ہے۔ چنانچہ آپ نے گھوڑے کے مالک سے کہا کہ آپ کا یہ گھوڑا تین سو درہم سے زائد قیمت کا ہے، کیا آپ چار سو درہم میں فروخت کریں گے؟ اس نے جواب دیا جیسے آپ کی مرضی۔ پھر فرمایا کہ آپ کے گھوڑے کی قیمت چار سو درہم سے بھی زائد ہے، کیا آپ پانچ سو میں بیچیں گے؟ اس نے کہا کہ میں راضی ہوں۔ اسی طرح حضرت جریر رضی اللہ عنہ گھوڑے کی قیمت میں سو سو درہم کی زیادتی کرتے چلے گئے، بالآخر آٹھ سو درہم میں گھوڑا خرید لیا اور رقم مالک کے حوالے کر دی۔ آپ سے سوال کیا گیا کہ جب مالک تین سو درہم پر راضی تھا آپ نے اسے آٹھ سو درہم دے کر اپنا نقصان کیوں مول لیا؟ آپ نے جواب دیا کہ گھوڑے کے مالک کو قیمت کا صحیح اندازہ نہیں تھا، میں نے خیر خواہی کرتے ہوئے اس کو پوری قیمت ادا کی ہے کیونکہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ وعدہ کیا تھا کہ ہمیشہ ہر مسلمان کی خیر خواہی کروں گا، میں نے اس وعدہ کا ایفاء کیا ہے۔ (نووی شرح مسلم، ج:۱،ص:۵۵)

بڑی سے بڑی مشکل میں بھی اُمید پنہانی نہیں جاتی

کبھی مشکل میں بھی پڑتا ہے اختر تو بحمد اللہ
خدا کے فضل سے امید پنہانی نہیں جاتی

دنیا میں جب انسان زندگی گزارتا ہے تو کبھی اسے مشکل حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور کبھی آسانی اور سہولتوں میں زندگی گزرتی رہتی ہے اسی طرح کبھی راحت و عافیت میں رہتا ہے تو کبھی تکلیف و مصیبت سے گزرتا ہے یعنی کہ یہ دو قسم کے ملے جلے حالات اس دنیا میں ہر زندگی گزارنے والے کو پیش آتے رہتے ہیں اس سے کوئی مستثنیٰ نہیں ہے۔ بس اتنا کہا جا سکتا ہے کہ کسی کو کم اور کسی کو زیادہ مگر یہ دنیا دونوں قسم کے حالات کی جگہ ہے اسی لیے صحیح سچے مومن کو اچھے حالات میں اکڑنا اور اترانا نہیں چاہیے اور مشکل حالات میں ناامید اور مایوس ہو کر دل میں بے چینیوں اور پریشانیوں کو جگہ نہیں دینی چاہیے۔

اس کی وجہ عقلی طور پر یہ ہے کہ بندہ مومن کو جو کچھ پہنچتا ہے تو اس کا ایمان اس کے متعلق یہ ہوتا ہے کہ یہ خود نہیں پہنچا بلکہ میرے اللہ نے پہنچایا ہے جو کہ میرا رب اور پالنے والا ہے اور رحیم و کریم بھی ہے تو میں یہی سمجھوں گا کہ جس وقت کے مناسب میرے لیے جو حالات تھے اللہ تعالیٰ نے سو فیصد حکمت و مصلحت کے مطابق ان کو ٹھیک ٹھیک وقت پر میرے لیے بھیجا ہے کہ اگر اس سے ذرا بھی مقدم و موخر ہوتے یا اس وقت میں کچھ اور حالات ہوتے تو وہ میرے لیے مناسب نہیں تھے اس لیے جو شخص اپنے دل میں صحیح ایمان اور اللہ تعالیٰ کی سچی محبت رکھے گا تو وہ مشکل

حالات میں بھی نا امید اور مایوس نہیں ہوگا اس لیے حضرت والا نے فرمایا کہ بحمد اللہ مشکل حالات میں بھی میری اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ امید اسی طرح قائم رہتی ہے اور میں بالکل مایوس اور نا امید نہیں ہوتا۔ اور یہ مایوسی اور نا اُمیدی اہلِ ایمان کی شان نہیں ہے بلکہ قرآن اعلان کرتا ہے:

﴿وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا بِاٰیٰتِ اللّٰہِ وَلِقَآئِہٖۤ اُولٰٓئِکَ یَئِسُوْا مِنْ رَّحْمَتِیْ وَاُولٰٓئِکَ لَھُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ﴾

(سورۃ العنکبوت، آیت: ۲۳)

ترجمہ: جولوگ خدا تعالیٰ کی آیتوں کے اور (بالخصوص) اس کے سامنے جانے کے منکر ہیں وہ لوگ (قیامت میں) میری رحمت سے نا امید ہوں گے (یعنی اس وقت مشاہدہ ہو جائے گا کہ ہم محلِ رحمت نہیں ہیں) اور یہی ہیں جن کو عذاب دردناک ہوگا۔ (معارف القرآن، جلد:۶، صفحہ ۶۸۳)

تو معلوم ہوا کہ نا اُمیدی کافروں کی خصلت اور شیطان کی حالت ہے، ایمان والوں کے لیے کسی بھی صورت میں نا اُمیدی نہیں ہے۔ چنانچہ ایک موقع پر قرآن کریم میں منافقین کی طرف سے مسلمانوں کو کہے جانے والی ایک بات کا جواب اللہ تعالیٰ نے اس طرح دیا جس میں وہ مسلمانوں کو کسی موقع پر میدان جنگ میں شکست ہو جانے یا کوئی اور حادثہ پیش آجانے پر تکلیف اور رنج و دکھ اور افسوس میں ڈالنا چاہتے تھے تو حق تعالیٰ شانہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو منافقین کے مذکورہ اقوال سے متاثر نہ ہونے اور اصل حقیقت کو ہمیشہ سامنے رکھنے کی ہدایت ان الفاظ میں دی:

﴿قُلْ لَّنْ یُّصِیْبَنَآ اِلَّا مَا کَتَبَ اللّٰہُ لَنَا ھُوَ مَوْلٰنَا وَعَلَی اللّٰہِ فَلْیَتَوَکَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ﴾

(سورۃ التوبۃ، آیۃ: ۵۱)

ترجمہ: آپ (جواب میں ان سے دو باتیں) فرما دیجئے (ایک تو یہ کہ) ہم پر کوئی حادثہ نہیں پڑ سکتا مگر وہی جو اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے مقدر فرمایا ہے، وہ ہمارا مالک ہے (پس مالک حقیقی جو تجویز کرے مملوک کو اس پر راضی رہنا واجب ہے) اور (ہماری کیا تخصیص ہے) اللہ کے تو سب مسلمانوں کو اپنے سب کام سپرد رکھنے چاہئیں۔
(معارف القرآن، جلد:۴، صفحہ ۳۸۴)

یعنی آپ ان مادی اسباب کی پرستش کرنے والوں کو بتلا دیجئے کہ تم دھوکے میں ہو یہ مادی اسباب محض ایک پردہ ہے، ان کے اندر کام کرنے والی قوت صرف اللہ تعالیٰ کی ہے ہمیں جو حال پیش آتا ہے وہ سب وہی ہے جو اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے لکھ دیا ہے اور وہی ہمارا مولیٰ اور مددگار ہے اور مسلمانوں کو چاہئے کہ اسی پر اصل بھروسہ رکھیں، مادی اسباب کو صرف اسباب وعلامات ہی کی حیثیت سے دیکھیں، ان پر کسی بھلائی یا برائی کا مدار نہ جانیں۔
(معاف القرآن، ج:۴، ص:۳۸۷)

مجھ کو جینے کا سہارا چاہیے

مجھ کو جینے کا سہارا چاہیے ‏ غم تمہارا دل ہمارا چاہیے
بحرِ الفت کا کنارا چاہیے ‏ سر ہمارا در تمہارا چاہیے
غم میں بس ان کو پکارا چاہیے ‏ ان کے ہوتے کیا سہارا چاہیے
لذتِ فریاد طوفانوں میں ہے ‏ کون کہتا ہے کنارا چاہیے
حاصلِ ساحل مجھے طوفاں میں ہے ‏ ان کے جلووں کا نظارا چاہیے
اپنی آہوں سے درِ جاناں پہ میر ‏ اپنی بگڑی کو سنوارا چاہیے
آپ پر ہر دم فدا ہو میری جاں ‏ غیر کی مجھ کو نہ پروا چاہیے
دستِ بکشا جانبِ زنبیلِ ما ‏ میرے سر کو تیرا سودا چاہیے
اخترؔ خستہ و دُور افتادہ کو ‏ ان کی رحمت کا بلاوا چاہیے

مشکل الفاظ کے معانی:۔ غم: گناہوں سے بچنے میں دل میں ہونے والا غم۔ **بحرِ الفت:** اللہ تعالیٰ کی محبت کا سمندر۔ **درِ جاناں:** اللہ تعالیٰ کا در۔ **دستِ بکشا جانبِ زنبیل ما:** میرے کشکول کی طرف اپنی سخاوت کا ہاتھ بڑھایئے۔ **سودا:** عشق۔ **خستہ:** بدحال۔ **دُور اُفتادہ:** دور پڑا ہوا۔

مؤمن کی حیات کا سہارا اللہ کی یاد اور اس کی راہ کا غم ہے

مجھ کو جینے کا سہارا چاہیے
غم تمہارا دل ہمارا چاہیے

مومن کی اصل زندگی اللہ تعالیٰ کی یاد کے ساتھ وابستہ اور جڑی ہوئی ہے اس کی حیات کا اصل سہارا صرف یہی ہے اگر یہ نہ رہے تو پھر زندہ انسان اور مردہ انسان میں کوئی فرق نہیں جیسا کہ قرآن کریم میں یہ بات ارشاد فرمائی گئی:

﴿وَمَا يَسْتَوِي الْأَحْيَاءُ وَلَا الْأَمْوَاتُ﴾

(سورۃ فاطر، اٰیۃ: ۲۲)

ترجمہ: اور (مؤمن اور کافر میں جو تفاوت بینا و نابینا کا سا کہا گیا ہے تو اس سے مقصود نفی کمی کی ہے نہ کہ زیادتی کی، کیونکہ ان میں تفاوت مردہ اور زندہ کا سا ہے، پس ان کی برابری کی نفی کے لیے یوں بھی کہنا صحیح ہے کہ) زندے اور مرّدے برابر نہیں ہو سکتے۔ (معارف القرآن، جلد: ۷، صفحہ: ۳۳۲)

اسی طرح حدیث شریف میں بھی آیا ہے:

﴿مَثَلُ الَّذِي يَذْكُرُ رَبَّهُ وَالَّذِي لَا يَذْكُرُ كَمَثَلِ الْحَيِّ وَالْمَيِّتِ﴾

(صحیح البخاری، کتاب الدعوات، باب فضل ذکر اللہ عزوجلّ)

کہ اللہ کے ذکر کرنے والے کی مثال زندہ کی طرح ہے اور ذکر نہ کرنے والے کی مثال مردہ کی طرح ہے، اس لیے مسلمان کا اصل سہارا اللہ تعالیٰ کی یاد اور اس کے راستے کا غم یعنی ہر طرح کی حرام لذت اور معصیت سے بچنا ہے خواہ دل پر کتنا ہی زور پڑے اور کیسا ہی رنج وغم اٹھانا پڑے اسی میں مومن کو لذت وفرحت ملتی ہے اس لیے حضرت نے فرمایا کہ میرے جینے کا سہارا یہ ہے کہ میرے دل میں آپ کا دردِ محبت موجود ہے۔ تب اس کے ہوتے ہوئے زندگی زندگی کہلانے کے قابل ہو جاتی ہے اور دل واقعی معنیٰ میں دل بن جاتا ہے حضرت شاہ محمد احمد پرتا بگڈھی رحمہ اللہ کا شعر ہے ؎

شکر ہے دردِ دل مستقل ہو گیا
اب تو شاید میرا دل بھی دل ہو گیا

بحرِ الفت کا کنارا چاہیے
سر ہمارا در تمہارا چاہیے

یعنی کہ میں اللہ تعالیٰ پر ہر وقت ایسا فدا رہوں اور اس کے در پر سر بسجود رہوں کہ جب تک مجھے اللہ تعالیٰ کی محبت کے سمندر کا کنارا حاصل نہ ہو جائے اور اولیائے صدیقین کی نسبت کے خطِ منتہا تک نہ پہنچ جاؤں تب تک اے اللہ مجھے اسی حال میں رکھنا کہ بس ہر گھڑی میں تیری ہی یاد میں مست رہوں، یہاں تک کہ اس محبت کے ساحل تک میں اسی طرح جستجو کرتے کرتے زندگی کے آخری سانس تک مصروفِ عمل رہوں اور یہی بندۂ مومن کی ادائیگیِ بندگی کا تقاضہ ہے اور محبت کا آخری کنارا اور فائنل (Fina) اسٹیج ہے کہ ہر گھڑی اسی کے در پر پڑا رہوں اور اسی کا ہو کر رہوں اور جب آدمی میں یہ کیفیت پیدا ہو جائے تو سمجھ لو کہ اسے مقصدِ حیات حاصل ہو گیا، کیونکہ مومن کا کام ہر وقت اللہ کا در کھٹکھٹانا اور اس پر پڑے رہنا ہے۔ البتہ در کے کھلنے اور ادھر سے جواب کا آنے منتظر نہیں رہنا چاہیے اس پر نظر ہی نہیں رہنی چاہیے، خواجہ صاحب کا شعر ہے ؎

بیٹھے گا چین سے اگر
کام کے کیا رہیں گے پر
گو نہ نکل سکے مگر
پنجرے میں پھڑ پھڑائے جا

اللہ کے سہارے کے بعد کسی سہارے کی ضرورت نہیں

غم میں بس ان کو پکارا چاہیے
ان کے ہوتے کیا سہارا چاہیے

یعنی مومن بندہ کیسے ہی غم میں مبتلاء ہو مگر اسے کسی طرح کا خوف اور اندیشہ اور رنج و پریشانی نہیں ہوتی۔

کیونکہ اللہ تعالیٰ سے تعلق ہونے کی وجہ سے وہ یہ جانتا ہے کہ غم اور خوشی سب خود آ جانے والے حالات نہیں ہیں۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھیجے جاتے ہیں۔تو لہٰذا میں اسی اللہ کو پکاروں گا جس کے ہاتھ میں اس غم کا مداوا ہے اوران کے سہارے کے ہوتے ہوئے کسی اور دوسرے سہارے کی ضرورت ہی نہیں۔کیونکہ اصل اللہ تعالیٰ کی ذات ہی مومن کا قابل اعتماد سہارا ہے، باقی جتنے سہارے ہیں وہ صرف ظاہر میں حالات کے بنانے والے اور ضرورت میں کام آنے والے نظر آتے ہیں لیکن درحقیقت ان کے در پردہ اللہ تعالیٰ کی طاقت ہی کارفرما ہوتی ہے۔سوجس کی نظر خدا تعالیٰ کی طاقت پر ہو وہ پھر کسی اور سہارے کی طرف نہ تو متوجہ ہوتا ہے اور نہ اس سے کوئی امید وابستہ کرتا ہے۔خاص طور پر غیر اللہ کا سہارا انتہائی کمزور اور ضعیف سہارا ہے۔قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿مَثَلُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِيَاۗءَ كَمَثَلِ الْعَنْكَبُوْتِ اتَّخَذَتْ بَيْتًا وَاِنَّ اَوْهَنَ الْبُيُوْتِ لَبَيْتُ الْعَنْكَبُوْتِ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ﴾

(سورة العنكبوت، آية: ۴۱)

ترجمہ: جن لوگوں نے خدا کے سوا اور کارساز تجویز کر رکھے ہیں ان لوگوں کی مکڑی کی سی مثال ہے جس نے ایک گھر بنایا اور کچھ شک نہیں کہ سب گھروں میں زیادہ بودا مکڑی کا گھر ہوتا ہے، (پس جیسا اس مکڑی نے اپنے زعم میں ایک اپنی جائے پناہ بنائی ہے، مگر واقع میں وہ پناہ انتہائی کمزور ہونے کے سبب کالعدم ہے، اسی طرح یہ مشرک لوگ معبوداتِ باطلہ کو اپنے زعم میں اپنی پناہ سمجھتے ہیں، مگر واقع میں وہ پناہ کچھ نہیں ہے) اگر وہ (حقیقتِ حال کو) جانتے تو ایسا نہ کرتے (یعنی شرک نہ کرتے، لیکن وہ نہ جانیں تو کیا ہوا) (معارف القرآن، جلد:۶، صفحہ:۶۹۲)

وَاِنَّ اَوْهَنَ الْبُيُوْتِ لَبَيْتُ الْعَنْكَبُوْتِ، عنکبوت مکڑی کو کہا جاتا ہے، اس کی مختلف قسمیں ہیں۔ بعض ان میں سے زمین میں گھر بناتی ہیں، بظاہر وہ یہاں مراد نہیں بلکہ مراد وہ مکڑی ہے جو جالا تانتی ہے، اور اس میں معلّق رہتی ہے، اس جالے کے ذریعہ مکھی کو شکار کرتی ہے، یہ ظاہر ہے کہ جانوروں کی جتنی قسم کے گھونسلے اور گھر معروف ہیں، یہ جالے کے تار ان سب سے زیادہ کمزور ہیں کہ معمولی ہوا سے بھی ٹوٹ سکتے ہیں۔ اس آیت میں غیر اللہ کی پرستش کرنے والوں اور ان پر اعتماد کرنے والوں کی مثال مکڑی کے اس جالے سے دی ہی جو کہ نہایت کمزور ہے، اسی طرح جو لوگ اللہ کے سوا بتوں پر یا کسی انسان وغیرہ پر بھروسہ کرتے ہیں ان کا بھروسہ ایسا ہی ہے جیسا یہ مکڑی اپنے جالے کے تاروں پر بھروسہ کرتی ہے۔ (معارف القرآن، جلد:۶، صفحہ:۶۹۳)

طوفانوں میں لذتِ فریاد کا کیا کہنا!

لذت فریاد طوفانوں میں ہے
کون کہتا ہے کنارا چاہیے
حاصل ساحل مجھے طوفاں میں ہے
ان کے جلوؤں کا نظارا چاہیے

یہ مضمون مختلف اشعار کے ضمن میں لکھا جا چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کو طوفانوں میں ساحل کا مزہ عطا فرماتے ہیں اور نافرمانوں کو ساحل پر طغیانی کا سماں نظر آتا ہے۔ کیونکہ مومن ناگوار اور ناموافق حالات میں بھی صبر کر کے اللہ تعالیٰ کے قریب ہوتا چلا جاتا ہے اور اسے کسی گھڑی بھی بے چینی اور پریشانی لاحق نہیں ہوتی۔ طوفانوں میں ساحل کا مزہ ملنے کی وجہ یہ ہے کہ درحقیقت وہ طوفانوں میں گھرا ہوا ہونے کے باوجود ساحل پر ہی ہوتا ہے کیونکہ مومن کا ساحل اور اس کی منزل حکم خداوندی کی بجا آوری ہے خواہ اس کے نتیجہ میں حالات اچھے اور موافق ہوں، یا بظاہر برے اور ناسازگار ہوں۔ جس وقت مومن اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کر رہا ہوتا ہے تو وہ اپنی منزل پر کھڑا ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسے اتنا ہی سکون میسر آتا ہے جتنا کہ اچھے اور خوشگوار حالات کی صورت میں، اور اس وقت بھی وہ حق تعالیٰ کے جلوؤں کا نظارہ کرتا رہتا ہے۔

آہوں سے بڑی جلدی بگڑی سنور جاتی ہے

اپنی آہوں سے در جاناں پہ میر
اپنی بگڑی کو سنوارا چاہیے

اللہ تعالیٰ کے در پر پڑ کر آہ وزاری کرنے کے نتیجے میں مسلمان اپنی بگڑی بنالیتا ہے۔ کیونکہ یہ ادا اللہ تعالیٰ کو بہت پسند اور خوش کرنے والی ہے اور جب کوئی انسان اپنے پالنے والے اللہ کو راضی کرلے تو پھر اس کی بگڑی بننے اور سنورنے میں کوئی شک وشبہ نہیں ہوسکتا۔ اللہ تعالیٰ کے قرب کی منزلیں آہ وفغاں کے ذریعے سے بڑی تیزی کے ساتھ طے ہوتی ہیں اور اللہ سے دوری قرب میں بدل جاتی ہے، اس لیے خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ کے در کو مضبوطی سے پکڑ کر اس پر آہ زاری کرتے رہتے ہیں جو کہ حقیقت میں دنیا وآخرت کے ہر مسئلے کا حل ہے اور ہر خوبی کے حصول کی کنجی ہے۔

اور یہ اللہ کا در ایسا در ہے جو بڑے سے بڑے کافر مشرک اور فاسق وفاجر کے لیے بھی چوبیس گھنٹے کھلا رہتا ہے۔ جو بھی اس در جاناں پہ آ کر سر رکھ دیتا ہے اور اپنے محبوب کو پکارتا ہے وہ ہر وقت سنتا ہے اور بڑی قدردانی کے

ساتھ اپنے بندے کے ساتھ عفو وکرم کا معاملہ فرماتا ہے، بندے نے خواہ اپنی زندگی کو کتنا ہی بگاڑا ہو اور کیسے ہی گناہوں میں لت پت رہا ہو اور کتنی ہی غفلتوں میں عمر ضائع کر دی ہو مگر اللہ کے سامنے ایک آہ بھرنے سے ہی سارے بگڑے ہوئے حالات یک دم سنور جاتے ہیں اور عمر بھر کا رنج وغم اور دکھ درد دور ہوتا نظر آتا ہے اس لیے ہر شخص کو اسی در کو مضبوط پکڑنا چاہیے۔ چنانچہ حدیثِ پاک میں ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

﴿عَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ اِنَّ اِبْلِیْسَ قَالَ لِرَبِّہٖ بِعِزَّتِکَ وَجَلَالِکَ لَا اَبْرَحُ اُغْوِیْ بَنِیْ اٰدَمَ مَا دَامَتِ الْاَرْوَاحُ فِیْھِمْ فَقَالَ اللّٰہُ فَبِعِزَّتِیْ وَجَلَالِیْ لَا اَبْرَحُ اَغْفِرُ لَھُمْ مَا اسْتَغْفَرُوْنِیْ﴾

(مسند أحمد، كتاب باقي مسند المكثرين، باب مسند ابي سعيد الخدري ﷺ)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ ابلیس نے اللہ تعالیٰ سے یہ بات کہی کہ مجھے آپ کے عزت وجلال کی قسم کہ میں بنی آدم کو بہکاتا رہوں گا اور اُن کو گمراہ کرتا رہوں گا جب تک کہ اُن کی روحیں اُن کے جسموں میں موجود ہیں تو جواب میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ مجھے بھی میری عزت وجلال کی قسم کہ میں اُن کو بخشتا رہوں گا جب تک کہ وہ مجھ سے مغفرت چاہتے رہیں گے۔ (یعنی اگر وہ مغفرت چاہنا بند کر دیں اور میرے در سے ہٹ جائیں تو الگ بات ہے ورنہ اگر وہ میری طرف متوجہ ہوں گے اور توبہ واستغفار کریں گے تو مرتے دم تک ہر ہر موقع پر کیسا ہی گناہ ہو میں بھی اُن کو معاف کرتا رہوں گا۔ اس سے معلوم ہو گیا کہ ہرگز ہرگز کسی بھی مؤمن کو کیسی ہی حالت ہو جانے کے باوجود نا اُمید نہیں ہونا چاہیے۔)

غیر کی پرواہ کرنا انبیاء واولیاء کا طریقہ نہیں ہے

آپ پر ہر دم فدا ہو میری جاں
غیر کی مجھ کو نہ پروا چاہیے

یہی کلمہ توحید ''لا الٰہ الا اللہ'' کا مقصد ہے کہ اللہ کے سوا دل میں کسی کی پرواہ نہیں ہونی چاہیے، بلکہ ہر لمحہ حیات اللہ تعالیٰ پر قربان ہو، اسی کو راضی کرنے کی فکر ہو اور اسی کی ناراضگی سے بچنے کا اہتمام ہو جس کی صورت یہی ہے کہ صبح سے شام تک اور شام سے صبح تک جس وقت میں اللہ تعالیٰ نے جو جو کام کرنے کے لیے کہے ہیں ان کو کرتا رہے اور جو بچنے کے لیے کہے ہیں ان سے بچتا رہے، چاہے دنیا والے ناراض ہوں یا راضی ہوں، ان کی ناراضگی اور ملامتوں کا کوئی خیال دل میں نہیں ہونا چاہیے، کیونکہ یہ انبیاء واولیاء کی سنت رہی ہے کہ جب انہوں نے مکمل طور پر دین پر چلنا چاہا تو ان کو اپنوں اور غیروں کی طرف سے ملامتوں اور طعن وتشنیع کا سامنا کرنا پڑا لیکن وہ اپنے موقف پر مضبوطی سے جمے رہے، اگرچہ ان سے سب کچھ چھوٹا ان کے پیارے بھی چھوٹے ان کا وطن بھی چھوٹا اور اہل

خاندان بھی چھوٹے لیکن انہوں نے اللہ کو نہیں چھوڑا۔

عام طور پر کافروں کی طرف سے نبیوں کو جلاوطن کیے جانے اور کبھی سنگسار کیے جانے اور کبھی قوم و وطن سے الگ کر دیے جانے کی دھمکیاں دی جاتی رہی ہیں جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِرُسُلِهِمْ لَنُخْرِجَنَّكُمْ مِّنْ أَرْضِنَا أَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِىْ مِلَّتِنَا فَأَوْحٰى إِلَيْهِمْ رَبُّهُمْ لَنُهْلِكَنَّ الظّٰلِمِيْنَ﴾

(سورة ابراهيم، اية: ۱۳)

ترجمہ: اُن کفار نے اپنے رسولوں سے کہا کہ ہم تم کو اپنی سرزمین سے نکال دیں گے۔ یا یہ ہو کہ تم ہمارے مذہب میں پھر آ جاؤ (پھر آنا اس لیے کہا کہ سکوت قبل بعثت سے وہ بھی یہی سمجھتے تھے کہ ان کا اعتقاد بھی ہم ہی جیسا ہوگا) پس ان رسولوں پر ان کے رب نے (تسلی کے لیے) وحی نازل فرمائی کہ (یہ بیچارے تم کو کیا نکالیں گے ہم (ہی) ان ظالموں کو ضرور ہلاک کر دیں گے۔ (معارف القرآن، جلد: ۵، صفحہ: ۲۲۶)

اسی طرح ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿قَالَ الْمَلَأُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَنُخْرِجَنَّكَ يَا شُعَيْبُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَكَ مِنْ قَرْيَتِنَا أَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِىْ مِلَّتِنَا قَالَ أَوَلَوْ كُنَّا كَارِهِيْنَ﴾

(سورة الاعراف، اية: ۸۸)

ترجمہ: ان کی قوم کے متکبر سرداروں نے (جو یہ باتیں سنیں تو انہوں نے گستاخانہ) کہا کہ اے شعیب! (یاد رکھئے) ہم آپ کو اور آپ کے ہمراہ جو ایمان والے ہیں ان کو اپنی بستی سے نکال دیں گے یا یہ ہو کہ تم ہمارے مذہب میں پھر آ جاؤ (تو البتہ ہم کچھ نہ کہیں گے۔ یہ بات مؤمنین کے لیے اس لیے کہی کہ وہ لوگ قبل ایمان کے اسی طریقِ کفر پر تھے لیکن شعیب علیہ السلام کے حق میں باوجود اس کے کہ انبیاء سے کبھی کفر صادر نہیں ہوتا، اس لیے کہی کہ ان کے سکوت قبل بعثت سے وہ یہ ہی سمجھتے تھے کہ ان کا عتقاد بھی ہم ہی جیسا ہوگا) شعیب (علیہ السلام) نے جواب دیا کہ ہم تمہارے مذہب میں آ جائیں گے گو ہم (بدلیل و بصیرت) اس کو مکروہ (اور قابل نفرت) ہی سمجھتے ہوں (یعنی جب اس کے باطل ہونے پر دلیل قائم ہے تو ہم کیسے اس کو اختیار کر لیں) (معارف القرآن، جلد: ۳، صفحہ: ۶۲۶)

حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم نے جو کہ متکبر اور مغرور تھے، ان کو یوں دھمکی دی کہ اے شعیب ہم تمہیں اور جو تمہارے ساتھ ایمان والے ہیں ان سب کو اپنی بستی سے نکال باہر کر دیں گے، الا یہ کہ تم ہمارے دین و ملت میں لوٹ آؤ۔ اسی طرح قوم نوح نے حضرت نوح علیہ السلام کو سنگسار کرنے کی دھمکی دی:

﴿قَالُوْا لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ يَا نُوْحُ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمَرْجُوْمِيْنَ﴾

(سورة الشعرآء، اية: ۱۱۶)

ترجمہ: وہ لوگ کہنے لگے کہ اگر تم (اس کہنے سننے سے) اے نوح! باز آ ؤ گے تو ضرور سنگسار کر دیئے جاؤ گے۔
(معارف القرآن، جلد:۶، صفحہ:۵۴۴)

اور قومِ لوط علیہ السلام نے یوں کہا:

﴿قَالُوْا لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ يٰلُوْطُ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُخْرَجِيْنَ﴾
(سورۃ الشعرآء، اٰیۃ:۱۶۷)

ترجمہ: وہ لوگ کہنے لگے کہ اے لوط! اگر تم (ہمارے کہنے سننے سے) باز نہیں آ ؤ گے تو ضرور (بستی سے) نکال دیئے جاؤ گے۔ (معارف القرآن، جلد:۶، صفحہ:۵۴۱)

غرض یہ کہ انبیاء علیہم الصلاۃ والسّلام کو ان کی قوموں کی طرف سے اس طرح کی دھمکیاں دی جاتی رہیں مگر۔ وہ دین کے اوپر جمنے اور اس کی دعوت سے ذرا بھی پیچھے نہیں ہٹے، گو کہ انہیں اپنی قوموں کی طرف سے مختلف قسم کی تکالیف کا سامنا بھی ہوا، لیکن وہ اللہ کے لیے ان کو گوارا کرتے رہے مگر حق کو نہیں چھوڑا۔

صاحبو! جس طرح انبیاء علیم السلام کی یہ سنت اور طریقہ رہا ہے ٹھیک اسی طرح ہر دور میں خاصانِ خدا اولیاء اللہ آزمائش کے ان دشوار گزار مراحل سے گزرتے رہے ہیں، اپنی جان و مال اور اپنا کاروبار اور وطن سب کچھ چھوڑنا گوارا کیا مگر اللہ تعالیٰ کے دین سے ایسے جمے رہے کہ اس کو بال برابر بھی چھوڑنا منظور نہ کیا۔ ہر قسم کی تکلیف اور مشقت سہنے کے لیے اپنے کو آگے کر دیا لیکن اللہ کا نازل کیا ہوا دین صحیح شکل وصورت میں محفوظ رکھنے کے واسطے دشمنانِ دین کے ساتھ کسی قسم کا کوئی سمجھوتہ اور مفاہمت نہیں کی۔

یہی بات ہر زمانے کے اہل حق علمائے ربانیین کی خاص پہچان اور نشانی ہے کہ وہ حق کے سامنے گردنیں کٹا دیتے ہیں اور دولتیں لٹا دیتے ہیں مگر اس کو سینے سے لگائے رکھتے ہیں گھر بار چھوڑ کر در در کی ٹھوکریں کھانا، پردیس میں زندگی گزارنا خدا کے دیوانوں کے لیے اپنے اللہ کی محبت میں معمولی بات بن جاتی ہے کیونکہ ان کی نگاہوں کے سامنے سید الاولین والآخرین اللہ کے پیارے اور چہیتے نبی حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جیسی شخصیت کا نمونہ ہر وقت رہتا ہے، جس کی بدولت ان کے قلب وجگر کو دین کی راہ میں کتنی ہی تکالیف اٹھانے کے باوجود ٹھنڈک اور راحت ملتی رہتی ہے۔

ایک نیو مسلم کا عبرت آموز واقعہ

چنانچہ اس پر احقر کو ایک واقعہ یاد آیا کہ ایک نیا مسلمان عیسائیوں کی کرسمس (Christmas) کے موقع پر اسلامی اخلاق پر عمل کرتے ہوئے اپنے والدین سے حسن سلوک کے طور پر ملنے کے لیے گیا مگر ان والدین کو اس کے اوپر اس قدر غصہ تھا اور وہ اتنے خفا اور ناراض تھے کہ اس کے پہنچنے کے بعد اس کو مارنے پیٹنے کی کوشش کی اور یہ نہ ہوسکا تو جو پتھر وغیرہ وہاں پڑے ہوئے تھے ان کو اٹھا کر اس کے اوپر پھینکنے شروع کیے، جس کے نتیجے میں وہ بڑی

مایوسی اور اداسی کے عالم میں وہاں سے واپس ہو گیا لیکن دل دل میں بہت ہی خوش تھا اور اسکی خوشی کے آثار ظاہر ہو رہے تھے۔ چنانچہ اس نے واپس ہونے کے بعد سیدھا مصلّے پر جا کر اللہ تعالیٰ کے شکر کی ادائیگی کے لئے دو رکعت نماز پڑھی اور دوستوں سے کہا کہ آج میری خوشی کا بہت بڑا دن ہے کہ جس طرح میرے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر طائف کی گلیوں میں وہاں کے لوگوں کی طرف سے پتھر اور کنکریاں پھینکی گئی تھیں جو کہ اللہ تعالیٰ کے سب سے زیادہ محبوب اور پیارے نبی تھے تو میں یہ سوچ کر خوش ہو رہا ہوں کہ میری کون سی ایسی ادا تھی جو اللہ تعالیٰ کو اتنی پسند آئی کہ میرے ساتھ بھی آج وہی معاملہ ہو گیا جو میرے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہوا تھا۔

میرے دوستو! اس واقعہ میں ہم سب کے لیے بہت بڑی عبرت اور نصیحت ہے کہ جب دین پر چلنے کے معاملے میں اور سنتوں کی اتباع کی پابندی کے نتیجے میں اپنے اور غیروں کی طرف سے کچھ باتیں سننے کو ملیں یا کچھ مشکلات کا سامنا ہو اور اس راہ میں کچھ رنج و غم آئیں اور تکالیف اٹھانی پڑیں، کچھ دنیا کے راحت و آرام کی چیزوں سے ہمیں دست بردار ہونا پڑے کہیں سے گالیاں دی جا رہی ہوں کسی کی طرف سے تہمتوں کا بازار گرم ہو تو کسی طرف بدگمانیوں اور بدظنی کا ایک طویل سلسلہ قائم ہو اور کوئی پاگل اور دیوانہ کہے تو کوئی دقیانوس اور قدامت پسند کہے، اسی طرح کوئی خاندان میں توڑ پیدا کرنے کا الزام لگائے اور کوئی شدت پسندی اور تنگ نظری کا بہتان باندھے اور ہم سے یہ تقاضہ کرے کہ ہم پورا دین چھوڑ کر کچھ معاملات میں دین کو لے لیں اور کچھ معاملات میں اہل زمانہ کے ساتھ صلح کر کے انہیں خوش کرتے ہوئے چلیں تو سمجھ لینا چاہیے کہ ایسی ہی صورت حال کے لیے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات ارشاد فرمائی تھی کہ ایک زمانے میں دین پر چلنا اتنا مشکل ہو جائے گا جتنا کہ چنگاری کو ہاتھ میں لینا، اس طرح کے الفاظ روایت میں وارد ہوئے ہیں:

﴿عَنْ عَبْدِ اللهِ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّ مِنْ وَرَآئِكُمْ أَيَّامَ الصَّبْرِ الصَّبْرُ فِيهِنَّ كَقَبْضٍ عَلَى الْجَمْرِ لِلْعَامِلِ فِيهَا أَجْرُ خَمْسِينَ قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللهِ خَمْسِينَ مِنْهُمْ أَوْ خَمْسِيْنَ مِنَّا قَالَ خَمْسُوْنَ مِنْكُمْ وَهٰذَا الْحَدِيْثُ لَا نَعْلَمُهُ يُرْوٰى عَنْ عَبْدِ اللهِ إِلَّا مِنْ هٰذَا الْوَجْهِ﴾

(مسند البزار، كتاب المجلد الأول، باب مسند عبد الله بن مسعود)

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بے شک تمہارے بعد کچھ صبر کے ایام آنے والے ہیں جن میں دین پر صبر اور جمار ہنا ایسا ہو جائے گا جیسے آگ کی چنگاری کو ہاتھ میں لینا اور اُن ایامِ صبر میں دین پر جمنے اور قائم رہنے والے کے لیے پچاس آدمیوں کے برابر اجر و ثواب ہو گا۔ صحابہ کرام نے پوچھا: یارسول اللہ! پچاس اُن میں سے یا پچاس ہم میں سے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ پچاس تم میں سے۔

صاحبو! اگر ہم غور سے دیکھیں تو اس حدیث سے ان ناموافق حالاتِ زمانہ اور فتنوں کے دور میں دین پر

عمل کرنے کی اتنی عظیم الشان فضیلت معلوم ہو رہی ہے کہ اُس کے بعد مزید اور کوئی فائدہ بھی حاصل نہ ہو تو محض یہی ایک فضیلت اس دور میں ہمیں دین پر جمنے اور ثابت قدم رہنے کے لیے کافی ووافی ہے۔ کیونکہ اس حدیث شریف سے یہ بات ثابت ہوئی کہ پچاس صحابہ کے برابر اُس شخص کو اجر ملے گا جو ان ناگوار حالات میں مکمل دین پر جما رہے، خواہ کتنی ہی مخالفتیں اور عداوتیں سامنے آئیں۔

مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اِس دور کا کوئی آدمی کسی صحابی سے بھی فضیلت میں بڑھ سکتا ہے کیونکہ جزوی فضیلت سے کلی فضیلت لازم نہیں آتی۔ لہٰذا صحابی کو شرفِ صحبت کی وجہ سے جو فضیلت اور برتری حاصل ہے پوری اُمت کا اتفاقی مسئلہ ہے کہ بعد میں آنے والے کسی بھی شخص کو وہ مقام اور درجہ حاصل نہیں ہوسکتا۔

تو ایسی صورت حال میں ہمیں نہ تو گھبرانا چاہیے نہ اہل دنیا کی ان باتوں سے پریشان اور مایوس اور رنجیدہ ہونا چاہیے بلکہ، بقول حضرت والا ؎

غیر کی مجھ کو نہ پرواہ چاہیے

اپنے آپ کو پورا پورا اس کا مصداق بنا دے تو ان شاء اللہ عنقریب یہ ظلمات کے بادل چھٹتے ہوئے نظر آئیں گے اور رات کی تاریکی سے صبح روشن اور عیاں ہوتی نظر آئے گی اور بہت جلد ایسا نظر آنے لگے گا جیسے پانی کو بہت سے جھاگ نے گھیرا ہو اور جلد ہی ہٹ جانے کے بعد پانی نظر آنے لگتا ہے تو حق کی شان یہی ہوتی ہے کہ اس کے خلاف باتیں کرنے والے اور ملامتیں کرنے والے مٹ کر رہ جاتے ہیں اور حق، اہل حق آفتاب و مہتاب کی طرح چمکتے ہوئے ایک خلق کثیر کو اپنے ایمان کی روشنی اور حق کی تابانی سے منور و روشن کیے رہتے ہیں۔ ہماری اسلام کی تاریخ ایسی داستانوں سے بھری پڑی ہوئی ہے۔

میں تو قرآن و حدیث کی روشنی میں یہاں تک کہتا ہوں کہ جب کامل دین کی اتباع کے نتیجے میں اور ہر معاملے میں سنت پر چلنے کی پابندی کرنے سے اس طرح کے جملے سننے کو ملیں تو یہ سمجھ لے کہ یہ جملے میرے متعلق بولے جانا اس بات کی نشانی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے میرے لیے کمال ایمان کا اور مرتے دم تک رشد و ہدایت پر قائم رہنے کا فیصلہ کیا جا چکا۔ کیونکہ روایت میں آیا ہے جس کو حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا رحمہ اللہ نے بھی فضائل اعمال میں ذکر کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا اتنا ذکر کرو کہ لوگ مجنوں اور دیوانہ کہنے لگیں۔ تو معلوم ہوا کہ لوگوں کی طرف سے یہ جملہ اللہ کے پیاروں اور محبوبین اور ذاکرین کو نصیب ہوتا ہے تو یہ غم کی بات نہیں بلکہ خوشی کی بات ہے۔

اسی طرح قرآن کریم میں یہ جملہ (وَلَا یَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَائِمٍ) ان حضرات کی صفات بیان کرتے ہوئے ذکر کیا ہے جن کو اللہ تعالیٰ مرتدین یعنی دین سے پھر جانے والوں کے مقابلے میں لائے ہیں جس میں اس طرف اشارہ ہوگیا کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کے دین کے معاملے میں لوگوں کی ملامتوں سے نہیں ڈرتے وہ ارتداد سے محفوظ

رہیں گے، گویا انہیں مرتے دم تک دین پر استقامت نصیب رہے گی جو درحقیقت مومن کے لیے سب سے عظیم الشان نعمت ہے اور ہر مسلمان کی دلی تمنا اور تمام اولیاء اللہ کی عمر بھر کی دعا ہے۔

آج کل عام طور پر ہمارے جوانوں کا وہ طبقہ جو دعوت وتبلیغ یا کسی اللہ والے کی صحبت کی برکت سے دین میں کامیابی کا سو فیصد کا یقین رکھنے کی وجہ سے یہی تمنا رکھتا ہے کہ سو فیصد دین پر عمل کیا جائے اور نبی کی کوئی سنت چھوٹنے نہ پائے جس کی وجہ سے اسے روزمرہ کی زندگی میں گھر والوں کی طرف سے اور خوشی کی تقریبات اور غمی کے مواقع پر غیر شرعی کاموں سے بچنے کے لیے بڑے مجاہدے اور قربانیوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ کہیں والدین کی طرف سے مجبور کیا جارہا ہے تو کہیں رشتہ داروں کی طرف سے کچھ سنتوں اور دین کو چھوڑنے کی نصیحت کی جارہی ہے جس کا تذکرہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں فرمایا ہے کہ تم پر ایک زمانہ ایسا آنے والا ہے جب تم امر بالمعروف ونہی عن المنکر چھوڑ بیٹھو گے۔ تو صحابہ کرام نے حیرت سے سوال کیا کہ یا رسول اللہ! کیا ایسا ہوگا؟ اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہوگا اور اُس سے بھی سخت ہوگا۔ جیسا کہ پورا مضمون حدیث شریف میں یوں مذکور ہے:

﴿عَنْ أَبِیْ أُمَامَةَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللہُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ کَیْفَ بِکُمْ إِذَا طَغَا نِسَآؤُکُمْ وَفَسَقَ شَبَابُکُمْ وَتَرَکْتُمْ جِهَادَکُمْ قَالُوْا وَإِنَّ ذٰلِکَ لَکَائِنٌ یَا رَسُوْلَ اللہِ قَالَ نَعَمْ وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِهٖ وَأَشَدُّ مِنْهُ قَالُوْا وَمَا أَشَدُّ مِنْهُ یَا رَسُوْلَ اللہِ قَالَ کَیْفَ أَنْتُمْ إِذَا لَمْ تَأْمُرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَلَمْ تَنْهَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ قَالُوْا أَوَ کَائِنٌ ذٰلِکَ یَا رَسُوْلَ اللہِ قَالَ نَعَمْ وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِهٖ وَأَشَدُّ مِنْهُ سَیَکُوْنُ قَالُوْا وَمَا أَشَدُّ مِنْهُ یَا رَسُوْلَ اللہِ قَالَ کَیْفَ أَنْتُمْ إِذَا رَأَیْتُمُ الْمَعْرُوْفَ مُنْکَرًا وَرَأَیْتُمُ الْمُنْکَرَ مَعْرُوْفًا قَالُوْا أَوَ کَائِنٌ یَا رَسُوْلَ اللہِ قَالَ نَعَمْ وَأَشَدُّ مِنْهُ سَیَکُوْنُ یَقُوْلُ اللہُ بِیْ حَلَفْتُ لَأُتِیْحَنَّ لَهُمْ فِتْنَةً یَصِیْرُ الْحَلِیْمُ فِیْهَا حَیْرَانَ﴾

(کنز العمال)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تمہارا کیا حال ہوگا اُس وقت جب تمہاری عورتیں سرکش اور نافرمان ہوجائیں گے اور تمہارے جوان فسق وفجور میں مبتلا ہوں گے اور تم جہاد کو چھوڑ بیٹھو گے۔ صحابہ نے پوچھا کہ یا رسول اللہ! کیا واقعی ایسا ہوگا؟ آپ نے ارشاد فرمایا قسم اُس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے کہ بالکل ہوگا اور اس سے بھی زیادہ سخت ہوگا۔ صحابہ نے پوچھا کہ اُس سے زیادہ سخت کیا ہوگا؟ ارشاد فرمایا کہ کیا حال ہوگا تمہارا جب تم بھلائی کا حکم نہیں دو گے اور بُرائی سے نہیں روکو گے۔ صحابہ نے پوچھا کہ کیا واقعی ایسا ہوگا؟ فرمایا جی ہاں! اور اُس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے اس سے بھی زیادہ سخت ہوگا۔ صحابہ نے پوچھا کہ یا رسول اللہ! اس سے زیادہ سخت کیا ہوگا؟ ارشاد فرمایا کہ تم بُرائی کو بھلائی سمجھنے لگو گے اور بھلائی کو بُرائی سمجھنے لگو گے۔ صحابہ نے پوچھا کہ یا رسول اللہ! کیا واقعی ایسا ہوگا؟ ارشاد فرمایا کہ بالکل ایسا ہوگا اور اس سے بھی زیادہ سخت ہوگا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں

مجھ کو میری قسم کہ میں اُن پر ایسا فتنہ ڈالوں گا کہ اُس فتنے میں حلیم و بردبار بھی حیران ہو کر رہ جائے گا۔

یہ وہ حالات ہیں جن کا آج ہم کھلی آنکھوں مشاہدہ کر رہے ہیں اور یہ حدیث شریف پڑھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسا کہ جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آج کے زمانے میں دنیا میں تشریف فرما ہوں اور بیٹھ کر کے ساری روئے زمین پر ہونے والے حالات وواقعات کو آنکھوں سے مشاہدہ کر رہے ہوں اور پھر بیان فرماتے جا رہے ہوں۔

یہی وجہ ہے ہمارا یہ ایمان ہے کہ اس مشاہدۂ حالات سے بھی زیادہ بڑھ کر صداقت وسچائی پر مبنی حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ علوم ہیں کہ جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو بذریعہ وحی عطا فرمائے ہیں۔ اب جو اُن کو نہ مانیں یا اُن میں شک کرے یا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ اور تجربہ کر کے ماننے کی تمنا رکھتا ہو تو حقیقت میں یہ ایمان ویقین والا نہیں کہلاتا۔ مؤمن کی شان یہ ہے کہ وہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی بات آتے ہی اپنی ہر خواہش اور تمنا اور جذبے پر بریک (Break) لگادے۔ اور سورج کی روشنی سے زیادہ سچائی پر مبنی حضور کی بات تسلیم کرتے ہوئے اُس پر عمل کرے۔

چنانچہ آج کے حالات بالکل ہمارے سامنے ہیں کہ خود مسلمانوں کا یہ حال ہے کہ وہ داڑھی کٹانے اور ٹخنوں سے نیچے پاجامہ رکھنے کا حکم دے رہے ہیں اور اپنی تصویریں کھنچوانے اور بے پردگی اختیار کرنے کی ترغیبیں دی جارہی ہیں۔

اس لیے میں اپنے ایسے پیارے نوجوان مسلمان بھائیوں سے یہ درخواست کرتا ہوں کہ خدارا دنیا اور اس کی خوشیاں چند روزہ ہیں، دنیا اور اس کی عزتیں خیالی اور فانی ہیں اور آخرت کی زندگی دائمی زندگی ہے وہاں کی عزتیں اور خوشیاں ہمیشہ کے لیے ہیں پس خود سوچ کر عقلمندانہ فیصلہ کیجئے اور اگر سب کچھ بھی قربان کر دینا پڑے تو قربان کر دیجئے مگر میرے نبی کے طریقہ کو بال برابر چھوڑ دینا بھی گوارا نہ کیجئے۔ یہی اصل کامیابی اور عزت کا راستہ ہے اور اسی میں سرخروئی اور نجات ہے اور ظلم و جفا اور طعن وتشنیع اور ایذاءِ خلق کی ان راہوں سے گزر کر جب انسان موت کے وقت اس دنیا سے رخصت ہوتا ہے تو وہ زبان حال سے اپنی کامیابی اور خوشی ومسرت کا اظہار اس طرح کر رہا ہوتا ہے جو کہ تائب صاحب کے بڑے درد بھرے اشعار میں یوں ذکر ہے۔

پانی پانی نہ ہونگے شرم سے آج
خون میں ہم نہا کے آئے ہیں
طعن و تشنیع ہو کہ خنجر ہو
زخم ہی زخم کھا کے آئے ہیں
ساری مخلوق سے بگاڑ کے ہم

اپنی بگڑی بنا کے آئے ہیں
لوگ روئے بچھڑ کے ہم سے مگر
ہم یہاں مسکرا کے آئے ہیں

(اَللّٰھُمَّ اشْھَدْ بِاَنِّیْ قَدْ بَلَغْتُ) یا اللہ گواہ رہنا میں نے آپ کی صحیح بات پہنچادی...... یا اللہ گواہ رہنا میں نے آپ کی صحیح بات پہنچادی...... یا اللہ گواہ رہنا میں نے آپ کی صحیح بات پہنچادی۔

میری خالی جھولی میں اپنی رحمت ومحبت کی بھیک ڈال دیجئے

دست بکشا جانب زنبیل ما
میرے سر کو تیرا سودا چاہیے
اخترِ خستہ و دور افتادہ کو
ان کی رحمت کا بلاوا چاہیے

اے اللہ! میں صرف آپ کا طلب گار ہوں آپ میری جھولی کو اپنی رحمت کے خزانوں سے بھر دیجئے لوگوں کی اپنی اپنی دلوں کی چاہتیں ہوتی ہیں اور ہر انسان اپنی چاہت کے مطابق اپنے لمحات حیات کا سودا کرتا ہے کوئی دنیا کے آب وگل کے عوض اپنی تمام صلاحیتوں کو برباد کر کے چلا جاتا ہے اور کوئی اپنے ہر عمل سے اللہ تعالیٰ کو ڈھونڈتا ہے اور خود اس سے اسی کا سوال کرتا ہے اور یوں کہتا رہتا ہے کہ اے اللہ! میں ایک ناکارہ انسان ہوں اور کوتاہی اور غفلتوں کے طوفان میں غرق ہوں آپ کی رحمت کا سہارا ہی مجھے کسی قابل بنا سکتا ہے اور مجھے بحرِ عصیان میں ڈوبے ہوئے کو بچا سکتا ہے آپ ہی سے بھیک مانگتا ہوں کہ آپ مجھ جیسے دور افتادہ کو اپنے سے نزدیک کر لیجئے اور مجھے اپنا بنا لیجئے۔

ذوقِ طلب بھی مختلف دہر میں دیکھتا رہا
اخترِ بے قرار نے تیرا سوال کر دیا

حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کا مشہور شعر ہے۔

کوئی تجھ سے کچھ کوئی کچھ مانگتا ہے
الٰہی میں تجھ سے طلب گار تیرا

گریۂ بے کار

بعض فانی ومردہ لاشوں پر میر کو پڑھتے فاتحہ دیکھا
اور ان اشک ہائے الفت کے ضائع ہونے کا سانحہ دیکھا

نعرۂ مستانہ مارا چاہیے

زندگی کو یوں گذارا چاہیے نعرۂ مستانہ مارا چاہیے
آہ و نالوں کا سہارا چاہیے اور کوئی غم کا مارا چاہیے
فرطِ غم سے جس کے دن کٹتے نہ ہوں مجھ کو ایسا ماہ پارا چاہیے
ہر نفس پیتا ہو خونِ آرزو ایسا دیوانہ خدارا چاہیے
قتل کرتی ہو جسے شمشیرِ عشق ہاں شہیدِ زندہ ایسا چاہیے
اب تو تنہائی سے گھبراتا ہے دل کوئی عشرت غم کا مارا چاہیے
غم کے دو مارے کہاں نالہ کریں کوئی دریا کا کنارہ چاہیے
گلستاں ہو یا بیاباں ہو مگر تیرے ہی غم کا سہارا چاہیے
حسرتوں سے بھاگتی ہے کائنات میری حسرت کو پکارا چاہیے
سارا عالم روکشِ عشرت ہوا میری حسرت کا نظارہ چاہیے
زندگی جو زندگی سے دُور ہو دل میں اس کے تیر مارا چاہیے

مشکل الفاظ کے معانی:۔ نعرۂ مستانہ: اللہ تعالیٰ کی محبت میں مست ہوکر نعرہ لگانا۔ **آہ و نالوں**: اللہ تعالیٰ کو یاد کر کے رونا۔ **غم کا مارا**: اللہ والا جو اپنے دل پر غم اٹھا کر گناہ سے بچتا ہو۔ **فرطِ غم**: اللہ تعالیٰ کے راستے کے غم۔ **نَفَس**: سانس۔ **خُدارا**: خدا کے لیے۔ **شمشیر**: تلوار۔ **شہیدِ زندہ**: اپنی حرام خواہشات کا ہر وقت خون کرنے والے زندہ ہوتے ہوئے بھی شہید ہوتے ہیں۔ **عشرت**: حضرت میر صاحب دامت برکاتہم۔ **نالہ**: رونا۔ **حسرتوں**: اللہ تعالیٰ کے راستے میں حرام لذتوں کو خاک میں ملانا۔ **رُوکشِ عشرت ہونا**: گناہوں کو چھوڑ دینا۔

میری زندگی کے لیے نعرۂ مستانہ اور غم کا مارا چاہیے

زندگی کو یوں گذارا چاہیے
نعرۂ مستانہ مارا چاہیے
آہ و نالوں کا سہارا چاہیے
اور کوئی غم کا مارا چاہیے

اس وقت تک انسان خوش نہیں رہ سکتا ہے جب تک کہ دیوانہ وار اللہ تعالیٰ کو یاد نہ کرتا ہو اگر دنیا کی محبت میں عاشق کو ذکرِ محبوب یا لقائے محبوب کے بغیر بظاہر سکون و تسلی ملتی نظر نہیں آتی تو آخر اللہ تعالیٰ کے دیوانے اور مستانے کو اسے یاد کرنے میں جو مزہ آئے گا اور زندگی میں جو بہار محسوس ہوگی تو اسے یہ کہنا پڑے گا کہ زندگی اگر

گزرے تو یوں گزرے ورنہ اس کے بغیر جینا کوئی جینا نہیں ہے کہ زبان پر اللہ کی محبت کے اور اس کے ذکر کے نعرے ہوں اور دل سے آہیں نکل رہی ہوں اور آنکھیں اشک بار ہوں۔

یہی وہ صورت حال ہے جس کو حضرت والا اپنے ان الفاظ سے تعبیر فرما رہے ہیں کہ زندگی ایسی گزرنی چاہیے کہ بس اپنے مولیٰ کی یادیں ہوں اور اسی میں ہم مست رہیں اور ساتھ میں کوئی اللہ تعالیٰ کا ایسا سچا عاشق بھی مل جائے جو اللہ تعالیٰ کے راستے کے غم اٹھائے ہوئے ہو اور اس کے رگ و ریشے میں اللہ تعالیٰ کی محبت پیوست ہو اور اس کے خون کا قطرہ قطرہ اللہ اللہ پکارتا ہو جس کو دوسرے لفظوں میں حضرت والا یوں تعبیر کرتے ہیں کہ میرے ہر بُنِ مو سے اللہ اللہ نکل رہا ہو تو ایسے اللہ کے دیوانے کے ساتھ یہ سفر آسان ہی نہیں بلکہ لذیذ ہو جاتا ہے اور راستے کے مشکل سے مشکل اور کٹھن مراحل سے بڑی خوبی کے ساتھ گزرنا میسر آتا ہے۔ جیسا کہ حضرتِ والا کا شعر ہے ؎

زندگی میری ہے تیرا ذکر و لقاء
اور میری موت ہے تجھ سے ہوں میں جدا

اور خواجہ صاحب کا شعر ہے ؎

تمنا ہے کہ اب ایسی جگہ کوئی کہیں ہوتی
اکیلے بیٹھے رہتے یاد ان کی دل نشیں ہوتی

حالاتِ جہاں کا ستایا ہوا ماہ پارا

فرطِ غم سے جس کے دن کٹتے نہ ہوں
مجھ کو ایسا ماہ پارا چاہیے
ہر نفس پیتا ہو خونِ آرزو
ایسا دیوانہ خدا را چاہیے

یعنی حضرت والا اپنے ایک ساتھی کو تلاش کر رہے ہیں کہ جس کے قلب میں دنیا کے ہموم وغموم سے اور مختلف افکارِ جہاں کی وجہ سے دنیا سے بیزاری اور دوری پیدا ہو چکی ہو اور اس کا اب دنیا کے نقشوں میں دن نہ لگتا ہو بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کی محبت کا غم اُٹھائے ہوئے ہو اور نسبت مع اللہ کی دولت رکھتا ہو۔ ہر قدم پر گناہوں اور نافرمانیوں سے بچنے کا غم اُٹھاتا ہو اور خدا کا ایسا عاشق اور دیوانہ جس کو سوائے اس غم کے دوسرے تمام غموں سے نجات اور رہائی مل چکی ہو۔

صاحبو! بسا اوقات ایسا دیکھنے میں آتا ہے کہ کوئی آدمی اپنے دنیا کے حالات کا ستایا ہوا اور دنیوی معاملات کے سلسلے میں مختلف لائنوں میں مار کھایا ہوا کہ جدھر کو چلتا تھا اُدھر سے ناکامی کا سامنا ہوتا تھا جس کے نتیجے میں اُس کے دل میں ایک طرح کی اُداسی اور غم کا سماں چھایا رہتا تھا۔ بالآخر شدہ شدہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اُس کو کسی

اللہ والے کے در پر لے آئی اور اب دنیا کے راستے کی ناکامیاں اُس کو اپنی کامیابیاں دکھائی دینے لگیں اور جن غموں نے اُسے گھیر رکھا تھا اور وہ جس مایوسی اور اُداسی کے عالم میں رہتا تھا آج انہی غموں کی بدولت کسی صاحبِ دردِ دل اللہ والے سے ملنے کی بدولت اُس کو اپنے مولا کے عشق والا راستہ طے کرنا بالکل آسان اور سہل ہو گیا۔ کل تک اُس کے دن کٹتے نہیں تھے لیکن آج اُس کو ہر قدم پر منزل نظر آ رہی ہے، کیونکہ مؤمن کی کامیابی یہی ہے کہ وہ ہر سانس اپنی حرام آرزوؤں کا خون پی رہا ہو اور اللہ پر فدا ہو رہا ہو ایسا ہی شخص خدا کا دیوانہ اور مستانہ کہلاتا ہے اور یہی حضرت والا کی اس شعر میں مراد ہے۔

حضرت والا کی تمنا حضرت میر صاحب کی صورت میں پوری ہوئی

اور بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے جو تمنا حضرت والا نے کی تھی وہ پوری پوری حضرت والا کو عطا ہوئی کہ ہر زمانے میں بچپن سے لے کر آج تک حضرت والا کا ساتھ ایسے اللہ کے دیوانوں کے ساتھ ہوا جو اپنے اپنے دور کے بڑے کامل مصلحین اولیاء اللہ میں شمار کیے جاتے تھے۔ اور پھر اُس کے بعد خود حضرت والا کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے حضرت میر صاحب دامت برکاتہم کو جوڑ دیا۔ جن کا پس منظر خود ان کی زبانی بیان کیا ہوا یہ ہے کہ میں حالاتِ زمانہ سے اتنا تنگ آ چکا تھا کہ مجھے احساسِ کمتری نے ہر طرف سے گھیر رکھا تھا لیکن جب حضرت والا کے قریب آیا اور مجھے حضرت نے تسلی دی اور حضرت والا کے اکلوتے صاحبزادے حضرت مولانا مظہر صاحب دامت برکاتہم سے میرے متعلق یہ بات فرمائی کہ میں نے تمہیں ایک دوسرا بھائی دے دیا ہے۔ اس کے تمام معاملات مثل بھائی کے رہیں گے اور حضرت میر صاحب نے فرمایا کہ مجھے ایسا لگا کہ جیسے ایک نئی زندگی حاصل ہوئی۔ اور تمام احساسِ کمتری یکدم دور ہوتا نظر آیا۔ جب میرے متعلقین کو پتہ چلا تو بعض دوستوں نے اعتراضاً مجھ سے کہا کہ تم کن سے جا کے وابستہ ہوئے ہو اور کدھر اپنا اصلاحی تعلق قائم کیا ہے۔ جبکہ اور بہت سے مشہور علماء اور مشائخ موجود ہیں لیکن مجھے حضرت سے اتنی زیادہ گہری مناسبت ہو گئی کہ میں حضرت کے سوا اپنی نظروں میں اپنے لیے کسی کو مصلح اور نافع نہیں سمجھتا تھا۔ جب لوگوں نے زیادہ اعتراض کیا تو میں نے اپنے ان دوستوں کو اس شعر میں اپنے دل کی کہانی سنائی

مجھ کو ترکِ عشق کا دینے چلے ہو مشورہ
اے میرے چارہ گرو تم نے اُنہیں دیکھا بھی ہے
وہ تو وہ ہیں تمہیں ہو جائے گی اُلفت مجھ سے
اِک نظر تم میرا محبوبِ نظر دیکھ تو لو

بالآخر انہوں نے مجھ پر اعتراض کرنا بند کر دیا اور یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہوا کہ مجھے شروع ہی سے حضرت والا کے مزاج سے مناسبت ہوئی جس کا نفع پوری زندگی اُٹھا رہا ہوں۔ اور یہی اس راستے کی اصل جڑ اور بنیاد ہے۔

شمشیرِ عشق کا مقتول بھی شہید ہے

قتل کرتی ہو جسے شمشیرِ عشق
ہاں شہید زندہ ایسا چاہیے

جس طرح شہید کا اطلاق اُس شخص پر ہوتا ہے جو دُشمنوں سے لڑتا ہوا اللہ تعالیٰ کے دین کی سربلندی کے لیے راہِ خدا میں جامِ شہادت نوش کرلیتا ہے اور اپنے اللہ سے جاملتا ہے۔ اسی طرح شہید کا اطلاق بہت سارے دوسرے معنی پر بھی ہوتا ہے۔ ان میں سے ایک وہ شخص ہے کہ جو زندہ ہوتے ہوئے شہید ہو۔ یعنی اُس نے اللہ کے راستے میں اس قدر غم اور تکالیف اُٹھائی ہوں جو عام طور پر انسان کو موت کے گھاٹ اُتار دیتی ہیں اور جن سے گزرنے کے بعد زندہ رہنا مشکل ہوتا ہے۔ نیز جس طرح اللہ کے راستے میں کٹنے میں مؤمن آدمی کو تکلیفیں اُٹھانی پڑتی ہیں اس شخص نے بھی خدا کے احکام پر جمنے اور نافرمانی سے بچنے میں اسی طرح کی تکلیفیں اور مشقتیں اُٹھائیں تو ایسا آدمی ''شمشیرِ عشق'' کا شہید کہلاتا ہے۔ جیسا کہ محدثین نے بعض ایسے حضرات صحابہ کے بارے میں حضور کی زبانی استعمال کیے گئے لفظِ شہید کی توجیہ کی ہے، کیونکہ وہ صحابہ زندہ رہتے ہوئے شہید کہلائے۔ وجہ یہی تھی کہ مثل شہید کے انہوں نے راہِ خداوندی کے غم و تکالیف اُٹھائی تھیں۔ جیسا کہ شہید کی بیالیس اقسام کو ماقبل میں بحوالہ حضرت ڈاکٹر عبدالحی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ''احکامِ میت'' میں ذکر کیا گیا ہے اور جیسا کہ حدیث شریف میں اس طرح کے اطلاقات مذکور ہیں روایت میں آیا ہے:

﴿عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَوْتُ غُرْبَةٍ شَهَادَةٌ﴾

(سنن ابن ماجه، كتاب ماجاء في الجنائز، باب ماجاء فيمن مات غريبا)

یعنی اگر کوئی شخص سفر میں انتقال کرجائے تو اس کو حکماً شہید کہا جاتا ہے۔ اس لیے پردیس کی موت شہادت کا حکم رکھتی ہے۔ اور اس کے ضمن میں شراح لکھتے ہیں کہ کبھی یہ غربت جسمانی ہوتی ہے اور کبھی یہ قلبی و روحانی ہوتی ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ دنیا میں اس طرح سے زندگی گزارے کہ سارے ماسواء اللہ کو دل سے باہر رکھے اور دل میں صرف اللہ تعالیٰ سے تعلق ہو جس کو درحقیقت موتِ ارادی کہتے ہیں جو اللہ والوں کو دنیا میں جیتے ہوئے بھی حاصل رہتی ہے۔ جیسا کہ مشکوٰۃ کے حاشیہ میں ہے **وَهُوَ يَحْصُلُ بِتَحْصِيْلِ الْمَوْتِ الْاِرَادِىْ وَ تَرْكِ التَّعَلُّقِ بِمَا سِوَى اللهِ** (المشکوٰۃ: ۱۳۹)

اب کوئی کہے کہ شہید بھی ہو اور زندہ بھی ہو یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض صحابہ کے متعلق فرمایا کہ کسی کو چلتا پھرتا جنتی دیکھنا ہو تو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو دیکھ لیں۔ معلوم ہوا کہ یہ بات ممکن ہوسکتی ہے کہ انسان زندہ بھی ہے اور شہید بھی جس کی صورت یہی ہے کہ وہ اپنی ناجائز خواہشات کو راہِ خداوندی میں

قربان کرنے کی وجہ سے حکماً شہید ہے۔ جیسا ہجرت کا ایک معنی تو ترکِ وطن ہے لیکن دوسرا معنی حدیث پاک کے ان الفاظ میں مذکور ہے:

﴿اَلْمُهَاجِرُ مَنْ هَجَرَ مَا نَهَى اللّٰهُ عَنْهُ﴾

(صحيح البخاري، كتاب الايمان، باب المسلم من سلم المسلمون)

یعنی جو شخص اللہ تعالیٰ کے منع کیے ہوئے کاموں کو چھوڑ دے اور منکرات و محرمات سے دور رہے تو وہ بھی اللہ کی نگاہ میں مہاجر ہے۔ چنانچہ ایک روایت میں حرام محبتوں سے باز رہنے والے کے متعلق یہ فرمایا گیا ہے:

﴿مَنْ عَشِقَ وَكَتَمَ وَعَفَّ ثُمَّ مَاتَ فَهُوَ شَهِيْدٌ﴾

(مرقاةُ المفاتيح، كتابُ الجنائز، باب عيادة المريض)

جس کو کسی لڑکی یا لڑکے سے عشق ہو گیا اور پھر اُسے دل میں چھپایا۔ اپنے معشوق و معشوقہ کو اُس کے متعلق کوئی خبر نہیں کی اور مکمل پاک دامن رہا اور گناہ کے تقاضوں پر عمل نہیں کیا بلکہ پورے طور پر برداشت کرتا رہا یہاں تک کہ دل پر اتنا غم اور صدمہ ہوا کہ اُس کی موت واقع ہو گئی تو اس کو شہید کہا جائے گا۔ اس لیے ایک روایت میں ہے کہ صحابہ نے شہید کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ شہید تو صرف وہی ہے جو اللہ کی راہ میں لڑتا ہوا مارا جائے اُس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ پھر تو میری اُمت کے شہید بہت کم ہوں گے۔

یہاں تک کہ روایات سے پتہ چلتا ہے جو دل سے شہادت کی دعا کرتا ہو اور پھر اُسے اس کے بستر پر موت آئے تو وہ بھی اللہ کی بارگاہ میں حکماً شہید کہلاتا ہے یا پیٹ میں دست یا اسہال (پیچش) کی شکایت ہو اُس کے نتیجہ میں موت واقع ہو جائے، جیسا کہ سیرتِ اشرف میں حضرت تھانوی رحمہ اللہ کے متعلق یہ واقعہ لکھا ہے کہ حضرت کے ایک مجاز بیعت نے جن کو خوابوں سے خاص مناسبت تھی اور نصف شب کے وقت حضرت کو خواب میں دیکھا حضرت نے فرمایا کہ "مجھے مردہ نہ سمجھو، میں زندہ ہوں، جس طرح میری حیات میں مجھ سے فیض لیتے تھے فیض لیتے رہنا فیض ہوتا رہے گا اور مجھے مقام شہداء نصیب ہوا ہے، کہہ دیا جائے" خواب کے آٹھویں روز صبح صادق کے قریب انہیں پھر ایسا خواب آیا جس میں تاکید کی گئی کہ یہ خبر چھوٹی پیرانی صاحبہ کو پہنچا دو۔ چنانچہ انہوں نے صبح پرچہ لکھ کر حضرت مخدومہ محترمہ چھوٹی بیگم صاحبہ کی خدمت میں دونوں خواب پہنچا دیئے۔ ایک تو یہ کہ حضرت کی وفات مرضِ اسہال سے ہوئی تھی اور دوسرے فتنوں کے زمانہ میں سنت کو زندہ کرنے والے کے لیے مخبرِ صادق صلی اللہ علیہ وسلم نے شہادت کی بشارت دی ہے اور حضرت کی ساری عمر احیائے سنت میں گذری ہے۔ (سیرت اشرف ج:۲،ص ۳۹۵)

تو شہید کی بہت ساری قسمیں ہیں۔

اللہ کا عاشق گروہِ عاشقاں کے ساتھ رہنے کو پسند کرتا ہے

اب تو تنہائی سے گھبراتا ہے دل
کوئی عشرت غم کا مارا چاہیے
غم کے دو مارے کہاں نالہ کریں
کوئی دریا کا کنارہ چاہیے

یعنی اللہ تعالیٰ نے جب مجھے اپنا دردِ محبت عطا فرمایا اور اُس سے میرے سینے کو بھر دیا تو اب میرا تنہائی میں جی نہیں لگتا بلکہ میرا جی یہ چاہتا ہے کہ مجھے کوئی غم کا مارا ملے ایک ہوں، چار ہوں، دس ہوں یا بیس ہوں غرض یہ کہ کوئی ایسی محفلِ دوستاں میسر آئے جہاں میں اللہ تعالیٰ کی عظمت و محبت کی باتیں کروں۔ گویا اس شعر میں بھی حضرت والا کسی ایسے صاحبِ نسبت اہلِ دل کی تلاش کی تمنا کا اظہار فرما رہے ہیں کہ جس کے ساتھ مل کر اللہ تعالیٰ کی محبت و عظمت کی باتیں اور اُس کی یادوں کے جلووں کا سماں قائم کیا جائے اور کوئی دریا کا کنارہ اور سمندر کا ساحل اور کہیں پہاڑوں کا کوئی ایسا دامن میسر آئے کہ جہاں دنیا کے تعلقات کم سے کم ہوں اور ہمارے اور اللہ کے بیچ میں سوائے صاف ستھری فضا اور اس آسمان کے اور کچھ نہ ہو۔

یہ ضروری نہیں ہے کہ شروع ہی دن سے آپ کو ساتھ چلنے والے بہت سے رفقاء اور سامعین مل جائیں، بلکہ اس کی تمنا بھی دل میں غیر اللہ کی تمنا کرنا ہے۔ جیسا کہ آج کل بہت سے لوگ ذہن میں یہ خیال کرتے ہیں کہ اگر اُن کے شیخ نے انہیں اجازت وخلافت عنایت فرمادی تو فوراً ایک لمبا چوڑا مجمع ہمیں چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہو اور میں ایک ایسا شیخ بن کر اُبھروں کہ میرے ہر طرف چرچے اور شہرتیں ہوں۔ میری تقریر اور خطاب سننے کے لیے بڑے بڑے مجمعے اکٹھے ہوں اور میں درس و تدریس کے لیے جس مدرسے میں بھی میں جاؤں خوب شہرت اور چرچا قائم ہو جس کے بارے میں حضرت گنگوہی نے فرمایا تھا۔

منصبِ تعلیم نوعِ شہوت است

تو بظاہر یہ بھی ایک غیر اللہ ہے کہ انسان دل میں یہ قائم کرلے کہ میں بڑا معلم و مقرر اور داعی و خطیب کی حیثیت سے پہچانا جاؤں جبکہ حقیقت یہ ہے کہ جو جتنے بڑے منصب پر فائز ہوگا اُس کو آخرت کے اعتبار سے اتنی ہی نزاکتوں اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔

اس لیے کسی عالم کی طبیعت میں اپنے مقام و مرتبہ کا خیال یہ اُس کے لیے اتنا مہلک ہے کہ جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر کسی بھوکے بھیڑیے کو بکریوں کے ریوڑ میں چھوڑ دیا جائے اور وہ ان میں تباہی و بربادی مچائے اُس سے بھی زیادہ عالم کے علم میں تباہی مچانے والی چیز مال کی حرص اور مرتبے کا لالچ ہے جو اس کے

دین میں تباہی و بربادی پیدا کرتا ہے۔

﴿عَنِ ابْنِ كَعْبِ بْنِ مَالِكٍ الْأَنْصَارِيِّ عَنْ أَبِيهِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَاذِئْبَانِ جَائِعَانِ أُرْسِلَا فِيْ غَنَمٍ بِأَفْسَدَ لَهَا مِنْ حِرْصِ الْمَرْءِ عَلَى الْمَالِ وَالشَّرَفِ لِدِيْنِهٖ﴾

(سنن الترمذی)

حضرت کعب ابن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دو بھوکے بھیڑیئے جن کو بکریوں میں چھوڑ دیا جائے اتنا نقصان نہیں پہنچاتے جتنا کہ انسان کی حرص جاہ و دولت پر دین کو نقصان پہنچاتی ہے۔

انسان کو عزت اور مال کی لالچ اللہ تعالیٰ سے غافل کر دیتی ہے اور جس شخص کا بھی دین تباہ ہوا ہے اگر اس کی تحقیق کی جاوے تو یہی دو سبب نکلیں گے۔عزازیل کی گمراہی کا سبب عزت کی حرص تھی، حبِ جاہ نے سجدۂ آدم علیہ السلام سے اس کو روک دیا اور شیطان ہو گیا۔قارون کو اس کے حرص مال نے گمراہ کیا۔ان دونوں بیماریوں کا علاج بزرگانِ دین کی خدمت میں حاضری اور ان سے اپنے حالات کی اطلاع کر کے اُن کے ارشادات اور ہدایات پر کچھ مدت تک عمل کرنا ہے اور جو شخص شریعت کا پابند نہ ہو اور سنت کی اتباع نہ کرتا ہو اس کو بزرگ سمجھنا بھی گمراہی اور گناہ ہے۔(دنیا کی حقیقت،صفحہ:۵۰)

اور دوسرے شعر میں حضرت والا نے جس تمنا کا اظہار فرمایا ہے یہ حضرت والا کا بکثرت معمول رہا ہے کہ جہاں بہ آسانی ہوسکتا ہے تو سمندروں اور دریاؤں کے کنارے پر جا کر صبح کے وقت میں اپنے چند احباب کے ساتھ بیٹھ کر اللہ تعالیٰ کا ذکر فرماتے ہیں اور وہاں ذکر کرنے میں ایک خاص سرور اور کیف حاصل ہوتا ہے۔اس لیے کہ شہروں میں گناہوں کے اڈّے اور معاصی و نافرمانی کی فضائیں قائم ہوتی ہیں جبکہ صبح سویرے وہ جگہیں بالکل خالی اور صاف شفاف ہوتی ہیں۔اسی کو حضرت نے فرمایا کہ مجھے اور میرے ساتھ رہنے والے میر صاحب اور دوسرے احباب کو کوئی دریا کا کنارہ چاہیے۔اس مضمون کے عملی طور پر کراچی میں بہت سے حضرات مشاہدہ کرنے والوں میں سے ہیں کہ حضرت والا صحت کے زمانے میں سمندر کے کنارے جا کر اللہ تعالیٰ کو کس طرح یاد کیا کرتے اور وہاں باقاعدہ ذکر اللہ کی مجالس قائم ہوا کرتی تھیں۔

گلستاں ہو یا بیاباں یادِ یار ہی درکار ہے

گلستاں ہو یا بیاباں ہو مگر
تیرے ہی غم کا سہارا چاہیے

جس آدمی کے قلب کو اللہ تعالیٰ نے رشکِ گلستان بنا دیا ہو تو اُسے ظاہر داری کی ضرورت نہیں رہتی۔ ظاہری چمن اور گلشن اور ایئر کنڈیشنوں کی موجودگی یا عدمِ موجودگی سے اُن کے اندرونِ قلب کا عالَم متغیر نہیں ہوتا

کیونکہ دنیا کے آفتاب ومہتاب ظاہر کو روشن کرتے ہیں اور عالَم کے گلستانوں کی باغ و بہار ظاہری جسم کی حد تک رہتی ہے، مگر اللہ کی یادوں میں رچا بسا ہوا قلب اندرونِ انسان کو معطّر رکھتا ہے۔

اگر ہم غور فرمائیں تو یہ اندازہ ہوگا کہ جناب نبی کریم صلی اللہ و لی ہو سلم نے کبھی بھی پنی دنیا کے گلستاں کو چمکانے کی کوشش نہ فرمائی اور اصل چیز یعنی محبت ومعرفتِ خداوندی کے خزانے سے سینہ پر تھا اور فقر اختیاری کو ترجیح دی اسی لیے اُمت کے اولیاء بھی اسی اسوۂ نبوی صلی اللہ و لی ہو سلم پر چلتے ہیں اور یہی بات حضرت والا نے اس شعر میں پیش فرمائی ہے۔

تمہیں عشرت مبارک ہو میرا مطلوب حسرت ہے

حسرتوں سے بھاگتی ہے کائنات
میری حسرت کو پکارا چاہیے
سارا عالَم روکش عشرت ہوا
میری حسرت کا نظارہ چاہیے

احقر حضرت والا کی برکت سے اس کی تشریح پیش کرتا ہے اور یہ ایک ایسا مضمون ہے کہ جو میں نے اپنی زندگی میں پہلی بار سنا ہے کہ جو شخص دل میں اللہ کی محبت رکھتا ہو تو اُسے ایسی بہار میسر آتی ہے کہ وہ تھوڑی دیر کو وَجد میں آجائے گا۔ اور وہ یہ ہے کہ جب انسان اللہ تعالیٰ کے لیے غم اُٹھاتا ہے وہ چاہے حسیناؤں سے بچنے کا غم ہو یا اپنے گھر کے اندر کے مسائل کا غم ہو بیوی سے، بھائیوں سے، والدین سے، اپنے ماتحتوں سے یا ملازموں سے یا اِدھر اُدھر سے ناموافق طبع باتیں پیش آنے پر ان پر صبر کرنا اور اللہ کے لیے ان کو برداشت کر کے دل پر غم اٹھانا ہو اور ان مسائل میں گر کر پھر جو اُسے حسرت اور دُکھ پہنچتا ہو مگر وہ اُس پر اس لیے صبر کرتا ہے کہ اُسے یہ پتہ ہے کہ میرے نبی کا طریقہ یہ ہے کہ بُرائی کا بدلہ اچھائی سے دو۔ اور اپنے دل دل میں اللہ کو پکارتا رہتا ہے کہ اے میرے اللہ! تو مجھے دیکھ رہا ہے یہ جو کچھ ہو رہا ہے تو دیکھ رہا ہے کہ حق پر کون ہے۔ تجھے پتہ ہے کہ یہ لوگ مجھ پر ظلم کر رہے ہیں لیکن میں قطعاً اور قطعاً ان کا بدلہ لینے والا نہیں ہوں، کیونکہ جو کچھ بھی ہوگا تو مجھے اس کا بدلہ ضرور عطا کرے گا۔ وہ یقیناً بہتر ہی ہوگا۔

تو دوستو! اللہ تعالیٰ ایسے انسان کے قلب کی تعمیر اپنے خزانۂ معرفت سے کرتا ہے۔ حضرت کا جو مضمون ہے وہ میں آپ کو سناتا ہوں جب یہ دل ٹوٹتا ہے۔ اِدھر سے بھائی کا ستایا ہوا، ادھر سے بیوی کا ستایا ہوا، ادھر سے دوسرے رشتے داروں کا، اِدھر سے اُدھر سے بہت باتیں اور بہت سے حقوق، بہت تلخ باتیں اور بڑے مسائل اب اس کا دل ٹوٹا ہے لیکن یہ کہتا ہے کہ میرے نبی کا اُسوہ ہے۔ چند دن کی بات ہے، یہ کڑوے گھونٹ پی لوں گا، برداشت کرلوں گا لیکن نہ کوئی جواب دیتا نہ غصے سے جھنجھلاہٹ کا شکار ہوتا ہے، نہ تلخ اور کڑوے انداز سے پیش آتا

ہے، کیونکہ میرے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اُسوہ یہ نہیں ہے۔ اس کا یہ دل ہے جو اللہ کے لیے ٹوٹا ہوا ہے۔ اللہ کی محبت میں غم اُٹھا کر چکنا چور ہوا ہے۔ بارگاہِ خداوندی میں بڑا قیمتی ہے۔

اور ایک مثال سے حضرت اس کو سمجھاتے ہیں کہ کہیں زلزلہ آتا ہے اور مکانات گرتے ہیں اور دیواریں ہیں سب ٹوٹ پھوٹ کے خراب ہوتی ہیں۔ حکومتِ وقت اعلان کرتی ہے کہ شاہی خزانے سے اس علاقے کو اس خطے کو تعمیر کیا جائے گا۔ اب جو ہم نے وہ ٹوٹا ہوا دل اللہ کے سامنے پیش کیا تو اللہ تعالیٰ کہتے ہیں اے میرے بندے! تو نے میرے لیے دل توڑا ہے۔ میں اپنی خصوصی عنایات اور خصوصی تجلیات سے اس دل کو تعمیر کروں گا اور دوستو! جو خدا کا تعمیر کیا ہوا دل ہو جہاں اس کی تجلیات ہوں۔ اللہ اکبر! اس کا کیا عالم ہوگا، اس لیے دنیا کے مسائل و حالات سے دل جتنا بھی ٹوٹے سمجھ لیں کہ جب تم حق پر ہو۔ اللہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔ اس ٹوٹے ہوئے دل کی تعمیر پھر اللہ کریں گے۔ سبحان اللہ کیا عجیب وغریب مضمون ہے! حضرت والا کے یہاں پوری زندگی میں اس طرح سے پہلی بار سنا ہے۔ الفاظ کی تعبیر ہے شاہی خزانے سے اور شاہی انداز سے جیسے وہ عمارتیں تعمیر ہوتی ہیں وہ احکم الحاکمین اور بادشاہ اور سارے بادشاہوں کا بادشاہ اپنی خصوصی تجلیات سے خصوصی رحمتوں اور نوازشات سے اس دل کو پھر مزین کرتا اور بچاتا ہے اور میں اس پر عرض کرتا چلوں کہ جتنے اولیاء اللہ ہوئے ہیں کسی کی بھی تاریخ اُٹھا کر دیکھ لیں حاسدین نے سب کو ستایا اور جب ان کے دل ٹوٹتے تھے تو پھر ان کی زندگی دیکھیں کہ بادشاہوں جیسی گزری ہے۔ کیا دلیل ہے اس بات کی کہ ان کے دل کو حق تعالیٰ نے اور بادشاہوں کے بادشاہ نے بنایا اور تعمیر کیا تھا۔ اس لیے آپ جتنے اولیاء اللہ کو دیکھیں سب کے حالات میں ہے۔ کس طرح ستایا گیا۔ ہمارے حضرت والا دامت برکاتہم کی خود ابتدائی زندگی کے جو حالات ہیں۔ میر صاحب سے آپ سنیں، پڑھیں، دیکھیں تو آپ کو پتہ چلے گا کہ ابتدائی زندگی میں حضرت کو کس طرح سے ستایا گیا۔

میرے دوستو! پھر جو ٹوٹا ہوا دل، چورا چورا دل، اللہ کے سامنے انسان پیش کرتا ہے اور پھر آہیں نکلتی اور آنسو نکلتے ہیں لیکن کہتا کچھ نہیں۔ میرے نبی کا اُسوہ ہے قطعاً نہیں چھوڑوں گا چاہے کچھ بھی ہو جائے۔ یہ تو دنیا میں اس کے دل کی تعمیر ہوگی دوستو! یاد رکھنا کہ دنیا کی ساری عزتیں سب یہی رکھی رہ جائیں گی، لیکن یہ اللہ کی محبت سے بھرا دل یہ انسان ساتھ لے جائے گا۔ اور ایسے ہی لوگوں کو جنت میں دخول حاصل ہوگا۔ جیسا کہ قرآن کریم میں ہے:

﴿هٰذَا مَا تُوْعَدُوْنَ لِكُلِّ أَوَّابٍ حَفِيْظٍ ۝ مَنْ خَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ وَجَآءَ بِقَلْبٍ مُّنِيْبٍ ۝ ادْخُلُوْهَا بِسَلَامٍ ذٰلِكَ يَوْمُ الْخُلُوْدِ ۝﴾

(سورۃ ق، آیات: ۳۲-۳۳-۳۴)

ترجمہ: یہ وہ چیز ہے جس کا تم سے (بایں عنوان) وعدہ کیا جاتا تھا کہ وہ ہر ایسے شخص کے لیے ہے جو (خدا کی طرف دل سے) رجوع ہونے والا (اور رجوع ہو کر اعمال وطاعات کی) پابندی کرنے والا ہو۔ (غرض یہ کہ) جو خدا سے

بے دیکھے ڈرتا ہو اور (اللہ کے پاس) رجوع ہونے والا دل لے کر آوے گا (ان کو حکم ہوگا کہ اس جنت میں سلامتی کے ساتھ داخل ہو جاؤ، یہ دن ہے ہمیشہ رہنے (کے لیے حکم ہونے) کا۔ (معارف القرآن، جلد:۸، صفحہ:۱۴۶)

ابوبکر وراق رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ قلب منیب کی علامت یہ ہے کہ وہ حق جل شانہ کے ادب کو ہر وقت مستحضر رکھے اور اُس کے سامنے تواضع اور عاجزی سے رہے اور اپنے نفس کی خواہشات کو چھوڑ دے۔

حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اوّاب وہ شخص ہے جو خلوت میں اپنے گناہوں کو یاد کرے اور اُن سے استغفار کرے۔ اور حضرت ابید ابن عمیر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اوّاب وہ شخص ہے جو اپنی ہر مجلس اور ہر نشست میں اللہ سے اپنے گناہوں کی مغفرت مانگے۔ اور فرمایا کہ ہمیں یہ بتلایا گیا ہے کہ اوّاب اور حفیظ وہ شخص ہیں جو اپنی ہر مجلس سے اُٹھنے کے وقت یہ دعا پڑھے: ''**سُبْحَانَ اللہِ وَبِحَمْدِہٖ اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْتَغْفِرُکَ مِمَّا اَصَبْتُ فِیْ مَجْلِسِیْ ھٰذَا۔**'' (معارف القرآن، جلد:۸، صفحہ:۱۴۶)

اے لوگو! جو قلبِ سلیم اور میری طرف انابت والا دل لائے ہو۔ آؤ! آج یہ جنت تمہارا محل ہے اور یہ ہمیشہ کے لیے ہے، اب اس سے کبھی تمہیں نہیں نکلنا، میرے دوستو! چند دن کی تلخیاں ہیں۔ چند دن کے کڑوے گھونٹ ہیں اور وہ بھی اللہ تعالیٰ صحبتِ صالحین کی برکت سے شیریں کر دیتا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ دل کی تعمیر اللہ تعالیٰ اس طرح کرتے ہیں کہ اُس دل میں سکون قائم رہتا ہے۔ لڑائی جھگڑوں اور اختلافات اور رنجشوں سے حفاظت رہتی ہے کیونکہ یہ سب غیروں کے طریقے ہیں۔ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اُسوہ نہیں حتیٰ کہ تورات میں خود جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جو صفات آئی ہیں کہ ایک ایسے نبی آئیں گے جن کے اُسوہ اور اخلاق کیا ہوں گے۔ تفسیر ابن کثیر میں لکھا ہے کہ بُرائی کا بدلہ اچھائی سے دیتے ہوں گے۔ بازاروں میں شور مچانے والے نہیں ہوں گے، تند و سخت مزاج نہیں ہوں گے۔ یہ سب اخلاق آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لکھیں ہیں تو حضرت فرماتے ہیں ۔

حسرتوں سے بھاگتی ہے کائنات
میری حسرت کو پکارا چاہیے

لیکن ہم تو خدا کے لیے اپنے ارمان توڑ کر جو حسرتیں ہوتی ہیں ان کے متلاشی ہیں کیونکہ اس کے بعد اللہ تعالیٰ قلب کی تعمیر فرماتے ہیں۔ اگر ان حسرتوں میں مزہ نہ ہوتا تو حضرت میر صاحب دامت برکاتہم جو حضرت والا کی طرف اس قدر تیزی کے ساتھ آئے ہیں کبھی نہ آتے ظاہر ہے ان کو زندگی میں کچھ مزہ اور لطف آیا ہے کہ جس کی وجہ سے لوگوں نے طعنے بھی دیئے تھے مگر میر صاحب نے ان کو جواب میں اشعار سنا دیئے تھے۔ جن کا خلاصہ یہ تھا کہ جس محبوب پر میں فدا ہو رہا ہوں اگر تم بھی اُن کو ایک نظر دیکھ لو گے تو وہ تو وہ ہیں تمہیں مجھ سے محبت قائم ہو جائے گی۔ اس لیے جو اللہ والے حسرتوں سے بھرے ہوئے دل رکھتے ہیں، ان کے یہاں مزہ ہی کچھ اور آتا ہے۔ یوں

تقریر کر لینا اور قرآن وحدیث کا مطلب وغیرہ بیان کر لینا یہ تو ایک عام بات ہوتی ہے، لیکن دل پر چوٹ جیسے پڑی ہوئی ہو اور جیسے حسرتیں اللہ کے راستے میں اُٹھائے ہوئے ہوں پھر اس دل سے جو کچھ برستا ہے وہ ایسا ہوتا ہے کہ اس سے مردوں کو زندگی نصیب ہو جاتی ہے۔ اور پھر یہ زندگی ایسی ہوتی ہے جس پر سینکڑوں حیات قربان کردی جائیں۔

دل میں محبت کا تیر مار کر زندگی زندگی بنتی ہے

زندگی جو زندگی سے دُور ہو

دل میں اس کے تیر مارا چاہیے

اللہ تعالیٰ تبارک وتعالیٰ ایسی زندگی کو زندگی نہیں گردانتے کہ جس میں اللہ تعالیٰ کی یاد نہ ہو اور جو حق تعالیٰ کی محبت سے خالی ہو۔ اللہ تعالیٰ پر فدا ہونے کے بجائے غیر اللہ پر فدا ہو تو ایسے لوگ جو اس طرح زندگی گزار رہے ہیں اُن کے دل میں عشق ومحبت کا تیر لگ جانا چاہیے تاکہ وہ محبتِ خداوندی کا شکار ہو جائیں اور اُن کی زندگی زندگی بن جائے۔ چنانچہ قرآن کریم اور حدیث شریف میں کئی مقامات پر غیر ایمان والے کو مردہ اور ایمان والے کو زندہ قرار دیا ہے۔ اسی طرح ذکر اللہ سے غافل کو مردہ اور ذاکر کو زندہ شمار فرمایا گیا ہے اور عقلی طور پر اس کی وجہ ظاہر ہے کہ جب زندگی مقصدِ زندگی پر خرچ نہ ہو تو مردہ اور زندہ انسان برابر ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ایسی حیات ننگِ صد ممات ہے۔ جیسے ایک شخص کے پاس بندوق تو ہو لیکن اُس کو وہ بندوق کے طریقے پر استعمال نہ کرتا ہو بلکہ اُس سے لاٹھی ڈنڈے کا کام لیتا ہو تو اگر کوئی کہنے والا یوں کہے کہ یہ بندوق نہیں ہے بلکہ لاٹھی ڈنڈا ہے تو یہ بجا اور درست ہوگا۔ ٹھیک اسی طرح حضرت والا نے اس شعر میں زندہ غافل آدمی کی زندگی کو زندگی سے دور قرار دیا ہے۔

جان دے دی میں نے ان کے نام پر

جان دے دی میں نے ان کے نام پر ۔۔۔ عشق نے سوچا نہ کچھ انجام پر

میر مت مرنا کسی گلفام پر ۔۔۔ خاک ڈالو گے انہیں اجسام پر

رشک سب کرتے ہیں اس ناکام پر ۔۔۔ جی رہا ہوں میں تمہارے نام پر

تف ہے یارو طالبِ اکرام پر ۔۔۔ میں فدا ہوں عاشقِ بدنام پر

لڑ رہے ہو ان سے کیوں دشنام پر ۔۔۔ کتنا پردہ ہے تمہارے کام پر

کیا تعجب ہے ترے دشنام پر ۔۔۔ اور کیا برسے گا اس بدنام پر

کیوں فدا ہے میر تو آرام پر ۔۔۔ عشق ہوتا ہے فدا آلام پر

مشکل الفاظ کے معانی:۔ گلفام: پھول جیسے بدن والا حسین۔ **اجسام:** جسم کی جمع۔ **تُف:** افسوس۔ **طالبِ اکرام:** لوگوں سے ادب واحترام طلب کرنے والا۔ **دُشنام:** طعنہ۔ **آلام:** الم کی جمع یعنی مصیبت۔

عشقِ حق کی بدولت جان، جان دینے والے کو دے دی گئی

جان دے دی میں نے ان کے نام پر
عشق نے سوچا نہ کچھ انجام پر

ہمیں دنیا میں جو کچھ بھی ملا ہے وہ سب اللہ تبارک وتعالیٰ کی عطا ہے ہمارا اپنا ذاتی کچھ نہیں ہے خواہ جان ہو یا مال سب کچھ اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا ہے تو اللہ ہی کے نام پر قربان بھی ہونا چاہیے اس لیے اللہ تعالیٰ کا نام لینے والا مومن بندہ جب اس کی محبت میں عشق کے درجے کو پہنچ جاتا ہے، تو پھر وہ اپنی سب سے محبوب ترین چیز یعنی جان کو بھی اللہ تعالیٰ کے نام پر قربان کر دیتا ہے یہی سچے عشق ومحبت کی پہچان اور نشانی ہے کے عاشق صادق اپنی مصالح اور منافع کے فوت ہونے کی طرف نظر نہیں کرتا اور نہ ہی دنیوی مفادات اس کی نگاہوں کے سامنے ہوتے ہیں بلکہ اس کا مقصد اپنے محبوب کو راضی کرنا ہوتا ہے اس لیے جب جس وقت محبوب کا جو حکم ہو وہ اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیتا ہے اور جان دے کر بھی وہ یہ نہیں سمجھتا ہے کہ میں نے کوئی بڑا کام کر دیا ہے، بلکہ بزبانِ حال وہ یوں کہتا ہے ؎

جان دی دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

قرآن کریم میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿هَلْ أَتٰى عَلَى الْإِنسَانِ حِينٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُن شَيْئًا مَّذْكُورًا ۝ إِنَّا خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن نُّطْفَةٍ أَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيهِ فَجَعَلْنَاهُ سَمِيعًا بَصِيرًا ۝﴾

(سورۃ الانسان، آیۃ: ۲-۱)

ترجمہ: بے شک انسان پر زمانے میں ایک ایسا وقت بھی آ چکا ہے جس میں وہ کوئی چیز قابلِ تذکرہ نہ تھا (یعنی انسان نہ تھا بلکہ نطفہ تھا اور اس سے قبل غذا اور اس سے پہلے عناصر کا جزء تھا) ہم نے اس کو مخلوط نطفہ سے پیدا کیا (یعنی مرد اور عورت دونوں کے نطفے سے کیونکہ عورت کی منی بھی اندر ہی اندر عورت کے رحم میں گرتی ہے۔ مگر کبھی فمِ رحم سے خارج ہو کر ضائع ہو جاتی ہے اور کبھی اندر رہ جاتی ہے اور مخلوط کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ وہ اجزاءِ مختلفہ سے مرکب ہے۔ چنانچہ ترکیب منی کی اجزاءِ مختلفہ سے ظاہر ہے۔ غرض ہم نے اس کو ایسے نطفہ سے پیدا کیا) اس طور پر کہ ہم اس کو مکلف بنائیں تو (اسی واسطے) ہم نے اس کو سنتا دیکھتا (سمجھتا) بنایا۔ (معارف القرآن، جلد: ۷، صفحہ: ۶۳۱)

انسان پر ایک زمانہ ایسا آیا ہے جب وہ لا شے تھا کچھ نہ تھا ہم نے اس کو اپنے نظامِ تخلیق کے تحت باپ کے نطفے سے پیدا کیا لہٰذا جان اسی کی دی ہوئی ہے اسی پر قربان ہونی چاہیے ہماری اپنی خواہشات اور تمنائیں جو اللہ تعالیٰ کی رضا کے خلاف ہوں اگر ان سے بچنے میں جان بھی جا رہی ہو، تو جان کی بازی لگا کر ان سے بچے، مگر اپنے

خالق و مالک کو ناراض نہ کرے۔

میر مت مرنا کسی گلفام پر
خاک ڈالو گے انہیں اجسام پر

آج کا ایک عام مرض جس میں جوانوں کی ایک بڑی تعداد مبتلاء ہے اس کے متعلق ارشاد فرما رہے ہیں کہ کسی حسین اور خوبصورت پر جان دینے کی باتیں مت کرنا اور اس سے عشق بازی نہ کرنا کیونکہ ان حسینوں کا انجام شب و روز یہی دیکھنے میں آتا ہے کہ یہ سب مر کر مٹی ہو جاتے ہیں۔

کسی خاکی پہ مت کر خاک اپنی زندگانی کو
جوانی کر فدا اس پر کہ جس نے دی جوانی کو

اگر تم ان پر فدا ہوئے تو ایک مٹی دوسری مٹی پر فدا ہو کر اس میں مل گئی جس کا انجام بجز تباہی اور بربادی کے اور کچھ نہیں ہے۔ جیسا کہ شب و روز واقعات سے یہ بات سامنے آرہی ہے یہ شکلیں جو گُل کی طرح بڑی تر و تازہ اور خوبصورت معلوم ہوتی ہیں ان کی حقیقت بس اتنی ہے کہ یہ خزاں ہے جو باندازِ بہار آئی ہے۔ یعنی اپنی اصلیت اور فطرت کے لحاظ سے ان کو مٹ کر فنا ہونا ہے، تو اس لحاظ سے اسے بہار کہنا ہی صحیح نہیں، بلکہ یہ درحقیقت خزاں ہے، کیونکہ اول بھی فنا اور آخر بھی فنا بس یہ بیچ کا مختصر سا حصہ وجود والا نظر آرہا ہے اس سے دھوکا کھا کر ان پر مرنے مٹنے کا اور اپنی زندگی ضائع کرنے کا انجام مستقبل میں کفِ افسوس ملنا ہے۔

میری ناکامی ہی کامیابی ہے

رشک سب کرتے ہیں اس ناکام پر
جی رہا ہوں میں تمہارے نام پر

یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے خاص بندوں کو دنیا کی محبت اور اس کے تعلقات سے اس طرح دور رکھتے ہیں کہ اسے اس راہ میں ہر طرف ناکامی ہی ناکامی نظر آتی ہے جو بظاہر اہل دنیا کے ہاں ناکامی کہلاتی ہے، لیکن اللہ تعالیٰ اسی ناکامی کو دین کی کامیابی کا پیش خیمہ بنا دیتے ہیں اور یہ دنیا کا ناکام اپنی ساری کوشش اور جد و جہد دین پر خرچ کر کے اسی کو اپنا میدان محنت بناتا ہے اور اس راستے میں خوب چمک اٹھتا ہے اللہ کی طرف سے اسے خوب عزتیں ملتی ہیں تب ہر سمت سے اہل دنیا اس ناکام پر رشک کیا کرتے ہیں جیسا کہ قرآن و حدیث میں کئی جگہوں یہ مضمون پر ذکر کیا گیا ہے اور احقر نے بھی بعض مقامات پر نقل کیا ہے۔

اور اللہ تعالیٰ کے راستے پر چلنے کی ایک عجیب خصوصیت یہ ہے کہ اگر منزل ملے تو بھی کامیابی اور اگر نہ ملے تو بھی کامیابی، کیونکہ ہر قدم پر ہی اس کے منزل ہوا کرتی ہے اور یہ کہ وہ اللہ تعالیٰ کا حکم پورا کرتے ہوئے راستہ طے

کرتا ہے اور یہی اصل مومن کی منزل ہے تو ظاہر میں خواہ وہ مقامات اور مرتبے اور اہل دنیا کی نگاہ میں دین کے بڑے بڑے القاب اسے حاصل نہ بھی ہوں تب بھی اس کا یہ سفر کامیاب کہلائے گا جیسے اس کو ایک مثال سے یوں سمجھئے کہ ایک شخص قرآن کریم حفظ کرتا ہے اور مستقل جدوجہد اور محنت کرتا رہتا ہے اور پورے اخلاص کے ساتھ اس کی سعی وکوشش میں لگا ہوا ہے مگر سب محنتوں کے باوجود ذہن کی کمزوری کی وجہ سے وہ حافظ نہ بن سکا اور اسی حالت میں دنیا سے رخصت ہو گیا تو اگر چہ وہ اہل دنیا کی نگاہ میں حافظ نہیں مگر اللہ تعالیٰ کے ہاں اسے حافظ ہی شمار کیا جائے گا اور اس طرح یہ بظاہر ناکام مگر حقیقتاً ناکام نہیں کہلائے گا۔

اسی لیے حضرت شاہ ابرار الحق صاحب ہردوئی رحمہ اللہ امت کے ہر چھوٹے بڑے اور جوان بوڑھے کے لیے حافظ بننے کا ایک آسان طریقہ ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ روزانہ پابندی کے ساتھ جتنا بھی ہو سکے حفظ کرنے کی کوشش میں لگ جائے تو اگر اس کی عمر نے ساتھ دیا اور دو، دو، چار چار آیتیں یاد کر کے کر دس پندرہ سال میں وہ پورے قرآن کریم کا حافظ ہو گیا تو بہت خوب ہوا۔

اور اگر اس کی عمر نے وفا نہ کی اور درمیان ہی میں اس کا انتقال ہو گیا تو اللہ تعالیٰ کے یہاں اسے حافظ ہی کا درجہ دیا جائے گا بالفاظ دیگر یوں کہیے کہ وہ آخرت کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ کی نظروں میں حافظ ہی شمار ہوگا اور یہی اصل مقصود ہے۔ چنانچہ بعض روایات سے پتہ چلتا ہے کہ جو آدمی کسی کام میں لگا ہوا ہو اور ایسے میں اُسے موت آجائے تو اللہ تعالیٰ اسے آخرت میں اس کام کے پورا کرنے والوں میں شامل کر کے اٹھائیں گے بلکہ اللہ تعالیٰ کی شان رحیمی وکریمی کا تو یہ عالم ہے کہ اگر پختہ ارادہ بھی کسی کار خیر کا کیا جائے اور اس کے کرنے سے پہلے اس کا انتقال ہو جائے تو بھی وہ عمل لکھ دیا جاتا ہے۔

عاشقِ خدا اکرام واحترام کا طالب نہیں ہوتا ہے

تف ہے یارو طالب اکرام پر
میں فدا ہوں عاشق بدنام پر

اللہ تعالیٰ کا سچا عاشق کبھی اپنے مولیٰ کو راضی کرنے کے لیے اہل دنیا کی نگاہوں میں عزت واکرام ملنے اور نہ ملنے کی کوئی پرواہ نہیں کرتا، اسے تو صرف ایک فکر ہوتی ہے کہ مجھے تو اپنے مالک پر مرمٹنا ہے خواہ اہل دنیا مجھے کیسے ہی القاب سے یاد کریں اور وہ کچھ بھی برے سے برے الفاظ میرے لیے استعمال کریں، مجھے ان کی نگاہ میں نہ باعزت بننے کا شوق ہے اور نہ میں بڑا کہلوانا چاہتا ہوں بلکہ میری زندگی کا صرف ایک ہی مقصد ہے کہ میں محبوب کی ہر چاہت پر مرمٹوں اور قربان ہو جاؤں اگر چہ دنیا والوں کی نگاہ میں مجھے ذلیل اور بدنام ہی ہونا پڑے۔ اس لیے حضرت والا فرماتے ہیں کہ بھلا عاشق ہو کر پھر لوگوں کی نگاہوں میں عزت واکرام کا طالب ہونا یہ قابل افسوس

معاملہ ہے اور شان عاشقی کے خلاف ہے جیسا کہ دنیا کے عشاق بھی اپنے محبوب پر فدا ہونے میں کسی کے کچھ کہنے سننے کی پرواہ نہیں کرتے اور بدنامی سے بالکل بے خوف ہوجاتے ہیں۔

عاشق بدنام اور دشنام

لڑ رہے ہو ان سے کیوں دشنام پر
کتنا پردہ ہے تمہارے کام پر
کیا تعجب ہے ترے دشنام پر
اور کیا برسے گا اس بدنام پر

یہ تمام انبیاءعظام واولیاء کرام کی سنت ہے کہ جب ان کی امتوں اور قوموں کی طرف سے ان کے ساتھ بدسلوکی کا معاملہ ہوتا ہے تو وہ جواب میں اچھائی کا معاملہ کرتے ہیں اور برائی کا بدلہ برائی سے نہیں دیتے، بلکہ ان کی نظر اس اللہ کی ذات عالی پر ہوتی ہے کہ جو اپنے بندوں کے عیوب چھپانے والی اور برائیوں پر پردہ ڈالنے والی ہے اور ایسے کسی بھی موقع پر جب ان کی قوم کا کوئی فرد ان کے ساتھ بے ہودہ گوئی اور گالی گلوچ کے ساتھ پیش آتا ہے، تو ان کو فوراً اپنی حقیقت نظروں میں آجاتی ہے اور وہ یہ سوچنے لگتے ہیں کہ ہم تو اس سے بھی زیادہ عیبوں اور خرابیوں سے بھرے ہوئے ہیں، صرف ستار العیوب اللہ تعالیٰ نے ہمارے ان عیبوں پر پردہ ڈال رکھا ہے اہل حق اہل اللہ کی نظر ہمیشہ اسی پر ہوتی ہے تو وہ اس طرح کے جملے کہنے والوں سے کبھی انتقام اور بدلے لینے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ عفو و درگزر سے کام لیتے ہیں، اگر چہ یہ الگ بات ہے کہ ایسے لوگ جو اللہ والوں سے برسرِ پیکار رہتے ہیں اور ان کے ساتھ بے ہودہ گوئی سے پیش آتے ہیں، وہ خدا کی پکڑ سے محفوظ نہیں رہتے۔ اور اللہ تعالیٰ خود ان سے انتقام لیتے ہیں، ہمارے اکابر کے اس پر بے شمار واقعات ہیں۔

جب کہ اس کے برخلاف وہ شخص جو حقیقت میں نسبت باطنی سے خالی ہو اور ظاہر دارانہ طور پر بڑے عالم اور پیر کی شکل میں رہتا ہو جب اسے اس طرح کی کوئی بات کہی جائے تو وہ یہ سوچنے کے بجائے کہنے والے پر شدید ناراض اور غصہ ہوتا ہے اور اس کی باتوں کو خلاف حقیقت سمجھتے ہوئے مغرورانہ اور متکبرانہ انداز میں اسے ڈانٹتا اور ڈپٹتا ہے جس سے یہ پتہ چل جاتا ہے کہ اس شخص نے اپنے آپ کو بہت سے کمالات اور خوبیوں کا مالک سمجھ رکھا ہے اس لیے کسی کے نامناسب کلمات کہنے پر اس سے انتقامی کارروائی کے طور پر سخت سے سخت جوابی کارروائی کی کوشش کرتا ہے اور آپے سے باہر ہو کر خود ہی انتقامی کارروائی پر اتر آتا ہے جو کہ درحقیقت متکبروں اور مغرور انسانوں کا شیوہ اور عادت ہے جن پر اپنی حقیقت حال کھلی ہوئی نہ ہو اور انہوں نے اپنے کو اپنے ذہنوں میں بہت کچھ سمجھ لیا ہو۔

عشق کی راہ میں آلام ہے آرام نہیں

کیوں فدا ہے میر تو آرام پر
عشق ہوتا ہے فدا آلام پر

یعنی اللہ تعالیٰ کی محبت کا راستہ آزمائشوں سے بھرا ہوا ہوتا ہے جو آرام پسندی اور راحت طلبی کے ساتھ طے نہیں ہوسکتا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

﴿إِنَّ مِنْ أَشَدِّ النَّاسِ بَلَاءً الْأَنْبِيَاءُ ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ﴾

(مسند احمد)

کہ آزمائش سب سے زیادہ انبیاء کی ہوتی ہے پھر جو ان سے جتنا زیادہ قریب ہو اس کی اتنی زیادہ آزمائش ہوا کرتی ہے ۔

مقرباں را بیش بود حیرانی

جو جتنا مقرب ہوتا ہے اس کو اتنی حیرانی اور پریشانی ہوا کرتی ہے کہ قدم قدم پر خوب سوچ کر اور سنبھل کر چلنا پڑتا ہے ایک روایت میں ہے کہ ایک صحابی نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! مجھے آپ سے محبت ہے تو اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے پوچھا کہ جو تم کہہ رہے ہو سوچ کر کہو اس نے پھر سے یہی بات کہی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

﴿إِنْ كُنْتَ تُحِبُّنِيْ فَأَعِدَّ لِلْفَقْرِ تِجْفَافًا فَإِنَّ الْفَقْرَ أَسْرَعُ إِلٰى مَنْ يُحِبُّنِيْ مِنَ السَّيْلِ إِلٰى مُنْتَهَاهُ﴾

(سنن الترمذي، كتاب الزهد، باب ماجآء في فضل الفقر)

جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر تم مجھ سے محبت کرتے ہو تو فقر و فاقہ کے لیے تیار ہو جاؤ، کیونکہ مجھ سے محبت رکھنے والوں کی طرف فقر و فاقہ اور آزمائشیں بڑی تیزی کے ساتھ آتی ہیں۔ ایک اور روایت میں ہے:

﴿عَنْ أَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا أَرَادَ اللهُ بِعَبْدِهِ الْخَيْرَ عَجَّلَ لَهُ الْعُقُوْبَةَ فِي الدُّنْيَا وَإِذَا أَرَادَ اللهُ بِعَبْدِهِ الشَّرَّ أَمْسَكَ عَنْهُ بِذَنْبِهِ حَتّٰى يُوَافِيَ بِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ﴾

(سنن الترمذي، كتاب الزهد عن رسول الله، باب ماجآء في الصبر على البلاء)

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جب اللہ تعالیٰ اپنے بندے کے ساتھ خیر اور بھلائی کا ارادہ فرماتے ہیں تو دنیا ہی میں اس کو اعمالِ بد کی سزا پیشگی دے دیتے ہیں اور جب اللہ اپنے بندے کے ساتھ بُرائی کا ارادہ فرماتے ہیں تو باوجود اُس کے گناہ کرنے کے اُس سے دنیا میں سزا کو روک لیتے ہیں یہاں تک کہ قیامت کے دن اُس کو پوری پوری سزا دیں گے۔ اس لیے عشق کے ساتھ آزمائشیں وابستہ اور جڑی ہوئی ہیں اور مؤمن کو دنیا میں رہتے ہوئے ان ناموافق حالات سے گزرنا ایک معمول اور عادت کی بات ہے۔

تقدیر بدل جاتی ہے مضطر کی دعا سے

کشتی کا ناخدا بھی ہے مشغول خدا سے
پالا پڑا ہے کیا اسے طوفان بلا سے
سنتا ہوں شب و روز یہ موجوں کی صدا سے
غالب ہے قضا ہم پہ تری آہ و بکا سے
عاصی جو کرے نالہ و فریاد خدا سے
ممکن نہیں دو چار ہو محشر میں سزا سے
مایوس نہ ہوں اہل زمیں اپنی خطا سے
تقدیر بدل جاتی ہے مضطر کی دعا سے
جب تک کہ نہ ہو آشنا تسلیم و رضا سے
زاہد کو مزہ آئے گا کیا اس کی جفا سے
پاتی ہے نظر ذوق نظر میری ندا سے
پاتا ہے جگر زخمِ جگر میری نوا سے
او بے خبرو بدگماں! رندوں کی وفا سے
دیوانہ اگر پھرتا ہوں میں تیری بلا سے
پروردۂ نعمت کو بھی اس راہ جفا سے
اختؔر تجھے مانوس بنانا ہے دُعا سے

مشکل الفاظ کے معانی:۔ ناخدا: کشتی چلانے والا۔ **آہ وبکا**: رونا چیخنا۔ **عاصی**: گنہگار۔ **نالہ وفریاد**: رونا پکارنا۔ **مضطر**: بے کس ومجبور ہوکر اللہ تعالیٰ کو پکارنے والا۔ **آشنا**: واقف ہونا۔ **تسلیم رضا**: اللہ تعالیٰ کی مرضی پر راضی رہنا۔ **زاھد**: اللہ تعالیٰ کی محبت سے خالی شخص مراد ہے۔ **جفا**: بے وفائی، اللہ تعالیٰ سے محبت نہ ہونا۔ **نظرِ ذوق**: مزا۔ **نوا**: آواز۔ **رندوں**: اللہ تعالیٰ کی محبت کی شراب پینے والے۔ **پروردۂ نعمت**: نازونعمت میں پلا ہوا۔ **مانوس بنانا**: قریب کرنا۔

کشتیٔ دین وایمان کا ناخدا بس خدا ہی ہے

کشتی کا ناخدا بھی ہے مشغول خدا سے
پالا پڑا ہے کیا اسے طوفان بلا سے
سنتا ہوں شب و روز یہ موجوں کی صدا سے
غالب ہے قضا ہم پہ تری آہ و بکا سے

دین وایمان کی کشتی اللہ تعالیٰ سے رابطے اورآہ وزاری کے بغیر بلا کے طوفان سے پار نہیں ہوسکتی زمانے میں پھیلے ہوئے طرح طرح کے دینی فتنوں کا طوفان جو ہماری کشتی کو ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے اور جو کشتی چاروں طرف سے ان سمندری طوفانوں کی موجوں میں پھنسی ہوئی ہے اس کے بچنے اور نجات پانے کا راستہ بس صرف اور صرف یہی ہے کہ جس کے قبضہ میں ہماری یہ کشتی ہے اس سے لو لگائی جائے اور رابطہ مضبوط کیا جائے تو با آسانی ساحل پر پہنچنے کی امید کی جاسکتی ہے ورنہ بجز طوفانِ معصیت میں غرقاب ہوجانے کے اورکوئی صورت نہیں ہوسکتی۔

کتنی ہی بڑی سے بڑی آزمائش ہو اور کیسے ہی ناموافق حالات ہوں مگر جو بندہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ رابطہ پیدا کرلیتا ہے پھر اسے کوئی غم نہیں رہتا بلکہ وہ بالکل مطمئن اور بے فکر ہوکر رہتا ہے اسی کو حضرت والا نے ایک مقام پر فرمایا۔

بحرِ طوفانِ غم ہے مخالف ہوا
میری کشتی کا ہے تو ہی بس ناخدا

تو جب کشتی کا ناخدا ہم اللہ تعالیٰ کو بنالیں گے اور اسی سے آہ وزاری اور فریاد کریں گے اور ہر قدم پر جہاں کشتی طوفانون میں پھنسی نظر آئے ں اسی کو پکاریں گے تو اس کے نجات پا جانے میں کیا شک وشبہ کیا جاسکتا ہے، کیونکہ ہمارا ایمان ہے کہ روئے زمین پر ایک پتہ بھی اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر نہیں ہلتا تو ہماری مخالف سمت جتنی ہوائیں چل رہی ہیں اور جو بھی کچھ ہو رہا ہے سب اللہ تعالیٰ کے فیصلے سے ہو رہا ہے۔ جب ہم اللہ تعالیٰ سے آہ وبکا کر کے اس کے فیصلوں کو اپنے حق میں کرلیں گے تو نہ یہ مخالف ہوائیں مخالف رہیں اور نہ طوفان کی موجیں ہم سے ٹکرانے کی کوشش کریں گی، اس لیے ان اشعار کا اصل پیغام یہ ہے کہ جو تمہارا کشتی چلانے والا ہے اور جس کے قضاء وقدر سے موافق ومخالف سمت ہوائیں چل رہی ہیں، اس کی قدرت وطاقت کو اپنے ساتھ لینے کی کوشش اور جدوجہد کرو خود ڈائریکٹ حالات سے نہ ٹکراؤ ورنہ یہ ایک لغو اور بیکار عمل ہوگا۔ اگر ہم قرآنِ کریم کی اس آیت میں غور کریں:

﴿وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ اَمْرِهٖ يُسْرًا﴾

(سورۃ الطلاق، آیۃ: ۴)

ترجمہ: اور جو کوئی ڈرتا رہے اللہ سے کردے وہ اس کے کام میں آسانی۔ (معارف القرآن، جلد: ۸، صفحہ: ۴۷۲)

اس میں یہی بات فرمائی گئی کہ ایک کام میرے کرنے کا ہے اور ایک کام میرے بندوں کے کرنے کا ہے اور وہ یہ کہ بندے مجھے راضی کرنے کی فکر کریں اور میرے رضا والے کاموں میں لگ جائیں اور میں پھر ان کے کام بنا تا جاؤں گا اور ان کے راستے کی ساری مشکلات آسانیوں میں بدلتا جاؤں گا، ان کے سارے ناموافق اور ناگوار حالات خوشگوار بنا دوں گا۔

اب افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ بندہ بحیثیت بندہ ہونے کے اپنی زندگی کی کشتی کو خود موافق رخ پر ڈال کر اور موجوں سے ٹکرا کر ساحل پر پہنچنے کا متمنی ہے اور خود حلال وحرام کی تمیز کئے بغیر اور اللہ کی مرضی کی پرواہ کئے بغیر صبح سے شام تک چوبیس گھنٹے اپنی بگڑی سنوارنے اور حالات درست کرنے میں لگا ہوا ہے، اور پریشانیوں اور الجھنوں سے نکلنے کی راہ ڈھونڈ رہا ہے اور اندرونی اور بیرونی اختلافات وجھگڑوں کے لیے ہر ممکنہ تدابیر کرنے پر دل وجان سے لگا ہوا ہے جبکہ یہ بات اپنے پالنے والے اللہ کو راضی کیے بغیر کسی بھی قیمت پر ممکن نہیں ہے اس لیے کہ در اصل صورت حال یہ ہے کہ اس کے حالات کی کشتی کا مالک اس سے ناراض ہونے کی وجہ سے اسے طوفان کی موجوں میں الجھائے ہوئے، ہے جس سے چھٹکارا کشتی کے ناخدا (اللہ تعالیٰ) کو راضی کئے بغیر ہو ہی نہیں سکتا بس یہی ان اشعار کا سبق ہے۔ جو کہ بعینہٖ میرے محبوب ومحسن نبی حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد میں موجود ہے اور اس میں بالکل وضاحت کے ساتھ ہمارے لیے رہنمائی ہے اور یہ مذکور ہے کہ اپنی جملہ مشکلات کے حل کا راستہ اللہ تعالیٰ کے لیے اپنے کو فارغ کر لینا ہے:

﴿عَنْ أَبِیْ هُرَیْرَةَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ إِنَّ اللّٰہَ تَعَالٰی یَقُوْلُ یَا ابْنَ اٰدَمَ! تَفَرَّغْ لِعِبَادَتِیْ أَمْلَأْ صَدْرَکَ غِنًی وَّأَسُدَّ فَقْرَکَ وَإِلَّا تَفْعَلْ مَلَأْتُ یَدَیْکَ شُغْلًا وَّلَمْ أَسُدَّ فَقْرَکَ قَالَ هٰذَا حَدِیْثٌ حَسَنٌ غَرِیْبٌ وَأَبُوْ خَالِدٍ الْوَالِبِیُّ اسْمُهٗ هُرْمُزُ﴾

(سنن الترمذی، کتاب صفة القیامة والرقائق والورع عن رسول اللہ)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتے ہیں اے انسان! تو میری عبادت کے لیے فارغ ہو جا تو میں تیرے سینہ کو غنا سے بھر دوں گا اور تیرے فقر کو دور کر دوں گا اور اگر تو ایسا نہ کرے گا تو میں تیرے ہاتھوں کو مشغولی سے بھر دوں گا اور تیرے فقر کو دور نہ کروں گا۔

عاصی اگر تائب ہوتو پھر سزا کا مستحق نہیں

عاصی جو کرے نالہ و فریاد خدا سے
ممکن نہیں دو چار ہو محشر میں سزا سے
مایوس نہ ہوں اہلِ زمیں اپنی خطا سے
تقدیر بدل جاتی ہے مضطر کی دعا سے

قیامت کے دن جس طرح کاملین جنت میں جائیں گے اسی طرح اللہ تعالیٰ کی رحمت سے تائبین بھی جنت میں جائیں گے، اسی لیے اگر کسی سے کوئی خطا سرزد ہوجائے تو، اسے بے چین اور پریشان ہوکر اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس نہیں ہونا چاہیے، کیونکہ قرآن کریم میں بکثرت ایسی آیات ہیں جن میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے گنہگار بندوں کی توبہ قبول کرنے کا تذکرہ فرمایا ہے۔اسی طرح احادیث شریفہ میں بھی کثرت کے ساتھ توبہ کے فوائد اور اس پر اللہ تعالیٰ کی رضا کا مرتب ہونا وارد ہوا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں گنہگاروں کے لیے نہایت امید افزاء آیت کریمہ ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿قُلۡ یٰعِبَادِیَ الَّذِیۡنَ اَسۡرَفُوۡا عَلٰۤی اَنۡفُسِہِمۡ لَا تَقۡنَطُوۡا مِنۡ رَّحۡمَۃِ اللّٰہِ﴾
(سورۃ الزمر، آیت:۵۳)

مشہور تابعی حضرت سعید ابن جبیر رحمہ اللہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ کچھ لوگ ایسے تھے جنہوں نے قتل ناحق کئے اور بہت کیے اور زنا کا ارتکاب کیا اور بہت کیا انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ جس دین کی طرف آپ دعوت دیتے ہیں وہ ہے تو بہت اچھا لیکن ہمارے لیے فکر کی بات یہ ہے کہ جب ہم اتنے بڑے بڑے گناہوں کا ارتکاب کر چکے ہیں اب اگر ہم مسلمان بھی ہوگئے تو کیا ہماری توبہ قبول ہوجائے گی؟ اس پر اللہ تعالیٰ نے آیت مذکورہ نازل فرمائی۔ (ذکرہ البخاری بمعناہ قرطبی)

اس لیے خلاصہ آیت کے مضمون کا یہ ہوا کہ مرنے سے پہلے پہلے ہر بڑے سے بڑے گناہ یہاں تک کہ کفر وشرک سے بھی جو توبہ کرلے قبول ہوجاتی ہے اور سچی توبہ سے سب گناہ معاف ہوجاتے ہیں اس لیے کسی کو اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہونا چاہیے۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ یہ آیت گناہگاروں کے لیے قرآن کی سب آیتوں سے زیادہ امید افزا ہے مگر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ سب سے زیادہ رجاء وامید کی یہ آیت ہے: اِنَّ رَبَّکَ لَذُوۡ مَغۡفِرَۃٍ لِّلنَّاسِ عَلٰی ظُلۡمِہِمۡ" (معارف القرآن، جلد:۷، صفحہ:۵۶۹)

اور ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

﴿مَنْ لَزِمَ الْاِسْتِغْفَارَ جَعَلَ اللّٰهُ لَهٗ مِنْ كُلِّ ضِيْقٍ مَخْرَجًا وَّمِنْ كُلِّ هَمٍّ فَرَجًا وَّرَزَقَهٗ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ﴾
(مشکاۃ المصابیح، ص: ۲۰۴)

حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو آدمی استغفار کو لازم پکڑ لے اور اس کی پابندی کرے تو اس کے لیے خاص طور پر تین اہم وعدے ہیں (۱) اللہ تعالیٰ ہر تنگی سے نکلنے کا اس کے لیے راستہ بنا دیتے ہیں۔ (۲) اور ہر غم سے اس کو کشادگی عطا فرما دیتے ہیں۔ اور (۳) اس کو ایسی جگہ سے رزق عطا فرماتے ہیں جہاں سے اس کا خیال بھی نہیں ہوتا۔

اگر ہم غور سے دیکھیں تو پتہ چلے گا کہ ہماری تمام ضرورتوں کا مدار اور ہماری جملہ حاجات کی بنیاد یہ تین چیزیں ہیں جس کو یہ تین چیزیں حاصل ہو جائیں، تو اسے ہر نعمت حاصل ہو گئی کیونکہ دنیا میں بسنے والا ہر انسان رات و دن انہی تین قسم کے مقاصد کے حصول کی جدوجہد میں لگا ہوا ہے کہ اسے اچھا آسان رزق حاصل ہو جائے اور مشکلات اور پریشانیوں سے نجات مل جائے اور جہاں معاملات میں کچھ رکاوٹیں ہیں وہ دور ہو جائیں، اس لیے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ استغفار کی پابندی سے دنیا ہی میں جنت کا مزہ حاصل ہونے لگے گا اور ہر قسم کے ٹینشن (Tension) اور ڈیپریشن (Depresion) وغیرہ سے حفاظت رہے گی۔

اب رہ گیا حضرت والا کا یہ فرمانا کہ مضطر کی دعا سے تقدیر بدل جاتی ہے، سو اس سلسلے میں علمی طور پر بظاہر ایک اعتراض اور اس کا جواب سمجھ لینا چاہیے اور وہ یہ کہ اہل اسلام کا یہ اجماعی عقیدہ ہے کہ جو بات جس کے حق میں تقدیر میں لکھی جا چکی وہ تبدیل نہیں ہو سکتی:

﴿قَدْ جَفَّ الْقَلَمُ بِمَا هُوَ كَائِنٌ اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ﴾
(کنز العمال)

کہ قیامت تک جو کچھ ہونے والا ہے اس کو قلم لکھ کر خشک ہو چکا ہے یعنی اب اس میں کسی قسم کی تبدیلی ممکن نہیں ہے تو یہ بات کہ مضطر کی دعا سے تقدیر بدل جاتی ہے اس کا کیا مطلب ہو سکتا ہے۔ اس کا جواب سمجھنے سے پہلے ایک حدیث شریف ذہن میں رہنی چاہیے:

﴿لَا يَرُدُّ الْقَضَآءَ اِلَّا الدُّعَآءُ وَلَا يَزِيْدُ فِى الْعُمْرِ اِلَّا الْبِرُّ﴾
(مشکاۃ المصابیح، ص: ۱۹۵)

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ کی قضا و قدر کو صرف دعا ٹال سکتی ہے اور نیکی کرنے سے عمر میں اضافہ (برکت) ہوتی ہے۔ اس حدیث شریف سے معلوم ہوا کہ دعا سے اللہ تعالیٰ کی قضاء و فیصلہ ٹل جاتا ہے، اس کی مختلف توجیہات میں سے بہترین توجیہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دعا کو تقدیر کے ان معاملات کے لیے جو تعلیقی درجے میں ہیں سبب قرار دیا ہے، یعنی اگر یہ بندہ دعا کرے گا تو یہ مصیبت اس سے ٹل جائے گی اور فلاں چیز اس کو

حاصل ہو جائے گی اسی کو تقدیرِ معلّق کہتے ہیں جو کہ بندوں کے لحاظ سے ہے۔البتہ اللہ تعالیٰ کے طے اور مقرر کرنے کے لحاظ سے جو تقدیر ہے وہ تقدیرِ مبرم کہلاتی ہے جس میں یہ لکھا ہوا ہوتا ہے کہ یہ بندہ دعا کرے گا اور اس سے یہ مصیبت ٹلے گی۔ یا یہ دعا نہیں کرے گا اور اس پر فلاں مصیبت آئے گی اور یہی وہ تقدیر ہے جس میں کسی قسم کے تغیر اور تبدل کا کوئی امکان نہیں، جس کے بارے میں امت کا اجماعی عقیدہ ہے لہٰذا اس طرح کے جملے اور تعبیرات کہ مضطر کی دعا سے تقدیر بدل جاتی ہے۔اس کا مفہوم ومطلب بس اتنا ہی ہے اس کو ایک حسی مثال سے سمجھئے کہ کسی کو گاڑی کے ایکسیڈنٹ (Accident) کا حادثہ پیش آیا جس میں دو ساتھیوں نے سیٹ بیلٹ نہیں باندھی تھی اور ایک نے باندھی ہوئی تھی، تو جس نے باندھی تھی وہ موت سے بچ گیا اور باقی دو حضرات جاں بحق ہو گئے، تو ایسی صورت میں ہم یہ کہیں گے کہ یہ سیٹ بیلٹ باندھنا اس کے جان بچنے اور موت سے حفاظت کا سبب بن گیا، اگر یہ نہ باندھتا تو یہ بھی لقمہ اجل بن جاتا۔البتہ اللہ تعالیٰ کے یہاں طے شدہ لکھا ہوا تھا کہ ان میں سے ایک اس وجہ سے محفوظ رہے گا اور دو حضرات حادثے کا شکار ہو کر اللہ سے جا ملیں گے، بس مضطر کی دعا سے تقدیر بدلنے کا مفہوم ومطلب بھی یہی ہے۔ ورنہ حقیقی اور حتمی تقدیر نہیں بدلتی ہے۔

زاہدِ خشک تسلیم ورضا کی لذت کو کیا جانے

جب تک کہ نہ ہو آشنا تسلیم و رضا سے
زاہد کو مزہ آئے گا کیا اُن کی جفا سے

تسلیم ورضا اللہ والوں کو حاصل ہونے والے مقاماتِ قربِ خداوندی میں سے بڑا اونچا مقام اور مرتبہ ہے اور مؤمن کی سعادت ونیک بختی کی نشانی ہے۔جیسا کہ حدیث شریف میں ہے:

﴿عَنْ سَعْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ سَعَادَةِ ابْنِ اٰدَمَ رِضَاهُ بِمَا قَضَى اللهُ لَهُ وَمِنْ شَقَاوَةِ ابْنِ اٰدَمَ تَرْكُهُ اسْتِخَارَةَ اللهِ وَمِنْ شَقَاوَةِ ابْنِ اٰدَمَ سَخَطُهُ بِمَا قَضَى اللهُ لَهُ﴾

(مسند احمد)

حضرت سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا انسان کی نیک بختی یہ ہے جو کچھ اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے مقدر کر دیا ہے اس پر راضی رہے اور آدمی کی بدبختی یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے خیر اور بھلائی کو مانگنا چھوڑ دے اور انسان کی بدبختی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ اس کے مقدر میں لکھا ہے وہ اس سے غضب ناک اور ناخوش ہو۔

آدمی کو چاہیے کہ ہمیشہ اللہ تعالیٰ سے خیر طلب کرتا رہے اور پھر جو کچھ اللہ تعالیٰ عطا فرمائیں اس پر راضی رہے اور قضائے الٰہی پر راضی ہونا بڑی نعمت ہے۔اور ابن آدم کے لیے یہ بڑی سعادت ہے کیونکہ جب بندہ تقدیرِ

الٰہی پر راضی رہتا ہے تو عبادت کے لیے فارغ رہتا ہے۔ برعکس اس کے کہ ناراض ہو فیصلۂ الٰہی سے تو وہ ہر وقت متفکر اور پریشان رہتا ہے کیونکہ کوئی انسان مصائب اور حوادث سے خالی نہیں۔ اہل اللہ تسلیم ورضا کی برکت سے ہر حالت میں پُرسکون ہیں۔

خوشا حوادثِ پیہم خوشا یہ اشکِ رواں
جو غم کے ساتھ ہو تم بھی تو غم کا کیا غم ہے
وہ تو کہیے کہ ترے غم نے بڑا کام کیا
ورنہ مشکل تھا غمِ زیست گوارا کرنا

ہر فکر اور ہر تردّد میں استخارہ اور استشارہ کر لے، پھر ان شاء اللہ تعالیٰ کوئی خطرہ نہیں۔ جیسا کہ حدیث میں بشارت ہے استخارہ اللہ تعالیٰ سے مشورہ کرنا اور استشارہ اہلِ تجربہ عاقل بندوں سے مشورہ لینا ہے۔

﴿مَا خَابَ مَنِ اسْتَخَارَ وَلَا نَدِمَ مَنِ اسْتَشَارَ وَلَا عَالَ مَنِ اقْتَصَدَ﴾

(المرقاۃ: ج ۹، ص ۱۶)

نہیں نامراد ہوا جس نے استخارہ کیا اور نہیں نادم ہوا جس نے مشورہ کیا اور نہیں تنگدست ہوا جس نے خرچ میں میانہ روی کی یعنی فضول خرچی سے احتیاط کی اور اعتدال کی راہ پر خرچ کیا۔

حضرت مولانا حکیم الامت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ غم سے نفس کو تکلیف ہوتی ہے مگر روح میں نور پیدا ہوتا ہے۔

میکدہ میں نہ خانقاہ میں ہے
جو تجلّی دلِ تباہ میں ہے
عارف جنون درد پسندی نے بارہا
ٹھکرا دیا وہ غم جو غمِ جاوداں نہ تھا

انسان اپنے خیر وشر کو نہیں سمجھ سکتا۔ حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: "عَسٰۤی اَنۡ تَکۡرَہُوۡا شَیۡئًا وَّہُوَ خَیۡرٌ لَّکُمۡ ۚ وَعَسٰۤی اَنۡ تُحِبُّوۡا شَیۡئًا وَّہُوَ شَرٌّ لَّکُمۡ ؕ وَاللّٰہُ یَعۡلَمُ وَاَنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ. (سورۃ البقرہ، پارہ:۲، آیت:۲۱۶)

قریب ہے یہ کہ تم بُری سمجھو کسی چیز کو اور بھلی ہو تمہارے لیے اور قریب ہے کہ درست سمجھو کسی چیز کو اور وہ بُری ہو تمہارے لیے اللہ تعالیٰ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے ہو۔ (دنیا کی حقیقت: ۱۸۶-۱۸۹)

اہل اللہ وہی ہوتے ہیں جو اپنی ہر تجویز کو اللہ تعالیٰ کی تجویز میں فنا کر دیتے ہیں اور اپنے ہر معاملے کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کر کے اس کے فیصلے پر راضی رہتے ہیں اگر کوئی خوشی کا واقعہ ہو، عزت وراحت کا معاملہ ہو، آسانی اور

سہولت کی بات ہو، تو بھی وہ راضی رہتے ہیں اور کسی غمی کے موقع پر اور پریشانی کی صورت میں بھی اسی طرح راضی رہتے ہیں، گویا وہ نفع ونقصان کو نہ اپنی طرف منسوب کرتے اور نہ ہی اس میں اپنا کوئی دخل اور کمال سمجھتے ہیں بلکہ ان کی سوچ وفکر ہر وقت یہ ہوتی ہے کہ جو بھی کچھ روئے زمین پر ہو رہا ہے وہ سب اللہ تعالیٰ کے فیصلے سے ہو رہا ہے اور ہمارا اللہ ہر شے کا مالک بھی ہے اور خالق بھی ہے اور ہمارے لیے ہر فیصلے کا پورا حق بھی اس کو ہے، کیونکہ وہ حاکم اور ہمارا مالک ہے، ہم اس کے محکوم ومملوک ہیں اور اس کا ہر فیصلہ خیر اور بہتر ہی ہے، کیونکہ وہ حکیم ہے کہ جس کا کوئی فعل حکمت سے خالی نہیں ہوتا، اس لیے خوشی کی حالت میں مومن کو اترانا اور اکڑنا نہیں چاہیے اور رنج وغم کی حالت میں مایوس واداس ہوکر پریشان نہ ہونا چاہیے، بلکہ ہر وقت ہر غم سے بے غم رہے، بلکہ غم میں بھی شاداں رہے اور دل دل میں یہ کہتا رہے ؎

مطمئن بیٹھے ہیں یارب تو حاکم بھی ہے حکیم بھی ہے

ورنہ اگر صرف عبادت ہی عبادت ہو اور اوراد ووظائف کی کثرت ہو لیکن تسلیم ورضا کا جوہر پاس میں موجود نہ ہو تو ایسے شخص کو زاہد خشک کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے، ہونا تو یہ چاہیے کہ ہر حال میں شاداں وخنداں رہے بقول حضرت والا دامت برکاتہم ؎

کیفِ تسلیم و رضا سے ہے بہارِ بے خزاں
صدمہ وغم میں بھی اختؔر روح رنجیدہ نہیں

سبحان اللہ! مسلمانوں کے لیے یہ اللہ تعالیٰ کا کتنا عظیم الشان تحفہ اور کیسی بے مثال نعمت ہے کہ آج کی دنیا میں وبا کی طرح پھیلی ہوئی ایک بیماری جس کو ٹینشن اور ڈیپریشن (Tension & Depresion) کہتے ہیں۔ تسلیم ورضا کا جوہر ہاتھ آ جانے کے بعد اس سے پوری حفاظت ہو جاتی ہے۔ اس لیے کسی پکے سچے ایمان والے کو دنیا کتنا ہی ستائے اور وہ کیسی ہی آزمائشوں اور مشکلات سے گزر رہا ہو، لیکن کبھی بھی حواس باختہ اور پریشان نہیں ہوگا۔ جب کہ دنیا کے متموِّل قسم کے لوگ جن کی ایمان کی جڑیں مضبوط نہیں ہیں آج اس بیماری کی وجہ سے بڑی تعداد میں خودکشی کر کر کے مر رہے ہیں، کیونکہ ان کو یہ بیماری لگنے کے بعد چین وسکون کی نیند میسر نہیں آتی، تو وہ اس قدر پریشان ہو جاتے ہیں کہ پھر جینے پر مرنے کو ترجیح دیتے ہیں اور خودکشی کر کے بے چینی سے نکل جانا چاہتے ہیں۔

ٹینشن (Tension) کا علاج خودکشی نہیں ہے

مگر آہ! کاش کہ وہ یہ جانتے کہ انہیں مر کر بھی چین ملنے والا نہیں، کیونکہ خودکشی ایسا سخت گناہ ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے متعلق فرمایا کہ: جو جس طریقہ سے خودکشی کر کے مرے گا وہ قیامت تک اس کا عذاب چکھتا رہے گا:

﴿وَمَنْ قَتَلَ نَفْسَهُ بِحَدِيْدَةٍ فَحَدِيْدَتُهُ فِيْ يَدِهِ يَجَأُ بِهَا فِيْ بَطْنِهِ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ خَالِدًا مُخَلَّدًا فِيْهَا أَبَدًا﴾

(صحیح البخاری، کتاب الطب، باب شرب السم والدواء به)

جس شخص نے اپنے آپ کولوہے کے ذریعے سے قتل کیا جس سے وہ اپنا پیٹ پھاڑ رہا تھا تو وہ قیامت تک اسی طرح اپنے پیٹ کو پھاڑ کر اس کا عذاب چکھتا رہے گا اور جس نے زہر کھا کر خودکشی کی، وہ اسی طرح زہر کھا کر اس کی تکلیف میں قیامت تک گرفتار رہے گا اور جس نے کسی پہاڑ پر سے اپنے کو گرا کر خودکشی کی تو وہ ایسے ہی گر کر مرنے کی تکلیف قیامت تک چکھتا رہے گا۔

اس لیے خودکشی کرنے کے بعد بھی چین وسکون ملنے والا نہیں، بلکہ اور سخت سزاؤں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس کا راز اور حکمت یہ ہے کہ یہ جان ہماری اپنی نہیں ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی امانت ہے تو ہم اس میں اپنی مرضی سے جو تصرف کرنا چاہیں اس کا ہمیں حق نہیں، نہ پورے بدن میں نہ بدن کے کچھ اعضاء میں، بلکہ اگر کسی عضو کو بھی اللہ تعالیٰ کی مرضی کے خلاف استعمال کیا ہو تو یہ امانت میں خیانت کہلائے گی، جس کے متعلق کل قیامت کے دن باز پرس ہوگی۔ اسی طرح اگر ہم نے اپنی جان اللہ کے حکم کے خلاف لٹا دی ہو تو اس پر بھی پکڑ ہوگی۔ یہی تو وجہ ہے کہ صحت بدنی کی حفاظت از روئے مسئلہ شریعت ہر مسلمان پر فرض ہے اس پر اتنا بوجھ ڈالنا کہ انسان بیماریوں میں مبتلاء ہوجائے اور صحت بگڑ جائے جائز نہیں ہے، بلکہ حتی الوسع احتیاطی تدابیر کر کے اپنی صحت کی حفاظت کرنا یہ ہم پر لازم کیا گیا ہے۔

کھانے کے درجات اور ان کے احکام

اس لیے تو فقہا نے لکھا ہے:

﴿اَلْاَكْلُ فَوْقَ الشَّبْعِ حَرَامٌ﴾

(المبسوط، کتاب الاشربة، باب مزارعة الحرب)

کہ اتنا کھانا جو چھک جانے اور سیراب ہونے سے اوپر ہو حرام ہے، کیونکہ وہ صحت کو خراب کر کے مرض میں مبتلاء کرنے والا ہے وراسی بنیاد پر امام غزالی رحمہ اللہ نے کھانے پینے کے سات درجے لکھے ہیں:

(۱)...... پہلا درجہ یہ ہے کہ آدمی اتنا شکم سیر ہو جس سے زندگی قائم رہ سکے۔

(۲)...... دوسرا درجہ یہ ہے کہ جس سے نماز، روزہ اور عبادات وحقوق ادا ہوسکیں، یہ دونوں مراتب واجب ہیں۔

(۳)...... اس قدر شکم سیری جس سے نوافل ادا ہوسکیں۔

(٤)...... جس سے کمائی کی قدرت حاصل ہو، یہ دونوں مستحب ہیں۔

(٥)...... جس سے پیٹ کا ایک ثلث بھر جائے، یہ جائز ہے۔

(٦)...... جس سے بدن بوجھل اور ثقیل ہوجائے، نیند بکثرت آنے لگے، یہ مکروہ ہے۔

(۷)......اس قدر شکم سیری جو صحت کے لیے نقصان دہ ہو، یہ حرام ہے۔ (کشف الباری، ابواب الاطعمة، صفحہ: ۸۶)

اور اس اصول کا مأخذ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ ہدایات ہیں، جو آپ نے ان تین صحابہ کے لیے فرمائی جنہوں نے آپس میں بہت زیادہ مجاہدہ کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا جو کہ اس حدیث شریف میں مذکور ہے:

﴿فَقَالَ اَحَدُهُمْ اَمَّا اَنَا فَاُصَلِّی اللَّیْلَ اَبَدًا وَقَالَ الْاٰخَرُ اَنَا اَصُوْمُ النَّهَارَ اَبَدًا وَّلَا اُفْطِرُ وَقَالَ الْاٰخَرُ اَنَا اَعْتَزِلُ النِّسَآءَ فَلَا اَتَزَوَّجُ اَبَدًا فَجَآءَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِلَیْهِمْ فَقَالَ اَنْتُمُ الَّذِیْنَ قُلْتُمْ کَذَا وَکَذَا مَا وَاللّٰهِ اِنِّیْ لَاَخْشَاکُمْ لِلّٰهِ وَاَتْقَاکُمْ لَهٗ لٰکِنِّیْ اَصُوْمُ وَاُفْطِرُ وَاُصَلِّیْ وَاَرْقُدُ وَاَتَزَوَّجُ النِّسَآءَ فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِیْ فَلَیْسَ مِنِّیْ﴾

(مشکاة المصابیح، ص: ۲۷)

پوری حدیث کا خلاصہ یہ ہے کہ تین صحابہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات کے پاس آکر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کے متعلق معلومات کررہے تھے۔ جب ان کو اس کے متعلق معلومات حاصل ہوئیں تو کہنے لگے کہ ہم کہاں اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا مرتبہ کہاں، آپ تو بخشے بخشائے ہیں اس لیے جب آپ اتنی عبادت کرتے ہیں تو ہمیں تو اور زیادہ عبادت کرنی چاہیے، لہٰذا ان میں سے ایک نے تو یہ فیصلہ کیا کہ بس آج سے میں تو ہمیشہ رات کو نماز پڑھا کروں گا۔ دوسرے نے کہا: میں تو دن بھر روزہ رکھوں گا کبھی بے روزہ نہیں رہوں گا اور تیسرے نے اپنے متعلق یہ فیصلہ کیا کہ میں عورتوں سے الگ رہوں گا اور کبھی بھی نکاح نہیں کروں گا تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس تشریف لائے اور ان سے دریافت فرمایا کہ کیا تم ہی لوگ ہو جنہوں نے اس طرح کی بات کہی ہے سن لو اللہ کی قسم میں تم میں سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا اور تقویٰ اختیار کرنے والا ہوں، لیکن میں روزہ بھی رکھتا ہوں اور بغیر روزے کے بھی رہتا ہوں اور میں نماز بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں اور عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں، بس جو میری سنت سے اعراض کرے وہ مجھ میں سے نہیں ہے۔

ایک دوسری روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں کہ تمہارے جسم کا بھی تم پر حق ہے اور تمہاری بیوی کا بھی تم پر حق ہے:

﴿فَلَا تَفْعَلْ صُمْ وَاَفْطِرْ وَقُمْ وَنَمْ فَاِنَّ لِجَسَدِکَ عَلَیْکَ حَقًّا وَّاِنَّ لِعَیْنِکَ عَلَیْکَ حَقًّا وَّاِنَّ لِزَوْجِکَ عَلَیْکَ حَقًّا﴾

(صحیح البخاری، کتاب النکاح، باب لزوجک علیک حقا)

کہ تمہارے جسم کا بھی تم پر حق ہے اور تمہاری بیوی کا بھی تم پر حق ہے، اس لیے ان کے حقوق کو پورا کرنا بھی عبادت ہے۔

اس لیے مذکورہ تمام تفصیلات سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ اس جسم پر ہمارا خود اپنا اختیار اور کنٹرول (Control) نہیں اور نہ ہی اپنے طور پر ہمیں اس میں کچھ تصرف (تبدیلی) کرنے کا حق حاصل ہے اسی لیے اسلام میں خودکشی حرام قرار دی گئی ہے اور جو ایسا کرتا ہو اس پر احادیث میں سخت وعیدیں وارد ہوئی ہیں۔

اہلِ نظر سے نظر کو ذوقِ نظر اور جگر کو زخمِ جگر مل جاتا ہے

پاتی ہے نظر ذوقِ نظر میری ندا سے
پاتا ہے جگر زخمِ جگر میری نوا سے
او بے خبر و بدگماں! رندوں کی وفا سے
دیوانہ اگر پھرتا ہوں میں تیری بلا سے

اہل اللہ کی تقاریر اور بیانات سے نفع پہنچنا تو یقینی ہے اور اُن کی تاثیر بھی مسلّم ہے لیکن۔ حقیقت یہ ہے کہ اُن کی نظر سے بھی انسان کی زندگی کے حالات بدل جاتے ہیں اور جب کوئی شخص اپنے سینے میں اللہ تعالیٰ کی محبت کا درد وغم رکھتا ہو اور اپنے قلب وجگر کو راہِ خداوندی کے زخموں سے چور چور کیا ہو، تو اُس کی تاثیر دوسروں تک اس طرح پہنچتی ہے۔ جیسے کوئی خوشبو والا کسی محفل میں موجود ہو تو اُس کی خوشبو اہلِ محفل کو خود بخود معطر کر دیتی ہے۔ یا کوئی شخص چراغ لے کر کسی تاریک اور بے نور محفل میں پہنچ جائے، تو اس کے چراغ سے خود بخود وہ محفل روشن اور منور ہو جاتی ہے۔ حضرت والا فرماتے ہیں ؎

جب شمعِ محبت دل میں لیے محفل میں ہو کوئی صاحبِ ضوء
پھر عشقِ خدا کے پروانے خود اُڑ کے وہاں آ جائیں گے
کیوں آہ میں کچھ تاثیر نہیں کیا عشق کا دل میں تیر نہیں
جب نور نہیں خود ہی دل میں منبر پہ وہ کیا برسائیں گے

جو لوگ اس حقیقت سے واقف نہیں ہوتے وہ اللہ والوں سے بدگمان رہتے ہیں اور تنقید و اعتراضات کرتے پھرتے ہیں۔ کاش! ایسے حضرات شرابِ محبتِ خداوندی کو پی کر اس کے نشے کو چکھ لیتے تو وہ اعتراض اور تنقید کی جرأت نہ کرتے۔ سو: اے معترض! اگر تجھے اس شراب کے نشے کو چکھنا نہیں ہے تو مجھے اس میں مست رہنے دے، تنقید کا نشانہ نہ بنا۔ اگر میں اللہ کا دیوانہ ہوں اور اُس کی محبت کا جنون مجھ پر سوار ہے، تو یہ دیوانگی اور فریفتگی میری ایسی غذا ہے جس کے بغیر میری زندگی زندگی نہیں۔ لہٰذا اگر میں دیوانہ پھر رہا ہوں تو تو اس سے پریشان مت ہو۔

اور اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ عرض کرتا ہوں کہ اگر کوئی اس راہِ خداوندی میں اعتراضات اور ملامتوں اور تنقید و تبصرے کا نشانہ مجھے بنانا چاہتا ہے، تو وہ یہ بات سن لے کہ میرے دل کے اندرونی حصے میں اللہ تعالیٰ کی محبت کی آگ اتنی شدید لگی ہوئی ہے کہ اگر ملامت کرنے والے کی ملامت میرے دل کے اردگرد آئے اور اُس کی تنقید و اعتراض قریب آنا چاہے، تو دو حال سے خالی نہیں۔ یا تو دل سے باہر ہی باہر رہے تو اِس کی مجھے کوئی پرواہ نہیں

کیونکہ دل کے باہر رہنے سے وہ دل پر اثر انداز نہ ہو سکے گی یا پھر وہ دل کے اندر آنے کی کوشش کرے، مگر وہاں اللہ کی محبت کی ایسی شدید آگ لگی ہوئی ہے کہ اگر وہ اس میں داخل ہو گی تو بالآخر وہ اُس میں آکر جل کر راکھ ہو جائے گی، تو بہر دو صورت اے ملامت گر مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں رہے گی۔ لہٰذا وہ اہلِ دنیا جو دینداروں اور اللہ کے نیک صالح بندوں پر مختلف قسم کے اعتراضات اور اشکالات اور اُن کی شان میں مختلف نوعیت کے تنقید و تبصرے کرتے ہیں، وہ یہ بات سن لیں کہ اُن کے تنقید و تبصرے اہلِ دل اللہ والوں پر کچھ اثر کرنے والے نہیں ہیں۔

نازونعم کے پروردہ بھی دعاؤں اور سنتوں کے محتاج ہیں

پروردۂ نعمت کو بھی اس راہ جفا سے
اخترؔ تجھے مانوس بنانا ہے دُعا سے

جن لوگوں کی زندگی بڑے عیش وعشرت سے اور نازونعم میں گزری ہوئی ہوتی ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کے دین کے ساتھ وفاداری کا تعلق نہیں رکھتے اور ربّ چاہی کے بجائے جی چاہی پر عمل کرتے ہیں اور اپنی حرام آرزوؤں اور خواہشات کو حکمِ خداوندی کے مقابلے میں ترجیح دیتے ہیں، تو ایسے لوگوں کو بھی اہلِ دل اولیاء اللہ اپنے اخلاقِ کریمانہ کے ذریعے قریب کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اُن کے لیے دل کشادہ رکھتے ہیں۔ ہر قسم کے خیر و بھلائی جو اُن کو پہنچا سکتے ہیں اُس میں کوئی کمی نہیں چھوڑتے۔ اُن کے حق میں ہر خیر و بھلائی کی دعا کرنا اور اس طرح سے اُن کو اپنے قریب کر کے اللہ تعالیٰ کی صحیح بندگی پر لانا یہ اُن کا شیوہ اور عادت ہوا کرتی ہے، جس کی بدولت بڑے بڑے سخت دل کچھ ہی دنوں میں اللہ تعالیٰ کی معرفت و محبت سے آشنا ہو کر اُس کے صحیح بندے بن جاتے ہیں۔

اور یہی وصف جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے اوصاف میں سے بڑا اہم اور نمایاں ہے کہ آپ کی طبیعت میں ایسی رفعت و رحمت اور اُلفت و مودت رکھی گئی تھی کہ دُشمن بھی قریب آ کر یہ محسوس کرنے لگتا تھا کہ جتنی محبت حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مجھ سے ہے کسی اور سے نہیں ہے۔ اس لیے قرآن پاک نے اس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عظیم الشان اخلاق میں بیان فرمایا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر اپنی خصوصی نعمت کے طور پر ذکر کیا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللهِ لِنْتَ لَهُمْ﴾

(سورة ال عمران، اية: ۱۵۹)

ترجمہ: سو خدا ہی کی رحمت کے سبب آپ ان کے ساتھ نرم رہے۔

اس لیے ہم اس بات کا آنکھوں سے مشاہدہ کرتے ہیں کہ اللہ والوں کے یہاں دوستوں اور دُشمنوں میں محبت و شفقت اور نرمی اور مہربانی میں کوئی فرق نہیں کیا جاتا۔ اُن کا سلوک ہر ایک کے ساتھ دوستوں جیسا ہی ہوتا ہے، کوئی کتنا ہی غیر ہو وہ وہاں آ کر ایسا سمجھنے پر مجبور ہوتا ہے کہ یہ میرے ہیں اور میں اِن کا ہوں۔

تیرے عاشق کو لوگوں نے سمجھا ہے کم

سارے عالم کو خاطر میں لائے نہ ہم
جانے کیا پا گئے جانِ عالم سے ہم
صبحِ گلشن نہ ہو کیوں میری شامِ غم
غم ہی میں پاگئے آپ کو بھی ہم
لب ہیں خنداں جگر میں تیرا درد و غم
تیرے عاشق کو لوگوں نے سمجھا ہے کم
میرا مقصود ہر گز نہیں کیف و کم
تیری مرضی پہ سرا میرا تسلیم خم
ہو رہا ہے تیرا درد کیوں بیش و کم
رازدارِ محبت سے پوچھیں گے ہم
تھمتے تھمتے اگر اشک جائیں گے تھم
آتشِ غم میرے دل میں ہوگی نہ کم

مشکل الفاظ کے معانی:۔جانِ عالم: اللہ تعالیٰ۔ خنداں: مسکراتے ہوئے۔ **کیف و کم**: کیفیت اور کمیت۔ **تسلیمِ خم**: جھکا دینا۔ **رازدارِ محبت**: اللہ تعالیٰ کی محبت کا رازدار یعنی مرشد کامل۔ **آتشِ غم**: اللہ تعالیٰ کی محبت کی آگ۔

جانِ عالم کو پانے کے بعد عالم نظروں سے گر جاتا ہے

سارے عالم کو خاطر میں لائے نہ ہم
جانے کیا پاگئے جانِ عالم سے ہم

حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کی حقیقت کو مختلف انداز سے اُمت کو سمجھایا ہے۔ چنانچہ اس بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے مختلف ارشادات منقول ہیں۔ جن میں سے بہت سے ارشادات ہمارے حضرت والا دامت برکاتہم نے اپنی کتاب ''دنیا کی حقیقت'' میں ذکر فرمائے ہیں۔ بہر حال یہ ایک سچی حقیقت ہے کہ جو شخص اس عالم کی حیثیت اور حقیقت سے آگاہ ہو جائے اور اُسے دنیا کی بے ثباتی اور بے وفائی کا اندازہ ہو جائے اور آخرت کے دائمی اور ہمیشہ ہونے کا عقیدہ دل میں راسخ ہو جائے، تو وہ اس دنیا کے ساتھ ویسا ہی سلوک کرے گا جیسا اُس کو حقیقت میں کرنا چاہیے۔

قرآن وحدیث کی تعبیرات سے یہ پتہ چلتا ہے کہ دنیا وقتی اور عارضی نفع اُٹھانے کی جگہ اور محض برتنے اور

استعمال کرنے کی چیز ہے، دل لگانے کی چیز نہیں ہے۔ چنانچہ حضرت والا نے اس شعر میں اسی مضمون کو ذکر فرمایا ہے۔ جس کی تشریح وتوضیح سے پہلے ایک مثال سمجھئے کہ اگر کوئی شخص کسی دسترخوان پر بڑے عمدہ اور مختلف قسم کے متنوع اقسام کے کھانے کھانے میں مشغول ہو اور ماشاء اللہ اس کے دسترخوان پر بہترین قسم کے مرغ وکباب موجود ہوں جن کو کھانے میں وہ خوب مست ہے اور اُسے بڑا لطف آرہا ہے۔ اسی طرح مختلف قسم کے مشروبات بھی اس کے پاس رکھے ہوئے ہوں، تو ایسے آدمی کو چٹنی روٹی یا دال روٹی والی دعوت میں کیا مزہ آئے گا۔ بلکہ وہ اس طرف نظر اُٹھا کر بھی نہیں دیکھے گا۔

یا اسی کو مثلاً دوسری مثال سے اس طرح سمجھئے کہ جو شخص اصلی گلاب اور اصلی عودِ ہندی اور مشک کی خوشبو سونگھنے کا عادی ہو تو پھر وہ کول واٹر، جنت الفردوس وغیرہ مصنوعی سینٹ (seant) سے بنے ہوئے عطورات کو نظر اُٹھا کر بھی نہیں دیکھے گا، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اگر آپ اس کو یہ عطورات سونگھائیں گے تو اُس کے لیے دردِ سر کا باعث ہوگا۔ بس ٹھیک اسی طرح احقر عرض کرتا ہے کہ جو لوگ تلاوت ومناجات، صوم وصلوٰۃ اور ذکر واستغفار اور اللہ کے سامنے رکوع وسجود کی لذت سے آشنا ہو جاتے ہیں اور جن نفوسِ قدسیہ کو اللہ تعالیٰ گناہوں سے بچنے کے درد وغم اُٹھانے اور حرام خوشیوں کو پامال کرنے کی وجہ سے اپنے قربِ خاص کی حلاوت عطا کر دیتے ہیں اور اپنی معرفت ومحبت کی خوشبو سے اُن کے دل ودماغ کو معطر اور اپنی تجلیاتِ خاص سے اُن کے قلب وجگر کو منوّر اور روشن کر دیتے ہیں تو اُن کے لیے اس پوری کائنات کے حسین ودلکش مناظر، اِس کے اونچے منصب اور عہدے اور اس کی حسین اور خوبصورت عورتوں کی شکلیں اور مختلف انواع واقسام کی لذاتِ دنیاویہ کی کوئی حیثیت دل میں باقی نہیں رہتی۔ اور وہ اِن کو کسی طرح خاطر میں نہیں لاسکتے۔

جبکہ درحقیقت احقر نے جو مثالیں پیش کی ہیں وہ تقریب الی الفہم کے لیے ہیں۔ ورنہ اللہ تعالیٰ کے قرب کی لذت کا اس دنیا کی فانی لذتوں کے ساتھ کوئی تقابل ہی نہیں کیا جاسکتا۔ اس لیے کہ اس دنیا کی تمام فانی لذتیں یہاں تک کہ آخرت کی بھی تمام لذتیں اور راحتیں اور دونوں جہان کی خوبصورت اور حسین شکلیں اور اُن کی چمک دمک اللہ سبحانہ تعالیٰ کی عطا ہے اور اس خالقِ حقیقی کی مخلوق ہے۔

تو جن اللہ والوں نے اِن لذات کے خالق ومالک کو اپنے دل میں سمولیا ہو تو ان کی نگاہوں سے لذاتِ عالم کا گر جانا اور بے حیثیت ہو جانا ایک واضح اور کھلا ہوا معاملہ ہے۔ بس اتنی شرط ہے کہ دل کے نہاں خانوں اور مخفی دھڑکنوں میں بھی اُس ذاتِ پاک کے سوا کسی کا گزر بسر نہ ہو۔ جب ایسا ہوگا تب ہی قرب کی حقیقی لذت عطا ہوگی۔ یہی تو راز ہے کلمۂ توحید میں اول ''لا الٰہ'' کو رکھا اور اُس کے ''بعد الا اللہ'' کو رکھا ہے۔ جس کا یہ سبق نکل کر سامنے آتا ہے کہ سارا غیر دل سے اچھی طرح صاف کرلو اور دل سے غیر کے سارے کانٹے نکال کر اِسے اللہ کے سامنے

کے قابل کرلو تو پھر قربِ خداوندی اور معرفتِ الٰہی کا گلستان مختلف قسم کے پھولوں اور پھلوں کے ساتھ دل میں آباد ہو جائے گا۔

نابالغ کو بلوغ کی لذت کی کیا خبر

صاحبو! اگر کوئی شخص بلوغ کی عمر کے متعلق اور اُس کی جملہ حدود اور حالات و کیفیات کے بارے میں پوری خبر رکھتا ہو اور اُس کا اچھی طرح مطالعہ کر رکھا ہو، لیکن ابھی تک وہ خود بالغ نہیں ہوا تو اُسے لذتِ بلوغ کا صحیح ادراک و احساس نہیں ہوسکتا۔ اس لیے اگر اُس کے سامنے بلوغ کے بعد گزرنے والے خاص احوال و امور کا تذکرہ کیا جائے تو وہ اُس پوری تقریر کو یا تو لغو و بے کار سمجھے گا یا مبالغہ آرائی سمجھے گا۔ بس دوستو! حقیقت یہ ہے کہ جو بات حضرت والا فرما رہے ہیں اُس کا بھی معاملہ کچھ اسی طرح ہے۔ جب تک ہم اللہ تعالیٰ کے قرب کو اور اُس کے دردِ محبت کو اپنے سینے میں جگہ نہ دے لیں تو اس کا حقیقی ادراک ممکن ہی نہیں ہے۔

اگر ہم پوری تاریخ میں غور کریں اور اوراق پلٹ کر اُمت کے اولیاء اللہ کے حالات پڑھیں تو اُن کی زندگی میں ہمیں اُن کا یہ وصفِ خاص بہت واضح اور صاف نظر آتا ہے کہ اُن کے دل میں اِس دنیا کی محبت ذرّہ برابر نہ تھی۔ اور انہیں دنیا کے ساتھ بالکل قلبی لگاؤ نہ تھا، بلکہ وہ اِس کائنات کے بڑے سے بڑے عہدوں اور منصبوں اور اِس کی وزارتوں اور حکومتوں کو اُن کی اصل حقیقت کی نظر سے دیکھتے تھے تو اُنہیں سوائے دھوکے کے اور کچھ نظر نہ آتا تھا۔ جیسا کہ قرآن پاک میں حق تعالیٰ نے دنیا کو جگہ جگہ دھوکے کا سامان قرار دیا ہے۔ لہٰذا حضرت والا کا یہ کہنا بالکل بجا اور درست ہے کہ ہم سارے عالم کو خاطر میں نہیں لائے، کیونکہ ہمیں اللہ تعالیٰ نے ایسی عجیب شے عطا فرمائی کہ سارا عالم نظروں سے گر گیا اور وہ چیز یہی ہے کہ دل کے ذرے ذرے میں اللہ تعالیٰ کی محبت رچ گئی اور بس گئی تو دوسری چیزوں کے لیے جگہ کہاں رہی؟ اس لیے کہ دل ایک ہے دو نہیں ہے کہ ایک میں اللہ تعالیٰ کو بسائیں اور دوسرے دل میں دنیا اور دنیا کی چیزیں رکھی جائیں۔

چنانچہ اس پر احقر کو یاد آیا کہ میرے شیخِ اول حضرت مسیح الامت جلال آبادی رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے کہ ایک زبان اور ایک دل ایک اکیلے اللہ کے لیے ہیں۔ یعنی دل میں اُن کی یاد رہے اور زبان اُس کی یاد سے رطب اللسان رہے۔ یہاں تک کہ شریعت کی طرف سے بندے کے ذمے جو باہمی حقوقِ واجبہ ہیں، اُن کی ادائیگی کے وقت بھی دل میں یہی خیال غالب رہے کہ میں اِن کو اس لیے ادا کر رہا ہوں کہ میرے اللہ نے مجھے ان کے ادا کرنے کا حکم دیا ہے۔ تو ایسی صورت میں اِن حقوق کی ادائیگی بھی ذکر اللہ ٹھہری۔ اور یہ شخص عین اُس وقت بھی ذاکر ہے اور یادِ الٰہی میں مشغول ہے۔ کیونکہ یہ اگر اللہ کو یاد نہ رکھتا تو پھر اپنی نفسانی خواہشات کے مطابق زندگی گزارتا۔ اور حقوق کی ادائیگی کی کوئی فکر نہ کرتا۔ لہٰذا اس سے یہ نقطہ بھی سمجھ میں آ گیا کہ شب و روز میں کیے جانے والے

ہمارے بہت سے وہ کام جو بظاہر دنیا کے کام کہلاتے ہیں، مگر اللہ تعالیٰ کے حکم کو سامنے رکھ کر بجالانے سے وہ بھی دین بن جاتے ہیں۔ یہی کمالِ تقویٰ ہے اور یہی وہ احسانی کیفیت ہے جو بندے سے مطلوب ہے۔ اور جس کا ''حدیث جبرئیل'' میں تذکرہ کیا گیا ہے۔ اور اس میں کوئی مبالغہ نہ ہوگا اگر یہ کہہ دیا جائے کہ یہی حاصلِ تصوف اور خلاصۂ اصلاح وتزکیہ ہے۔

رات کی تاریکیوں سے صبح ہوتی ہے عیاں

صبحِ گلشن نہ ہوں کیوں میری شامِ غم
غم ہی میں پاگئے آپ کو بھی ہم

قرآنِ کریم میں اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا﴾
(سورۃ الشرح، آیۃ:۵)

ترجمہ: بے شک موجودہ مشکلات کے ساتھ آسانی ہو۔

اس آیت کے تحت مفسرین لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ایک مشکل اور تکلیف ڈالنے کے بعد دو آسانیاں اور راحتیں عطا فرماتے ہیں۔ اس لیے ہر رات کی تاریکی کے پیچھے اُجالا چھپا ہوا ہوتا ہے۔ اور ہر عُسرِ کے ساتھ یُسْرٌ وابستہ اور جڑی ہوئی ہے۔ بالکل ٹھیک اسی طرح اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے اُٹھائے ہوئے غموں کے پیچھے خوشی چھپی ہوئی ہوتی ہے۔

تو گویا اس شعر میں ہم حضرت والا کے مضمون کو یوں تعبیر کر سکتے ہیں کہ اس شعر میں دکھے دلوں کا مرہم پیش کیا گیا ہے۔ اور بیمار دلوں کی شفاء ذکر کی گئی ہے۔ اور جملہ اہلِ ایمان کے لیے عموماً اور سالکین کے لیے خصوصاً اس کو ذہن میں رکھنا اور ہر وقت مستحضر رکھنا انتہائی ضروری ہے۔ چنانچہ قرآن وحدیث میں مختلف مقامات پر یہ بات مذکور ہے کہ جب بندہ مؤمن اپنی جی چاہی چھوڑ کر رب چاہی پر چلنا شروع کرتا ہے اور اپنی حرام خوشیوں کو اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر چھوڑ دیتا ہے اور نفس کے تقاضوں کو پامال کر کے اپنے کو حکم الٰہی کے قید و بند میں جکڑتا ہے تو پھر اللہ تبارک وتعالیٰ اس کے دل کو ایسا گلشن بنا دیتے ہیں جس میں حق تعالیٰ اپنے عشق ومحبت کے مختلف پھول اُگاتے ہیں۔ اور پھر اُن کی مہک وخوشبو سے وہ پورے عالم کو معطر فرما دیتے ہیں۔ جیسا کہ تائب صاحب نے اسی کو اپنے کلام میں یوں پیش کیا ہے ؎

تم اپنی قید میں لے لو کہ ہم آزاد ہوجائیں
کچھ اپنا درد و غم دے دو کہ ہم دلشاد ہوجائیں

ایک اور شعر میں کہتے ہیں ۔

زندوں کو ہے پیغام جو زنداں میں ہیں اب تک
آزاد جو ہونا ہے تو میدان کھلا ہے

اللہ کے نام پر جان دینا اور اپنے ارمانوں کا خون کرنا یہ حقیقی حیات ہے۔ اور دنیا کے قید و بند اور اُس کے آلام و مصائب اور الجھنوں اور پریشانیوں سے آزادی کا واحد راستہ ہے۔

گو کہ حضرت والا عام طور پر اپنے اشعار میں حسینوں سے نظریں بچا کر دل پر غم اُٹھانا مراد لیتے ہیں۔ مگر ظاہر ہے اس میں تمام ہی گناہوں سے بچنے اور مخلوقات کی ایذاؤں کو سہنے کا غم بھی شامل ہے۔

تلخ مزاج بیوی کا واقعہ

چنانچہ حضرت والا کے وعظ میں ایک اللہ والے بزرگ کا قصہ مذکور ہے۔ جن کا نام غالباً خواجہ ابوالحسن خرقانی رحمہ اللہ تھا۔ اُن کو نہایت تلخ مزاج بیوی ملی تھی۔ اور یہ اُس کی جملہ تلخیوں کو برداشت کیا کرتے تھے۔ اُس کو کچھ جواب نہ دیتے تھے۔ تو ایک مرتبہ اُن کا ایک عقیدت مند اُن سے ملنے کے لیے گھر پر آ گیا۔ اور دل میں یہ تمنا لے کر آیا کہ میں اُن سے جا کر بیعت ہو جاؤں گا۔ بظاہر یہ ایک اتفاقی معاملہ تھا کہ جب وہ ان کے گھر پہنچے تو وہاں خواجہ صاحب موجود نہ تھے۔ تو اندر سے بیوی نے پوچھا کہ کون ہو اور کیسے آئے ہو؟ اس پر آنے والے نے اُن کے سامنے اپنی پوری بات رکھ دی۔ تو اندر سے بیوی نے یہ کہنا شروع کیا کہ تمہیں دھوکا ہو گیا ہے، اور تم کسی غلط جگہ آ گئے ہو، اور یہ کوئی بزرگ نہیں ہے۔ غرض یہ کہ اس نوع کی باتیں کہہ کر اُن کو بڑے غم و صدمے میں مبتلا کر دیا۔ بالآخر وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ افسوس میں اس قدر دور سے کس قدر عقیدت لے کر آیا اور اتنا طویل سفر کیا، مگر میری ساری محنت بے کار چلی گئی۔

اس سوچ و خیال میں وہ وہاں سے واپس ہو گئے۔ جب ذرا ہی دور چلے تو اُن کو ایک شخص شیر پر سوار نظر آیا۔ وہ دیکھتے ہی فوراً چونکے اور قریب ہوئے۔ تو اِن کو معلوم ہوا کہ یہ ہی وہ اللہ والے ہیں جن سے میں ملنے کے لیے آیا ہوں۔ جب انہوں نے اُن کی یہ حالت دیکھی کہ وہ شیر پر سوار ہیں اور سانپ کا کوڑا اُن کے ہاتھ میں ہے۔ تو انہوں نے پوچھا کہ حضرت! آپ کی بیوی بہت تلخ مزاج ہے، یہ کیا معاملہ ہے؟ تو حضرت شاہ ابوالحسن خرقانی نے نے جواب دیا کہ جو اللہ کے لیے بیوی کی تلخ اور کڑوی باتوں اور مخلوق کی طعن و تشنیع کو اپنے اوپر سوار کر لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اُسے اسی طرح شیروں پر سواری دیتے ہیں۔ اور سانپ جیسے زہریلے جانور کو اُن کے تابع کر دیتے ہیں۔ بہت ہی عمدہ بات ایک شاعر نے کہی ہے ۔

دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لیے کچھ کم نہ تھے کرّ و بیاں

احقر کا منشا یہ ہے کہ حضرت والا جو غم اُٹھانے کی بات ارشاد فرماتے ہیں یہ درحقیقت راہِ خداوندی کے ہر نوع کے غموں کو شامل ہے۔ کبھی کسی بڑے کو چھوٹے کی طرف سے اپنے مزاج کے خلاف کوئی ناگوار اور ناموافق بات پیش آ جائے، یا والد و والدہ نے کسی ناموافق بات پر موقع یا بے موقع ڈانٹ دیا ہو اور کچھ تنبیہ کر دی ہو، یا اپنے دوستوں اور خاص متعلقین کی موجودگی میں کسی نے خلافِ حقیقت کوئی الزام لگا دیا ہو، یا کوئی نازیبا حرکت کر دی ہو، جبکہ لوگوں میں بڑی عزت و مقام و مرتبہ تھا اور خانقاہ و تبلیغ میں چلے لگانے کی وجہ سے لوگوں کے درمیان حضرت حضرت کے نام سے مشہور تھا۔ انتقام اور بدلہ لینے کی بھی پوری قدرت موجود تھی۔ مگر وعدۂ الٰہی پر نظر رکھتے ہوئے اور اخلاقِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے پیشِ نظر سب کو میٹھا گھونٹ سمجھ کر پی گیا۔ اور فوراً آنکھوں کے سامنے اپنی حقیقت کھل کر آ گئی کہ میری ابتداء ماءِ مہین ہے اور میری انتہا اور انجام مٹی کا ایک ڈھیر ہے۔ اور حقیقت میں تو میں اُس سے کہیں زیادہ گیا گزرا ہوں۔ جو لوگوں نے میرے بارے میں کہا ہے وہ کچھ بھی نہیں ہے۔ بس اللہ نے ستاری فرمائی ہے کہ میرے سب عیوب لوگوں پر کھولے نہیں ہیں۔

جب تک ایمان پر خاتمہ نہیں ہوتا اُس سے پہلے اپنے ذہن میں اپنا کوئی مقام اور مرتبہ سوچ کر رکھنا بالکل حماقت اور بے کار ہے۔

اولیاء اللہ حلم و تواضع کا پیکر ہوتے ہیں

صاحبو! ایسے ہی مواقع پر انسان کو اپنے اندر کی حقیقت تواضع کا پتا چلتا ہے۔ کیونکہ اگر طبیعت میں عجب و خود پسندی اور تکبر اور بڑائی کا زہر بھرا ہوا ہو تو اپنی شان اور مقام و مرتبے کے خلاف ہونے کی وجہ سے اس قسم کی باتیں برداشت نہیں ہو پاتیں۔ چنانچہ اکابر اولیاء اللہ کے اس نوع کے بے شمار قصے ہیں۔ جن سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ لوگ ایذائے خلق کو کس طرح گوارا کرتے تھے اور مختلف تکالیف اور مصائب کے غم کو کس طرح سہتے تھے۔ اور باوجود لوگوں کے درمیان اُن کے عظیم مقام و مرتبے کے وہ اپنے کو ذرۂ خاک کے برابر بھی نہیں سمجھتے تھے۔

احقر کو یاد آیا کہ حضرت مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم نے جنوبی افریقہ کے جمعیت علماء حال میں ایک مرتبہ علماء کے فرائض منصبی پر تقریر کرتے ہوئے (حضرت شاہ اسماعیل شہید) کا قصہ ذکر فرمایا کہ کسی شخص نے حضرت کو بہت بُری گالی دی، جبکہ وہاں حضرت شاہ صاحب کے مریدین و متعلقین کا ایک بڑا مجمع تھا۔ اُس نے اسی حالت میں شاہ صاحب کے متعلق کہا کہ تم حرامی ہو اور ولدِ زنا ہو اور تمہارے والد کا نکاح نہیں ہوا تھا۔ تو بقول حضرت مفتی تقی عثمانی دامت برکاتہم کہ شاہ صاحب نے نے اسے گالی کی بجائے ایک مسئلہ بنا کر پیش کیا اور فرمایا کہ نہیں بھائی! ایسی بات تو نہیں ہے، بلکہ میرے والد نے تو میری والدہ سے نکاح کیا تھا، اور اُس کے گواہ ابھی تک دلّی میں موجود ہیں۔ اگر تم چاہو تو جا کر تحقیق کر سکتے ہو۔

غور فرمائیے! کہ اتنا سنگین اور خطرناک الزام انسان کی طبیعت میں کس قدر غصہ اور مزاج میں کس قدر جھنجھلاہٹ کا باعث ہوتا ہے اور اس پر جتنا بھی غصہ آ جائے کم ہے۔ پھر مزید برآں یہ کہ انتقام کی پوری قدرت بھی موجود، کیونکہ سب اپنوں کا مجمع تھا۔ مگر یہ اولیاء اللہ، اللہ کی مخلوق پر مجسم شفقت اور سراپا رحمت ہوتے ہیں۔ جو خود اپنی نگاہ میں اپنی حقیقت کچھ نہیں سمجھتے ہیں، بلکہ اُن کی نظر ہر لمحہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر رہتی ہے۔ اُس کی نعمتیں اور اُس کے وعدے اور وعیدیں ہر آن اُن کی نگاہوں کے سامنے اور دل و دماغ میں مستحضر رہتے ہیں۔ اور ایسی چیزیں ان حضرات کے لیے بہت معمولی ہوا کرتی ہیں۔ کیونکہ انہوں نے بُرائی کا بدلا بُرائی سے دینا سیکھا ہی نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ پر عمل کرتے ہوئے ہر بُرائی کا بدلہ بھلائی سے دیتے ہیں۔ اور تکلیف دہ بُری باتوں پر صبر و حلم سے کام لیتے ہیں۔

چنانچہ معارف القرآن، صفحہ: ۳۵۳ پر بحوالہ قرطبی نقل ہے کہ بعض روایت میں ہے کہ صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کو کسی شخص نے گالی دے دی یا بُرا کہا۔ تو آپ نے اُس کے جواب میں فرمایا کہ اگر تم اپنے کلام میں سچے ہو کہ میں مجرم خطاوار اور بُرا ہوں تو اللہ تعالیٰ مجھے معاف فرما دے۔ اور اگر تم نے جھوٹ بولا ہے تو اللہ تعالیٰ تمہیں معاف فرما دیں۔

عفو و درگذر میں اللہ کی نرالی شان

اگر غور سے دیکھیں تو درحقیقت یہ صفت اصل میں حق سبحانہ وتعالیٰ کی ہے۔ چنانچہ مرقاۃ شرح مشکوٰۃ میں یہ روایت ہے کہ:

﴿مَا اَحَدٌ اَصْبَرُ عَلٰی اَذًی یَّسْمَعُهٗ مِنَ اللهِ یَدْعُوْنَ لَهُ الْوَلَدَ ثُمَّ یُعَافِیْهِمْ وَیَرْزُقُهُمْ﴾

(المرقاۃ، ج:۱، ص:۹۷)

اس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ سے زیادہ صبر کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ ایسی تکلیف دہ باتوں پر جن کو وہ سن رہا ہو یہ صرف اللہ کی شانِ رحیمی وکریمی ہے کہ ایسے لوگوں پر جلد عذاب نازل نہیں کرتے ہیں۔ بلکہ اُن کو مہلت دیتے رہتے ہیں کہ جو اللہ کے لیے اولاد تجویز کرنے کی بات کرتے ہیں۔ اور حق تعالیٰ اس لغو و مہمل اور بدترین الزام کو سنتے ہیں مگر پھر بھی فوراً عذاب نازل نہیں کرتے، بلکہ مزید برآں یہ کرتے ہیں کہ اُن کو عافیت و آرام دیتے ہیں۔ اور اُن کو اُن کا رزق دیتے رہتے ہیں۔

مُلا علی قاری رحمہ اللہ اگرچہ ایک محدث کی حیثیت سے مشہور و معروف ہیں مگر وہ بڑے اللہ والے اور صاحبِ دردِ دل، عالمِ ربانی تھے۔ چنانچہ اس حدیث کو نقل کرکے ارشاد فرماتے ہیں:

﴿اُنْظُرْ فَضْلَهٗ وَاِنْعَامَهٗ فِیْ مُعَامَلَتِهٖ مع مَنْ یُّؤْذِیْهِ فَمَا ظَنُّكَ بِمَنْ یَّحْتَمِلُ الْاَذٰی عَمَّنْ یَّعْصِیْهِ وَیَمْتَثِلُ اِرْتِكَابَ طَاعَاتِهٖ وَاجْتِنَابَ مَنَاهِیْهِ وَفِیْهِ اِرْشَادٌ لَّنَا اِلٰی تَحَمُّلِ الْاَذٰی وَعَدَمِ الْمُكَافَاةِ

﴿وَالتَّخَلُّقُ بِاَخْلَاقِ اللهِ تَعَالٰى﴾

(المرقاۃ، کتاب الایمان)

ذرا حق تعالیٰ کے فضل وکرم اور اُس کے انعام واحسان کا معاملہ دیکھو کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی شان میں ایسے جملے کہتا ہے جو کہ اللہ تعالیٰ کو نہایت ناپسندیدہ ہیں، پھر بھی اُسے کھلاتے پلاتے رہتے ہیں۔تو بھلا تمہارا کیا خیال ہے اُس شخص کے سلسلے میں جو اِس خُلق میں اخلاقِ خداوندی سے متصف ہو کہ نافرمانوں کی طرف سے تکالیف کو برداشت کرتا ہو اور حق تعالیٰ کی اطاعت وفرمانبرداری کرتا ہو اور نافرمانی سے بچتا ہو تو اُس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا کیا کچھ خصوصی معاملہ ہوگا۔

ابرار واولیاء کون؟ علامہ عینی رحمہ اللہ کی زبانی

اور پھر اِس میں ہمارے لیے رہنمائی ہے کہ ہم لوگوں کو تکالیف کو برداشت کریں اور انتقام وبدلے کی کارروائی نہ کریں۔اور اخلاقِ الٰہیہ سے متخلق ہوں۔اسی طرح ایک اور مقام پر علامہ عینی ابرار یعنی نیک بندوں کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

﴿هُمُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْذُوْنَ الذَّرَ وَلَا يَرْضَوْنَ الشَّرَّ﴾

(عمدۃ القاری شرح صحیح البخاری، کتاب الایمان، باب المسلم من سلم المسلمون)

کہ ابرار اللہ کے وہ بندے ہیں جو ایک چیونٹی کو بھی تکلیف نہیں دیتے اور خود لوگوں کی تکالیف سہتے رہتے ہیں اور شر سے کبھی بھی راضی نہیں ہوتے۔اور ملا علی قاری رحمہ اللہ نے اسی کو یوں فرمایا ہے جو اوپر کے مضمون سے ملتا جلتا ہے کہ:

﴿قَالَ الْحَسَنُ الْبَصْرِيُّ فِيْ تَفْسِيْرِ الْاَبْرَارِ هُمُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْذُوْنَ الذَّرَّ وَلَا يَرْضَوْنَ الضَّرَّ﴾

(مرقاۃ المصابیح شرح مشکاۃ المصابیح، کتاب الایمان)

چنانچہ میرے شیخ اول حضرت مسیح الامت جلال آبادی رحمہ اللہ کا ایک واقعہ حضرت کی سوانح میں لکھا ہوا ہے کہ ایک مرتبہ مسجد سے بعض متعلقین کے ساتھ مجلس خانہ تشریف لے جارہے تھے کہ سامنے کتے پر نظر پڑی جو نالی میں پانی پی رہا تھا۔نظر پڑتے ہی فوراً وہیں رُک گئے اور ساتھیوں سے فرمایا کہ اگر ہم یہاں سے گزریں گے تو اس کے پانی پینے میں خلل پڑے گا۔اس لیے ذرا راستہ بدل دو تا کہ ہماری وجہ سے اِس کو تکلیف نہ ہو۔

میرے دوستو! غور کرنے کا مقام ہے کہ اہل اللہ کے دلوں میں صرف اپنے مسلمان بھائیوں اور مطلق انسانوں ہی کے لیے نہیں بلکہ جانوروں تک کے لیے بھی کس قدر راحت رسانی کی فکر ہوتی ہے۔اور یہ لوگ اُن کی ایذاء سے بھی کس قدر بچتے ہیں۔اور ایسا کیوں نہ ہو جبکہ اُن کی نظر اس پر ہوتی ہے کہ:

﴿اَلْخَلْقُ عِيَالُ اللهِ فَاَحَبُّ الْخَلْقِ اِلَى اللهِ مَنْ اَحْسَنَ اِلٰى عِيَالِهٖ﴾

(مشکاۃ المصابیح، کتاب الاداب، باب الشفقة والرحمة)

یعنی ساری مخلوق اللہ کا کنبہ ہے۔ اس نسبت پر نظر رکھ کر جب وہ مخلوق کے ساتھ معاملہ کرتے ہیں، تو اُسی میں اُن کو خالق مل جاتا ہے۔ اور یہی خلاصہ ہے نسبت مع اللہ کے حاصل ہونے کا۔ اور یہی دلیلِ ولایت وتقویٰ ہے کہ انسان کی طبیعت میں ''اَلْاِنْقِیَادُ لِاَمْرِ اللہِ وَالشَّفَقَةُ عَلٰی خَلْقِ اللہِ'' یعنی اللہ کے حکم کے سامنے جھک جانے اور مخلوق خداوندی پر دل میں شفقت پیدا ہوجانے کا جذبہ پیدا ہوجائے اور اگر کبھی کبھار اُن سے اس کے خلاف سرزد ہوجائے تو اُنہیں اس وقت تک چین نہیں ملتا جب تک وہ اُس کی معافی تلافی نہیں کر لیتے۔

چنانچہ احقر نے حضرت والا کے ایک وعظ میں حضرت شاہ عبدالغنی پھولپوری رحمہ اللہ کا یہ قصہ سنا کہ کوئی عام آدمی حضرت سے ملاقات وزیارت کے لیے آیا اور کسی بات پر حضرت نے اُس کو تنبیہ کردی اور ڈانٹ ڈپٹ دیا۔ وہ واپس چلا گیا۔ اُس کے چلے جانے کے فوراً بعد حضرت کو یہ خیال آیا کہ نہ وہ میرا شاگرد تھا نہ مرید۔ پھر بھی میں نے اُس کو اس طرح ڈانٹ دیا اور یہ میری طرف سے زیادتی ہوگئی۔ اس لیے مجھے اُس سے معافی مانگنی چاہیے۔ اور یہ سوچ کر اندر اندر سے بے چینی ہونے لگی۔ اور حضرت اسی بے قراری و بے چینی کے عالم میں گھر سے نکل پڑے۔ اور بقول حضرت والا کہ طبیعت پر اس قدر خوفِ قیامت غالب ہوا کہ راستہ بھی پورا یاد نہ رہا اور جنگلوں میں نکلے چلے گئے۔ بالآخر اُس آدمی کے گھر پہنچ کر اُس سے معافی کی درخواست کی۔ جبکہ وہ حضرت کے اس عمل پر شرمندہ ہوا اور بڑے معذرت کے انداز میں کہا کہ حضرت! کوئی بات ہی نہیں پیش آئی تھی، آپ نے یہ تکلیف کیوں اُٹھائی؟ اِدھر دوسری جانب آپ یہ دیکھیں کہ اللہ کی رضا کے لیے اور آخرت کے خوف سے جو بے قراری اور بے چینی ہوئی اور اُس سے معافی مانگی۔ اس کے نتیجہ میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو کیا دولت حاصل ہوئی کہ حضرت شاہ عبدالغنی پھولپوری رحمتہ اللہ علیہ کو اُسی رات میں جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خواب میں زیارت ہوئی۔ اور ایسے عجیب وغریب محبت بھرے انداز میں جس کی حلاوت تاعمر محسوس ہوتی رہی۔

خواب کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت نے دیکھا سمندر میں ایک کشتی ہے جس میں میں سوار ہوں۔ اور میری کشتی سے آگے ذرا فاصلے سے ایک دوسری کشتی ہے جس میں حضرت نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سوار ہیں۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ عبدالغنی کی کشتی کو ہماری کشتی سے جوڑ دو۔ چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت کی کشتی کو اپنی کشتی سے جوڑ دیا۔ اور ایسے ڈھنگ سے جوڑا کہ اُس کے اندر سے ایک کھٹ کی آواز ہوئی، جس پر حضرت شاہ عبدالغنی پھولپوری رحمہ اللہ یہ فرمایا کرتے تھے کہ اُس کھٹ کی آواز کے تصور سے میرے قلب میں آج تک عجیب وغریب حلاوت ولذت محسوس ہوتی ہے۔ حضرت پھولپوری رحمہ اللہ شاعر نہیں تھے، مگر اس خواب کے واقعہ کو ایک شعر میں فرماتے ہیں کہ ؎

مضطرب دل کی تسلی کے لیے
حکم ہوتا ہے ملا دو ناؤ کو

صاحبو! یہ واقعات سنانے سے راقم السطور کا مطلب محض واقعات کا تذکرہ نہیں، بلکہ دراصل یہ بتانا ہے کہ جب انسان اللہ کے لیے مخلوق کا غم اُٹھانے والا بن جاتا ہے اور راہِ خداوندی کی تلخیوں اور کڑواہٹوں کو میٹھا گھونٹ سمجھ کر پینا شروع کر دیتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے یہاں اُس کی محبوبیت اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ اُسے کائنات کی کوئی چیز اچھی نہیں لگتی۔ اور اس طرح شبِ غم سے خوشی کی کرنیں پھوٹنی شروع ہوتی ہیں۔ اور میں بہ قسم عرض کرتا ہوں اور بڑی بصیرت اور شرح صدر سے یہ بات کہتا ہوں کہ اللہ کے راستے کا غم جو کہ انبیاء و اولیاء کی وراثت ہے اس میں حق تعالیٰ نے ایسی مٹھاس اور حلاوت رکھی ہے کہ ایک مردِ مؤمن اُس کو چکھ لینے کے بعد زندگی کے سارے مزوں کو بے مزہ اور ساری خوشیوں کو محض ایک دھوکا تصور کرنے لگتا ہے۔ اور اُسے سوائے اس راہ کے کہیں اور سکون محسوس نہیں ہوگا، خواہ اُس کے پاس کتنے ہی اسباب سکون اور سامانِ عیش جمع ہوں۔

لبِ خنداں دیکھ کر دھوکہ نہ کھایئے

لب ہیں خنداں جگر میں تیرا درد و غم
تیرے عاشق کو لوگوں نے سمجھا ہے کم

دنیا میں بعض لوگوں نے تصوّف کا ایسا خراب اور خشک نقشہ پیش کیا ہے اور اُس کو تشدد اور سختی پر مبنی دین کا ایسا شعبہ ظاہر کیا ہے کہ کئی مسلمان نوجوان اس کے قریب آنا نہیں چاہتے ہیں۔ بلکہ تصوف کے نام سے ہی گھبراتے ہیں۔ گویا کہ اُن کے نزدیک تصوف میں داخلے کا معنی یہ ہوگا کہ ساری دنیا کو چھوڑ کر ایک خشک سا بجھا بجھا راستہ اختیار کر لیا جائے۔ جس میں نہ کوئی ہنسی خوشی کا امکان ہو اور نہ باہمی گفتگو اور آپسی مزاج پرسی کی کوئی صورت روا رکھی جائے۔ نہ ہی اچھی عمدہ غذائیں اور طیباتِ الٰہیہ کے استعمال کا کوئی تصور ہو اور نہ بیوی بچوں کے ساتھ کوئی مزاح و مذاق کی گنجائش۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ یہ سب باتیں اُن لوگوں کے یہاں ہیں جو اندر سے کھوکھلے ہوتے ہیں۔ اور اُن کے سینے اللہ کی معرفت و محبت کے خزانے سے بالکل عاری اور خالی ہوتے ہیں۔ تو اُن کو اپنی ظاہری عظمت و وقار برقرار رکھنے کے لیے بہ تکلف یہ سب صورتیں اختیار کرنی پڑتی ہیں۔ تاکہ لوگوں کے دلوں میں اُن کی بزرگی اور ولایت کا رعب قائم رہے اور لوگ اُن کے اس برتاؤ اور انداز کو دیکھ کر اپنا جیسا ایک عام انسان انہیں تصور نہ کریں۔ چنانچہ احقر نے بعض مقامات پر اِن چیزوں کا مشاہدہ بھی کیا ہے۔ درحقیقت بات یہ ہے کہ آج کے دور کے حالات کا تقاضا یہ ہے کہ ہنسا ہنسا کر تصوف طے کراؤ اور اللہ تعالیٰ کے دین کو ایک خطرناک راستہ بنا کر پیش نہ کرو۔ جس پر چلنے سے لوگ گھٹن اور اُلجھن محسوس کرتے ہوں اور اُس کے نام سے ہی گھبرا جاتے ہوں۔ جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

﴿یَسِّرُوْا وَلَا تُعَسِّرُوْا وَبَشِّرُوْا وَلَا تُنَفِّرُوْا﴾

(صحیح البخاری، کتاب العلم، باب ما کان النبی ﷺ یتخولھم بالموعظۃ)

کہ دین کو لوگوں کے سامنے اس انداز سے پیش کرو کہ جس میں سہولت ہو اور لوگوں کے لیے عمل کی آسان شکلیں سامنے آئیں۔ اور اُن کو دین پر چلنا آسان نظر آئے۔ خلوتوں میں آہ وزاری کیجیے، مگر جلوتوں میں خود بھی مسکرایئے اور دوسروں کو بھی ہنسایئے اور مسکرایئے اور ہنسنے دیجیے۔ اگر جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کا مطالعہ کریں، تو یہ معلوم ہو جائے گا کہ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ مبارکہ یہی تھی۔ جب آپ کسی سے ملتے تو آپ کے رُخِ مبارک پر مسکراہٹ ہوا کرتی تھی۔ یہاں تک کہ روایت میں آتا ہے ایک صحابی فرماتے ہیں کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ مسکراتے ہوئے کسی کو نہیں دیکھا۔

اور عقلی طور پر یہ بات بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے کہ باہمی تعلق اور رابطے کے لیے آسان اور سہل صورت یہی ہے، جس سے افادہ اور استفادہ بڑھ جاتا ہے۔ اس لیے جو لوگ اس کے برخلاف تصوف کو دوسرے انداز سے پیش کر رہے ہیں یہ اُن کی بہت بڑی نادانی اور ناعاقبت اندیشی ہے۔ اور فی الحقیقت سراسر دھوکا ہے۔ بس حضرت والا اس شعر میں یہی بات پیش کر رہے ہیں کہ اگرچہ میں ہونٹوں سے مسکرا رہا ہوں، مگر بحمد اللہ میرے سینے میں اللہ تعالیٰ کی محبت کا درد وغم ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کی طرح موجزن ہے۔

تصوف کی حقیقت اور ہمارے اکابر

تصوف کی حقیقت بس اتنی بات ہے کہ شب و روز میں ایک لمحے کے لیے بھی انسان کا دل اللہ کی یاد سے غافل نہ ہو۔ اور وہ کسی بھی گناہ کا ارتکاب نہ کر رہا ہو۔ اور اگر بشری تقاضے سے ایسا ہو جائے تو اُسے تب تک چین نہ ملے جب تک کہ وہ توبہ نہ کرلے۔ اور اُس کی زندگی کی ہر ادا قرآن وسنت کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہو۔ اور حق تعالیٰ کو ناراض کرنے والے ہر قول وفعل سے اتنا بچتا اور دُور بھاگتا ہو۔ جیسے کوئی انسان بھوکے شیر سے دور بھاگتا ہے۔ اسی کو حضرت والا مختصر لفظوں میں یوں تعبیر فرمایا کرتے ہیں کہ اے مسلمانو! فرائض و واجبات اور سننِ مؤکدہ ادا کرنے کے بعد بس ایک کام کرلو تو ولی اللہ بن جاؤ گے۔ اور وہ کام یہ ہے کہ ''کام نہ کرو'' یعنی گناہ کا کام نہ کرو۔ باقی ہنسی خوشی رہو۔ اللہ کی حرام کی ہوئی چیزوں کے قریب نہ جاؤ اور اُس کی نافرمانیاں ہرگز سرزد نہ ہونے پائے۔

قاسم العلوم والخیرات حضرت مولانا قاسم نانوتوی رحمہ اللہ کے حالات میں لکھا ہے کہ اتنے علوم ومعارف اور کمالاتِ علمیہ اور عملیہ کے حامل ہوتے ہوئے اپنے طلبہ وتلامذہ میں اس غرض سے بے تکلف رہا کرتے تھے کہ یہ لوگ مجھے بہت بڑا اور بزرگ نہ سمجھنے لگیں۔ اور ان کے ذہنوں میں میرے متعلق کوئی بزرگی اور بڑائی کا نقشہ قائم نہ ہو۔ حالانکہ حال یہ تھا کہ ایک ایک رات میں نفلوں میں کھڑے ہو کر پورا قرآن تلاوت کرلیا کرتے تھے۔

چنانچہ حضرت کے حالات میں ایک قصہ لکھا ہے کہ ایک دن کسی شخص کو یہ خیال ہوا کہ میں مسجد میں نماز عشاء کے بعد حضرت مولانا قاسم نانوتوی کے ساتھ ٹھہروں گا اور یہ دیکھوں گا کہ مولانا روزانہ مسجد میں ٹھہر کر عشاء

کے بعد کیا کرتے ہیں۔ کیونکہ حضرت روزانہ ٹھہر جایا کرتے تھے۔ چنانچہ اُس شخص نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ وہ ایک صف میں لپٹ کر مسجد کے کونے میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ حضرت نے سب مصلیوں کے جانے کے بعد مسجد کا دروازہ بند کیا اور حسبِ معمول نفلوں میں کھڑے ہوکر قرآن کریم کی تلاوت شروع کی تو اُس شخص نے بھی نماز کی نیت باندھ کر حضرت کے پیچھے نماز شروع کردی، مگر ظاہر ہے کہ حضرت کی نماز اتنی طویل تھی کہ اُس سے برداشت نہ ہوا اور اُسے درمیان میں نماز کی نیت توڑنی پڑی۔

غرض یہ کہ حضرت مولانا قاسم نانوتوی رحمہ اللہ کے بے شمار عجیب وغریب قسم کے واقعات ہیں جن سے اُن کے مقامِ بلند اور اعلیٰ درجے کے تقویٰ وطہارت کا اندازہ ہوتا ہے، مگر ان سب کے باوجود اس طرح رہنا اخفائے حال کی بنا پر تھا جو کہ اللہ کے مخلص بندوں کا خاص شیوہ اور عادت رہی ہے۔

صاحبو! احقر بڑی صفائی اور وضاحت کے ساتھ عرض کرنا چاہتا ہے کہ آج ہم لوگ ذرا سا سلوک طے کر کے یا دعوت وتبلیغ کی محنت سے کچھ دنوں وابستہ رہ کر یا کسی اور دینی کام میں کسی بھی نوع سے اپنی خدمات پیش کر کے اپنے لیے ایک خاص وجاہت وحیثیت اور عظمت وبزرگی والا مقام اپنے دماغ میں مقرر کر لیتے ہیں اور پھر یہ چاہتے ہیں کہ لوگ ہمارے ساتھ ویسا ہی معاملہ کریں۔ یہ سراسر بے دینی اور مبتدعین اہلِ بدعت کا تصوف اور اُن کا طریقۂ کار ہے۔

ظاہرداری کا نام ولایت نہیں ہے

اب چونکہ یہ لوگ اندر سے بالکل خالی ہوتے ہیں اور دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت کا وہ غم اور درد وکڑھن نہیں ہوتا جو حقیقت میں اللہ کی طرف سے لوگوں کے دلوں میں عزت کا ذریعہ بنتا ہے جس کے نتیجے میں اللہ کے بندے اولیاء اللہ کے ساتھ خصوصی عزت وعظمت کا معاملہ کرتے ہیں۔ تو پھر ان مصنوعی اور جعلی پیروں کو ایسی تدبیریں کرنی پڑتی ہیں کہ اُن کا چہرہ خاص انداز سے بنا ہوا ہو یعنی پیشانی میں بل پڑے ہوئے ہوں۔ ہونٹوں پر بالکل مسکراہٹ نہ ہو۔ مصافحہ بھی پورے ہاتھ کے ساتھ نہ کیا جائے، بلکہ ہاتھوں کے آگے انگلیوں کے کچھ حصے سے سرسری انداز سے مصافحہ کرنے کی عادت بنائی جائے۔ گفتگو کے وقت الفاظ صاف اور واضح نہ ہوں اور وہ خود چل رہے ہوں اور دوسرا شخص اُن کے ساتھ ساتھ کھنچا چلا جا رہا ہو اور چہرہ کی پوری توجہ مخاطب کی طرف نہ ہو اور درمیانِ گفتگو ایک دم ایسے روکھے سوکھے انداز سے رخصت ہو جائیں کہ سامنے والا حیران و پریشان کھڑا کا کھڑا رہ جائے جس کا مقصد اپنا رنگ وروپ بڑے بزرگوں جیسا بنانا ہو اور گویا اپنے دل ودماغ میں خود اپنے متعلق یہ تصور قائم کیے ہوئے ہوں کہ میں بھی لوگوں کے درمیان بہت بڑے ”حضرت جی“ کے مقام پر فائز ہوں اور لوگوں کے درمیان میرا بڑا بلند مرتبہ ہے۔

متبع سنت اولیاء اللہ کے بعض خاص احوال وصفات

میرے بھائیو! احقر نے یہ جتنی باتیں عرض کی ہیں اگر اِن کا واقعی میں بزرگی اور نیکی یا ولایت وتقویٰ سے کوئی تعلق ہوتا تو اِن کو سب سے پہلے اختیار کرنے والے جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہوتے اور یہ سارے اوصاف آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ میں بدرجہ اکمل واتم پائے جانے چاہیے تھے۔ اس لیے کہ ہم سب مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے جو بالکل برحق، بجا اور صحیح ہے کہ بشریت کی کوئی خوبی ایسی نہیں ہے اور صفاتِ کمالِ بشری میں سے کوئی ایسی صفت نہیں ہے جو جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اکمل درجہ میں عطا نہ ہوئی ہو۔ کسی شاعر نے اسی مضمون کو ایک چھوٹے سے شعر میں بڑے عمدہ طریقے سے بیان کیا ہے ؎

نہ تھا معلوم کوزے میں سمندر بھی سماتا ہے
محمد مصطفیٰ ﷺ کو دیکھ کر سب کو یقین آیا

حالانکہ جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات میں مذکورہ باتوں میں سے ایک بھی بات نہیں ملتی۔ چنانچہ سیرت کی کتابوں میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خصائل حمیدہ اور عاداتِ طیبہ کا ذکر کرتے ہوئے حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا نور اللہ مرقدہ تحریر فرماتے ہیں کہ:

ایک مرتبہ کسی سفر میں چند صحابہ نے ایک بکری ذبح کرنے کا ارادہ فرمایا۔ اور اُس کا کام تقسیم فرمالیا۔ ایک نے اپنے ذمے ذبح کرنا لیا اور دوسرے نے کھال نکالنا، کسی نے پکانا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پکانے کے لیے لکڑی اکھٹی کرنا میرے ذمے ہے۔ صحابہ نے عرض کیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم یہ کام ہم خود کرلیں گے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ تو میں بھی سمجھتا ہوں کہ تم لوگ اسے بخوشی کرلو گے لیکن مجھے یہ بات پسند نہیں کہ میں مجمع میں ممتاز رہوں اور اللہ جل جلالہ بھی اس کو پسند نہیں فرماتے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے:

﴿كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَعُوْدُ الْمَرِيْضَ وَيَشْهَدُ الْجَنَازَةَ وَيَرْكَبُ الْحِمَارَ وَيُجِيْبُ دَعْوَةَ الْعَبْدِ﴾

(الشمائل المحمدية للترمذي)

کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مریضوں کی عیادت فرماتے خواہ کسی درجے کا بیمار ہو شریف ہو یا معمولی آدمی ہو۔ حتیٰ کہ غیر مسلموں کی بھی عیادت فرماتے تھے۔ جنازے میں بھی شرکت فرماتے تھے خواہ وہ کسی معمولی آدمی کا ہو یا کسی کا بھی۔ اور گدھے پر سوار ہوتے اور غلاموں کی بھی دعوت قبول فرماتے تھے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کیا ہی مبارک اور پیاری عادتِ شریفہ ہے، جو ایک طویل حدیث میں مذکور ہے۔ جس کا ایک حصہ یہ ہے:

﴿يُعْطِيْ كُلَّ جُلَسَائِهِ بِنَصِيْبِهِ لَا يَحْسَبُ جَلِيْسُهُ أَنَّ أَحَدًا أَكْرَمُ عَلَيْهِ مِنْهُ مَنْ جَالَسَهُ أَوْ فَاوَضَهُ فِيْ

﴿حاجةٍ صابرهُ حتّٰی یکوْنَ هُوَ الْمُنصرفُ عنهُ ومَنْ سَألَهُ حاجةً لَمْ یرُدَّهُ إلاَّ بها أوْ بمیْسُوْرٍ مّنَ الْقوْلِ﴾

(الشمائل المحمدیة للترمذی)

خلاصۂ ترجمہ یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم حاضرینِ مجلس میں سے ہر ایک کا حق ادا فرماتے تھے یعنی بشاشت اور بات چیت میں جتنا اُس کا حق ہوتا اُس کو پورا فرماتے کہ آپ کے پاس ہر بیٹھنے والا یہ سمجھتا تھا کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم میرا سب سے زیادہ اکرام فرما رہے ہیں اور جو آپ کے پاس بیٹھتا یا کسی معاملے میں آپ کی طرف مراجعت کرتا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کے پاس بیٹھے رہتے۔ یہاں تک کہ وہی خود اُٹھنے کی ابتدا کرے اور جو آپ سے کوئی چیز مانگتا، آپ اس کو مرحمت فرماتے یا اگر نہ ہوتی تو نرمی سے سمجھاتے۔ اس سے آگے حضرت عمرو بن العاص کی روایت میں اخلاق نبوی کے متعلق مذکور ہے:

﴿کَانَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یُقْبِلُ بِوَجْهِهٖ وَحَدِیْثِهٖ عَلٰی أَشَرِّ الْقَوْمِ یَتَأَلَّفُهُمْ بِذٰلِکَ﴾

(الشمائل المحمدیة للترمذی)

یعنی قوم کے بدترین شخص کی طرف بھی حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم تالیفِ قلب کے لیے اپنی توجہ اور اپنی خصوصی گفتگو مبذول فرماتے تھے جس کی وجہ سے اس کو اپنی خصوصیت کا احساس ہونے لگتا تھا۔ چنانچہ خود میری طرف بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی توجہات عالیہ اور کلام کا رُخ بہت زیادہ رہتا تھا حتی کہ میں یہ سمجھنے لگا کہ میں قوم کا بہترین شخص ہوں کہ میری طرف حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سب سے زیادہ توجہ فرماتے ہیں۔ اس کے آگے پھر حضرت حسن کی روایت ہے کہ حضرت حسین بن علی فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے ابا جان حضرت علی رضی اللہ عنہ سے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنے اہلِ مجلس کے ساتھ طرزِ عمل پوچھا تو ابا جان نے فرمایا:

﴿کَانَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ دَائِمَ الْبِشْرِ سَهْلَ الْخُلُقِ لَیِّنَ الْجَانِبِ لَیْسَ بِفَظٍّ وَلَا غَلِیْظٍ﴾

(الشمائل المحمدیة للترمذی)

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا کہ: آپ ہمیشہ خندہ پیشانی اور خوش خلقی کے ساتھ پیش آتے یعنی چہرۂ انور پر تبسم اور بشاشت کا اثر نمایاں ہوتا تھا۔ آپ نرم مزاج تھے یعنی کسی بات میں لوگوں کو آپ کی موافقت کی ضرورت ہوتی تو آپ سہولت سے موافق ہوجاتے تھے نہ آپ سخت گو تھے اور نہ سخت دل تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات میں اسی حدیث میں آگے ہے:

﴿یَضْحَکُ مِمَّا یَضْحَکُوْنَ مِنْهُ وَیَتَعَجَّبُ مِمَّا یَتَعَجَّبُوْنَ مِنْهُ﴾

(الشمائل المحمدیة للترمذی)

جس بات سے سب ہنستے تو آپ بھی ان کے ساتھ تبسم فرماتے اور جس بات سے سب کو تعجب ہوتا تو آپ بھی تعجب میں شریک رہتے۔ یہ نہیں کہ سب سے الگ چپ چاپ بیٹھے رہیں، بلکہ معاشرت اور طرزِ کلام میں شرکاءِ مجلس کے شریکِ حال رہتے۔ اجنبی مسافر آدمی کی سخت گفتگو اور بے تمیزی کے سوال پر صبر فرماتے، یعنی گاؤں کے لوگ جا و بیجا

سوالات کرتے، آداب کی رعایت نہ کرتے، ہر قسم کے سوالات کر لیتے تھے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان پر گرفت نہ فرماتے، ان پر صبر کرتے۔ اسی طرح آگے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف میں ہے:

﴿وَلَا يَقْطَعُ عَلٰى اَحَدٍ حَدِيْثَهٗ حَتّٰى يَجُوْزَ فَيَقْطَعُهٗ بِنَهْيٍ اَوْ قِيَامٍ﴾

(الشمائل المحمدية للترمذی)

یعنی کسی کی گفتگو قطع نہ فرماتے تھے کہ دوسرے کی بات کاٹ کر اپنی شروع فرمائیں۔ اگر کوئی حد سے تجاوز کرتا تو اسے روک دیتے تھے یا مجلس سے تشریف لے جاتے تاکہ وہ خود رُک جائے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

﴿قَالَتْ كَانَ بَشَرًا مِّنَ الْبَشَرِ يَفْلِيْ ثَوْبَهٗ وَيَحْلُبُ شَاتَهٗ وَيَخْدُمُ نَفْسَهٗ﴾

(الشمائل المحمدية للترمذی)

مقصود یہ ہے کہ اپنی ضروریات اور گھر کے کاروبار کے کرنے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کچھ گرانی اور تکبر مانع نہ ہوتا تھا۔ اپنے کپڑے میں خود ہی جوں تلاش کر لیتے تھے اور خود ہی بکری کا دودھ نکال لیتے تھے، اور اپنے کام خود ہی کر لیتے تھے۔ (جوں عرق گلاب جیسے بدن و پسینہ میں کہاں ممکن، مقصد کسی اور سے چڑھ آئی ہو یا محض تعلیم اُمت کے لیے اہتمام کرتے تھے۔) اسی طرح آپ کے گفتگو کا خاص وصف یہ تھا:

﴿يَفْتَتِحُ الْكَلَامَ وَيَخْتَتِمُهٗ بِاَشْدَاقِهٖ﴾

(المعجم الکبیر للطبرانی)

یعنی آپ کی تمام گفتگو ابتداء سے انتہا تک منہ بھر کر ہوتی تھی۔ یہ نہیں کہ نوکِ زبان سے کٹتے ہوئے حروف کے ساتھ آدھی بات زبان سے کہی اور آدھی متکلم کے ذہن میں رہی۔ جیسا کہ متکبرین کا شیوہ ہے۔

میرے دوستو! حضرت والا کے شعر میں جو لبوں پر تبسم اور مسکراہٹ کی بات آئی ہے۔ دراصل یہ ایک تعبیر ہے کہ ظاہری طور پر جب لوگ ہنستے ہیں تو اللہ والے بھی اُن کے ساتھ مسکراتے ہیں اور ظاہری اُمور میں عام انسانوں کی طرح وہ بھی سب کام انجام دیتے ہیں لیکن اُن کے سینے میں ایسا تڑپتا ہوا دل ہوتا ہے جو اُن کو ایک لحظہ اور لمحہ بھی خدا کی یاد سے غافل ہونے نہیں دیتا۔ اسی لیے جنابِ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے جو اوصاف اُوپر ذکر کیے گئے ہیں اُن تمام کے ساتھ ساتھ آپ کا حال یہ تھا کہ ایک لمحہ کے لیے اللہ سے غافل نہ رہتے تھے۔ جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

﴿كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَذْكُرُ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ اَحْيَانِهٖ﴾

(صحیح البخاری، کتاب الاذان، باب هل يتتبع المؤذن)

یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہر گھڑی اللہ کو یاد کرتے رہتے تھے۔ بعینہٖ یہ حال اہلِ دل اللہ والوں کا ہوا کرتا ہے۔

میرے دوستو! آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مذکورہ صفات کو سامنے رکھ کر آپ خود فیصلہ کیجیے کہ اگر کوئی انسان بظاہر ہواؤں میں بھی اُڑتا ہو، اور پانی پر چلتا ہو، اور اُس کے اردگرد مخلوق کا ایک جم غفیر جمع رہتا ہو، مگر ان صفات سے

خالی ہو تو کیا وہ بزرگ اور ولی ہوسکتا ہے؟ ہرگز نہیں! کیونکہ سب سے اونچا ولی وہی شخص ہے جو سب سے زیادہ سنتوں کا اتباع کرنے والا ہو۔

جعلی پیروں کے مخصوص احوال اور مصنوعی بزرگی کی ایک جھلک

احقر کو اس صورتِ حال کا انتہائی افسوس اور دُکھ ہوتا ہے، آج ہم عجمیوں میں ایک ایسا طبقہ ہے کہ اُس کے ذہن میں بس یہی بات ہے کہ بزرگ لوگ وہی ہوتے ہیں جن میں اِس طرح کے اوصاف موجود ہوں کہ وہ بولتا نہ ہو، اور جب بولے تو منہ بسوڑ کر پُرتکلف انداز سے بولے اور چہرے پر جلالی کیفیات ہوں، ہنستا بالکل نہ ہو، نہ ہی بالکل دوڑنا بھاگنا کرسکتا ہو کیونکہ آج کل لوگ اس کو بزرگی کے خلاف سمجھتے ہیں، لوگوں سے میل جول نہ رکھتا ہو، سلام میں پہل کرنے کا سوال ہی پیدا نہ ہو، کسی سے خیر خیریت پوچھ لینے کو اپنے وقار کے خلاف سمجھتا ہو بلکہ جواب بھی بڑی آہستگی سے دینے کا مزاج ہو، نہایت روکھا سوکھا انداز اپنائے ہوئے ہو، بات مکمل ہوئے بغیر مخاطب سے درمیانِ گفتگو بلا سلام علیحدہ ہوجاتا ہو، اپنی خاص شان کے ساتھ رہتا ہو، بازاروں میں جاکر اپنے کام کرنا ولایت کے خلاف سمجھتا ہو اور نہ ہی اپنے ذاتی کام کرسکتا ہو، جہاد وغیرہ کے لیے ورزش اور ایکسر سائز (Exercise) کرنے کو بزرگی کی شان کے خلاف جانتا ہو، ہتھیاروں کو مکمل چھوڑ کر صرف ایمان بنانے اور اصلاحِ نفس بنانے کی بات کرتا ہو اور ہتھیار وغیرہ رکھنے کو غلط اور بدمعاش لوگوں کی عادت سمجھتا ہو، کسی کی بیماری میں عیادت اور وفات کے وقت میں تعزیت کو اپنی خاص شان میں خلل کا باعث سمجھتا ہو، خندہ پیشانی کے ساتھ ملنا جلنا معیوب جانتا ہو، اور گویا کہ اپنی ذہن میں بنائی ہوئی مفروضہ شان کے اعتبار سے لوگوں میں اپنے کو مستغرق فی اللہ باور کراتا ہو، ہر مجلس میں اپنی ایک امتیازی اور خصوصی شان رکھتا ہو، اپنے اردگرد لوگوں کے ہجوم کو پسند کرتا ہو، چلتے وقت لوگوں کے گروہ کے ساتھ چلتا ہو، کسی سے پورے طور پر متوجہ ہوکر بات نہ کرے، جلد جلد ادھوری بات کرنے کا مزاج رکھتا ہو۔

ہائے افسوس! اگر کسی کے اندر یہ اوصاف نہ ہوں، لیکن اُس کی پوری زندگی اتباعِ سنت اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے بچنے میں گزری ہو، باقی وہ اپنے کام بھی کررہا ہے، ہنسی خوشی کے ساتھ زندگی گزارتا ہے، لوگوں کی خدمت کرنے اور راحت رسانی کو اپنی سعادت سمجھتا ہے۔ اور دوسرے اوصافِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم میں رچا بسا ہوا ہو، تو انسانوں کا ایک طبقہ اُس کو بزرگ اور ولی ماننے کو تیار نہیں ہوتا جو کہ انتہائی غلط سوچ وفکر ہے اور اس نوع کے خیالات جوگیانہ اور ہندوانہ ذہن کی پیدوار ہیں جن کا اسلامی تصوف سے کوئی دور کا بھی تعلق نہیں ہے۔ اس لیے حضرت والا نے فرمایا ؎

لب ہیں خنداں جگر میں تیرا درد و غم
تیرے عاشق کو لوگوں نے سمجھا ہے کم

احقر نے حضرت والا کے ایک وعظ میں یہ بات سنی کہ ایک مرتبہ بڑے بڑے علماء کے مجمع میں جن میں حضرت مفتی شفیع صاحب، حضرت مفتی محمد حسن امرتسری، علامہ شبیر احمد عثمانی اور مولانا ظفر عثمانی رحمہم اللہ وغیرہ جیسے اکابر موجود تھے، حضرت خواجہ عزیز الحسن مجذوب صاحب بھی اُن کے درمیان تشریف فرما تھے۔تو خواجہ صاحب نے بعض باتوں پر اِن حضرات کو خوب ہنسایا۔ پھر فوراً تھوڑے وقفے کے بعد رُک کر سوال کیا کہ بتاؤ! اس ہنسی کے دوران کون ہے جو اللہ کی یاد سے غافل نہ تھا؟ حضرت مفتی شفیع صاحب فرماتے ہیں کہ سب علماء خاموش رہ گئے۔ حضرت خواجہ صاحب نے فرمایا کہ بحمد اللہ عزیز الحسن اس حال میں بھی اللہ کی یاد سے غافل نہ تھا اور پھر یہ اشعار پڑھے ؎

ہنسی بھی ہے گو لبوں پہ ہر دم
اور آنکھ بھی میری تر نہیں ہے
مگر جو دل رو رہا ہے پیہم
کسی کو اُس کی خبر نہیں ہے

محبتِ الٰہی کی حقیقت مرضیٔ مولیٰ پر ہر لمحہ فدا رہنا ہے

میرا مقصود ہرگز نہیں کیف و کم
تیری مرضی پر سر میرا تسلیم خم

حضرت والا فرماتے ہیں کہ اصل بندگی یہ ہے کہ مؤمن اپنی ہر خواہش اور چاہت کو اللہ کی مرضی پر فدا کردے۔ایک دو واقعات یا دس بیس امور اور سو پچاس و ہزار لاکھ معاملات کی بات نہیں اور نہ یہ کہ زندگی کے چند گنے چنے معاملات اور شعبے صرف مرضی الٰہی کے تحت ہوں اور باقی میں بزعمِ خود انسانیت کام کر رہی ہو اور اپنی من مانی پر عمل ہو رہا ہو یہ کامل عبدیت نہیں ہے اور یہ نسبت الٰہی کا مقصود نہیں ہے، اسلیے حضرت قاری امیر حسن صاحب نے غالباً حضرت شاہ احمد پرتاب گڈھی کا شعر سنایا تھا کہ ؎

نسبت اسی کا نام ہے نسبت اسی کا نام
ان کی گلی سے آپ نکلنے نہ پایئے

یعنی ہر شعبۂ زندگی میں اور زندگی کی ہر سانس میں صرف مرضی الٰہی پر عمل ہو نہ یہ کبھی کہ ذکر و درود کی مجلس قائم ہوتی تو کبھی لایعنی باتوں کی محفل سجائی اور نری شعر و شاعری ہوئی اور کچھ کیفیات طاری ہوئیں اور لوگ وجد میں آ کر جھومنے لگے اور عشاق بن کر نہ معلوم کہاں کہاں کی پروازیں کرنے لگے، لیکن دوسری طرف نہ نماز باجماعت کا خیال نہ پردہ کا اہتمام، وہیں لڑکے لڑکیاں مخلوط بھی محفلوں میں موجود ہیں اور خوب دھوم دھام سے فضول خرچیاں ہو رہی ہیں۔صرف کیفیات میں مست ہیں، مگر اللہ تعالیٰ کی مرضیات کا کوئی خیال و دھیان نہیں، تو یہ کوئی بندگی اور

عبدیت نہیں ہے۔

آج بڑے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ بعض اچھے پڑھے لکھے لوگوں نے کیفیات کو مقصود سمجھ کر انہیں میں اپنے کو مشغول کر رکھا ہے اور اسی کو نیکی و بزرگی کی معراج اور ولایت کی دلیل مانا جاتا ہے۔ جبکہ مجدد تھانوی نور اللہ مرقدہ نے صاف صاف بانگِ دہل اعلان فرمایا ہے کہ اصل دین یہ ہے کہ انسان کی پوری زندگی شریعت وسنت کے مطابق ہو اور ہر قدم پر فکرِ آخرت اور خوفِ خدا دل پر غالب ہو اور اس کی ہر خواہش دین وشریعت کے تابع ہو۔

اس طرح حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہ نے فرمایا ہے کہ آج مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ وہ ہے کہ جو دین کا تعلق صرف مسجدوں کی حد تک سمجھے ہوئے ہے اور ان کی نظر میں دین دار ہونے کا یہ مطلب ہے کہ نماز باجماعت پڑھتا ہو اور اس کی پابندی کرتا ہو اور کبھی ذکر و قرآن کی تلاوت کا معمول ہو اور کبھی حج وعمرہ وغیرہ کو بھی چلا جاتا ہو۔ بس یہ ان کی نگاہ میں کمالِ ایمان ہے اور متقی و ولی ہونے کے لیے اتنی بات بہت ہے اور اس سے آگے اگر ان سے کوئی بات کہی جائے تو وہ سمجھتے ہیں کہ یہ تو دین کے اندر سختی ہے اور مولویوں کی بنائی ہوئی باتیں ہیں اور یہ کوئی اتنی اہم نہیں ہے۔

حالانکہ دوستو! حضرت والا کے شعر کی تشریح کرتے ہوئے احقر عرض کرتا ہے کہ اصل دین یہ ہے کہ زندگی کے ہر شعبہ میں ہر قدم پر اور ہر سانس میں اپنی جملہ خواہشاتِ نفسانیہ امرِ الٰہی پر قربان ہو رہی ہوں۔ خواہ وہ عبادات ہوں یا معاملات ہوں، معاشرت ہوں یا اخلاق ہوں اور جب ان تمام شعبوں میں انسان دین پر چلتا ہے اور ان تمام شعبوں میں اوامرِ الٰہی کو زندہ کرتا ہے اور نواہی سے اپنے کو بچاتا ہے تب جا کر اس کو مؤمن کامل اور مسلم کامل کہا جاسکتا ہے اور اس کے بعد ہی ولایت وتقویٰ کی صفات کا حامل قرار دیا جاسکتا ہے گو کہ ایک گونہ ولایت وتقویٰ اس شخص کو بھی حاصل ہے مگر وہ کامل متقی نہیں ہے۔

جملہ شعبہائے حیات میں اسلام پر عمل لازم ہے

اور حضرت اشعار میں کوئی بات اپنی طرف سے پیش نہیں فرماتے ہیں بلکہ وہ سب قرآن وحدیث سے ماخوذ ہوتا ہے۔ چنانچہ آپ قرآن کریم کی آیات کو دیکھیں تو بعینہٖ یہ مضمون موجود ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا ادۡخُلُوۡا فِی السِّلۡمِ كَآفَّةً ۪ وَلَا تَتَّبِعُوۡا خُطُوٰتِ الشَّیۡطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمۡ عَدُوٌّ مُّبِیۡنٌ﴾

(سورۃ البقرۃ، آیۃ: ۲۰۸)

ترجمہ: اے ایمان والو! اسلام میں پورے پورے داخل ہو (یہ نہیں کہ کچھ یہودیت کی بھی رعایت کرو) اور (ایسے خیالات میں پڑ کر) شیطان کے قدم بقدم مت چلو، واقعی وہ تمہارا کھلا دشمن ہے (کہ ایسی پٹی پڑھا دیتا ہے کہ ظاہر

میں تو سراسر دین معلوم ہو اور فی الحقیقت بالکل دین کے خلاف) اور مت چلو قدموں پر شیطان کے بے شک وہ تمہارا صریح دشمن ہے۔ (معارف القرآن، ج:۱،ص:۴۹۷)

تو قرآن اپنے ماننے والوں سے کہتا ہے کہ مجھے پورے طور پر مانو، یہودیوں کی طرح نہیں کہ کچھ احکام پر تو عمل کرلیا اور ان کو لے لیا اور کچھ کو چھوڑ دیا بلکہ پورے پورے اسلام میں داخل ہو جاؤ۔

اس آیت کی ایک تفسیر تو یہ ہے کہ تم سر سے پاؤں تک اللہ تبارک وتعالیٰ کی بندگی اور غلامی میں داخل ہو جاؤ یعنی تمہارے بدن کے جملہ اعضاء زبان، آنکھ، کان، ناک، شرمگاہ، دل و دماغ سب کے سب دائرۂ اسلام اور طاعت الٰہیہ میں داخل ہونے چاہئیں۔ ایسا نہ ہو کہ ہاتھ پاؤں سے تو احکامِ اسلامیہ بجالا رہے ہو، مگر دل و دماغ اس پر مطمئن نہیں یا دل و دماغ کو اس پر مطمئن ہو، مگر ہاتھ پاؤں اور اعضاء وجوارح کا عمل اس سے باہر ہے۔

اور دوسری تفسیر یہ ہے کہ تم داخل ہو جاؤ مکمل اور پورے اسلام میں یعنی ایسا نہ ہو کہ اسلام کے بعض احکام کو تو قبول کرو، بعض میں پس وپیش ہے اور چونکہ اسلام نام ہے اس مکمل نظامِ حیات کا جو قرآن وسنت میں بیان ہوا ہے۔ خواہ اس کا تعلق عقائد وعبادات سے ہو یا معاملات ومعاشرت سے ہو، حکومت وسیاست سے اس کا تعلق ہو یا تجارت وصنعت وغیرہ سے اسلام کا جو مکمل نظامِ حیات ہے تم سب اس پورے نظام میں داخل ہو جاؤ۔

(معارف القرآن، جلد:۱، صفحہ:۴۹۹)

ایک اہم تنبیہ

آگے حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس میں ان لوگوں کے لیے بڑی تنبیہ ہے جنہوں نے اسلام کو صرف مسجد اور عبادات کے ساتھ مخصوص کر رکھا ہے۔ معاملات اور معاشرت کے احکام کو گویا دین کا جزو ہی نہیں سمجھتے۔ اصطلاحی دینداروں میں یہ غفلت عام ہے۔ حقوق ومعاملات اور خصوصاً حقوقِ معاشرت سے بالکل بے گانہ ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان احکام کو وہ اسلام کے احکام ہی یقین نہیں کرتے نہ ان کے معلوم کرنے یا سیکھنے کا اہتمام کرتے ہیں، نہ ان پر عمل کرنے کا۔ والعیاذ باللہ من ذٰلک۔ کم از کم مختصر رسالہ ''آدابِ معاشرت'' حضرت سیدی حکیم الامت رحمہ اللہ کا ہر مسلمان مرد وعورت کو ضرور پڑھ لینا چاہیے۔

اسی طرح قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿وَلَا تَرْكَنُوْا إِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِنْ دُوْنِ اللهِ مِنْ أَوْلِيَآءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ﴾

(سورة الهود، اٰية:۱۱۳)

ترجمہ: (اے مسلمانو! ان) ظالموں کی طرف (یا جو ان کی مثل ہوں ان کی طرف دلی دوستی سے یا اعمال واحوال میں مشارکت ومشابہت سے) مت جھکو، کبھی تم کو دوزخ کی آگ لگ جاوے اور (اس وقت) خدا کے سوا تمہارا کوئی رفاقت کرنے والا نہ ہو پھر تمہاری حمایت کسی طرف سے بھی نہ ہو کیونکہ رفاقت تو حمایت سے سہل ہے جب رفاقت

کرنے والا بھی کوئی نہیں تو حمایت کرنے والا کون ہوتا۔ (معارف القرآن، جلد:۴، صفحہ:۶۶۹)

قاضی بیضاوی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ ظلم و جور کی ممانعت اور حرمت کے لیے اس آیت میں وہ انتہائی شدت ہے جو زیادہ سے زیادہ تصور میں لائی جاسکتی ہے، کیونکہ ظالموں کے ساتھ دوستی اور گہرے تعلق ہی کو نہیں بلکہ ان کی طرف ادنیٰ درجہ کے میلان اور جھکاؤ اور ان کے پاس بیٹھنے کو بھی اس میں ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ اور فرمایا کہ شکل وصورت اور فیشن اور رہن سہن کے طریقوں میں ان کا اتباع کرنا یہ سب اسی ممانعت میں داخل ہے اور امام اوزاعی نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک کوئی شخص اس عالم سے زیادہ مبغوض نہیں جو اپنے دنیوی مفاد کی خاطر کسی سے ملنے کے لیے جائے۔ اور تفسیر قرطبی میں ہے کہ اس آیت سے معلوم ہوا کہ اہلِ کفر اور اہلِ معصیت اور اہلِ بدعت کی صحبت سے اجتناب اور پرہیز واجب ہے۔ بجز اس کے کہ کسی مجبوری سے ان سے ملنا پڑے۔
(معارف القرآن، جلد:۴، صفحہ:۶۷۳)

حدیث شریف میں جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

﴿لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى يَكُوْنَ هَوَاهُ تَبَعًا لِمَا جِئْتُ بِهٖ﴾
(مشكاة المصابيح، كتاب الايمان، باب الاعتصام بالكتاب والسنة)

ترجمہ: تم میں سے کوئی مؤمن کامل نہیں ہوسکتا جب کہ اس کی خواہشات اس دین کے مطابق نہ ہوجائیں جو میں نے کہا ہے۔

میرے دوستو! یہ سب آیات اور بہت سی احادیث اس مضمون پر واضح دلیل ہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے بندوں سے یہ چاہتے ہیں کہ وہ ہر قدم پر اور زندگی کے ہر شعبہ میں میرے حکم کے سامنے سرِ تسلیم خم کردیں۔ اسی کو کامل بندگی کہتے ہیں اور یہی چیز اللہ رب العزت کی بارگاہ میں مطلوب ہے اور آج کل استعمال ہونے والے تسلی کے کلمات کہ چلو کم سے کم اتنا تو ہے اور انگلش میں (A tleast) جیسے جملوں کا استعمال اسلام میں اس کا کوئی تصور نہیں ہے، اسی لیے جو شخص اپنی ساری فکروں اور معاملات ومسائل کو حق تعالیٰ کے سپرد کرکے پورے طور پر ان کا ہو رہتا ہے، تو پھر حق تعالیٰ پورے طور پر اس کے ہوجاتے ہیں اور اس کی جملہ حاجات دنیویہ اور ہر نوع کے ہموم و غموم کے لیے کافی ہوجاتے ہیں، وگرنہ انسان جب خدا کی طرف پورا رجوع نہ ہوا تو اُسے ایسی فکروں اور الجھنوں میں ڈالا جاتا ہے کہ ان سے اسے نجات نہیں ملتی۔ کچھ افکار سے فراغت ملتی ہے، تو دوسرے فکروں کا دل ودماغ پر ہجوم ہوجاتا ہے۔ اور اسی طرح پوری زندگی پریشانیوں اور الجھنوں کی نذر ہوکر رہ جاتی ہے۔

ایمانی کیفیات کم وبیش ہوتی رہتی ہیں

ہو رہا ہے تیرا درد کیوں بیش و کم
رازدار محبت سے پوچھیں گے ہم

حضرات صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے یہ بات ثابت ہے کہ جب وہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی مجلسِ مبارک میں تشریف فرما ہوتے تھے، تو ان کے دلوں پر ایسی رقت وگریہ اور ایسا خوف وخشیت چھایا رہتا تھا کہ جب وہ وہاں سے چلے جاتے اور بیوی بچوں میں لگتے تو پھر وہ حال نہ رہتا تھا تو اس کی اطلاع صحابہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دی اور بڑے گھبرائے کہ نہ معلوم ایسا کیوں ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب ارشاد فرمایا کہ ساعةً فساعةً یعنی یہ حالت کبھی کسی طرح اور کبھی کسی طرح، اس میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے اور اگر تم اسی حالت پر ہر وقت رہو تو لصافحتکم الملائکة پھر تو فرشتے تم سے مصافحہ کرنے لگیں۔

حضراتِ صحابہ کرام کو جب ایسی باتیں پیش آتی تھیں، تو وہ حضرات حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنے دلوں کا حال پیش کر کے اس کا علاج دریافت کر لیتے تھے، مگر آج جبکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام موجود نہیں ہے، تو اب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے نائبین علماء ربانیین اور مشائخ عظام ہیں ان کی خدمت میں سالکین ومریدین اپنے احوال پیش کر کے اپنا علاج تلاش کرتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ جس طرح سونے چاندی کے ماہرین سے سونے چاندی کی معلومات حاصل کی جاتی ہیں اور جسمانی امراض کے ماہرین سے جسمانی نظامِ صحت میں خلل پڑنے کی صورت میں رجوع کیا جاتا ہے۔ تو اسی طرح جو لوگ محبت خداوندی کے میدان کے کھلاڑی اور اس راہ کو طے کیے ہوئے ہیں ان سے اس راہ کی بات معلوم کی جائے گی اور پھر ان کی ہدایات پر عمل کیا جائے گا۔

آنسو اگر تھم بھی جائیں تب بھی

تھمتے تھمتے اگر اشک جائیں گے تھم
آتش غم میرے دل میں ہوگی نہ کم

احقر دوسرے مقام پر یہ مضمون عرض کر چکا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی راہ میں جو آنسو گرتے ہیں ان آنسوؤں کی اللہ تبارک وتعالیٰ کی نگاہ میں بڑی قدر و قیمت ہے اور درحقیقت یہ آنسو ترجمان دردِ دل ہوتے ہیں۔ جیسا کہ مقولہ ہے کہ ''کل اناء یترشح بمافیه'' جس برتن کے اندر جو ہوتا ہے اس سے وہی ٹپکتا ہے تو جس سینہ میں اللہ کے عشق ومحبت کی آگ لگی ہوئی ہے تو وہ آنسوؤں کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے، لیکن ظاہر ہے کہ ہر وقت روتے رہنے سے انسانی اور بشری حقوق کی ادائیگی ممکن نہیں اور نہ یہ بندوں سے مطلوب ہے اور اگر بعض اولیاء اللہ

سے اس قسم کے واقعات ثابت ہیں تو وہ درحقیقت غلبۂ حال ہے جس کی پیروی اُمت کے لیے نہیں ہے۔ ورنہ اصل انسانوں کے لیے یہ ہے کہ اللہ کی یاد میں تنہائی میں آنسو بہائے اور جلوت میں لوگوں سے مسکرا کر پیش آئے اور اپنے اہل وعیال اور دوست واحباب کے حقوق ادا کرے۔

لیکن یہ ادائیگی حقوق بھی اصل میں اللہ کی محبت کی وجہ سے ہے کہ مجھے خدا تعالیٰ نے حکم دیا ہے، اس لیے ان کی ادائیگی بھی درحقیقت مظہرِ محبتِ خداوندی ہے۔ اسی لیے علماء نے لکھا ہے کہ جتنی عبادات وطاعات ہیں خواہ وہ کسی بھی شعبہ سے تعلق رکھتی ہوں وہ سب کی سب مظاہرِ یادِ الٰہی ہیں اور اللہ کو یاد کرنے کی مختلف شکلیں ہیں، للہٰذا کبھی آنسو بہا کر اللہ کو یاد کیا جاتا ہے، تو کبھی اپنے اہل وعیال میں ہنس کر اور مسکرا کر اور ان کے دل کو بہلا کر اللہ کو یاد کیا جاتا ہے اور اس کو بھی اللہ تعالیٰ اپنی یاد اور اطاعت میں لکھتے ہیں، اسی لیے یہ سارے امور سنت نبویہ ہیں جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہر وقت اللہ کو یاد کیا کرتے تھے۔

اور اللہ کے خوف سے رونا اور آنسو بہانا ہر وقت نہیں رہتا ہے۔ ہاں قلب میں اللہ کی محبت ہر وقت رہنی ضروری ہے اور اللہ تعالیٰ کے خوف وخشیت اور عشق ومحبت کا اصل محل قلب ہی ہے۔ کبھی کیفیت غالب ہوتی ہے اور آنکھیں آنسو بہانا شروع کردیتی ہیں اور کبھی وہ آنسو رُک جاتے ہیں۔ لیکن یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اصل چیز استقامت ہے یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ کی مرضی کے خلاف ایک منٹ ایک سیکنڈ بھی نہ گزرے اور یہی اصل تقویٰ ہے جو زندگی کے آخری سانس تک مطلوب ہے۔ اور مدارِ نجات یہی امر ہے۔ تو اگر ہم بعض اولیاء اللہ کو دیکھیں کہ وہ زیادہ آہ وزاری اور گریہ وبکاء والے نہیں ہیں اور اُن کی آنکھیں بیانوں اور تقریروں میں زیادہ آنسو نہیں گراتی ہیں، تو اس کا یہ مطلب سمجھنا سخت غلطی ہے کہ یہ کامل اللہ والا اور بزرگ نہیں ہے، کیونکہ اگر بزرگ ہوتے تو بات بات میں رویا کرتے، کیونکہ جو آدمی کسی گناہ میں مبتلا نہیں ہے اور ایک لمحہ کے لیے بھی معصیت کے قریب نہیں جاتا ہے اور ہر حال کے اوامر کو بڑی استقامت کے ساتھ پورا کرتا رہتا ہے بس یہی دلیل ہے کہ اس کے سینہ میں وہ خزانۂ محبتِ الٰہی موجود ہے اور اس کا دل خوف وخشیتِ خداوندی سے لبریز ہے، باوجود گناہوں کی ظاہری زیب وزینت اور لذت ومزہ کے وہ ان کے قریب نہیں جاتا۔ ورنہ بعض لوگ ایسے دیکھے گئے کہ رونے میں بہت آگے ہیں اور بڑی جلدی آنسو نکل آتے ہیں، مگر احکام شریعت کے پورے طور پر پابند نہیں ہوتے نہ اوامر کو پوری توجہ اور دھیان سے پابندی کے ساتھ ادا کرتے ہیں اور نہ معاصی سے بچنے کا اس قدر اہتمام کرتے ہیں تو یاد رکھیے کہ یہ لوگ اللہ کے صحیح بندے اور ولی کہلانے کے لائق نہیں ہیں۔

اپنے مالک کو راضی کریں خوب ہم

جس کے دل میں نہیں ہے تیرا درد و غم
ہو کے انسان نہیں جانور سے وہ کم

دوستو سن لو تم کچھ میری داستاں
ایک دن پھر نہیں ہوں گے دنیا میں ہم

خاکِ تن میں نہیں ہے اگر دردِ دل
کوئی قیمت نہیں خاک ہیں صرف ہم

دو جہاں میں کوئی میری قیمت نہیں
ہاں اگر آپ کی ہو نگاہِ کرم

صحبتِ اہلِ دل سے ملا دردِ دل
ورنہ پاتے کہاں سے یہ دولت بھی ہم

دردِ دل سیکھنا ہے اگر دوستو
ساتھ میرے رہو پھر سکھائیں گے ہم

سارے ارض و سما اور شمس و قمر
دیکھ کر پاگئے اپنے خالق کو ہم

دل کے ملنے کی ہے بات کچھ اور ہے
ساتھ رہتے ہیں گو ایک مدت سے ہم

سختیاں شیخ کی ہیں فنا کے لیے
مت سمجھ مت سمجھ ان کو ہرگز ستم

اخترؔ بے نوا کی صدائیں سنو
اپنے مالک کو راضی کریں خوب ہم

مشکل الفاظ کے معانی:۔ **خاکِ تن**: جسم، انسان مراد ہے۔ **ارض وسما**: زمین اور آسمان۔ **شمس وقمر**: سورج اور چاند۔ **خالق**: پیدا کرنے والا۔ **فنا کے لیے**: نفس کو مٹانے کے لیے۔ **ستم**: ظلم۔ **بے نوا**: بے آواز، عاجزی اور انکساری کا اظہار ہے۔

ایمان ومحبت سے خالی انسان حیوان سے کیا گذرا ہے

جس کے دل میں نہیں ہے تیرا درد وغم
ہو کے انسان نہیں جانور سے وہ کم

حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ ارشاد فرماتے ہیں کہ جس کے دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت کا درد وغم نہ ہو، وہ ظاہری شکل وصورت اور اپنے نام کے اعتبار سے بنی نوع انسان میں داخل تو ہے، لیکن حقیقی معنی میں اس پر انسان کا اطلاق درست نہیں ہے، بلکہ جانور اور اس کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ کسی کے ذہن میں یہ بات آئے کہ یہ تعبیر بڑی بھاری اور سخت ہے تو اس سلسلہ میں احقر اتنا عرض کرنا چاہتا ہے کہ درحقیقت آپ اگر غور فرمائیں، تو اس تعبیر کو خود اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے پاک کلام میں اختیار کیا ہے۔ چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿أُولٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ أُولٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُوْنَ﴾

(سورۃ الاعراف، آیۃ: ۱۷۹)

ترجمہ: یہ لوگ (آخرت کی طرف سے بے توجہ ہونے میں) چوپایوں کی طرح ہیں بلکہ (اس حیثیت سے کہ چوپایوں کو آخرت کی طرف متوجہ ہونے کا مکلف تو نہیں بنایا گیا سو ان کا متوجہ نہ ہونا مذموم نہیں اور ان کو تو اس کا حکم ہے پھر بھی بے توجہی کرتے ہیں سو اس اعتبار سے) یہ لوگ (ان چوپایوں سے بھی) زیادہ بے راہ ہیں (کیونکہ) یہ لوگ (باوجود توجہ دلانے کے آخرت سے) غافل ہیں (بخلاف چوپایوں کے) (معارف القرآن، جلد: ۴، صفحہ: ۱۲۴)

قرآن تو مزید ان کے جانوروں سے بھی زیادہ بے راہ ہونے کا فیصلہ کر رہا ہے اور ان سے دیکھنے، سمجھنے اور سننے کی نفی کر رہا ہے، اگرچہ وہ ظاہر کے خلاف ہے۔

اس موقع پر حضرت مفتی شفیع صاحب رحمہ اللہ اپنی تفسیر میں بڑی بصیرت افروز گفتگو فرماتے ہیں۔ احقر اس کا نقل کرنا مناسب سمجھتا ہے تاکہ یہ بات اچھی طرح واضح ہو جائے کہ اللہ کو بھولنے والے لوگ جانوروں کے مانند کیوں قرار دیئے گئے ہیں؟ چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں کہ اس آیت میں ان لوگوں کی سمجھ بوجھ اور بینائی وشنوائی سب چیزوں کی بالکل نفی کی گئی ہے کہ یہ نہ کچھ سمجھتے ہیں نہ کوئی چیز دیکھتے ہیں، نہ کوئی کلام سنتے ہیں۔ حالانکہ واقعہ اور مشاہدہ یہ ہے کہ یہ لوگ نہ پاگل و دیوانے ہوتے ہیں جو کچھ نہ سمجھیں اور نہ نابینا ہوتے ہیں کہ کچھ نہ دیکھیں اور نہ بہرے ہوتے ہیں کہ کچھ نہ سنیں بلکہ مشاہدہ یہ ہے کہ دنیا کے کاموں میں یہ اکثر لوگوں سے زیادہ چالاک اور ہوشیار نظر آتے ہیں۔

مگر بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوقات میں سے ہر مخلوق کے اندر اس کی ضرورت کے مطابق اور اس کے مقصدِ حیات کے مناسب عقل وشعور رکھا ہے، جن چیزوں کو ہم بے عقل اور بے حس و بے شعور کہتے اور سمجھتے

ہیں درحقیقت وہ بھی حس وادراک اور عقل وشعور سے خالی نہیں۔ البتہ یہ چیزیں ان میں اسی مقدار سے ہیں جو مقدار ان کے مقصدِ وجود کو پورا کرنے کے لیے کافی ہو۔ سب سے کم عقل وشعور اور حس جمادات یعنی مٹی اور پتھر وغیرہ میں ہے جن کو نہ کچھ بڑھنا ہے نہ اپنی جگہ سے نکلنا اور چلنا پھرنا ہے۔ وہ اتنی قلیل ہے کہ ان میں حیات کے آثار کا پہچاننا بھی بہت دشوار ہے۔ اس سے کچھ زائد نباتات میں ہیں، جن کے مقصدِ وجود میں بڑھنا، پھلنا، پھولنا داخل ہے۔ اسی کے مناسب عقل وادراک ان کو دے دیا گیا۔

اس کے بعد حیوانات کا نمبر ہے جن کے مقصدِ وجود میں بڑھنا بھی داخل ہے، چلنا پھرنا بھی اور چل پھر کر اپنی غذا حاصل کرنا بھی اور مضر ومہلک چیزوں سے بچنا بھاگنا بھی اور نسل پیدا کرنا بھی، اس لیے ان کو جو عقل وشعور ملا وہ اوروں سے زیادہ ملا، مگر وہ اتنا ہی کہ جس سے وہ اپنے کھانے پینے، پیٹ بھرنے، سونے جاگنے وغیرہ کا انتظام کریں اور دُشمن سے اپنی جان بچالیں۔

سب کے بعد انسان کا نمبر ہے جس کا مقصدِ وجود سب چیزوں سے آگے یہ ہے کہ اپنے پیدا کرنے والے اور پالنے والے کو پہچانے۔ اس کی مرضی کے مطابق چلے۔ اس کی ناپسند چیزوں سے پرہیز کرے، ساری مخلوقات کے حقائق پر نظر ڈالے اور ان سے کام لے اور ہر چیز کے نتائج اور عواقب کو سمجھے، کھرے کھوٹے، اچھے بُرے کو پرکھے۔ بُرائیوں سے بچے، اچھائیوں کو اختیار کرے۔ اسی نوعِ انسانی کی یہ خصوصیت ہے کہ اس کو ترقی کرنے کا بڑا میدان ملا ہے جو دوسری نوع کو حاصل نہیں۔ یہ جب ترقی کرتا ہے تو فرشتوں سے آگے مقام پاتا ہے۔ اس کی یہ خصوصیت ہے کہ اس کے اعمال وافعال پر جزاء وسزا ہے، اس لیے اس کو عقل وشعور تمام انواع مخلوقات سے زیادہ ملا ہے تاکہ وہ عام حیوانات کی سطح سے بلند ہو کر اپنے مقصدِ وجود کے مناسب کاموں میں لگے۔ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی مخصوص عقل وشعور اور اس کی بخشی ہوئی۔ بینائی وشنوائی کو اسی کام میں صرف کرے۔

جب یہ حقیقت سامنے آ گئی تو ایک انسان کا سمجھنا، دیکھنا، سننا، دوسرے جانوروں کے سمجھنے سننے دیکھنے سے مختلف ہونا چاہیے۔ اگر اس نے بھی صرف انہی چیزوں میں اپنی عقل اور بینائی وشنوائی کی طاقتوں کو لگا دیا جن میں دوسرے جانور لگاتے ہیں اور جو کام انسان کے لیے مخصوص تھا کہ ہر چیز کے نتائج وعواقب پر نظر رکھے اور بُرائیوں سے بچے، بھلائیوں کو اختیار کرے۔ اگر ان پر دھیان نہ دیا تو اس کے باوجود عقل رکھنے کے بے عقل اور باوجود بینا ہونے کے نابینا اور باوجود سننے والا ہونے کے بہرا ہی کہا جائے گا، اس لیے قرآن کریم نے دوسری جگہ ایسے لوگوں کو ''صُمٌّ بُکْمٌ عُمْیٌ''، یعنی بہرے، گونگے اندھے فرمایا ہے۔

اس میں اس کا بیان نہیں ہے کہ وہ اپنے کھانے پینے، رہنے سہنے اور سونے جاگنے کی ضروریات کو سمجھتے نہیں یا یہ کہ ان کے متعلق چیزوں کو دیکھتے سنتے نہیں بلکہ خود قرآنِ کریم نے ان لوگوں کے بارے میں ایک جگہ فرمایا ہے کہ:

﴿يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ﴾

(سورۃ الروم، آیۃ:۷)

دنیاوی زندگی کی ظاہری چیزوں اور امور و معاملات سے تو واقفیت رکھتے ہیں لیکن آخرت اور اس کی باتوں سے غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔

اور فرعون اور ہامان اور ان کی قوموں کے بارے میں فرمایا کہ وَ کَانُوْا مُسْتَبْصِرِیْنَ یعنی یہ لوگ بڑے روشن خیال تھے، مگر چونکہ ان کی دانائی و بینائی کا سارا مصرف اتنا ہی رہا جتنا عام جانوروں کا ہوتا ہے کہ اپنے تن بدن کی خدمت کرلیں، روح کی خدمت اور اس کی راحت کے متعلق کچھ نہ سوچا نہ دیکھا۔ اس لیے وہ ان معاشیات اور عمرانیات میں کتنی ہی ترقی کرلیں۔ چاند اور مریخ کو فتح کرلیں، مصنوعی سیاروں سے دنیا کی فضا کو بھر دیں، لیکن یہ سب خدمت تن بدن کے ڈھانچے اور پیٹ ہی کی ہے۔ اس سے آگے نہیں جو روح کے لیے دائمی چین و راحت کا سامان ہے، اس لیے قرآن کریم ان کو اندھا بہرا کہتا ہے اور اس آیت میں ان کے سمجھنے، دیکھنے، سننے کی نفی کرتا ہے۔ مطلب یہ کہ ان لوگوں کو جو سمجھنا چاہیے تھا وہ نہیں سمجھے، جو دیکھنا چاہیے تھا وہ نہیں دیکھا، جو سننا چاہیے تھا وہ نہیں سنا اور جو کچھ سمجھا اور دیکھا اور سنا وہ عام حیوانات کی سطح کی چیزیں تھیں جن میں گدھا، گھوڑا، بیل، بکری سب شریک ہیں۔

اس لیے آیتِ مذکورہ کے آخر میں ان لوگوں کے متعلق فرمایا اُولٰٓئِکَ کَالْاَنْعَامِ کہ یہ لوگ چوپاؤں کی طرح ہیں کہ بدن کے صرف موجود ڈھانچہ کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں۔ روٹی اور پیٹ ان کے فکر کی آخری معراج ہے۔ پھر فرمایا کہ بَلْ هُمْ اَضَلُّ بلکہ یہ لوگ چوپاؤں اور جانوروں سے بھی زیادہ بے وقوف ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ جانور احکامِ شرعیہ کے مکلف نہیں۔ ان کے لیے جزا و سزا نہیں۔ ان کا مقصد اگر صرف موجودہ زندگی اور اس کے ڈھانچہ کی درستی تک رہے تو صحیح ہے، مگر انسان کو تو اپنے اعمال کا حساب دینا ہے اور اس پر جزا و سزا ہونے والی ہے، اس لیے اس کا ان کاموں کو اپنا مقصد سمجھ بیٹھنا جانوروں سے زیادہ بے وقوفی ہے۔ اس کے علاوہ جانور اپنے آقا و مالک کی خدمت پوری بجالاتے ہیں اور نافرمان انسان اپنے ربّ اور مالک کی خدمت میں قصور کرتا ہے، اس لیے وہ زیادہ بے وقوف اور غافل ٹھہرا۔

خود میری داستاں میری زبانی سنو تو بات ہی الگ ہے

دوستو! سن لو تم کچھ میری داستاں
ایک دن پھر نہیں ہوں گے دنیا میں ہم

حضرت والا اپنے مریدین و مستفیدین کو 'دوست' فرماتے ہیں اور یہ حضرت کا خاص اندازِ شفقت ہے کہ اس انداز سے ہم سب کو توجہ دلا رہے ہیں کہ یہ داستان درد و غم جو میری زبان سے رات و دن، صبح و شام جاری ہے، اس کو غور سے سن لو اور اس کی قدر کرلو، ورنہ ایک دن اس نعمت کی قدر نہ کرنے پر افسوس کرو گے اور وہ وہ دن ہوگا کہ

جب ہم اس دنیا سے رخصت ہو کر اپنے وطن اصلی پہنچ گئے ہوں گے۔

اس کے ضمن میں احقر ایک بات عرض کرنا مناسب سمجھتا ہے کہ اگر کسی کے ذہن میں یہ خیال آئے کہ اپنی باتوں کو داستانِ دردوغم اور بڑی قابلِ توجہ سمجھنا کیا یہ درست ہے؟ اور کیا یہ عُجب اور خوش خیالی نہیں ہے؟

تو اس سلسلے میں عرض ہے کہ یہ ایسا ہی ہے جیسے ایک بہت بڑے بزرگ حضرت مولانا شاہ احمد پرتاب گڑھی اپنے متعلق فرماتے ہیں کہ ؎

شکر ہے دردِ دل مستقل ہوگیا
اب تو شاید میرا دل بھی دل ہوگیا

اپنے قلب کے متعلق ارشاد فرما رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اب میرا دل اللہ کی محبت کے درد کے قابل ہو گیا ہے اور میرا دل اب اس قابل ہو گیا ہے کہ اس کو دل کہا جا سکے، تو اس کو عجب وغیرہ سے تعبیر نہ کریں گے، بلکہ اس کی حقیقت حضرت مجدد تھانوی نور اللہ مرقدہ نے ارشاد فرمائی ہے حضرت کے ملفوظات کی ایک کتاب ہے جس کا نام ہے ''انفاسِ عیسیٰ'' اس میں حضرت کا ملفوظ ہے کہ اکمل ہونا الگ ہے اور افضل ہونا الگ ہے۔ اوّل کا تعلق امر محسوس ومشاہد سے ہے۔ جیسے ایک شخص صرف حافظ ہے اور ایک حافظ بھی ہے اور عالم بھی ہے تو حافظ اور عالم شخص اپنے آپ کو صرف حافظ کے مقابلے میں اکمل سمجھ سکتا ہے اور افضل ہونا امر مخفی ہے، کیونکہ اس کے معنی ہیں کہ انسان اللہ کی بارگاہ میں مقرب ہو اور اس کا بڑا مرتبہ اور اونچا درجہ ہو اور یہ بات قبل الموت کسی کو بھی معلوم نہیں ہوسکتی ہے، کیونکہ اس کا تعلق امر مخفی سے ہے جس کا علم سوائے وحی الٰہی کے اور کسی صورت سے نہیں ہوسکتا، اس لیے اپنے کو کسی دوسرے سے اکمل سمجھنا جائز ہے بشرطیکہ دعویٰ نہ ہو، مگر افضل سمجھنا جائز نہیں ہے۔

تو اب اس ملفوظ کی روشنی میں احقر عرض کرتا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے کسی کو کوئی دینی یا دنیوی نعمت عطا کی ہو اور اس کے کسی دوسرے بھائی اور ساتھی کو وہ نعمت نہ ملی ہو تو ایسے موقع پر اگر اس کو یہ احساس ہو اور ہونا بھی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ پر فضل فرمایا ہے کہ مجھے یہ نعمت عطا فرمائی ہے تو یہ امر محمود ومطلوب ہے، کیونکہ بقول حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اگر اس کو اس کا احساس نہ ہوگا تو پھر وہ شکریہ کیسے ادا کرے گا۔

اس لیے حاصل شدہ نعمت کا استحضار ہو اور اس کا احساس ہو، مگر اپنا استحقاق نہ سمجھے اور اس پر غرور وفخر نہ کرے اور اس کی وجہ سے دوسروں کی تحقیر نہ کرے تو پھر یہ استحضار واحساس اس نعمت کی ترقی اور اس میں مزید جلا اور زیادتی کا سبب ہے۔ جیسا کہ حضرت تھانوی نے ایمان پر خاتمہ کا ایک طریقہ یہ ذکر کیا ہے کہ حاصل شدہ نعمت پر اظہارِ شکر کیا جائے۔

تو جب یہ بات واضح ہوگئی تو اس کی روشنی میں احقر یہ عرض کرتا ہے کہ اگر حضرت والا کو اللہ تعالیٰ نے اپنی

محبت کے بیان کا خاص درد بھرا انداز عطا کیا ہے اور حضرت بطورِ شکر یہ کے اس کو بیان کرتے ہیں تو اس کو نہ عُجب کہتے ہیں، نہ یہ مذموم اور بُرا ہے، بلکہ درحقیقت عین مطلوب و مراد خداوندی ہے۔ بس اس کو اپنا کمال اور اپنا استحقاق نہ سمجھا جائے۔ جیسا کہ حضرت کے اشعار میں جگہ جگہ اس کا سبب توفیقِ الٰہی اور فیض صحبت اولیاء اللہ بیان فرمایا ہے۔

خاکِ تن میں دردِ دل نہ ہوتو وہ مثلِ خاکِ ارض ہے

خاکِ تن میں نہیں ہے اگر دردِ دل
کوئی قیمت نہیں خاک ہیں صرف ہم

حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ ارشاد فرماتے ہیں کہ اگر اس جسم خاکی میں ہم نے اللہ تعالیٰ کی معرفت و محبت حاصل نہ کی اور اس کی محبت کا غم ہمارے قلب کو عطا نہ ہوا تو بس پھر یہ انسان مٹی کا ڈھانچہ ہے۔ اس سے آگے اس کی اور کوئی حیثیت نہیں ہے۔ اس کے برخلاف اگر اپنی تمام حرام آرزوؤں اور خواہشوں کو اللہ کی مرضی پر قربان کر کے ہم نے اپنے مولیٰ کو راضی کرلیا، تو حق تعالیٰ اس کی بہت قیمت لگاتے ہیں اور اس قیمت کا اندازہ آپ قرآن کریم کی اس آیت سے لگا سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرما رہے ہیں کہ:

﴿إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْ أَنَّ لَهُم مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا وَمِثْلَهُ مَعَهُ لِيَفْتَدُوا بِهِ مِنْ عَذَابِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ مَا تُقُبِّلَ مِنْهُمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ﴾

(سورۃ المائدۃ، آیت ۳۶)

ترجمہ: جو لوگ کافر ہیں اگر ان کے پاس ہو جو کچھ زمین میں ہے سارا اور اس کے ساتھ اتنا ہی اور ہو، تاکہ بدلہ میں دیں اپنے قیامت کے دن عذاب سے، تو ان سے قبول نہ ہوگا اور ان کے واسطے عذاب دردناک ہے۔

(معارف القرآن، جلد:۳، صفحہ:۱۲۴)

اس آیت سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ایک ایمان والے کے ایمان کی کیا حیثیت ہے کہ اس ایمان کے فقدان اور نہ ہونے کے سبب اگر وہ اس کے بدلے ساری دنیا کے خزانے اور دولت بھی پالے تو اس کو اس عذاب سے نجات نہیں ہوگی۔

تو گویا اللہ کی نگاہ میں ایک مؤمن کے ایمان کی اس قدر قیمت ہے کہ ساری زمین کے خزانے اور دوگنے ہوں تب بھی اس کے برابر نہیں، مگر یاد رکھیے کہ یہ ایمان جس کی قدر اللہ تبارک وتعالیٰ کی نگاہ میں اتنی ہے وہ ایمان ہے جو صحابہ کو عطا ہوا تھا کہ لوگ ان کو بیوقوف اور پاگل اور مجنون اور سفیہ کہتے تھے، مگر ان کو اس کی کوئی پرواہ نہ ہوتی تھی اور بیٹے اپنے باپ کو جنگوں کے موقع پر بوجہِ دینی دُشمنی وبغض فی اللہ کے اس طرح قتل کرتے تھے کہ ذرا اثر ان پر نہ ہوتا تھا اور جن کی ساری خواہشات اللہ کی مرضی پر قربان ہوتی تھیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک اشارے پر اپنا تن من دھن سب کچھ قربان کرنے کے لیے تیار رہتے تھے۔

ناجائز محبتوں کے ساتھ کبھی جائز محبتوں کو بھی چھوڑنا پڑتا ہے

آج حضرت والا کی موجودگی میں اپنی اصلاح کے لیے ایک بات اور مزید آگے بڑھ کر عرض کرتا ہوں کہ اگر غلط اور خطا ہو تو اصلاح ہو جائے اور وہ یہ کہ آپ حضرات سنتے رہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی ایسی محبت ہو کہ اس پر اپنی ساری خواہشات کو قربان کردے، یہ مضمون تو بار بار کانوں میں پڑتا ہی رہتا ہے، مگر اس سے بھی آگے ایک بات ہے کہ ایمان تو وہ ہے کہ حرام خوشیوں کو تو قربان کرنا ہی ہے، مگر اس کے ساتھ ساتھ جہاں جائز خوشیاں بھی حکمِ الٰہی سے ٹکرائیں ان پر بھی نشتر چلادے اور ان کو بھی قربان کردے۔ جیسا کہ صحابہ کے یہاں حرام کا تو تصور ہی نہ تھا، مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم آتے ہی اپنے بیوی بچوں میں رہنے کی جائز خوشی بھی فوراً قربان کر کے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے آگے سرنگوں ہو جاتے تھے اور سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اللہ کی راہ میں نکل پڑتے تھے اور یہ جائز محبتیں بھی ان کے لیے رکاوٹ نہ ہوتی تھیں۔ اپنے بیوی بچوں اور اپنے کاروبار اور اپنی ماؤں بہنوں کی محبت جائز ہے، لیکن قرآن اعلان کرتا ہے کہ اگر ان کی محبت اللہ و رسول کے حکم سے زیادہ محبوب ہوگئی تو بس عذابِ خداوندی کے منتظر رہنا۔

حضرت والا نے ارشاد فرمایا کہ بیوی بچوں کی محبت شدید بھی ہو تو گنجائش ہے، مگر اشد نہیں ہونا چاہیے۔ کاروبار سے محبت ہو، مگر ایسی نہیں کہ جو خدا کی یاد سے غافل کردے۔ یعنی ۴۹ فیصد چیزوں کی محبت ہو لیکن اس پر ۵۱ فیصد اللہ کی محبت غالب رہے اور جب انسان اس طرح زندگی گذارتا ہے کہ ہر قدم پر اللہ کی مرضی کو اپنی مرضی پر غالب رکھتا ہے اور ساری محبتیں حق تعالیٰ کی محبت پر قربان کردیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو ایسا دردبھرا دل عطا فرماتے ہیں کہ جس کے سامنے اس کے لیے دونوں جہان کی نعمتیں بھی کچھ حیثیت نہیں رکھتی اور پھر اسے اللہ تعالیٰ آہ و زاری کی لذتیں عطا فرماتے ہیں اور اس کو عبادات کی حلاوت اور انوار عطا فرماتے ہیں اور اس کے دل میں غیر کی کوئی جگہ باقی نہیں رہتی ہے، بلکہ وہ محبتِ خداوندی سے لبریز ہوتا ہے، کیونکہ اگر غیر کی ذرا بھی جگہ باقی ہو تو پھر اللہ تعالیٰ اس دل میں نہیں آتے ہیں۔ اس غیر کے تصور سے کیا ہوا کوئی عمل نہ اللہ کی رضا و قرب کا ذریعہ بنتا ہے اور نہ اس پر کوئی اجر موجود ہے، بلکہ عذاب اور سزا کی وعید ہے۔

اس لیے اگر کوئی مصنف اپنی تصنیف سے، مقرر اپنی تقریر سے اور مدرس اپنی تدریس سے یہ چاہے کہ لوگ میرے معتقد ہو جائیں اور میرا احترام کریں اور میری ہر طرف شہرت ہو جائے، لوگ مجھے خوب جان جائیں اور خوب ماننے لگیں اور مجھے بزرگ سمجھنے لگیں تو یاد رکھنا کہ یہ تصنیف و تالیف اور تقریر و تدریس نہ صرف یہ کہ باعث اجر و ثواب نہیں ہے بلکہ موجبِ سزا اور باعثِ عتاب و عذاب ہے۔

اسی لیے اللہ کی پوری عظمت اور اس کی بڑائی و بزرگی کی شایانِ شان یہ ہے کہ ہر عمل سے صرف اس کی رضا

مقصود ہو اور اِدھر اُدھر کا کا کوئی التفات نہ ہو اور نہ ہی اس کے غیر کا کوئی خیال ذہن میں آئے، اور اس امر یعنی اخلاص کے مکمل حصول کے لیے انسان صرف اتنا غور وفکر کر لے کہ آج میں جن سے عزت چاہ رہا ہوں، کل کو جب ایک دن نہ میں ہوں گا اور نہ یہ سب ہوں گے تو پھر یہ عزت ساری کہاں جائے گی؟ اور اس سے کیا حاصل ہوگا یہ تو محض ایک خیالی عزت ہوئی کہ صرف لوگوں کا خیال ہے کہ میں بہت اچھا ہوں، بزرگ ہوں۔

اللہ راضی ہو تو عزت نصیب ہوتی ہے

ورنہ حقیقی عزت وہ ہے جو اللہ تبارک وتعالیٰ آسمان سے زمین پر اُتارتا ہے اور اگر بندہ اپنے اعمالِ صالحہ اور تنہائیوں میں کی ہوئی گریہ وزاری کے نتیجہ میں اللہ کی نگاہ میں مقبول بنتا ہے تو سارے عالم میں اللہ تعالیٰ انسانوں کے دلوں میں اس کی محبت ڈال دیتے ہیں۔ مسلم شریف کی حدیث ہے:

﴿عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللهَ اِذَا اَحَبَّ عَبْدًا دَعَا جِبْرَئِیْلَ فَقَالَ اِنِّیْ اُحِبُّ فُلَانًا فَاَحِبَّهُ قَالَ فَیُحِبُّهُ جِبْرَئِیْلُ ثُمَّ یُنَادِیْ فِی السَّمَآءِ فَیَقُوْلُ اِنَّ اللهَ یُحِبُّ فُلَانًا فَاَحِبُّوْهُ فَیُحِبُّهُ اَهْلُ السَّمَآءِ ثُمَّ یُوْضَعُ لَهُ الْقَبُوْلُ فِی الْاَرْضِ وَاِذَا اَبْغَضَ عَبْدًا دَعَا جِبْرَئِیْلَ فَیَقُوْلُ اِنِّیْ اُبْغِضُ فُلَانًا فَاَبْغِضْهُ قَالَ فَیُبْغِضُهُ جِبْرَئِیْلُ ثُمَّ یُنَادِیْ فِیْ اَهْلِ السَّمَآءِ اِنَّ اللهَ یُبْغِضُ فُلَانًا فَاَبْغِضُوْهُ قَالَ فَیُبْغِضُوْنَهُ ثُمَّ تُوْضَعُ لَهُ الْبَغْضَآءُ فِی الْاَرْضِ﴾

(صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ الادب، باب اذا احب اللہ عبدا، ج:۲، ص:۳۳۱)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ارشاد فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی بندہ کو محبوب بناتے ہیں تو حضرت جبرئیل علیہ السلام کو ارشاد فرماتے ہیں کہ ہم فلاں شخص سے محبت رکھتے ہیں، تم بھی اس سے محبت رکھو۔ پس جبرئیل علیہ السلام بھی اس سے محبت کرنے لگتے ہیں۔ پھر جبرئیل علیہ السلام آسمان میں ندا فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فلاں شخص کو چاہتے ہیں تم سب اس سے محبت رکھو۔ آسمان والے بھی اس سے محبت کرنے لگتے ہیں۔ پھر اہلِ زمین میں اس شخص کی مقبولیت رکھ دی جاتی ہے اور جب اللہ تعالیٰ کو کسی شخص سے بغض ہوتا ہے تو اسی ترتیب مذکور سے اہلِ زمین کے قلوب تک اس کی مبغوضیت آجاتی ہے۔ روایت کیا ہے اس کو مسلم نے۔

فائدہ: تو درحقیقت اس حدیث کو یہاں ذکر کرنے کا منشا یہ ہے کہ دراصل انسان کو چاہیے کہ رات ودن صرف ایک اللہ کی رضا کی فکر میں لگا رہے اور بس یہی دھن اور دھیان رہے کہ میرے کسی عمل سے اللہ تعالیٰ ناراض نہ ہو جائے اور کوئی کام مجھ سے اللہ کو ناراض کرنے والا نہ ہو جائے، اس صورت میں اوپر ذکر کیا ہوا وعدہ مکمل طور پر وجود میں آتا ہے۔ اس کے علاوہ مخلوق کی پرواہ کو دل سے بالکل باہر کر دے نہ ان کی مدح وذم کی پرواہ ہو اور نہ ان سے نفع وضرر کا خیال ہو اور نہ ان کی ملامت اور طعن وتشنیع کا ڈر ہو تو پھر یہ باقی رہنے والی محبت نصیب ہوتی ہے۔

غور فرمائیں کہ حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہ نے کبھی ساؤتھ افریقہ نہ دیکھا تھا اور نہ وہاں گئے تھے، مگر آج گھر گھر یعنی تقریباً ہر دیندار مسلم گھرانے میں حضرت تھانوی کی کوئی نہ کوئی کتاب آپ کو ضرور مل جائے گی اور دنیا بھر میں مختلف خانقاہوں اور مدارس میں وعظوں اور تقریروں میں حکیم الامت کا نام اور ان کے ارشادات کس طرح ذکر ہو رہے ہیں اور یہی حال حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا رحمہ اللہ کا ہے کہ پوری دنیا میں کیا کچھ ان کی عزت ہے کہ قرآن کریم کے بعد سب سے زیادہ چھپنے والی کتاب ''فضائلِ اعمال''۔

تو معلوم یہ ہوا کہ حقیقی عزت کا معاملہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور اس کا نظام اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ ہے کہ وہ آسمانوں سے زمین کی طرف آتی ہے۔ زمین سے آسمانوں کی طرف نہیں جاتی ہے۔ یعنی اصل یہ ہے کہ انسان اس کی فکر کرے کہ اس کی تنہائیاں اور اس کی محفلیں سب یکساں ہو جائیں اور اس کی خلوتیں اس کی جلوتوں سے زیادہ خدا ترسی میں گذرے اس کا مصداق نہ ہو ؎

بہت آساں ہے مجلس میں معاذ اللہ کہہ دینا
بڑا مشکل ہے خلوت میں گل گلگوں سے بچ رہنا

کہ جلوتوں میں تو بہت لاحول پڑھی جا رہی ہو اور بہت استغفر اللہ و معاذ اللہ کہا جا رہا ہو اور خلوتوں میں ہر قسم کی نافرمانی اور عیاشی میں مبتلا ہو۔ یہ درحقیقت نفاق کی وجہ سے ہوتا ہے اور یہ منافق کی حالت ہوتی ہے۔ جیسا کہ قرآن میں مذکور ہے کہ جب وہ مسلمانوں سے ملتے ہیں تو ان کی حالت الگ ہوتی ہے اور جب وہ تنہائیوں میں ہوتے ہیں، تو ان کے حالات الگ ہوتے ہیں۔

مقبولینِ بارگاہِ حق کی پہچان

اور جب انسان تنہائیوں میں خدا سے زیادہ ڈرنے والا ہوتا ہے تو پھر وہ اللہ کا محبوب ہوتا ہے اور اس کے بعد پھر اہلِ زمین میں اس کی محبت ڈالی جاتی ہے۔ جیسا کہ اوپر مذکور ہوا ہے اور اس حدیث سے حضرت مجدد تھانوی نور اللہ مرقدہ نے ایک عجیب وغریب نکتہ نکالا ہے۔ فرماتے ہیں پر کہ'' علامتِ مقبول و غیر مقبول'' اس حدیث میں اولیاء کی غیر اولیاء سے ایک شناخت مذکورہ ہے۔ اس علامت سے طلبِ شیخ میں کام لینا چاہیے و نیز غیر مقبول سے احتراز لازم سمجھنا چاہیے۔ حاصل اس کا یہ ہے کہ بلا کسی سبب وتعلق ونفع یا ضرر دنیوی کے اکثر خلائق کا کسی کی طرف میلان قلبی اور گمان نیک ہونا علامت ہے اس شخص کے محبوب ومقبول ہونے کی۔ اسی طرح بلا کسی لوث ونفع وضرر ظاہری کے اکثر لوگوں کا کسی سے نفرت کرنا اور اس کو اچھا نہ سمجھنا علامت ہے غیر مقبول عند اللہ ہونے کی اور جو صداقت یا عداوت کسی احسان یا رشتہ داری یا نقصان اور ناموافق حالات سے ہو اس کا اعتبار نہیں ہے۔ اور یاد رہے کہ جن لوگوں کی طینت میں خبث وفساد غالب ہے ان کا ادراک بھی غیر معتبر ہے۔ (التکشف، صفحہ: ۲۶۸)

چنانچہ ہمارے اکابر علمائے کرام اور بزرگانِ دین رحمہم اللہ اپنے آپ کو اپنے خیال میں کچھ نہ سمجھتے تھے، مگر اس تواضع کے سبب عنداللہ مقبول ومحبوب تھے مذکورہ نشانی ان پر پوری پوری صادق آتی ہے کہ بس لوگ ان کے ایسے دیوانے ہوتے تھے اور ایسی محبت لوگوں کے دلوں میں ان سے قائم تھی کہ اپنی جان و مال ان پر لٹانے کے لیے تیار رہتے تھے۔ یہ درحقیقت وہی چیز ہے کہ جو بظاہر عالم بالا میں اللہ تعالیٰ اور فرشتوں میں قبولیت کا مظہر ہے۔ اس قسم کے واقعات حضرت نانوتوی وحضرت گنگوہی اور حضرت حاجی صاحب اور خود تھانوی رحمہ اللہ کے بہت ہیں جن پر مستقل کتابیں تصنیف ہوسکتی ہیں۔

جبکہ تصویر کا دوسرا رُخ ہمارا حال عام طور پر یہ ہے کہ جس نے جماعت میں دو چار چلّے لگا لیے یا جس نے کسی اللہ والے کے پاس چند دن خانقاہ میں گذار لیے اور کچھ دو چار کتابیں تصنیف کر دیں اور چند بیانات اور وعظ و تقریر کر دیے تو اب وہ یہ سوچنے لگتا ہے اور اس کو یہ فکر لگ جاتی ہے کہ جلد سے جلد میرے بزرگ اور حضرت جی ہونے کا اعلان ہونا چاہیے اور کب لوگ مجھے بحیثیت شیخ و پیر تسلیم کرنا شروع کریں گے اور کیوں لوگ میری طرف رجوع نہیں ہو رہے ہیں؟ حالانکہ میرے اندر یہ خوبی ہے اور وہ خوبی ہے؟ آخر کب لوگ مجھے اپنی نگاہوں میں مقام دیں گے اور مجھے مخدوم ومکرم اور محترم و معظم سمجھنا شروع کریں گے اور پھر اس کے نتیجہ میں دوسروں سے حسد وبغض کی بیماری میں مبتلا ہوتا ہے اور ناز وغرور اور فخر وکبر میں پڑ کر اپنے سارے اعمال کو ضائع کر ڈالتا ہے اور احقر بہت وضاحت سے اس موقع پر یہ عرض کرنا چاہتا ہے کہ درحقیقت یہ خواص اور علماء اور خدامِ دین کا انتہائی خطرناک اور بھیانک فتنہ ہے اور دل کی ایسی مہلک بیماری ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے ساری عمر کی خدمت دین عنداللہ رائیگاں اور بے کار رہے، اسی لیے ملا علی قاری نے بھی شرح مرقاۃ میں فرمایا ہے کہ:

﴿وَقَدْ قَالَتِ السَّادَةُ الصُّوْفِيَةُ رَحِمَهُمُ اللهُ إِنَّ اٰخِرَ مَا يَخْرُجُ مِنْ رَأْسِ الصِّدِّيْقِيْنَ مَحَبَّةُ الْجَاهِ﴾

(المرقاة، كتاب الرقاق)

کہ اللہ والوں کے دلوں سے سب سے آخر میں نکلنے والی بیماری حب جاہ (عہدہ ومنصب کی محبت) ہے۔

صاحبو! کیا یہ حقیقت نہیں کہ جب ہماری آج 'کل' میں تبدیل ہوگی تو نہ ہمارے نام باقی رہیں گے نہ نشان باقی رہیں گے اور کیا یہ روزمرّہ کا مشاہدہ نہیں ہے کہ بڑے مضبوط محلوں میں رہنے والے، بڑی بڑی عمریں پانے والے اور بڑی دولتوں اور حکومتوں والے بھی آج کیسے افسانوں میں ڈھلے ہوئے ہیں۔ اگر آپ کو اس پر یقین نہیں آتا ہے تو آیئے ہم اپنی نگاہوں کے سامنے موت کی آغوش میں جانے والوں کی قبریں کھودیں اور ذرا یہ دیکھیں کہ سوائے مٹی کے ڈھیر کے وہاں کچھ ہے۔ حضرت والا کا شعر ہے کہ ؎

آہ جب دنیا سے کوئی آخرت کو جائے ہے
بس اکیلا جائے ہے اور سب دھرا رہ جائے ہے

آخرت کا سفر اکیلے اور تنہا کرنا ہے

تو آخر جب ہماری حقیقت یہ ہے تو پھر اس دنیا میں جیتے جی صرف اللہ کی محبت وعظمت کا نعرہ لگاؤ اور اس کی بزرگی وتقدس کے گیت گاؤ اور کبھی کبھی اپنی زبان سے دل کے استحضار کے ساتھ کہا کرو کہ یا اللہ! عزت تیرے لیے ہے، تجھے جچتی سجتی ہے۔ بزرگی تیری شان ہے اور ہر نوع کا تقدس و پاکی صرف تیرے لیے ہے۔ عظمت و شہرت کی مستحق بس تیری ذات ہے۔ بقاء وحیات درحقیقت تیری صفت ہے۔ ہم مخلوق سے ان چیزوں کو چاہ کر کیا کریں گے جو کچھ تو اپنے خزانہ سے ہمیں عطا کردے تو یہ تیرا احسان اور کرم ہے۔ اور تو نے اپنی مخلوقات میں جو ہمیں شرفِ انسانیت بخشا ہے یہ تیری بڑی نعمت ہے۔ پھر اس پر مزید احسان فرمایا کہ مسلمان بنایا ہے اور حضرت نبی پاک محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت میں سے بنایا، یہ تیری بے شمار نعمتیں ہیں۔

کلمۂ توحید کا اہم سبق

اگر انسان اپنی حقیقت پر غور کیا کرے کہ میرا امبداء کیا ہے؟ اور میرا معاد کیا ہے؟ میں کہاں سے آیا ہوں؟ اور کہاں لوٹ کر جاؤں گا؟ تو پھر اپنی شہرت وعظمت اور اپنے مقام وعزت کے بتوں کو اپنے دل سے بڑی جلد نکال کر باہر کردے گا اور بس جب یہ مکمل طور پر دل سے رخصت ہوجائیں گے تو پھر اس دل کے مہمان اللہ تبارک وتعالیٰ ہوں گے اور اللہ تعالیٰ اپنی پوری تجلیات کے ساتھ اس دل میں آجائیں گے، اسی لیے کلمۂ توحید میں "لَا اِلٰہَ" کو "اِلَّا اللہ" پر مقدم رکھا گیا ہے کہ پہلے سارا غیر نکل جائے گا تو پھر اللہ ملے گا۔

اس پر حضرت والا کا ایک واقعہ ہے کہ کسی فوجی افسر نے حضرت سے پوچھا کہ میرا "اِلَّا اللہ" کیسے مضبوط ہوگا؟ تو حضرت والا نے فرمایا کہ اپنی "لَا اِلٰہَ" کو مضبوط کرلو تو الا اللہ مضبوط ہوجائے گی۔ حضرت کا شعر ہے ؎

لا الٰہ ہے مقدم کلمۂ توحید میں
غیرحق جب جائے ہے تب دل میں حق آجائے ہے

اور حب جاہ کی شکل میں جب غیر اللہ دل میں موجود ہو تو اللہ نہیں ملتا ہے۔ اس پر بھی حضرت والا کا دوسرا شعر ہے ؎

کیسے سمجھ لوں پاگیا وہ جام معرفت
رکھتا ہے خود کو جو بھی نمایاں کیے ہوئے

اس مذکورہ گفتگو سے آپ یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہ ساری دنیوی عزتیں اور لوگوں کی نگاہوں میں بڑائی اور شہرت کی چاہت یہ سب خواب وخیال ہے اور محض خیالی عزتیں ہیں جن کا نفس الامر (حقیقت) سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ جیسا کہ ایک شاعر نے بڑے ہی پیارے انداز سے اس مضمون کو اپنے اشعار میں پرویا ہے کہ ؎

ایک ہی کام سب کو کرنا ہے یعنی جینا ہے اور مرنا ہے

رہ گیا عز و جاہ کا جھگڑا یہ تخیل کا پیٹ بھرنا ہے
اب رہی بحث رنج و راحت کی یہ فقط وقت کا گذرنا ہے
مقصدِ زندگی ہے طاعتِ حق نہ کہ فکرِ جہاں میں پڑنا ہے

عزت تو وہ ہے کہ جو اللہ تعالیٰ عطا فرماتے ہیں جو پائیدار ہوتی ہے اور جس کی بنیاد پر انسان کو سرخروئی سعادت مندی نصیب ہوتی ہے اور جس کی بنیاد پر عنداللہ اس کے لیے نعمتوں کے فیصلے ہوتے ہیں اور جنت کی نعمتیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس کا مقدر بنتی ہیں ورنہ خود لوگوں میں اپنے مقام وشہرت کا خیال یہ محض خیالی چیز ہے اور شاعر کہتا ہے کہ جہاں تک دنیا کی رنج وراحت اور خوشی وغمی کی باتیں ہیں، تو یہ تو وقت کے گذرنے کے ساتھ ساتھ ختم ہوجاتی ہیں۔

ایک وہ انسان ہے کہ جس کی آج بڑی شان وشوکت سے گذری ہے اور ایک وہ ہے کہ جس کی آج پریشانیوں اور مصائب میں گذری ہے لیکن جب ان کی یہ آج، کل میں بدلتی ہے تو پھر عیش وعشرت والا اور تنگی و پریشانی والا سب برابر ہوتے ہیں اور دونوں کے درمیان فرق کرنا ممکن نہیں ہوتا ہے، اس لیے جس دن دونوں کے جنازے ترتیب سے رکھے ہوں تو ان میں کوئی فرق نہیں کرسکتا ہے۔ ایک خوشحال ڈاکٹر اور لویر(Lawe) اور بادشاہ ووزیر کا جنازہ ہو اور دوسری طرف کسی فقیر ومسکین اور کسی یتیم و بے کس و بے بس انسان کا جنازہ ہو، دونوں کو دیکھو اور دونوں کی شکلوں پر بغور نظر ڈالو، لیکن کون عیش وعشرت میں تھا اور کون فقر وفاقہ کی مصیبت میں تھا، اس کا کوئی پتہ نہیں چل سکتا ہے اور نہ ہی دونوں مین کوئی فرق ہوسکتا ہے۔

مگر افسوس کہ انسان اس وقتی خوشی وعیش کے لیے اپنی قیمتی زندگی کے ان قیمتی لمحات کو ضائع کرتا ہے کہ جن کی بدولت اگر وہ چاہتا تو آخرت کی دائمی اور ابدی نعمتوں کو حاصل کرتا اور ہمیشہ کے ایسے چین وسکون کا سودا کرتا کہ جس کے ملنے کے بعد پھر بے چینی اور بے سکونی کا تصور بھی نہیں ہے اور تکلیف و پریشانی اور دُکھ درد اور فکر وغم کا کوئی امکان ہی نہیں ہے۔ بس جب انسان اپنے پیشِ نظر صرف اپنے محبوب حقیقی اللہ تعالیٰ کی رضا کو رکھ کر چلتا ہے اور غیر اللہ سے ہر قسم کے نفع وضرر کا التفات بھی نہیں رکھتا تو یہ انسان محض خاک اور مٹی کا ایک ڈھیر نہیں ہوتا بلکہ پھر اسے بارگاہِ الٰہی میں وہ مقام عطا ہوتا ہے کہ فرشتوں کو اس پر رشک آنے لگتا ہے اور یہ فرشتوں سے آگے بڑھ جاتا ہے۔
حضرت مجدد تھانوی نور اللہ مرقدہ فرماتے ہیں کہ خواص بشر خواص ملائکہ سے اور عوام بشر عام ملائکہ سے افضل ہیں۔ چنانچہ شرح عقائد، صفحہ: ۱۷۶ پر ہے کہ **وَرُسُلُ الْبَشَرِ اَفْضَلُ مِنْ رُسُلِ الْمَلاَئِکَةِ وَرُسُلُ الْمَلاَئِکَةِ اَفْضَلُ مِنْ عَامَّةِ الْبَشَرِ وَعَامَّةُ الْبَشَرِ اَفْضَلُ مِنْ عَامَّةِ الْمَلاَئِکَةِ** اور اگر ایسا نہ ہوتو پھر حضرت فرماتے ہیں کہ بس ہم خاک اور مٹی کا ایک ڈھیر ہیں اور اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں ہماری کوئی قیمت نہیں ہے، بلکہ جانور اور جانوروں سے بھی بدتر اور گئے گذرے ہیں۔

حق تعالیٰ کی نظر کرم ہی سے قیمت وحیثیت ہے

دو جہاں میں کوئی میری قیمت نہیں
ہاں اگر آپ کی ہو نگاہ کرم

حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ نے اس شعر میں جس سوچ اور فکر کو پیش کیا ہے۔ یہ وہ سوچ ہے کہ جو تمام انبیاء واولیاء حضرات صحابہ وتابعین غرضیکہ جملہ اسلاف اُمت کی وراثت ہے اور اللہ تبارک وتعالیٰ کو یہ بات بہت ہی پسند ہے کہ انسان اپنی نگاہ میں اپنی قیمت نہ لگائے اور اپنے کو بے قیمت سمجھے تو اللہ تبارک وتعالیٰ اس کی بڑی اونچی قیمت لگاتے ہیں اور لوگوں میں بھی اللہ تعالیٰ اس کی قیمت وحیثیت کو بڑھادیتے ہیں۔ اور اس پر خصوصی کرم کا معاملہ فرماتے ہیں اور اس کو عزت ومرتبہ عطا فرماتے ہیں۔

اس مضمون کو حضرت نبی کریم علیہ الصلاۃ والسلام نے قسم کے ساتھ مؤکد کرکے فرمایا ہے کہ اللہ کے لیے جو تواضع اختیار کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کو سربلندی عطا فرماتے ہیں۔ اور یہ عقلی طور پر بھی بالکل درست ہے کہ خود انسان اگر اپنے ذہن میں اپنی قیمت لگالے تو یہ ایسے ہی ہے جیسے کسی عورت کو زیور سے آراستہ کیا گیا تھا اور بڑے عمدہ کپڑے اور ساری چیزیں بہت اچھی تھیں، تو عورتوں نے اس کی تعریف شروع کی کہ تم بہت اچھی معلوم ہوتی ہو شوہر کو بڑی پسند آؤ گی اور بہت تعریف کی تو اس نے کہا کہ اگر میں اپنے شوہر کی نگاہوں میں بھاگئی اور پسند آگئی تو تمہاری ساری تعریفیں ٹھیک ہیں ورنہ سب بے کار ہے۔

تو ٹھیک بالکل اسی طرح انسان کو خود کیا معلوم ہے کہ میرا کوئی عمل بارگاہ الٰہی میں قبول ہے یا نہیں اور اللہ تبارک وتعالیٰ مجھ پر نظرِ کرم فرمائیں گے یا نہیں اور کیا میں بخشا جاؤں گا یا نہیں؟ اور میرا شمار سعادتمندوں میں سے ہو یا اہلِ شقاوت میں سے؟ یہ سب کچھ ہماری نظروں سے اوجھل اور مخفی ہے تو پھر اپنی قیمت لگانا تو عقلی طور پر بھی بڑی نادانی ہے۔

اب رہ گئی یہ بات کہ جب ہم نے اعمال کیے ہیں، نماز پڑھی ہے، روزے رکھے ہیں اور دوسرے بہت سے خیر کے کام کیے ہیں، تو آخران کی قیمت تو ہوگی، اس لیے اپنی قیمت لگانے کو کیسے عقلی طور پر خلاف عقل کہہ سکتے ہیں تو اولاً تو یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ آخران اعمال کی توفیق کس نے دی ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ توفیق بھی تو اللہ تعالیٰ ہی نے دی ہے، اس لیے حضراتِ علماء نے لکھا ہے کہ جو نیکی ہوجائے اسے اپنی عقل وفہم اور سمجھ کا نتیجہ یا اپنا ذاتی کمال نہ سمجھے بلکہ تصور کرے کہ شکر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ سے فلاں خیر کا کام کروادیا اور اس کے ہونے کو محض بلا استحقاق فضلِ خداوندی سمجھے اور یہی حقیقت بھی ہے۔ حتیٰ کہ کسی کارِ خیر کی سوچ اور خیال تک بھی اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم ہی کا اثر ہوتا ہے تو جب بات یوں ہے تو پھر اپنی کسی نیکی کی اپنے طور پر کیسے قیمت لگائی جاسکتی ہے۔

اور دوسری بات یہ ہے کہ اس کی کیا ضمانت اور گارنٹی ہے کہ وہ عمل جتنے اخلاص اور صدقِ دل سے اللہ کی عظمت کے شایانِ شان ہونا چاہیے تھا وہ ویسا ہوا کہ وہ قبول ہو سکے یا ویسا نہ ہو سکا۔

ظاہر ہے کہ اس کا دعویٰ کسی انسان کے لیے جائز ہی نہیں، کیونکہ جب یہ امر ہماری نگاہوں سے مخفی ہے، تو پھر اس کو سوچنا بھی ممکن نہیں ہے۔ ہاں! بس اللہ تعالیٰ سے اُمید قائم کی جاسکتی ہے اور یہ اُمید لازم بھی ہے کیونکہ کہ مومن کی شان ہی یہی ہے کہ خوفِ عدم قبول بھی رہے اور اُمید قبولیت بھی قائم رہے اور اسی کا نام ایمان ہے جیسا کہ فرمایا گیا ہے کہ اَلْاِیْمَانُ بَیْنَ الْخَوْفِ وَالرَّجَآءِ۔

الغرض اس تمام تفصیل کا منشا حضرت والا کے اس شعر کی تشریح ہے کہ یااللہ! میری تو کوئی قیمت اور حیثیت دونوں جہاں میں نہیں ہے۔ بس آپ کی نگاہِ کرم اگر ہو جائے گی تو نجات کی اُمید ہے ورنہ اپنے اعمال کی تو کیا حقیقت ہے اور اس شعر میں ہمارے لیے اور حضرت کے متعلقین اور دوستوں کے لیے بڑی نصیحت ہے کہ اپنی پوری جوانی مجاہدات کی نذر کردینے کے باوجود حضرت والا ایسی بات فرما رہے ہیں اور اپنے اعمال سے اس طرح صرفِ نظر کرکے فضلِ الٰہی پر نظر رکھے ہوئے ہیں اور اپنے مجاہدات وعبادات سے نظر ہٹا کر اللہ کے فضل و کرم کے اُمیدوار ہو رہے ہیں، پھر آخر ہم سب کے لیے ناز اور فخر کی کیا گنجائش رہ جاتی ہے اور اپنے اعمال پر نظر کرکے ان پر اعتماد کے کیا معنی رہتے ہیں۔

دردِ دل بس اہلِ دل سے ہی ملتا ہے

صحبتِ اہلِ دل سے ملا دردِ دل
ورنہ پاتے کہاں سے یہ دولت بھی ہم
دردِ دل سیکھنا ہے اگر دوستو
ساتھ میرے رہو پھر سکھائیں گے ہم

اوّل شعر میں حضرت والا یہ ارشاد فرما رہے ہیں کہ بحمداللہ میں نے اپنے بزرگوں کی صحبت میں رہ کر اللہ تعالیٰ کی محبت پائی ہے اور دردِ دل کی نعمت حاصل کی ہے اور اگر یہ صحبت اولیاء اور خدمت اہل اللہ نہ ملی ہوتی تو ہمیں اس دولت کی ہوا بھی نہ لگتی۔ چنانچہ حضرت والا کی زندگی کے ابتدائی تین سال پندرہ سال کی عمر سے اٹھارہ سال تک حضرت شاہ احمد پرتا بگڈھی کی خدمت میں گذرے اور پھر سولہ برس حضرت پھولپوری رحمۃ اللہ کی خدمت میں اور پھر باقی زندگی تا حیات حضرت شاہ ہردوئی رحمہ اللہ سے اصلاحی تعلق میں گذاری ہے۔

حضرت شاہ ہردوئی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت پھولپوری رحمہ اللہ کے انتقال کے بعد ہمارے حضرت والا کو خط لکھا: ’’حضرت شاہ پھولپوری کی خدمت از اوّل تا آخر مبارک ہو۔‘‘ اور حضرت شاہ ہردوئی رحمۃ اللہ نے یہ بھی

فرمایا کہ جیسی خدمت اپنے بزرگوں کی اور شیخ کی پہلے زمانہ میں لوگ کیا کرتے تھے، وہ (حضرت مولانا شاہ) حکیم اختر نے اس دور میں کر کے دکھائی ہے۔

اور پھر اگلے شعر میں حضرت والا ارشاد فرما رہے ہیں کہ ایک تو اللہ تعالیٰ کی محبت کی باتیں سننا اور بولنا اور لکھنا پڑھنا ہے اور ان باتوں پر کتابیں تصنیف و تالیف کرنا ہے اور ایک اللہ کی محبت کو سیکھنا ہے، دونوں میں فرق ہے۔ جیسا کہ حضرت شاہ ہردوئی رحمۃ اللہ فرمایا کرتے تھے کہ آج دنیا کی چیزوں کے سلسلہ میں تو ہم نے پڑھنے اور سیکھنے کو الگ الگ کر رکھا ہے یعنی صرف پڑھنے پر اکتفا نہیں کرتے، بلکہ اس کو پھر کسی ماہر کے پاس وقت دے کر سیکھتے ہیں، مگر دین کے سلسلہ میں صرف پڑھنے کو کافی سمجھ لیا ہے اور سیکھنا چھوڑ دیا ہے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ جیسے دنیا کی چیزیں سیکھے بغیر نہیں آتی ہیں۔ اسی طرح دین کی باتیں بھی سیکھے بغیر نہیں آتی ہیں، ڈاکٹری ہے یا سلائی، وبنائی وکڑھائی کا کام ہو یا اور دوسرے بے شمار کام ہوں۔ صرف کتابیں ہی دیکھ کر کوئی نہیں کرتا ہے بلکہ پہلے کسی ماہر کے پاس چند دن رہ کر ان کاموں کو سیکھتا ہے، اس لیے کسی ڈاکٹر کو گورنمنٹ کی طرف سے اس کے پیشے کو باقاعدہ شروع کرنے کی اجازت نہیں ملتی ہے جب تک وہ کسی ماہر کے پاس رہ کر پریکٹس نہ کر چکا ہو اور نہ اسے باقاعدہ سرٹیفکیٹ (Certificate) دیا جاتا ہے۔

اصلاح وتزکیہ کے باب میں ہمارے اکابر کا حال اور موجودہ افسوسناک صورتحال

اسی لیے ہمارے اکابر دار العلوم دیوبند کے یہاں شروع میں باقاعدہ یہ معمول رہا ہے کہ دورۂ حدیث شریف سے فراغت کے بعد طلبہ کو کسی بزرگ صاحب سلسلہ سے ضرور تعلق قائم کرنا ہے، ورنہ اس کے بغیر ان کو سندِ فضیلت نہیں دی جاتی تھی۔ گویا کہ یہ بھی نصاب کا ایک حصہ تھا۔ جیسا کہ حضرت محمد مفتی تقی عثمانی دامت برکاتہم نے اپنی کتاب ''دینی مدارس کا نصابِ تعلیم'' میں اس موضوع پر لکھا ہے کہ بہت ہی کم کوئی مدرس ایسا ہوتا تھا کہ جس کا تعلق اصلاحی اس وقت کے کسی ولی اللہ سے نہ ہو۔ چنانچہ اس کا اثر یہ تھا کہ اس مادرِ علمی دار العلوم دیوبند کے استاذ و طالب علم کا تو کیا کہنا، دربان بھی اس دور میں صاحبِ نسبت ولی اللہ ہوا کرتا تھا۔ جیسا کہ دار العلوم کی تاریخ میں لکھا ہوا ہے اور یہی چیز اس دینی درسگاہ کا وصف امتیازی تھا، اس لیے میں آج آپ کے سامنے یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ آپ اپنے بزرگوں میں سے بلا استثناء کسی کا نام لیجیے کہ جس نے کوئی اہم خدمت اور دینی کارنامہ انجام دیا ہو اور وہ کسی بزرگ سے وابستہ نہ ہو جتنے بزرگان دیوبند وسہارنپور گزرے ہیں تقریباً سب کا معاملہ یہی تھا۔

میں بہت حیران ہوتا ہوں کہ آج کل کی نئی نسل کے جوان جنہوں نے دین کی الف ب (''الف، ب'') کو جان لیا۔ یہ بزرگوں سے ملنے، ان سے اصلاحی تعلق اور بیعت کو شخصیت پرستی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے کام کے علاوہ دوسرا کام کہنے لگتے ہیں اور طرح طرح کے شکوک وشبہات اور اعتراضات واشکالات کا شکار ہو جاتے ہیں۔

حتیٰ کہ بعضوں کی زبانوں سے ایسے زہریلے جملے بھی سنے گئے کہ اب خانقاہوں اور ملفوظات کا وقت نہیں رہا۔ اب میدانوں میں نکلنے کا وقت ہے۔

حالانکہ اپنے وقت کا مجدد الملۃ اور حکیم الامۃ جن کو بالاتفاق اپنے ملک کے تمام طبقوں میں حکیم الامت تسلیم کیا گیا ہے یعنی حضرت مولانا شرف علی تھانوی نور اللہ مرقدہ ارشاد فرماتے ہیں: جیسا کہ پہلے بھی گذرا ہے کہ میں تو اہل اللہ کی صحبت اور ان سے تعلق کو اس دور میں فرضِ عین کہتا ہوں اور یہ فتویٰ دیتا ہوں یعنی وہ صرف از روئے تقویٰ نہیں بلکہ حضرت از روئے فتویٰ ومسئلہ یہ بات فرمارہے ہیں کہ یہ فرض ہے اور فرمارہے ہیں کہ ایمان کی سلامتی کا یہ واحد ذریعہ ہے۔ حتیٰ کہ حضرت مولانا الیاس صاحب رحمہ اللہ کے ملفوظات میں ہے کہ ارشاد فرمایا کہ طریقۂ تبلیغ میرا ہو اور طریقۂ تعلیم حضرت تھانوی کا ہو اور حضرت تھانوی کے طریق میں خاص چیز بزرگوں سے اصلاحی تعلق اور رابطہ ہے۔ اور اس پر دلائل تو ماقبل میں گذر چکے ہیں لیکن مزید ایک بات کہتا ہوں کہ پوری تاریخ گواہ ہے کہ اللہ والوں سے تعلق رکھنے والا کبھی محروم نہیں رہتا ہے۔ بشرطیکہ تعلق صحیح طور پر اخلاص واتباع کے ساتھ ہو ویسے اس مسئلہ پر احقر دوسری نظموں کے ضمن میں مفصل کلام پیش کرچکا ہے۔

حضرت مولانا جلال الدین رومی رحمہ اللہ کوئی چھوٹے موٹے آدمی نہ تھے اور علمِ ظاہر کے لحاظ سے اس درجہ کے عالم تھے کہ حضرت علامہ ابن عابدین شامی رحمہ اللہ ان کے شاگرد تھے اور بڑے بڑے وقت کے علماء ان کے شاگرد ہوتے تھے، مگر جب اللہ کی محبت حاصل کرنے کی تڑپ پیدا ہوئی اور ایک خلا دل میں محسوس ہوا تو پھر اس پیاس کو بجھانے کے لیے شیخ کی تلاش شروع کردی اور بالآخر شمس تبریزی سے ملے، اس پر آپ دیکھئے کہ کیا سے کیا ہوگئے ؎

مولوی ہرگز نہ شد مولائے روم
تا غلام شمس تبریزی نہ شد

یہ مولوی جلال الدین جب تک کہ شمس تبریزی کا غلام نہیں ہوا، تب تک مولائے روم نہیں بنا۔ اسی کو خود فرماتے ہیں کہ ؎

قال را بگذار مرد حال شو
پیشِ مردِ کاملے پامالِ شو

کہ ذرا کچھ قال کو چھوڑ کر صاحبِ حال بن جا اور کسی اللہ والے متبعِ سنت وشریعت ولی کامل کے پاس رہ کر اپنے کو اور اپنی شان بان کو فنا کردے اور ان کے ارشادات اور ہدایات کے مطابق اپنے کو چلا اور پھر دیکھ کہ کیا سے کیا ہوجاؤ گے۔ اسی پر تائب صاحب کا شعر ہے حضرت والا سے تعلق پر کہ ؎

یہ نہیں کہتے کہ یکدم پارسا ہوجائے گا
کم سے کم بے دردیاں درد آشنا ہوجائے گا

بس اس مضمون کو حضرت والا اس شعر میں فرما رہے ہیں کہ درد دل اگر سیکھنا چاہتے ہو تو میرے ساتھ رہو۔ ان شاء اللہ پھر ہم تمہیں درد دل سکھائیں گے، مگر شرط یہی ہے کہ سفر و حضر میں ساتھ رہ کر سیکھنا پڑے گا اور ہمت سے عمل اور پابندیٔ تعلیمات کرنی ہوگی تب یہ چیز ملے گی۔

کائنات کا ہر ذرّہ وجودِ خالق پر دلیل ہے

سارے ارض و سما اور شمس و قمر
دیکھ کر پاگئے اپنے خالق کو ہم

اس شعر میں حضرت والا نے وہ مضمون ذکر فرمایا ہے کہ جس کے متعلق قرآن کریم نے جگہ جگہ انسانوں کو توجہ دلائی ہے یعنی خود انسان اپنے اندر غور کرے اور ساری کائنات میں اس کے نظام واستحکام میں غور کرے تدبر اور تفکر سے کام لے تو وہ یہ سمجھنے پر مجبور ہوجائے گا کہ اس کا کوئی خالق اور کوئی رب ہے۔ تو ارض وسماء وشمس وقمر بڑی مخلوقات ہیں جن کے متعلق غور وفکر کرنے کا حکم خود قرآن میں ہے کہ:

﴿إِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ﴾

(سورۃ اٰل عمران، اٰیۃ: ۱۹۰)

کہ جو سمجھدار لوگ ہیں وہ ارض وسماء کی تخلیق اور رات ودن کے اختلاف کے نظام میں غور کریں، تو ان کے لیے بڑی نشانیاں ہیں اور یہ عقلمندوں ہی کا کام ہے کہ یَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ زمینوں اور آسمانوں کی تخلیق میں غور کرتے ہیں اور پھر اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ اے اللہ! یہ سارا نظام مستحکم اور مضبوط اور شاندار نظام یہ کبھی بھی بلا فائدہ اور عبث اور بے کار نہیں ہوسکتا ہے، بلکہ درحقیقت یہ انسانوں کی خدمت میں لگا ہوا ہے اور انسان کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے لیے بنایا ہے اور اپنی عبادت ومعرفت کے لیے بنایا ہے اِنَّ الدُّنْیَا خُلِقَتْ لَکُمْ وَاِنَّکُمْ خُلِقْتُمْ لِلْاٰخِرَۃِ البتہ اس غور وفکر اور تدبر وتفکر کا محل صرف مخلوقات ہیں خالق نہیں، اس لیے قرآن کہتا ہے کہ خالق کا ذکر کرو اور مخلوق میں فکر کرو:

﴿اَلَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾

(سورۃ اٰل عمران، اٰیۃ: ۱۹۱)

ترجمہ: وہ لوگ (ہر حال میں دل سے بھی اور اس زبان سے بھی) اللہ تعالیٰ کی یاد کرتے ہیں، کھڑے بھی بیٹھے بھی لیٹے بھی اور آسمانوں اور زمین کے پیدا ہونے میں (اپنی قوتِ عقلیہ سے) غور کرتے ہیں۔ (معارف القرآن، جلد: ۲، صفحہ ۲۵۸)

ورنہ خالق میں غور وفکر کا انجام خطرناک اور مہلک ہے اور انسان کو دین سے بے دین کر دینے والا ہے اور اس کی وجہ بالکل ظاہر ہے۔ اس پر مزید کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہے کہ ہماری عقل محدود ہے اور مخلوق ہے۔ اس کی خاص حد اور لمٹ (Limit) ہے۔ اگر اس سے زیادہ اس کے اندر ڈالیں گے تو وہ پھٹ کر چورا چورا ہوجائے گی۔

جیسے اگر کسی برتن میں ایک کیلو سامان آتا ہے تو اگر آپ اس کے اندر پانچ دس کیلو بھرنا چاہیں گے تو بالآخر وہ برتن ٹوٹ پھوٹ کر چورا چورا ہو جائے گا تو بھلا ایک محدود غیر محدود کو کیسے اپنے اندر لے سکتی ہے۔ اکبر الٰہ آبادی کا شعر ہے ؎

تو دل میں تو آتا ہے سمجھ میں نہیں آتا
میں جان گیا بس تیری پہچان یہی ہے

درحقیقت یہ خود اللہ تبارک وتعالیٰ کی بڑی نشانی ہے کہ وہ آج تک کسی کی سمجھ میں نہیں آسکا ہے اور جس نے اُن کو سمجھنا چاہا وہ گمراہ ہو گئے۔ جادۂ حق سے ہٹ گئے، مگر سمجھ نہ سکے۔ اسی کو ایک شاعر نے فلسفیوں کی موشگافیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا ہے ؎

فلسفی کو بحث کے اندر خدا ملتا نہیں
ڈور کو سلجھا رہا ہے پر سرا ملتا نہیں ہے

اس لیے اس سلسلہ میں بحث کو چھوڑنا واجب ہے اور بحث کرنا حرام ہے۔ ہاں! ہم اللہ کی مخلوقات اور سارے عالم کے نظام میں غور وفکر کریں، تو اس سے ہم خدا کو پائیں گے اور اللہ کی وحدانیت کو سمجھ سکیں گے۔ اس مضمون کو حضرت والا فرمارہے ہیں کہ سارے ارض وسما اور شمس وقمر کو دیکھ کر اے اللہ! ہم یہ پہچان گئے ہیں کہ تو ہمارا خالق ہے اور ہم تجھے پاگئے۔

ایمان دل میں سما جائے تو پھر رنگ لائے

اور اس پر یہ عرض کرتا چلوں کہ جب انسان اللہ کو پالیتا ہے اور اس کا ایمان قوی وراسخ ہو جاتا ہے کہ تو اُس کے سامنے اس کے کتنے ہی جذبات خون ہوتے ہوں، وہ اس کے لیے تیار رہتا ہے، مگر ایک لمحہ کے لیے اپنے اللہ کو ناراض نہیں کرتا تو پھر یہ انسان گویا کہ ساری کائنات کو پائے ہوئے ہوتا ہے اور جب خالق کسی کو مل جائے یعنی اس کی رضا وتائید اس کو حاصل ہو جائے، تو یہ ارض وسما اور یہ شمس وقمر اور یہ درندے پرندے اور یہ حشرات الارض اور جانور سب اس کے ہو جاتے ہیں۔ پھر اس کو سب کچھ اپنا معلوم ہوتا ہے، اس لیے شاعر نے کہا ہے کہ ؎

جو تو میرا تو سب میرا فلک میرا زمیں میری
اگر اک تو نہیں میرا تو کوئی شئے نہیں میری

میں اس مضمون کی مناسبت سے عرض کرتا چلوں کہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کی کیا بات تھی اور ان کو کیا ملا تھا کہ وہ اپنی ساری دنیا کو بھولے ہوئے تھے اور اس سے منہ موڑے ہوئے تھے۔ میرے دوستو! تاریخ سے پوچھو تو بتائے گی کہ صحابہ اپنے خالق کو پاگئے تھے، اس لیے درندے ان کے مطیع ہو گئے۔ سمندروں پر ان کا حکم چلنے لگا۔ دُشمنوں کے دلوں پر ان کا رعب پڑنے لگا۔ چنانچہ واقعات میں لکھا ہے۔

صحابۂ کرام کے چند ایمان افروز واقعات

آ یئے! حضرت شیخ الحدیث رحمۃ اللہ کی کتاب ''اسلامی سیاست'' سے خود حضرت شیخ کے الفاظ میں آپ کے سامنے کچھ پیش کروں۔ چنانچہ حضرت شیخ فرماتے ہیں کہ ''یہی چیز تھی جس نے اس وقت مسلمانوں کو نہ صرف آدمیوں ہی پر غالب بنا رکھا تھا بلکہ بحر و بر شجر و حجر چرند و پرند سب ہی چیزوں پر ان کو فتح حاصل تھی۔ تاریخیں ان واقعات سے پر ہیں۔ تفصیلات کے لیے بڑے دفتروں کی ضرورت ہے۔ افریقہ کے جنگل میں مسلمانوں کو چھاؤنی ڈالنے کی ضرورت پیش آئی اور ایسے جنگل میں جہاں ہر قسم کے درندے اور موذی جانور بکثرت تھے۔ حضرت عقبہ امیر لشکر چند صحابہ کو ساتھ لے کر ایک جگہ پہنچے اور اعلان کیا:

﴿أَيَّتُهَا الْحَشَرَاتُ وَالسِّبَاعُ نَحْنُ اَصْحَابُ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَارْحَلُوْا عَنَّا، فَاِنَّا نَازِلُوْنَ فَمَنْ وَجَدْنَاهُ بَعْدُ قَتَلْنَاهُ﴾

(معجم البلدان، حرف القاف والياء ومايليها، ج:۴، ص:۴۲۱، دار الاحياء التراث العربی)

اے زمین کے اندر رہنے والے جانورو اور درندو! ہم صحابہ کی جماعت اس جگہ رہنے کا ارادہ کر رہی ہے، اس لیے تم یہاں سے چلے جاؤ۔ اس کے بعد [illegible] میں سے ہم پائیں گے، قتل کر دیں گے۔ یہ اعلان تھا یا کوئی بجلی تھی جوان درندوں اور موذی جانوروں میں سرعت سے دوڑ گئی اور اپنے بچوں کو اٹھا اٹھا کر چل دیئے۔ (اسلامی سیاست، صفحہ:۱۱۲)

حضرت سفینہ رضی اللہ عنہ کسی لڑائی میں یا کسی دوسرے موقع پر راستہ بھول گئے۔ اتفاق سے ایک شیر سامنے آ گیا۔ انہوں نے اس شیر سے فرمایا کہ میں حضور کا غلام ہوں، مجھے یہ صورت پیش آ گئی ہے۔ وہ شیر دُم ہلاتا ہوا ان کے ساتھ ہولیا۔ جہاں کہیں کوئی خطرہ کی بات پیش آتی وہ دوڑ کر اُس طرف جاتا اور اُس سے ہٹ کر پھر ان کے پاس آ جاتا اور اسی طرح دُم ہلاتا ہوا ساتھ ہولیتا۔ حتیٰ کہ لشکر تک ان کو پہنچا کر واپس چلا گیا۔

فارس کی لڑائی میں جب مدائن پر حملہ ہونے والا تھا تو راستہ میں دجلہ پڑتا تھا۔ کفار نے وہاں سے کشتیاں وغیرہ بھی سب ہٹا لیں کہ مسلمان ان پر نہ آ سکیں۔ برسات کا موسم اور سمندر میں طغیانی، امیرِ لشکر حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے حکم دے دیا کہ مسلمان سمندر میں گھوڑے ڈال دیں۔ دو دو آدمی ساتھ ساتھ چل رہے تھے اور سمندر میں گھوڑے بے تکلف تیر رہے تھے۔ امیرِ لشکر حضرت سعد کے ساتھی حضرت سلمان رضی اللہ عنہ تھے اور حضرت سعد رضی اللہ عنہ بار بار فرماتے تھے کہ **واللہ لینصرن اللہ ولیہ ولیظهرن دینہ ولیهزمن عدوہ مالم یکن فی الجیش بغی او ذنوب تغلب الحسنات** یعنی خدا کی قسم! اللہ جل شانہٗ اپنے دوستوں کی مدد ضرور کرے گا اور اپنے دین کو غالب کرے گا اور دُشمنوں کو مغلوب کرے گا جب تک کہ لشکر میں ظلم (یا زنا) نہ ہو اور نیکیوں پر گناہ غالب نہ ہو جائیں۔

صحابہ کے لیے آسمان کا برسنا اور سمندر میں راستہ بنانا

مرتدین کی لڑائی میں حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے حضرت علاء حضرمی کو امیرِ لشکر بنا کر بحرین کی طرف بھیجا۔ ایک ایسے جنگل پر گذر ہوا جہاں پانی کا نشان تک نہ تھا۔ لوگ پیاس کی وجہ سے ہلاکت کے قریب پہنچ گئے۔ حضرت علاء رضی اللہ عنہ گھوڑے سے اُترے، دو رکعت نماز پڑھی۔ اُس کے بعد دعا کی جس کے الفاظ یہ ہیں: ''**یاحلیم، یاعلیم، یاعلی، یاعظیم، اعطنا الماء**'' اے حلم والے، اے علم والے، اے برتری والے، اے بڑائی والے ہمیں پانی عطا فرما۔ ایک نہایت معمولی سا بادل اُٹھا اور فوراً برسا اور اس زور سے کہ سب لوگوں نے خوب پیا، برتنوں کو بھر لیا۔ سواریوں کو پلایا، یہاں سے فارغ ہو کر چونکہ مرتدین کی جماعت نے دارین میں جا کر پناہ لے رکھی تھی اور وہاں پہنچنے کے لیے سمندر کو عبور کرنا پڑتا تھا۔ مرتدین نے کشتیاں بھی جلا دی تھیں تا کہ مسلمان ان کا تعاقب نہ کرسکیں۔ حضرت علاء سمندر کے کنارے پہنچے۔ دو رکعت نماز پڑھی اور دعا کی کہ ''**یاحلیم، یا علیم، یا علی یاعظیم اَجِزنَا**'' اے حلم والے، اے علم والے، اے علی وعظیم ہمیں پار کر دے۔ یہ دعا کی اور گھوڑے کی باگ پکڑ کر سمندر میں کود پڑے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم پانی پر چل رہے تھے۔ خدا کی قسم! نہ قدم بھیگا، نہ موزہ بھیگا، نہ گھوڑوں کے سم بھیگے اور چار ہزار کا لشکر تھا۔ بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ پانی اس قدر کم ہو گیا تھا کہ گھوڑوں اور اونٹوں کے صرف پاؤں بھیگے تھے۔ کیا بعید ہے کہ جب چار ہزار کا لشکر تھا، اس میں بعض کے ساتھ ایسا معاملہ ہوا ہو اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے موزے بھی نہ بھیگے ہوں۔

اس قصہ کی طرف عفیف بن منذر نے جو خود اس لڑائی میں شریک تھے۔ دو شعروں میں اشارہ کیا ہے جن کا ترجمہ یہ ہے کہ کیا تو دیکھا نہیں ہے کہ اللہ نے سمندر کو مطیع کر دیا اور کفار پر کتنی سخت مصیبت نازل کی۔ ہم نے اس پاک ذات کو پکارا جس نے (بنی اسرائیل کے واسطے) سمندر کو ساکن کر دیا تھا۔ اس نے ہمارے ساتھ بنی اسرائیل سے بھی زیادہ اعانت کا معاملہ فرمایا۔ سمندروں اور دریاؤں پر پیدل اور سواریوں پر گزرنے کے واقعات کثرت سے ہیں۔ (اسلامی سیاست، صفحہ:۱۱۴)

ان تمام واقعات سے احقر یہ عرض کرنا چاہتا ہے کہ جب یہ ایمان والا حقیقی طور پر اللہ والا بنتا ہے اور اللہ کا فرمانبردار بنتا ہے تو پھر خدا کی تائید و نصرت ہمہ وقت اس کے ساتھ شامل ہوتی ہے اور وہ نہ دنیا کو اپنے نفع کا ذمہ دار سمجھتا ہے اور نہ نقصان کا۔ اُس کی نظر ہمہ وقت اس اکیلے اللہ پر رہتی ہے، اس لیے یہ کہنا غلط نہیں ہے کہ جس نے اللہ کو پالیا ہے، اس نے سب کچھ پالیا ہے۔ حضرت والا کا شعر ہے کہ ؎

پالیا جس نے خدا کو پالیا سارا جہاں
کون کہتا ہے کہ اہلِ دل جہاں دیدہ نہیں

اس لیے اس دنیا میں سب سے اچھا اور بالطف اور حلاوتوں سے بھرا راستہ ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ انسان صرف ایک کو راضی کرنے کی فکر میں لگ جائے اور ظاہر ہے کہ ایک کو راضی کرنا بہت آسان ہے۔ بنسبت سارے دوستوں اور گھر والوں اور خاندان والوں کو راضی کرنے کے، کیونکہ اگر آپ کوئی کام کریں اور کسی دوست کی رضا کو سامنے رکھیں تو ایک کو راضی کریں دوسرے چند ناراض ہوں گے اور ان چند کو راضی کریں، تو دوسرے ناراض ہوں گے اور اگر آپ سب کو راضی کرلیں یعنی ان کی چاہتوں کے مطابق آپ نے زندگی گذاری تو ذرا کوئی ناگوار اور خلافِ مزاج بات سامنے آنے پر ساری زندگی کا اعتقاد ختم ہوا اور بالآخر سب آپ کو چھوڑ بیٹھے۔ لیکن اللہ کو راضی کرنے میں ایسا نہیں ہوتا، وہ آپ کی خوشیوں کے وقت میں بھی آپ کے ساتھ ہوتا ہے اور آپ کی غمی کے موقع پر بھی ساتھ ہوتا ہے اور صحت کی حالت میں آپ کا حامی و مددگار رہے۔ ویسے ہی وہ آپ کے مرض و بیماری میں بھی آپ کا رفیق و ساتھی ہوتا ہے۔ وہ دنیا میں بھی آپ کے ساتھ ہے تو آخرت میں بھی۔ وہ قبر و حشر و نشر میں بھی آپ کا معین و مددگار ہوگا اور آپ کو نعمتوں اور عنایتوں کے ذریعے یاد رکھے گا اور جب سب خوف و غم میں مبتلا ہوں گے تو وہ آپ کو بے غم رکھے گا۔ جب ہر ایک کو فکر لاحق ہوگی وہ آپ کو بے فکر کردے گا۔ جیسا کہ قرآن پاک میں ذکر ہے کہ:

﴿یٰعِبَادِ لَا خَوْفٌ عَلَیْکُمُ الْیَوْمَ وَلَآ اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ﴾

(سورۃ الزخرف، آیۃ:۶۸)

ترجمہ: اے میرے بندو! آج تم پر نہ کچھ ڈر و خوف ہے اور نہ تم غمگین ہو۔

اے میرے بندو! تم نے میرے لیے بڑے غم اور خوف دنیا میں اٹھائے تھے اب تم کو ہمیشہ کے لیے غم و خوف سے نجات دی جارہی ہے اور فری و بری کیا جارہا ہے۔ تم نے بڑا خونِ حسرت پیا ہے اور میرے لیے بڑے غم اُٹھائے ہیں اور میری رضا پر تم نے سب کی ناراضگی کو گوارا کیا، تم نے بہت طعنے سہے تھے اور تم نے بہت مرتبہ زبانِ حال سے یہ کہا تھا۔

آرزوئیں خون ہوں یا حسرتیں پامال ہوں
اب تو اس دل کو تیرے قابل بنانا ہے مجھے

حضراتِ صحابہ کرام نے بس یہی کیا تھا کہ اپنی حسرتوں کو پامال اور اپنی آرزوؤں کا خون کیا تھا اور اللہ کی مرضی پر اپنے اہل و عیال اور اپنی جانوں اور مالوں کو ایسا قربان کیا تھا کہ جس کی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی اور انہوں نے پوری اُمت محمدیہ کے لیے یہ راز فاش کردیا تھا کہ اہلِ ایمان کی کامیابی کا راز صرف ایک اللہ تعالیٰ کو اپنا بنانے میں ہے اور اللہ تعالیٰ تب تک ہمارے ساتھ نہ ہوں گے جب تک گناہ اور اس کی نافرمانیاں ہم میں موجود ہوں، اس لیے طاعات پر استقامت اور گناہوں سے دائمی احتراز و پرہیز ان کی زندگی کا خاصہ تھا اور یہی ہر قدم پر ان کی کامیابی کا راز تھا۔

شیخ سے مکمل استفادہ مناسبت پر موقوف ہے

دل کے ملنے کی ہے بات کچھ اور ہی
ساتھ رہتے ہیں گو ایک مدت سے ہم

اس شعر کے ضمن میں حضرت والا نے تصوف کے ایک اہم مسئلہ کا ذکر کیا ہے کہ شیخ اور مرید کے درمیان آپس میں قلبی مناسبت استفادۂ باطنی اور کسب فیض کے لیے بہت ہی اہم اور ضروری ہے اور حقیقی نفع جبھی حاصل ہوتا ہے کہ جب باہمی قلبی مناسبت ہو، اسی لیے ایک بڑی تعداد مشائخ تصوف کی بالخصوص اس سلسلہ تھانوی میں اس وقت تک بیعت نہیں کرتے ہیں جب تک مرید کی مناسبت کا اندازہ نہ ہو جائے۔ چنانچہ احقر نے اپنے شیخ اوّل حضرت مسیح الامت جلال آبادی رحمہ اللہ سے جب اصلاحی تعلق قائم کیا، تو قصہ یہ ہوا کہ احقر نے حضرت کی خواب میں زیارت کی اور اس خواب کو از اوّل تا آخر حضرت والا کی خدمت میں تحریر کر دیا تو ادھر سے جو جواب آیا، بڑا عجیب پُر کیف تھا کہ ''خواب پر مدار اعتماد و اعتقاد کا رکھنا لا حاصل، بذریعہ مکاتبت مناسبت کا علم ہونے پر اصلاحی تعلق قائم کرلیا جائے۔'' کیونکہ درحقیقت اگر باہمی مناسبت نہ ہو تو پیر کتنا ہی بڑا ولی اللہ ہو، مگر مرید کو پورا نفع نہیں ہوتا اور یہ مضمون جو احقر اس شعر کی تشریح میں پیش کر رہا ہے۔ درحقیقت ایک حدیث شریف سے ماخوذ ہے جو کو حضرت حکیم الامت تھانوی نور اللہ مرقدہ نے تحریر فرمایا ہے کہ:

﴿عَنْ عَائِشَةَ رَضِیَ اللہُ عَنْهَا قَالَتْ سَمِعْتُ النَّبِیَّ صَلَّى اللہُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ الْاَرْوَاحُ جُنُوْدٌ مُجَنَّدَةٌ فَمَا تَعَارَفَ مِنْهَا ائْتَلَفَ وَ مَا تَنَاكَرَ مِنْهَا اخْتَلَفَ﴾

(مشکاةُ المصابیح، کتابُ الأداب، باب الحب فی اللہ ومن اللہ، ص: ۴۲۵، قدیمی کتب خانہ)

یعنی ارواح لشکر کے لشکر ہیں جو عالمِ ارواح میں مجتمع تھیں جن میں (وہاں) باہم جان پہچان ہوئی ہے۔ ان میں (یہاں بھی) باہم الفت ہے اور جن میں وہاں جان پہچان نہیں ہوئی ان میں یہاں بھی اختلافِ مزاج ہے۔

حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہ فرماتے ہیں کہ یہ امر تجربہ سے ثابت ہو چکا ہے کہ فیض باطنی کے لیے پیر و مرید کی باہمی مناسبت فطری شرط ہے۔ بس یہی بات حضرت والا فرماتے ہیں کہ جب کسی اللہ والے سے واقعی معنی میں دل مل جائے تو پھر اس مرید کو بہت ہی نفع پہنچتا ہے اور وہ بہت ہی فیض حاصل کرتا ہے ورنہ بغیر اس کے کبھی بعض لوگ مدتوں مشائخ کے یہاں عمریں گذار دیتے ہیں، مگر جہاں تھے وہیں کے وہیں رہتے ہیں، کوئی خاص معتد بہ نفع نہیں ہوتا ہے، اسی لیے بیعت سے پہلے اس مناسبت کا پتہ کر لینا چاہیے، پھر ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر سلوک میں آگے بڑھنا چاہیے۔ (التکشف، صفحہ: ۳۲۸)

شیخ کی سختیاں مرید کے نفع کے لیے ہیں

سختیاں شیخ کی ہیں فنا کے لیے
مت سمجھ مت سمجھ ان کو ہرگز ستم

اللہ والے اپنے مریدین اور متعلقین کی حقیقی فلاح ودائمی کامیابی کی فکر کرتے ہیں، اس لیے وہ محض رسمی اخلاق اور ظاہری خوش خلقی کے حامل نہیں ہوتے ہیں اور نہ ہی ان کے یہاں یہ چیز سکھائی جاتی ہے، اس لیے اگر کسی سے کوئی ایسی بات صادر ہو کہ جو بظاہر چھوٹی ہو، مگر اس کا منشا اہم ہو تو اس پر شدید پکڑ ہوتی ہے۔ جیسے حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہ فرماتے تھے کہ جب مرید غلطی کرتا ہے تو میں اس غلطی کو نہیں دیکھتا ہوں بلکہ منشا غلطی کو دیکھتا ہوں۔ کبھی بظاہر غلطی چھوٹی، مگر اس کا منشا بہت اہم ہے یعنی جس وجہ سے وہ غلطی ہوئی ہے، جیسے احقر نے ایک واقعہ پڑھا ہے کہ ایک شخص حضرت کی خانقاہ میں ٹھہرے ہوئے تھے تو وہ اپنی جگہ سے اُٹھ کر دوسرے شخص کے پاس آ کر بیٹھ گئے جو کہ قرآن شریف کی تلاوت میں مشغول تھے اور مقصد یہ تھا کہ ان کا قرآن میں بھی سنوں۔ جب ان پر حضرت کی نظر پڑی تو فوراً بلوایا اور فرمایا کہ کیا تم نے ان سے اجازت لی ہے؟ اور اگر اجازت نہیں لی ہے تو پھر تمہیں کیسے معلوم ہے کہ ان کو تمہارے قرآن سننے سے تکلف نہ ہوگا تو اپنے اس عمل سے تم اس کے لیے تکلیف کا سبب بنے ہو اور کسی مؤمن کو ایذا پہنچانا سخت گناہ ہے، لہٰذا خانقاہ سے نکل جاؤ۔ اس قصہ میں آپ اگر بظاہر دیکھیں تو اتنی بڑی غلطی نہیں ہے بلکہ چھوٹی سی غلطی ہے لیکن اس کا منشا اہم ہے، اس لیے حضرت نے سخت سزا دی تاکہ اس منشاءِ خطا کی اصلاح ہو جائے۔ اسی لیے حضرت مجدد تھانوی نور اللہ مرقدہ کے خلفاء میں آپ خاص طور پر دیکھیں گے کہ یہ حضرات معاشرت کی اعلیٰ صفات کے حامل ہوتے تھے اور ان کی معاشرت و معاملات کے شعبوں میں ہونے والی بے اعتدالیوں کی اصلاح پر خاص نظر ہوتی تھی کیونکہ عبادات کو تو لوگ دین سمجھتے ہی ہیں، مگر معاشرت و معاملات میں بھی کچھ شرعی اصول وضوابط ہوتے ہیں۔ اس سے لوگ بڑی تعداد میں بے خبر ہوتے ہیں۔

غیر منکر پر نکیر خود منکر اور گناہ ہے

بہرحال میں تو یہ عرض کر رہا تھا کہ جب شیخ اپنے مرید کو تنبیہ کرے اور ڈانٹے، تو درحقیقت یہ عینِ رحمت ہے۔ اس کو ستم نہ سمجھیں اور شیخ کی طرف سے ظلم وتشدد مت سمجھو اور یہ اصلاح کے لیے ضروری ہے۔ البتہ اس موقع پر ایک بات ضمناً عرض کرنا ضروری ہے تاکہ اہلِ علم کی موجودگی میں میری اصلاح ہو جائے اور وہ یہ کہ حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ نے تفسیر معارف القرآن اور حضرت مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم نے ترمذی کی شرح درسِ ترمذی میں یہ بات لکھی ہے کہ نکیر کرنا اور روک ٹوک کرنا منکر پر ہے اور جو چیز شرعی طور پر منکر نہیں ہے، گناہ نہیں ہے، اس پر نکیر کرنا جائز ہی نہیں یعنی اس پر نکیر کرنا خود گناہ ہے۔ بالفاظ دیگر اَلنَّکِیْرُ عَلٰی غَیْرِ الْمُنْکَرِ

مُنْکَرٌ یعنی غیر منکر پر نکیر کرنا خود ایک گناہ ہے۔ اب میں بہت وضاحت سے یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ بعض خانقاہوں میں اپنے احبابِ مجلس کی طرف سے چھوٹی چھوٹی باتوں پر جو کہ از قبیلِ محبت و ادب و مستحب ہے، اس طرح نکیر کی جاتی ہے کہ وہ بالکل کوئی فرض و واجب درجہ کی چیز ہو حالانکہ وہ امور از خود انسان کے اپنے طور پر اپنانے یا زیادہ سے زیادہ ترغیب دینے اور شوق دلانے کے ہیں لیکن شرعی طور پر ان پر روک ٹوک کرنا نہیں ہے۔ ہاں! اگر کوئی بڑا ہو جیسے حضرت مفتی تقی عثمانی نے دفتر جمعیۃ العلماء ٹرانسوال جنوبی افریقہ کے اجلاس میں فرمایا کہ والد و شیخ و استاذ یعنی جو بڑا ہے اور دوسرا اس سے نیاز مندانہ تعلق رکھتا ہے، اس کے لیے یہ گنجائش ہے کہ وہ چھوٹی چھوٹی چیزوں پر بھی روک ٹوک اور تنبیہ کرے کیونکہ اس سے خود وہ شخص بھی بُرا محسوس نہیں کرے گا اور اس کی طبیعت میں بھی بوجہِ اس نسبت کے کوئی انقباض نہ ہوگا لیکن اگر کوئی دوسرا کرے تو بسا اوقات یہ چیز اس کے لیے سلوک کو چھوڑنے کا سبب بن سکتی ہے اور وہ اس کو ایک طرح کی دین میں تنگی تصور کرنے لگتا ہے۔

پھر میرے دوستو! آپ ذرا اس پہلو سے غور فرمائیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے بندوں کے رب ہیں، ان کے لیے جسمانی اور روحانی دونوں غذائیں عطا کرتے ہیں تو اگر کوئی خاص چیز روح کی تربیت کے لیے اتنی ضروری ہوتی تو اس کو فرض و واجب کیا جاتا، آخر جب اللہ تعالیٰ نے اس کو فرض و واجب نہیں کیا ہے تو اس میں کوئی تو مصلحت ہے اور منجملہ مصلحتوں کے ایک بڑی مصلحت یہی ہے کہ میرے بندوں پر توسع رہے اور وہ تنگی میں نہ پڑیں اور آپ اپنے رویہ اور طرز و طریق سے ان کو تنگی میں ڈال رہے ہیں۔ جیسے مثال کے طور پر لباس ایسا ہو، ایسا نہ ہو۔ ایک تو اس کی وہ شرعی حدود ہیں کہ جن سے وہ جواز کی حدود میں رہتا ہے وہ تو ضروری ہے اور اس پر تو روک ٹوک بھی واجب ہے، مگر اب دوسری چیز کہ مختلف مباح اور جائز درجہ لباسوں میں سے اور مختلف مباح ٹوپیوں اور رومال وغیرہ میں سے آپ کسی خاص قسم پر اتنا زور دیں اور اس پر روک ٹوک کریں تو یہ شرعاً تضییق فی الدین یعنی دین میں تنگی پیدا کرنا ہے، جو گناہ ہے۔ اس لیے آج حضرت والا کی موجودگی میں احقر یہ عرض کرنا چاہتا ہے کہ آج سے ہم آپس میں ایک دوسرے کو چھوٹی چھوٹی باتوں پر روک ٹوک کرنا بند کریں کیونکہ اس سے دلوں میں دوری پیدا ہوتی ہے اور اصلاح کے بجائے ایک دوسرے سے نفرت اور بعد کا راستہ کھلتا ہے اور اگر اللہ تعالیٰ نے کل قیامت کے دن آپ سے یہ سوال کرلیا کہ آخر میں نے جب دین میں گنجائش رکھی تھی اور آسانی پیدا کی تھی تو تم نے یہ تضییق کا معاملہ کیوں کیا؟ تو میرے دوستو! کیا جواب ہوگا؟ حقیقت یہ ہے کہ ان بزرگوں کی تصریح اور قرآن میں استعمال لفظِ منکر اس کی ترجمانی کے لیے کافی دلیل ہے کہ منکر اگر نہ ہو تو پھر اس پر نکیر نہ کیجیے۔

بسا اوقات ہم اپنے زعم میں بڑا کام کر رہے ہیں کہ اونچے درجہ کا ولی بنا رہے ہیں حالانکہ ہم خود ایک منکر ہیں، مبتلا ہیں اور دوسروں کے دلوں کو ان چیزوں کے ذریعہ ایذاء پہنچا کر ایذائے مسلم کا کام کر رہے ہیں جو بہت بڑا گناہ ہے۔

ہمارے اکابر کے یہاں ایذائے مسلم تو بہت بڑی بات ہے۔ ایذائے مخلوق ہی سے بچنے کا اس قدر اہتمام تھا کہ جس سے اس کی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ میں آپ کے سامنے اپنے شیخ اوّل حضرت جلال آبادی کا ایک قصہ سناتا ہوں کہ ایک مرتبہ وہ مسجد سے خانقاہ کی طرف آنے لگے تو وہ راستہ میں ایک چھوٹی نالی ہے، اس میں کتا پانی پی رہا تھا تو حضرت کی اس پر نظر پڑ گئی۔ بس دیکھتے ہی فوراً فرمایا کہ ارے! راستہ بدل دو کیونکہ اگر ہم ادھر سے جائیں گے تو اس بیچارے کتے کے پانی پینے میں خلل پڑے گا، اس لیے حضرت نے وہ راستہ بدل دیا اور دوسرے راستہ کو اختیار کیا۔ بظاہر وہ محض کتا تھا، مگر ان حضرات کی نظر اس پر ہوتی ہے کہ درحقیقت یہ بھی تو اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے، اس کو بھی ایذاء نہ پہنچنی چاہیے۔ اسی لیے حضرت مولانا علی میاں کا ایک ملفوظ میں نے ایک جگہ ایک جلسہ میں ایک بینر پر لکھا ہوا دیکھا کہ جس میں انہوں نے یہ فرمایا ہے کہ اگر مجھے کوئی شخص اس بات کی ضمانت دے کہ مجھ سے کسی مخلوق کو کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی تو میں اس کی ولایت کی گارنٹی دیتا ہوں۔

ایک ایسی حدیث جو ہر وقت پیشِ نظر ہو تو زندگی کے تمام غموں کے لیے کافی ہے

اختر بے نوا کی صدائیں سنو
اپنے مالک کو راضی کریں خوب ہم

یہ حضرت والا کا مقطع ہے اور اس میں حضرت پوری زندگی کا خلاصہ اور ساری تعلیمات کا نچوڑ پیش کر رہے ہیں اور ایک خاص انداز میں فرما رہے ہیں کہ یہ اختر تو پوری دنیا میں ایک ہی صدا لگاتا پھر رہا ہے اور ساری دنیا کے بسنے والے انسانوں کو یہ پیغام ببانگِ دہل سناتا ہے کہ بس ایک اللہ کو راضی کرو اور خوب راضی کرو یعنی ایسا نہ ہو کہ کبھی اپنے نفس کی مان لی اور کبھی اللہ تعالیٰ کی مان لی بلکہ ہر قدم پر اور ہر آن اور ہر گھڑی اپنے اللہ کو راضی کرنے کی فکر کرو۔

اور یہ ایسا راز ہے کہ جو اس دھن اور دھیان میں لگ جاتا ہے کہ میرا اللہ مجھ سے راضی ہو جائے تو پھر اللہ تعالیٰ اس کو ساری فکروں سے آزاد کر دیتے ہیں۔ چنانچہ روایت میں ارشاد ہے کہ:

﴿مَنْ جَعَلَ الْهُمُوْمَ هَمًّا وَّاحِدًا هَمَّ اٰخِرَتِهٖ كَفَاهُ اللّٰهُ هَمَّ دُنْيَاهُ﴾

(سنن ابن ماجة، باب الانتفاع بالعلم)

یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ جو انسان اپنے سارے غموں کو چھوڑ کر بس ایک فکر میں پڑ جائے کہ کہیں میرا اللہ مجھ سے کسی عمل سے ناراض نہ ہو جائے تو پھر اللہ تعالیٰ اس کے دوسرے سارے غموں کو ختم فرما دیتے ہیں اور اس کے لیے ان غموں سے کفایت فرماتے ہیں اور جس کی طرف سے اللہ کافی ہو تو پھر اسے دنیا کی کوئی طاقت اور کوئی غم و ھم پریشان نہیں کر سکتا ہے۔ اس پر بھی حالات آئیں گے، مگر وہ جسم کے اوپر سے ہو کر گذر جائیں گے اور اس کے دل کے قرار و جماؤ میں ذرا خلل نہ ڈال سکیں گے اور وہ بزبانِ حال یہ شعر پڑھتا ہوا ہو گا کہ ؎

بے کیفی میں بھی ہم نے تو ایک کیفِ مسلسل دیکھا ہے
جس حال میں بھی وہ رکھتے ہیں اس حال کو اکمل دیکھا ہے
جس راہ کو ہم تجویز کریں اس راہ کو اثقل دیکھا ہے
جس راہ سے وہ لے چلتے ہیں اس راہ کو اسہل دیکھا ہے

دستگیریٔ حق

مہربانی سے دستگیری کی داستاں سن مری فقیری کی
تھک گیا جب بھی راہ میں اخترؔ لاج رکھ لی ہے اس نے پیری کی

عشق جب بے زبان ہوتا ہے

عشق جب بے زبان ہوتا ہے رشکِ صدہا بیان ہوتا ہے
سر بوقتِ سجود عارف کا فوقِ ہفت آسمان ہوتا ہے
دردِ دل کا زبانِ بسمل سے آہ کیسا بیان ہوتا ہے
فیضِ مرشد سے ہوگیا محروم جب کوئی بدگمان ہوتا ہے
جو محافظ نہیں نظر کا آہ زیرِ تیر و کمان ہوتا ہے
کیسے پائے گا قرب کی منزل جب کوئی وقفِ نان ہوتا ہے
دیکھ لو شانِ فیضِ پیغمبر شترباں حکمران ہوتا ہے
منزلِ قرب سے جو گذرے گا منزلوں کا نشان ہوتا ہے
سارا عالم کرے گا کیا اخترؔ جس پہ حق مہربان ہوتا ہے

مشکل الفاظ کے معانی:۔ **صدہا**: سینکڑوں۔ **سجود**: سجدہ۔ **عارف**: اللہ والا۔ **فوق**: اوپر۔ **ہفت آسمان**: سات آسمان۔ **بسمل**: زخمی، مراد جس نے اللہ کی نافرمانی سے بچنے کے لیے دل پر زخم کھائے ہوں۔ **زیر تیر و کمان**: لعنت و ملامت ہونا۔ **قرب**: اللہ تعالیٰ کی نزدیکی۔ **وقفِ نان**: روٹیاں کھانے میں مصروف۔ **شترباں**: اُونٹ چرانے والا۔ **حق**: اللہ تعالیٰ۔

عشقِ بے زبان رشکِ صد ہا بیان

عشق جب بے زبان ہوتا ہے
رشکِ صدہا بیان ہوتا ہے

اس شعر میں حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ ارشاد فرمارہے ہیں کہ اللہ کے عشاق اور اولیاء اللہ بیان کریں یا نہ کریں بہرصورت ان کے وجود اور دیدار اور ان کی صحبت سے فیض پہنچتا رہتا ہے۔ ان سے کسبِ فیض ان کی تقریر و بیان پر موقوف نہیں ہے۔ اصل بنیادی چیز ان کی صحبت ہے، اسی لیے قرآن نے عجیب تعبیر اختیار فرمائی ہے کہ **كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ** یعنی ان کے ساتھ رہو۔

غالباً یہی نکتہ اور راز ہے کہ حضراتِ صحابہ کو صحابہ کا نام دیا گیا ہے ورنہ ان کے کارناموں اور قربانیوں کے لحاظ سے بہت سے نام دیئے جاسکتے تھے۔ جیسے مثلاً معلم، مقرر، واعظ، مبلغ، مجاہد، داعی، عالم وغیرہ وغیرہ یعنی وہ ان سب صفات کے حامل تھے، مگر ان کا نام جس وصف کے ساتھ خاص کہلاتا ہے وہ وصف صحبت نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہے تو اس سے معلوم ہوا کہ ان حضرات کا سب سے اعلیٰ اور قیمتی وصف یہی شرف صحبت ہے۔

اس لیے حضراتِ علمائے اُمت نے یہ بات تحریر فرمائی ہے کہ صحبت نبی سے بڑا شرف اُمتی کے لیے کچھ نہیں اور کوئی بھی شخص اپنے کارناموں اور مجاہدات و ریاضات کے اعتبار سے خواہ کتنا ہی اونچا ہو جائے اور کیسے ہی درجہ پر پہنچ جائے، مگر وہ صحابی کے برابر نہیں ہوسکتا ہے اور کسی ادنیٰ سے ادنیٰ صحابی کے درجہ کو بھی نہیں پہنچ سکتا ہے اور یہ اُمت کا اجماعی مسئلہ ہے۔ بہرحال میرے عرض کرنے کا منشاء ہے کہ اہل اللہ کے پاس جا کر خواہ ان سے بیان و تقریر سننے کو ملے یا نہ ملے، مگر انسان نفع سے خالی نہیں رہتا ہے۔ خود حدیث شریف میں اللہ والوں کو دیکھتے ہی اللہ کی یاد آنا مذکور ہے کہ:

﴿اِذَا رُأُوْا ذُكِرَ اللهُ﴾

(مسند احمد، مسند الشامین)

کہ جب ان کی زیارت ہوتی ہے تو اللہ یاد آتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی یاد کتنا اونچا نفع ہے۔ اس لیے کہ اہلِ عشق و وفا اپنے سینوں میں جو خدا تعالیٰ کی محبت کا خزانہ رکھتے ہیں اور ان کے پاکیزہ وصاف شفاف قلوب پر جو اللہ تعالیٰ کے یہاں سے انوار کی بارش ہوتی رہتی ہے تو اس کا اثر خود بخود اہلِ مجلس پر ہوتا ہے، اسی لیے ہم نے کتنے ہی اللہ والے دیکھے ہیں کہ باوجودیکہ وہ اپنی مجالس میں کچھ زیادہ گفتگو اور تقریر و وعظ نہیں کرتے ہیں، مگر لوگ جوق در جوق ان کے یہاں آتے رہتے ہیں اور جمع رہتے ہیں اور ان کے دیدار و زیارت اور ملاقات کو اپنی سعادت سمجھتے ہیں۔ اور وہ ان کے پاس بیٹھ کر دنیا کے سارے غموں کو بالکل بھول جاتے ہیں اور عجیب قلبی اطمینان و سکون محسوس کرتے ہیں۔

مقصود صحبت اہل اللہ ہے نہ کہ تقریر و بیان

چنانچہ ہم جب دار العلوم دیوبند میں پڑھتے تھے تو وہاں حضرت مفتی محمود الحسن گنگوہی کی مجلس ہوا کرتی تھی اور حضرت اکثر ہر وقت ذکر میں مشغول رہتے تھے اور خود ذاکر رہ کر کوئی بیان وتقریر نہیں کرتے تھے، مگر لوگ کثرت سے آتے تھے اور وہاں بیٹھ کر عجیب سکون واطمینان ملتا تھا اور بعض اوقات بہت سی علمی باتیں فرمایا کرتے تھے اور کتابوں کی باتیں پوری پوری عبارتوں کی عبارتیں حضرت پڑھتے چلے جاتے تھے۔ تو بہر حال بے زبان عشق بھی ہزار زبانوں اور بیانوں اور تقریروں سے زیادہ مؤثر اور نافع ہوتا ہے، اسی لیے حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عجیب ارشاد فرمایا ہے کہ:

﴿لِكُلِّ شَيْءٍ مَعْدِنٌ وَمَعْدِنُ التَّقْوٰى قُلُوْبُ الْعَارِفِيْنَ﴾

(الجامع الصغير لسيوطي، ج:۲، ص:۱۲۵)

یعنی ہر چیز کی کان ہوتی ہے اور تقویٰ کی کان اللہ والوں کے دل ہیں تو اگر آپ غور سے دیکھیں تو اس حدیث میں یہ بھی اشارہ ہے کہ اصل خزانہ اولیاء اللہ کے سینوں میں ہے اور ان کے سینوں سے وہ حاصل کیا جاتا اور نکالا جاتا ہے۔ اس میں نہ تو کتب العارفین فرمایا ہے نہ بیان العارفین ووعظ العارفین فرمایا ہے۔ اور اس حدیث کے متعلق کنز العمال اور طبرانی وغیرہ کا حوالہ کتابوں میں موجود ہے اس حدیث پر محدثانہ بحث کرتے ہوئے جو بھی تفصیل ہے مگر اخیر میں حضرت شیخ یونس مظاہری لکھتے ہیں: ”باقی ظاہری معنیٰ صحیح ہیں اس لیے کہ عارفین کے قلوب انوار معرفت سے منور ہوتے ہیں جس سے وہ حقائق کا مشاہدہ کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی صفات عظمت وجلال کا ہر وقت عکس پڑتا ہے اس لیے تقویٰ ہمہ وقت ان کے دلوں کا مونس ومکین بنا رہتا ہے واللہ اعلم“ (الیواقیت الغالیہ، ج:۱، ص:۶۰)

اور اس سے بھی زیادہ واضح دلیل اس پر وہ حدیث ہے کہ جب نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا کہ مجھے دنیا کی چیزوں میں سے تین چیزیں بہت پسند ہیں:

﴿عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حُبِّبَ إِلَيَّ مِنْ دُنْيَاكُمْ ثَلَاثٌ اَلطِّيْبُ وَالنِّسَآءُ وَقُرَّةُ عَيْنِيْ فِي الصَّلَاةِ وَقَالَ أَبُوْبَكْرِ نِالصِّدِّيْقِ وَأَنَا حُبِّبَ إِلَيَّ مِنْ دُنْيَاكُمْ ثَلَاثٌ اَلْجُلُوْسُ بَيْنَ يَدَيْكَ وَالنَّظْرُ اِلَيْكَ وَإِنْفَاقُ مَالِيْ عَلَيْكَ﴾

(نزهة المجالس)

(۱) خوشبو (۲) عورت (۳) میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے تو اس پر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا کہ یارسول اللہ! مجھے بھی اسی طرح تین چیزیں بہت پسند ہیں۔ النظر الیک میری نظریں آپ پر پڑا کریں اور میں آپ کو دیکھا کروں۔ (۲) الجلوس بین یدیک میں آپ کے سامنے بیٹھا رہوں۔ (۳) وَإِنْفَاقُ مَالِيْ عَلَيْكَ کہ میرا جو مال ہو وہ آپ پر خرچ ہوا کرے اور سیرت کا مطالعہ کریں تو آپ کو پتہ چلے گا کہ اللہ تعالیٰ

نے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی تمنا بدرجۂ اکمل واتم پوری فرمائی کہ ان کو یہ سب کچھ عطا ہوا اور خوب عطا ہوا تو اس میں بھی ہمارا مضمون موجود ہے کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے یہ ارشاد نہیں فرمایا کہ میں آپ کا بیان سنوں اور تقریر سنوں اور آپ کی باتیں سن کر پھر دوسروں کو پھیلاؤں بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت اور آپ کے سامنے بیٹھے رہنا یعنی آپ کی صحبت و ساتھ نصیب ہونا، اسی لیے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے بہت زیادہ روایات منقول نہیں ہیں بلکہ بہت ہی کم روایات منقول ہیں، مگر اس کے باوجود مقام و مرتبہ کے لحاظ سے وہ افضل الصحابہ ہیں۔

بہرحال حاصلِ کلام یہ ہے کہ اللہ والوں سے نفع کے لیے بیانات اور تقریریں ضروری نہیں بلکہ ان کے سینے اللہ کے عشق و محبت کے خزانے سے بھرے ہوئے ہوتے ہیں تو خود بخود دوسرا انسان متاثر ہوتا جاتا ہے۔ ان کی دعاؤں اور صحبتوں سے اس میں تبدیلی آتی جاتی ہے۔ جیسا کہ حضرت والا نے ایک مقام پر فرمایا ہے کہ ؎

مگر دولت یہ ملتی ہے کہاں سے
بتاؤں میں ملے گی یہ جہاں سے
یہ ملتی ہے خدا کے عاشقوں سے
دعاؤں سے اور ان کی صحبتوں سے

اس لیے اصلاح وتزکیۂ نفس کے لیے مشائخ کے یہاں ایک مدت تک مسلسل اور مستقل رہنا چاہیے محض دو دن یا چار دن آتے جاتے رہنا اگرچہ نفع سے خالی نہیں ہے مگر مقصود کے حصول کے لیے کافی نہیں ہے۔

صحبت اہل اللہ پر محبوبیت کا وعدہ ہے

اور اُن کے پاس بیٹھنے سے اہلِ مجلس کو اللہ تعالیٰ کی محبت کی ایسی دولت نصیب ہوتی ہے کہ جو سینکڑوں بیانات سے بھی لوگوں کو میسر نہیں آتی۔ اسی وجہ سے اللہ والوں سے ملاقات کے وقت تقریر و بیان مقصود نہیں ہونا چاہیے۔ خود جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث قدسی میں جس مضمون کو ذکر فرمایا ہے اُس میں یہ بات آئی ہے کہ:

﴿وَجَبَتْ مَحَبَّتِیْ لِلْمُتَحَابِّیْنَ فِیَّ وَ الْمُتَجَالِسِیْنَ فِیَّ وَ الْمُتَزَاوِرِیْنَ فِیَّ وَ الْمُتَبَاذِلِیْنَ فِیَّ﴾

(مؤطا مالک، کتاب الجامع، باب ما جاء فی المتحابین فی، ص: ۷۴۳)

کہ جو لوگ میرے لیے محبت رکھتے ہیں اور میرے لیے ایک دوسرے سے ملاقات کرتے ہیں اور میرے لیے ایک دوسرے کے پاس بیٹھتے ہیں اور میرے لیے ہی ایک دوسرے پر مال خرچ کرتے ہیں اُن سب کے لیے میری محبت واجب ہوگئی۔ تو اس سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ اللہ تعالیٰ کے لیے محبت رکھنا اور آپس میں بیٹھنا بھی نافع اور مفید

ہے اور اللہ تعالیٰ کی محبت کا سبب ہے۔ جیسا کہ ایک مقام پر حضرت والا نے فرمایا۔

میری زبان حال بھی میرے بیاں سے کم نہیں
میرا سکوت عشق بھی میرے بیاں سے کم نہیں

مومن بحالت سجدہ فرش پر رہتے ہوئے عرش پر ہوتا ہے

سر بوقتِ سجود عارف کا
فوق ہفت آسمان ہوتا ہے

اللہ والوں کے سجدوں کا عالم عجیب عالم ہوتا ہے اور ان کو دنیا کی سب سے لذیذ ترین چیز اللہ کے سامنے سجدہ ریز ہونا ہوتا ہے اور جب وہ سجدے میں جاتے ہیں تو ان کو خدا تعالیٰ سے ایسا قرب حاصل ہوتا ہے جیسا کہ ساتوں آسمانوں کے حجابات اُٹھ چکے ہوں اور گویا کہ اپنی ادائے بندگی بصورت سجدہ ریزی میں بالکل اپنے خالق و مالک کے سامنے ہوں اور بیچ کے سارے حائل اور حجابات اُٹھ چکے ہوں اور سب دوری قرب میں بدل چکی ہو۔ قرآن کریم نے اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ بندہ میرا سب سے زیادہ قرب بذریعۂ سجدہ حاصل کرتا ہے۔ اس لیے ارشاد فرمایا ہے کہ واسجد واقترب اور ابوجہل کی بات پر کان نہ دھریں اور سجدہ اور نماز میں مشغول رہیں کہ یہی اللہ تعالیٰ کے قرب کا راستہ ہے۔ اور امام مسلم نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ:

﴿اقرب ما یکونُ العبدُ من ربّہ وھو ساجدٌ فاکثروا الدُّعاءَ﴾

(صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب ما یقال فی الرکوع والسجود، ج:۱، ص:۱۹۱)

یعنی بندہ اپنے رب سے سب سے زیادہ قریب اس وقت ہوتا ہے جبکہ وہ سجدہ میں ہو، اس لیے سجدہ میں بہت دعا کیا کرو اور ایک دوسری صحیح حدیث میں یہ الفاظ بھی آئے ہیں:

﴿واما السُّجُودُ فاجتھدوا فی الدُّعاءِ فقمنٌ ان یُستجابَ لکم﴾

(صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب النہی عن قراءۃ القرآن فی الرکوع والسجود)

یعنی سجدہ کی حالت میں دعا قبول ہونے کے لائق ہے۔

مسئلہ: نفل نمازوں کے سجدہ میں دعا کرنا ثابت ہے۔ بعض روایاتِ حدیث میں اس دعا کے لیے خاص الفاظ بھی آئے ہیں۔ وہ الفاظِ ماثورہ پڑھے جائیں تو بہتر ہے۔ فرائض میں اس طرح کی دعائیں ثابت نہیں کیونکہ فرائض میں اختصار مطلوب ہے۔ (معارف القرآن، جلد:۸، صفحہ:۷۸۹)

اور حضرت مفتی شفیع صاحب تحریر فرماتے ہیں ''یاد رہے کہ تنہا سجدے کی کوئی عبادت معروف نہیں اس لیے امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک کثرتِ سجود سے مراد یہ ہے کہ کثرت سے نوافل پڑھا کریں جتنی نفلیں زیادہ

ہوں گی سجدے زیادہ ہوں گے لیکن اگر کوئی شخص تنہا سجدہ ہی کر کے دعا کر لے تو اس میں بھی کوئی مضائقہ نہیں اور سجدے میں دعا کرنے کی ہدایت نفلی نمازوں کے لیے مخصوص ہے، فرائض میں نہیں ہے۔

صحیح مسلم میں بروایت حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ منقول ہے کہ جب آدم کا بیٹا کوئی آیتِ سجدہ پڑھتا ہے اور پھر سجدہ تلاوت کرتا ہے تو شیطان روتا ہوا بھاگتا ہے اور کہتا ہے کہ ہائے افسوس انسان کو سجدہ کرنے کا حکم ملا اور اس نے تعمیل کر لی تو اس کا ٹھکانہ جنت ہوا، اور مجھے سجدہ کا حکم ہوا میں نے نافرمانی کی تو میرا ٹھکانہ جہنم ہوا۔

(معارف القرآن، ج:۴، ص:۱۷۰)

اور یہ قربِ سجدہ ہر عارف کو اس کے مقامِ معرفت کے لحاظ سے اور ہر عابد کو اس کے مجاہدہ کے لحاظ سے حاصل ہوتا ہے کیونکہ اَلْمُشَاهَدَةُ بِقَدْرِ الْمُجَاهَدَةِ یعنی جتنا مجاہدہ ہوگا اتنا ہی مشاہدہ والی کیفیت نصیب ہوگی۔

جیسا کہ حضرت والا کا ایک اور شعر ہے کہ مہربانیاں جیسی قربانیاں ہیں۔ اگر چہ یہ قربانیاں بھی درحقیقت ان کی مہربانیاں ہیں، مگر باری تعالیٰ خود ہی توفیق دے کر ان کی نسبت بندوں کی طرف فرماتے ہیں۔ یہ صرف ان کا فضل ہے اور ان کی عطا ہے، اس لیے قرآن میں ایک موقعہ پر حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ یہ جو جنت کی نعمتیں ہیں، اگر چہ صورتاً یہ جزاء ہے، مگر درحقیقت ہماری عطا ہے۔ جَزَآءً مِّنْ رَّبِّكَ عَطَآءً حِسَابًا۔

تو عرض کرنے کا منشاء یہ ہے کہ یہ مقامِ قربِ سجدہ اور یہ حلاوتِ عبادت درحقیقت اپنے اپنے مجاہدوں کے لحاظ سے الگ الگ ہوتی ہے، اسی لیے اگر کوئی انسان نظر بچاتا ہے اور حسینوں سے نظر نہیں لڑاتا، تو اس کو عبادت کی جو حلاوت ملتی ہے وہ دوسروں کو نہیں ملتی کہ جو نظر کے چور ہوتے ہیں اور گناہوں میں لگے رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ہم سب کو یہ مقامِ قرب عطا فرمادے، آمین۔

حاملِ دردِ دل کی زبانِ لبسمل کا بیانِ دردِ دل

دردِ دل کا زبانِ لبسمل سے
آہ کیسا بیان ہوتا ہے

حضرت والا دامت برکاتہم نے اس شعر میں اللہ والوں کے وعظ ونصیحت اور ان کے تقریر و بیان کی تاثیر کا ذکر فرمایا ہے۔ ارشاد فرماتے ہیں کہ جو انسان اللہ کی راہ کا غم اُٹھائے ہوئے ہو اور اپنی خواہشاتِ نفس کو اللہ کی محبت کی تلوار سے ذبح کیے ہوئے ہو اور ہر قدم پر اپنی حرام خوشیوں اور لذتوں کا خون کرتا ہو اور اللہ کی محبت کی شراب کا نشہ اس کے دل ودماغ پر ایسا سوار ہو کہ پلک جھپکنے کے برابر بھی اللہ کی نافرمانی میں اس کا وقت نہ گذرتا ہو تو پھر ایسے صاحبِ دل دیوانۂ حق کی داستانِ عشق وجنوں اور ایسے حاملِ دردِ نسبت کا بیان دردِ دل اور ایسے خدا کی محبت میں بے قرار تڑپتے ہوئے دل سے نکلنے والے جملے کیا کچھ زبردست تاثیر رکھتے ہیں۔ اس کو لفظوں میں بیان نہیں کیا جاسکتا

ہے۔لغت والفاظ اس کیفیت کی ترجمانی سے عاجز ہے۔ یہ تجربہ سے سمجھنے کی چیز ہے کہ کسی خدا کے سچے عاشق کی صحبت میں چند لمحات گذار کر بیٹھ کر اس کی داستان دردوغم سنے اور پھر دیکھے کہ ان کی یہ داستاں کیسے دلوں کو چیرتی اور تڑپاتی ہوئی جارہی ہے۔اس لیے حضرت والا فرماتے ہیں ؎

خرد ہے محوِ حیرت اس زباں سے
بیان کرتی ہے جو آہ و فغاں سے
جو لفظوں سے ہوئے ظاہر معانی
وہ پاسکتے نہیں دردِ نہانی

کیوں؟اس لیے کہ ؎

لغت تعبیر کرتی ہے معانی
محبت دل کی کہتی ہے کہانی

میرے دوستو! یہ ایک بات یاد رکھنا کہ جو انسان خود صاحبِ دل ہوتا ہے۔اگرچہ اس کی تقریر ظاہری فصاحت و بلاغت کے اصولوں سے پُر نہ ہو،مگر اس میں اللہ تعالیٰ بڑی تاثیر رکھ دیتے ہیں اور ایسے ہی بیانات اور تقریریں لوگوں میں انقلاب برپا کرتی ہیں اور ان کو معصیتوں کی ظلمتوں سے نکال کر طاعات کے انوار سے منور کردیتی ہیں، اسی لیے حضرت علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ جیسے اپنے وقت کے علامہ مخدوم العرب والعجم جب حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوئے جس کا قصہ احقر دوسری جگہ لکھ چکا ہے۔ یہاں صرف اتنا مقصود ہے کہ حضرت سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے بار بار درخواست پر کہ کچھ نصیحت فرمادیں تو آخر میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے صرف ایک مختصر سا جملہ ارشاد فرمایا تھا کہ ’’ہم نے تو اپنے حضرت حاجی صاحب سے ایک ہی سبق سیکھا ہے اور وہ ہے اپنے کو مٹانا۔‘‘ بس اسی بات پر آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے حالانکہ یہ کوئی لمبی چوڑی فصیح و بلیغ تقریر نہ تھی۔ اندازہ لگائیں کہ دردِ دل سے نکلے جملوں کی کیا تاثیر ہوتی ہے؟اور ان میں کیا نور رہوتا ہے۔

بدگمان ہمیشہ محروم رہا کرتا ہے

فیض مرشد سے ہوگیا محروم
جب کوئی بدگمان ہوتا ہے

اس شعر میں حضرت ارشاد فرماتے ہیں کہ اگر کوئی اللہ والوں سے بدگمانی رکھتا ہو تو پھر اسے فیض نہیں ہوتا ہے بلکہ وہ محروم رہتا ہے یعنی گویا اس شعر کا مقصود موانعِ اکتسابِ فیض میں سب سے بڑے مانع اور رکاوٹ کو پیش کرنا

ہے کہ اگر کوئی کسی کے ساتھ لگا رہے اور تعلق بھی رکھے لیکن اندر دل میں بدظن رہے تو ایسے شخص کو اس شیخ سے کوئی نفع نہیں ہوتا ہے۔

اس لیے شیخ سے حسنِ ظن اور اپنے لیے پوری دنیا میں سب سے زیادہ نافع ہونے کا اعتقاد رکھنا واجب اور ضروری ہے۔ ورنہ مطلقاً شیخ کے بیانات سے معلومات میں اضافہ تو ہوسکتا ہے مگر صاحبِ نسبت ولی اللہ بننا نہ صرف یہ کہ مشکل بلکہ ناممکن ہے اور اس راہِ سلوک کی ترقی مکمل طور پر رک جاتی ہے۔

احقر عرض کرتا ہے کہ یہ حضرت والا کا شعر اس بدگمانی شیخ کے جرم کی شناعت وقباحت کو بیان کرنے کے سلسلہ میں احتیاط پر مبنی ہے ورنہ اس سلسلہ میں جو وعیدیں احادیث مبارکہ میں آئی ہیں وہ تو بہت ہی سخت ہیں۔ چنانچہ احقر عرض کرتا ہے کہ اللہ والوں سے کینہ وعداوت یا ان کی ایذا رسائی پر بہت ہی سخت ارشاداتِ نبوت ہیں۔ حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا رحمہ اللہ اسلامی سیاست صفحہ: ۱۲ پر فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اللہ جل جلالہ ارشاد فرماتے ہیں کہ:

﴿مَنْ عَادٰی لِیْ وَلِیًّا فَقَدْ اٰذَنْتُہٗ بِالْحَرْبِ﴾

(صحیح البخاری، کتاب الرقاق، باب التواضع، ج: ۲، ص: ۹۶۳)

جو شخص میرے کسی ولی سے دُشمنی رکھے، میری طرف سے اس کو اعلانِ جنگ ہے۔ تم خود سمجھ لو کہ اللہ جل جلالہ سے لڑائی کرکے دنیا میں کون شخص فلاح پا سکتا ہے اور آخرت کا تو پوچھنا ہی کیا ہے اور یہ مضمون کئی حدیثوں میں مختلف الفاظ کے ساتھ نقل کیا گیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف اوقات میں مختلف الفاظ سے اس پر متنبہ فرمایا ہے۔ چنانچہ الفاظِ بالا حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے بخاری شریف میں نقل کیے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ روایت حضرت عائشہ، حضرت میمونہ، حضرت معاذ، حضرت انس، حضرت ابوامامہ وہب بن منبہ سے بھی نقل کی گئی ہے۔ بعض روایتوں میں وارد ہوا ہے کہ جس شخص نے میرے کسی ولی کو ستایا وہ میرے ساتھ لڑائی پر اُتر آیا۔

ایک حدیث میں آیا ہے جو میرے کسی ولی کی اہانت کرتا ہے، وہ میرے ساتھ مقابلہ کے لیے سامنے آتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ مسجد نبوی میں تشریف لائے تو دیکھا کہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کے قریب بیٹھے رو رہے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دریافت کیا کہ معاذ کیوں رو رہے رہو؟ عرض کیا کہ میں نے اس (پاک) قبر والے (صلی اللہ علیہ وسلم) سے ایک بات سنی تھی اور اس کی وجہ سے رو رہا ہوں۔ (مبادا کہیں میں مبتلا نہ ہوجاؤں) میں نے آپ کو کہتے ہوئے سنا تھا کہ تھوڑا سا دکھلاوا بھی شرک ہے اور جو شخص اللہ کے کسی ولی کے ساتھ دُشمنی کرتا ہے وہ اللہ کے ساتھ لڑائی کے لیے مقابلہ کرتا ہے۔

(مستدرک حاکم)

ایک حدیث میں آیا ہے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے اللہ جل جلالہ سے نقل کیا ہے کہ جو شخص میرے کسی ولی کی اہانت کرتا ہے وہ مجھ سے لڑنے کے لیے مقابلہ میں آتا ہے، میں اپنے اولیاء کی حمایت میں ایسا ناراض ہوتا ہوں جیسا غضبناک شیر۔ (درمنثور)

صرف دو گناہوں پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اعلان جنگ کی وعید ہے

کتنا سخت اندیشہ ناک معاملہ ہے۔ اللہ تعالیٰ سے جس کی لڑائی ہو اس کا بھلا ٹھکانا کہاں؟ اور پھر اگر اس کے معاوضہ میں ہاتھ پاؤں ٹوٹ جائیں، ناک کان آنکھ جاتے رہیں تب بھی سہل ہے کہ دنیا کی تکلیف بہر حال ختم ہونے والی ہے اور اس نوع کے نقصان سے توبہ کی اُمید ہے لیکن خدانخواستہ کوئی دینی نقصان پہنچ جائے، کسی بددینی میں مبتلا ہو جائے، تو کیا ہو؟ ائمہ نے کہا ہے کہ گناہوں میں کوئی گناہ بھی ایسا نہیں ہے کہ جس کے کرنے والے کو اللہ جل شانہ نے اپنے ساتھ لڑائی سے تعبیر کیا ہو۔ بجز اس گناہ کے اور سود کھانے کے کہ حق تعالیٰ شانہ نے ان دونوں کو اپنے ساتھ جنگ سے تعبیر کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ان دونوں کا گناہ بہت ہی زیادہ بڑھا ہوا ہے اور ان لوگوں کے سوء خاتمہ کا اندیشہ ہے۔ (مرقاۃ شرح مشکوٰۃ)

صاحبِ مظاہرِ حق نے بھی لکھا ہے کہ اللہ سے بندہ کی لڑائی دلالت کرتی ہے سوء خاتمہ پر۔ ایک مسلمان کے لیے خاتمہ بالخیر ہونا انتہائی مرغوب اور لازوال نعمت ہے اور جس چیز سے خاتمہ کے خراب ہونے کا اندیشہ ہو، تم ہی سوچو کہ کتنی خطرناک چیز ہوگی؟

میرے دوستو! اپنے وقت کے عالمِ ربانی حضرت شیخ الحدیث نور اللہ مرقدہ کی یہ تحریر اسلامی سیاست صفحہ: ۱۴ پر ہے جو کہ احادیثِ مبارکہ کی روشنی میں حضرت نے تحریر کی ہے، اس پر اگر کوئی واقعی معنی میں نظر عبرت ڈالے تو اسے یہ اندازہ لگانا آسان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اولیاء اور مقربین بارگاہ کا اپنی نظروں میں کیا مقام رکھا ہے۔ اس لیے احقر اپنے ناقص علمی مطالعہ کی روشنی میں عرض کرتا ہے کہ جس شخص کی تاریخ پر نظر ہوگی وہ یہ فیصلہ بآسانی کر سکے گا کہ جس طرح اس دنیا میں کبھی بھی وہ قوم عزت و رفعت حاصل نہ کر سکی جس نے نبی کو ستایا ہو اور اس کو تکلیف پہنچائی ہو، بالکل ٹھیک اسی طرح وہ قوم یا وہ فرد کہ جس نے اپنے زمانہ کے عالمِ ربانی کی توہین و تحقیر کی ہو یا اس کو ایذاء پہنچائی ہو یا اس کے ساتھ بدگمانی و بدسلوکی کی ہو، کبھی عزت و سرخروئی حاصل نہیں کر سکا ہے۔

اہل اللہ سے بدگمانی اور ان پر اعتراض بدنصیبی کی نشانی ہے۔

اس کو حضرت شیخ لکھتے ہیں کہ چنانچہ علامہ شعرانی رحمہ اللہ طبقات کبریٰ میں لکھتے ہیں کہ امام ابوتراب بخشی رحمہ اللہ جو مشائخ صوفیہ میں سے ہیں، یہ فرماتے ہیں کہ جب کسی شخص کا دل اللہ جل شانہ سے اعراض کے ساتھ مانوس ہو جاتا ہے تو اہل اللہ پر اعتراض کرنا اس کا رفیق بن جاتا ہے۔ یعنی جو شخص اللہ تعالیٰ سے نامانوس ہو جاتا ہے تو

وہ اہل اللہ پر اعتراض کرنے کا خوگر ہو جاتا ہے۔

چوں خدا خواہد کہ پردہ کس درد
میلش اندر طعنۂ پاکاں زند

یہاں ایک بات اور بھی سمجھ لو کہ اہل اللہ بعض مرتبہ اپنے بُرا بھلا کہنے والے سے انتقام لیتے ہیں اور یہ چیز ظاہر بینوں کے لیے حجاب کا سبب بن جاتی ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ لوگ بھی عوام کی طرح جذبات سے مشتعل ہو جاتے ہیں حالانکہ بعض اوقات یہ بڑی مصلحت پر مبنی ہوتا ہے۔ حضرت مرزا مظہر جانِ جاناں نے اپنے مکاتیب میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت مجدد الف ثانی رحمہ اللہ کے والد شیخ عبدالاحد کی شان میں کسی عورت نے گستاخی کی۔ انہوں نے صبر وسکون کیا۔ اتنے میں دیکھا کہ غیرتِ الٰہی جوشِ انتقام میں ہے۔ شیخ نے فوراً ایک شخص سے جو اس وقت موجود تھا کہا کہ اس عورت کو ایک تھپڑ مارے۔ اس کو تردد ہوا۔ ادھر وہ عورت گر کر مرگئی۔

اس قسم کے واقعات مشائخ کے حالات میں کثرت سے ملتے ہیں اور میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ میرے نزدیک تو اس نوع کی سزا دینا مصیبت میں ابتلاء سے بہت سہل ہے۔

حضرت شیخ فرماتے ہیں کہ کسی سے محبت اور تعلق رکھنے کے لیے یہ شرط تو ضروری ہے کہ اس کے دینی حالات معلوم ہوں اور شریعت کے موافق ہونا اس کا محقق ہو جائے لیکن جس شخص کا حال معلوم نہیں، نہ یہ معلوم کہ وہ شریعت کے موافق ہے یا مخالف اس سے تعلق نہیں رکھنا چاہیے۔ البتہ محض سنی سنائی باتوں سے اس پر کوئی حکم لگانا یا بُرا بھلا کہنا برا ہے۔

حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد حضرت انس رضی اللہ عنہ نقل کرتے ہیں کہ مجھ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بیٹا! اگر تو اس پر قادر ہو کہ تیرے دل میں کسی کی طرف سے کینہ نہ ہو تو اس کو اختیار کر، یہ میری سنت ہے اور جو میری سنت کو پسند کرتا ہے وہ مجھ سے محبت رکھتا ہے اور جو مجھ سے محبت رکھتا ہے وہ جنت میں میرا رفیق ہوگا۔ (اسلامی سیاست، صفحہ:۲۱)

اس مذکورہ تحریر سے آپ بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ اہل اللہ کے ساتھ کیا محبت وعظمت کا معاملہ کرنا لازم اور ضروری ہے ورنہ الٹا نفع کے بجائے ضرر اور ضرر بھی ضررِ شدید کا خطرہ ہے۔

بلا وجہ بدگمانی حرام اور ناجائز ہے

یہ پورا مضمون تو اپنے شیخ اور کسی بھی ولی اللہ سے بدگمانی و بدظنی اور ان سے عداوت و ایذاء رسانی کے عنوان پر تھا، مگر بدگمانی تو ایسا خطرناک مرض ہے کہ کسی بھی مسلمان سے جائز نہیں ہے اور اس کو گناہ کبیرہ میں شمار کیا گیا ہے اور اس مرض کا آج کل بہت ہی شیوع وعموم ہے حالانکہ بغیر کسی قوی دلیل کے کسی ایسے مسلمان سے بدگمانی

کرنا جو ظاہر میں نیک اور باشرع ہو بالکل جائز نہیں ہے۔ چنانچہ حضرت مفتی شفیع صاحب نور اللہ مرقدہ نے تحریر فرمایا ہے کہ ''ایسے مسلمان جو ظاہری حالت میں نیک دیکھے جاتے ہیں، ان کے متعلق بلا کسی قوی دلیل کے بدگمانی کرنا حرام ہے۔'' حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

﴿ اِیَّاکُمْ وَالظَّنَّ فَاِنَّ الظَّنَّ اَکْذَبُ الْحَدِیْثِ ﴾

(الجامع الصغیر للسیوطی، ص: ۴۴۳)

یعنی گمان سے بچو کیونکہ گمان جھوٹی بات ہے۔ یہاں ظن سے مراد بالاتفاق کسی مسلمان کے ساتھ بلا کسی قوی دلیل کے بدگمانی کرنا ہے۔ (معارف القرآن، جلد: ۸، صفحہ: ۱۲۰)

اور بدظنی پر عنداللہ مواخذہ ہوگا جبکہ حسنِ ظن پر کوئی مواخذہ نہیں ہے تو جب کسی کی طرف سے کوئی بات اور واقعہ پیش آئے تو اگر اس میں اچھائی اور بُرائی کے دونوں احتمال نکلتے ہوں تو ہم کو چاہیے کہ اسے اچھائی پر محمول کریں ورنہ خواہ مخواہ بلاوجہ انسان گناہ میں گرفتار ہوتا ہے۔

اس کی ایک مثال پیش کرتا ہوں جو مجھ کو بچپن سے یاد ہے کہ ایک جگہ ایک خاندان والے مہمان تھے۔ تو انہوں نے ان کو کھانا وغیرہ کھلایا اور جب وہ فارغ ہو گئے تو امرود کی چاٹ بنائی جس کو ہم لوگ فروٹ سیلڈ (Fruit sealed) کہتے ہیں، مگر اس میں انہوں نے کچھ مصالحے اور چینی ڈالی تو چند منٹ کے لیے اس کو ایک طرف اُٹھا کر رکھ دیا تاکہ اس کے اندر وہ چینی اور مصالحے اچھی طرح گھل کر لذیذ ہو جائے اور پھر اس کو مہمانوں کے سامنے پیش کریں۔ تو اسی موقعہ پر ایک عورت بڑے عجیب لہجہ میں کہتی ہے کہ وہ چاٹ ہم سے کیوں چھپالی؟ اور چھپا کر ایک طرف اُٹھا کر رکھ لی، جب کھلانی نہیں تھی تو پھر ہمیں یہ دکھلائی کیوں؟ آپ حیران ہوں گے کہ میزبان سکتہ کے عالم میں رہ گئے کہ افسوس ہم نے کس نیت سے اس کو ایک طرف رکھا ہے اور اس نے اس کو کس نیت پر محمول کیا ہے؟

اور ایسے واقعات زندگی میں بے شمار پیش آتے ہیں اور عوام مسلمین ہی سے نہیں بلکہ خواص علماء و مشائخ کی ایک بڑی تعداد اسی مرض کا شکار ہے کہ ویسے تو ماشاء اللہ بڑی خوبیوں کے حامل ہیں لیکن کسی کی طرف سے محض کوئی بات سامنے نقل ہونے پر یا ناموافق طبع کوئی قصہ پیش آجانے پر یا کسی مخالف کی بعض شکایتوں پر مختلف قسم کی بدگمانیاں دل میں لے کر ہی جاتے ہیں، حالانکہ اس بندۂ خدا کے دل میں ان باتوں کا گذر بھی نہیں ہوتا ہے تو بالآخر کسی موقعہ پر وہ باتیں جب اس کے سامنے آتی ہیں تو وہ حیران و پریشان ہو کر رہ جاتا ہے کہ افسوس یہ شخص میرے متعلق ایسے ایسے خیالات میں مبتلا ہے کہ جو کبھی میرے وہم و گمان میں بھی نہیں گذرے اور اس طرح اس کو اس سے شدید تکلیف پہنچتی ہے اور جانبین کو سخت نقصانات اٹھانا پڑتے ہیں اور اس سے بھی زیادہ غم کی بات یہ ہے کہ اس نوع کی تحریر پڑھنے کے وقت بھی اپنے اوپر تطبیق نہیں کی جاتی بلکہ اپنی بدگمانیوں کے لیے شیطان کی طرف سے ایسے

مزین کردہ دلائل ذہن میں گھومنے لگتے ہیں کہ وہ اپنی باتوں کو حقائق تصور کرتا ہے، صرف بدگمانی نہیں سمجھتا۔ بس وَاللهُ الْمُسْتَعَانُ وَ اِلَى اللهِ الْمُشْتَكٰى یعنی لوگ ایسی باتوں اور واقعات ومعاملات میں جانب مخالف کا مفہوم جو بدظنی والا ہے بڑی جلدی مراد لے کر آپ سے ناراض وخفا ہو جاتے ہیں۔ بس اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس مرض سے اور جملۂ امراض جسمانی وروحانی سے محفوظ فرمائیں حالانکہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات تو ہمیں یہ سکھاتی ہیں کہ ہماری زندگی کی ایک صبح وشام بھی اس طرح نہ گذرے کہ ہمارے دل میں کسی کی طرف سے کوئی کینہ، عداوت اور بدگمانی ہو۔ جیسا کہ اوپر حضرت انس رضی اللہ عنہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ نصیحت ذکر کی گئی ہے۔

اس لیے میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ اگر کوئی ہمیں گالی بھی دے اور بُرا بھلا بھی کہے تو ہم کو تو یہی سمجھنا چاہیے کہ وہ آدمی بہت اچھا ہے۔ بس وقتی طور پر کچھ غصہ آ گیا تھا اس لیے اس نے مجھے بُرا بھلا کہہ دیا ہے ورنہ وہ تو بہت نیک صالح ہے اور دل کا بہت بھلا آدمی ہے اور ایسی سوچ پر ہمارا کوئی مواخذہ نہیں۔ ہاں البتہ اس مقام پر ایک دوسری چیز ہے جس کو مفتی شفیع صاحب رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ:

﴿اِنَّ مِنَ الْحَزْمِ سُوْءَ الظَّنِّ﴾

یعنی انسان کی احتیاطی تدابیر میں سے یہ ہے کہ لوگوں پر بے جا اعتماد کر کے ان سے اپنی زندگی میں دھوکہ نہ کھائے اور ان کو اپنے راز دے کر ان سے نقصان نہ اُٹھائے۔ اس کا مطلب لوگوں کو چور ڈاکو سمجھے یہ نہیں ہے۔

خلاصہ اس کا یہ ہے کہ ہر شخص سے بدگمانی رکھے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ معاملہ ایسا کرے جیسے بدگمانی کی صورت میں کیا جاتا ہے کہ بدون قوی اعتماد کے اپنی چیز کسی کے حوالہ نہ کرے اور نہ یہ کہ اس کی تحقیر کرے یا اسے چور وغدار سمجھے بلکہ اپنے معاملہ میں احتیاط برتے۔ (معارف القرآن)

نظر شیطان کا زہر آلود تیر ہے

جو محافظ نہیں نظر کا آہ
زیرِ تیر و کمان ہوتا ہے

حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ ارشاد فرماتے ہیں کہ جو شخص حسینوں سے خواہ وہ نامحرم عورتیں ہوں یا حسین امرد بے ریش لڑکے ہوں، یا وہ ہلکی ہلکی ڈاڑھی والے امارد ہوں، مگر ان کو دیکھ کر نفس کو حظ وسرور ملتا ہو ان کو دیکھنے سے نظر کی حفاظت نہیں کرتا ہے، آہ! وہ اپنے اوپر کتنا بڑا ظلم کر رہا ہے اور خود اپنے چین وسکون کا سودا کر رہا ہے۔ خود وہ اپنے دل پر تیر وکمان کی بارش برسا کر اس کو زخمی ولہولہان کر رہا ہے اور اس کے نتیجہ میں پورا بدن اور سارے اعضاء وجوارح بیمار وزخمی ہو رہے ہیں۔

ابن الجوزی کی کتاب ''ذم الھویٰ'' کے ترجمہ عشقِ مجازی کی تباہ کاریاں صفحہ ۷۰ پر ہے کہ حضرت علی رضی

اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ:

﴿یَاعَلِیُّ! اِتَّقِ النَّظْرَةَ بَعْدَ النَّظْرَةِ فَاِنَّهَا سَهْمٌ مَسْمُوْمٌ يُوْرِثُ الشَّهْوَةَ فِي الْقَلْبِ﴾

اور آگے حضرت انس رضی اللہ فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ:

﴿نَظْرُ الرَّجُلِ اِلٰى مَحَاسِنِ الْمَرْاَةِ سَهْمٌ مَسْمُوْمٌ مِنْ سِهَامِ اِبْلِيْسَ﴾

اور حضرت علامہ ابن زیاد فرماتے ہیں کہ اپنی نگاہ کو عورت کی چادر پر بھی مت ڈال کیونکہ نگاہ دل میں شہوت کا بیج بوتی ہے۔

زہریلا تیر اگر انسان کے بدن میں لگ جائے تو پورے جسم میں وہ زہر پھیل کر موت کا سبب بنتا ہے تو دوستو! بس اسی طرح یہ زہریلا تیر جب انسان کے ایمان میں داخل ہوگا اور اس کے دل میں جا کر لگے گا تو اس کا زہر اس کے ایمان میں پھیل کر اس کی ساری ایمانیات اور عبادات اور طاعات کی حقیقی لذت کو اس سے دور کر دے گا۔ جیسا کہ جسمانی زہر پھیلنے سے جسم کی صحت بگڑتی ہے۔ اسی طرح روح میں زہر پھیلنے سے قلب و روح کی سلامتی خطرہ میں پڑ جاتی ہے۔

حضرت والا کی یہ تعبیر درحقیقت ایک حدیث شریف سے ماخوذ ہے جو حضرت کی کتابوں وعظوں میں کئی جگہ مذکورہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

﴿اِنَّ النَّظْرَ سَهْمٌ مِنْ سِهَامِ اِبْلِيْسَ مَسْمُوْمٌ مَنْ تَرَكَهَا مَخَافَتِيْ اَبْدَلْتُهُ اِيْمَاناً يَجِدُ حَلَاوَتَهُ فِيْ قَلْبِهِ﴾

(كنز العمال، ج:۵، ص: ۱۳۰، دار الكتب العلمية)

کہ یہ نظر ایک زہریلا تیر ہے۔ شیطان کے تیروں میں سے اور جو اس کو چھوڑ دے میرے خوف سے تو اس کو اس کے بدلے ایسا ایمان عطا کرتا ہوں کہ جس کی حلاوت وہ اپنے دل میں موجود پاتا ہے۔ دوسری جگہ بھی یہ مضمون آ چکا ہے کہ ملا علی قاری ارشاد فرماتے ہیں کہ:

﴿وَقَدْ وَرَدَ اَنَّ حَلَاوَةَ الْاِيْمَانِ اِذَا دَخَلَتْ قَلْبًا لَا تَخْرُجُ مِنْهُ اَبَدًا فَفِيْهِ اِشَارَةٌ اِلٰى بَشَارَةِ حُسْنِ الْخَاتِمَةِ

(مرقاة المفاتيح)

کہ حلاوتِ ایمانی جب دل میں داخل ہو جاتی ہے تو پھر اس سے نہیں نکلتی ہے لہٰذا اس میں حسنِ خاتمہ کی طرف اشارہ موجود ہے یعنی گویا حفاظت نظر اتنا بڑا عمل ہے کہ اس میں ایمان پر خاتمہ کی بشارت موجود ہے، اسی لیے قرآن کریم میں اگر غور سے دیکھیں تو غضِ بصر سے حفظِ فرج و شرمگاہ اور اس کے نتیجہ میں طہارتِ قلب اور تزکیۂ نفس کا ہونا اور تزکیۂ نفس پر فلاح کا موقوف ہونا اور فلاح و کامیابی والوں کا اہلِ جنت سے ہونا مذکور ہے تو اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ حفاظتِ نظر دخولِ جنت کی ضامن ہے۔ اسی کو حضرت عارف ہندی حضرت خواجہ عزیز الحسن مجذوب فرماتے ہیں کہ

دین کا دیکھ ہے خطر اُٹھنے نہ پائے یاں نظر
کوئے بتاں میں تو اگر جائے نظر بچائے جا

نظر بڑے بڑے بہادروں کو زیر کر دیتی ہے

اس نظر کی بنیاد پر دل قیدی ہوتا ہے اور وہ جال میں پھنستا ہے اور پھر انسان بظاہر لاچار و مجبور دکھائی دیتا ہے، اسی لیے ہم نے دارالعلوم دیوبند میں عربی ادب کی ایک کتاب پڑھی ہے جس کا نام ''دیوانِ متنبّی'' ہے۔ اس میں ایک عجیب شعر اس نظر کی تاثیر اور عشقِ مجازی کی قید میں پھنس کر انسان کی حالت پر ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ۔

يَسْتَاسِرُ الْبُطَلَ الكَمِيَّ بِنَظْرَةٍ
وَيَحُوْلُ بَيْنَ فُؤَادِهٖ وَعَزَائِهٖ

کہ بڑے سے بڑا بہادر ہتھیاروں سے مسلح اور میدانوں کو زیر کرنے والا ہر طرف سے بہادری کی داد پانے والا لیکن جب معشوق و محبوب پر نظر پڑتی ہے تو ایک نظر میں اس کا ایسا قیدی ہوتا ہے کہ پھر اس سے اس کے فراق و جدائی پر صبر نہیں ہو پاتا اور وہ اس کے صبر اور دل کے درمیان حائل ہو جاتا ہے کہ وہ صبر کو دل تک پہنچنے نہیں دیتا ہے۔

ایک نظر سے جب ایسا حال ہوتا ہے تو اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ نظر کی حفاظت کس قدر اہم ہے، اس لیے بڑے بڑے نیک لوگ بھی جب اس سلسلہ میں احتیاط نہیں کرتے تو ان سے وہ سب سننے کو ملتا ہے جس کو ان کے متعلق نہ کبھی کسی نے سوچا ہوتا ہے اور نہ اس کا گمان کیا ہوتا ہے۔ چنانچہ اس طرح کے بے شمار واقعات ہیں کہ نظر کی بے احتیاطی کے نتیجہ میں انسان ایمان تک سے ہاتھ دھو بیٹھا ہے اور کفر پر موت آتی ہے۔

صالح مؤذنِ بغداد کا عبرتناک واقعہ

چنانچہ اسی طرح کا ایک واقعہ ابن الجوزی رحمۃ اللہ نے اپنی کتاب ''ذم الھویٰ'' میں نقل کیا ہے جو مترجم کتاب عشقِ مجازی کی تباہ کاریاں، صفحہ: ۲۱۰ پر ذکر فرما رہے ہیں کہ امام ابن الجوزی فرماتے ہیں کہ مجھے ایک شخص کی حکایت معلوم ہوئی ہے جو بغداد میں رہتا تھا۔ نام اس کا صالح تھا۔ اس نے چالیس سال تک اذان دی تھی اور یہ نیک نامی میں بھی بہت مشہور تھا۔ یہ ایک اذان دینے کے لیے منارہ پر چڑھا اور مسجد کے پہلو میں ایک عیسائی کے گھر میں اس کی بیٹی کو دیکھا اور اس کے فتنہ میں مبتلا ہو گیا اور اُتر کر اس کے دروازے پر آیا اور اس کے دروازہ کو کھٹکھٹایا تو اس کی لڑکی نے پوچھا کہ کون ہے؟ اس نے کہا میں صالح مؤذن ہوں۔ تو اس نے اس کے لیے دروازہ کھول دیا۔ تو اس مؤذن نے فوراً اس کو اپنے سے چمٹا لیا۔ تو لڑکی نے کہا تم مسلمان بڑی دیانت امانت والے ہو۔ پھر یہ خیانت کیسی تو مؤذن نے جواب دیا کہ اگر میری بات مانتی ہو تو ٹھیک ورنہ میں تمہیں قتل کر دوں گا۔ لڑکی نے کہا کہ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا ہے۔ ہاں اگر تم اپنا دین چھوڑ دو تو۔ مؤذن نے کہا کہ میں اسلام سے بری ہوں اور اس سے بھی جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم لے کر مبعوث ہوئے ہیں۔ پھر وہ اس کے قریب ہوا تو لڑکی نے کہا کہ تم نے یہ اس لیے کیا کہ اپنا مقصد پورا کر لو۔ پھر اپنے دین کی طرف لوٹ جاؤ۔ اب میری شرط ہے کہ تم خنزیر کا گوشت کھاؤ۔ تو اس نے اس کو

کھایا۔ پھرلڑکی نے کہا کہ اب شراب پیئو۔ تو اس نے شراب بھی پی لی۔ جب اس پر شراب نے اثر کیا تو لڑکی کے قریب ہوگیا۔ تو لڑکی نے کمرہ میں داخل ہوکر اندر سے کنڈی لگالی۔ اور اس نے کہا کہ تم چھت پر چڑھ جاؤ حتیٰ کہ میرا والد آ جائے اور میرا تیرا نکاح کر دے تو وہ چھت پر چڑھ گیا اور اس سے گر کر مر گیا۔ پھر وہ لڑکی کمرہ سے باہر نکلی اور اس کو کپڑے میں لپیٹا۔ یہاں تک کہ اس کا باپ بھی آ گیا۔ تو اس نے اس کو سارا قصہ سنایا تو اس نے اس کو رات کے وقت نکال کر ایک گلی میں پھینک دیا اور اس کا قصہ مشہور ہوگیا اور اس کو گندگی کے ڈھیر پر پھینک دیا گیا۔ اَللّٰھُمَّ احْفَظْنَا مِنْ سُوْءِ الْخَاتِمَۃِ.

میرے دوستو! کیا یہ واقعہ نظر بازی کے سنگین اور خطرناک نتائج کے لیے پیش خیمہ ہونے کو ثابت کرنے میں کوئی معمولی اہمیت کا حامل ہے۔ آپ اندازہ لگائیں کہ یہی نظر ایمان سے کفر میں لے گئی اور عمر بھر کا کیا ہوا، سارا سب کچھ ضائع ہوکر رہ گیا ہے۔ کیونکہ نظر سے دل شکار ہوا اور دل نے آگے حرام کاری کی طرف بڑھنے کے لیے دعوت دی جس کے نتیجے میں وہ اپنے دین و ایمان کو قربان کرنے پر راضی ہوگیا۔

آہ! آج کا مسلمان اور بدنظری کے گناہ سے لاپرواہی

آج کے ہمارے نوجوان اس مرض کے شکار ہوکر اپنی جوانیاں تباہ کر رہے ہیں اور کیا کچھ نہیں ہو رہا ہے کہ اس کے تصور سے روح کانپ اُٹھتی ہے کہ بے حیائی میں مسلم وغیر مسلم کا کوئی فرق باقی نہیں رہ گیا ہے۔ اس سے بھی زیادہ دُکھ اور تکلیف کی بات یہ ہے کہ بظاہر دینداری کا لبادہ اوڑھے ہوئے جماعتوں، مدرسوں اور خانقاہوں سے جُڑے ہوئے لوگ، مگر عورتوں سے نظر بازی کے گناہ کو گناہ ہی نہیں سمجھتے ہیں، اس لیے اپنی دکانوں، آفسوں، کارخانوں اور سرجریوں میں جدھر بھی جاؤ تو جوان عورتوں کو اپنا نوکر اور سکریٹری (Secretary) بنا رکھا ہے اور پورے دن ان کی طرف نظر ڈال ڈال کر نظر کے زنا میں مبتلا ہو رہے ہیں اور بظاہر اپنے خیال میں وہ سمجھتے ہیں کہ یہ تو کوئی خاص گناہ کی بات نہیں ہے اور اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

میں یہ کہتا ہوں کہ کیا یہ کم حرج اور گناہ ہے کہ آپ نے اپنے اللہ کے حکم کو توڑا ہے اور اس کی نافرمانی کی ہے اور از روئے قرآن و سنت نظر بازی کرنے والے اللہ و رسول کے نافرمان اور ملعون اور آنکھوں کے زناکار کہلاتے ہیں۔ اور اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ کو چھوڑنے والے کہلاتے ہیں، اب اگر آگے اور کچھ بھی نہ ہو تو کیا ایک مؤمن کے لیے یہ کچھ کم ہے، اس لیے حکیم الامت تھانوی رحمہ اللہ کو کسی نے لکھا کہ نماز پڑھ کر کیا ملا تو فرمایا کہ بس نماز ہی ملی ہے، یہی کیا کم نعمت ہے اور اس سے زیادہ مزید جو کچھ ملے وہ سب مِن اللہ ہے، مگر نماز پڑھ کر نماز ملی اور خدا کے سامنے اظہارِ بندگی کی نعمت حاصل ہوئی۔ یہ ہمارے حضرت والا کا خاص مضمون ہے اور یہ اس دور کا خاص پھیلا ہوا مرض ہے، اس لیے حضرت نے خلاصہ کے طور پر فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت نبی پاک صلی اللہ

علیہ وسلم کے ذریعہ مسلمان مردوں اور عورتوں سے کہلوایا اور حکم دیا ہے کہ اپنی نگاہوں کو بچا کر رکھو اور پست رکھو اور فرمایا کہ:

﴿قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ﴾

(سورۃ النور، آیت: ۳۰)

ترجمہ: مسلمانوں سے کہیے کہ اپنی بعض نگاہوں کو پست رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں۔

اور حدیث پاک میں فرمایا گیا ہے کہ:

﴿لَعَنَ اللّٰهُ النَّاظِرَ وَالْمَنْظُوْرَ اِلَيْهِ﴾

(مشکوٰۃ المصابیح، کتاب النکاح، باب النظر الی المخطوبۃ، ص: ۲۷۰)

جو کسی پر نظر ڈالے اور اپنے کو دیکھنے کے لیے پیش کرے تو ان دونوں پر اللہ کی لعنت ہو اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ:

﴿زِنَا الْعَيْنِ النَّظَرُ﴾

(صحیح البخاری، کتاب الاستیذان، باب زنا الجوارح دون الفرج، ج: ۲، ص: ۹۲۲)

یعنی نظر بازی آنکھوں کا زنا ہے تو اس آیت و حدیث کو سامنے رکھ کر ہم یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ جو نظر نہیں بچاتا ہے تو وہ ایک لقب پاتا ہے کہ اللہ و رسول کا نافرمان ہے۔

اور حدیثوں سے معلوم ہوا کہ اس کو دوسرے دو لقب ملتے ہیں ایک ملعون اور دوسرا آنکھوں کا زناکار۔ کس قدر بُرے اور مذموم القاب ہیں کہ اگر کوئی اس نظر باز کو ان ناموں سے پکارے تو اسی وقت لڑنے مرنے کو تیار ہو جائے گا، مگر حقیقی طور پر عنداللہ وہ ان بُرے ناموں کا مستحق ہو جاتا ہے، اس لیے حضرت والا نظر کی حفاظت نہ کرنے والے پر آہ دردِ زخم و شفقت بھر کر فرما رہے ہیں کہ افسوس! ایسا انسان اپنے کس قدر دنیا و آخرت کے خسارہ میں ہے۔ اگر وہ نظر کی حفاظت کرے تو اس کے دل و دماغ بھی راحت و سکون سے رہیں اور وہ دل میں عجیب حلاوتِ ایمانی محسوس کرے گا۔ اس کے ضمن میں یہ بھی عرض کرنا مناسب ہے کہ یہاں جس نظر بازی کی بات ہو رہی ہے کہ وہ صرف نامحرم عورتوں کے ساتھ ہی خاص نہیں ہے بلکہ جو جوان امرد لڑکے ہوتے ہیں جن کی طرف دیکھنے سے جی لگتا ہے اور نفس کو حظ و سرور ملتا ہے وہ بھی اس حکم میں ہیں، اس لیے ایسے اَمردوں کا حکم شرعی طور پر لڑکی ہی کا حکم ہے۔

اکابر و اسلافِ امت کی حفاظتِ نظر کے سلسلہ میں احتیاط

چنانچہ جملہ اکابرین و اولیائے اُمت ان سے اسی طرح پرہیز کرتے تھے جیسے لڑکی سے پرہیز کرتے تھے، اس لیے امام ابوحنیفہ کے متعلق آتا ہے کہ:

﴿وَكَانَ مُحَمَّدُ بْنُ الْحَسَنِ صَبِيْحًا وَكَانَ اَبُوْ حَنِيْفَةَ يُجْلِسُهُ فِيْ دَرْسِهِ خَلْفَ ظَهْرِهِ﴾

مَخَافَةَ خِيَانَةِ الْعَيْنِ مَعَ كَمَالِ تَقْوَاهُ﴾

(رد المحتار، كتاب الحظر والاباحة)

امام محمد کے خوبصورت ہونے کی وجہ سے ان کو امام ابوحنیفہ ان کو پیچھے بٹھایا کرتے تھے۔

چنانچہ ابن الجوزی رحمۃ اللہ کی کتاب مترجم میں صفحہ: ۳۰۷ پر حدیث نقل ہے کہ:

﴿نَهَى رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ يَّحُدَّ الرَّجُلُ النَّظَرَ اِلَى الْغُلَامِ الْاَمْرَدِ﴾

(الرد المفحم)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا کہ انسان کسی بے ریش لڑکے کی طرف نگاہ ڈالے۔

حضرت امام مالک رحمہ اللہ سماع حدیث کے لیے بے ریش لڑکوں کو اپنی مجلس میں بیٹھنے سے منع کرتے تھے۔ ہشام ابن عمار حیلہ کر کے لوگوں کے مجمع میں چھپ کر بیٹھ گئے۔ اس وقت وہ بے ریش تھے اور امام مالک سے سولہ حدیثیں سن لیں۔ امام مالک کو جب اس کی خبر دی گئی تو انہوں نے اس کو بلایا اور سولہ دُرّے مارے۔ حضرت ہشام فرماتے ہیں کہ کاش! کہ میں ان سے سو حدیثیں سنتا اور مجھے سو دُرّے مارتے۔

حضرت جنید بغدادی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ایک شخص حضرت امام احمد بن حنبل کی خدمت میں آیا۔ اس کے ساتھ ایک حسین چہرہ والا لڑکا بھی تھا۔ آپ نے اس شخص سے پوچھا کہ یہ کون لڑکا ہے؟ عرض کیا کہ یہ میرا بیٹا ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اس کو دوبارہ اپنے ساتھ مت لانا جب وہ شخص چلا گیا تو امام صاحب سے محمد بن عبدالرحمٰن رحمہ اللہ محدِّث نے عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ اس شخص کی مدد کرے وہ پاکدامن تھا اور اس کا بیٹا (بے ریش لڑکا) اس سے افضل تھا تو حضرت امام احمد رحمہ اللہ نے فرمایا کہ ہم نے جس مقصد کا ارادہ کیا ہے اس کو ان کا پاکدامن ہونا نہیں روکتا ہے۔ ہم نے شیوخ اساتذہ کو اسی طرزِ عمل پر دیکھا ہے اور انہوں نے ہمیں اپنے اسلاف سے اس کا پتہ دیا ہے۔

حضرت ابو سہل رحمہ اللہ فرماتے ہیں عنقریب اس اُمت میں ایک قوم ہوگی جن کو لونڈے باز کہا جائے گا۔ ان کی تین قسمیں ہوں گی۔ (۱) ایک قسم صرف (حسین لڑکوں) کو دیکھنے والی ہوگی۔ (۲) دوسری قسم ان سے ملاقات کرے گی، مصافحہ کرے گی۔ (۳) تیسری قسم یہ گھناؤنا فعل کرے گی۔

حضرت ابراہیم حربی رحمہ اللہ فرماتے ہیں اپنی اولاد کی بُرے دوستوں سے حفاظت کرو۔ اس سے پہلے کہ تم ان کو گناہ میں مبتلا کر دو کیونکہ سب سے پہلے بچوں میں خرابی آپس میں شروع ہوتی ہے۔

ابوعبداللہ بن الجلاء کہتے ہیں کہ میں کھڑے ہو کر ایک حسین صورت عیسائی لڑکے کو دیکھ رہا تھا تو میرے پاس سے حضرت ابوعبداللہ بلخی رحمہ اللہ گذرے اور پوچھا کہ تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ میں نے عرض کیا کہ اے چچا!

آپ کا کیا خیال ہے کہ یہ حسین صورت کافر ہونے کی وجہ سے دوزخ میں جلائی جائے گی تو انہوں نے میرے کندھے پر ہاتھ مارا اور فرمایا تم اس بدنظری کے وبال کو دیکھو گے اگر چہ کچھ مدت کے بعد چنانچہ ابن الجلاء فرماتے ہیں کہ میں نے اس کا وبال چالیس سال بعد دیکھا کہ مجھے قرآن پاک بھلادیا گیا۔ (۷۳ سے ۸۱ تک از ذم الہوی مترجم)

یہ چند واقعات ہیں جو اسلاف اُمت کے عمل اور ان کے احتیاط اور تقویٰ کو بیان کرنے اور اپنی عبرت کے لیے پیش کیے ہیں۔ افسوس کہ آج ایک طبقہ یہ کہہ کر اس میں مبتلا رہتا ہے کہ یہ تو گناہِ صغیرہ ہے حالانکہ خود صغیرہ گناہ پر اگر اصرار ہو تو وہ کبیرہ بن جاتا ہے۔ اور بہت سے تو اس گناہ کو گناہ ہی نہیں سمجھتے اور نہ اس موضوع پر تقریر و بیان اور وعظ و نصیحت کو پسند کرتے ہیں بلکہ اسے دین میں تشدد اور سختی سے تعبیر کرتے ہیں جو بالکل دین سے ناواقفیت اور جہالت پر مبنی ہے۔

اخلاص کے بغیر منزل نہیں مل سکتی

کیسے پائے گا قرب کی منزل
جب کوئی وقفِ نان ہوتا ہے

ظاہر ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی نگاہ میں بڑے سے بڑا عمل بھی اگر رضائے الٰہی کی غرض اور نیت سے نہ کیا جائے تو پھر اس عمل کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی ہے اور انسان بڑی سے بڑی عبادت کے ذریعہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا قرب نہیں پاتا ہے۔ ہم سب کی منزل مقصود اللہ تبارک وتعالیٰ کا قرب و رضا ہے اور اس کے حصول کے لیے دونوں باتیں ضروری ہیں، جو بھی عمل کیا ہے وہ شریعت وسنت کے مطابق ہو اور دوسری چیز کہ وہ نیت صحیح یعنی اخلاص کے ساتھ اللہ کی رضاء کے لیے کیا جائے۔ ان میں سے اگر کوئی بھی مفقود ہو تو پھر وہ عمل بے کار اور باعثِ مؤاخذہ و عتاب ہوتا ہے۔

اوّل کی مثال یہ ہے کہ جیسے کوئی شخص بڑی ہی خشوع وخضوع والی نماز پڑھے اور اس میں خوب آہ وزاری کرے اور بڑی توجہ الی اللہ بھی ہو، مگر عصر کی نماز کے بعد نفل کی نماز ہو یا عید کے دن روزہ ہو تو اس طرح کے عمل میں خواہ کتنا ہی اخلاص ہو وہ غیر معتبر اور غیر مقبول ہے اور ٹھیک اسی طرح اگر کوئی شخص صحیح حقیقی جہاد واقعی شرعی طریقوں کے مطابق کررہا ہو اور بہت صحیح جگہوں میں اپنی دولت خرچ کررہا ہو، مگر اس سے اس کی نیت صحیح نہ ہو تو روایت بہت ہی مشہور ہے کہ شہید وسخی وقاری کو لاکر ان کو اوّل جہنم میں منہ کے بل گھسیٹ کر ڈالا جائے گا کیونکہ ان کی قراءت و جہاد وسخاوت اللہ کی رضا کے لیے نہ تھی، اس لیے اہل اللہ سے تعلق اور ان کی صحبت میں بھی اپنی نیت کا جائزہ لیتے رہنا چاہیے کہ کیا میں اس لیے یہاں آتا ہوں کہ یہاں کھانے کا بہت اچھا نظم ہے یا اس لیے آتا ہوں کہ یہاں بڑے مالدار لوگ ہیں، ان سے تعلق ہونے میں آسانی رہے گی یا اس لیے آتا ہوں کہ یہاں آکر بڑی جلدی عالمی

شہرت حاصل ہو جائے گی وغیرہ وغیرہ یہ ساری نیتیں قابلِ اصلاح ہے۔صرف اللہ کو پانے اور اپنی اصلاح کی نیت سے آنا چاہیے اور کسی اللہ والے کی صحبت میں اسی نیت کے ساتھ ایک مدت رہنا چاہیے۔

اخلاص کی ایک الہامی حکمت

احقر ایک بات عرض کرتا ہے تاکہ اگر اس میں کچھ غلطی ہو تو اصلاح ہو جائے وہ یہ کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہمیں اخلاص کا حکم دے کر احسانِ عظیم فرمایا ہے کیونکہ اگر ہم کو یہ کہا جاتا کہ اتنے اتنے لوگوں کو خوش کرو اور ان کے سامنے ان کے لیے کام کرو کہ یہاں تک کہ وہ خوش ہو جائیں تو بڑا مشکل ہو جاتا۔

میرے دوستو! غور کرو کہ ایک ایسی ہستی کو خوش کرنا کہ جو ہر گھڑی ہمارے دل کی دھڑکنوں سے بھی واقف، جو ہمارے خفیہ وعلانیہ ظاہر و باطن کا جاننے والا، جو سارے انسانوں اور ساری مخلوقات کا کنٹرول کرنے والا ہے اور جس کے حکم کے بغیر درخت پر ایک پتہ بھی حرکت نہیں کرتا ہے اور جس کے فیصلہ کے بغیر نہ کسی میں نفع کی طاقت اور نہ نقصان وضرر کا اختیار تو ایسے ایک رب کو راضی کرنا کتنا آسان ہے۔

جبکہ مختلف انسانوں کی سوچ مختلف، ان کا مزاج مختلف، طبیعتیں مختلف، اور چاہتیں الگ، پسند و ناپسند کا معیار جدا جدا، ایک کو راضی کرو تو دوسرا ناراض، دوسرے کو راضی کرو تو پہلا ناراض تو سب کو راضی کرنا انسان کے لیے بہت ہی مشکل ہو جاتا۔ پھر انسان کا علم ناقص، اس کی عقل وفہم ناقص، اس لیے بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص جو واقعی آپ کا خیر خواہ ومخلص و ہمدرد ہو، مگر کسی نے ایک دو بات اس کے متعلق آپ کے کانوں میں ڈال دیں بس آپ بدظن ہو گئے اور اپنی بیسیوں سال کی عقیدت ومحبت اور دوستی کو ایک طرف ڈال دیا۔

بس احقر درد بھرے دل سے کہتا ہے اور دل کی گہرائیوں سے یہ پیغام دینا چاہتا ہے کہ اسلام کا راستہ اللہ نے بہت آسان کر دیا ہے کہ ایک مجھے راضی کرو، باقی کسی کی پرواہ نہ کرو کیونکہ ہر سانس کے بدلے دوسرا سانس دینے والا، ہر صبح وشام روزی ورزق دینے والا میں ہوں۔ اگر تم نے مجھے راضی کیا تو سمجھو کہ سب کچھ تم نے پالیا۔ رزق بھی، عزت بھی، سکون بھی، راحت بھی کیونکہ سب کچھ کا میں اکیلا مالک ہوں اور میرا کوئی شریک وساجھی نہیں ہے۔اسی لیے تو حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ:

﴿يَا مَعَاذُ اَخْلِصِ الْعَمَلَ يَكْفِكَ الْقَلِيْلُ مِنْهُ﴾

(تفسیر القشیری)

اے معاذ! عمل کو خالص اللہ کے لیے کرو تو تھوڑا سا بھی کافی ہو جائے گا، اس لیے اصل چیز، ہر عمل کی جان اخلاص ہے، اسی لیے جگہ جگہ قرآن وحدیث میں اس کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔

اور یہ بھی احقر بہت صاف لفظوں میں عرض کر دینا چاہتا ہے کہ اللہ والوں کی صحبت اُٹھائے بغیر اور ان سے

تعلق کیے بغیر اخلاص کی حقیقت کا پتہ بھی نہیں چلتا ہے۔ بس لفظ ہی لفظ ہوتے ہیں، مگر اخلاص کامل کیا ہے؟ اس کا پتہ صرف اللہ والوں کے پاس رہ کر ہی ہو پاتا ہے، اسی لیے ایک بہت بڑے عالم حضرت شیخ الحدیث رحمہ اللہ سے ملے اور عرض کیا کہ یہ تصوف کیا ہے؟ مجھ کو سمجھا دیں اور ان کا یہ خیال تھا کہ حضرت گھنٹوں تقریر کریں گے اور پھر شاید سوال و جواب کی نوبت بھی آئے گی اور اگر حضرت شیخ نے یوں فرمایا تو میں یوں اعتراض کروں گا اور یوں فرمایا تو یوں اعتراض کروں گا لیکن صورت وحال یہ ہوئی کہ حضرت نے فرمایا کہ بس تصوف کی حقیقت تصحیح نیت ہے۔ یعنی اس کی ابتداء تصحیح نیت ہے اور انتہاء احسان واخلاص ہے۔ چنانچہ حدیثِ جبرئیل میں ایمان واسلام کے بعد جس احسان کا تذکرہ ہے بس اسی احسان کو ہم اپنی اصطلاح میں تصوف کہتے ہیں اور اصطلاحات بدلنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔ یعنی یہ کہ ہر گھڑی اللہ تعالیٰ کا دھیان اور خیال رہنے لگے۔ ہر عمل کی ابتداو بقاء دونوں میں صرف مرضی محبوب پیش نظر ہو۔ اس کے غیر سے نظر بالکل اُٹھ جائے اور یہی چیز سالک کو سب سے اخیر میں جا کر حاصل ہوتی ہے۔ اور مدار نجات یہی ہے۔ باقی سب کے لیے ہلاکت و بربادی اور نقصان وخسران ہے۔

شتربان حکمراں کیونکر بنے؟

دیکھ لو شانِ فیض پیمبر
شتربان حکمران ہوتا ہے

حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم وتربیت کا کمال ہے کہ ایسی قوم جو جہالت وگمراہی میں اور قتل و غارت گری میں اعلیٰ درجہ پر فائز تھی جن میں تہذیب وتمدن کا نام ونشان نہ تھا اور وہ ایسے گئے گذرے شمار ہوتے تھے کہ ان پر اس وقت کی حکومتوں کے بادشاہ حکومت کرنے کو باعث عار سمجھتے تھے، مگر حق تعالیٰ نے ایسی ہی جگہ پر اپنے سب سے محبوب نبی حضرت محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کو انہیں میں سے پیدا فرمایا اور پھر آپ کی تعلیمات کو قبول کرنے اور ان پر عمل پیرا ہونے کی برکت سے یہ لوگ جو کل تک اونٹوں کو چراتے تھے اور راعی الابل کہلاتے تھے۔ اب راعی القوم اور ایسے بادشاہ بنے کہ قیامت تک دنیا ان کو یاد رکھے گی اور ایسی تہذیب وتمدن والے بنے کہ اس دور کے سارے ترقی یافتہ ممالک اور قومیں ان کی غلام بنیں اور ان کے نام سے کانپنے اور تھرانے لگے۔

چنانچہ ہمارے دارالعلوم آزادول کی مسجد میں پاکستان کے ایک عالمِ دین نے بیان فرمایا تھا کہ ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک مقام سے گذرتے ہوئے وہاں ذرا ٹھہرے اور آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ تو صحابہ نے دریافت کیا کہ یا امیر المؤمنین! ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ تو ارشاد فرمایا اور بڑی عجیب بات فرمائی۔ ارشاد فرمایا کہ مجھے اس جگہ پر پہنچ کر اپنے ماضی کا ایک قصہ یاد آ گیا ہے کہ ٹھیک اس جگہ پر میرے والد نے مجھ سے کہا تھا کہ تجھے تو اونٹوں اور بکریوں کا چرانا اچھی طرح نہیں آتا تو زندگی کیسے بسر کرے گا اور اپنی زندگی میں کیا کرے گا؟ تجھ سے کچھ

نہ ہو سکے گا۔ تو مجھے وہ جملے یاد آئے اور آج حضرت نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی اور اتباع کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے ہمیں کیا کچھ عطا کیا ہے اور کیا عزت وشرف بخشا ہے، اس لیے آنکھوں میں آنسو ہیں۔

اور یہ بات ظاہر ہے کہ کسی کے پاس رہ کر جاہل اور سرکش افراد کا درست اور ٹھیک ہو جانا اور اخلاقِ حمیدہ اور اوصاف عالیہ کا حامل ہو جانا، یہ درحقیقت خود مربی کا کمال ہوتا ہے اور اس میں اس کے طرقِ تربیت اور انداز اصلاح کا بڑا دخل ہوتا ہے۔ تو حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کے کمالات اور ان کے اخلاقِ عالیہ اور ان کی صفاتِ حمیدہ جتنی بیان کی جائیں یہ درحقیقت خود حضرت نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف وتوصیف ہے اور اس سب میں خود بخود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کا عالی ہونا اور آپ کا واقعی نبی برحق اور مؤید من اللہ ہونا معلوم ہوتا ہے اور آپ کی تربیت واصلاح کی باتوں کا وحی ہونا ثابت ہوتا ہے، اس لیے کہ جو لوگ جیسے اہلِ تشیع روافض صحابہ کی شان میں گستاخی کرتے ہیں وہ نادان یہ نہیں سوچتے کہ یہ سب وشتم صحابہ پر درحقیقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ تربیت میں تنقیص اور اس میں کیڑے نکالنا ہے یا ان کے ارتداد کی باتیں کرنا یہ سب شیطانی راستے ہیں اور ڈائریکٹ (Direct) حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر اعتراض کرنا ہے۔ اس لیے اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پورے تیئس سالہ دورِ نبوت میں انسانوں کی اصلاح ہو کر ان کو اعلیٰ مقامِ قرب حاصل نہ ہوا ہو تو پھر میں یہ کہوں گا کہ کسی ولی اللہ کی تربیت میں تو سینکڑوں اور ہزاروں سالوں میں بھی کسی کی تربیت ممکن نہ ہوگی۔

اس لیے حضرت والا کے اس شعر کا خلاصہ یہ ہے کہ یہی حضرات جو شتربان تھے حکمران اور صحابہ بنے اور رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ کے سرٹیفکیٹ (Certificate) کے مستحق قرار پائے یعنی قیامت تک کے لیے اللہ کی رضا کا سرٹیفکیٹ قرآن نے ان کو دیا۔ یہ سب کچھ فیضانِ نبوت کا اثر ہے کہ حقیقی انسان بننا نصیب ہوا اور ظاہر وباطن کی کایہ پلٹ گئی۔

صحابہ مسلمان ہو کر معزز تھے تو ہم خوار کیوں؟

یہاں یہ بھی داستان درد وغم چھیڑنی ضروری ہے کہ ایک طرف وہ شتربان حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی اور دل وجان سے سچی اتباع کی برکت سے ذلت وخواری سے نکل کر رفعت وعزت حاصل کرتے تھے اور دوسری طرف آج کا مسلمان ہے۔ نامعلوم کہ اس نے کہاں سے یہ سیکھا؟ اور جانا ہے کہ اللہ کے باغی اور دُشمن یہود ونصاریٰ کی تہذیب وتمدن ان کے طور وطریق ان کے رہن سہن سے محبت کرو اور اس کو رواج دو اور اس میں تفاخر کرو اور اس کو اپناؤ تو تم باعزت ہو جاؤ گے۔ خواہ ہماری تجارتیں ہوں یا معاشرتیں اور معاملات ہو یا اخلاقیات ہوں سب میں ان کی اتباع وپیروی ہمارا شعار بن چکی ہے اور ہم نے ذلت کی راہوں میں عزتیں ڈھونڈنا شروع کر دی ہیں۔ اور بس اگر دینداروں کا بھی ذکر کروں تو انہوں نے بھی دین کو صرف مسجد اور نماز تک منحصر کر دیا ہے کہ نماز روزہ اور

حج وعمرہ وغیرہ چند عبادات کو ادا کر کے باقی اسلام کی جامع اور مکمل تعلیمات سے کلی طور پر انحراف پایا جا رہا ہے، حالانکہ دینِ اسلام ایک مکمل جامع نظامِ حیات اور دستورِ زندگی ہے۔ جس کے کسی بھی شعبہ میں کوئی کمی اور کسر نہیں ہے کہ جس میں اسلام کی تعلیمات موجود نہ ہوں۔ پیدا ہونے سے مرنے تک۔

بلکہ میں تو آگے بڑھ کر یہ کہتا ہوں کہ پیدا ہونے سے بھی پہلے سے اسلامی تعلیمات آپ کے متعلق موجود ہیں اور اسی طرح مرنے تک نہیں بلکہ مرنے کے بعد بھی آپ کے لیے اسلامی تعلیمات موجود ہیں۔ افسوس صد افسوس! اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے ایسے جامع اور مکمل دستورِ حیات کو چھوڑ کر خود یہود و نصاریٰ کے گھڑے ہوئے طریقوں کو اختیار کر کے ان میں اپنی عزت محسوس کرنا، اس سے بڑی تباہی اور بربادی کیا ہوسکتی ہے، اسی لیے آج مسلمان ہر طرف ذلیل وخوار ہیں اور اس لیے آج بھی ہم مسلمانوں کے لیے عزت کا وہی پرانا راستہ ہے جیسا کہ فرمایا گیا ہے لَنْ يَصْلَحَ اٰخِرُ هٰذِهِ الْاُمَّةِ اِلَّا بِمَا صَلَحَ بِهٖ اَوَّلُهَا یعنی اس اُمت کا اخیر ہرگز درست نہیں ہوسکتا، مگر انہیں چیزوں سے کہ جن چیزوں سے اس اُمت کا اوّل اچھا ہوا ہے یعنی جن بنیادوں پر یہ اُمت عزت پائی تھی اور اس کے شتربانوں نے شاندار حکمرانی کی تھی۔ بس آج کے دور میں بھی اس اُمت کی فلاح وصلاح اور اس کی کامیابی وکامرانی اور اس کی عزت ورفعت کے لیے وہی راستہ ہے۔ اس کے علاوہ دوسرے راستوں میں اس اُمت کی تباہی اور بربادی کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہے۔

صاحبو آہ! کس دردِ دل سے کہوں کہ آج ہماری بنیادی تباہی و بربادی کی وجہ تو یہ ہے کہ ہم نے حضرت نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات وہدایات کو چھوڑ کر دُشمنوں کے طریقوں کو اختیار کرلیا ہے حالانکہ ہمیں اس کی بالکل ضرورت نہیں تھی کیونکہ اگر کسی ملک کے پاس اپنی ساری چیزیں ملک سے پیدا ہونے والی موجود ہوں اور وہ ملک ہر طرح سے خود کفیل ہو تو وہ اپنے اس خود کفیل ہونے پر فخر کرتا ہے اور اس کو باہر سے درآمدات اور امپورٹ (Import) کی ضرورت نہیں پڑتی ہے بلکہ اگر باہر والوں کو ضرورت ہو تو وہاں سے ضروری اشیا برآمد اور ایکسپورٹ (Export) کی جاتی تو آخر میرے بھائیو! جب ہمارے اللہ نے ہمیں ایسا دین نہیں دیا ہے کہ جس میں کوئی کمی ہو کہ اس کو ہم دوسروں سے حاصل کریں بلکہ بحمد اللہ مکمل اور جامع نظام حیات عطا فرمایا ہے کہ جس میں زندگی کے ہر شعبہ کے لیے احکام اور طریقے موجود ہیں تو پھر ہمیں دوسروں کے طریقوں کو اپنے اندر لانے کی کیا ضرورت ہے اور جبکہ وہ دوسرے ہمارے حقیقی دُشمن ہیں اور ہمیں نقصان پہنچانے میں کوئی کسر اور کمی نہیں چھوڑتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ پوری اُمت کی حفاظت فرمائے۔

منزلِ قرب سے گذرے بغیر نشانِ منزل نہیں بن سکتے

منزلِ قرب سے جو گذرے گا
منزلوں کا نشان ہوتا ہے

جو انسان اللہ تعالیٰ کے قرب و محبت کو حاصل کرنے کے لیے مجاہدات و ریاضتوں سے گذرتا ہے اور خونِ آرزو پیتا ہے اور زندگی کے ہر شعبہ میں اپنی جی چاہی پر ربّ چاہی کو غالب کر دیتا ہے۔ تو پھر اللہ تبارک وتعالیٰ اس کو ایسا عظیم مرتبہ عطا فرماتے ہیں کہ لوگ اس کو دیکھ کر اس کے اعمال و افعال کو دیکھ کر اس کی صورت و سیرت کو دیکھ کر دین پر آنے لگتے ہیں۔ اس کی ایک ایک ادا ایسی سنت و شریعت کے سانچہ میں ڈھلی ہوئی ہوتی ہے کہ لوگ اس کو اپنا مقتدا اور شیخ و رہبر بنانے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں اور اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ مردہ دلوں کی زندگی کا سامان فراہم کرتے ہیں اور اس کے شب و روز میں ہونے والے معمولات مؤمنین کے لیے قابلِ اتباع ہوتے ہیں اور گویا حضرت والا کے الفاظ میں کہ اللہ تعالیٰ اسے منزلوں کا نشان بنا دیتے ہیں۔

گویا کہ جس طرح وہ منزلِ قربِ خداوندی تک پہنچا ہوا ہوتا ہے تو جو اس سے جُڑ جاتا ہے وہ بھی اس منزل تک پہنچ جاتا ہے اور اگر خود انسان ان راہوں سے گذرا ہوا نہ ہو تو پھر کیا دوسرے کے لیے نمونہ اور قابلِ اتباع ہوگا گویا حضرت والا اس شعر میں ہم کو یہ نصیحت فرما رہے ہیں کہ اگر ہمیں دنیا میں اللہ تعالیٰ کے عشق و محبت کو پھیلانا اور لوگوں کو اس کا سبق دینا ہے اور پورے عالم میں پھر پھر کر لوگوں کو اپنے اللہ کا دیوانہ بنانا ہے تو پھر خود بھی فرزانگی کے اصولوں کو چھوڑ کر دیوانگی کی راہوں پر آنا پڑے گا اور ساری حرام لذتوں اور آرزوؤں کو اللہ تعالیٰ کی رضا پر فنا کرنا پڑے گا، تب جا کر یہ مرتبہ قرب و قبول حاصل ہوگا ورنہ یاد رکھیے کہ صرف آرزوؤں سے یہ راستہ طے نہیں ہوتا ہے۔

اللہ کے ہوتے ہوئے کسی کی کیا پرواہ

سارا عالم کرے گا کیا اختؔر
جس پہ حق مہربان ہوتا ہے

جو مضمون حضرت والا نے اس شعر میں پیش کیا ہے، اس مضمون سے قرآن و حدیث بھرے ہوئے ہیں۔ جیسے اس میں سے چند احقر پیش کرتا ہے۔ قرآن کریم میں حق تعالیٰ نے اعلان فرمایا ہے کہ:

﴿وَأَنْتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِيْنَ﴾
(سورۃ ال عمران، آیت: ۱۳۹)

ترجمہ: اور تم ہی بلند و برتر رہو گے اگر تم مومن ہو۔

اگر تم میرے سچے عاشق اور حقیقی چاہنے والے اور مجھے دل و جان سے ماننے والے رہو گے تو پھر میں کسی

کو تم پر غالب نہ کروں گا بلکہ ہمیشہ تم ہی سر بلند رہو گے اور عزت و رفعت تمہارا مقدر ہوگی اور ہر قدم پر نصرت و تائیدِ خداوندی سے تم منصور و موئید رہو گے، مگر اس کے لیے شرط یہی ہے کہ تم نیک و صالح اور واقعی اہلِ ایمان رہو۔ جیسے دوسری آیت میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ:

﴿وَإِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا﴾

(سورۃ آل عمران، آیت: ۱۲۰)

ترجمہ: اور اگر تم صبر اختیار کرو اور تقویٰ اختیار کرو تو ان کی سازشیں تمہیں کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتیں۔

(معارف القرآن، ج:۲،ص:۱۵۶)

اللہ تعالیٰ اعلان فرماتے ہیں کہ اگر تم صبر و تقویٰ کے ساتھ متصف رہو گے تو پھر تم کو ان دُشمنوں کی سازشیں اور ان کی تدبیریں بالکل نقصان نہیں پہنچا سکیں گی۔ قرآن کریم نے تیسرے ایک مقام پر جہاں شیطان کے تصرف اور شیطانی چالوں سے متاثر ہونے والوں کا ذکر ہے اس مقام پر یہ بھی مذکور ہے **اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ** کہ میرے خالص و مخلص بندوں پر شیطان کا کوئی اثر نہیں چلے گا۔ تو حضرت والا فرماتے ہیں کہ سارا عالم ایسے شخص کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا ہے کہ جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی مہربانیاں اور عنایتیں ہوں اور اللہ کہ مہربانیاں اور عنایتیں کن کے ساتھ ہیں؟ تو قرآن نے اس کا بھی اعلان فرمایا ہے کہ:

﴿إِنَّ رَحْمَةَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ﴾

(سورۃ الاعراف، آیت: ۵۶)

ترجمہ: بے شک اللہ تعالیٰ کی رحمت محسنین سے قریب ہے۔

اس لیے جو خاصانِ خدا اور اللہ کے نیک و صالح اور مخلصین بندے ہیں، ان کے دُشمن ان کے خلاف کتنی بھی سازشیں کریں، مگر پوری تاریخ اس پر گواہ ہے کہ وہ دُشمن مٹتے چلے جاتے ہیں اور یہ اللہ والے چمکتے چلے جاتے ہیں اور دنیا اُن کے قدموں میں آتی ہے۔

تو میرے دوستو! اللہ والا بننے اور نیک صالح بننے کے بے شمار دنیوی اور اخروی فائدے ہیں جو قرآن و حدیث میں مذکور ہیں، مگر ان سارے فائدوں میں سب سے اعلیٰ اور اونچا فائدہ اور نفع یہی ہے کہ ہر قدم پر نصرت الٰہی اور تائیدِ ربانی اس کے ساتھ ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ ہر قسم کے دُشمنوں کی طرف سے اس کو کافی ہو جاتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ اس سے بڑھ کر اور کیا فائدہ اور نفعِ عظیم ہو سکتا ہے کہ وہ ہر وقت اپنے اللہ کی مہربانیوں اور عنایتوں کی بارش میں رہتا ہے اور جو وعدۂ حدیث پاک کے اندر آیا ہے کہ:

﴿وَاَتَتْهُ الدُّنْيَا وَهِيَ رَاغِمَةٌ﴾

(سنن الترمذی، کتاب صفة القیامة والرقاق)

کہ دنیا اس کے پاس ذلیل ہو کر آتی ہے اور اس کے پیچھے پیچھے پھرتی ہے۔ وہ اس کو اپنی آنکھوں سے پورا ہوا دیکھتا ہے۔

چنانچہ حضرت مولانا نانوتوی رحمہ اللہ کا ایک واقعہ ان کے حالات میں لکھا ہے کہ ان کے پاس ایک شخص کچھ ہدیہ لے کر آیا اور اس کی نیت مخلصانہ نہ تھی جس کو حضرت نے اپنی فراستِ ایمانی سے تاڑ لیا اور اپنے قلب میں محسوس کر لیا کیونکہ یہ اللہ والے لوگ خاص فراستِ ایمانی رکھتے ہیں جس کو فرمایا گیا ہے کہ:

﴿اِتَّقُوْا فِرَاسَةَ الْمُؤْمِنِ فَاِنَّهٗ يَنْظُرُ بِنُوْرِ اللّٰهِ﴾

(سنن الترمذی، کتاب تفسیر القرآن)

کہ مؤمن کی فراستِ ایمانی سے بچو اور ڈرو کیونکہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔

تو بہر حال حضرت نے اپنا چہرہ پھیر لیا اور منع فرما دیا تو اس شخص نے دوسری طرف سے جا کر حضرت کو دینا چاہا تو حضرت نے ادھر سے بھی رُخ پھیر لیا۔ بالآخر وہ شخص حضرت کے جوتوں میں وہ پیسے رکھ کر چلا گیا تو حضرت اُٹھے اور پیسوں کو جوتوں سے جھاڑا اور چلتے بنے۔

یہ وہ چیز ہے کہ جب کوئی حقیقی معنی میں اللہ والا بنتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ دنیا کو اس طرح اس کے قدموں میں لاتے ہیں اور پھر وہ دنیا کو کوئی اہمیت و وقعت نہیں دیتا ہے۔ لیکن یہاں یہ بھی عرض کرنا ضروری ہے کہ اگر کوئی شخص نیک و صالح بننا چاہے اور وہ سلوک طے کر رہا ہو اور اس نیت سے اس راہ کو طے کر رہا ہو کہ لوگ میرے نیک بننے کے بعد اس طرح میرے بھی پاس آیا کریں گے اور میری تعظیم و تکریم کریں گے اور میں خوب مشہور ہوں گا اور مجھے خوب ہدایا و تحائف پیش کیے جایا کریں گے اور لوگ مجھے بزرگ سمجھیں گے تو یاد رکھنا چاہیے کہ اس نیت کا دل میں رکھنا خود غیر اللہ ہے اور ایسے بتوں کو دل میں رکھتے ہوئے پھر اللہ کی محبت کا دل میں آنا یہ محض خواب ہے جو کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکتا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے کلمہ لاالٰہ الا اللہ میں لا الٰہ کو مقدم رکھا ہے اور الا اللہ کو بعد میں رکھا ہے کہ پہلے دل سے سارے الٰہ نکالو اور سارا غیر نکالو تب جا کے اللہ دل میں آئیں گے۔

لا اِلٰہ ہے مقدم کلمۂ توحید میں
غیرِ حق جب جائے ہے تب دل میں حق آ جائے ہے

اور یہ سارا عزتوں اور عظمتوں کا نقشۂ مظنونہ یہ سب غیرِ حق ہے یہ سب کچھ دل و دماغ کے حاشیوں سے بھی باہر ہو، بس صرف پیشِ نظر اللہ ہی اللہ ہو۔ تب انسان خدا کا محبوب بنتا ہے اور تب ان سب فضیلتوں اور وعدوں کا مستحق ہوتا ہے، لیکن آج ہماری کمی یہی ہے کہ انتظار بڑی بڑی بشارتوں کے نزول کا ہے، مگر جو صحابہ کے مجاہدات و قربانیاں ہیں، ہم ان کے پاسنگ بھی نہیں ہیں تو ہمارا حال ایسا ہے۔ بقول حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا رحمۃ اللہ علیہ کہ ہم کھیت کے اندر گیہوں کا بیج ڈال دیں اور پھر انتظار کریں کہ اس میں چاول اُگنے لگے۔ صحابہ نے جو بویا تھا وہ کاٹا تھا اور جیسا دیا ویسا لیا تھا۔

دردِ دل کا امام ہوتا ہے

جذب جس کا امام ہوتا ہے
راہ میں تیزگام ہوتا ہے

دل سے ان کا غلام ہوتا ہے
عشق جس کا امام ہوتا ہے

جس کا رہبر نہ ہو تو
پھر اُس کا نفس بھی بے لگام ہوتا ہے

دوستو! دردِ دل کی مسجد میں
درد دل کا امام ہوتا ہے

یہ کرامت ہے شیخِ کامل کی
فیض طالب کا عام ہوتا ہے

رائیگاں آہ تو نہیں ہوتی
فضل اس پر بھی تام ہوتا ہے

کار فرما تو لطف ہے اُن کا
ہم غلاموں کا نام ہوتا ہے

عالمِ غیب کے ہیں جام و سبو
جام اُن کا ہی جام ہوتا ہے

گر نہ ہو دوستو کرم ان کا
عمر بھر عشق خام ہوتا ہے

اشک باری پہ فضلِ باری ہو
تب کہیں جا کے کام ہوتا ہے

گر مُربی نہ ہو کوئی اُس کا
عشق بھی بے نظام ہوتا ہے

ذکر و تقویٰ کے نور سے اختؔر
نورِ نسبت تمام ہوتا ہے

مشکل الفاظ کے معانی:۔ جذب: اللہ تعالیٰ کا بندے کو اپنی طرف کھینچ لینا۔ **تیز گام:** تیز تیز قدم چلنے والا۔ **رھبر:** مرشد کامل۔ **بے لگام:** بے قابو۔ **جام و سبو:** شراب پینے کا پیالہ۔ **خام:** کچا۔ **اشکباری:** آنسو بہانا۔ **مربی:** تربیت کرنے والا۔

خالق جسے جذب فرمالے پھر اس کی اڑان کا کیا پوچھنا

جذب جس کا امام ہوتا ہے
راہ میں تیزگام ہوتا ہے

جذب جس سالک کا امام ہو جائے تو پھر وہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی طرف ایسی تیزی کے ساتھ قدم بڑھا کے چلتا ہے اور اتنی جلد منزلیں طے کرتا ہے جس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ کے مواعظ میں ہے کہ جب اللہ سبحانہ وتعالیٰ اپنی طرف کسی کو جذب فرماتے ہیں تو چونکہ قادرِ مطلق ہیں اور تمام طاقتوں اور تمام قدرتوں اور تمام شہنشاہوں اور بادشاہوں میں سب سے زیادہ قدرت وطاقت رکھنے والے اللہ ہیں تو جب اللہ کسی کو اپنی طرف کھینچتے ہیں تو کوئی کتنی ہی طاقت والا ہو وہ اللہ سے اُسے چھڑا نہیں سکتا۔ اس لیے جب اللہ اپنی طرف کھینچیں گے تو یہ نفس وشیطان جو ہمارے دُشمن ہیں اور یہ غلط تعلق والے جو اگرچہ بظاہر تو دوست دِکھتے

ہیں، لیکن حقیقت میں دُشمن ہیں۔ یہ امرد لڑکے، حسین عورتیں وغیرہ ہمیں اپنی طرف کھینچ کر گناہ کرانا چاہتی ہیں۔ جب اللہ سبحانہ وتعالیٰ کسی بندے کو اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں تو پھر اس کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا اور پھر اسے کسی ضرور نقصان کا اندیشہ نہیں رہتا جیسا کہ قرآنِ کریم کی اس آیت میں ہے کہ:

﴿اَللّٰہُ یَجۡتَبِیۡۤ اِلَیۡہِ مَنۡ یَّشَآءُ وَیَہۡدِیۡۤ اِلَیۡہِ مَنۡ یُّنِیۡبُ﴾

(سورۃ الشوریٰ، آیت: ۱۳)

اللہ تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں۔ ''جبیٰ'' حضرت والا فرماتے ہیں ''جذبٌ'' کے معنی میں ہے۔ یعنی اپنی طرف کھینچ لینا، اپنی طرف جذب کر لینا جس کو اللہ اپنی طرف ''پُل'' (Pul) کر کے کھینچ لیں، اُسے پھر کوئی طاقت نہیں چھڑا سکتی۔

جیسا کہ حضرت والا نے اپنی کتاب ''معارفِ مثنوی'' میں اس کے دو طریقوں کو ذکر فرمایا ہے۔ حق تعالیٰ تک وصول کے دو طریقے ہوتے ہیں جن کے متعلق قرآن کریم سے استدلال پیش کرتا ہوں:

﴿اَللّٰہُ یَجۡتَبِیۡۤ اِلَیۡہِ مَنۡ یَّشَآءُ﴾

اللہ جس بندہ کو چاہتا ہے اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ اس طریق کا نام طریقِ جذب ہے۔

﴿وَیَہۡدِیۡۤ اِلَیۡہِ مَنۡ یُّنِیۡبُ﴾

اور ہدایت دیتا ہے اس بندہ کو جو اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع وتوجہ اختیار کرتا ہے۔ اس طریق کا نام طریقِ سلوک ہے۔

سلوک فعلِ اختیاری ہے اور جذب امرِ غیر اختیار۔ پس بندہ سلوک کا مکلّف ہے لیکن عادۃً ہر سالک کو بھی اس کے مجاہدات کے صلہ میں من جانب اللہ جذب نصیب ہو جاتا ہے کیونکہ بغیر عنایت ویاریٔ حق کے کسی کا کام نہیں بنتا۔ جذب اور سلوک ہر دو طریق بہر حال فضل ہی سے موصل الی المقصود اور مثمر للقرب ہوتے ہیں۔ حق تعالیٰ کی عنایت کے ایک ذرّہ سایۂ طاعت پر ناز کرنا دنیا والوں کی ہزاروں کوششوں سے افضل ہے۔

اسی لیے جب شیطان نے یہ کہا تھا کہ میں تیرے بندوں کو بہکاؤں گا اور قیامت تک آنے والی نسلوں کو گمراہ کرتا رہوں گا تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا تھا:

﴿اِلَّا عِبَادَکَ مِنۡہُمُ الۡمُخۡلَصِیۡنَ﴾

(سورۃ الحجر، آیت: ۴۰)

جو اللہ کے خاص بندے ہیں اُن پر شیطان کا کوئی اثر نہیں چل سکے گا، کیونکہ شیطان کو اللہ نے ڈھیل دی ہے اور اس نے ڈھیل مانگی تھی، لیکن شیطان کی قدرۃ، شیطان کا پاور، شیطان کی طاقت، اللہ کے سامنے جا کر رُک جاتی ہے۔ وہاں یہ بھی کہہ اُٹھتا ہے:

﴿وَقَالَ اِنِّیۡ بَرِیۡٓءٌ مِّنۡکُمۡ اِنِّیۡۤ اَرٰی مَا لَا تَرَوۡنَ اِنِّیۡۤ اَخَافُ اللّٰہَ وَاللّٰہُ شَدِیۡدُ الۡعِقَابِ﴾

(سورۃ الانفال، آیت: ۴۸)

جنگ کے موقع پر وہ لڑاتا ہے اور لڑا کر جب دُشمن کو اہلُ اللہ اور مؤمنین اور اللہ کے لیے لڑنے والوں کے سامنے پیش کر دیتا ہے پھر وہاں سے بھاگتا ہے۔ پھر وہ کہتا ہے کہ بس اب آگے میرا کام نہیں تمہیں جہنم کے اندر جھونک دینا اتنا ہی میرا کام تھا۔ تو پھر وہاں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی قدرت کے سامنے اس کے سارے حیلے اور حربے فیل ہو جاتے ہیں۔

اسی لیے حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ فرماتے ہیں جسے اللہ سبحانہ وتعالیٰ اپنی طرف کھینچ لے بس وہ بڑی جلدی منزلیں طے کرتا ہے۔ اس کی نشانی کیا ہوتی ہے کہ اللہ اپنی طرف کھینچ رہا ہے؟ اس کی نشانی یہ ہوتی ہے کہ اس آدمی کے دل میں جذباتِ خیر آنے لگتے ہیں جیسے توبہ کا جذبہ، شکر وصبر کا خیال، خیر کے کاموں کی سوچ اور لگن، اللہ والوں سے ملنے کا خیال اور داعیہ، قلب میں اُبھرنے لگتا ہے۔ یہ دلیل ہے کہ اندر سے اُسے اللہ سبحانہ وتعالیٰ اپنی طرف کھینچ رہے ہیں، اسی لیے یہ ساری چیزیں اس کے دل میں ڈالی جارہی ہیں کہ وہاں چلو، اُن سے ملو، اللہ کے نیک صالح بندوں کے پاس بیٹھو، اُٹھو اور اس طرح ہوتے ہوتے ایک دن ایسا آتا ہے کہ وہ بھی اللہ والا بن جاتا ہے۔ یعنی اپنے شیخ سے جس درجہ محبت وعقیدت اور عشق ہوگا اتنی جلد یہ راستہ بھی بآسانی طے ہوتا چلا جائے گا اور وہ اپنے خالق و مالک پر فدا ہوگا، اس لیے راہِ سلوک کی سب سے قیمتی سوغات عشق ہے نہ کہ عقل۔

رہبر کے ساتھ ساتھ عشق امام ہو تو نفس بے لگام نہیں ہوتا

دل سے ان کا غلام ہوتا ہے
عشق جس کا امام ہوتا ہے
جس کا رہبر نہ ہو تو پھر اُس کا
نفس بھی بے لگام ہوتا ہے

اسی لیے حضرت والا نے ابھی جو وعظ میں قصہ بیان فرمایا کہ حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ جیسا جلیل القدر صحابی غلام کو مار رہا ہے۔ پٹائی کر رہا ہے۔ توجہ نہیں ہو پارہی ہے کہ میرے اللہ کو میرے اوپر اتنی قدرۃ ہے۔ میں اپنی تھوڑی سی قدرۃ کو استعمال کر کے غلام کی پٹائی کر رہا ہوں۔ اگر اللہ مجھ پر ناراض ہو گئے اور اللہ نے انتقام لینا شروع کر دیا تو کیا ہوگا؟ حضرت نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے توجہ دلانے سے فوراً ذہن متوجہ ہوا اور فرمایا کہ یارسول اللہ! میں اس غلام کو اللہ کے لیے آزاد کر رہا ہوں۔ تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا کہ اگر تم ایسا نہ کرتے تو جہنم کی آگ تمہاری طرف لپک کر تمہیں چھو لیتی۔

﴿عَنْ أَبِیْ مَسْعُوْدِ الْأَنْصَارِیِّ قَالَ کُنْتُ أَضْرِبُ غُلَامًا لِیْ فَسَمِعْتُ مِنْ خَلْفِیْ صَوْتًا اِعْلَمْ أَبَا مَسْعُوْدٍ

لَلّٰہُ أَقْدَرُ عَلَیْکَ مِنْکَ عَلَیْہِ فَالْتَفَتُّ فَإِذَا ھُوَ رَسُوْلُ اللہِ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللہِ ھُوَ حُرٌّ لِوَجْہِ اللہِ فَقَالَ أَمَا لَوْ لَمْ تَفْعَلْ لَلَفَحَتْکَ النَّارُ أَوْ لَمَسَّتْکَ النَّارُ﴾

(صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب صحبۃ الممالیک و کفارۃ من لطم عبدہ)

حضرت والا نے اس سے استنباط فرمایا کہ بڑے بڑے اچھے اچھے لوگوں کو بھی شیخ کی حاجت اور ضرورت رہتی ہے تاکہ وقت پر کبھی ذرا اِدھر اُدھر کو ہو جائے تو متوجہ کیا جا سکے۔ اسی لیے اگر خلافت و اجازت بھی مل گئی اور اس کے بعد بہت سے مریدین بھی ہوگئے تو اس شیخ اور خلیفۂ وقت کو پھر بھی کسی اللہ والے سے رابطہ رکھتے رہنا چاہیے۔ ہمارے اکابر رحمہم اللہ اسی طرح کرتے چلے آئے۔ اپنے اوپر اعتماد نہیں کرتے تھے حتیٰ کہ خطوط کے جو علاج اور معالجات مریدین کے لیے تجویز کرتے تھے انہیں اپنے بزرگوں اور اکابر کے سامنے پیش کر کے پھر مریدین کو ارسال کیا کرتے تھے تاکہ یہ اندازہ ہو سکے کہ میں جو کچھ لکھ رہا ہوں وہ صحیح لکھ رہا ہوں۔

اسی لیے حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ نے تین تین شیخ بدلے اور اس میں ہمیں اس طرف بھی اشارہ دے دیا کہ شیخ کی ذات فی نفسہٖ مطلوب نہیں۔ بلکہ مطلوب اللہ تعالیٰ کی ذاتِ عالی ہے۔ جب اللہ کی ذاتِ عالی مقصود ہے تو اگر ایک شیخ دنیا سے چلے جائیں تو دوسرے، دوسرے چلے جائیں تو تیسرے لیکن اخیر تک اپنے سر کے اوپر کوئی سرپرست اور کوئی اپنا بڑا رکھنا چاہیے تاکہ خودرائی کے مرض سے حفاظت رہے، خودرائی کی کیا حقیقت ہے؟ یہی تو حقیقت ہے۔ کتنے ہی انسان خودرائی میں مبتلا ہوتے ہیں لیکن ان کو اپنے بارے میں یہ گمان نہیں ہوتا۔ خیال نہیں جاتا کہ میں اپنی رائے پر عمل کر رہا ہوں، لیکن جب کوئی بڑا اللہ والا سر پر ہو اور اس کے سامنے اپنے حالات رکھتے رہیں تو جہاں خودرائی ہو تو وہیں وہ بریک لگا دیں گے۔ اور جو صحیح رُخ ہے۔ اس طرف ہمارا رُخ پھر جائے گا تو

جس کا رہبر نہ تو پھر اُس کا
نفس بھی بے لگام ہوتا ہے

مسجدِ دردِ دل میں درد کی علامت

دوستو! دردِ دل کی مسجد میں
درد دل کا امام ہوتا ہے

جب اللہ کی محبت قلب میں پیدا ہوگئی۔ تو اب آپ کا دل ان معشوقوں، ان حسیناؤں، امردوں اور ان دنیا کی فانی چیزوں، حسین لذتوں، آب و گِل، مٹی پانی کے نقشوں کے اوپر نہیں جائے گا بلکہ دل آپ کے درد کی اقتدا کرے گا اور آپ کے اندر اللہ کی محبت کا درد ہے۔ تو دل بھی اُسی میں مشغول رہے گا۔ دائیں بائیں کی چیزوں کی چکر میں نہیں لگے گا، کیوں کہ جس کا امام اللہ کی محبت کا درد ہو پھر دل بھی انہیں چیزوں میں مزہ پاتا ہے اور دل کو بھی

انہیں چیزوں میں لطف آتا ہے۔ اِدھر اُدھر کی چیزوں میں نہیں۔ حضرت والا دامت برکاتہم اسی مضمون کو بیان فرماتے ہیں۔

اس کے ضمن میں تشریح کے طور پر احقر یہ عرض کرنا بھی مناسب سمجھتا ہے کہ اس میں اس بات کی جانب بھی تنبیہ ہے کہ اللہ کی محبت اور اُس کا درد سیکھ لو، پیدا کرلو، ان شاء اللہ بڑی جلدی بڑی آسانی سے ولایت کے اعلیٰ مقام پر پہنچ جاؤ گے جس کو حضرت والا یوں بیان فرماتے ہیں کہ میں پہلے قلب میں اللہ کی محبت کی آگ پیدا کرتا ہوں تو دل میں گناہوں کے جو جھاڑ جھنکاڑ۔ لگے ہوتے ہیں وہ سارے جل کے ختم ہوجاتے ہیں بلکہ یہ چیزیں کھاد کا کام دیتی ہیں۔ حضرت نے مثال بیان فرمائی۔ اگر آپ کو کسی زمین میں کاشت کرنی ہو اور اس میں بڑے جھاڑ وغیرہ لگے ہوئے ہیں۔ اب آپ چاہتے ہیں کہ اس کو صاف کرائیں تو دس بیس نوکروں کو لاؤ اور دو، چار، دس دن تک ایک ایک نکلواؤ۔ اور نکال کر پھر اُسے بہہ کر اور جوت کر اس قابل بناؤ کہ اس میں کاشت کی جائے۔ ایک طریقہ تو یہ ہے، لیکن ایک دوسرا طریقہ یہ ہے کہ سارے کے سارے جھاڑ میں آگ لگا دو اور آگ لگا کر کے سب کو راکھ بنا دو۔ تو وہ راکھ بھی بنے گی اور راکھ بن کر زمین کے اندر کھاد کا کام بھی دے گی۔ اور آسانی بھی آپ کے لیے ہوجائے گی کہ صرف ایک تیلی ماچس لگائی اور پورا جتنا جنگل تھا وہ آسانی سے جل گیا۔ اب آپ آسانی سے اس میں بوؤ اور کاشت کرلو۔ تو حضرت اسی طرح فرماتے ہیں دل میں جس قسم کے گناہوں کی یہ سب جھاڑ جھنکاڑ اُگے ہوئے ہیں، اللہ کی محبت کا درد پیدا کرو اور اس کی آگ ان درختوں میں لگا دو، تو یہ سارے جل کر خود بخود ختم ہوجائیں گے اور کھاد کا کام دیں گے۔ اسی لیے حضرت والا نے فرمایا کہ اپنے قلب میں اللہ کی محبت پیدا کرلو۔ پھر اس کے پیچھے پیچھے جو تمہارا دل اس میں مشغول رہے گا تو خود بخود گناہوں کو چھوڑتا چلا جائے گا۔

طالبین کا بفیضِ مرشد کامل کاملین بن جانا

یہ کرامت ہے شیخِ کامل کی
فیض طالب کا عام ہوتا ہے

حکیم الامت مجدد تھانوی نور اللہ مرقدہ نے لکھا ہے کہ شیخِ کامل اور ولی برحق کو پہچاننا ہو تو اس کے متعلقین میں دیکھو کہ کیا احوال ہیں؟ اگر متعلقین میں یہ احوال ہیں کہ قربِ خداوندی، اللہ کی محبت اور اتباعِ سنت و شریعت ان کے اندر پائی جارہی ہے تو سمجھ لو بس یہ اس بات کی نشانی ہے کہ جس شیخ سے وہ وابستہ ہیں وہ شیخ برحق ہے۔ اسی لیے جو منتسبین و متعلقین ہیں اگر ان کے قلب میں دنیا کی محبت گھٹ رہی ہو، اللہ کی محبت بڑھ رہی ہو اور پھر ان کا فیض بھی عام ہو رہا ہو۔ جیسا کہ بحمد اللہ تعالیٰ، اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے یہ بات ہم حضرتِ والا میں دیکھتے ہیں کہ دنیا بھر میں حضرت والا کے متعلقین جہاں جہاں بھی دیکھو ماشاء اللہ خوب کام میں لگے ہوئے ہیں۔ خود یہاں کتنے بیٹھے

رہتے ہیں۔ بظاہر ہمیں ایک دوسرے کو پتہ نہیں ہوتا لیکن اپنی اپنی جگہ میں وہ کتنا کام کرتے ہیں، ان کی مجالس کس طرح سے چل رہی ہوتی ہیں۔ حتیٰ کہ مدینہ منورہ زادھا اللہ شرفًا و عظمۃً جیسی مقدس جگہ میں بھی ماشاء اللہ حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ کے بارہ تیرہ خلفاء ہیں اور باقاعدہ ان کی مجالس اور پروگراموں کا مستقل نظم چلتا رہتا ہے۔ بس یہی دلیل ہے شیخ کامل کے کمال اور س کی ولایت اور شیخ برحق ہونے کی اور یہی نشانی ہے اس بات کی کہ ایسے شیخ سے متعلق ہو کر اور تعلق جوڑ کر ان شاء اللہ، اللہ کے ساتھ تعلق اور قرب بہت جلد نصیب ہو جائے گا۔

اصل تو اللہ کا لطف ہی کارفرما ہوتا ہے

رائیگاں آہ تو نہیں ہوتی
فضل اس پر بھی تام ہوتا ہے
کار فرما تو لطف ہے اُن کا
ہم غلاموں کا نام ہوتا ہے

میرے دوستو! یہی وہ چیز ہے جو بارگاہِ رب العزت میں سب سے زیادہ محبوب اور سب سے زیادہ پسند ہے۔ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر جہاں بڑے بڑے انعامات کا ذکر آیا ہے وہاں اکثر مقامات پر تو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا تذکرہ اسی صفت (صفتِ عبدیت) سے کیا ہے۔ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا جائے اور اپنے سے کچھ نہ ہونے کا اعتراف اور اقرار کیا جائے۔ جب شیطان کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے حکم دیا تھا کہ آدم کو سجدہ کرو، تو اس نے اپنی طرف نظر کی اور کیا کہا کہ میں تو دلیل کے اعتبار سے یہ ظاہر کر سکتا ہوں کہ میں اس آدم سے اعلیٰ اور ارفع اور اونچا ہوں۔ اور آپ اعلیٰ وارفع کو حکم دے رہے ہیں کہ ادنیٰ و کمتر کو سجدہ کرے تو یہ کیسے۔

تو اُس کی اپنی طرف نظر گئی کہ میں ایسا اور ویسا ہوں، اس لیے سجدہ نہیں کیا۔ حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ایک چوک ہوئی جس کے بارے میں خود باری تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا﴾

(سورۃ طٰہٰ، آیت: ۱۱۵)

ترجمہ: سو ان سے غفلت ہوگئی اور ہم نے ان میں پختگی نہ پائی۔ (معارف القرآن، ج:۶، ص:۱۵۴)

لیکن اس کے باوجود حضرتِ آدم علیہ السلام نے یوں نہیں کہا کہ اے اللہ! میں نے تو کوئی غلطی نہیں کی بلکہ کیا کہا؟

بالفاظ حضرت حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دار العلوم دیوبند کہ حضرتِ آدم علیہ السلام نے اللہ کی بارگاہ میں عرض کیا کہ اے خدا! مجھ سے اگر خطا ہوئی تو بھی میں مجرم ہوں اور اگر خطا نہیں ہوئی تو بھی میں

مجرم ہوں۔ بس میری حالت تو یہ ہے کہ اگر تو نے مجھے معاف نہ کیا تو پھر میری تباہی و بربادی میں کوئی شک وشبہ باقی نہ رہے گا۔

﴿رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ﴾

(سورۃ الاعراف، آیت: ۲۳)

ترجمہ: اے ہمارے رب ہم نے اپنا بڑا نقصان کیا کہ پوری احتیاط اور تامل سے کام نہ لیا اور اگر آپ مغفرت نہ کریں گے اور ہم پر رحم نہ کریں گے تو واقعی ہم بڑے خسارے میں پڑ جائیں گے۔ (معارف القرآن، ج:۳،ص:۵۳۱)

گویا اس بات کا اظہار کیا کہ اے اللہ! میں کچھ نہیں ہوں، اگر آپ نے مجھے معاف نہ کیا تو پھر میرا خسارہ ہی خسارہ ہے۔ حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب نور اللہ مرقدہ نے فرمایا کہ ہم تو آدم علیہ السلام کے بیٹے ہیں، ہمیں تو بحیثیت نسبتِ الیٰ آدم کے یہ شان رکھنی چاہیے کہ ہر وقت یہی کہتے رہیں کہ اے الٰہی! میں نے کیا تو میں مجرم، نہ کیا تو میں مجرم۔ میرا کام صرف آپ کے عفو و کرم سے بنے گا، لطف و کرم سے بنے گا۔ حضرت والا یہی بات فرماتے ہیں اصل تو اللہ کا لطف ہے، میں تو کچھ بھی نہیں ہوں، لیکن ذریعہ بن کر بظاہر نام ہو جاتا ہے۔ فلاں کے مریدین فلاں کے متعلقین فلاں کی کتابیں فلاں کا فیض۔

حضرت والا فرماتے ہیں کہ اے میرے ماننے والو! یہ اپنے دل میں جما کے رکھنا کہ کام محض ان کے لطف وکرم سے بنتا ہے، اسی لیے میرے دوستو! میں ابھی بیٹھ کے تقریر کر رہا ہوں۔ اگر میں یہ سمجھوں کہ ''میں میں میں'' تو یہ میں، مجھے کھا جائے گی، بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ آپ حضرات بیٹھے ہیں اور حضرت والا تشریف فرما ہیں تو حضرت والا کی دعائیں اور توجہات ہیں۔ آپ حضرات کے قلب میں اپنی اپنی نوعیت کی طلبیں ہیں۔ وہ طلب مجھے بلواتی ہے۔ میرا کوئی بھی کمال نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فیضان ہے اور وہ فضل فرماتے ہیں جب کوئی بندہ طلب لے کر آتا ہے، بولنے والا بولتا ہے۔ اگر اپنی طرف نسبت کر کے ''میں میں'' کا دل میں خیال آئے تو میں نے مظفر نگر میں ایک بیان میں عرض کیا کہ آدمی جب یہ بکنے لگتا ہے میں ایسا، میرا بیان ایسا، میری کتاب ایسی، میرے پروگرام ایسے تو ''میں''، ''میرا''، ''میری''، ''میرے'' بس یہ تباہی کے جملے ہیں اور سمجھو کہ انسان شیطان کی گود میں جا بیٹھا۔ اب اُس کی تباہی میں شک وشبہ نہیں رہے گا، کیونکہ اپنی انانیت کے اوپر اُس کی نظر جانے لگی خواہ بظاہر کیسی ہی تقریری و بیان کا ملکہ رکھتا ہو اور کتنا ہی قابل اور باصلاحیت ہو تاریخ میں ایسے بے شمار قابل نظر آئیں گے کہ جن کو ان کی انا نے تباہ و برباد کر ڈالا ہے۔ حضرت والا کے اکثر اشعار میں آپ کو ملے گا کہ اخیر میں جب مضمون ختم کرتے ہیں تو فرماتے ہیں اس میں میرا کوئی دخل نہیں، کوئی کمال نہیں ہے۔ میرے مرشد اور میرے شیخ کی صحبتوں کا یہ سب فیض ہے جو کچھ ہو رہا ہے جب انسان نے اپنی طرف نسبت کر لی تو پھر وہ شکر گذار بندوں میں شامل نہ رہا۔

تشکر اور تکبر ایک دوسرے کی ضد ہیں

چنانچہ حضرت والا کا ایک ٹیلیفون پر وعظ تھا ''ٹیلیفونک وعظ'' حضرت مولانا عبدالحمید صاحب کو جبکہ مولانا نے حضرت والا سے یہ بات عرض کی تھی کہ حضرت لوگ اصلاح کے سلسلہ میں کافی رجوع ہو رہے ہیں۔ ''تشکر'' اور ''تکبر'' دونوں میں تضاد ہے۔ اور یہ تضاد کیوں ہے؟ تضاد اس لیے ہے کہ تکبر کی حقیقت ہے کسی چیز پر اپنا استحقاق سمجھنا اور تشکر کی حقیقت ہے کہ اے اللہ! میں تو مستحق نہیں تھا، آپ نے میرے اوپر محض فضل فرمایا تو اس حقیقت پر اگر غور کریں تو دونوں میں تضاد ہے، دونوں جمع نہیں ہو سکتے اور ایک بات بتا دوں اگر اپنے اوپر ہم نظر رکھیں کہ میں اتنا جید عالم ایسا ویسا؟ فلاں فلاں؟ تو مجھے تو خلافت مل جانی ہی چاہیے تھی تو اگر حضرت نے دے دی تو کون سی بڑی بات ہے۔ بھئی! میں تو اتنا بڑا عالم ہوں، حدیث کی کتابیں پڑھاتا ہوں، تفسیر جانتا ہوں تو خلافت تو مجھے ملنی تھی ہی۔ اسے کہیں گے کہ اس نے اپنا استحقاق سمجھا تھا۔ اب اگر وہ یوں کہتا ہے کہ شکر ہے مجھے خلافت مل گئی تو یہ صرف زبان پر شکر کا جملہ ہے لیکن حقیقتِ تشکر وہاں موجود نہیں ہے۔ حقیقتِ شکر تو دوستو! یہ ہے کہ میں تو اس قابل بالکل نہ تھا اور واقعی دل سے سوچے۔ آج کل ہم لوگ رسمی تواضع اختیار کرتے ہیں۔ نہیں نہیں! میں تو کچھ نہیں ہوں، میں تو ایسا ہوں اور کسی نے دو چار جملوں میں ذرا حقیقت کھول کے رکھ دی، کہہ کر تو دیکھو اسی وقت شعلہ جوالہ بن جاتے ہیں۔ اتنا طیش اور اتنا غصہ۔

میں نے مولانا محمد یوسف لدھیانوی شہید رحمہ اللہ کے حالات میں کہیں پڑھا تھا: کسی نے بڑی گالیاں دیں اور بڑا بُرا بھلا کہا۔ فرمایا کہ بھئی میں تو قسم کھا کے کہہ سکتا ہوں جتنا تو نے کہا ہے میں اس سے بھی زیادہ بُرا ہوں۔ اور ہمارے سارے اکابر کا حال یہ تھا۔ حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمہ اللہ کا میں نے مجلس میں سنایا تھا۔ کیا فرمایا؟ امداد اللہ کے اترے پترے کھول کر اگر اللہ رکھ دے تو لوگ قریب بھی نہ لگیں۔ یہ حال ہے ''امداد اللہ'' کا۔ مجدد تھانوی رحمہ اللہ نے فرمایا ''اشرف علی'' کا ایک خلق بھی ابھی تک صحیح نہیں ہوا۔ اندازہ لگایئے کہ یہ بات مجددِ زمانہ نے فرمائی۔ تو میری اور آپ کی کیا حیثیت کہ ہم اپنی طرف نظر کریں۔

حضرت والا دامت برکاتہم کے اس شعر میں ہم سب کے لیے یہ تعلیم ہے جو کچھ ہو رہا ہے اے اللہ! جو کام آپ لے رہے ہیں ہماری اگر زبان چل رہی ہے، ہمارا قلم چل رہا ہے، ہماری آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں یہ اے اللہ! سب تیرا فیضان ہے ورنہ ہم کہاں اس لائق؟ حضرت اسی کو فرماتے ہیں کہ ؎

کار فرما تو لُطف ہے اُن کا

ہم غلاموں کا نام ہوتا ہے

اصل جام تو شراب محبت الٰہیہ کا جام ہے

عالم غیب کے ہیں جام و سبو
جام اُن کا ہی جام ہوتا ہے
گر نہ ہو دوستو کرم ان کا
عمر بھر عشق خام ہوتا ہے

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ نفس کی اصلاح میرے فضل اور رحمت ہی سے ہوتی ہے اگر میرا فضل اور رحمت نہ ہو تو کسی کا بھی تزکیۂ نفس نہیں ہوسکتا ہے۔

﴿وَلَوْ لَا فَضْلُ اللهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ مَازَكٰى مِنْكُمْ مِنْ اَحَدٍ اَبَدًا﴾

(سورۃ النور، آیت: ۲۱)

ترجمہ: اگر تم پر اللہ کا فضل و کرم نہ ہوتا تو تم میں سے کوئی کبھی بھی (توبہ کرکے) پاک صاف نہ ہوتا۔

(معارف القرآن، جلد: ۶، ص: ۳۶۹)

اگر اللہ کا فضل و کرم شامل نہ ہو تو کوئی دنیا میں نہیں ہے جو تزکیہ پا سکے۔ یہی حقیقت ہے کمالِ عشق کی کہ انسان کا نفس تمام رذائل سے صاف ستھرا ہو جائے اور مزکّی اور مجلّی ہو جائے۔ حضرت والا فرماتے ہیں یہ صرف ان کے کرم سے ہوتا ہے، اللہ کے فضل سے ہوتا ہے اور اللہ کا فضل اور کرم میرے دوستو! شاملِ حال کیسے ہوتا ہے؟

قرآن کی دوسری آیت اس کے ساتھ شامل کرلو:

﴿لَقَدْ مَنَّ اللهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ﴾

(سورۃ آل عمران، آیت: ۱۶۴)

یعنی اللہ نے نبی کو بھیجا اور نبی کو یہ یہ کام دیئے۔ ان میں سے ایک کام یہ دیا کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام حضراتِ صحابہ کا تزکیہ فرماتے ہیں۔ تو دونوں آیتوں کو جوڑنے سے کیا ثابت ہوا؟ اصل اللہ کے فضل سے ہوتا ہے، لیکن شیخ کی صحبت کی برکت سے (اللہ کی سنت و عادت جاری ہے) کہ لوگوں کا تزکیہ فرما دیا جاتا ہے۔ کیوں کہ ان کاموں میں شیخ مثل نبی کے ہوتا ہے جیسا کہ ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اَلشَّيْخُ فِيْ قَوْمِهٖ كَالنَّبِيِّ فِيْ اُمَّتِهٖ.

تو خلاصہ دونوں آیتوں کو جوڑ کر یہ نکلا کہ اصل مزکّی تو اللہ تعالیٰ کی ذاتِ عالی ہے لیکن سبب کے درجے میں دنیا میں اللہ کی سنت اور اللہ کا نظام یہ چل رہا ہے کہ جب کوئی کسی ولی کامل سے ملتا ہے، اب نبی نہیں ہے، نبی کے وارثین ہیں اور وارثین کون ہیں؟ علمائے صالحین، علمائے اولیاء اللہ جب ان سے کوئی ملتا ہے تو ان کے توسط سے

اللہ تعالیٰ تزکیہ فرمادیتے ہیں۔اب نتیجہ یہ نکل کے سامنے آیا کہ اہل اللہ سے ملاقات، ان سے ملنا جلنا اور ان کی صحبت میں رہنا، گویا یہ نشانی ہے اللہ تعالیٰ کے کرم کے شامل ہوجانے کی کہ ان بندوں پر اللہ کا خصوصی کرم ہورہا ہے۔اوران شاء اللہ اس کی بدولت تزکیہ بھی حاصل ہوجائے گا۔

اشکباری پہ فضل باری ہو
تب کہیں جا کے کام ہوتا ہے

اور حق تعالیٰ جب کسی کو آنسو بہانا نصیب کرتے ہیں تو دوستو! حدیث قدسی میں ہے:

﴿لَاَنِيْنُ الْمُذْنِبِيْنَ اَحَبُّ اِلَيَّ مِنْ زَجَلِ الْمُسَبِّحِيْنَ﴾

(روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم والسبع المثانی، ج:۳۰، ص:۱۹۲)

یہ جو گنہگار روتے ہیں اُن کی آواز مجھے اتنی پسند ہے کہ تسبیح پڑھنے والے جو سبحان اللہ، سبحان اللہ کہہ رہے ہیں، اس سے بھی زیادہ ان کے رونے کی آواز پسند ہے۔معلوم ہوا رونا جسے اللہ عطا کرتے ہیں اُسے اپنا محبوب بنانا چاہتے ہیں۔اور اُسے اپنا محبوب بنالیتے ہیں، اسی لیے حضراتِ انبیاء کرام، صحابۂ عظام اور تابعین سب کے حالات میں آپ اُٹھا کے دیکھیے کس طرح سے روتے تھے۔ایک کتاب ہے ''دُموعُ الصَّالحین'' یعنی ''اللہ والوں کے آنسو'' اس میں صحابہ کرام اور اولیاءعظام کی بہت بڑی تعداد کے رونے کا تذکرہ کیا گیا ہے کہ کس طرح سے یہ لوگ رویا کرتے تھے تو جب اشک باری ہوتی ہے۔میرے دوستو! تو پھر اللہ کا فضل اس کے ساتھ شامل ہوجاتا ہے۔

یہ عشق کی بے نظامی کیوں؟

گر مُربی نہ ہو کوئی اُس کا
عشق بھی بے نظام ہوتا ہے

بغیر اہل اللہ کی صحبت اور کسی مربی کی تربیت کے صورت حال ایسی ہی ہوتی ہے کہ اگر سالک کبھی جوش میں آیا تو بہت تہجد اور نوافل اور تسبیح وتلاوت شروع کردیا۔کبھی جوش ٹوٹا تو بالکل ایک دم نیچے چلا گیا۔اور فرائض تک چھوڑ بیٹھا اور تم کسی کو دیکھو کہ وہ میانہ روی اور اعتدال کے ساتھ دین پہ چل رہا ہے تو سمجھ لو کہ یہ وہ شخص ہے جو کہ صحیح آدمی ہے اور جو دین پر قائم رہ سکے گا تو دوستو! اس کا احساس اصل میں اولیاء اللہ کے بغیر نہیں ہوتا۔بلکہ انسان اِفراط وتفریط کا شکار رہتا ہے، جب اللہ والوں کے ساتھ مل کے چلتا ہے تب اعتدال پر رہتا ہے۔اور یہاں عتدال ہی پر رہنا مذکور ہے۔

ذکر و تقویٰ کے دو تار ہوں تو روشنی ضرور پیدا ہوگی

ذکر و تقویٰ کے نور سے اختؔر
نورِ نسبت تمام ہوتا ہے

دو لفظ حضرت والا نے استعمال فرمائے۔ یہ جو روشنی جس میں ہم بیٹھے ہیں یہ بھی دو تاروں کے ذریعہ ہم تک پہنچتی ہے ان میں ایک مثبت اور ایک منفی ''پوزیٹو (Positive) اور نگیٹو (Negative)'' ہوتے ہیں اور ان دونوں سے مل کر بجلی کی روشنی وجود میں آتی ہے اور دنیا کی ساری چیزوں کا حال یہی ہے۔ اگر آپ ایک گلاس میں دودھ لینا چاہتے ہیں تو پہلے اس گلاس کو ذرا اس کی گندگیوں سے صاف شفاف تو کرلو۔ پھر اس کے بعد گلاس میں دودھ لے لو۔ اگر آپ نے گندے گلاس میں دودھ لے لیا اور کسی کو پیش کیا، لیجیے یہ دودھ پی لیجئے تو وہ تمہیں دھتکارے گا کہ کیا تمہیں اتنا سلیقہ نہیں ہے، کیسے گندے گلاس میں دودھ پیش کررہے ہو؟ اگر تم نے بڑی قیمتی نعمت یعنی دودھ کو پیش کیا ہے۔

حضرت فرماتے ہیں کہ ایک طرف تو تقویٰ ہو یعنی روحانی گندگی اور غلاظتوں یعنی گناہوں سے اپنے دل کو بالکل صاف کرو۔ تمام اعضا، بالکل صاف ستھرے بنالو اور پھر ذکر کا نور ان کے اوپر چڑھالو۔ بس اسی کا نام ہے ''نسبتِ تامہ'' اور انہی دو باتوں کی برکت سے آپ کی نسبت ''نسبتِ تامہ'' ہوجائے گی۔ اسی لیے حضرت نے بار بار فرمایا اور فرماتے رہتے ہیں کہ بھائی اللہ والا بننا بہت آسان ہے، سب گناہوں کو چھوڑ دو اور فرائض و واجبات و سنن ادا کرلو، کچھ ذکر واذکار وغیرہ کرلو اور ذہن پر زیادہ زور نہ ڈالو اور اپنے سونے کا خاص خیال رکھو اور اگر دماغ پر زور محسوس ہو تو وظائف ملتوی کردو، کیونکہ وظائف فی نفسہا مقصود نہیں ہیں، حفاظتِ صحت فرض ہے۔ یاد رکھیۓ! اگر نفلی وظائف کی وجہ سے آپ کی صحت متاثر ہورہی ہو، دماغی خشکی بڑھ رہی ہو۔ جیسا کہ آج بہت سے لوگ انہیں وظائف کی کثرت میں لگ کر اپنا دماغ کھو بیٹھتے ہیں۔ تو اس صورت میں ان وظائف کا ترک واجب ہے یاد رکھیۓ! ہمارے یعنی اہلِ حق مشائخ کی خانقاہوں میں یہ چیز نہیں سکھائی جاتی۔ گناہوں کو چھوڑ دو۔ فرائض و واجبات و سنن ادا کرو۔ اگر آپ کی صحت اس قابل نہیں ہے اور اگر صحت میں کچھ قوت و ہمت ہے تو پھر تھوڑے سے وظائف ذکر اذکار وغیرہ بھی کرلو۔ اللہ کے ولی بن گئے۔ اسی کو حضرت والا فرماتے ہیں ؎

ذکر و تقویٰ کے نور سے اختؔر
نورِ نسبت تمام ہوتا ہے

جو خانقاہ میں آتا رہے۔ لیکن گناہوں کی عادت کو نہ چھوڑے وہ حضرت والا کا سچا عاشق نہیں ہے۔ اگرچہ وہ اپنے زعم و گمان میں سمجھ رہا ہو کہ مجھے حضرت والا سے بہت محبت ہے تو یہ اُس کا محض دعویٰ ہے جو کہ بالکل غلط اور

جھوٹ ہے۔ شاعر کہتا ہے ؎

اِنَّ الْمُحِبَّ لِمَنْ یُّحِبُّ مُطِیْعٌ

جو کسی کا عاشق ہوتا ہے، وہ اس کی ہر ادا کا بھی عاشق ہوتا ہے۔ اسے اس کی ہر ادا اچھی لگتی ہے۔ اگر عشق کا دعویٰ ہے تو یہ کیا بات ہے کہ جو تعلیمات حضرت والا کی ہیں۔ ان سے ہم دور دور بھاگ رہے ہیں اور ان سے کٹ رہے ہیں اور اپنی جان بچا رہے ہیں۔ معلوم ہوا کہ پکا سچا عاشق نہیں۔ مجدِد تھانوی نور اللہ مرقدہ نے فرمایا کہ اگر کوئی مجھ سے دور رہ رہا ہو لیکن وہ میری تعلیمات پر عمل کر رہا ہو تو وہ میرے قریب ہے اور کوئی قریب رہ رہا ہو مگر میری تعلیمات پر عمل نہیں کر رہا ہے وہ حقیقت میں مجھ سے دور ہے۔ حضرت نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بہت سے حضرات قرب وجوار میں رہے، لیکن اتباع نہیں تھی، انقیاد نہیں تھا، تسلیم نہیں تھی، کوئی نفع نہیں اُٹھا سکے۔

میرے دوستو! اس لیے حضرت والا کے دو جملے (۱) ایک تو ذکر ہو اور (۲) ایک تقویٰ ان دونوں کو مضبوطی سے پکڑ لو۔ ان شاء اللہ ولایتِ تامہ اور معرفتِ کاملہ نصیب ہو جائے گی۔ اللہ ہم سب کو استقامت کے ساتھ اس پر عمل کی توفیق نصیب فرمائے، آمین۔

گر خدا چاہے تو پہلے عاشقِ ابرار ہو

عشق کا اے دوستو! ہم سب کا یہ معیار ہو
متبعِ سنت ہو اور بدعت سے بھی بیزار ہو

اتباعِ سنتِ نبوی سے دل سرشار ہو
نورِ تقویٰ سے سراپا حاملِ انوار ہو

عاشقِ کامل کی بس ہے یہ علامت کاملہ
جاں فدا کرنے کو ہر دم سر بکف تیار ہو

عشقِ سنت کی علامت ہر نفس سے ہو عیاں
خواہ وہ رفتار ہو، گفتار ہو، کردار ہو

صحبتِ مرشد سے نسبت تو عطا ہوگی مگر
اجتنابِ معصیت ہو ذکر کی تکرار ہو

عشقِ کامل کی علامت یہ سنا کرتا ہوں میں
آشنائے یار ہو بے گانۂ اغیار ہو

ہے یہی مرضی خدا کی ہم مٹادیں نفس کو
گرچہ وہ سارے جہاں کا بھی کوئی سردار ہو

اس کی صحبت سے نہیں کچھ فائدہ ہوگا کبھی
بے عمل کوئی محبت کا علمبردار ہو

جب کسی بندہ پہ ہوتا ہے خدا کا فضلِ خاص
دم میں وہ ذوالنور ہوگا گرچہ وہ ذوالنار ہو

عمر بھر کا تجربہ اختؔر کا ہے یہ دوستو
گر خدا چاہے تو پہلے عاشقِ ابرار ہو

مشکل الفاظ کے معانی:۔ **بدعت**: جو کام سنت نہ ہو اسے دین کا حصہ سمجھنا۔ **سرشار**: مست۔ **سراپا**: سر سے پیر تک۔ **انوار**: نور کی جمع۔ **سر بکف**: سر ہاتھوں میں لیے ہوئے۔ **نفس**: سانس۔ **رفتار**: چلنا۔ **گفتار**: بات کرنا۔ **معصیت**: گناہ سے بچنا۔ **تکرار**: مسلسل کرنا۔ **آشنائے یار**: دوست کے واقف۔ **اغیار**: اللہ کے غیر سے انجان۔ **علم بردار**: دعویدار۔ **ذوالنور**: اللہ تعالیٰ کی محبت کی روشنی رکھنے۔ **ذوالنّار**: جہنمی۔ **عاشق ابرار**: اللہ والے۔

معیار عشق سنت کی تابعداری اور بدعت سے بیزاری ہے

عشق کا اے دوستو! ہم سب کا یہ معیار ہو
متبع سنت ہو اور بدعت سے بھی بیزار ہو
اتباع سنت نبوی سے دل سرشار ہو
نور تقویٰ سے سراپا حامل انوار ہو
عشق سنت کی علامت ہر نفس سے ہو عیاں
خواہ وہ رفتار ہو، گفتار ہو، کردار ہو

اس دنیا میں رہنے والے مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد وہ ہے کہ جو اللہ و رسول سے عشق و محبت کے دعوے دار ہوتے ہیں اور ہر ایک اپنے دعوے پر مختلف قسم کی دلیلیں بھی اپنے ذہن میں تیار کیے ہوئے ہے لیکن کیا واقعی معنیٰ میں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں وہ دلیلیں معتبر اور مستند ہیں یا نہیں؟ اور کس کی دلیل از روئے قرآن وحدیث درست ہے اور کس کی غلط ہے؟ آیئے اس سلسلے میں ہم قرآن وحدیث کی طرف نظر ڈالیں۔

قرآن کریم میں اس سلسلے میں ایک بنیادی آیت کریمہ موجود ہے جس سے یہ فیصلہ ہو جاتا ہے کہ محبت کے دعوے میں کون سچا ہے اور کون جھوٹا ہے اور وہ آیت کریمہ یہ ہے:

﴿قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ وَاللهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ﴾

(سورۃ آل عمران، آیت: ۳۱)

ترجمہ: آپ لوگوں سے فرما دیجئے کہ اگر تم (بزعم خود) خدا تعالیٰ سے محبت رکھتے ہو اور محبت رکھنے کی وجہ سے یہ بھی چاہتے ہو کہ (خدا تعالیٰ) بھی تم سے محبت کرے تو تم لوگ اس مقصد کے حاصل کرنے کے طریقوں میں میری اتباع کرو کیونکہ میں خاص اسی تعلیم کے لیے مبعوث ہوا ہوں جب ایسا کرو گے) خدا تعالیٰ بھی تم سے محبت کرنے لگیں گے اور تمہارے سب گناہوں کو معاف کر دیں گے (کیونکہ میں اس معافی کا طریقہ بھی تعلیم کرتا ہوں، اس پر عمل کرنے سے لامحالہ حسب وعدہ گناہ معاف ہو جائیں گے، مثلاً گناہوں سے توبہ، اللہ تعالیٰ کے حقوق جو فوت کئے ہیں ان کو پورا کرنا، حقوق العباد کا ادا کر لینا یا معاف کرا لینا) اور اللہ تعالیٰ بڑے معاف کرنے والے اور بڑی عنایات فرمانے والے ہیں۔

محبت ایک مخفی چیز ہے، کسی کو کسی سے محبت ہے یا نہیں اور کم ہے یا زیادہ ہے اس کا کوئی پیمانہ بجز اس کے نہیں کہ حالات اور معاملات سے اندازہ کیا جائے اور محبت کے کچھ آثار اور علامات ہوتی ہیں ان سے پہچانا جائے، یہ لوگ جو اللہ تعالیٰ سے محبت کے دعویدار اور محبوبیت کے متمنی تھے اللہ تعالیٰ نے ان کو ان آیات میں اپنی محبت کا معیار

بتلایا ہے، یعنی اگر دنیا میں آج کسی شخص کو اپنے مالک حقیقی کی محبت کا دعویٰ ہو تو اس کے لیے لازم ہے کہ اس کو اتباع محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی کسوٹی پر آزما کر دیکھ لے، سب کھرا کھوٹا معلوم ہو جائے گا جو شخص اپنے دعویٰ میں جتنا سچا ہو گا اتنا ہی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کا زیادہ اہتمام کرے گا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی روشنی کو مشعل راہ بنائے گا اور جتنا اپنے دعوے میں کمزور ہو گا اسی قدر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت میں سستی اور کمزوری دیکھی جائے گی۔ (معارف القرآن، جلد:۲، صفحہ:۵۴)

احیائے سنت کی اہمیت پر بعض اسلاف کے اقوال

امام ربانی حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ ارشاد فرماتے ہیں کہ یہ بندہ عاجزی اور زاری اور التجا اور محتاجی اور ذلت وخواری کے ساتھ ظاہر اور پوشیدہ حق تعالیٰ کی بارگاہ میں سوال کرتا ہے کہ جو کچھ اس دین میں محدث اور مبتدع پیدا ہوا ہے جو خیر البشر اور خلفائے راشدین علیہ وعلیہم الصلاۃ والسلام کے زمانہ میں نہ تھا، اگر وہ روشنی میں صبح کی سفیدی کی مانند ہو، اس ضعیف کو ان لوگوں کے ساتھ جو اس بدعت سے منسوب ہیں۔ اس محدث کے عمل میں گرفتار نہ کرے اور مبتدع کے حسن پر فریفتہ نہ کرے۔ بحرمة سيد المرسلين واله الابرار عليه الصلاة والسلام.

علماء نے کہا ہے کہ بدعت دو قسم پر ہے حسنہ اور سیئہ۔ حسنہ اس نیک عمل کو کہتے ہیں جو آنحضرت اور خلفائے راشدین علیہ والسلام کے زمانہ کے بعد ہوا ہو اور وہ سنت کو رفع نہ کرے اور بدعت سیئہ وہ ہے جو سنت کی رافع ہو۔

یہ فقیر ان بدعتوں میں سے کسی بدعت میں حسن اور نورانیت مشاہدہ نہیں کرتا اور ظلمت و کدورت کے سواء کچھ محسوس نہیں کرتا۔ اگرچہ آج مبتدع کے عمل کو ضعف بصارت کے باعث طراوت وتازگی میں دیکھتے ہیں لیکن کل جب کہ بصیرت تیز ہو گی تو دیکھ لیں گے کہ اس کا نتیجہ خسارت وندامت کے سواء کچھ نہ تھا۔

بوقت صبح شود ہمچو روز معلومت
کہ باکہ باختۂ عشق در شب دیجور

بوقت صبح ہو جائے گا روشن روز کی مانند
کہ تو نے عشق میں کس کے گزاری رات ہے ساری

حضرت خیر البشر صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ:

﴿مَنْ اَحْدَثَ فِیْ اَمْرِنَا هٰذَا مَا لَيْسَ فِيْهِ فَهُوَ رَدٌّ﴾

(صحيح البخاری، کتاب الصلح، باب اذا اصطلحوا على صلح جور فالصلح مردود)

جس نے ہمارے امر میں ایسی نئی چیز پیدا کی جو اس میں سے نہیں ہے تو وہ مردود ہے بھلا جو چیز مردود ہو وہ حسن کہاں

پیدا کرسکتی ہے۔ (مکتوبات امام ربانی، جلد:۱،صفحہ:۴۱۴)

حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا رحمہ اللہ حضرت خواجہ محمد معصوم رحمہ اللہ کا ایک مکتوب نقل کرتے ہیں جس سے یہ اندازہ ہوگا کہ اصل عشق ومحبت اور تصوف وطریقت کا معیار اتباع سنت ہی ہے۔

''اس وقت عہد نبوت سے دوری اور قرب قیامت کی وجہ سے بدعت شائع ہوتی جارہی ہے اور بدعت کی ظلمتیں عالم پر محیط ہیں۔ سنت غریب ونادر ہوگئی ہے اور اس کے انوار مستور ہورہے ہیں۔ سنن متروکہ کے زندہ کرنے اور علوم شرعیہ کے پھیلانے کے لیے خوب ہمت باندھو، اور اس امر کو وسیلہ کمال رضامندی حق تعالیٰ بنالو نیز قرب بارگاہ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اسی عمل سے ڈھونڈو۔ یہ مضمون حدیث ہے کہ جو میری سنت کو جو متروک العمل ہوگئی ہے۔ زندہ کرے گا اس کو سو شہیدوں کا ثواب ہے۔ احیائے سنت کا پہلا درجہ تو یہ ہے کہ اس سنت پر خود عمل کرے اور اعلیٰ اس سنت کی نشر واشاعت اور دوسروں کو اس پر عمل کرانے کی کوشش کرنا ہے۔''

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اگر تم ایسا آدمی دیکھو کہ کرامتیں دیا گیا ہے یہاں تک کہ ہوا پر اڑتا ہے تو دھوکہ میں نہ آجاؤ جب تک یہ نہ دیکھو کہ امر ونہی اور حفظِ حدود اور پابندیٔ شریعت میں کیسا ہے۔ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ سب راہیں بند ہیں کل مخلوق پر سوائے اس کے جو قدم بقدم چلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے۔ (زاد السالکین،ص:۸۸۳۔۸۸۴،مرتبہ مولانا عبدالحفیظ مکی)

یعنی اصل کسی آدمی کی ولایت اور تقویٰ کا مدار اتباع سنت وشریعت پر ہے کرامتوں کے ظہور پر نہیں ہے جبکہ عام طور پر لوگ اس سے دھوکہ کھاتے ہیں اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ جو جتنی کرامتوں والا ہو وہ اتنا ہی بڑا بزرگ ہے حالانکہ صحیح بات یہ ہے کہ جو ہر قدم پر سنت وشریعت کا متبع ہو سب سے بڑا ولی وہی ہے۔

اس لیے اللہ ورسول کا سب سے بڑا عاشق وہی شخص کہلائے گا جس کے ہر قول وفعل میں اس کی رفتار وگفتار میں سنت کی اتباع پائی جائے یعنی کوئی قول وعمل خلاف سنت وشریعت نہ ہو اسی کو تقویٰ کہتے ہیں اور یہی تصوف ہے اور یہی سچا عشق اور ولایت ہے اور خلاف سنت وشریعت چل کر بہت سے مجاہدات اور ریاضتوں کا کرنا اور پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے بطور استدراج اور ڈھیل کے اس دنیا میں کچھ ثمرات اور نتائج کا حاصل ہوجانا یہ ولایت کی نشانی نہیں ہے بلکہ یہ کیفیات تو بہت سی مرتبہ کفار ومشرکین کے مندروں میں بیٹھنے والے ہندوؤں، جوگیوں کو بھی حاصل ہوجاتی ہیں اور ان کو ان کے مجاہدات پر دنیا میں اس کا ثمرہ دے دیا جاتا ہے لیکن اس کا اللہ تعالیٰ کے یہاں مقبول اور مقرب ہونے سے کوئی تعلق نہیں اسی لیے بزرگوں کا مشہور مقولہ ہے ''**الاستقامة فوق الف کرامة**'' کہ دین پر جمے رہنا ہزار کرامتوں سے افضل ہے اگر کوئی شخص پوری زندگی ہر کام شریعت کے مطابق گزار رہا ہو مگر اس سے کوئی کرامت صادر نہ ہو تو وہ اللہ کا مقبول بندہ کہلائے گا۔

کشف والہام سے متعلق مکتوب شیخ الاسلام مدنی رحمہ اللہ

جہاں تک اچھے اچھے خواب اور عمدہ کیفیات اور کشف والہام کا معاملہ ہے تو ان کے متعلق شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی نور اللہ مرقدہ کا ایک مکتوب ملاحظہ فرمائیں جس سے اتباع سنت وشریعت کی اہمیت کا بھی اندازہ ہو جائے گا۔

''جو احوال جناب نے تحریر فرمائے ہیں اطمینان بخش اور امید افزا ہیں (الاستقامۃ فوق الکرامۃ) خواب یا انوار یا الہامات وغیرہ صرف دل بڑھانے کے لیے سالک کو پیش کئے جاتے ہیں جیسے بچے کو لبھانے کے لیے گنگھنا دے دیا جاتا ہے۔ اکابر کا مقالہ **تلک خیالات تربی بھا اطفال الطریقۃ** (یہ سب خیالات ہیں جن سے سلوک کے بچوں کی تربیت کی جاتی ہے) مشہور ہے۔ عبادت اور ذکر پر مداومت، اتباع سنت اور شریعت پر قیام یہی امور ہیں جن کے ہم مکلّف ہیں اور جن پر استقلال سے عمل پیرا ہونا، درجاتِ احسان کا حاصل ہونا کمال ایمانی ہے۔ خوفِ خداوندی اور رجاء دونوں ایمان کے کمال کی نشانیاں ہیں۔ بکاء اور گریہ کا غلبہ چشتیہ نسبت کا ظہور ہے۔ **اللّٰھم زد فزد**'' (مکتوبات شیخ الاسلام، جلد:۳، ص:۱۶۸، مکتوب:۵۷)

متبع سنت ہی کے محبوب ہونے پر ایک عقلی دلیل

صاحبو! اس مسئلے پر ایک عقلی دلیل سے غور کرنے کے بعد یہ بات بڑی آسانی سے سمجھ میں آ جائے گی کہ جو جتنا سنتوں کا متبع ہوگا وہ اللہ تعالیٰ کے یہاں اتنا ہی زیادہ محبوب ہو جائے گا چاہے اس کی عبادات اور ریاضت و مجاہدات بہ نسبت دوسروں کے کم ہوں لیکن اس کا اتباع سنت پر جمنے کا مجاہدہ ہی سب پر بھاری اور اہم ہے کیونکہ تمام مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے کہ ہمارے نبی حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام انبیاء میں سب سے افضل اور اللہ کے سب سے زیادہ محبوب نبی ہیں تو لہٰذا آپ کے جو طریقے اور اقوال وافعال ہیں وہ بھی سب طریقوں سے افضل اور اعلیٰ ہوں گے اسی طرح آپ کے خصائل وعادات کا ہر ہر گوشہ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں سب سے زیادہ اونچا اور پسندیدہ ہوگا لہٰذا جو آدمی اس طریقے کو اپنائے گا تو وہ افضل الانبیاء کے افضل الطرق (یعنی سب سے افضل نبی کے افضل طریقہ) کو اپنا رہا ہے لہٰذا اس کے سب سے زیادہ مقرب الی اللہ اور محبوب عند اللہ ہونے میں کیا شبہ ہو سکتا ہے اس لیے سلوک طے کرنے والوں کو سب سے زیادہ اتباع سنت کا خیال رکھنا چاہیے اور وہ اس طرح کے شب و روز کے اپنے تمام معمولات کو سنتیں تلاش کر کر کے ان کے مطابق ڈھال دے۔

اس موضوع پر خاص طور پر ہمارے حضرت والا کا ایک مختصر سا رسالہ موجود ہے جس کا نام ہے ''پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری سنتیں'' اور اسی موضوع پر ایک ضخیم اور موٹی کتاب حضرت ڈاکٹر عبدالحئی عارفی رحمہ اللہ کی تصنیف کردہ ہے جس کا نام ''اسوۂ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم'' جو سیرت کے عملی پہلو کے اعتبار سے جذبہ اتباع

سنت رکھنے والوں کے لیے ایک انوکھی اور بے مثال کتاب ہے کہ جس کے اندر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام سنتوں کو بڑی خوبی کے ساتھ جمع فرما دیا گیا ہے اور ایک عاشق رسول کے لیے مرتے دم تک کے شب و روز کے ہر قول و فعل میں کوئی نہ کوئی سنت اس کتاب میں لکھ دی گئی ہے اس لیے ہر دین دار ذہن رکھنے والے آدمی کو یہ کتاب اپنے پاس رکھ کر کچھ نہ کچھ حصہ کا روزانہ مطالعہ کر لینا چاہیے تا کہ ہمارا ہر قول و فعل سنت کے سانچے میں ڈھل جائے کہ اس سے بڑی بزرگی اور ولایت کچھ نہیں ہے۔ کھانے پینے اور اٹھنے بیٹھنے، ملنے جلنے غرض کے ہر معاملے میں سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا اتباع پیش نظر ہو یہاں تک کے چلنے پھرنے میں بھی اس لیے حضرت والا نے فرمایا رفتار ہو یا گفتار ہو یا کردار ہو ہر ایک میں سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا ہی اتباع کیا جا رہا ہو۔

سنت کے مطابق گفتار و رفتار کیسی ہوا کرتی ہے؟

اگر کسی کے ذہن میں یہ خیال آوے کہ کیا چلنے پھرنے کے سلسلے میں بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی سنت ہے تو یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ دین اسلام کامل اور مکمل دین ہے ہماری زندگی کا کوئی چھوٹا یا بڑا معاملہ ایسا نہیں ہے جس میں شریعت وسنت سے روشنی موجود نہ ہو یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شمائل و خصائل میں اس طرح کی آپ کی تمام باتوں کا تذکرہ موجود ہے اور قرآن کریم میں بھی عباد الرحمٰن (رحمٰن کے خاص مقبول بندوں) کی صفات ذکر کرتے ہوئے ان کی چال کا تذکرہ کیا گیا ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِیْنَ یَمْشُوْنَ عَلَی الْاَرْضِ هَوْنًا﴾

(سورۃ الفرقان، ۶۳)

ترجمہ: کہ اللہ تعالیٰ کے خاص بندے وہ ہیں جو زمین پر عاجزی کے ساتھ چلتے ہیں مطلب یہ کہ ان کے مزاج میں تواضع ہے تمام امور میں اور اسی کا اثر چلنے میں بھی ظاہر ہوتا ہے۔

لفظ ھون کا مفہوم اس جگہ سکینت و وقار اور تواضع ہے کہ اکڑ کر نہ چلے، قدم متکبرانہ انداز سے نہ رکھے بہت آہستہ چلنا مراد نہیں کیونکہ وہ بلا ضرورت ہو تو خلاف سنت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چلنے کی جو صفت شمائل نبویہ میں منقول ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا چلنا بہت آہستہ نہیں بلکہ کسی قدر تیزی کے ساتھ تھا۔ حدیث میں ہے کانما الارض تطوی له یعنی آپ ایسا چلتے تھے کہ گویا زمین آپکے لیے سمٹتی ہے (ابن کثیر) اسی لیے سلف صالحین نے بتکلف مریضوں کی طرح آہستہ چلنے کو علامت تکبر و تصنع ہونے کے سبب مکروہ قرار دیا ہے۔ فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک نوجوان کو دیکھا کہ بہت آہستہ چل رہا ہے، پوچھا، کیا تم بیمار ہو۔ اس نے کہا نہیں، تو آپ نے اس پر درہ اٹھایا اور حکم دیا کہ قوت کے ساتھ چلا کرو۔ (ابن کثیر)

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے اس آیت یمشون علی الارض ھونا، کی تفسیر میں فرمایا مومنین

مخلصین کے تمام اعضاء و جوارح آنکھ، کان، ہاتھ پاؤں سب اللہ کے سامنے ذلیل عاجز ہوتے ہیں ناواقف ان کو دیکھ کر معذور عاجز سمجھتا ہے حالانکہ نہ وہ بیمار ہیں نہ معذور بلکہ تندرست قوی ہیں مگران پر حق تعالیٰ کا خوف ایسا طاری ہے جو دوسروں پر نہیں ہے۔ ان کو دنیا کے دھندوں سے آخرت کی فکر نے روکا ہوا ہے اور جو شخص اللہ پر بھروسہ نہیں کرتا اور اسکی ساری فکر دنیا ہی کے کاموں میں لگی رہتی ہے تو وہ ہمیشہ حسرت ہی حسرت میں رہتا ہے (کہ دنیا ساری ملتی نہیں اور آخرت میں اس نے حصہ نہیں لیا) اور جس شخص نے اللہ کی نعمت صرف کھانے پینے کی ہی چیزوں کو سمجھا ہے اور اعلیٰ اخلاق کی طرف دھیان نہیں دیا، اس کا علم بہت تھوڑا ہے اور عذاب اس کے لیے تیار ہے۔ (ابن کثیر ملخصا)

اس سے معلوم ہوا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رفتار کا بھی ایک خاص انداز تھا عاشق رسول کو چاہیے کہ اس میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کرے اور آپ کی گفتار کا انداز بھی حدیث کی کتابوں میں اس طرح ذکر کیا گیا ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب گفتگو فرماتے تھے تو بڑی واضح اور صاف گفتگو ہوتی تھی اور مخاطب کی طرف پورے طور پر متوجہ ہو کے گفتگو فرماتے تھے۔

متکبر لوگوں کی طرح نہیں کہ بات کاٹ کاٹ کر جلد بازی میں گفتگو کرتے ہیں اور الفاظ کو صحیح طرح نہ ادا کرتے اور نہ مخاطب کو سنانے کی پرواہ کرتے ہیں بلکہ ان کی طرف پورے طور پر متوجہ ہونے کو اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہیں یہاں تک کے سننے والا پوری طرح نہ سننے اور نہ سمجھنے کی وجہ سے تکلیف کا شکار ہو جاتا ہے، حضور علیہ الصلاۃ والسلام زیادہ تر خاموش رہا کرتے تھے:

﴿وَعَنْ جَابِرِ بْنِ سُمُرَةَ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ طَوِيْلَ الصَّمْتِ﴾

(الشمائل المحمدية للترمذي، باب كيف كان كلامُ رسول ﷺ)

یعنی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بغیر ضرورت کہ خواہ مخواہ قیل وقال میں مشغول نہ ہوتے تھے بلکہ دیر تک خاموش رہا کرتے تھے۔

اور ایک دوسری روایت میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جلد بازی سے گفتگو نہیں فرماتے تھے بلکہ اس طرح صاف صاف اور واضح گفتگو فرماتے تھے کہ پاس بیٹھنے والا آسانی کے ساتھ سن کر اس کو یاد کر سکے اسی طرح آپ کی گفتگو میں فحش اور بے حیائی والے جملے اور گالی گلوچ کا کلام شامل نہیں ہوتا تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی گفتگو کا انداز پر وقار اور الفاظ انتہائی شستہ اور شائستہ اور بامقصد اور واضح ہوتے تھے اگر کوئی بری بات کہہ دیتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم خوش اسلوبی سے عمدہ پیرائے میں اس کو جواب دیتے تھے اور ہر ایک کے ساتھ بڑی خندہ پیشانی سے مسکرا کر پیش آتے تھے خواہ دوست ہو یا دشمن یہی وجہ ہے کہ آپ سے ملنے والا ہر شخص یہ محسوس کرتا تھا کہ جیسا کہ مجھ ہی سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے زیادہ محبت ہے باقی آپ کی

صفات شمائل کی کتابوں میں موجود ہیں۔ غرض یہ کہ کوئی انسانی خوبی اور کمال ایسا نہیں ہے کہ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات عالی میں موجود نہ ہو۔

آہ! آج ہم اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتیں

میرے بھائیو! اس مقام پر بڑے دکھ اور درد سے یہ بات کہنی پڑتی ہے کہ آج عشق ومحبت کے دعوے بھی ہر طرف ہو رہے ہیں اور سنتوں میں کامیابی کی تقریریں بھی خوب کی جارہی ہیں لیکن جب ہم اس کا جائزہ لیتے ہیں کہ ہماری اجتماعی اور انفرادی زندگیوں میں کتنی سنتیں زندہ ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کتنے طریقے ہماری عملی زندگی میں موجود ہیں تو بڑے دکھ سے کہنا پڑتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقوں کو ہم نے کتابوں میں لکھنے یا تقریروں میں بیان کرنے کے لیے تو باقی رکھا مگر اپنی زندگیوں سے نکال دیا۔ چنانچہ اس مقام پر احقر ذرا تفصیل سے عرض کرنا چاہتا ہے کہ ہم دین کے قبیل سے جو کچھ بھی کریں گے اس کی تین صورتیں ہوسکتی ہیں:

یا تو وہ دین کے حکموں میں سے کوئی حکم فرض وواجب وسنت ومستحب ہوگا

یا پھر حرام مکروہ اور ناجائز ہوگا

یا تیسرا درجہ ایسا مباح اور جائز کام ہوگا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور دین کا کوئی حکم تو نہیں ہے لیکن خلافِ سنت اور ممنوع وحرام بھی نہیں ہے بلکہ ایک مباح درجے کا معاملہ ہے کیونکہ سنت کے خلاف ہونا الگ چیز ہے اور سنت کے مطابق نہ ہونا الگ چیز ہے جیسا کہ حضرت شیخ الاسلام حضرت مفتی تقی عثمانی دامت برکاتہم نے ترمذی کی شرح، تقریرِ ترمذی، ج:۲، صفحہ:۳۶۱ پر یہ بات ذکر فرمائی ہے کہ کسی نے حضرت کو کف والا کرتا پہنے ہوئے دیکھا تو حضرت کو خط لکھ کر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار اس طرح سے کیا کہ آپ اتنے بڑے آدمی ہو کر خلاف سنت لباس پہنتے ہیں کیونکہ آپ کف والا کرتا پہنے ہوئے ہیں جس پر حضرت مفتی تقی عثمانی دامت برکاتہم نے جواب لکھا کہ ''اس سے تو مجھے بہت خوشی ہوئی کہ کچھ لوگ میری حرکات وسکنات پر نظر رکھنے والے ہیں تاکہ اگر مجھ سے کوئی نامناسب بات سرزد ہو تو مجھے اطلاع کرسکیں لیکن پھر اس میں یہ بات بھی لکھی کہ خلاف سنت ہونا الگ چیز ہے اور مطابق سنت نہ ہونا الگ چیز ہے اگرچہ وہ خلاف سنت نہ ہو، بہت سی ایسی چیزیں ہیں جو سنت کے مطابق تو نہیں ہیں یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو استعمال نہیں فرمایا لیکن وہ چیزیں خلاف سنت بھی نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع کیا ہو یا ان کے مقابل دوسری چیز کی ترغیب دی ہو اور کوئی اس کے خلاف کرے بلکہ ان کو مباح اور جائز بنا کر چھوڑ دیا جس کا جی چاہے اس پر عمل کرسکے اس اعتبار سے جو مباح وجائز چیزوں پر عمل کر رہا ہو گو کہ وہ سنت کا متبع تو نہیں لیکن وہ سنت کے خلاف کرنے والا بھی نہیں۔ جیسے کہ اس کی مثال پیش فرمائی ہے کہ مثلاً بجلی کا استعمال سنت نہیں ہے اب اگر کوئی شخص یہ کہے کہ بجلی جلانا یا بجلی کا پنکھا استعمال کرنا خلاف سنت ہے تو یہ بات

درست نہیں ہے۔ آگے حضرت مفتی صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ ہاں البتہ اس میں شبہ نہیں کہ آدمی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے جتنا قریب رہے گا اتنا ہی اس عمل میں نور برکت اور اجر وثواب ملے گا اور جتنا سنت سے دور رہے گا اتنی ہی اس کے اندر بے برکتی ہوگی۔ (تقریر ترمذی، جلد:۲، صفحہ:۳۶۲)

ارشاد حضرت مولانا منظور نعمانی ''اب دیو بندیت بریلویت سے ایک بالشت کے فاصلہ پر''

پس اس مقام پر احقر یہ عرض کرنا چاہتا ہے کہ سالکین علماء وطلباء کو اول درجے کو اپنانا چاہیے یعنی جو کام جس انداز سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے۔ اس کو اسی طرح اپنائے اور اختیار کرے۔ یہ جو آج کل نیا ایک مزاج پیدا ہوا ہے کہ سنتوں کو چھوڑ کر نئے نئے طریقے اور عبادت کے نئے نئے انداز ایجاد کر لیے گئے اور جب اُن کو اس غلطی پر توجہ دلائی جائے تو جواب میں کہتے ہیں کہ یہ بدعتِ حسنہ ہے اور فی نفسہ جائز تو ہے سو جب کہ مباح اور جائز ہے تو اس کے کرنے میں کیا حرج ہے اور اسی طرح بہت سے نئے نئے قسم کے ختمات اور وظائف ایجاد کیے گئے ہیں جن کا دورِ نبوت اور دورِ صحابہ وتابعین میں کوئی وجود نہیں ملتا۔

انتہائی دُکھ اور افسوس سے یہ بات کہنی پڑتی ہے کہ دیو بندی مسلک پر چلنے والے اور اپنے کو علمائے دیو بند سے وابستہ قرار دینے والے لوگ بھی اس میں کثرت کے ساتھ مبتلا ہیں۔ چنانچہ احقر نے استاد محترم حضرت مفتی سعید صاحب پالن پوری دامت برکاتہم سے یہ بات سنی جو کہ حضرت نے دورانِ درس بیان فرمائی اور ایک مرتبہ ''رابطۃ المدارس'' کے جلسے کے موقع پر اسی بات کا تذکرہ کیا اور لکھنے سے پہلے جنوبی افریقہ سے حضرت کو بذریعۂ فون معلوم کی اور عرض کیا کہ کتاب میں آپ کے حوالہ سے لکھ سکتا ہوں تو ارشاد فرمایا کہ ضرور لکھو کہ حضرت مولانا منظور نعمانی دامت برکاتہم نے اُن سے یہ بات ارشاد فرمائی کہ اب دیو بندیت اور بریلویت میں ایک بالشت کے برابر فاصلہ رہ گیا ہے۔ اور دیو بندیت بریلویت کے انتہائی قریب پہنچ چکی ہے۔ تعجب ہے ان لوگوں پر کہ جب اس طرح کے مسائل اور ختمات اور نئی نئی باتوں پر ان کو روک ٹوک کی جاتی ہے تو وہ دلیل اس طرح سے پیش کرتے ہیں کہ ان چیزوں کا عبادت ہونا قرآن وحدیث سے ثابت ہے۔ مگر یہ لوگ یہ نہیں سوچتے کہ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی تو ثابت ہونا چاہیے کہ اس ہیئت اور کیفیت کے ساتھ ان خاص مواقع پر خاص انداز سے ان کاموں کو جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابہ وتابعین میں سے کسی نے کیا ہے یا نہیں؟ اگر نہیں کیا تو پھر ہمیں اُن کے کرنے کی کیا ضرورت ہے۔

کیا خیر کی طرف سبقت لے جانے میں ہم اُن سے بڑھ کر ہیں یا وہ ہم سے آگے تھے۔ اور کیا دین پر عمل کرنے میں ہمیں زیادہ شوق اور جذبہ ہے یا اُن حضرات کو زیادہ تھا۔ اور کیا اللہ ورسول کی محبت اُن کے قلوب میں زیادہ تھی یا ہمیں اُن سے زیادہ محبت ہے اور کیا اللہ تعالیٰ کے قرب ومعرفت کی کچھ ایسی اعلیٰ درجہ کی حد دو تھیں کہ جو نہ

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا ہوئیں اور نہ صحابہ وتابعین کو بلکہ وہ صرف بعد میں آنے والے علماء واکابر کے قلوب پر القاء ہوتی ہیں العیاذ باللہ کیا یہ کھلا ہوا کمالِ دین اور اتمامِ نعمت کے خلاف دعویٰ نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ ان سب باتوں میں یہی جواب ہوگا کہ وہ ہی حضرات ان سب چیزوں میں ہم سے زیادہ سبقت لے جانے والے تھے تو اگر اس طرح کسی خاص موقع پر کوئی عبادت ثابت ہوتی تو آخر اُن لوگوں نے ایسا کیوں نہ کیا؟

میں ایک مثال پیش کرتا ہوں کہ آج خود ہمارے دیوبندی حضرات میں کثرت کے ساتھ یہ رواج ہوگیا ہے کہ جیسے ہی کسی کے انتقال کی خبر سنتے ہیں تو اجتماعی ختمِ قرآن شریف یا آیتِ کریمہ کرنے کے لیے اکٹھے ہوجاتے ہیں جبکہ خیر القرون میں سے کسی بھی زمانے میں کوئی شخص کوئی ضعیف سے ضعیف درجے میں بھی روایت یا کسی کا عمل ثابت نہیں کرسکتا جس سے یہ پتہ چلتا ہو کہ اُن لوگوں نے اجتماعی ختمِ قرآن کیا ہے اسی لیے حضرت تھانوی قدس سرہٗ نے اپنی وصایا میں یہ بات لکھی ہے کہ مجھے ثواب پہنچانے کے لیے لوگ جمع نہ ہوں اگر پہلے سے جمع ہوں تو الگ ہوجائیں اور بدعاتِ عوام وخواص میں سے کسی کا ارتکاب نہ کیا جائے۔ یا اسی طرح کثرت سے یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ عنوان بہ عنوان مختلف کاموں کے لیے لوگوں کو جمع کرکے یٰسین شریف کا ختم کرنے کا اہتمام لوگوں میں رواج پکڑ گیا ہے جس کے نتیجے میں اصل اُمت کے بگاڑ کے سبب اور تباہی و بربادی کی وجوہات سے صرفِ نظر کرلیا گیا جو کہ اُمت کا گناہوں میں مبتلا ہونا اور اللہ کے احکامات کی پرواہ نہ کرنا ہے۔ ان ختمات کے نتیجے میں اُمت کو سخت نقصان پہنچا اور پریشانیاں اور مشکلات جوں کی توں قائم رہیں کیونکہ بے شک اس کا انکار نہیں ہے کہ سورۂ یٰسین جس مقصد سے پڑھی جاتی ہے وہ اس میں کارآمد اور نافع ہے بلکہ یقیناً نافع ہے۔ جیسا کہ حدیث پاک میں صراحت کے ساتھ یہ مضمون وارد ہوا ہے۔

لیکن میرے دوستو! پوری تاریخ میں کوئی ایک مثال تو بتاؤ کہ خیر القرون کے زمانے میں کسی ایک مسئلے میں بھی جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام سے یہ بات ارشاد فرمائی ہو کہ سب مسجدِ نبوی میں جمع ہوجائیں ایک اہم کام درپیش ہے اُس کے لیے یٰسین شریف کا ختم ہوگا۔ اور اس کے علاوہ ان گنت اور بے شمار چیزیں ہمارے عوام وخواص نے ایجاد کرڈالیں ہیں جن کو مجدد زمانہ حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی نور اللہ مرقدہٗ نے اپنی وصایا کے تحت میں اس طرح سے ذکر فرمایا کہ میرے انتقال کی خبر سن کر بدعاتِ عوام وخواص میں سے کسی کا ارتکاب نہ کرنا وغیرہ وغیرہ۔

ختم یٰسین شریف کی شرعی حیثیت

مسلک دیوبند کی بعض مساجد میں یٰسین شریف کے اجتماعی ختم نے ایک التزامی رواج کی صورت اختیار کرلی ہے۔ صورت اس کی یہ ہوتی ہے کہ برطانیہ میں مقامی طور پر کسی کی وفات ہوجائے یا ہندوپاک یا کسی جگہ سے

کسی عزیز کی وفات کی خبر آجائے تو مسجد میں کسی نماز کے بعد اعلان کیا جاتا ہے کہ بعد نماز یٰسین شریف کا ختم ہوگا، بعض جگہ یہ اعلان بلیک بورڈ پر لکھ دیا جاتا ہے اور نماز کے بعد مصلی اجتماعی طور پر یٰسین پڑھتے ہیں آخر میں امام صاحب یا کوئی اور اجتماعی دعا کرتا ہے۔ اس کے التزام واہتمام نے یہ صورت اختیار کرلی ہے کہ اگر اسے روکا جائے تو روکنے والے سے لڑائی جھگڑا کیا جاتا ہے۔ اگر مسجد کی انتظامیہ اسے روکے تو انتظامیہ کو مجبور کرنے کے لیے ممبران کو اس کے خلاف اُکسایا جاتا ہے۔ ختم یٰسین جاری کرانے کے لیے انتظامیہ کے خلاف ممبران سے احتجاجی طور پر دستخط کرائے جاتے ہیں حتیٰ کہ اگر انتظامیہ اس کے بعد بھی یٰسین شریف کا ختم جاری نہیں کرتی تو مختلف بہانوں سے اس کمیٹی ہی کو بدلنے کی مہم چلائی جاتی ہے اور خواہی نخواہی اپنی مقدور بھر کوشش یہ ہوتی ہے کہ ختم یٰسین شریف کی یہ اجتماعی بدعت ختم نہ ہو اور جاری رہے۔ اس میں علماء وآئمہ مساجد بھی جانتے ہوئے اسے نہیں روکتے۔

جہاں تک قرآن کریم یا یٰسین شریف کی تلاوت کے بعد مرحوم کو ایصال ثواب پہنچانے کا تعلق ہے تو اس بارے میں مطلق بات یہ ہے کہ مذکورہ بالا التزام کے بغیر انفرادی طور پر بغیر اجتماع کے تلاوت کرنے والا اپنے طور پر تلاوت کا اجر وثواب مرحوم کو بخش دے تو اس کے جواز میں کوئی اعتراض نہیں۔ مگر اجتماعی ختم یٰسین شریف کی جو صورت اوپر بیان کی گئی ہے شریعتِ مطہرہ میں قطعاً اس کی کوئی اصل نہیں اور یہ بدعتِ سیئہ قبیحہ ہے اس کا ترک لازم ہے اور روکنے والے سے اختلاف وجھگڑا دین سے مقابلہ کرنے والی بات ہے۔

بدعتی ایجاد بدعت سے دو دعوے کرتا ہے

(۱)...... وہ دعویٰ کرتا ہے کہ دین نعوذ باللہ ناقص تھا، بدعت کے اضافہ سے وہ اس کی تکمیل کررہا ہے۔

(۲)...... یا مبتدع اس بات کا مدعی ہے کہ نعوذ باللہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دین پہنچانے میں خیانت کی اور دین کی یہ بات (بدعت) نہیں پہنچائی جسے وہ اب دین میں شامل کررہا ہے۔

حضرت امام مالک رحمہ اللہ کا فرمان ہے کہ جو شخص بھی کسی بدعت کو ایجاد کرے اور اسے نیکی سمجھے وہ اس بات کا دعویٰ کرتا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رسالت میں خیانت کی (اور یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر بہتان ہے) کیونکہ اللہ جل شانہٗ کا ارشاد ہے کہ آج ہم نے مکمل کردیا تمہارے لیے تمہارا دین پس جو بات اس زمانہ میں دین نہیں تھی وہ آج بھی دین نہیں ہوسکتی۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی قدس سرہٗ نے اپنی کتاب ''حجۃ اللہ البالغہ'' کے اندر یہ بات لکھی ہے کہ اسلام میں بدعت کو اس لیے سخت جرم قرار دیا کہ وہ تحریفِ دین کا راستہ ہے پچھلی امتوں میں یہی ہوا ہے کہ انہوں نے اپنی کتاب اور اپنے رسول کی تعلیمات پر اپنی طرف سے اضافے کرلیے اور ہر آنے والی نسل اضافے کرتی رہی یہاں تک کہ یہ پتہ نہ رہا کہ اصل دین کیا تھا اور لوگوں کے اضافے کیا ہیں، تحریفِ دین کے دنیا میں کیا

کیا اسباب پیش آئے ہیں اور شریعت نے ان سب کے دروازوں پر کس طرح پہرہ بٹھایا کہ کسی سوراخ سے یہ وبا اُمت میں نہ پھیلے۔ (معارف القرآن، جلد:۲، صفحہ:۴۲۱)

حضرت فضیل بن عیاض رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جو شخص کسی بدعتی سے محبت کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے نیک اعمال مٹا دیتا ہے اور اسلام کا نور اس کے دل سے نکال دیتا ہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ خود بدعتی کا کیا حال ہوگا۔

حضرت جنید بغدادی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مخلوق پر اللہ کی طرف پہنچنے کے تمام راستے بند ہیں سوائے اس راستہ کے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بتلایا۔

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مسلمان کے لیے توحید وسنت کی پیروی لازم ہے اوراسی طرح شرک وبدعت سے پرہیز لازم ہے۔ بدعت یہی ہے کہ اپنے پاس سے بے سند چیزیں ایجاد کر کے دین وشریعت سے منسوب کر دی جائیں اور ان کی پیروی کو اسلام کی پیروی سمجھا جائے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ایک قوم کے متعلق فرمایا ان لوگوں نے رہبانیت کا ایک طریقِ عمل ایجاد کر کے اسے اپنے لیے لازم سمجھا حالانکہ رہبانیت یعنی گوشہ گیری اور دنیا کی جائز وحلال نعمتوں کا استعمال ترک کر دینا ہم نے ان پر فرض نہیں کیا تھا اور نہ اس کا حکم دیا تھا اور یہی وجہ ہے کہ پھر وہ لوگ اپنے اس خلاف فطرت عمل کی پیروی بھی نہ کر سکے۔ اس لیے ہر وہ عقیدہ یا عمل جس کی کتب سماوی اور شریعت میں کوئی سند نہ ہو بدعت ہے، اختراعِ نفس ہے اور اس کی پیروی عینِ گمراہی اور راہِ سنت سے منحرف ہونا ہے۔ بدعت کے مقابل سنت ہے اور سنت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کا وہ دستور العمل ہے جسے اللہ تعالیٰ ''اسوۂ حسنہ'' سے موسوم کرتے ہیں۔ (فتوح الغیب)

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ رسوم وبدعات کی تردید میں اپنے معروف رسالہ اصلاح الرسوم میں تحریر فرماتے ہیں:

کسی امر غیر ضروری کو اپنے عقیدہ میں ضروری اور مؤکد سمجھ لینا یا عمل میں اس کی پابندی اصرار کے ساتھ اس طرح کرنا کہ فرائض وواجبات کے مثل یا زیادہ اس کا اہتمام ہو اور اس کے ترک کو مذموم اور تارک کو قابل ملامت وشناعت جانتا ہو یہ دونوں امر ممنوع ہیں، کیونکہ اس میں حکم شرعی کو توڑ دینا ہے اور تقید وتعین وتخصیص والتزام وتحدید وغیرہ اسی قاعدہ اور مسئلہ کے عنوانات وتعبیرات ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جو شخص تجاوز کرے گا اللہ کی حدوں سے پس ایسے ہی لوگ ظالم ہیں۔

چونکہ دوسرے مسلمانوں کو بھی ضرر سے بچانا فرض ہے اس لیے اگر خواص کے کسی مشروع فعل سے عوام کے عقیدے میں خرابی پیدا ہوتی ہو تو وہ فعل خواص کے حق میں بھی مکروہ وممنوع ہو جاتا ہے خواص کو چاہیے کہ وہ فعل

ترک کردیں۔ (اصلاح الرسوم)

مجدد الف ثانی کے سنت کی اہمیت پر بعض مکاتیب

اور اسی بات کو حضرت مجدد الف ثانی رحمہ اللہ نے اپنے مکتوبات میں جگہ جگہ بڑے اہتمام کے ساتھ ذکر فرمایا ہے یہاں تک لکھ دیا ہے کہ افسوس آج عالم کا عالم بدعات کے سمندر میں غرق ہے۔ غور کرنے اور سوچنے کی بات یہ ہے کہ اگر یہ کوئی خیر کی چیز تھی تو خیر القرون کے زمانے میں ایسا کیوں نہیں کیا گیا۔ جبکہ وہ لوگ خیر کی طرف سبقت لے جانے میں ہم سے کہیں آگے تھے۔

اور ایک مقام پر حضرت مجدد الف ثانی رحمہ اللہ ارشاد فرماتے ہیں: اے فرزند! جو بات کل قیامت کے دن کام آئے گی وہ صاحبِ شریعت علیہ الصلوٰۃ والسلام کی متابعت ہے اور احوال و مواجید اور علوم و معارف اور اشارات و رموز اگر اس متابعت کے ساتھ جمع ہو جائیں تو بہتر اور زہے قسمت ورنہ سوائے خرابی اور استدراج کے کچھ نہیں۔

سید الطائفہ حضرت جنید بغدادی رحمہ اللہ کو مرنے کے بعد کسی شخص نے خواب میں دیکھا اور ان کا حال پوچھا۔ انہوں نے جواب میں کہا: ''طَارَتِ الْعِبَارَاتُ وَفَنِيَتِ الْاِشَارَاتُ وَمَا نَفَعَنَا اِلَّا رُكَيْعَاتٌ رَكَعْنَاهَا فِيْ جَوْفِ اللَّيْلِ کہ سب عبارتیں اُڑ گئیں اور سب اشاراتیں فناء ہو گئیں اور ہم کو دو رکعتوں کے سواء جو رات کے درمیان پڑھا کرتے تھے کسی چیز نے نفع نہ دیا۔'' (مکتوباتِ امام ربانی، دار الاشاعت کراچی، جلد اوّل، صفحہ: ۴۱۲)

اس سے بھی زیادہ دکھ کی بات یہ ہے کہ بہت سی خانقاہوں کا موضوع آج صرف چند ختمات اور مختلف مجالس اور اوراد و وظائف ہو کر رہ گیا ہے۔ جس کو میرے شیخِ اول حضرت مسیح الامت جلال آبادی رحمہ اللہ یوں ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ آج کل کی خانقاہیں خوامخواہیں ہو گئی ہیں۔ جن کی غرض و غایت اصلاح و تزکیۂ نفس تھی۔ اور لوگ اسی نسبت پر جمع ہوا کرتے تھے مگر اب اپنے تمام اوقات خانقاہ میں رہ کر انہی مجالس اور ختمات میں گزار کر چلے آتے ہیں۔ اور اصل مقصد کی طرف ذہن تک نہیں جاتا۔ حالانکہ ابنِ بطال رحمہ اللہ اور دیگر محدثین نے بھی مختلف کتابوں میں اس بات کی صراحت کی ہے کہ جتنی فضائل کی باتیں ہیں اُس فضیلت کا حصول اس شرط کے ساتھ مقید ہے کہ آدمی گناہِ کبیرہ کا مرتکب نہ ہو۔ اسی لیے حضرت مفتی رشید لدھیانوی صاحب رحمہ اللہ کو کسی نے خط میں یہ بات لکھی کہ حضرت میں نے فضائلِ استغفار نامی کتاب چھپوا کر اتنی اتنی مقدار میں تقسیم کی ہے۔ شاید اُن کے ذہن میں یہ رہا ہو کہ میرے شیخ مجھے مبارکباد پیش کریں گے، مگر وہ حقیقی شیخِ کامل اور مصلحانہ شان کے حامل تھے، اس لیے انہوں نے افسوس کے ساتھ جواب لکھا کہ افسوس مجھ سے تعلق کیے ہوئے تمہیں ایک عرصہ گزر گیا اور ابھی تک یہ خیال نہ آیا کہ ایسی کوئی کتاب چھپوا کر تقسیم کرتے جس میں اُمت کے اصل بگاڑ اور خرابی اور اس کی تباہی و بربادی کے اسباب اور اُن کے علاج کو پیش کیا گیا ہو جس سے اصل نفع کا ہونا متوقع تھا۔

سلف صالحین کا بدعت سے سخت نفرت کا نمونہ

حضرت ابنِ وضاح رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ مدینہ منورہ کا مؤذن امام مالک رحمہ اللہ کے زمانہ میں صبح صادق کے وقت لوگوں کو آواز دیا کرتا تھا۔ امام مالک رحمہ اللہ نے اس کو بلا کر دریافت فرمایا کہ تو یہ کیا حرکت کرتا ہے؟ اس نے جواب دیا لوگوں کو صبح صادق کی خبر کرنے کے لیے یہ عمل کرتا ہوں تا کہ لوگ اٹھ جائیں۔ امام مالک رحمہ اللہ نے فرمایا تو ایسا نہ کر، ہمارے اس شہر میں ایسی بات ایجاد نہ کر جو اس میں نہیں ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مبارک شہر میں دس سال قیام فرمایا اور حضرت ابوبکر وعمر وعثمان رضی اللہ عنہم نے بھی (یہاں قیام فرمایا ہے) انہوں نے یہ کام نہیں کیا۔ اس لیے تو بھی ایسی چیز ایجاد نہ کر جو آج تک یہاں نہیں کی گئی تو مؤذن رُک گیا۔ پھر کچھ دنوں بعد صبح صادق کے وقت منارے پر کھنکھارنا شروع کر دیا۔ امام مالک نے فرمایا کیا تم کوئی چیز ایجاد کرنے سے منع نہیں کیا تھا؟ (پھر یہ نئی حرکت کیوں شروع کر دی؟) اس نے جواب دیا آپ نے تثویب (یعنی اذان کے بعد لوگوں کو نماز کے لیے پکارنا) سے منع فرمایا تھا۔ امام مالک رحمہ اللہ نے فرمایا نہیں یہ کام بھی مت کرو۔ پھر کچھ مدت اس سے رکا رہا اس کے بعد لوگوں کے دروازے کھٹکھٹانا شروع کر دیئے۔ امام مالک نے اس کے پاس ایک شخص کو بھیجا اور دریافت کیا کہ پھر تم نے یہ کیا کرنا شروع کر دیا؟ تو اس سے کہا میں نہ تثویب کرتا ہوں نہ کھنکھارتا ہوں اور آپ نے مجھے اس سے منع فرمایا تھا اب تو میں لوگوں کو صبح صادق کی اطلاع دینے کے لیے دروازے کھٹکھٹاتا ہوں۔ آپ نے اس سے بھی منع فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ جو چیز اس شہر میں نہیں ہوئی تو اسے یہاں جاری مت کر۔

(الاعتصام از شاطبی، جلد:۲، صفحہ:۲۲۲)

امام مالک کا اس شدت سے بار بار اس مؤذن کو منع کرنے کی وجہ یہ ہے کہ حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ میں مبتدع اور بدعتی دونوں پر اللہ تعالیٰ کی اور فرشتوں اور تمام لوگوں کی لعنت فرمائی ہے:

﴿قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ اَحْدَثَ فِيْهَا حَدَثًا اَوْ اٰوٰى مُحْدِثًا فَعَلَيْهِ لَعْنَةُ اللهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ﴾

(مشكوٰة المصابيح، باب حرم المدينة حرسها الله تعالى، ص:۲۳۸)

ہر منصف اور عادل کے لیے حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ کا ارشاد مشعلِ راہ ہے

غور فرمائیں حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت ہے:

﴿عَنْ نَافِعٍ اِنَّ رَجُلاً عَطَسَ اِلٰى جَنْبِ ابْنِ عُمَرَ فَقَالَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ وَالسَّلَامُ عَلٰى رَسُوْلِ اللهِ قَالَ ابْنُ عُمَرَ وَاَنَا اَقُوْلُ الْحَمْدُ لِلّٰهِ وَالسَّلَامُ عَلٰى رَسُوْلِ اللهِ وَلَيْسَ هٰكَذَا عَلَّمَنَا رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَلْ اَنْ نَّقُوْلَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰى كُلِّ حَالٍ﴾

(مشكوٰة المصابيح، ص:۴۰۶)

حضرت نافع فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کے برابر میں چھینکا اور چھینکنے کے بعد اس نے کہا الحمدللہ والسلام علی رسول اللہ تو حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ بولے کہ یہ تو میں بھی بول سکتا ہوں الحمدللہ والسلام علی رسول اللہ مگر ہم کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقع پر یہ نہیں سکھایا بلکہ ہم کو یہ سکھایا کہ ہم یہ کہیں
"اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی کُلِّ حَالٍ"

میرے دوستو! سب قارئین کو سنجیدگی سے اس مضمون کو پڑھنے اور غور وفکر کرنے کی دعوت دیتا ہوں کہ کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر درود شریف بھیجنے کو کوئی مؤمن کسی بھی وقت اور کسی بھی درجے میں نامناسب یا ناپسندیدہ سمجھ سکتا ہے؟ اور کیا ابنِ عمر رضی اللہ عنہما کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجنے سے العیاذ باللہ کوئی نفرت تھی؟ کیا درود شریف کی فضیلت حدیثوں میں موجود نہیں ہے؟ تو آخر کیا وجہ ہے کہ اس موقع پر حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما نے اس شخص پر تنقید اور اعتراض کیا اور اس کو منع فرما کر یہ بات ارشاد فرمائی کہ اس موقع پر صرف الحمدللہ پڑھنا چاہیے جس کے مختلف صیغے روایات میں وارد ہوئے ہیں اور مزید کسی چیز کا اضافہ یہ غلط ہوگا اور دین میں زیادتی ہوگی۔

مسلمانوں کے لیے جن چیزوں کا مجھے خطرہ ہے ان میں سب سے زیادہ خطرناک دو چیزیں ہیں ایک یہ کہ جو چیز وہ دیکھیں اس کو اس پر ترجیح دینے لگیں جو ان کو سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے معلوم ہے دوسرے یہ کہ وہ غیر شعوری طور پر گمراہ ہو جائیں۔ (سنت و بدعت، صفحہ: ۲۶)

اور حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ "خدا کی قسم آئندہ زمانہ میں بدعتیں اس طرح پھیل جائیں گی کہ اگر کوئی شخص اس بدعت کو ترک کرے گا تو لوگ کہیں گے کہ تم نے سنت چھوڑ دی۔" (اعتصام، جلد: ۱، صفحہ: ۹۰)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ "اے لوگو! بدعت اختیار نہ کرو اور عبادت میں مبالغہ اور تعمق نہ کرو پرانے طریقوں کو لازم پکڑے رہو اس چیز کو اختیار کرو جو از روئے سنت تم جانتے ہو اور جس کو اس طرح نہیں جانتے اس کو چھوڑ دو۔"

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ "بدعت والا آدمی جتنا زیادہ روزہ اور نماز میں محنت کرتا جاتا ہے اتنا ہی اللہ تعالیٰ سے دور ہوتا جاتا ہے نیز یہ بھی فرمایا کہ صاحب بدعت کے پاس نہ بیٹھو کہ وہ تمہارے دل کو بیمار کردے گا" (سنت و بدعت، صفحہ: ۲۷)

حضرت سفیاں ثوری رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ "کوئی قول بغیر عمل کے مستقیم نہیں اور کوئی قول وعمل بغیر نیت کے مستقیم نہیں اور کوئی قول اور عمل اور نیت اس وقت تک مستقیم نہیں جب تک کہ وہ سنت کے مطابق نہ ہو"
(سنت و بدعت، صفحہ: ۲۷)

آخر کیوں دنیا میں کوئی بھی مؤذن اذان میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نام لینے کے ساتھ درود شریف کا

اضافہ نہیں کرتا۔ آپ کے پاس جتنے دلائل اور جوابات نئی نئی چیزوں کے ایجاد کے لیے ہیں وہ سب دلائل اور جوابات یہاں بھی موجود ہیں۔ پھر بھی ان مقامات پر درود شریف کے اضافے کا کوئی بھی قائل نہیں۔ حضرت مفتی تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم نے اس واقعہ کو درس ترمذی میں ذکر فرمایا ہے کہ حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے ان لوگوں کو جو اکھٹے بیٹھ کر بلند آواز سے درود شریف پڑھا کرتے تھے مسجد سے باہر یہ کہہ کر نکال دیا تھا کہ یہ نئی بدعت ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ہم نے یہ سب نہیں دیکھا۔ (درسِ ترمذی، جلد:۲، صفحہ:۲۵۷)

مکمل اور جامع دین ہوتے ہوئے نئی چیزوں کی ضرورت کیا ہے؟

اس لیے میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ نئی نئی چیزیں خواہ ہم ان کو بدعات نہ کہیں اور فی نفسہ جائز ہی ہوں لیکن ہمیں اُن کو اختیار کرنے کے بجائے سنت کو اختیار کرنا چاہیے۔ اُس کی روشنی اور نور جدا اور الگ ہے۔ اُس کی خوشبو اور مہک بالکل نرالی ہے۔ ہاں اگر کوئی یہ کہنے لگے کہ بہت سے معاملات اور کام ایسے ہیں جن میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی اسوہ اور نمونہ ہمیں ملا نہیں اس لیے ہم اُن میں اپنی رائے کے مطابق جو مناسب سمجھتے ہیں اختیار کرتے ہیں تو یہ بات قطعاً غلط اور بے بنیاد ہے کیونکہ سوائے اُن چیزوں کے جو نئی ایجاد ہیں باقی اور کسی بھی معاملے میں ایسا ہو ہی نہیں سکتا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی روشنی ہمیں نہ ملی ہو ورنہ یہ دین اسلام کے مکمل اور متمم ہونے کے خلاف ہوگا۔ بس صرف وہ نئی چیزیں کہ جو بعد کے دور کی ایجاد ہیں اُن کے سلسلے میں بلا واسطہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اگرچہ کوئی عمل موجود نہیں ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ بالواسطہ اُن میں بھی کوئی نہ کوئی حضور کا نمونہ اور اسوہ موجود ہے۔

لٰہذا اے میری قوم! مہربانی کر کے اپنے اوپر ہم رحم کھائیں اور اپنے ہر ہر قول و فعل کو سنت کے سانچے میں ڈھالنے کی فکر کریں۔ یہاں تک کہ زبان سے جو بولیں، جو دعائیں مانگیں یا حالاتِ مختلفہ میں سے کسی بھی حال میں جو بھی کام بطور عبادت کے کریں تو یہ ضرور دیکھ لیں کہ اس کام کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ و تابعین کے زمانے میں کس طرح، کس حال کے ساتھ اور کیفیت کے ساتھ انجام دیا گیا ہے۔ اُس سے بال برابر بھی نہ گھٹائیں نہ بڑھائیں۔ ان شاء اللہ اگر ہم پورے پورے سنت پر رہیں اور اپنی طرف سے اس میں اضافہ نہ کریں تو اس صورت میں اللہ تعالیٰ کا قرب بدرجہ اتم اور اکمل حاصل ہوگا اور بسہولت و آسانی منزل ہاتھ آ جائے گی۔ جیسا کہ ہمارے حضرت والا کا شعر ہے ؎

نقشِ قدم نبی ﷺ کے ہیں جنت کے راستے
اللہ سے ملاتے ہیں سنت کے راستے

بس ہم اپنے اوپر ایک فکر سوار کر لیں کہ جیسے ہی ہمیں کہیں سے کوئی بات معلوم ہو یا کسی کا بتایا ہوا کوئی عمل سامنے آئے اور اس کا کیسا ہی چھوٹا یا بڑا فائدہ ہمارے سامنے پیش کیا جائے مگر ہمارے دل میں ایک ہی فکر لگی ہوئی

ہو کہ کیا یہ کام، یہ دعا، یہ وظیفہ، یہ عبادت، یہ معمول وغیرہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا تھا یا نہیں؟ اور اگر کیا تھا تو کس طرح کیا تھا؟ کیونکہ میرا ایمان وعقیدہ ہے کہ جینے سے لے کر مرنے تک زندگی کا کوئی اہم اور غیر اہم، معمولی اور غیر معمولی معاملہ ایسا نہیں ہوسکتا جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت موجود نہ ہو۔ جب ہمیں یہ بات تسلیم ہے تو پھر کیوں اپنی ایجاد کی ہوئی نئی چیزوں پر اصرار کیا جارہا ہے۔

بطور علاج کوئی عبادت مقرر کرنا اور اس کی حقیقت

رہ گیا یہ استدلال کہ بطور مقصد کے نہیں بلکہ بطور علاج کے فلاں فلاں معمولات تجویز کیے گئے ہیں تو آپ خود اپنے ذہن سے یہ سوال کر کے پوچھیں کہ کیا حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے روحانی معالج نہ تھے؟ کیا آپ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ علاج بطور وحی دیا گیا یا نہیں؟ اور جب یہ واقعی علاج تھا تو کیسے ہوسکتا ہے کہ حضور کو جامع شریعت دینے کے باوجود یہ علاج نہ دیا جاتا؟ بالفاظ دیگر یوں کہیے کہ اگر یہ علاج تھا تو جنہوں نے اس کو اختیار نہیں کیا تو کیا وہ لوگ اپنے ایمان میں کوئی ضعف یا بیماری لے کر ناقص ایمان کے ساتھ دنیا سے مرے؟ اَلْعَیَاذُ بِاللّٰہِ مِنْ ذٰلِکَ

لہٰذا اگر آپ اس کے جواب میں یوں کہتے ہیں کہ اُن حضرات کو اس علاج کی ضرورت نہیں تھی بلکہ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور کے بعد والوں کے لیے تھا تو پھر جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا دین اور شریعت قیامت تک کے لیے تھی تو ہمیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے اس کی اطلاع ضرور دی جانی چاہیے تھی کہ میرے زمانے کے گزرنے کے بعد تم کو کچھ فلاں فلاں قسم کے نئے نئے معمولات و وظائف بطور علاج ومعالجے کے اختیار کرنے ہوں گے جو اگرچہ میری سنت نہیں مگر کامیابی کے لیے اور وصول الی اللہ کے لیے لازم اور ضروری ہوں گے۔ حالانکہ اس طرح کی کوئی بات پورے حدیث کے ذخیرے میں کہیں بھی موجود نہیں۔ اور ہو بھی کیسے سکتی ہے اس لیے کہ کائنات میں جو شے خوبی اور بھلائی کی ہوسکتی تھی وہ ہر ایک آپ کی عادات کا حصہ بنی۔ اور جن میں کوئی خیر وخوبی اور بھلائی نہ تھی اُن سے آپ کو محفوظ رکھا گیا۔ خواہ اہلِ دنیا اُن کو کتنا ہی بہتر اور اچھا بنادیں۔ اور معیار شرف وعزت سمجھیں۔

یہ مضمون مزید کچھ تفصیلی گفتگو کا حامل ہے لیکن اس موقع پر احقر اتنی ہی باتیں پیش کر کے سامعین اور قارئین کو غور وفکر کی دعوت دے رہا ہے کہ خدارا! اپنی پوری جماعت کو بدعات اور خرافات کے گرداب میں پھنسنے سے بچائیے اور جو لوگ اس سمندر میں ڈوبے ہیں ان کا ہاتھ پکڑ کے وہاں کے اندھیروں سے سنت کی روشنی کی طرف لائیے تاکہ جلد منزل تک پہنچنا آسان ہو۔ اور اس کے سلسلے میں احقر کے ناقص علم کے مطابق ہماری جماعتِ دیوبند کے سرخیل اور شانِ تجدید پر فائز، وقت کے حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نور اللہ

مرقدہ کی کتابیں اور مواعظ وملفوظات اور کتب ورسائل کے پھیلانے کا خاص اہتمام کرنے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ یہ وہ شخصیت ہے کہ جہاں بدعات کا شائبہ بھی نظر آیا تو فوراً اُس پر روک ٹوک فرما کر بدعت اور سنت کو دودھ کا دودھ پانی کا پانی کر دیا۔ جن کے مسلک ومشرب کی بنیاد خالصتاً اتباعِ سنت پر ہے۔ اور جن سلسلے کی خانقاہیں جہاں تک احقر کی نظر ہے اُس طرز پر قائم ہیں وہ حقیقتاً اصلاح وتزکیۂ نفس کا کام انجام دے رہی ہیں۔ یہاں کسی کی تنقیص اور نفی مقصود نہیں بلکہ احقر کو جس سلسلے سے واسطہ پڑا ہے اُس کا صحیح حال اپنے علم کے مطابق بیان کر کے لوگوں کو اس طرف متوجہ کرنا مقصود ہے۔ ان شاء اللہ کسی موقع پر ان باتوں کو ایک مستقل رسالہ کی شکل میں لکھا جائے گا تاکہ اُمت میں پھیلی ہوئی غیر مسنون چیزیں مسنون چیزوں سے جدا ہو جائیں۔ وَاللهُ الْمُعِيْنُ وَهُوَ الْمُوَفِّقُ لِلصَّوَابِ.

امام مالک رحمہ اللہ کا فرمان ہے لَنْ يَّصْلَحَ اٰخِرُ هٰذِهِ الْاُمَّةِ اِلَّا بِمَا صَلَحَ بِهٖ اَوَّلُهَا'' کہ اس امت کا اخیر انہیں چیزوں سے درست ہوگا جن چیزوں سے اس کا اول صحیح ہوا ہے یعنی قرآن سنت کی اتباع اور دین صحیح کی پیروی کرنے سے اس کے علاوہ خواہ کتنی ہی نئی نئی چیزوں کی ایجاد کر لی جائے اور ان پر عمل کیا جائے مگر جو امت میں بگاڑ آ چکا ہے وہ نہیں سدھر سکتا ہے:

﴿يَأْتِيْ عَلَى النَّاسِ زَمَانٌ الصَّابِرُ فِيْهِمْ عَلٰى دِيْنِهٖ كَالْقَابِضِ عَلَى الْجَمْرِ﴾

(مشکوٰۃ المصابیح، ص: ۴۵۹)

''حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لوگوں پر ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ ان لوگوں میں دین پر جمنے والا ایسا ہوگا جیسے آگ کا شعلہ اپنے ہاتھ میں لینے والا'' اس لیے آج صحیح دین یعنی سنت وشریعت پر چلنا اتنا ہی دشوار ہو چکا ہے کیونکہ اس کے علاوہ طرح طرح کے فتنے اور دین کے نام پر طرح طرح کی نئی نئی چیزیں ایجاد کر لی گئی ہیں۔

عشقِ کامل کی علامتِ کاملہ

عاشقِ کامل کی ہے بس یہی علامتِ کاملہ
جاں فدا کرنے کو ہر دم سر بکف تیار ہو

اللہ تعالیٰ سے سچی محبت کی نشانی یہی ہے کہ اپنی سب سے پیاری اور قیمتی چیز جان بھی اگر اللہ کے لیے دینی پڑے تو وہ اس پر تیار رہے تو جتنی نفس کی حرام آرزوئیں اور خواہشات ہوں ان کو قربان کیے بغیر عشق کا دعویٰ بے بنیاد ہے کیونکہ یہ اندر دل میں چھپی ہوئی ایک صفت ہے اور ہر مخفی شے کی کچھ علامات اور نشانیاں ہوا کرتی ہیں بس اسی طرح اس کی بھی یہ نشانی ہے کہ انسان اپنے محبوب کی خاطر سب کچھ لٹانے کو تیار رہے جیسا کہ یہ علامت حضرات صحابہ کرام میں کامل درجے میں پائی جاتی تھی کہ گھریلو اور خاندانی معاشی اور تجارتی کیسے ہی تقاضے سامنے ہونے

کے باوجود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک اشارے پر اپنی جان ہتھیلیوں پر (سر بکف) میدان میں نظر آتے تھے اس لیے قرآن کریم نے ان کے ایمان کی گواہی دی۔

صحبت مرشد کے مفید ہونے کی شرطیں

صحبت مرشد سے نسبت تو عطا ہوگی مگر
اجتناب معصیت ہو ذکر کی تکرار ہو
اس کی صحبت سے نہیں کچھ فائدہ ہوگا کبھی
بے عمل کوئی محبت کا علم بردار ہو

یہ مضمون کئی مقامات پر ذکر کیا جا چکا ہے کہ اہل اللہ کی صحبت اور کسی شیخ کامل سے اصلاحی تعلق اختیار کرنے کے ساتھ ساتھ گناہوں سے بچنے پر دوام اور ذکر اللہ کا التزام منزل مقصود پر پہنچنے کے لیے لازم وضروری ہے اگر ان میں سے کسی ایک کا بھی فقدان ہوگا تو ساری عمر اس راستے میں لگے ہونے کے باوجود وصول الی اللہ کی دولت نصیب نہیں ہوگی۔

جسمانی بیمار کو شفا پانے کے لیے جس طرح کسی اچھے ڈاکٹر یا حکیم سے رابطہ کرنا اور اس کے زیر علاج رہنا ضروری ہے اسی طرح دوائی کا استعمال اور پرہیز بھی پوری صحت کے لیے از حد لازم اور ضروری ہے ورنہ خواہ طبیب کتنے ہی عالی درجے کا ہو لیکن اگر مضر چیزوں سے پرہیز نہ ہو یا جو دوائی اس نے دی ہے اسی کا استعمال نہ کیا جائے تو صحت ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا یہ مثال ہمارے سمجھنے کے لیے کافی ہے کہ شیخ اگر چہ کتنے ہی کامل درجے کا ہو مگر گناہوں سے بچنے اور ذکر اللہ کی پابندی کے بغیر ہمارے قلب وروح کو شفاء وتزکیہ حاصل نہ ہوگا مختلف اشعار میں حضرت والا نے اس توازن اور اعتدال کو پیش فرمایا ہے۔

آخر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں کتنے ہی لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں بیٹھتے تھے اور ملتے جلتے تھے یہاں تک کے اہل خاندان میں سے تھے مگر اتباع نہ ہونے کی وجہ سے نفع نہیں ہوا اور نجات ان کا مقدر نہ بنی تو پھر کوئی کتنا ہی بڑا ولی اللہ ہو اس کی باتوں پر اگر عمل نہ کیا جائے تو کیسے نفع پہنچ سکتا ہے بڑے دکھ اور تکلیف سے کہنا پڑتا ہے کہ بہت سے لوگ خانقاہوں اور تبلیغی مرکزوں میں ایک طویل مدت تک پڑے رہتے ہیں لیکن اپنے مشائخ اور اکابر کی تعلیمات پر نہ تو وہ عمل کرتے ہیں اور نہ ان کے وہاں پڑے رہنے میں یہ نیت پیش نظر ہوتی ہے بلکہ ایسے ہی زندگی گزارتے رہتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک طویل عرصہ وہاں گزارنے کے بعد جب وہ اپنے گھروں کو واپس ہوتے ہیں تو وہ اپنے کو ویسا ہی پاتے ہیں جیسا کے وہاں شروع میں پہنچے تھے روحانی رذائل اور برائیاں اسی طرح نظر آتی رہتی ہیں جیسا کہ سابقہ زندگی میں وہ ان کا شکار تھے۔

عاشق آشنائے یار اور بیگانۂ اغیار ہوتا ہے

عشق کامل کی علامت یہ سنا کرتا ہوں میں
آشنائے یار ہو بے گانۂ اغیار ہو

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

﴿لا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی اَکُوْنَ اَحَبَّ اِلَیْهِ مِنْ وَّالِدِهٖ وَوَلَدِهٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ﴾

(صحیح البخاری، کتاب الایمان، باب حب الرّسول من الایمان، ج: ۱، ص: ۷)

تم میں سے کوئی اس وقت تک پکا سچا مومن نہیں ہوسکتا جب تک کہ میں اس کے نزدیک اس کے والد اور اس کی اولاد سے اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب ہو جاؤں۔ یہاں تک کہ خود اس کی اپنی ذات سے بھی میں اس کے نزدیک زیادہ محبوب ہو جاؤں۔ جیسا کہ بخاری شریف کی ایک روایت میں اس طرح سے آیا ہے:

﴿اِنَّ عَبْدَ اللهِ بْنَ هِشَامٍ قَالَ کُنَّا مَعَ النَّبِیِّ صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ اٰخِذٌ بِیَدِ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ فَقَالَ لَهٗ عُمَرُ یَا رَسُوْلَ اللهِ لَأَنْتَ أَحَبُّ إِلَیَّ مِنْ کُلِّ شَیْءٍ إِلَّا مِنْ نَفْسِیْ فَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَا وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِهٖ حَتّٰی أَکُوْنَ أَحَبَّ إِلَیْکَ مِنْ نَفْسِکَ فَقَالَ لَهٗ عُمَرُ فَإِنَّهُ الْآنَ وَاللهِ لَأَنْتَ أَحَبُّ إِلَیَّ مِنْ نَفْسِیْ فَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ الْآنَ یَا عُمَرُ﴾

(صحیح البخاری، کتاب الایمان والنذور، باب کیف کانت یمین النبی صلی الله علیه وسلم)

حضرت عبداللہ بن ہشام سے روایت ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ تھے اور آپ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ہاتھ پکڑے ہوئے تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ''یارسول اللہ! بے شک آپ مجھ کو ہر چیز سے زیادہ محبوب ہیں بجز میری جان کے۔'' حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''قسم اُس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے مرتبہ کمال کا (جو تم کو مطلوب ہے) کبھی حاصل نہ ہوگا جب تک کہ میں تم کو تمہاری جان سے بھی زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ بولے: ''اس وقت یہ حالت ہے کہ آپ مجھ کو میری جان سے بھی زیادہ محبوب ہیں۔'' آپ نے فرمایا: ''تو بس اب وہ کمال بھی (جو تم کو مطلوب ہے) حاصل ہوگیا (آپ کے اس ارشاد کی برکت سے وہ دولت فی الفور نصیب ہوگئی) اور یہ محبت عقلی نہ تھی ورنہ استثناء حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا صحیح نہ ہوتا، طبعی تھی سو طبعاً ایسی محبت ہونا شرطِ ایمان نہیں ہے۔ ہاں! بعض کمالات کے لیے شرط ہے۔ اسی محبت کا نام فناء فی الشیخ ہے۔ (التکشف، صفحہ: ۳۵۷)

ایک ان سے کیا محبت ہو گئی
ساری دنیا ہی سے نفرت ہو گئی

اس لیے اللہ تعالیٰ سے سچی دوستی اسی وقت شمار ہوگی جب کہ ہر معاملے میں اللہ تعالیٰ ہی پر نظر رہے اور غیر

اللہ دل سے بالکل باہر ہو جائے اس کی پرواہ ہی دل میں قائم نہ رہے چاہے کتنا ہی بڑا نفع چھوٹ رہا ہو اور یا کیسے ہی ظاہری نقصان کا سامنا کرنا پڑ رہا ہو لیکن اپنے اللہ کو ناراض کرنا ایک لمحہ کے لیے گوارا نہ ہو یہی سچے اور کامل عشق کی نشانی ہے جس کے بغیر عشق کا دعویٰ خود اپنے کو دھوکے میں رکھنا ہے اس لیے خلاف شرع کاموں میں لگے رہنے کے ساتھ اور اللہ کے حکموں کو توڑنے اور مختلف رسومات اور بدعات کی پابندی کرنے کے باوجود کسی کو اللہ کا سچا عاشق نہیں کہا جاسکتا۔

نفس مٹادو اور مولیٰ کو پالو

ہے یہی مرضی خدا کی ہم مٹا دیں نفس کو
گرچہ وہ سارے جہاں کا بھی کوئی سردار ہو

بڑے بڑے امراء وسلاطین دنیا میں ایسے گزرے ہیں جنہوں نے اللہ کے لیے اپنے کو مٹایا اور اس کے واسطے اپنی حکومت وسلطنت کو قربان کر دیا اور اللہ تعالیٰ کی پوری پوری مرضیات پر مرتے دم تک چلتے رہے تو اس کی بدولت حق تعالیٰ نے ان کو ظاہری فقیری میں حقیقی سلطنت کا مزہ عطا فرما دیا کہ انہیں ایسی عزت نصیب ہوئی جو بادشاہوں کو بھی حاصل نہیں ہوتی اگرچہ یہ نفس کو مٹانا اور اللہ تعالیٰ پر فدا ہونا ان عزتوں کے حصول کی نیت سے نہیں ہونا چاہیے ورنہ پھر یہ مٹانا نہیں ہے بلکہ دل میں غیر اللہ کی نیت ہے جس کے ہوتے ہوئے اللہ کے لیے اپنے کو مٹانا نہیں کہا جائے گا بلکہ اپنے کو ایسا فنا کرنا چاہیے کہ اپنے فنا ہونے کا احساس بھی ختم کر دے اسی کو اصطلاح میں فناء الفناء کہتے ہیں جس کے بعد حقیقی بقاء انسان کو حاصل ہوتی ہے

کیونکہ اگر اپنے کو فنا کرنے کا احساس ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ میں کچھ تھا اور پھر میں نے اپنے کو مٹا دیا اور جس نے اپنے کو کچھ سمجھا تو وہ حقیقتا مٹانا نہیں ہوا جیسے کوئی آدمی یہ تصور کرے کے میں ہوں تو بہت کچھ لیکن تواضع اختیار کرتا ہوں تو ظاہر ہے کہ یہ حقیقی تواضع نہیں ہوئی بلکہ در پردہ اس میں تکبر چھپا ہوا ہے اس لیے جب تک انسان اپنے کو اس طرح نہ مٹا دے کہ اس مٹانے کا احساس بھی دل میں باقی نہ رہے اور جو ہماری حقیقت ہے وہ دل میں رچ اور بس جائے کہ نہ میں کچھ تھا اور نہ رہوں گا اور جو بھی کچھ ہے سب اللہ کی عطا ہے میری ذات کی حقیقت تو لا شے ہے نہ ہی میرا اپنا کوئی کمال اور خوبی ذاتی ہے بلکہ سب عطاء ربانی ہے اس لیے حقیقت کے لحاظ سے میں کچھ بھی نہیں ہوں جب اس طرح ہم اپنے کو مٹا دینگے پھر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں محبوبیت ومقبولیت نصیب ہوگی اور دلوں پر بادشاہت عطا ہو جائے گی ۔

عشق میں ذلت بھی عزت ہو گئی
لی فقیری بادشاہت ہو گئی

جب کسی بندے پہ ہوتا ہے خدا کا فضل خاص
دم میں وہ ذوالنور ہوگا گرچہ وہ ذوالنار ہو

اللہ تعالیٰ کی شان جذب ایسی ہے کہ اگر وہ کسی کو اپنی طرف کھینچ کر اپنا بنانے پر آجائیں تو کیسا ہی کفر و شرک کی وادیوں میں پھنسا ہوا ہو منٹوں سیکنڈوں میں تقویٰ اور ولایت کے اعلیٰ سے اعلیٰ درجے پر پہنچ کر وہ ناری، نوری بن جاتا ہے کہ کل تک جہنم کا مستحق تھا اور اس کے دل میں کفر و شرک کی ظلمات بھری ہوئی تھیں مگر آج وہ جنت کے اعلیٰ مقامات کا مستحق ہو چکا ہے اور اس کے قلب پر اللہ تعالیٰ کی تجلیات خاصہ اور انوارات کی بارش ہو رہی ہوتی ہے۔ جیسا کہ حضرت والا کے وعظ میں یہ واقع مذکور ہے۔

پیرانِ پیر حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمتہ اللہ علیہ کے زمانہ کا واقعہ

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمتہ اللہ علیہ کا زمانہ ہے دو بجے رات کو حکم ہوا کہ بغداد سے موصل جاؤ۔ وہاں سے موصل پہنچے ایک ابدال کا انتقال ہو رہا تھا، سارے ابدال جمع تھے۔ خواجہ خضر علیہ السلام نے نماز جنازہ پڑھائی۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی اپنے زمانہ کے غوث تھے۔ علماء اور محدثین نے لکھا ہے کہ غوث کو روزانہ اللہ تعالیٰ سے ایک وقت خاص قرب کا عطا ہوتا ہے کہ پوری دُنیا میں ایسا قرب کسی کو نہیں عطا ہوتا۔ جب شیخ عبدالقادر جیلانی کا وہ وقت آیا کہ جس وقت روئے زمین پر اتنا مقرب کوئی نہیں تھا، اس وقت انہوں نے اللہ تعالیٰ سے پوچھا کہ یہ جو ابدال انتقال کر گیا اب دوسرا ابدال کہاں سے لاؤں، اب کس کو آپ اس کرسی پر بٹھانا چاہتے ہیں......اور ابدال کون ہیں؟ اس پر ایک واقعہ یاد آ گیا۔ ایک گاؤں کے آدمی نے کہا میں ابدال ہو گیا ہوں حالانکہ جو اصلی ابدال ہوتا ہے وہ اپنے کو جتاتا نہیں ہے۔ یہ نقلی تھا اس لیے جب حکیم الامت تھانوی رحمتہ اللہ علیہ کو خبر دی گئی کہ ایک گاؤں میں ایک شخص کہتا ہے کہ میں ابدال ہو گیا ہوں تو فرمایا کہ یہ ظاہر کرنے والا اور اکڑنے والا ابدال ہو ہی نہیں سکتا۔ ہاں پہلے گوشت تھا اب دال ہو گیا ہے یعنی تکبر کی نحوست سے اب دال ہو گیا یعنی اس کا درجہ گر گیا۔

تو پیرانِ پیر شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کو حکم ہوا کہ آپ جائیے ایک بستی ہے اور وہاں ایک عیسائی ایک گرجا گھر میں اپنے عیسائی مذہب پر ذوالنار پہنے ہوئے مشغول عبادت ہے آپ جائیے اور اس سے کہئے ذوالنار توڑ ذوالنور بن۔ ذوالنار توڑ دے اور کلمہ پڑھ اور اس کو ابدال کی کرسی پر بٹھا دیجئے۔ اس بڑے ولی اللہ کے درجہ پر اس کو بٹھا دو جو ابھی حالت کفر میں ہے۔

جوش میں آئے جو دریا رحم کا
گبر صد سالہ ہو فخر اولیاء

اللہ کی رحمت کے دریا میں جب جوش آتا ہے تو سو برس کے کافر کو فخر اولیاء بنا رہے ہیں۔ بڑے پیر صاحب شیخ

عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو گرجا گھر میں جا کر پکڑا اور فرمایا جلدی توبہ کر عیسائی مذہب سے۔ اب اسلام کے سوائے کوئی مذہب قبول نہیں۔ اللہ کے نزدیک اسلام ہی مقبول دین ہے۔ وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ اسلام کے سوا اگر کوئی عیسائیت، یہودیت، ہندویت یا کوئی بھی مذہب اختیار کرے گا، اللہ کے یہاں اس کی قبولیت کا کوئی درجہ نہیں ہے۔ وہ دین مردود ہے جو اسلام کے علاوہ ہو۔ جلد عیسائیت سے توبہ کر اور ذوالنار توڑ دے اس نے فوراً توڑ دیا۔ یہ اس نے اتنی جلدی ہدایت کیوں قبول کرلی؟ اللہ میاں نے پہلے ہی اس کا کام بنادیا تھا اور اس کے دل کو ہدایت قبول کرنے کی صلاحیت عطا فرمادی تھی۔ پھر اس نے کہا اب کیا پڑھوں؟ فرمایا پڑھ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللهِ اب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان لانا فرض ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور دوسرے پیغمبروں کو پیغمبر ماننا بھی ضروری ہے، ہمارے ذمہ ہر نبی کو ماننا فرض ہے، کسی نبی کی توہین حرام اور کفر ہے لیکن تعمیل احکام نبوت اب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی چلے گی۔ قیامت تک اب ان کی شریعت ہوگی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جو آخری نبی نہیں مانے گا وہ کافر اور مردود ہو جائے گا۔ لہٰذا اس نے کلمہ پڑھا اور کہا اب کیا کروں؟ فرمایا اب کرنا کیا ہے چل ایک ابدال کا انتقال ہوگیا ہے اس کی کرسی پہ جا کے بیٹھ جا۔

سُن لے اے دوست جب ایام بھلے آتے ہیں
گھات ملنے کی وہ خود آپ ہی بتلاتے ہیں

(تجلیاتِ جذب، جلد:۳)

عمر بھر کا تجربہ اختر کا ہے یہ دوستو
گر خدا چاہے تو پہلے عاشق ابرار ہو

یہ مضمون پوری کتاب میں بکثرت ذکر ہوا ہے کہ اہل اللہ کی صحبت کے بغیر اللہ تعالیٰ کا یہ راستہ طے نہیں ہوتا۔ ساری عمر گزر جانے کے باوجود منزل نگاہوں سے اوجھل اور مخفی رہتی ہے راستے کی ہر قسم کی زحمتیں اٹھانے کے باوجود منزل میسر نہیں آتی اس لیے حضرت والا مختلف نظموں میں اس طرف توجہ دلاتے رہتے ہیں کہ اگر اللہ کو پانا چاہتے ہو تو اس کی آسان صورت یہ ہے کہ پہلے اللہ والوں سے تعلق پیدا کرلو میری اسی سالہ زندگی کا یہ تجربہ ہے کہ اللہ والوں کی محبت اور ان سے تعلق پیدا ہونے کے بعد حق تعالیٰ سے تعلق بڑا آسان اور سہل ہو جاتا ہے اسی لیے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کی محبت کے ساتھ اللہ کے عاشقوں کی محبت کو بھی مانگا ہے ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

﴿اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ حُبَّکَ وَحُبَّ مَنْ یُّحِبُّکَ وَحُبَّ عَمَلٍ یُّبَلِّغُنِیْ اِلٰی حُبِّکَ﴾

(سنن ترمذی، کتاب الدعوات، باب ما جآء فی عقدة التسبیح بالید، ج:۲، ص:۱۸۷)

یا اللہ مجھے اپنی محبت اور اپنے عاشقوں کی محبت دے دے اور ایسے عمل کی محبت عطا فرمادے جو مجھے تجھ تک پہنچادے۔

فیضِ شیخِ کامل

مری رسوائیوں پہ آسماں رویا زمیں روئی
مری ذلت کا لیکن آپ نے نقشہ بدل ڈالا
بہت مشکل تھا میرے نفس امارہ کا چت ہونا
تری تدبیر الہامی نے اس کا سر کچل ڈالا

رحمت کا تری سر پہ مرے آبشار ہو

سجدہ میں سر ہو چشم بھی یوں اشکبار ہو
رحمت کا تری سر پہ مرے آبشار ہو
غالب نہ نفس پر کبھی شہوت کی نار ہو
دل میں نہ مرے غیر کا کوئی بھی خار ہو
میرے لبوں پہ ذکر ترا بار بار ہو
پھر دل بہ فیضِ ذکر مرا پُر بہار ہو
ہم سب کو تیری یاد سے حاصل قرار ہو
دل بھولنے سے تجھ کو بہت بے قرار ہو
ہر اک گناہ سے مجھے یارب فرار ہو
یک لحہ عاصیوں میں نہ میرا شمار ہو
بستی ہو یا چمن ہو کہ وہ کوہسار ہو
جاؤں جدھر بھی دل مرا تجھ پر نثار ہو
اپنے کرم سے بھیک مجھے مغفرت کی دے
بندہ ترا محشر میں نہ یہ شرمسار ہو
یارب ترے کرم سے یہ کچھ بھی نہیں بعید
رحمت بروز حشر تری بے شمار ہو
عاصی اگر ہو متقی ترک گناہ سے
پھر تاج ولایت کا وہی تاج دار ہو
یارب فدا ہو تجھ پہ اس اختر کا ہر نفس
توفیق ایسی آپ کی لیل و نہار ہو

مشکل الفاظ کے معانی:۔ چشم: آنکھ۔ **شہوت:** حرام لذت۔ **نار:** آگ۔ **خار:** کانٹا۔ **لبوں:** لب کی جمع یعنی ہونٹ۔ **قرار:** سکون۔ **فرار:** دور بھاگنا۔ **عاصیوں:** عاصی کی جمع یعنی گنہگار۔ **چمن:** باغ۔ **کوھسار:** پہاڑ۔ **نثار:** قربان۔ **شرمسار:** شرمندہ۔ **بعید:** دور۔ **متقی:** ہر قسم کے گناہ سے بچنے والا۔ **ولایت:** اللہ تعالیٰ کی دوستی۔ **نفس:** سانس۔ **لیل و نہار:** رات و دن۔

چشم کی اشکباری پر رحمت کی آبشاری

سجدہ میں سر ہو چشم بھی یوں اشکبار ہو
رحمت کا تری سر پہ مرے آبشار ہو

سجدے کی حالت میں بندہ اللہ تعالیٰ کے سب سے زیادہ قریب ہوتا ہے جیسا کہ حدیث پاک میں یہ بات ذکر کی گئی ہے پھر اس حالت میں اللہ تعالیٰ کے سامنے آخرت کے خوف سے رونا اور آنکھوں سے آنسو بہانا جیسا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بعض مرتبہ لمبے لمبے وقت کے لیے سجدے میں گر کر اللہ کے سامنے آہ وزاری کیا کرتے تھے اور تقریباً تمام ہی اولیاء امت کی یہ عادت رہی ہے چنانچہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمہ اللہ کے متعلق واقعات میں آتا ہے کہ کبھی کبھی پوری رات سجدے میں گر کر یہ دعا پڑھا کرتے تھے ؎

اے خدا ایں بندہ را رسوا مکن
گر بدم من سر من پیدا مکن

اللہ تعالیٰ کے خوف سے رونے پر اس کی کتنی رحمت برستی ہے اس کا اندازہ ان روایات سے لگایا جاسکتا ہے جن میں اللہ کے خوف سے رونے پر جہنم کی آگ حرام کر دیے جانے کی بات ارشاد فرمائی گئی ہے جیسا کہ علامہ منذری کی الترغیب والترھیب کتاب کے اندر اللہ کے خوف سے رونے کے متعلق متعدد روایات نقل کی گئی ہیں اس لیے جب آدمی سجدے میں گر کر خوف خدا سے روئے گا تو یقیناً اس کے سر پر رحمت خداوندی کا آبشار ہوگا جس سے باران رحمت خداوندی اس کو سیراب کر رہی ہوگی۔

نفس کی چاہتیں جہنم میں لے جانے والی ہیں

غالب نہ نفس پر کبھی شہوت کی نار ہو
دل میں نہ مرے غیر کا کوئی بھی خار ہو

اگر آدمی گناہوں سے بچتا رہے اور نفس کے گندے تقاضوں اور اس کی خواہشات پر عمل نہ کرے تو اس کے لیے جنت کا راستہ بالکل آسان ہو جاتا ہے اس لیے کہ شہوت کے تقاضے پر عمل کرنا اور نفس کے کہنے پر چلنا بمقتضائے حدیث شریف انسان کو جہنم میں لے جانے والا ہے۔ چنانچہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

﴿حُفَّتِ الْجَنَّةُ بِالْمَكَارِهِ وَحُفَّتِ النَّارُ بِالشَّهَوَاتِ﴾

(صحيح مسلم، كتاب الجنة وصفة نعيمها واهلها)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ارشاد فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوزخ ڈھانکی گئی ہے شہوات سے (یعنی دوزخ پر شہوتوں اور لذتوں کے پردے پڑے ہوئے ہیں پس جو شخص شہوت نفسانی میں

اپنے کو مبتلا کر دیتا ہے وہ دوزخ کا پردہ چاک کرتا ہے یعنی اس میں داخل ہو جاتا ہے) اور جنت ڈھانکی گئی ہے سختیوں اور تکلیفوں سے (پس جو شخص اعمال صالحہ پر دوام اور گناہوں سے صبر کی تکلیف کو برداشت کرتا ہے وہ جنت کے پردہ کو چاک کرتا ہے یعنی اس میں داخل ہو جاتا ہے) اور مسلم شریف کی روایت میں ہے کہ حفت یعنی دوزخ کو شہوتوں سے اور جنت کے تکلیفوں سے گھیر دیا گیا ہے۔

تشریح: خلاصہ حدیث مذکور کا یہ ہے کہ دوزخ تک کوئی شخص نہ پہنچے گا جب تک وہ شہوات کا یعنی گناہوں کا ارتکاب نہ کرے گا اسی طرح کسی شخص کو جنت تک رسائی نہ ہوگی جب تک کہ وہ عبادات کی اور معاصی سے حفاظت کی محنت نہ برداشت کرے گا۔ جو شخص جس حجاب کو چاک کرے گا وہ اس حجاب کے محجوب تک واصل ہو جاوے گا۔ فَمَنْ هَتَکَ الْحِجَابَ وَصَلَ اِلَی الْمَحْجُوْبِ ترجمہ جس نے پردہ پھاڑا وہ پردہ کے پیچھے والی شے سے ملا (خلاصہ مرقات) اس سے معلوم ہوا کہ اَلْعِلْمُ حِجَابُ اللهِ علم اللہ کا پردہ ہے یعنی اللہ تعالیٰ تک رسائی کے لیے علم حاصل کرنا ضروری ہے جب علم تک رسائی ہوگی خدا کی معرفت عطا ہوگی۔ اس حدیث میں شہوت سے مراد خواہش حرام ہے جیسے شراب، زنا اور غیبت ہے اور جائز راحت میں حرج نہیں مگر عیش کی زیادہ فکر و کاوش مانع قرب ولایت ہے۔ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر میں دنیا کی حقیقت ص ۷۱)

شہوت کا گناہ آج ایک وبائی مرض ہے

عام طور پر آج کل شہوت فرج والا گناہ دنیا میں وبا کی طرح پھیلا ہوا ہے اور زیادہ تر لوگ اسی مرض کے بیمار دکھائی دیتے ہیں جب انسان حرام محبتوں میں پڑتا ہے اور قرآنی احکام کا خیال نہیں کرتا تو پھر اس کے نتائج دنیا و آخرت کی تباہی و بربادی ہوا کرتی ہے۔

قرآن کریم نے تِلْکَ حُدُوْدُ اللهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا بڑا واضح اور صاف اعلان فرما دیا کہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانیوں کے قریب تک مت جاؤ کیونکہ جو قریب جائے گا وہ مبتلاء ہو ہی جائے گا۔

اگر ہم بغور دیکھیں تو اللہ تعالیٰ نے یہ حکم دے کر ہم پہ یہ احسان فرمایا ہے کہ اے میرے بندو! میں تمہاری خیر اور بھلائی کے لیے تم کو جہنم سے بچانے کے واسطے ایسی صورت بتا رہا ہوں کہ جس پر چل کر حرام کاریوں اور خاص طور پر شہوت رانیوں کے گناہوں سے تمہاری حفاظت رہے گی اور اس طرح تم جنت میں جا سکو گے۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

﴿اِنَّ لِکُلِّ مَلِکٍ حِمًی اَلَا وَاِنَّ حِمَی اللهِ مَحَارِمُهٗ﴾

(صحیح مسلم، کتاب المساقاۃ، باب اخذ الحلال وترک الشبہات)

ہر بادشاہ کے لیے ایک چراگاہ ہوتی ہے اور اللہ کی حمیٰ اور چراگاہ اس کے حرام کیے ہوئے کام ہیں پس اگر کوئی چراگاہ

کے اردگرد جانوروں کو چرائے گا تو قریب ہے کہ جانور چراگاہ میں منہ ڈال کر اسے چرنے لگیں۔

اس لیے دل میں کسی محبوب اور محبوبہ کا خیال گزرنے بھی نہیں دینا چاہیے اپنی نگاہوں اور کان و زبان کی بہت مضبوطی سے حفاظت کرنی چاہیے کہ دل میں اللہ کے سوا کسی کا گزر ہی نہ ہو جو کسی گناہ میں مبتلا کر دے بلکہ دل ہر وقت اللہ کی یاد میں مست ہو جس کی بدولت نفس کی شرارتوں اور خباثتوں سے میں محفوظ رہے۔

جو لوگ شہوت کے گناہوں سے احتیاط نہیں کرتے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آہستہ آہستہ دین سے بالکل دور ہو جاتے ہیں۔

ذکر سے رطب اللسانی، ایک جامع نصیحت

میرے لبوں پہ ذکر ترا بار بار ہو
پھر دل پہ فیض ذکر مرا پر بہار ہو

یوں تو اسلام کے احکام قولی اور عملی بہت سارے ہیں لیکن خاص طور پر اللہ تعالیٰ کو ہر وقت یاد کرتے رہنا اور زبان کا اللہ کی یاد میں تر و تازہ رہنا یہ اللہ تعالیٰ کا نہایت پسندیدہ عمل ہے جس کے متعلق جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی کو خاص طور پر نصیحت فرمائی تھی چنانچہ روایت میں ہے:

﴿عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ بُسْرٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ أَنَّ رَجُلًا قَالَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ إِنَّ شَرَائِعَ الْإِسْلَامِ قَدْ کَثُرَتْ عَلَیَّ فَأَخْبِرْنِیْ بِشَیْءٍ أَتَشَبَّثُ بِہٖ قَالَ لَا یَزَالُ لِسَانُکَ رَطْبًا مِنْ ذِکْرِ اللّٰہِ﴾

(مشکوۃ المصابیح، ص:۱۹۸)

یعنی ایک شخص نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بات عرض کی یا رسول اللہ اسلام کے احکام مجھ پر بہت زیادہ ہو چکے ہیں کوئی ایک جامع بات مجھے ارشاد فرمایئے جس کو میں مضبوطی سے پکڑ لوں جو زیادہ دشوار بھی نہ ہو اور جس میں کسی خاص وقت کی یا جگہ کی پابندی بھی نہ ہو اور وہ کسی خاص حالت کے ساتھ مقید بھی نہ ہو اور دوسری عبادات کی طرف سے وہ کافی بھی ہو جائے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا کہ تمہاری زبان ہر وقت اللہ کے ذکر میں ''تر'' رہنی چاہیے یعنی یہ کہ اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے ہر حالت میں زبان اللہ تعالیٰ کے ذکر میں مشغول رہے۔

قرآن کریم میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے ذکر اللہ پر ایک عظیم الشان انعام عطا فرمانے کا وعدہ کیا ہے کہ جب کوئی اللہ کو یاد کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو یاد کرتے ہیں جیسا کہ حضرت مفتی شفیع صاحب رحمہ اللہ معارف نے القران میں اس آیت کے تحت ذکر کیا ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَاذْکُرُوْنِیْٓ اَذْکُرْکُمْ﴾

ذکر کے اصلی معنی یاد کرنے کے ہیں جس کا تعلق قلب سے ہے، زبان سے ذکر کرنے کو بھی ذکر اس لیے کہا جاتا ہے

کہ زبان ترجمان قلب ہے اس سے معلوم ہوا کہ ذکر زبانی وہی معتبر ہے جس کے ساتھ دل میں بھی اللہ کی یاد ہو مولانا رومی رحمہ اللہ نے اس کے متعلق فرمایا ہے ۔

بر زباں تسبیح در دل گاخر
ایں چنیں تسبیح کے دادر اثر

لیکن اس کے ساتھ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ اگر کوئی شخص زبان سے ذکر و تسبیح میں مشغول ہو مگر اس کا دل حاضر نہ ہو اور ذکر میں دل نہ لگے تو وہ بھی فائدہ سے خالی نہیں، حضرت ابوعثمان سے کسی نے ایسی ہی حالت کی شکایت کی کہ ہم زبان سے ذکر کرتے ہیں، مگر قلوب میں اس کی کوئی حلاوت محسوس نہیں کرتے، آپ نے فرمایا اس پر بھی اللہ تعالیٰ کا شکر کرو، کہ اس نے تمہارے ایک عضو یعنی زبان کو تو اپنی طاعات میں لگا لیا۔ (قرطبی)

ذکر اللہ کے فضائل

ذکر اللہ کے فضائل بے شمار ہیں اور یہی ایک فضیلت کچھ کم نہیں ہے کہ جو بندہ اللہ تعالیٰ کو یاد کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ بھی اسے یاد فرماتے ہیں، ابوعثمان نہدی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ میں اس وقت کو جانتا ہوں جس وقت اللہ تعالیٰ ہمیں یاد فرماتے ہیں لوگوں نے کہا کہ آپ کو یہ کیسے معلوم ہو سکتا ہے، فرمایا کہ قرآن کریم کے وعدے کے مطابق جب کوئی بندہ مومن اللہ تعالیٰ کو یاد کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ بھی اسے یاد کرتے ہیں اس لیے سب کو یہ سمجھ لینا آسان ہے کہ جس وقت ہم اللہ کی یاد میں مشغول ہوں گے تو اللہ تعالیٰ بھی یاد فرمائیں گے۔

اور معنی آیت کے یہ ہیں کہ تم مجھے اطاعت احکام کے ساتھ یاد کرو تو میں تمہیں ثواب اور مغفرت کے ساتھ یاد کروں گا، حضرت سعید بن جبیر رحمۃ اللہ نے ذکر اللہ کی تفسیر ہی طاعت و فرمانبرداری سے کی ہے وہ فرماتے ہیں کہ فَمَنْ لَّمْ يُطِعْهُ لَمْ يَذْكُرْهُ وَاِنْ كَثُرَ صَلٰوتُهٗ وَ تَسْبِيْحُهٗ یعنی جس نے اللہ تعالیٰ کے احکام کی پیروی نہ کی اس نے اللہ تعالیٰ کو یاد نہیں کیا، اگرچہ ظاہر میں اس کی نماز اور تسبیح کتنی بھی ہو۔

ذکر اللہ کی اصل حقیقت

قرطبی نے بحوالہ احکام القرآن ابن خویز منداذ ایک حدیث بھی اس مضمون کی نقل کی ہے جس کا ترجمہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے اللہ تعالیٰ کی عبادت کی، یعنی اس کے احکام حلال و حرام کی اتباع کی اس نے اللہ کو یاد کیا، اگرچہ اس کی (نفل) نماز روزہ وغیرہ کم ہوں، اور جس نے احکام خداوندی کی خلاف ورزی کی اس نے اللہ کو بھلا دیا اگرچہ (بظاہر) اس کی نماز روزہ تسبیحات وغیرہ زیادہ ہوں۔

حضرت ذوالنون مصری رحمہ اللہ نے فرمایا کہ جو شخص حقیقی طور پر اللہ کو یاد کر رہا ہے وہ اس کے مقابلے میں ساری چیزوں کو بھول جاتا ہے، اور اس کے بدلے میں اللہ تعالیٰ خود اس کے لیے ساری چیزوں کی حفاظت کرتے

ہیں اور تمام چیزوں کا عوض اس کو عطا کر دیتے ہیں،

اور حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ انسان کا کوئی عمل اس کو خدا تعالیٰ کے عذاب سے نجات دلانے میں ذکر اللہ کے برابر نہیں اور ایک حدیث قدسی بروایت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ میں ہے کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں ”میں اپنے بندے کے ساتھ ہوتا ہوں جب تک وہ مجھے یاد کرتا ہے اور میرے ذکر میں اس کے ہونٹ ہلتے رہیں۔“ ذکر اللہ کے فضائل بے شمار ہیں، ان کا مختصر خلاصہ احقر نے اپنے رسالہ ذکر اللہ میں جمع کر دیا ہے۔ (معارف القرآن جلد اول ص ۳۹۲)

قرآن کی اصطلاح میں اہل عقل کون لوگ ہیں؟

اب یہاں یہ مسئلہ غور طلب تھا کہ عقل والوں سے کون لوگ مراد ہیں کیونکہ ساری دنیا عقلمند ہونے کی مدعی ہے کوئی بے وقوف بھی اپنے آپ کو بے عقل تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں اس لیے قرآن کریم نے عقل والوں کی چند ایسی علامات بتلائی ہیں جو درحقیقت عقل کا صحیح معیار ہیں پہلی علامت اللہ تعالیٰ پر ایمان ہے غور کیجئے تو محسوسات کا علم کان، آنکھ، ناک، زبان وغیرہ سے حاصل ہوتا ہے جو بے عقل جانوروں میں بھی پایا جاتا ہے اور عقل کا کام یہ ہے کہ علامات وقرائن اور دلائل کے ذریعہ کسی ایک ایسے نتیجہ تک پہنچ جائے جو محسوس نہیں ہے اور جس کے ذریعے سلسلۂ اسباب کی آخری کڑی کو پایا جاسکے۔

اس اصول کو پیش نظر رکھتے ہوئے کائنات عالم پر غور کیجئے، آسمان اور زمین اور ان میں سمائی ہوئی تمام مخلوقات اور ان کی چھوٹی بڑی چیزوں کا مستحکم اور حیرت انگیز نظام عقل کو کسی ایسی ہستی کا پتا دیتا ہے جو علم و حکمت اور قوت وقدرت کے اعتبار سے سب سے زیادہ بالاتر ہو اور جس نے ان تمام چیزوں کو خاص حکمت سے بنایا ہو اور جس کے ارادہ اور مشیت سے یہ سارا نظام چل رہا ہو، اور وہ ہستی ظاہر ہے کہ اللہ جل شانہ ہی کی ہوسکتی ہے کسی عارف کا قول ہے۔

ہر گیا ہے کہ از زمیں روید
وحدہ لا شریک لہ گوید

انسانی ارادوں اور تدبیروں کے فیل ہونے کا ہر جگہ اور ہر وقت مشاہدہ ہوتا رہتا ہے، اس انسان کو نظام چلانے والا نہیں کہا جاسکتا اس لیے آسمان اور زمین کی پیدائش اور ان میں پیدا ہونے والی مخلوقات کی پیدائش میں غور وفکر کرنے کا نتیجہ عقل کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی معرفت اور اس کی اطاعت و ذکر ہے جو اس سے غافل ہے وہ عقلمند کہلانے کا مستحق نہیں، اس لیے قرآن کریم نے عقل والوں کی یہ علامت بتائی:

﴿اَلَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ﴾

(سورۃ آل عمران، آیت: ۱۹۱)

یعنی عقل والے وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کو یاد کریں کھڑے اور بیٹھے اور لیٹے ہوئے مراد یہ ہے کہ ہر حالت اور ہر وقت اللہ تعالیٰ کی یاد میں مشغول ہوں۔

اس سے معلوم ہوا کہ آج کی دنیا نے جس چیز کو عقل اور عقل مندی کا معیار سمجھ لیا ہے وہ محض ایک دھوکہ ہے کسی نے مال و دولت سمیٹ لینے کو عقلمندی قرار دیدیا کسی نے مشینوں کے کل پرزے بنانے یا برق اور بھاپ کو اصل پاور سمجھ لینے کا نام عقلمندی رکھ دیا لیکن عقل سلیم کی بات وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے انبیاء و رسل لے کے آئے کہ علم و حکمت کے ذریعہ سلسلہ اسباب میں ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف ترقی کرتے ہوئے درمیانی مراحل کو نظر انداز کیا، خام مواد سے مشینوں تک اور مشینوں سے برق اور بھاپ کی قوت تک تمہیں سائنس نے پہنچایا، عقل کا کام یہ ہے کہ ایک قدم اور آگے بڑھو تا کہ تمہیں یہ معلوم ہو کہ اصل کام نہ پانی، مٹی، لوہے، تانبے کا ہے، نہ مشین کا نہ اس کے ذریعہ پیدا کی ہوئی اسٹیم کا، بلکہ کام اس کا ہے جس نے آگ اور پانی اور ہوا پیدا کی جس کے ذریعہ یہ برق و بھاپ تمہارے ہاتھ آئی۔

کار زلف تست مشک افشانی اما عاشقاں
مصلحت را تہمتے برآہوئے چین بستہ اند

اس کو ایک عامیانہ محسوس مثال سے یوں سمجھئے کہ ایک جنگل کا رہنے والا جاہل انسان جب کسی ریلوے اسٹیشن پر پہنچے اور یہ دیکھے کہ ریل جیسی عظیم الشان سواری ایک سرخ جھنڈی کے دکھانے سے رک جاتی ہے، اور سبز کے دکھانے سے چلنے لگتی ہے تو اگر وہ یہ کہے کہ یہ سرخ اور سبز جھنڈی بڑے پاور اور طاقت کی مالک ہے کہ اتنی طاقت والے انجن کو روک دیتی اور چلا دیتی ہے تو علم و عقل والے اس کو احمق کہیں گے اور بتلائیں گے کہ طاقت ان جھنڈیوں میں نہیں بلکہ اس شخص کے پاس ہے جو انجن میں بیٹھا ہوا ان جھنڈیوں کو دیکھ کر روکنے یا چلانے کا کام کرتا ہے لیکن جس کی عقل کچھ اس سے زیادہ ہے وہ کہے گا کہ انجن ڈرائیور کا پاور یا طاقت کا مالک سمجھنا بھی غلطی ہے، کیونکہ درحقیقت اس کی طاقت کو اس میں کوئی دخل نہیں، وہ ایک قدم اور بڑھ کر اس طاقت کو انجن کے کل پرزوں کی طرف منسوب کرے گا لیکن ایک فلاسفر یا سائنس داں اس کو بھی یہ کہہ کر بیوقوف بتلائے گا کہ بے حس کل پرزوں میں کیا رکھا ہے، اصل طاقت اس بھاپ اور اسٹیم کی ہے، جو انجن کے اندر آگ اور پانی کے ذریعہ پیدا کی گئی ہے، لیکن حکمت و فلسفہ یہاں آکر تھک جاتا ہے۔

انبیاء علیہم السلام فرماتے ہیں کہ ظالم! جس طرح جھنڈیوں کو یا ڈرائیور کو یا انجن کے کل پرزوں کو طاقت اور پاور کا مالک سمجھ بیٹھنا اس جاہل کی غلطی تھی، اسی طرح بھاپ اور اسٹیم کو طاقت کا مالک سمجھ لینا بھی تیری فلسفیانہ غلطی ہے ایک قدم اور آگے بڑھ، تا کہ تجھے اس الجھی ہوئی ڈور کا سرا ہاتھ آئے اور سلسلۂ اسباب کی آخری کڑی تک تیری رسائی ہو جائے کہ دراصل ان ساری طاقتوں اور پاوروں کا مالک وہ ہے جس نے آگ اور پانی پیدا کیے، اور یہ اسٹیم

تیار ہوئی اس تفصیل سے آپ نے معلوم کرلیا کہ عقل والے کہلانے کے مستحق صرف وہی لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کو پہچانیں اور ہر وقت ہر حالت مین اس کو یاد کریں، اسی لیے اُولِی الْاَ لْبَابِ کی صفت قرآن کریم نے یہ بتلائی "اَلَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللہَ قِیَامًا وَّقُعُوْدًا وَّ عَلٰی جُنُوْبِھِمْ"

اس لیے حضرات فقہاء کرام نے لکھا ہے کہ اگر کوئی انتقال سے قبل یہ وصیت کر جائے کہ میرا مال عقلاء کو دیدیا جائے تو کس کو دیا جائے گا؟ اس کے جواب میں حضرات فقہائے کرام نے تحریر فرمایا کہ ایسے عالم زاہد اس مال کے مستحق ہونگے جو دنیا طلبی اور غیر ضروری مادی وسائل سے دور ہیں، کیونکہ صحیح معنی میں وہی عقلاء ہیں۔ (درمختار، کتاب الوصیۃ)

اس جگہ یہ امر بھی قابل غور ہے کہ شریعت میں ذکر کے علاوہ کسی اور عبادت کی کثرت کا حکم نہیں دیا گیا لیکن ذکر کے متعلق ارشاد ہے کہ "اُذْکُرُوا اللہَ ذِکْرًا کَثِیْرًا"، وجہ اس کی یہ ہے کہ ذکر کے سوا سب عبادات کے لیے کچھ شرائط اور قواعد ہیں جن کے بغیر وہ عبادات ادا نہیں ہوتیں، بخلاف ذکر کے کہ اس کو انسان کھڑے، بیٹھے لیٹے ہوئے باوضو ہو یا بے وضو ہر حالت میں اور ہر وقت انجام دے سکتا ہے اس آیت میں شاید اس حکمت کی طرف اشارہ ہے۔ (معارف القرآن، ج:۲،ص:۲۶۳)

چونکہ ذکر اللہ ایمان والوں کے دل کی غذا ہے جس طرح مختلف قسم کے کھانے پینے کی چیزیں انسان کے بدن کی غذا ہیں اس لیے ذکر اللہ کے فیض سے دل میں ایک تروتازگی اور اطمینان نصیب ہوتا ہے اور ایسی بہار بے خزاں ملتی ہے کہ جو کیسے ہی موافق و ناموافق حالات میں ختم نہیں ہوتی اس لیے حضرت والا نے فرمایا کہ میرا دل ذکر اللہ کے فیض سے پر بہار ہو جائے۔

ہم سب کو تیری یاد سے حاصل قرار ہو
دل بھولنے سے تجھ کو بہت بے قرار ہو

یہ وہی بات ہے جس کو قرآن کریم کی اس آیت میں فرمایا گیا:

﴿اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوْبُھُمْ بِذِکْرِ اللہِ اَلَا بِذِکْرِ اللہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ﴾

(سورۃ الرعد، آیت:۲۸)

اس آیت میں بڑی وضاحت کے ساتھ یہ بات بتادی گئی ہے کہ دل میں سکون اور قرار اور چین و اطمینان صرف اللہ کی یاد ہی سے حاصل ہوسکتا ہے اس کا دوسرا کوئی راستہ نہیں ہے اس لیے جار و مجرور کو مقدم کر کے حصر کے ساتھ یہ بات ارشاد فرمائی گئی جس کا مفہوم یہ نکلتا ہے کہ اللہ کے ذکر ہی سے دلوں کو اطمینان میسر آتا ہے اور جو لوگ اللہ کی یاد سے غافل رہتے ہیں ان کے دلوں کو غفلت گھیر لیتی ہے جس کے نتیجہ میں وہ اپنی زندگی کے ہر میدان میں

بے چین و پریشان دکھائی دیتے ہیں۔

خاص طور پر اولیاء اللہ کی تو غذا ہی اللہ کا ذکر ہوتی ہے تو اگر کوئی وقت ذرا بھی غفلت میں گزر جائے تو وہ ان کے لیے بہت ہی شاق اور دشوار ہوتا ہے جس کے بدلے وہ لوگ رو رو کر توبہ کرتے ہیں اور پھر اس کمی کو پورا کرتے ہیں حق سبحانہ وتعالیٰ قرآن کریم میں ارشاد فرماتے ہیں کہ جو شخص میرے ذکر سے اعراض کرے گا تو اس کی معیشت تنگ ہوگی اگر چہ یہاں ذکر سے رسول یا قرآن مراد ہے مگر مقصد یہی ہے کہ قرآن کریم کی تلاوت واتباع سے اعراض کرنا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت سے منہ موڑ لینا جس کا خلاصہ دین سے دوری اختیار کرنا ہے تو اس پر یہ سزا ذکر فرمائی گئی ہے جس کو حضرت مفتی شفیع صاحب نے معارف القرآن میں یوں ذکر فرمایا ہے کہ **ومن اعرض عن ذکری یہاں ذکر سے مراد قرآن بھی ہوسکتا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک بھی جیسا کہ دوسری** آیات میں ''ذکرا رسولا'' آیا ہے دونوں کا حاصل یہ ہے کہ جو شخص قرآن سے یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اعراض کرے یعنی قرآن کی تلاوت اور اسکے احکام پر عمل سے یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت سے اعراض کرے اسکا انجام یہ ہے کہ ''فان لہ معیشۃ ضنکا و نحشرہ یوم القیمۃ اعمیٰ'' یعنی اسکی معیشت تنگ ہوگی اور قیامت میں اسکو اندھا کر کے اٹھایا جائیگا پہلا عذاب دنیا ہی میں اسے مل جائیگا اور دوسرا یعنی اندھا ہونے کا عذاب قیامت میں ہوگا۔

کافر اور بدکار کی زندگی دنیا میں تلخ اور تنگ ہونے کی حقیقت

یہاں یہ سوال ہوتا ہے کہ دنیا میں معیشت کی تنگی تو کفار و فجار کے لیے مخصوص نہیں، مومنین صالحین کو بھی پیش آتی ہے بلکہ انبیاء علیہم السلام کو سب سے زیادہ شدائد و مصائب وغیرہ سے اس دنیا کی زندگی میں اٹھانے پڑتے ہیں۔ صحیح بخاری اور تمام کتب حدیث میں بروایت حضرت سعد رضی اللہ عنہ وغیرہ یہ حدیث منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دنیا کی بلائیں اور مصیبتیں سب سے زیادہ انبیاء پر سخت ہوتی ہیں ان کے بعد جو جس درجہ کا صالح اور ولی ہے اسی کی مناسبت سے اسکو یہ تکلیفیں پہنچتی ہیں، اسکے بالمقابل عموماً کفار و فجار کو خوشحال اور عیش و عشرت میں دیکھا جاتا ہے تو پھر یہ ارشاد قرآنی کہ ان کی معیشت تنگ ہوگی آخرت کے لیے تو ہوسکتا ہے دنیا میں خلاف مشاہدہ معلوم ہوتا ہے۔ اسکا صاف بے غبار جواب تو یہ ہے کہ یہاں دنیا کے عذاب سے قبر کا عذاب مراد ہے کہ قبر میں انکی معیشت تنگ کر دی جاویگی، خود قبر جو ان کا مسکن ہوگا وہ ان کو ایسا دبائے گی کہ ان کی پسلیاں ٹوٹنے لگیں گی جیسا کہ بعض احادیث میں اسکی تصریح ہے اور مسند بزار میں بسند جید حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے یہ حدیث منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اس آیت کے لفظ معیشۃ ضنکا کی تفسیر فرمائی کہ اس سے مراد قبر کا عالم ہے۔ (مظہری)

اور حضرت سعد بن جبیر رحمتہ اللہ نے تنگی معیشت کا یہ مطلب بھی بیان کیا ہے کہ ان سے قناعت کا وصف سلب کرلیا جاویگا اور حرص دنیا بڑھادی جاویگی (مظہری) جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ان کے پاس کتنا ہی مال و دولت جمع ہوجائے کبھی قلبی سکون اسکو نصیب نہیں ہوگا ہمیشہ مال بڑھانے کی فکر اور اسمیں نقصان کا خطرہ اسکو بے چین رکھے گا اور یہ بات عام اہل تمول میں مشاہر و معروف ہے جسکا حاصل یہ ہوتا ہے کہ ان لوگوں کے پاس سامان راحت تو بہت جمع ہوجاتا ہے مگر جسکا نام راحت ہے وہ نصیب نہیں ہوتی کیونکہ وہ قلب کے سکون و اطمینان کے بغیر حاصل نہیں ہوتی۔ (معارف القرآن، ج:۶ ص:۱۶۰)

گناہوں سے فرار اور مولیٰ کی یاد سے قرار لقائے مولیٰ کی پہچان ہے

ہر ایک گناہ سے مجھے یا رب فرار ہو
یک لمحہ عاصیوں میں نہ میرا شمار ہو
بستی ہو یا چمن ہو کہ وہ کوہسار ہو
جاؤں جدھر بھی دل مرا تجھ پر نثار ہو

ہر قدم پر اس بات کی فکر رکھنا کہ مجھ سے اللہ کی کوئی نافرمانی نہ ہوجائے اور کوئی گناہ سرزد نہ ہوجائے خواہ خلوتوں میں ہوں یا جلوتوں میں شہر اور بستی میں ہوں یا گلستان و چمنستان میں ہوں یا کہیں سمندروں اور دریاؤں کے کناروں اور کوہساروں میں ہوں زمین پر ہوں یا فضاؤں میں بس مجھے ہر جگہ ایک ہی بات کی دھن وار دھیان ہو کہ میرا اللہ جن چیزوں سے ناراض ہے کہیں وہ مجھ سے سرزد تو نہیں ہورہی ہیں چاہے میرے دل پر کتنا ہی زور پڑے لیکن میں کبھی بھی اور کسی بھی جگہ پر اللہ تعالیٰ کو ناراض کرنا گوارا نہیں کروں گا۔

اسی بات کو میرے شیخ اول حضرت مسیح الامت جلال آبادی رحمہ اللہ یوں فرماتے تھے کہ جس آدمی کو اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کی دھن اور دھیان لگ جائے تو اسے اللہ تعالیٰ ضرور مل جاتے ہیں یعنی دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ اللہ تعالیٰ اپنے راضی کرنے کی فکر اور لگن اسی شخص کو عطا کرتے ہیں جسے یہ تحفہ رضائے خداوندی ملنا مقدر ہوتا ہے۔

اسی لیے بعض سالکین متعلقین احباب میں سے اس طرح کی بات وقتاً فوقتاً پوچھتے رہتے ہیں کہ میں سو فیصد دین دار بننا چاہ رہا ہوں اور مجھے اپنے بزرگوں کے طریقے پر سو فیصد زندگی کو ڈھالنا ہے لیکن میں کوشش میں لگے ہونے کے باوجود ان کی طرح کیوں نہیں بن پار ہا ہوں؟ اور کیوں مجھے وہ سب اولیاء کی صفات حاصل نہیں ہو رہی ہیں؟ اور مجھے اپنے اندر بڑی کمی اور خلا محسوس ہو رہا ہے۔ جس کے پورا کرنے کے لیے میں مچھلی کی طرح تڑپ رہا ہوں اور بڑی بے تابی کے ساتھ میں اس کی خاطر مچل رہا ہوں۔

تو احقر یہی جواب عرض کرتا ہے کہ میرے بھائی یہ طلب اور تڑپ پیدا کیا جانا مطلوب کے حصول کا پیش

خیمہ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی سنت یہی ہے کہ پہلے اپنی تڑپ پیدا فرماتے ہیں اور پھر کچھ راستے کی آزمائشوں اور مجاہدوں سے گزارنے کے بعد اپنے قرب کی دولت عطا فرمادیتے ہیں اس لیے میں ایسے تمام لوگوں کو خوش خبری سناتا ہوں اور مبارک باد دیتا ہوں اور یہ عرض کرتا ہوں کہ وہ اپنی اس حالت سے کبھی بھی مایوس نہ ہوں بلکہ طلب مل جانے پر خوشی منائیں خواجہ صاحب نے کیا ہی خوب فرمایا۔

ہر تمنا دل سے رخصت ہو گئی
اب تو آجا اب تو خلوت ہو گئی

بس یہی دل میں اللہ تعالیٰ کو پانے کی طلب آجانا مطلوب کے ملنے کی نشانی ہے اور یہی فکر ہر وقت لگے رہنا تقویٰ کہلاتا ہے اور اللہ والے ہر وقت گناہوں سے بچنے میں اپنی پوری قوت کا استعمال فرماتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف صرف چلتے ہی نہیں بلکہ فرار اختیار کرتے ہیں یعنی خوب دوڑ کر اور بھاگ کر چلتے ہیں جیسا کہ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ''ففروا الی اللہ انی لکم منہ نذیر مبین ''یعنی دوڑو اللہ کی طرف حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا مراد یہ ہے کہ اپنے گناہوں سے بھاگو اللہ کی طرف توبہ کے ذریعہ، ابوبکر وراق اور جنید بغدادی رحمہما اللہ نے فرمایا کہ نفس و شیطان معاصی کی طرف دعوت دینے والے ہیں اور بہکانے والے ہیں تم ان سے بھاگ کر اللہ کی طرف پناہ لو تو تمہیں ان کے شر سے بچالیں گے۔ (معارف القرآن، ج:۸،ص:۱۷۰)

گناہوں کی جگہوں سے دور بھاگیے

جب بندہ اپنی پوری قوت و ہمت استعمال کر کے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور گناہوں سے بھاگتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ اس کے لیے بچنے کے لیے راستے فراہم کر دیتے ہیں لیکن مومن کو اپنی طرف سے پوری قوت و ہمت گناہوں کے چھوڑنے اور نافرمانی سے بچنے میں خرچ کرنی چاہیے جیسا کہ حضرت یوسف علیہ الصلاۃ والسلام کو جب زلیخا نے غلط حرکت کے لیے دعوت دی تو حضرت یوسف علیہ الصلاۃ والسلام نے صرف زبانی انکار پر اکتفاء نہیں کیا بلکہ وہاں سے فرار اختیار کیا اور اس جگہ ہی کو چھوڑ دیا جیسا کہ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَاسْتَبَقَا الْبَابَ وَقَدَّتْ قَمِيصَهُ مِنْ دُبُرٍ وَّأَلْفَيَا سَيِّدَهَا لَدَى الْبَابِ﴾

(سورۃ یوسف، آیت:۲۵)

ترجمہ: جب اس عورت نے پھر وہی اصرار کیا تو یوسف علیہ السلام وہاں سے جان بچا کر بھاگے اور وہ ان کو پکڑنے کے لیے ان کے پیچھے چلی اور وہ دونوں آگے پیچھے دروازہ کی طرف دوڑے اور (دوڑنے میں جوان کو پکڑنا چاہا تو) اس عورت نے ان کا کرتہ پیچھے سے پھاڑ ڈالا یعنی اس نے کرتہ پکڑ کر کھینچنا چاہا اور یوسف علیہ السلام آگے کی طرف دوڑے تو کرتہ پھٹ گیا مگر یوسف علیہ السلام دروازے سے باہر نکل گئے اور عورت بھی ساتھ تھی تو دونوں اتفاقاً اس

عورت کے شوہر کو دروازے کے پاس کھڑا پایا۔ (معارف القرآن، ج:۵،ص:۴۰)

چنانچہ اس آیت کے تحت حضرت مفتی شفیع صاحب رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں کہ آیت فاستبقا الباب سے اول تو یہ معلوم ہوا کہ جس جگہ گناہ میں مبتلا ہوجانے کا خطرہ ہو اس جگہ ہی کو چھوڑ دینا چاہیے جیسا کہ یوسف علیہ السلام نے وہاں سے بھاگ کر اس کا ثبوت دیا۔

دوسرا مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ احکام الٰہیہ کی اطاعت میں انسان پر لازم ہے کہ اپنی مقدور بھر کوشش میں کمی نہ کرے خواہ اس کا نتیجہ بظاہر کچھ برآمد ہوتا نظر نہ آئے، نتائج اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں انسان کا کام اپنی محنت اور مقدور کو اللہ کی راہ میں صرف کرکے اپنی بندگی کا ثبوت دینا ہے، جیسا کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے دروازے سے بند ہونے اور تاریخ روایات کے مطابق مقفل ہونے کے باوجود دروازہ کی طرف دوڑنے میں اپنی پوری قوت خرچ فرمادی ایسی صورت میں اللہ جل شانہ کی طرف سے امداد و اعانت کا بھی اکثر مشاہدہ ہوتا ہے کہ بندہ جب اپنی کوشش پوری کرلیتا ہے تو اللہ تعالیٰ کامیابی کے اسباب بھی مہیا فرمادیتے ہیں مولانا رومی نے اسی مضمون پر ارشاد فرمایا ہے۔

گرچہ رخنہ نیست عالم را پدید
خیرہ یوسف وار می باید دوید

ایسی صورت میں اگر ظاہری کامیابی بھی حاصل نہ ہو تو بندہ کے لیے یہ ناکامی بھی کامیابی سے کم نہیں۔

گر مرادت را مذاق شکر ست
نا مرادی نے مراد دلبرست

ایک بزرگ عالم جیل میں تھے جمعہ کے روز اپنی قدرت کے مطابق غسل کرتے اور اپنے کپڑے دھو لیتے اور پھر جمعہ کے لیے تیار ہوکر جیل خانہ کے دروازے تک جاتے وہاں پہنچ کر عرض کرتے کہ یااللہ میری قدرت میں اتنا ہی تھا آگے آپ کے اختیار میں ہے، اللہ تعالیٰ کی رحمت عامہ سے کچھ بعید نہ تھا کہ ان کی کرامت سے جیل کا دروازہ کھل جاتا اور یہ نماز جمعہ ادا کرلیتے لیکن اس نے اپنی حکمت سے اس بزرگ کو وہ مقام عالی عطا فرمایا، جس پر ہزاروں کرامتیں قربان ہیں، کہ ان کے اس عمل کی وجہ سے جیل کا دروازہ نہ کھلا، مگر اس کے باوجود انہوں نے اپنے کام میں ہمت نہیں ہاری، ہر جمعہ کو مسلسل یہی عمل جاری رکھا یہی وہ استقامت ہے جس کو اکابر صوفیا نے کرامت سے بالاتر فرمایا ہے۔ (معارف القرآن، ج:۵،ص:۴۴)

صاحبو! ہم اس سے یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام نبی ہونے کے باوجود گناہ کے مقام پر ٹھیرے نہیں بلکہ وہاں سے دوڑے تو پھر ہمیں گناہوں سے بچنے کے لیے کتنی احتیاط اور مضبوطی کی ضرورت ہے اس

لیے وہی شخص گناہوں سے محفوظ رہ سکتا ہے کہ جو اسباب گناہ کے بھی قریب نہ جائے اور قلبا اور قالبا ہر طرح سے دور ہو جائے لہٰذا جو لوگ کسی معشوق و معشوقہ کی حرام محبت میں پڑے رہتے ہیں اور گرل فرینڈ اور بوئے فرینڈ (Girl Friend Boy Friend) کے چکروں میں پڑ کر اپنی دنیا و آخرت کو برباد کئے ہوئے ہیں اور اگر ان کو ان گناہوں کے چھوڑنے اور ان سے دور رہنے کی نصیحت کی جاتی ہے تو ان کا جواب یہ ہوتا ہے کہ میں نے بہت کوشش کی مگر مجھ سے چھوٹتا نہیں ہے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اگر ایسی کوشش اختیار کی جائے کہ قلب و قالب دونوں سے دور ہو جائیں اور معشوق و معشوقہ کی جگہ سے فرار اختیار کرلے تو ضرور اس گناہ سے چھٹکارا مل جائے گا لیکن افسوس تو یہ ہے کہ ایک طرف گناہ کے چھوڑنے کی بات ہوتی ہے تو دوسری جانب ان سے sms کے ذریعے سے رابطہ رکھنا اور Cell Phone سیل فون پر باتیں کرنا برابر جاری رہتا ہے یہاں تک کہ اگر اپنے فون نمبر کو تبدیل کرتا ہے تو اس کو اطلاع دے کر تبدیل کیا جاتا ہے کہ میں اپنا نمبر بدل چکا ہوں تم مجھے فون کرنے کی کوشش نہیں کرنا اور میں تم سے الگ ہو چکا ہوں مجھ سے رابطہ مت جوڑنا۔

غور کرنے کی بات ہے کہ اگر یہ نادان دل سے اس بات کا متمنی تھا کہ میں اس حرام تعلق کو کلی طور پر چھوڑ دوں اور ہر قیمت پر اس محبت کو اللہ کی محبت پر قربان کروں تو پھر اُسے خاموشی کے ساتھ ان حرام تعلقات کو چھوڑنا چاہیے کہ نہ اپنے محبوب و محبوبہ کو کسی طرح کی مثبت و منفی اطلاع دی جائے اور نہ اس بارے میں کسی سے کوئی بات کی جائے بلکہ اپنی جگہ کو چھوڑ دے اور رابطے کے تمام نمبرات اس طرح ختم کردیے جائیں کہ ان کے ختم کرنے کی کسی کو کوئی اطلاع نہ دی جائے اور اس بارے میں سوچنا اور گفتگو کرنا بھی مکمل طور پر بند کردیا جائے جس کی آسان صورت یہ ہے کہ کوئی دوسرا مناسب جائز اچھا شغل اختیار کر کے اپنے ذہن کو اس میں مشغول کرلیا جائے یا پھر ایک لمبی مدت کے لیے دعوت و تبلیغ کے واسطے اللہ تعالیٰ کی راہ میں نکل جائے یا کسی صاحب نسبت اللہ کے ولی کی خدمت میں کسی خانقاہ وغیرہ میں وقت گزارا جائے یہاں تک کہ اس کے آثار دل و دماغ سے بالکل ختم اور صاف ہو جائیں۔

بقول ہمارے ایک مشفق دوست کے یہ ایک آخری چنگاری راکھ کے ڈھیر کے نیچے ایسی دبی رہتی ہے کہ اگر اس کو نہ بجھایا جائے تو پھر چند ہی دن کے بعد یہی شعلہ بن کر ابھر جاتی ہے اور پھر سے وہی سارے رنگ و روپ لوٹ آتے ہیں اور جانبین کو وہیں لا کھڑا کرتی ہے جہاں سے وہ بچنا چاہتے تھے یہی طریقہ ہے جس سے گناہوں سے مکمل فرار اختیار کیا جاسکتا ہے اور یہی طریقہ اصحاب عزیمت اہل اللہ کا ہے۔ حضرت خواجہ صاحب نے کیا ہی خوب فرمایا۔

طبیعت کی رو زور پر ہے تو رک
وگرنہ یہ سر سے گزر جائے گی

ذرا دیر کو تو ہٹا لے خیال
یہ ندی چڑھی ہے اتر جائے گی

تقویٰ کی تعریف متعدد تعبیرات سے کی گئی، لیکن سب سے زیادہ جامع تعریف وہ ہے جو حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سوال کرنے پر فرمائی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا تھا کہ تقویٰ کیا ہے؟ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ امیر المؤمنین! کبھی آپ کا ایسے راستہ پر بھی گذر ہوا ہوگا جو کانٹوں سے پُر ہو۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کئی بار ہوا ہے۔ حضرت ابی ابن کعب رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ایسے موقع پر آپ نے کیا کیا؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ دامن سمیٹ لیے اور نہایت احتیاط سے چلا۔ حضرت ابی ابن کعب رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ بس تقویٰ اسی کا نام ہے۔ یہ دنیا ایک خارستان ہے، گناہوں کے کانٹوں سے بھری پڑی ہے، اس لیے دنیا میں اس طرح چلنا اور زندگی گزارنا چاہیے کہ دامن گناہوں کے کانٹوں سے نہ اُلجھے۔ اسی کا نام تقویٰ ہے جو سب سے زیادہ قیمتی سرمایہ ہے۔ حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ یہ شعر اکثر پڑھا کرتے تھے۔

يَقُوْلُ الْمَرْءُ فَائِدَتِىْ وَ مَالِىْ
وَتَقْوَى اللّٰهِ اَفْضَلُ مَا اسْتَفَادَا

''یعنی جو لوگ اپنے دنیوی فائدے اور مال کے پیچھے پڑے رہتے ہیں حالانکہ تقویٰ سب سے بہتر سرمایہ ہے۔''

(معارف القرآن، جلد:۲، صفحہ:۲۴۱)

ٹھیک اسی طرح مسلمان اللہ تعالیٰ کے راستے پر چلتے ہوئے گناہوں سے بہت چوکنا اور ہشیار رہتا ہے خواہ چھوٹا گناہ ہو یا بڑا گناہ ہو ہر ایک سے بچنے کی کوشش کرتا ہے اس لیے کہ اگر کوئی صغیرہ سے نہیں بچتا تو اس سے کبیرہ گناہوں کا ترک بھی مشکل ہوتا ہے لہٰذا اس سے بچنے کی آسان ترکیب یہی ہے کہ صغیرہ و کبیرہ سے بچنے کا پورا اہتمام رکھے مختصر تفسیر ابن کثیر میں یہ اشعار نقل ہیں۔

خَلِّ الذُّنُوْبَ صَغِيْرَهَا وَكَبِيْرَهَا ذَاتَ التُّقٰى
وَاصْنَعْ كَمَاشٍ فَوْقَ اَرْ ضِ الشَّوْكِ يَحْذَرُ مَا يَرٰى
لَا تَحْقِرَنَّ صَغِيْرَةً اِنَّ الْجِبَالَ مِنَ الْحَصٰى

یعنی چھوٹے اور بڑے سب گناہوں کو چھوڑ دو یہی تقویٰ ہے اور کبھی بھی چھوٹے گناہوں کو معمولی مت سمجھنا کیونکہ پہاڑ چھوٹی چھوٹی کنکریوں ہی سے بنا ہوتا ہے اور اللہ کے راستے میں اس طرح چلو جس طرح کہ کوئی شخص کانٹوں کی زمین پر چل رہا ہو کہ وہ کانٹوں سے بڑی احتیاط اور بچاؤ اختیار کرتا ہے۔

اس لیے جس کو یہ فکر لاحق ہو کہ میں ایک لمحہ اللہ کے نافرمانوں میں شامل نہ ہو جاؤں تو وہ ہر قدم پر تمام

گناہوں سے بچنے کی کوشش کرے گا کیونکہ معصیت و نافرمانی ہی پر اللہ تعالیٰ کی ناراضگی اور غضب وغصہ نازل ہوتا ہے نوافل کی کمی پر واقع نہیں ہوتا جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

﴿اِیَّاکَ وَالْمَعْصِیَةَ فَاِنَّ بِالْمَعْصِیَةِ حَلَّ سَخَطُ اللہِ﴾

(مشکوٰۃ المصابیح، ص: ۱۸)

کہ اللہ کی نافرمانی سے بچو کیونکہ نافرمانی ہی سے اللہ تعالیٰ کا عذاب اور ناراضگی اترتی ہے۔

مغفرت مولیٰ کے کرم کا صدقہ ہے

اپنے کرم سے بھیک مجھے مغفرت کی دے
بندہ ترا محشر میں نہ یہ شرمسار ہو
یارب تیرے کرم سے یہ کچھ بھی نہیں بعید
رحمت بروز حشر تری بے شمار ہو

﴿عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِکٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللہِ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ قَالَ اللہُ تَبَارَکَ وَتَعَالٰی یَا ابْنَ اٰدَمَ اِنَّکَ مَا دَعَوْتَنِیْ وَرَجَوْتَنِیْ غَفَرْتُ لَکَ عَلٰی مَا کَانَ فِیْکَ وَلَا اُبَالِیْ یَا ابْنَ اٰدَمَ لَوْ بَلَغَتْ ذُنُوْبُکَ عَنَانَ السَّمَآءِ ثُمَّ اسْتَغْفَرْتَنِیْ غَفَرْتُ لَکَ وَلَا اُبَالِیْ یَا ابْنَ اٰدَمَ اِنَّکَ لَوْ اَتَیْتَنِیْ بِقُرَابِ الْاَرْضِ خَطَایَا ثُمَّ لَقِیْتَنِیْ لَا تُشْرِکُ بِیْ شَیْئًا لَاَتَیْتُکَ بِقُرَابِھَا مَغْفِرَةً﴾

(مشکوٰۃ المصابیح، ص: ۲۰۴)

حضور اکرم صلی علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ اے انسان جب تک تو مجھ سے دعا کرتا رہے گا اور معافی کی امید رکھتا رہے گا میں تجھے معاف کرتا رہوں گا جو بھی اور جیسے بھی گناہ تجھ میں ہوں اور میں اس کی کوئی پرواہ نہیں کروں گا، اے انسان اگر تیرے گناہ آسمان کے بادلوں تک پہنچ جائیں پھر تو مجھ سے مغفرت طلب کرے تو پھر تجھے بخش دوں گا اور کوئی پرواہ نہیں کروں گا، اور اے انسان اگر تو میرے پاس زمین کے مقدار بھر کر گناہ لے کر آئے اور پھر تو مجھ سے اس کی مغفرت چاہنے کے لیے ملے اس حال میں کہ تو میرے ساتھ کسی چیز کو شریک نہیں ٹھراتا اور موت ایمان اور توحید کامل پر ہوئی ہو تو میں تجھے اس کے برابر مغفرت عطا کرونگا۔

اس لیے بندے کو ہر حالت میں اپنے گناہوں کی معافی مانگتے رہنا چاہیے اور قبولیت کا یقین رکھنا چاہیے یہی بات شعر میں حضرت والا سکھارہے ہیں کہ کوئی کسی مقام پر بھی پہنچ جائے لیکن اس کی بخشش اللہ تعالیٰ کے عفو و کرم سے ہی ہوگی لہٰذا مومن کی نظر ہمیشہ اسی پر رہنی چاہیے اعمال کی بنیاد پر بخشش نہیں ہوگی جیسا کہ مختلف روایات میں یہ مضمون وارد ہوا ہے اور حضرت والا کا ایک شعر اسی مضمون پر ہے ۔

روز محشر اے خدا رسوا نہ کرنا فضل سے
کہ ہمارا حال تجھ پر کوئی پوشیدہ نہیں
جس کو استغفار کی توفیق حاصل ہو گئی
پھر نہیں جائز یہ کہنا کہ وہ بخشیدہ نہیں

اس لیے انبیاء و اولیاء کی سنت یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہنا چاہیے اور اپنی مغفرت کی بھیک بلا استحقاق اس کے فضل و کرم کے سہارے مانگتے رہنا چاہیے جو بھی جنت میں جائے گا اور جہنم سے بچے گا یہ صرف اللہ کے فضل سے ہی ممکن ہوگا میدان محشر کی رسوائی اور ذلت سے حفاظت صرف اور صرف حق تعالیٰ کے خاص کرم کی بدولت ہوگی بس مومن کامل کی شان یہ ہے کہ اپنے اعمال اور عبادات اور مجاہدوں اور ریاضتوں پر بالکل نظر نہ رکھے ہر وقت صرف اللہ کے فضل و کرم پر نظر رہے یہی اللہ تعالیٰ کو پسند ہے اور یہی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا صحیح شکر ہے۔

اولیاء اللہ دنیا و آخرت کے غموں سے محفوظ ہوتے ہیں

عاصی اگر ہو متقی ترک گناہ سے
پھر تاج ولایت کا وہی تاجدار ہو
یا رب فدا ہو تجھ پہ اس اخترؔ کا ہر نفس
توفیق ایسی آپ کی لیل و نہار ہو

﴿ اَلَاۤ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ o الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ o لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللهِ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ o﴾

(سورۃ یونس، آیات: ۶۲-۶۳-۶۴)

ترجمہ: یاد رکھو اللہ کے دوستوں پر نہ کوئی اندیشہ ناک واقع پڑنے والا) ہے اور نہ وہ کسی مطلب کے فوت ہونے پر مغموم ہوتے ہیں (یعنی اللہ تعالیٰ ان کو خوف ناک اور غم ناک حوادث سے بچاتا ہے اور اللہ کے دوست وہ ہیں جو ایمان لائے اور معاصی سے پرہیز رکھتے ہیں (یعنی ایمان اور تقویٰ سے اللہ کا قرب نصیب ہوتا ہے اور خوف وحزن سے ان کے محفوظ رہنے کی وجہ یہ ہے کہ ان کے لیے دنیوی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی (من جانب اللہ خوف وحزن سے بچنے کی) خوش خبری ہے (اور) اللہ کی باتوں میں یعنی وعدوں میں کچھ فرق ہوا نہیں کرتا پس جب بشارت میں ان سے وعدہ کیا گیا اور وعدہ ہمیشہ صحیح ہوتا ہے اس لیے عدم خوف و عدم حزن لازم ہے اور یہ بشارت جو مذکور ہوئی) بڑی کامیابی ہے۔ (معارف القرآن، جلد:۴، صفحہ:۵۴۵)

آیات مذکورہ میں اولیاء اللہ کے مخصوص فضائل اور ان کی تعریف اور پہچان پھر دنیا و آخرت میں ان کے

لیے بشارت کا ذکر ہے، ارشاد فرمایا کہ اولیاء اللہ کو نہ کسی ناگوار چیز کے پیش آنے کا خطرہ ہوگا اور نہ کسی مقصد کے فوت ہوجانے کا غم اور اولیاء اللہ وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اور جنہوں نے تقویٰ و پرہیزگاری اختیار کی ان کے لیے دنیا میں بھی خوش خبری ہے اور آخرت میں بھی۔

اس میں چند باتیں قابل غور ہیں اول یہ کہ اولیاء اللہ پر خوف وغم نہ ہونے کے کیا معنیٰ ہیں؟ دوسرا یہ کہ اولیاء اللہ کی تعریف کیا ہے اور ان کی علامات کیا ہیں؟ تیسرا یہ کہ دنیا وآخرت میں ان کی بشارت سے کیا مراد ہے؟

پہلی بات کہ اولیاء اللہ پر خوف وغم نہیں ہوتا اس سے یہ بھی مراد ہوسکتا ہے کہ آخرت میں جب حساب کتاب کے بعد جب ان کو ان کے مقام جنت میں داخل کردیا جائے گا تو خوف وغم سے ان کو ہمیشہ کے لیے نجات ہوجائے گی نہ کسی تکلیف و پریشانی کا خطرہ رہے گا نہ کسی محبوب ومطلوب چیز کے ہاتھ سے نکل جانے کا غم ہوگا، بلکہ جنت کی نعمتیں دائمی اور لازوال ہوں گی اس معنی کے اعتبار سے تو مضمون آیت پر کوئی اشکال نہیں لیکن یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ اس میں اولیاء اللہ کی کوئی خصوصیت نہ رہی بلکہ تمام اہل جنت جن کو جہنم سے نجات مل گئی ہوگی وہ بھی اسی حال میں ہوں گے، ہاں یہ کہا جاسکتا ہے کہ جو لوگ انجام کار جنت میں پہنچ گئے وہ سب اولیاء اللہ ہی کہلائیں گیا گرچہ دنیا میں ان کے اعمال کتنے ہی مختلف رہے ہوں مگر دخول جنت کے بعد سب کے سب اولیاء اللہ کی ہی فہرست میں شمار ہونگے لیکن بہت سے مفسرین نے فرمایا کہ اولیاء اللہ پر خوف وغم نہ ہونا دنیا وآخرت دونوں کے لیے عام ہے اور اولیاء اللہ کی خصوصیت یہی ہے کہ دنیا میں بھی وہ خوف وغم سے محفوظ ہیں اور آخرت میں ان پر خوف وغم نہ ہونا تو سب ہی جانتے ہیں، اور اس میں سب اہل جنت داخل ہیں۔

اللہ والوں کے بے خوف و بے غم ہونے پر سوال وجواب

مگر اس پر حالات وواقعات کے اعتبار سے یہ اشکال ہے کہ دنیا میں تو یہ بات مشاہدہ کے خلاف ہے کیونکہ اولیاء اللہ تو کیا انبیاء علیہم السلام بھی اس دنیا میں خوف وغم سے محفوظ نہیں بلکہ ان کا خوف وخشیت اوروں سے زیادہ ہوتا ہے جیسا کہ قرآن کریم کا ارشاد ہے:

﴿إِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَآءُ﴾

(سورۃ الفاطر، آیت:۲۸)

یعنی اللہ تعالیٰ سے پوری طرح علماء ہی ڈرتے ہیں اور دوسری جگہ میں اولیاء اللہ کا یہ حال بیان فرمایا ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ مِنْ عَذَابِ رَبِّهِمْ مُشْفِقُوْنَ۝ إِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمْ غَيْرُ مَأْمُوْنٍ﴾

(سورۃ المعارج، آیات:۲۷-۲۸)

یعنی یہ لوگ اللہ کے عذاب سے ہمیشہ ڈرتے رہتے ہیں کیونکہ ان کے رب کا عذاب ایسی چیز نہیں جس سے کوئی بے فکر ہوکر بیٹھ سکے۔

اور واقعات بھی یہی ہیں جیسا کہ شمائل ترمذی کی حدیث میں ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اکثر حالات میں متفکر و غمگین نظر آتے تھے اور آپ نے خود فرمایا کہ میں تم سب سے زیادہ خدا تعالیٰ سے ڈرتا ہوں۔

صحابہ کرام میں سب سے افضل حضرت صدیق وفاروق رضی اللہ عنہما اور تمام صحابہ وتابعین اور اولیاء اللہ کی گریہ وزاری اور خوف آخرت کے واقعات بے شمار ہیں۔

اس لیے روح المعانی میں علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے یہ فرمایا کہ حضرات اولیاء اللہ کا دنیا میں خوف وغم سے محفوظ ہونا اس اعتبار سے ہے کہ جن چیزوں کے خوف وغم میں عام طور سے اہل دنیا مبتلا رہتے ہیں کہ دنیوی مقاصد آرام وراحت عزت و دولت میں ذرا سی کمی ہو جانے پر مرنے لگتے ہیں اور ذرا ذرا سی تکلیف و پریشانی کے خوف سے ان سے بچنے کی تدبیروں میں رات دن کھوئے رہتے ہیں، اولیاء اللہ کا مقام ان سے سے بلند و بالا ہوتا ہے، ان کی نظر میں نہ دنیا کی فانی عزت و دولت، راحت و آرام کوئی چیز ہے جس کے حاصل کرنے میں سرگرداں ہوں اور نہ یہاں کی محنت وکلفت اور رنج کچھ قابل التفات ہے جس کی مدافعت میں پریشان ہوں بلکہ ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ

نہ شادی داد سامانے نہ غم آورد نقصانے
بہ پیش ماہر چہ آمد بود مہمانے

نہ ہمیں خوشی سے کوئی اثر اور غم سے کوئی نقصان بلکہ ہم تو یہ سب کچھ اللہ کی طرف سے بھیجا ہوا سامان سمجھتے ہیں۔

اللہ جل شانہ کی عظمت ومحبت اور خوف وخشیت ان حضرات پر ایسی چھائی ہوتی ہے کہ اس کے مقابلہ میں دنیا کی رنج وراحت سود وزیاں پر کاہ کی بھی حیثیت نہیں رکھتے بقول کسی شاعر کے کہ

یہ ننگ عاشقی ہیں سود حاصل دیکھنے والے
یہاں گمراہ کہلاتے ہیں منزل دیکھنے والے

اولیاء اللہ کی تعریف اور علامات

دوسری بات اولیاء اللہ کی تعریف اور ان کی علامات سے متعلق ہے اولیاء ولی کی جمع ہے، لفظ ولی عربی زبان میں قریب کے معنی میں بھی آتا ہے اور دوست ومحب کے معنیٰ میں بھی، اللہ تعالیٰ کے قرب ومحبت کا ایک عام درجہ تو ایسا ہے کہ اس سے دنیا کائی انسان وحیوان بلکہ کوئی چیز بھی مستثنیٰ نہیں، اگر قرب نہ ہو تو سارے عالم میں کوئی چیز وجود ہی میں نہیں آسکتی تمام عالم کے وجود کی اصلی علت وہی خاص رابطہ ہے جو اس کو حق تعالیٰ شانہ سے حاصل ہے گو اس رابطہ کی حقیقت کو نہ کسی نے سمجھا اور نہ سمجھ سکتا ہے مگر ایک بے کیف رابطہ کا ہونا یقینی ہے۔

مگر لفظ اولیاء اللہ میں یہ درجہ ولایت کا مراد نہیں بلکہ ولایت ومحبت اور قرب کا ایک دوسرا درجہ بھی ہے جو اللہ تعالیٰ کے مخصوص بندوں کے ساتھ خاص ہے یہ قرب ولایت کہلاتا ہے جن لوگوں کو یہ قرب خاص حاصل ہو وہ

اولیاء اللہ کہلاتے ہیں جیسا کہ ایک حدیث قدسی میں ہے حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ میرا بندہ نفلی عبادات کے ذریعہ میرا قرب حاصل کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ میں بھی اس سے محبت کرنے لگتا ہوں اور جب میں اس سے محبت کرتا ہوں تو پھر میں ہی اس کی آنکھ بن جاتا ہوں، وہ جو کچھ دیکھتا ہے مجھ سے دیکھتا ہے میں ہی اس کے ہاتھ بن جاتا ہوں وہ جو کچھ کرتا ہے مجھ سے کرتا ہے، مطلب اس کا یہ ہے کہ اس کی کوئی گھڑی اور کوئی کام میری رضاء کے خلاف نہیں ہوتا۔

اور اس ولایت خاصہ کے درجات بے شمار اور غیر متناہی ہیں اس کا اعلیٰ درجہ انبیاء علیہم السلام کا حصہ ہے کیونکہ ہر نبی کا ولی ہونا لازمی ہے اور اس میں سب سے اونچا مقام سید الانبیاء نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے اور ادنیٰ درجہ اس ولایت کا وہ ہے جس کو صوفیائے کرام کی اصطلاح میں درجہ فناء کہا جاتا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ آدمی کا قلب اللہ تعالیٰ کی یاد میں ایسا مستغرق ہو کہ دنیا میں کسی کی محبت اس پر غالب نہ آئے وہ جس سے محبت کرتا ہے تو اللہ کے لیے کرتا ہے جس سے نفرت کرتا ہے تو اللہ کے لیے کرتا ہے اس کے حب و بغض اور محبت و عداوت میں اپنی ذات کا کوئی حصہ نہیں ہوتا جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کا ظاہر و باطن اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی میں مشغول رہتا ہے اور وہ ہر ایسی چیز سے پرہیز کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک ناپسند ہو۔

اسی حالت کی علامت ہے کثرت ذکر اور دوام طاعت یعنی اللہ تعالیٰ کو کثرت سے یاد کرنا اور ہمیشہ ہر حال میں اس کے احکام کی اطاعت کرنا یہ دو وصف جس شخص میں موجود ہوں وہ ولی اللہ کہلاتا ہے جس میں ان دونوں میں سے کوئی ایک نہ ہو وہ اس فہرست میں داخل نہیں، پھر جس میں یہ دونوں موجود ہوں اس کے درجات ادنیٰ و اعلیٰ کی کوئی حد نہیں، انہیں درجات کے اعتبار اولیاء اللہ کے درجات متفاضل اور کم و بیش ہوتے ہیں۔

ایک حدیث میں بروایت حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ مذکور ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا کہ اس آیت میں اولیاء اللہ کون لوگ مراد ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ وہ لوگ جو خالص اللہ کے لیے آپس میں محبت کرتے ہیں، کوئی دنیاوی غرض درمیان میں نہیں ہوتی۔ اور ظاہر ہے کہ یہ حالت انہیں لوگوں کی ہو سکتی ہے جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔

ولایت حاصل کرنے کا طریقہ

یہاں ایک سوال اور بھی پیدا ہوتا ہے کہ اس درجہ ولایت کے حاصل کرنے کا طریقہ کیا ہے؟

حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیر مظہری میں فرمایا کہ امت کے افراد کو یہ درجہء ولایت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے فیض صحبت سے حاصل ہوسکتا ہے اسی سے تعلق مع اللہ کا وہ رنگ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل تھا اپنے حوصلہ کے مطابق اس کا کوئی حصہ امت کے اولیاء کو ملتا ہے پھر یہ فیض صحبت صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنھم کو بلا واسطہ حاصل تھا، اسی وجہ سے ان کا درجۂ ولایت تمام امت کے اولیاء واقطاب سے بالاتر تھا، بعد کے لوگوں کو یہی فیض ایک واسطہ یا چند واسطوں سے حاصل ہوتا ہے جتنے وسائط بڑھتے جاتے ہیں اتنا ہی اس میں فرق پڑتا جاتا ہے یہ واسطہ صرف وہی لوگ بن سکتے ہیں جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے رنگ میں رنگے ہوئے آپ کی سنت کے پیرو ہیں۔

ایسے لوگوں کی کثرت سے مجالست اور صحبت جبکہ اس کے ساتھ ان کے ارشادات کی پیروی اور اطاعت اور ذکر اللہ کی کثرت بھی ہو یہی نسخہ ہے درجہ ولایت حاصل کرنے کا جو تین ۳ جز، سے مرکب ہے، کسی ولی اللہ کی صحبت ۱، اس کی اطاعت ۲ اور ذکر اللہ کی کثرت، بشرطیکہ یہ کثرت ذکر مسنون طریقہ پر ہو کیونکہ کثرت ذکر سے آئینہ قلب کو فلاح ہوتی ہے تو وہ نور ولایت کے انعکاس کے قابل بن جاتا ہے حدیث میں ہے کہ ہر چیز کے لیے صیقل اور صافی کا کوئی طریقہ ہوتا ہے، قلب کی صیقل ذکر اللہ سے ہوتی ہے، اس کو بیہقی نے بروایت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نقل فرمایا ہے۔ (مظہری)

اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ ایک شخص نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ آپ اس شخص کے بارے میں کیا فرماتے ہیں جو کسی بزرگ سے محبت کرتا ہے مگر عمل کے اعتبار سے ان کے درجے تک نہیں پہنچتا؟ آپ نے فرمایا:

﴿اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ﴾

(صحیح البخاری، کتاب الادب، باب علامة حب الله عزّوجلّ، ج:۲، ص:۹۱۱)

یعنی ہر شخص اسی کے ساتھ ہوگا جس سے اس کو محبت ہے اس سے معلوم ہوا اولیاء اللہ کی صحبت انسان کے لیے حصول ولایت کا ذریعہ ہے۔

اور بیہقی نے شعب الایمان میں حضرت زرین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زرین سے فرمایا میں تمہیں دین کا ایسا اصول بتلاتا ہوں جس سے تم دنیا و آخرت کی فلاح و کامیابی حاصل کر سکتے ہو، وہ یہ ہے کہ اہل ذکر کی مجلس و صحبت کو لازم پکڑو اور جب تنہائی میں جاؤ تو جتنا زیادہ

ہو سکے اللہ کے ذکر سے اپنی زبان کو حرکت دو، جس سے محبت کرو اللہ کے لیے کرو جس سے نفرت کرو اللہ کے لیے کرو۔ (مظہری)

مگر یہ صحبت و مجالست انہیں لوگوں کی مفید ہے جو خود ولی اللہ متبع سنت ہوں اور جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے تابع نہیں وہ خود درجۂ ولایت سے محروم ہیں چاہے کشف وکرامات ان سے کتنے ہی صادر ہوں اور جو شخص مذکورہ صفات کے اعتبار سے ولی ہو اگر چہ اس سے کبھی کوئی کشف وکرامت ظاہر نہ ہوئی ہو وہ اللہ کا ولی ہے (مظہری) اولیاء اللہ کی علامت اور پہچان تفسیر مظہری میں ایک حدیث قدسی کے حوالہ سے یہ نقل کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میرے اولیاء میرے بندوں میں سے وہ لوگ ہیں جو میری یاد کے ساتھ یاد آویں اور جن کی یاد کے ساتھ میں یاد آؤں، اور ابن ماجہ میں بروایت حضرت اسماء رضی اللہ عنہ بنت یزید مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اولیاء اللہ کی یہ پہچان بتلائی اِذَا رُأُوْا ذُکِرَ اللّٰہُ یعنی جن کو دیکھ کر خدا یاد آئے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جن لوگوں کی صحبت میں بیٹھ کر انسان کو اللہ کے ذکر کی توفیق اور دنیاوی فکروں کی کمی محسوس ہو، یہ علامت اس کے ولی اللہ ہونے کی ہے۔

تفسیر مظہری میں فرمایا کہ عوام نے جو اولیاء اللہ کی علامت کشف وکرامت یا غیب کی چیزیں معلوم ہونے کو سمجھ رکھا ہے یہ غلط اور دھوکہ ہے، ہزاروں اولیاء اللہ ہیں جن سے اس طرح کی کوئی چیز ثابت نہیں اور اس کے خلاف ایسے لوگوں سے کشف اور غیب کی خبریں منقول ہیں جن کا ایمان بھی درست نہیں۔

آخر آیت میں جو یہ فرمایا گیا کہ اولیاء کے لیے دنیا میں بھی خوش خبری ہے اور آخرت میں بھی آخرت کی خوش خبری تو یہ ہے کہ موت کے وقت جب اس کی روح کو اللہ کے پاس لے جایا جائے گا اس وقت اس کو خوش خبری جنت کی ملے گی پھر قیامت کے روز قبر سے اٹھنے کے وقت جنت کی خوش خبری دی جائے گی۔

جیسا کہ طبرانی نے بروایت ابن عمر نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اہل لا الہ الا اللہ کو نہ موت کے وقت کوئی وحشت ہوگی نہ قبر میں اور نہ قبر سے اٹھنے کے وقت، گویا میری آنکھیں اس وقت کا حال دیکھ رہی ہیں جب یہ لوگ اپنی قبروں سے مٹی جھاڑتے ہوئے اور یہ کہتے ہوئے اٹھیں گے'' اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَذْھَبَ عَنَّا الْحَزَنَ ''یعنی شکر ہے اللہ کا جس نے ہمارا غم دور کر دیا، اور دنیا کی بشارت کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ سچی خوابیں، جو انسان خود دیکھے یا اس کے لیے کوئی دوسرا دیکھے جن میں ان کے لیے خوش خبری ہو۔

(رواہ البخاری عن ابی ہریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ)

اور دنیا کی دوسری بشارت یہ ہے کہ عام مسلمان بغیر کسی غرض کے اس سے محبت کریں اور اچھا سمجھیں، اس کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''تلک عاجل بشرٰی المومن'' یعنی عام مسلمانوں کا اچھا سمجھنا اور تعریف کرنا مومن کے لیے نقد خوش خبری ہے۔ (معارف القرآن، ج:۴، ص:۵۴۵)

زندگی کے دو رُخ

گئی وہ بھول جمال رُخ مہ و انجم
مری نظر جو رُخ آفتاب سے گذری
یہ کائنات اسے تنگ تھی بہ ایں وسعت
کوئی حیات جو اس کے عتاب سے گذری

مشکل الفاظ کے معانی:۔ جمال: خوبصورتی۔ **مہ وانجم:** چاند اور ستارے۔ **آفتاب:** سورج۔ **وسعت:** لمبائی چوڑائی کے ساتھ۔ **حیات:** زندگی۔ **عتاب:** غضب۔

جام و مینا کی ہے فراوانی

جس پہ ہوتا ہے فضلِ رحمانی ترک کرتا ہے کارِ شیطانی
دوستو درد دل کی دولت کو دل میں پاتے ہیں صرف ربانی
حامل درد اہل نسبت کو خلق کہتی ہے دل سے یزدانی
شیخ کامل سے جو ہے مستغنی پائے گا کیسے ظلِ رحمانی
فسق کرتا ہے دور منزل سے پیر تیرا ہو گرچہ لاثانی
فیض مرشد کی یہ کرامت ہے کوئی رومی ہے کوئی خاقانی
مست رکھتی ہے سارے عالم سے دل میں لذت درد پنہانی
کیا حلاوت ہے اس کے جینے میں جس کو ملتا ہے جام عرفانی
میر میرے دل شکستہ میں جام و مینہ کی ہے فراوانی
رنگ دیکھو تو بزم عارف کا کیسی مستی ہے کیسی جولانی
رشک کرتے ہیں اہل ساحل سب دیکھ کر موج دل کی طغیانی
رند پاتا ہے خانقاہوں سے اپنے ایماں میں کیف احسانی
جب ملا درد خونِ حسرت سے کیا کہوں اس کا ذوق ایمانی
صحبت اہل دل کی برکت سے دل میں اخترؔ ہے کیسی تابانی

مشکل الفاظ کے معانی:۔ فضلِ رحمانی: اللہ تعالیٰ کا فضل۔ **کارِ شیطانی:** شیطان والے کام یعنی گناہ۔ **حامل:** رکھنے والا۔ **یزدانی:** اللہ والا۔ **مستغنی:** بے پروا۔ **ظلِّ رحمانی:** اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم کا سایہ۔ **فسق:** گناہ۔ **منزل:** مراد اللہ تعالیٰ۔ **لاثانی:** جس کے جیسا کوئی دوسرا نہ ہو۔ **خاقانی:** رومی وخاقانی دونوں اللہ والوں میں سے ہیں۔ **مست:**

بے پرواہ۔ **دردِ پنہانی**: دل ہی دل میں گناہوں سے بچنے کا غم اور درد اٹھنا۔ **حلاوت**: مٹھاس۔ **جام عرفانی**: اللہ تعالیٰ کی پہچان اور محبت کی شراب۔ **دلِ شکستہ**: گناہوں سے بچنے کے غم کی وجہ سے ٹوٹا ہوا دل۔ **جام و مینا**: اللہ تعالیٰ کی محبت کی شراب کے پیالے۔ **فراوانی**: زیادہ ہونا۔ **بزمِ عارف**: اللہ والے کی محفل۔ **جولانی**: مستی اور لذت۔ **اہلِ ساحل**: حرام خواہشات سے لطف اندوز ہونے والے۔ **طغیانی**: گناہوں سے بچنے میں دل پر گذرنے والا طوفان۔ **رند**: دنیا کی گندی شراب پینے والا۔ **خانقاہوں**: اللہ والوں کے رہنے کی جگہ۔ **ذوقِ ایمانی**: ایمان کا مزہ۔ **تابانی**: چمک، روشنی۔

کارِ شیطانی کا ترک فضل رحمانی کی نشانی ہے

جس پہ ہوتا ہے فضلِ رحمانی
ترک کرتا ہے کارِ شیطانی

حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ ارشاد فرماتے ہیں کہ جو انسان اللہ کی نافرمانیوں کو چھوڑتا ہے اور معاصی اور گناہوں سے اپنے کو محفوظ رکھتا ہے تو سمجھ لو کہ اس پر خدا تعالیٰ کا خاص فضل ہے اور اسی فضل الٰہی کی برکت سے وہ گناہوں سے بچا ہوا ہے۔ تو اگر غور سے دیکھیں تو ایک بات تو اس شعر میں یہ مذکور ہے کہ جو لوگ متقی ہیں اور گناہوں سے محفوظ رہنے والے ہیں وہ اس کو اپنا کمال عقل نہ سمجھیں اور اپنی ذہانت و سمجھ کی طرف منسوب نہ کریں بلکہ درحقیقت تقویٰ وطہارت اور تزکیہ واصلاح صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم کی مرہونِ منت ہے۔ جیسا کہ قرآن کریم میں حق سبحانہ وتعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

﴿وَلَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ مَا زَكٰى مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَبَدًا﴾
(سورۃ النور، آیت: ۲۱)

ترجمہ: اگر تم پر اللہ کا فضل وکرم نہ ہوتا تو تم میں سے کوئی کبھی بھی (توبہ کر کے) پاک صاف نہ ہوتا۔
(معارف القرآن، جلد: ۶، ص: ۳۶۹)

اس لیے اس کی نسبت صرف فضل الٰہی اور توفیقِ الٰہی کی طرف ہونی چاہیے اور یہی سوچنا چاہیے۔

اور دوسری بات اس شعر میں یہ مذکور ہے کہ جو لوگ گناہوں سے بچنے والے ہیں اور ہر قسم کی معصیت سے اپنی حفاظت کرنے والے ہیں بس یہی وہ لوگ ہیں کہ جو درحقیقت فضلِ الٰہی والے لوگ ہیں اور یہی لوگ حقیقت میں متقی اور ولی اللہ ہیں ورنہ اگر کوئی بندہ عبادات اور نوافل اور بہت سی دینی خدمات انجام دیتا ہو اور مختلف میدانوں میں دینی کاموں میں لگا ہوا ہو لیکن وہ گناہوں سے نہیں بچتا ہے۔ جیسا کہ آج کل عمومی طور پر ایسا ہو رہا ہے کہ نیکیاں کرنے والے بہت ہیں اور نیکیاں خوب ہو رہی ہیں، مگر گناہوں اور معصیتوں سے حفاظت کی فکر اور اہتمام نہیں ہے اور امورِ خیر کی دعوت وترغیب دینے والے بھی بہت ہیں مگر بڑے بڑے گناہ جو قرآن وحدیث میں مذکور ہیں، وہ اعلانیہ طور پر کیے جا رہے ہیں اور افسوس کہ ان پر کوئی روک ٹوک کرنے والا بھی نہیں ہے۔ جیسا کہ عورتوں سے

اختلاط، سودی کاروبار، جاندار کی تصویروں میں بے احتیاطی وغیرہ جیسے گناہ کثرت سے ہو رہے ہیں۔

تو حضرت والا فرماتے ہیں کہ جب تک انسان گناہوں سے نہیں بچتا ہے، خواہ بظاہر کتنا ہی نیک اور صالح ہو لیکن حقیقت میں عنداللہ وہ مقبولین بارگاہِ الٰہی اور منعم علیہم بندوں میں شامل نہیں ہوسکتا ہے کیونکہ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے حصر کے ساتھ فرمایا ہے کہ ''اِنْ اَوْلِیَآءُ ہٗ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ اور فرمایا کہ ''اَلَآ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰہِ لَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَ لَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ ط اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ کَانُوْا یَتَّقُوْنَ پہلی آیت میں فرماتے ہیں کہ میرے دوست صرف متقی بندے ہیں اور دوسری آیت میں ارشاد ہے کہ سنو اللہ کے اولیاء پر نہ کوئی خوف وڈر ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے اور یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اور گناہوں سے بچتے تھے۔

یہ شعر دعویٰ مع دلیل ہے

پھر حضرت والا کی تعبیر ایسی ہے کہ جس میں دعویٰ کے ساتھ دلیل بھی ہے کہ گناہوں کو کیوں چھوڑنا چاہیے۔ فرماتے ہیں کہ وہ شیطانی کام ہیں اور قرآن میں اللہ تعالیٰ نے اعلان فرمایا ہے کہ اِنَّ الشَّیْطٰنَ لَکُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْہُ عَدُوًّا کہ شیطان تمہارا دُشمن ہے، تم اس کو دُشمن گردانو اور قرار دو یعنی دُشمن سمجھ کر اس سے دُشمن جیسا سلوک کرو اور ظاہر ہے کہ اہلِ دنیا بھی اپنے دُشمن کے سلسلہ میں یہ اصول اپناتے ہیں کہ اس کی بات نہیں مانتے ہیں اور جس چیز میں دُشمن کی خوشی ہو اس کو اختیار نہیں کرتے بلکہ اس کے خلاف کرتے ہیں تو اس پہلو سے بھی ہم پر لازم ہے کہ ہم گناہوں سے بچیں کیونکہ جتنے گناہ ہیں وہ سارے اللہ کی ناراضگی اور دُشمن شیطان کی خوشی کا ذریعہ ہیں۔ چنانچہ مشکوٰۃ شریف میں ایک روایت ہے کہ:

﴿اِیَّاکَ وَالْمَعْصِیَۃَ فَاِنَّ بِالْمَعْصِیَۃِ حَلَّ سَخَطُ اللّٰہِ﴾

(مشکوۃ المصابیح، ص: ۱۸)

کہ نافرمانی اور گناہ سے بچتے رہنا کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ناراضگی اور غصہ معصیت ونافرمانی ہی سے اُترتا ہے، اسی لیے آپ اقوامِ عالم کا مطالعہ کریں جب جب معصیت اور نافرمانی کسی قوم میں آئی تو اللہ تبارک وتعالیٰ کا عذاب آیا۔ محض طاعات کی کمی کی وجہ سے عذاب نہیں آتا ہے۔ اسی لیے آج حضرت والا کی زندگی کی تمام تعلیمات کا اصل رُخ گناہوں کو مٹانے پر اور بالخصوص اس وقت کے سب سے بڑے سنگین مرض عشقِ مجازی کے خطرناک گناہ کے مٹانے اور اس کی خرابیوں اور مذمتوں اور نقصانات وفسادات پر مشتمل مضامین کے نشر کرنے کی طرف ہے کیونکہ آج کے دور کا یہ وہ مرض ہے کہ اگر بغور دیکھیں تو آج کے جدید جدید آلات وذرائع جو بظاہر منافع کی صورت لیے ہوتے ہیں، مگر ان میں عشقِ مجازی کی بیماری کا زہریلا تیر ضرور ہوتا ہے اور یہود ونصاریٰ اس خواہش وتمنا میں ہیں کہ مسلم نوجوان کو میدان کارزار کے بجائے اس راہ سے زیر کیا جائے کیونکہ عشقِ مجازی میں لگ کر انسان دین کا اور

آخرت کا تو رہتا ہی نہیں ہے، مگر وہ دنیا کے مطلب کا بھی نہیں رہ پاتا ہے۔ اس لیے آج کے دور میں مختلف طریقوں اور تدبیروں سے اس خطرناک مرض کو اُمت سے دور کرنے کے لیے کوششیں کرنا اس وقت کا بڑا جہاد ہے، کیونکہ بہت سے تاریخی واقعات ہیں کہ جن سے پتہ چلتا ہے کہ اس مرض کا منتہا سلبِ ایمان اور خاتمہ علی الکفر پر ہوا۔ اَللّٰھُمَّ احْفَظْنَا مِنْہُ.

دردِ دل کی دولت صرف ربانی کو ملتی ہے

دوستو دردِ دل کی دولت کو
دل میں پاتے ہیں صرف ربانی

جو اللہ والے لوگ ہیں اور واقعی معنی میں اولیاء اللہ ہیں اور ہر قسم کے گناہوں سے پرہیز کرتے ہیں وہ ایسے ہوتے ہیں کہ ان کو اگرچہ اس کے لیے کتنا ہی صبر اور مجاہدہ کرنا پڑے مگر وہ ہر حال میں ثابت قدم رہتے ہیں ہر مسئلہ میں صرف اللہ کو پکارتے ہیں تو یہ وہ لوگ ہیں کہ جو حقیقی طور پر جینے کا لطف اور مزہ پاتے ہیں اور ان کو اللہ تبارک و تعالیٰ اپنی محبت کا دردوغم عطا کرتا ہے اور اس دولت سے ان کو مالا مال کردیتا ہے۔ جیسا کہ حضرت شاہ احمد صاحب رحمہ اللہ پرتابگڈھی فرماتے ہیں کہ ؎

شکر ہے دردِ دل مستقل ہو گیا
اب تو شاید میرا دل بھی دل ہو گیا

اور اسی کو ایک شاعر بڑے درد بھرے انداز سے یوں پیش کرتا ہے کہ ؎

میں نے لیا ہے دردِ دل کھو کے بہارِ زندگی
اِک گُلِ تر کے واسطے میں نے چمن لٹا دیا

ظاہر ہے کہ انسان میں گناہوں کی طرف فطری میلان ورغبت رکھی گئی ہے تو جب بندۂ مؤمن اپنی طبیعت پر ہر قدم پر اور ہر موڑ پر جبر کرکے مجاہدہ کرکے تمام گناہوں سے بچنے کا فیصلہ کرلیتا ہے تو حق تعالیٰ اسے اپنی محبت کا نور عطا فرماتے ہیں اور اس کے قلب کو روشن کردیتے ہیں۔ ورنہ محض کچھ نوافل وطاعات کرکے اور گناہوں بالخصوص بدنظری اور شہوت کے گناہ میں ملوث رہنے سے اصل ایمان تو انسان کا رہتا ہے لیکن جو خاص قلب کی حلاوت اور لذت قربِ خداوندی ہے، وہ اس کو حاصل نہیں ہوتی ہے اور درحقیقت قلب کا قلبِ سلیم وقلب منیب ہونا یہ انبیاء کی وراثت ہے اور جنت میں دخول کی ضمانت وگارنٹی کا سبب ہے۔

خلق خود پکار اٹھتی ہے

حامل درد اہل نسبت کو
خلق کہتی ہے دل سے یزدانی

جو لوگ اپنے سینوں میں اللہ تعالیٰ کی حقیقی محبت کا درد و غم رکھتے ہیں اور ان کو اللہ تعالیٰ سے نسبت وولایت عطا ہو جاتی ہے تو ہر طرف لوگ ان کو اللہ والا کہنا شروع کر دیتے ہیں اور لوگوں میں ان کے چرچے اسی نام سے ہونے لگتے ہیں۔ آپ نے کسی حقیقی اللہ والے کو نہیں دیکھا ہوگا کہ وہ اپنا اشتہار اور ایڈورٹائز (Advertise) کرتا پھر رہا ہو کہ میں اللہ والا بن گیا ہوں، مجھے اللہ والا تسلیم کرو، مجھے بزرگ مانو، مجھے ولی اللہ کہو اور میری قدر و احترام کرو، بلکہ ہمارے جملہ اکابر کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ جیسا کہ ان کی پوری زندگی اور تاریخ اس پر گواہ ہے کہ وہ ہمیشہ گمنامی و اخفاء کو پسند کرتے تھے اور اخلاص وللّٰہیت کے پہاڑ تھے۔ میں سمجھتا ہوں یہی وجہ ہے کہ پوری دنیا میں اگر بنظر غائر دیکھو تو سب سے زیادہ دین کا کام انہیں حضرات کے تلامذہ اور تلامذہ کے تلامذہ انجام دے رہے ہیں اور یہ ایسا معاملہ ہے کہ جس کے اپنے اور پرائے سب کے سب گواہ ہیں اور سب اس کے قائل ہیں۔

لیکن بات دراصل یہ ہے کہ زبانِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھو کہ جب اللہ کسی کو محبوب بنا لیتے ہیں تو پھر حدیثِ شریف میں یہ مضمون ہے کہ فرشتوں اور انسانوں میں بھی اس کی محبوبیت ڈال دی جاتی ہے۔ (التکشف، صفحہ: ۲۶۹، مظہری)

چنانچہ پوری حدیث یوں ہے کہ:

﴿عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللهَ اِذَا اَحَبَّ عَبْدًا دَعَا جِبْرَئِیْلَ فَقَالَ اِنِّیْ اُحِبُّ فُلَانًا فَاَحِبَّهُ قَالَ فَیُحِبُّهُ جِبْرَئِیْلُ ثُمَّ یُنَادِیْ فِی السَّمَآءِ فَیَقُوْلُ اِنَّ اللهَ یُحِبُّ فُلَانًا فَاَحِبُّوْهُ فَیُحِبُّهُ اَهْلُ السَّمَآءِ ثُمَّ یُوْضَعُ لَهُ الْقَبُوْلُ فِی الْاَرْضِ وَاِذَا اَبْغَضَ عَبْدًا دَعَا جِبْرَئِیْلَ فَیَقُوْلُ اِنِّیْ اُبْغِضُ فُلَانًا فَاَبْغِضْهُ قَالَ فَیُبْغِضُهُ جِبْرَئِیْلُ ثُمَّ یُنَادِیْ فِیْ اَهْلِ السَّمَآءِ اِنَّ اللهَ یُبْغِضُ فُلَانًا فَاَبْغِضُوْهُ قَالَ فَیُبْغِضُوْنَهُ ثُمَّ تُوْضَعُ لَهُ الْبَغْضَآءُ فِی الْاَرْضِ﴾

(صحیح مسلم، کتاب البر والصلة الادب، باب اذا احبّ الله عبدًا، ج: ۲، ص: ۳۳۱)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ارشاد فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی بندہ کو محبوب بناتے ہیں تو حضرت جبرئیل علیہ السلام کو بلا کر ارشاد فرماتے ہیں کہ ہم فلاں شخص سے محبت رکھتے ہیں، تم بھی اُس سے محبت رکھو۔ پس جبرئیل علیہ السلام بھی اس سے محبت کرنے لگتے ہیں، پھر جبرئیل علیہ السلام آسمان میں ندا فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فلاں شخص کو چاہتے ہیں تم سب اس سے محبت رکھو۔ سو آسمان والے بھی اس سے محبت کرنے لگتے ہیں، پھر اہلِ زمین میں اس شخص کی مقبولیت رکھ دی جاتی ہے اور جب اللہ تعالیٰ کو کسی شخص سے بغض

ہوتا ہے تو اسی ترتیبِ مذکور سے اہلِ زمین کے قلوب تک اس کی مبغوضیت آ جاتی ہے۔ روایت کیا اس کو مسلم نے۔

علامت مقبول و غیر مقبول اس حدیث میں اولیاء کی غیر اولیاء سے ایک شناخت مذکور ہے۔ اس علامت سے طلبِ شیخ میں کام لینا چاہیے۔ نیز غیر مقبول سے احتراز لازم سمجھنا چاہیے۔ حاصل اس کا یہ ہے کہ بلا کسی سبب و تعلق و نفع یا ضرر دنیوی کے اکثر خلائق کا کسی کی طرف میلانِ قلب اور گمانِ نیک ہونا علامت ہے۔ اس شخص کے محبوب و مقبول ہونے کی اسی طرح بلا کسی لوث نفع و ضرر ظاہری کے اکثر لوگوں کا کسی سے نفرت کرنا اور اس کو اچھا نہ سمجھنا علامت ہے۔ غیر مقبول عنداللہ ہونے کی اور جو صداقت یا عداوت کسی احسان یا رشتہ داری یا ضرر و نا موافقتِ معاملہ سے ہو اس کا اعتبار نہیں۔ اور یاد رہے کہ جن لوگوں کی نیت میں خبث و فساد غالب ہے ان کا ادراک بھی غیر معتبر ہے۔

احقر راقم سطور کے عرض کرنے کا منشا یہ ہے کہ حقیقی طور پر جو اللہ کو راضی کرنے والے اہل اللہ ہیں تو آسمانوں سے ان کی عزت زمین کی طرف چل کر ساری مخلوق میں ڈال دی جاتی ہے اور لوگ بلا کسی قرابت داری اور رشتہ و نفع دنیوی کے اس کی محبت اپنی جان سے زیادہ کرنے لگتے ہیں اور خلق میں ان کی مقبولیت اور محبوبیت بڑھتی چلی جاتی ہے اور لوگوں میں ان کا احترام اور ان کی خدمت کا جذبہ بڑھتا چلا جاتا ہے تو یزدانی یعنی اللہ والا ہونے کا چرچہ و شہرت خود بخود حق تعالیٰ کی طرف سے بذریعہ خلق ہوتا چلا جاتا ہے۔

حدیث پاک میں ریاکاروں کے لیے ایک اہم نصیحت

میرے دوستو! اس حدیث سے میں اپنے لیے اور ہم سب کے لیے ایک قیمتی خزانہ نکال کر پیش کرتا چلوں کہ اس میں ہمارے لیے یہ سبق ہے کہ انسان اپنی زندگی میں ہر قدم پر اور ہر موڑ پر بس اپنے اللہ کو راضی و خوش کرنے کی فکر کرے۔ خواہ کتنا ہی خونِ تمنا اور خونِ آرزو کرنا پڑے، مگر کرتا چلا جائے۔ کتنے ہی مجاہدے اُٹھانے پڑے اُٹھاتا چلا جائے۔ ذاتِ باری تعالیٰ سے کچھ مخفی نہیں ہوتا جب اللہ کی نگاہوں میں محبوبیت ہو جائے گی تو اول تو ہمیں وہ کافی ہے، مگر اس کا یہ انعام و احسان اور فضل و کرم ہے کہ وہ اپنے محبوبوں کو اپنی خلق خاص کی نگاہوں میں بھی محبوب بنا دیتا ہے جس کے نتیجہ میں ان کے لیے آخرت کی نعمتوں کے ساتھ ساتھ دنیا کا لطف و مزہ بھی مقدر ہو جاتا ہے۔ اور اس حدیث شریف سے ریاکاری اور شہرت طلبی اور خلق کی نگاہ میں اپنا مقام تلاش کرنا ان سب امور کا علاج ہے اور اس میں اخلاص کامل کی تعلیم ہے۔ وہ اس طرح کہ آپ اور ہم اصل اپنے عمل کا ایک مقصد بنائیں اور وہ ہے رضائے خداوندی۔ باقی چیزیں حسبِ حال و مصلحت حق تعالیٰ خود عطا فرماتے ہیں۔

اور اس حدیث میں یہ سبق ہے کہ عزت زمین سے آسمان کی طرف نہیں چلتی بلکہ آسمان سے زمین کی طرف آتی ہے۔ یعنی اگر کوئی انسان اللہ تعالیٰ کی صحیح بندگی اور شریعت کی اتباع نہ کرتا ہو اور گناہوں میں مبتلا رہتا ہو،

مگر بظاہر لوگوں میں بہت پارسا اور نیک بن کر رہتا ہو اور مختلف اسباب و ذرائع سے اپنی عزت و احترام اور محبت و عظمت کو لوگوں کے دلوں میں پیدا کرنا چاہتا ہو اور پھر یہ سب کر کے محبتِ خداوندی کے خواب بھی دیکھ رہا ہو تو یہ خواب اب کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکتا ہے۔ بس وہ اپنے زعم میں بڑا بن کر رہے گا، لیکن اللہ کی نگاہوں میں اور مخلوق کی نظر میں وہ ذلیل و بے حیثیت کر دیا جاتا ہے۔

ہاں! اس کے برعکس کرنے سے اسے سب کچھ حاصل ہوتا ہے یعنی ظاہری طور پر اپنی عزت وعظمت کے لیے کوئی طریقے اختیار نہیں کرتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا کوئی کام نہیں کرتا ہے بلکہ اس سے اپنے کو مکمل بچا کر رکھتا ہے تو یہ شخص عنداللہ تو محبوب ہو ہی گیا۔ لوگوں کے دلوں میں بھی اس کو معزز و مؤقر بنا دیا جاتا ہے۔

میرے شیخ اول حضرت مسیح الامت کی وفات پر ایک ہندو کا قول

تو خلاصہ یہ کہ انسان کو ہر وقت یہ فکر کرنی چاہیے کہ میرا اللہ مجھ سے ناراض نہ ہو جائے۔ چنانچہ مجھے اس پر اپنے شیخ اوّل حضرت مسیح الامت جلال آبادی نور اللہ مرقدہ کا قصہ یاد آیا کہ جب حضرت کا وصال ہوا تو ایک بات تو خود مجھ کو پیش آئی کہ میں دیوبند سے نانوتہ آیا تو جلال آباد کے لیے بس کے انتظار میں کھڑا تھا تو میں نے دیکھا کہ ہندو مسلم سب اپنے کاروبار بند کر کے جلال آباد کی طرف رواں دواں ہیں اور لاکھوں کا مجمع اکھٹا ہو گیا اور وہ ہندو مجھ سے اپنی خاص اصطلاح میں حضرت والا سے غایت درجۂ محبت وعقیدت کا اظہار کرنے لگا اور حتیٰ کہ حضرت کی وفات کا اثر خود ان کے دلوں پر اتنا پڑا کہ انہوں نے اپنے مندر سے گائے جانے والی آواز کو بالکل آہستہ کر دیا بلکہ بعض حضرات نے یہاں تک بتایا کہ کئی دنوں تک انہوں نے اپنے مندر کے لاؤڈ اسپیکر کو سوگ کے طور پر بند رکھا۔

یہ وہ عزت ہے کہ جو اہل اللہ اور خاصانِ خدا کو اطراف عالم میں تمام مخلوق کے دل میں حاصل ہوتی ہے اور یہ درحقیقت ان سے اللہ کے راضی اور خوش ہونے کی اس دنیا میں ایک نشانی اور علامت ہے۔ جیسا کہ حکیم الامت نے فرمایا ہے اور قرآن کریم میں حق سبحانہ وتعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ:

﴿إِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا﴾

(سورۃ مریم، آیت: ۹۶)

حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہ فرماتے ہیں کہ بلاشبہ جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے اچھے کام کیے اللہ تعالیٰ (ان کو علاوہ نعم مذکورہ اخرویہ کے دنیا میں نعمت دے گا کہ) ان کے لیے خلائق کے دل میں محبت پیدا کر دے گا۔ حضرت مفتی شفیع صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ خود مؤمنین صالحین میں آپس میں بھی الفت ومحبت ہو جاتی ہے۔ ایک نیک صالح آدمی دوسرے نیک آدمی سے مانوس ہو جاتا ہے اور دوسرے تمام لوگوں اور مخلوقات کے دلوں میں

بھی اللہ تعالیٰ ان کی محبت پیدا فرما دیتے ہیں اور تفسیر قرطبی کے حوالہ سے فرمایا کہ ہرم بن حیان رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ جو شخص اپنے پورے دل سے اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ تمام اہلِ ایمان کے دل اس کی طرف متوجہ فرما دیتے ہیں۔ (معارف القرآن، صفحہ:۵۹)

مؤمنین کے قلوب اللہ والوں کی طرف پھیر دیئے جاتے ہیں

اسی مضمون کی روایت حضرت تھانوی نے التکشف صفحہ ۳۸۳ مظہری میں بھی نقل فرمائی ہے کہ:

﴿وَمَا أَقْبَلَ عَبْدٌ بِقَلْبِهِ إِلَى اللهِ إِلَّا جَعَلَ اللهُ قُلُوبَ الْمُؤْمِنِينَ تَنْقَادُ إِلَيْهِ بِالْوُدِّ وَالرَّحْمَةِ وَكَانَ اللهُ إِلَيْهِ بِكُلِّ خَيْرٍ أَسْرَعَ﴾

(المعجم الكبير للطبراني)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث طویل میں ارشاد فرمایا کہ کوئی شخص ایسا نہیں ہے جو اپنے قلب سے حق تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو جائے، مگر حق تعالیٰ اہلِ ایمان کے قلوب کو اس کی طرف محبت اور مہربانی کے ساتھ متوجہ اور مطیع کر دیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ہر طرح کی خیر اس کی طرف جلدی پہنچاتے ہیں۔

میرے دوستو! اس لیے احقر عرض کرتا ہے کہ ہمیں اپنے اعلام کے ذریعہ لوگوں میں اپنا مقام بنانے اور اپنی شان وعزت ورفعت بڑھانے کے لیے کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہمیں تدریس وتقریر اور تصنیف وتالیف کے ذریعہ لوگوں میں اپنے چمکانے کی سوچ وفکر پیدا کر کے اپنی خدمات کو ضائع کرنے کی ضرورت نہیں، بلکہ ہمیں ضرورت اس بات کی ہے کہ ہر قدم پر تمام گناہوں سے پرہیز ہو۔ خواہ ایئرپورٹوں پر ہوں یا جہازوں میں یا بس اسٹاپ (Bus stop) پر ہوں یا پارکوں میں ہوں اور یا بازاروں اور مارکیٹوں میں ہوں، نظریں اُٹھنے نہ پائیں اور دل میں حرام لذت ومزے کا گذر نہ ہو اور رات ودن اللہ تعالیٰ کی رضا کی فکر ہو اور کسی کی کوئی پرواہ نہ ہو۔ لوگ مدحت کریں یا مذمت اور ملامت کریں یا محبت سب سے بالاتر ہو کر اپنے مولیٰ کی رضاء کی دھن اور دھیان سوار ہو۔ اگر وہ اللہ راضی ہو گیا اور پھر ہمیں شہرت دے تو اور گمنام رکھے تو، مالدار کر دے تو، غریب رکھے تو، راحت و آرام دے تو، پریشانیوں میں رکھے تو۔ غرض یہ کہ وہ جس حال میں بھی رکھے تو بندہ کی شان یہ ہے کہ وہ اس پر راضی رہے۔

بعض اولیاء اللہ گمنام ہوتے ہیں

کیونکہ اللہ تعالیٰ کے کتنے ہی محبوب بندے اور بڑے مقرب اللہ والے ہیں مگر ان کی لوگوں میں شہرت نہیں ہوتی ہے۔ جیسا کہ حدیثِ پاک کے اندر آیا ہے کہ اللہ کے بعض بندے اللہ کو بڑے پیارے ہوتے ہیں، مگر وہ بظاہر بالکل پراگندہ حال ہوتے ہیں لیکن اگر وہ اللہ پر کسی بات کے پورا ہونے کی قسم اُٹھا لیتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کی قسم کو پورا کرتے ہیں جس کے الفاظ ترمذی شریف سے حضرت تھانوی نے التکشف صفحہ ۳۶۷ پر یوں نقل

فرماتے ہیں کہ:

﴿عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَمْ مِنْ أَشْعَثَ أَغْبَرَ ذِيْ طِمْرَيْنِ لَا يُؤْبَهُ لَهُ لَوْ اَقْسَمَ عَلَى اللهِ لَأَبَرَّهُ مِنْهُمْ﴾

(سنن الترمذی، کتاب المناقب، باب مناقب البراء بن مالک ﷺ)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا بہت سے بندگانِ خدا ایسے ہیں کہ بال بھی گرد آلود اور بدن بھی گرد آلود کیونکہ اتنا سامان نہیں کہ بال اور بدن کی خدمت کرسکیں، دو پرانی چادر والے کہ ایک باندھیں، ایک اوڑھیں اور کوئی ان کی ذرا بھی پرواہ نہ کرے، مگر رُتبہ اتنا بڑا کہ اگر خدا پر قسم کھا بیٹھیں اس طرح کہ واللہ خدا تعالیٰ یوں کرے گا تو اللہ تعالیٰ ان کی قسم سچی کردیں یعنی وہ کام اسی طرح کردیں۔ اور بعض روایت میں مدفوع بالابواب کا بھی ذکر ہے کہ ان کو دروازوں پر دھکے دیئے جاتے ہیں یعنی کوئی حیثیت نہیں دی جاتی ہے۔

مجدد تھانوی فرماتے ہیں کہ اغبر اشعث وغیرہ شرط نہیں ہے۔ جیسا کہ بعض ناواقفوں کا زعم ہے بلکہ مقصود یہ ہے کہ یہ ہیئت منافی کمال نہیں ہے۔ جیسا کہ اہلِ کبر اس ہیئت کو حقیر سمجھتے ہیں تو احقر کا مدعا اس حدیث سے ثابت ہو رہا ہے کہ بہت سے اللہ کے مقرب بندے ہیں اور اللہ ان کو گمنام رکھتے ہیں تو اس میں ان کی مصالح ہوتی ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ حاکم بھی ہیں اور حکیم بھی ہیں تو ہم پر اللہ تعالیٰ جیسا چاہے تصرف کریں اور ہر تصرف میں ضرور حکمت ہوگی۔ اللہ کا کوئی عمل حکمت سے خالی نہیں ہوسکتا ہے یہ محال ہے۔

میرے دوستو! اللہ تعالیٰ کا کسی بندہ سے راضی ہوجانا یہ ایسی نعمت ہے کہ اگر یہ حاصل ہوجائے تو پھر سارے مسائل ٹھیک ہوتے چلے جاتے ہیں کیونکہ حدیث پاک میں حق تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے کہ جو شخص فکرِ آخرت کو اپنے اوپر سوار کرلیتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ اس کی باقی دنیا کی ساری فکروں کی طرف سے کفالت فرمادیتے ہیں۔ اور پھر وہ اگر ظاہری فقر و فاقہ اور تنگی میں بھی ہوتا ہے، مگر وہ ایسی راحتِ قلبی اور سکون و چین سے جیتا ہے کہ دنیا بھر کے دولت والے بھی اس پر رشک کرتے ہیں کیونکہ دنیا و آخرت کا چین و سکون اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنی رضا کے ساتھ وابستہ کیا ہے۔ اس لیے یہ کہنا غلط نہیں کہ دنیا و آخرت کی تمام نعمتوں میں سب سے بڑی اور اونچی نعمت انسان کے لیے رضائے الٰہی ہے اور سنت اللہ یہی ہے کہ ایسے لوگوں کو اللہ تبارک و تعالیٰ مخلوق کے اندر بھی ایسا مقام و عزت عطا فرماتے ہیں کہ ہر انسان اُسے اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتا ہے۔

صحبت شیخ کامل گرچہ حاصل مگر فسق سے ہے دور منزل

شیخِ کامل سے جو ہے مستغنی
پائے گا کیسے ظلِ رحمانی
فسق کرتا ہے دور منزل سے
پیر تیرا ہو گرچہ لاثانی

حضرت والا نے ان اشعار میں اپنے بزرگوں اور اکابر اہل اللہ کے اس مسلک کو پیش کیا ہے کہ جس میں نہ افراط ہے اور نہ تفریط ہے بلکہ بالکل اعتدال پر مبنی ہے۔ جہاں ایک طرف شیخِ کامل اور مرشد دینی کی ضرورت بڑی قوت سے اپنے خصوصی انداز میں پیش فرمائی ہے وہیں دوسری جانب انسان کے اپنے تقویٰ و طہارت کو قربِ خداوندی کے حصول کی اصل بنیاد اور کنجی قرار دیا ہے۔ اس لیے دونوں جانب کا لحاظ و خیال پیش نظر رکھا ہے۔ جیسا کہ احقر نے ایک مقام پر حضرت مفتی شفیع صاحب رحمہ اللہ کے معارف القرآن، جلد: ۲، صفحہ: ۶۱۹ سے دونوں طبقوں کی گمراہی اور افراط و تفریط کو خود حضرت مفتی صاحب کے الفاظ میں پیش کیا ہے وہاں دیکھ لیا جائے۔ چنانچہ حضرت فرماتے ہیں کہ جو لوگ اہل اللہ اور مشائخ اہل حق میں سے کسی کو اپنا مرشد و شیخ نہیں بناتے اور ان سے مستغنی بے نیاز ہو کر زندگی گذارتے ہیں، ان پر اللہ تبارک و تعالیٰ کے علوم و معارف اور اسرار و رموز کا دروازہ نہیں کھلتا ہے اور وہ تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰهِ کا مظہر نہیں بن پاتے یعنی بالفاظ دیگر ان کی اصلاح مرشد تھانوی کی تعبیر میں ناممکن ہے اور محال ہے۔ اس لیے مولانا رومی نے فرمایا کہ ؎

قال را بگذار مردِ حال شو
پیشِ مردِ کاملے پامال شو

احقر نے دوسری مختلف جگہوں پر اسی مسئلہ پر تفصیلی کلام کیا ہے اور شیخِ کامل سے تعلق کی ضرورت و اہمیت پر بفضلہٖ تعالیٰ روشنی ڈالی ہے جس کا حاصل یہی ہے کہ اللہ کو قدرت ہے کہ بغیر شیخ کے اصلاح کر دے مگر سنت اللہ یہی جاری ہے کہ کتاب اللہ کے لیے رجال اللہ بھیجے گئے اور پھر قوموں میں رشد و ہدایت پھیلی ہے۔ جیسا کہ بغیر ماں و باپ اللہ تعالیٰ انسان کے پیدا کرنے پر قادر ہیں، مگر سنت اللہ یہی ہے کہ مرد و عورت کے جوڑے سے اولاد وجود میں آتی ہے۔ اب دوسرا پہلو جو حضرت نے پیش کیا ہے کہ اگر کوئی کیسے ہی بڑے پیر و مرشد سے جوڑا ہوا ہے لیکن اگر خود ہمت کر کے گناہوں سے نہیں بچتا ہے، نظر بازی اور عشق حرام میں اِدھر اُدھر لگا پھرتا ہے تو پھر وہ اپنی منزل سے قریب ہونے کے بجائے دور ہی ہوتا چلا جائے گا اور اسے قربِ خدا کی منزل تک رسائی نہ ہو سکے گی اور ایسا انسان خواہ کتنا ہی قریب رہے مگر حقیقت میں یہ دور ہے۔

یہ وہ نظریہ ہے کہ جو تصوف کی حقانیت کو ثابت کرتا ہے اور جو کہ بالکل عین قرآن وسنت پر مبنی ہے کہ اصل انسان کا اپنا کیا ہوا عمل وکوشش اور استعمال ہمتِ تقویٰ ہے ورنہ تباہی و بربادی سے کوئی انسان نہیں بچا سکتا ہے۔ خواہ وہ اپنے وقت کا کتنا بڑا ولی اللہ ہو۔ بالکل واضح بات ہے کہ اگر کوئی انسان بڑے ماہر ڈاکٹر اور طبیب کے ہسپتال میں داخل ہو اور بالکل ڈاکٹر کے پاس رہتا ہو لیکن ڈاکٹر کی دوائی کو نہ تو پورے طور پر استعمال کرتا ہے اور نہ جو پرہیز ڈاکٹر نے تجویز کیا ہے اس پر بالکل عمل کرتا ہے تو ظاہر ہے کہ ایسا مریض جلد ہی اپنے ہاتھوں اپنی ہلاکت کو دعوت دے دے گا اور اس کو ہلاکت سے کوئی بھی نہ بچا سکے گا۔ اس تصوف صحیح کے مقابلہ میں عجم میں کچھ ایسا تصوف ایجاد ہوا اور اس کے ماننے والے آج بھی دنیا بھر میں بڑی تعداد میں موجود ہیں کہ جن کا نظریہ یہ ہے کہ اپنے آپ کو کچھ کرنے کی ضرورت نہیں، بس اگر ہمارا پیر بڑا ہو تو پھر نہ ہمیں نمازوں کی ضرورت ہے اور نہ روزوں کی اور نہ دوسری چیزوں کی بلکہ ان تمام چیزوں کے لیے آخرت میں ہمارے پیر صاحب کافی ہوں گے۔

تصوفِ حق اور تصوفِ باطل پر ایک نظر

یہی وہ تصوف باطل اور مخترع ومتبدع یعنی نئی ایجاد ہے کہ جس نے عربوں کو مطلقاً تصوف اور علمائے اہلِ تصوف سے بدظن کر دیا ہے ورنہ بحمد اللہ ہمارا یہ تصوف جس کی تعبیر آپ تزکیۂ نفس سے کریں یا اصلاحِ نفس سے، زہد سے کریں یا احسان سے تصحیح نیت سے کریں یا تصفیۂ اخلاق سے حقیقت سب کی ایک ہی ہے اور اسی لیے حکیم الامت مجدد الملت جیسا عالمِ ربانی اس راہ میں کھڑا نظر آتا ہے اور مجدد تھانوی رحمہ اللہ نے بڑے واضح اور صاف الفاظ میں فرمایا ہے کہ جو چیز قرآن وسنت میں نہ ہو وہ تصوف نہیں ہے، بلکہ وہ سراسر وہ بدعت ہے، گمراہی و بے دینی ہے۔

چنانچہ حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہ کی کتاب التکشف عن مہمات التصوف اس موضوع پر خاص اہم تالیف ہے کہ جس کے اندر تصوف کے جملہ مسائل کو احادیث شریفہ سے ثابت کیا ہے اور جو بات خانقاہوں یا بزرگوں کے متبعین میں خلافِ سنت وشریعت رائج ہے اس پر بالکل دوٹوک انداز میں رد اور نکیر کی ہے اور اس پر کسی کی کوئی پرواہ نہیں کی اور یہی اہلِ حق علماء کی شان ہوتی ہے۔ اسی لیے ہم بحمد اللہ بڑے انشراحِ صدر اور قلبی بصیرت کے ساتھ تصوف وطریقت کے حق ہونے کو مانتے ہیں اور ان مبارک سلسلوں میں الحاق کو ہمارے اکابر علماء اصلاح وتزکیہ کے لیے اور احسانی کیفیات کے حصول کے لیے بہت مؤثر اور اہم سمجھتے تھے اور سمجھتے ہیں اور اسی لیے اس کی تلقین کی جاتی ہے اور آج تک یہ دیکھا گیا ہے کہ جو لوگ ان سلسلوں میں داخل ہو جاتے ہیں ان کے اندر تقویٰ ونیکی اور اتباعِ سنت وشریعت کے جذبات دوسروں کی بنسبت کئی گنا زیادہ ہوتے ہیں۔

رہ گیا وہ تصوف باطل جو سراسر بے دینی ہے، اس سے ہم کلی طور پر براءت کا اعلان کرتے ہیں اور بزرگوں اور اولیاء اللہ کے متعلق صرف اتنی عظمت واحترام کو صحیح سمجھتے ہیں کہ جو قرآن وسنت سے ثابت ہے اور اس سے آگے

شرک و بدعت اور گمراہی قرار دیتے ہیں۔

واقعۂ تصوف باطل

جیسے اس کو آپ کے سامنے ایک قصہ سے سمجھاتا ہوں۔ یہاں جنوبی افریقہ میں میرے ایک دوست ہیں وہ ایک بستی میں گئے ہوئے تھے اور ان کے ساتھ بعض ان کے خاندانی افراد بھی تھے، مگر ان کا تعلق اہلِ بدعت سے تھا تو جب عصر کی نماز کا وقت ہوا تو انہوں نے اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا کہ چلو اب عصر کی نماز کا وقت ہے تو ان میں سے ایک بولے کہ ارے تم ہمارے پیر کی شان میں کیسی گستاخی کر رہے ہو، ابھی ہم اپنے پیر کی مجلس میں ہیں اور جب ہم اپنے پیر کی مجلس میں ہوتے ہیں تو ان کی طرف ایک نظر بھر کر دیکھنا تمہاری ہزاروں نمازوں سے بہتر ہے تو اسپر پیر صاحب نے ان کو دیکھا اور مسکرائے اور کچھ نہ بولے تو یہ صاحب جو اہلِ حق میں سے تھے وہاں سے اُٹھے اور گھر سے باہر نکل کر نماز کے لیے گئے تو ایک صاحب گھر سے باہر نکل کر ان سے کہنے لگے کہ آج تم نے ہمارے پیر کے بارے میں بڑی گستاخی کی ہے، خبردار! آئندہ ایسا نہ کرنا۔

مگر جب انہوں نے یہ پوچھا کہ تم نماز نہیں پڑھو گے تو قبر و حشر میں کیا جواب دو گے؟ تو وہ فوراً برجستہ بولے کہ ارے میاں وہاں جواب دینے کے لیے تو ہمارے پیر موجود ہوں گے اور ہمارے پیر بڑے پاورفل (Powerfull) ہیں۔ ہماری طرف سے یہ جوابات دیں گے، ہم کو وہاں کوئی پریشانی نہیں ہونے دیں گے، اس لیے ہمیں دنیا میں اس کی فکر کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ العیاذ باللہ من ذالک۔

یہ محض ایک واقعہ پیش کیا گیا ہے تا کہ باطل اور مخترع تصوف با آسانی سمجھ میں آ جائے ورنہ اس نوع کے واقعات بڑی کثرت سے ہیں۔ ان کا احاطہ دشوار بھی ہے اور مقصود بھی نہیں ہے۔ میں تو اصل میں یہ عرض کر رہا تھا کہ اگر مرید گناہوں میں مبتلا رہے اور خود کچھ کرنے کو تیار نہ ہو تو پھر خواہ کیسا ہی پیر ہو وہ شخص کبھی منزلِ قربِ خداوندی کو نہیں پہنچ سکتا ہے، اور نہ ہی اس کا یہ خواب کبھی شرمندۂ تعبیر ہو سکتا ہے۔

نسبت مفید ہے مگر کافی نہیں

یہ تو اولیاء اللہ و مشائخ تصوف کی بات ہو رہی ہے۔ خود حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر جب یہ آیت نازل ہوئی کہ **وانذر عشیرتک الاقربین** تو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ التکشف صفحہ ۴۱۸ پر تحریر فرماتے ہیں کہ:

﴿عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ لَمَّا نَزَلَ وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَکَ الْاَقْرَبِیْنَ دَعَا النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قُرَیْشًا الحدیث وَفِیْهِ یَا فَاطِمَةُ اَنْقِذِیْ نَفْسَکِ مِنَ النَّارِ فَاِنِّیْ لَا اَمْلِکُ لَکُمْ مِنَ اللّٰهِ شَیْئًا﴾

(مشکوۃ المصابیح، ص: ۴۵۲)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی "وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَکَ" اپنے

قریب والے خاندان کو عذابِ الٰہی سے ڈراؤ تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کو پکارا اور جمع کیا اور اسی حدیث میں یہ بھی ہے کہ آپ نے حضرت فاطمہ کو فرمایا: اے فاطمہ! اپنے کو دوزخ سے بچاؤ کیونکہ میں تم کو اللہ تعالیٰ سے بچانے کا کوئی اختیار نہیں رکھتا ہوں۔

اصلاحِ عدم غرور بشرف نسبت بعضوں کو یہ ناز ہوتا ہے کہ ہم فلاں بزرگ کی اولاد میں ہیں یا فلاں خاندان میں بیعت ہیں اور اس بنا پر اصلاح عقائد و اعمال سے بالکل بے فکر ہو جاتے ہیں۔ اس دعویٰ اور ناز کی اس حدیث سے جڑ کٹتی ہے۔ (التکشف ،صفحہ:۴۵۲،مظہری)

یہ حضرت حکیم الامت نور اللہ مرقدہ کے الفاظ ہیں جس سے صاف طور پر حضرت والا کے اس شعر کا مطلب و مفہوم اس آیت و حدیث سے مدلل ہو گیا کہ محض پیرو شیخ بڑا ہونا کافی نہیں ہے، اصل چیز اپنا عمل ہے۔

اس حدیث شریف کا تعلق انکار شفاعت سے نہیں ہے بلکہ وہ اپنی جگہ پر احادیث سے ثابت ہے اور انبیاء وعلماء وشہداء وحفاظ کی شفاعت کا مفہوم مختلف دوسری احادیث سے ثابت ہے بلکہ منشاء یہ ہے کہ ان نسبتوں پر اعتماد کر کے اپنے آپ کو گناہوں میں لگائے رکھنا اور دین کی محنت وجدوجہد سے الگ رہنا یہ قطعاً درست نہیں ہے۔ اس طرح کے خیالات کی اس حدیث سے جڑ کٹ جاتی ہے۔

شیخ سے قرب جسمانی کے ساتھ اصل تعلیمات کی اتباع ہے

حکیم الامت مجدد تھانوی نور اللہ مرقدہ نے ارشاد فرمایا ہے اور بڑی عجیب بات فرمائی ہے کہ جو میرا تعلق والا اور مجھ سے محبت رکھنے والا، میری تعلیمات پر عمل پیرا ہوگا اگرچہ وہ مجھ سے دور ہو لیکن وہ حقیقی طور پر مجھ سے قریب ہے اور جو میرے نزدیک رہ کر میری تعلیمات پر عمل نہیں کرتا ہے تو وہ باوجود میرے قریب رہنے کے اپنے کو مجھ سے دور سمجھے۔

میرے دوستو! حضرت والا کے اس شعر اور حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے اس ملفوظ میں ہم سب کے لیے بڑی عبرت اور نصیحت ہے کہ جو ہم لوگ یہاں خانقاہ میں رہ کر وقت گذارتے ہیں اور بظاہر جسمانی طور پر ہم حضرت سے قریب ہیں لیکن اصل حضرت سے نزدیکی والا اور پاس رہنے والا وہ ہے جو حضرت والا کی دردبھری ہوئی محبت خداوندی سے لبریز تعلیمات پر عمل پیرا ہو اور ان تعلیمات کو حرز جان بنائے ہوئے ہو ورنہ صحبت کی حقیقی منفعت اور اصل خانقاہ میں وقت گزارنے کے مقاصد سے ہم محروم ہو جائیں گے۔ اس لیے بلاوجہ ایک دوسرے سے تعلقات اور دوستیاں بڑھانا اور پھر رات گئے دیر تک بیٹھے اِدھر اُدھر کی بے مقصد باتیں کرتے رہنا اور صبح کو اُٹھنے کا اہتمام نہ رکھنا اور لایعنی امور سے اجتناب و پرہیز نہ کرنا، باہر نکلیں تو بقصدِ حفاظتِ نظر اپنی نظروں کے بچانے کا اہتمام نہ کرنا یہ سب امور ہیں جو ہمیں منزل سے دور کرنے والے ہیں۔

الحمد للہ تحدیثِ نعمت خداوندی کے طور پر اس شعر کے ضمن میں یہ عرض کرنا بھی مناسب ہے کہ بعض امورِ تربیت واصلاح میں حضرت والا کا انداز بظاہر احقر کے ناقص علم کے مطابق بالکل لاثانی اور بے نظیر ہے۔ جیسا کہ اس سلسلہ میں بہت سے ایسے حضراتِ علماء سے بھی احقر نے سنا کہ جو باقاعدہ طور پر حضرت والا سے کوئی اصلاحی تعلق کا سلسلہ نہیں رکھتے جیسے مثلاً اللہ تبارک وتعالیٰ کے عشق ومحبت کو اپنے بے مثال انداز اور خاص طریق سے پیش کرنا اور اس پر مرتب ہونے والے انعاماتِ خداوندی کو عجیب عجیب مثالوں سے بڑے مؤثر اور دلنشین انداز میں بیان کرنا یہ حضرت والا کا خاص امتیازی انداز ہے اور عشقِ مجازی یعنی فسق کو عشقِ حقیقی میں بدلنا اور اوّل کی بُرائی اور گندگی اور ثانی کی لذت وحلاوت کو دل میں اُتار دینا یہ خاص عطائے الٰہی ہے۔ اس لیے تائب صاحب نے بالکل بجا فرمایا ہے کہ ؎

کب کہا کہ یہ دنیا اہلِ دل سے خالی ہے
لیکن اپنے مرشد کی بات ہی نرالی ہے

اور حضرت مولانا منصور الحق صاحب کا شعر ؎

میرے پیارے مرشد سے ملنے سے پہلے
کیا کرتے تھے جو شقاوت کی باتیں
میرے پیارے مرشد سے ملنے کے بعد
اب کیا کرتے ہیں وہ سعادت کی باتیں

حضرت والا کے فیض کی تاثیر مثل اپنے مرشد کے ہے

فیضِ مرشد کی یہ کرامت ہے
کوئی رومی ہے کوئی خاقانی

حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ اپنے مرشد کے فیض صحبت کو پیش فرما رہے ہیں کہ میرے مرشد کی صحبت سے مختلف بزرگ اور اولیاء اللہ پیدا ہوتے ہیں، کوئی رومی ہوتا ہے تو کوئی خاقانی اور کوئی رازی ہوتا ہے تو کوئی غزالی بن کر سامنے آتا ہے۔

اور احقر بحمد اللہ تعالیٰ یہ عرض کرنا مناسب سمجھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خود حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ کو وہی انداز عطا فرمایا ہے کہ جو مولانا رومی کا تھا اور وہی دردِ محبت اور وہی سوزِ عشق اور وہی آنسو بہانے والی آنکھیں عطا فرمائی ہیں۔ یہی تو وجہ ہے کہ حضرت مفتی حسین بھیات نے جب حضرت مولانا یوسف بنوری رحمہ اللہ کو حضرت والا کی معارفِ مثنوی دکھلائی تو حضرت بنوری نے یہ ارشاد فرمایا تھا کہ لَا فَرْقَ بَیْنَہٗ وَبَیْنَ مَوْلَانَا رُوْم اسی لیے

حضرت والا کو رومیٔ عصر کہنا کوئی مبالغہ نہ ہوگا اور حضرت مولانا رومی اس اُمت کے ایسے ولی اللہ گذرے ہیں کہ جن کو سارے اولیاء اللہ خدا تعالیٰ کا بڑا عاشق تسلیم کرتے ہیں اور اسی لیے حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی، حضرت تھانوی و نانوتوی وغیرہ رحمہم اللہ باقاعدہ طور پر اس کا درس دیا کرتے تھے اور حضرت مولانا قاسم نانوتوی تو فرمایا کرتے تھے کہ اول درجہ پر قرآن اور پھر بخاری شریف اور پھر مثنوی شریف یعنی جامعیت وعلوم وکمالات میں یہ درجہ بتایا کرتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ یہ تینوں کتابیں الہٰیلی ہیں۔

یقینی طور پر کسی کی ولایت کا قائل ہونا جائز نہیں

یہاں پر ایک اہم بات حضرت والا کے سامنے اپنی اصلاح کے لیے عرض کرتا چلوں کہ کسی بھی انسان کو دوسرے انسان کے متعلق حتمی طور پر اس کے درجہ اور فضیلت کی بات کہنا جائز نہیں ہے کیونکہ حضرت نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے سختی سے منع فرمایا ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا ہے کہ:

﴿عن ابی بکرٍ قال قال رسولُ اللہ صلی اللہُ علیہ وسلّم من کان مادحًا اخاہُ فلیقل احسبُ فلانًا واللہُ حسیبُہٗ ولا یُزکّی علی اللہ احدًا احسبُ فلانًا کذا وکذا ان کان یعلمُ منہٗ ذٰلک﴾

﴿اخرجہ الشیخان وابو داؤد﴾

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس شخص کو اپنے مسلمان بھائی کی ضرور ہی تعریف کرنی ہو تو اس طرح کہنا چاہیے کہ فلاں شخص میرے گمان میں ایسا ہے، آگے خدا کافی جاننے والا ہے اور خدا کے نزدیک کسی کے پاک ہونے کا دعویٰ نہ کرے اور یہ جو کہے گا کہ فلاں شخص میرے گمان میں ایسا ایسا ہے وہ بھی اس شرط کے ساتھ کہ وہ شخص ایسا ہو ورنہ اس عنوان سے بھی مدح جائز نہیں۔ (روایت کیا اس کو بخاری ومسلم وابوداؤد نے)

اصلاحِ ترکِ جزم بولایت کسے حدیث کے عموم سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کسی شخص کو بدون نص محض گمان سے ولی قطعاً کہنا جائز نہیں۔ جیسا کہ اکثر کو اس میں بے احتیاطی ہے۔ البتہ اگر ظناً کہہ دے تو مضائقہ نہیں اور بہتر یہ ہے کہ اس ظنیت کی تصریح بھی کردے لیکن اگر اعتماداً علیٰ قرینۃ المقام والکلام تصریح نہ بھی کرے تب بھی مضائقہ نہیں۔ ہاں شیخ کہنا کسی کو جزم سے بھی جائز ہے کیونکہ مشیخت امر مشاہد ہے یعنی طریقِ تربیت کا جاننا بخالف ولایت کے کہ امر غیبی ہے یعنی مقبول عند اللہ ہونا۔ (التکشف، صفحہ:۳۸۶)

یہ حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہ کی عبارت ہے۔ اس سے آپ کو معلوم ہوگیا کہ حتمی طور پر کسی کے ولایت کی بات اور اس کے عند اللہ مقام ومرتبہ کی بات صرف نبی کو معلوم ہوسکتی ہے اور اب نبوت کا سلسلہ ختم ہے تو اب اس کے علم کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ ہاں صرف ظن غالب اور گمان قائم کیا جاسکتا ہے اور اسی بات کو ظن کے ساتھ کہا جاسکتا ہے۔

تو اب سوال یہ ہے کہ آج کل جو عموماً اس میں بے احتیاطی ہوتی ہے اور خود مذکورہ شعر میں جو رومی وخاقانی

کہا جا رہا ہے تو اسطرح قطعی طور پر گویا کہ ولایت کا فیصلہ کرنا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ اولاً تو رومی و خاقانی کے ساتھ تشبیہ دینا ان بعض امور کے اعتبار سے ہے جو کہ ان بزرگوں کو حاصل تھے اور یہ امر محسوس و مشاہد ہے تو اس لیے یہ تو جائز ہوگا اور ثانیاً یہ عرض ہے کہ یہ کلام ظنیت پر ہی محمول ہے۔ اس میں قطعیت مراد ہوتی ہی نہیں۔ ہاں بس اتنی بات ضرور ہے کہ افضل اور اچھا ہے کہ ظنیت کی تصریح کر دی جائے۔

چنانچہ حضرت والا کے ایک وعظ میں احقر نے خود سنا کہ فرمایا کہ میرے شیخ حضرت شاہ عبدالغنی پھولپوری رحمہ اللہ جن کو لوگ ولی گمان کرتے ہیں اور ہمارا بھی یہی گمان ہے۔ اس طرح نام لے کر تذکرہ کیا ہے تو اس لیے کسی ایک مقام پر آئی ہوئی بات کی تشریح و توضیح متکلم کے دوسرے کلام کی روشنی میں کی جاتی ہے۔

اسی لیے جو لوگ اپنے اپنے مشائخ کے بارے میں بے احتیاطی سے عجیب عجیب خیالات قائم کر لیتے ہیں اور بسا اوقات زبان سے کہتے بھی ہیں، یہ سب بالکل غلط ہیں۔

جیسے ایک مجلس میں ایک بار بعض حضرات کہہ رہے تھے کہ ہمارے حضرت باقی موجودہ حضرات مشائخ سے بازی لے گئے ہیں اور سب سے بڑھ گئے ہیں تو احقر نے اس پر عرض کیا کہ مجھے اس میں کچھ لقمہ ہے اور کچھ کہنا ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ کیا ہے؟ تو احقر نے عرض کیا کہ مقامات و درجات کا علم اور مراتب کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد ہے اور ہم سے مخفی ہے اور احقر نے فوراً حدیث پاک سنائی اور یہی مضمون پیش کیا تو ماشاء اللہ سب چونکہ اہلِ حق تھے اس لیے خاموش ہو گئے اور اس طرح احقر کی اس رائے کو قبول کر لیا اور قطعی طور پر کسی کے متعلق ولایت کی بات ازروئے شرع درست نہیں ہے۔ جیسا کہ اوپر مذکور ہوا۔

البتہ یہ کہنا بالکل درست ہے کہ میرے نفع کے لیے، میرے لیے علم کی حد تک میرے شیخ سے بڑھ کر میرے لیے کوئی نہیں ہے۔ جیسا کہ احقر نے دوسرے مقام پر حضرت گنگوہی کا یہی ملفوظ حضرت حاجی صاحب رحمہ اللہ کے متعلق تحریر کیا ہے۔

عارف تو اپنی مستیٔ قلب میں مست رہتا ہے

حضرت والا نے بڑی اونچی حقیقت کا اظہار فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی محبت و معرفت اور قرب کا مزہ اور لطف ایسا ہے کہ انسان کو اس کے ماسوا سے بالکل مستغنی اور بے نیاز کر دیتا ہے اور جو لوگ اِدھر اُدھر کی چیزوں میں پڑے رہتے ہیں اور ان کا یہ خیال ہوتا ہے کہ مجھے اللہ کی معرفت و قرب حاصل ہے، حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے اس کی لذت کو بالکل نہیں چکھا ورنہ دل میں اِدھر اُدھر کی چیزوں کا گذر بھی نہ ہوتا۔ جیسا کہ حضرت والا نے ایک

دوسرے مقام پر اسی کو یوں ارشاد فرمایا ہے کہ ؎

کیسے سمجھ لوں پاگیا وہ جامِ معرفت
رکھتا ہے خود کو جو بھی نمایاں کیے ہوئے
رکھتا ہے مجھ کو مست خزانہ یہ قلب کا
ہوں دفن اپنے دل میں کچھ ارماں کیے ہوئے

یعنی خدا کا سچا عاشق تو اپنے اللہ کی محبت کے درد میں مست رہتا ہے اسے تو دوسری چیزوں کا خیال بھی دل میں نہیں گذرتا ہے۔ اس لیے ایسے لوگوں کی محبت اور ایمان کا سودا ساری کائنات کے عوض بھی نہیں کیا جاسکتا ہے۔ جیسا کہ اہل اللہ نے اس بات کو بارہا فرمایا اور لکھا ہے کہ اگر سلاطینِ دنیا کو یہ پتہ چل جائے کہ ان خدا کے عاشقوں کو قربِ خداوندی میں کیا لذت اور مزہ مل رہا ہے تو یہ لوگ بادشاہوں سے لڑائی لڑنے کی جگہ میں ان اولیاء سے جنگ پر اُتر جائیں۔

جامِ عرفانی نصیب ہو تو جینے کی حلاوت ہے

کیا حلاوت ہے اس کے جینے میں
جس کو ملتا ہے جامِ عرفانی

حضرت نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ جب انسان کے اندر تین باتیں پیدا ہوجائیں تو پھر اس کو ایمان کی حلاوت ومٹھاس نصیب ہوجاتی ہے اور ظاہر ہے کہ اس حلاوتِ ایمانی کا محل اور موردِ قلب ہے اور دل ہی حاکمِ بدن ہے جب اس کو حلاوتِ ایمانی اور جامِ عرفانی ملے گا تو پھر بدن کے رگ ریشہ اور روئیں روئیں میں ایک نور اور روشنی اور حلاوت ومٹھاس محسوس ہونے لگتی ہے۔ چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ:

﴿ثَلٰثٌ مَنْ کُنَّ فِیْهِ وَجَدَ بِهِنَّ حَلَاوَةَ الْاِیْمَانِ مَنْ اَحَبَّ عَبْدًا لَا یُحِبُّهٗ اِلَّا لِلّٰهِ وَمَنْ کَانَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَحَبَّ اِلَیْهِ مِمَّا سِوَاهُمَا وَمَنْ کَرِهَ اَنْ یَّعُوْدَ فِی الْکُفْرِ کَمَا یَکْرَهُ اَنْ یُّنْقَذَ فِی النَّارِ﴾

(مشکوٰۃ المصابیح، کتاب الایمان)

تین باتیں جس شخص میں ہوں گی اس کو ایمان کی حلاوت حاصل ہوگی (یعنی وہ واجد ہوگا اور ایمانی حلوئی اس کے قلب میں موجود ہوگا محض تشبیہ وتخیل کے طور پر نہیں) اوّل یہ کہ انسان جب کسی سے محبت کرے تو صرف اللہ کے لیے کرے اور دوسرے یہ کہ اللہ ورسول اس کو باقی تمام چیزوں کے مقابلہ میں زیادہ محبوب ہوجائیں اور جو کفر میں لوٹنا اس قدر ناگوار رکھتا ہو جیسا کہ آگ میں ڈالا جانا ناگوار ہوتا ہے۔

جس شخص میں یہ تین باتیں پیدا ہوجائیں تو اس کو ایمانی حلاوت حاصل ہوجاتی ہے۔ اسی کو حضرت والا فرماتے ہیں کہ جسے اللہ کی معرفت مل جاتی ہے تو پھر اس کو جینے میں یہ مٹھاس اور حلاوت نصیب ہوجاتی ہے۔

اس لیے ہمارے دارالعلوم آزادول میں حضرت مولانا عبدالحفیظ مکی نے دومرتبہ میری موجودگی میں اپنے بیان میں یہ بات ارشادفرمائی کہ جس کی عربی عبارت کچھ یوں ہے جس کو احقر نے یہاں خانقاہ میں حضرت مولانا مکی دامت برکاتہم سے ایک باران کی آمد کے موقع پر دریافت فرمایا تو حضرت نے ارشادفرمایا کہ اس کے الفاظ کچھ یوں ہیں کہ:

﴿یُغَادِرُ کَثِیْرٌ مِنَ النَّاسِ الدُّنْیَا وَلَمْ یَذُوْقُوْا اَلَذَّ مَا فِیْھَا فَسَاَلَ سَائِلٌ وَمَا ذَاکَ یَا ابْنَ الْمُبَارَکِ قَالَ مَعْرِفَۃُ اللہِ﴾

حضرت عبداللہ ابن المبارک نے بڑی حسرت سے فرمایا افسوس کہ لوگ دنیا میں آئے اور مرکر چلے گئے مگر دنیا کی جو سب سے زیادہ قیمتی اور لذیذ چیز تھی اور سب سے زیادہ حلاوت ولذت والی دولت تھی اس کو چکھے بغیر مر گئے تو کسی نے پوچھا وہ کیا نعمت ودولت تھی تو فرمایا کہ وہ اللہ کی معرفت اور اللہ کی محبت وقرب کی حلاوت ولذت تھی جس کے سامنے ساری لذاتِ عالم ہیچ ہیں۔

خاص مضمون عطائے الٰہی ہے

میرے دوستو! ایک مضمون فضلِ الٰہی اور حضرت والا کی توجہ اور سامعین وحاضرین کی طلب صادق کی برکت سے پیش کرتا ہوں اور اس کے لیے اللہ تبارک وتعالیٰ نے مثال ذہن میں ڈالی ہے کہ دیکھئے گاڑی اور جہاز وٹرین اور دوسری سواریاں ہیں، ان کے پارٹس (Parts) اور پُرزے ہیں ان سے مل کر گاڑی چلتی ہے اور اگر کسی پرزے میں کوئی خرابی پیدا ہوجائے تو گاڑی کا نظام ٹھیک نہیں رہتا ہے اور وہ جس مقصد کے لیے آپ نے خریدی تھی اس مقصد میں یا تو بالکل بے کار ہوجائے گی اور یا پھر پورے طور پر کارآمد نہ رہے گی۔ اس کے بگاڑ اور فساد کے مطابق اس کے مقصد کی تکمیل میں خلل واقع ہوجائے گا۔

بس ٹھیک اسی طرح قرآن وسنت کی روشنی میں احقر عرض کرتا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس انسان کے بدن کو چند اعضاء و پرزوں سے بنایا ہے اور ہر عضو کے لیے ایک مقصد متعین کیا ہے اور اسی مقصد کی تکمیل اور پورے طور پر اسے حاصل کرنے کے لیے اس عضو کو اس کے خالق وصانع کے اصول کے مطابق استعمال کرنا ضروری ہے اور اس کو اس کی صحیح غذا دینا اور اس کے مخالف اثرات سے محفوظ رکھنا ضروری ہے ورنہ پھر وہ عضو حقیقی طور پر بے کار اور فاسد کہلائے گا۔ اگرچہ ظاہری طور پر وہ اپنا کام کررہا ہو۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں جابجا یہ مضمون آیا ہے کہ جس میں ایمان نہیں ہے وہ مردہ ہے اور جس کے عقل وفہم اور سمع وبصر دین کے سمجھنے اور ایمان لانے کے لیے دلائل انفس ودلائل آفاق میں غور کرنے سے قاصر ہیں اور وہ ان کو اس مقصد کے لیے استعمال نہیں کرتے ہیں تو قرآن ان کو بے عقل اور صُمٌّ بُکْمٌ عُمْیٌ قرار دیتا ہے اور دوسری جگہ ارشاد ہے کہ ان کے پاس دل ہیں مگر وہ ان دلوں سے کچھ سمجھتے نہیں ہیں اور ان کی آنکھیں ہیں مگر وہ ان سے دیکھتے نہیں ہیں اور ان کے کان

ہیں مگر وہ ان سے سنتے نہیں ہیں۔

تو درحقیقت یہ نفی اسی اعتبار سے کی جارہی ہے کہ ان اعضاء کا جو مقصد تھا انہوں نے اس کے لیے استعمال کرنے کے بجائے اس کے خلاف میں استعمال کیا تو اس اعتبار سے یہ اعضاء بے کار ہو گئے۔

تو اس لیے جب دل کو دل کی غذا نہیں ملے گی تو پھر یہ دل زندہ نہ رہے گا بلکہ مردہ ہو جائے گا اور انسان کی گاڑی پورے جسم والی سکون واطمینان سے چلنے کے بجائے اس میں خلل پڑے گا اور وہ بے چین واضطراب کا شکار ہوگا کیونکہ بدن کے اعضاء کا غلط استعمال شروع کر دیا تو گویا یہ مشین صحیح رُخ پر کام کرنا بند کردے گی اور آج پوری انسانیت کے بگاڑ کا یہی سبب ہے ورنہ ہم پورے بدن کو بالکل اس مقصد میں استعمال کرنا شروع کر دیں کہ جس کے لیے اس کا ہر عضو بنا ہے تو پھر پورا بدن اور قلب و دماغ سب کچھ سکون سے رہیں گے اور یہ انسانی گاڑی اپنے مقصد حقیقی کی طرف تیزی تیزی سے رواں دواں رہے گی اور دنیا و آخرت کی راحتیں ضرور بضرور اس کو مل کر رہیں گی۔اور جس کو دنیا میں جامِ معرفت نہیں ملا ہے وہ اپنے مقصدِ حیات ہی میں ناکام اور نامراد ہے۔

اسی لیے انسان کا اصل مقصد اللہ تعالیٰ کی معرفت وعبادت ہے اور انسان کا سب سے بڑا جرم یہ ہے کہ وہ دنیا میں آنے کے بعد ساری چیزوں کو جانتا ہو لیکن اللہ کو نہ جانے اگر اس سے پوچھو کہ تمہارا مکان، گاڑی، سیل فون، کمپیوٹر، تجارت، زراعت، صنعت وحرفت کیا ان امور کو تم جانتے ہو تو آپ دیکھیں گے کہ وہ ان سب سے واقف ہوگا اور بعض میں ماہر ہوگا اور دنیا کی مختلف لائنوں اور میدانوں میں اس کو بڑی مہارت حاصل ہوگی اور اسی کو وہ اپنا مقصدِ حیات اور زندگی کا قیمتی خزانہ سمجھے بیٹھا ہوتا ہے اور بظاہر اس کی حالت اس حقیقت کی ترجمانی ہوتی ہے کہ شاید اب اسے کبھی موت آ کر یہ ساری عیش وعشرت اس سے ختم ہونے والی نہیں ہے اور اس کو اس میں ہمیشہ کے لیے رہنا ہے، مگر افسوس صد افسوس یہ وہ جگہ ہے کہ جہاں کوئی نہ رہ سکا، بڑے بڑے بادشاہ وسلاطین اور بڑے تخت وتاج والے سب زیرِ زمین چلے گئے۔

اے انسان! تو نے سب کو پہچانا، مگر اس اللہ کو نہ پہچانا کہ جن کے امر وحکم سے تو انسان بنا اور جس کے امر وحکم سے پھر مٹی کا ڈھیر ہو کر اسی کی طرف لوٹ کر جائے گا۔ اگر اس کو پہچانتا تو خوشی خوشی اس آقا ورب، اپنے محبوب کی طرف نفساً مطمئنہ لے کر جنت کی نعمتوں اور رضا دائمی کے تحفہ سے مالا مال ہو جاتا۔

دلِ شکستہ میں جام و مینا کی فراوانی

میر میرے دل شکستہ میں
جام و مینا کی ہے فراوانی

میر حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ کے خادم خاص حضرت مولانا عشرت جمیل صاحب دامت برکاتہم کا

لقب ہے اور حضرت والا جب اس سے مخاطب کرتے ہیں تو اس سے مراد و مقصود صرف حضرت میر صاحب دامت برکاتہم نہیں ہوتے بلکہ درحقیقت ہر شخص ہی مخاطب ہوتا ہے، مگر یہ خاص اندازِ کلام حضرت والا کا ہے۔ زیادتی قرب و زیادتی تعلق کی بنیاد پر ان کو مخاطب بناتے ہیں۔ تو حضرت والا فرماتے ہیں کہ میں نے بفضلہٖ تعالیٰ اپنی بہت سی آرزوؤں اور تمناؤں کا خون کیا ہے اور اس کی وجہ سے میرا دل چورا چورا ہو جاتا تھا، مگر چونکہ یہ سب رضاءِ الٰہی کے سبب تھا تو اس لیے مجھے اپنے اس دل کو توڑنا گوارا تھا حق تعالیٰ کے لیے جب کوئی دل کو توڑتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ خود اپنے محبت و عشق کے خزانوں سے اس دل کی تعمیر کرتے ہیں اور اسے اپنے قابل بنا کر اس کے مہمان ہوتے ہیں ؂

تیرے ہاتھ سے زیرِ تعمیر ہوں میں
مبارک مجھے میری ویرانیاں ہیں

یہ حضرت والا دامت برکاتہم ہی کا شعر ہے کہ مجھے اپنی ظاہری ویرانیاں مبارک ہیں اور میں ان پر خوش ہوں کیونکہ ان ویرانیوں کے نتیجہ میں جو آبادکاریاں ہوتی ہیں وہ پروردگار کے ہاتھ سے ہوتی ہیں اور پھر وہ ایسا عالی شان محل بنتا ہے جس کا مہمان خود اللہ ہوتا ہے جس کو حضرت مولانا رومی فرماتے ہیں کہ ؂

در دل مؤمن بگنجیدم چوں ضیف

کہ میں مؤمن کے دل میں مہمان کی طرح سما جاتا ہوں۔ مگر یاد رکھئے کہ حرام آرزوؤں اور تمناؤں کا خون کرنا پڑتا ہے اور عیش و عشرت کو پامال کر کے اللہ کے راستوں کی کڑواہٹوں اور تلخیوں کو چکھنا پڑتا ہے۔

بزمِ عارف کی مستی و جولانی

رنگ دیکھو تو بزمِ عارف کا
کیسی مستی ہے کیسی جولانی

اللہ والوں کی محفلیں اور مجالس چونکہ ذکر اللہ پر مشتمل ہوتی ہیں اور ان میں خداوندِ قدوس کے کلام اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے تذکرے ہوتے ہیں اور اللہ کی عظمت و محبت کی بات کی جاتی ہے، اس لیے وہاں بیٹھنے والوں پر اس اللہ والے کے قلب پر القاء ہونے والے علوم و معارف کی بارش ہوتی رہتی ہے۔ فیاضِ حقیقی کی طرف سے اور فیضانِ انوارِ محبت و معرفت ہوتا رہتا ہے۔ اس لیے سب شرکائے مجلس پر عجیب سرور و نشاط اور عجیب کیف چھایا ہوا ہوتا ہے اور وہ اپنے اس کیف و لذت میں مست رہتے ہیں اور دنیادار جن لذتوں میں پڑے ہوتے ہیں وہ ان کی طرف نظر اُٹھا کر دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے ہیں اور اس کا ثبوت حدیث پاک کے اس مفہوم سے ہے کہ جن محفلوں میں اللہ تعالیٰ کا ذکر ہوتا ہے تو ان کو ڈھانپ لیتی ہے خصوصی رحمت اور سکینہ نازل ہوتا ہے اور فرشتے چاروں طرف سے ان کو گھیرے ہوئے ہوتے ہیں تو اللہ والوں کی محفلوں کا رنگ ڈھنگ عام دنیاداروں یا

عام علماء وفضلاء کی محفلوں کی طرح نہیں ہوتا ہے۔

چنانچہ ہم بحمد اللہ خود اس مجلس میں حضرت والا پر علوم وفیض کی جو جولانی اور بارش ہوتی رہتی ہے اور جس طرح و جس انداز میں ہم حضرات اللہ کی محبت کی شراب سے مست رہتے ہیں اور حاضرین کو مست رکھتے ہیں وہ بالکل نا قابلِ بیان کیفیت ہے جس کا خود تجربہ کر کے دیکھنے سے تعلق ہے۔ اسی لیے اس کی کچھ جھلک حضرت کی کتابوں میں لوگ دیکھ دیکھ کر دنیا بھر سے دیوانہ وار چلے آتے ہیں۔

اہلِ ساحل کو موجِ دل کی طغیانی پر رشک کیوں؟

رشک کرتے ہیں اہلِ ساحل سب
دیکھ کر موجِ دل کی طغیانی

سبحان اللہ! کیا عجیب وغریب مضمون ہے اور کیا ہی اونچی حقیقت کا بیان ہے۔ حضرت والا فرماتے ہیں کہ جو لوگ اپنے اپنے ذہنوں میں اپنے لیے تجویز کی ہوئی منزلیں رکھتے ہیں اور جو ارمان اور تمنائیں اپنے سینوں میں رکھتے ہیں اور جو اُمیدوں کا محل اپنے دل و دماغ میں بنائے ہوئے ہوتے ہیں جب وہ ان امیدوں کو پورا ہوتا ہوا دیکھتے ہیں اور وہ پوری ہو جاتی ہیں اور ان کو ان کے مقاصد دنیویہ عیش وعشرت کی چیزیں اور کچھ دنیوی لذات اور راحتیں حاصل ہو جاتی ہیں یا ذہن میں بنایا ہوا مال منصوبہ پایۂ تکمیل کو پہنچ جاتا ہے یا اولاد و کاروبار کے متعلق ان کے بنائے ہوئے پروگرام عملی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔

مثلاً کہ اتنا بڑا کاروبار ہو کہ جس سے ہر سال ایک ملین کی آمدنی ہو یا دو ملین کی آمدنی ہو اور اسی طرح مثلاً یہ کہ میری اولاد ڈاکٹر اور انجینئر اور پائلٹ و پروفیسر بنے وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب ان کو مل چکا ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ سب انسان اسی لیے چاہتا ہے کہ وہ عیش و آرام اور چین وسکون اور عزت وراحت کی زندگی گذارے لیکن اس ساحل پر پہنچ کر بھی اسے یہ مقاصد حاصل نہیں ہوتے بلکہ وہ دیکھتا ہے کہ میری مال کی طلب وحرص ختم ہونے کا نام نہیں لیتی ہے بلکہ دو سے چار اور چار سے آٹھ ملین اور آٹھ سے سولہ غرض یہ کہ نفس مجھے کسی منزل پر چین سے بیٹھنے نہیں دیتا ہے بلکہ اس کے دل کا مرض حرصِ مال اسے ہر وقت بے چین ومضطرب رکھتا ہے اور مشغولیات بڑھتی جاتی ہیں۔ ہر وقت دیکھو تو مشغول اور بزی، نہ کسی سے ملنے کا وقت، نہ عیادت وتعزیت کا وقت، نہ صلہ رحمی اور والدین کی دیکھ بھال وغیرہ کی فکر اور اس طرح اپنے کو ایسا الجھا ہوا اور مشغول پاتا ہے کہ اس کا جو کچھ سکون تھا وہ بھی ختم ہوتا نظر آتا ہے۔

اور جس اولاد کو ڈاکٹر وانجینئر بنا کر اس پر اپنی امیدوں کا پل کھڑا کیا تھا وہ پل ڈھاتا ہوا نظر آتا ہے اور اسے محسوس ہوتا ہے کہ ہائے افسوس جس اولاد کو ہم نے بڑی اُمیدوں سے پالا تھا اور ان سے بڑی توقعات وابستہ کی تھیں اور اپنی زندگی کے آخری دور میں آج جبکہ ہمیں ان کی ضرورت تھی تو وہ قریب لگنے کو تیار نہیں، حال پوچھنے اور

خبر گیری تک کی ان کو فرصت نہیں ہے کیونکہ ہر ایک اپنے اپنے معاملات اور مشاغل حیات میں لگا ہوا ہے نہ ان کے پاس عیادت کے لیے وقت ہے، نہ خدمت کے لیے نہ وہ یہ جانتے ہیں کہ والدین کی راحت رسانی کیا نعمت ہے اور اس سے محرومی کتنی بڑی محرومی ہے۔ نہ وہ یہ جانتے کہ ہم کس لیے پیدا ہوئے ہیں؟ ہمارا اصل مقصد حیات کیا ہے؟ کیونکہ ان کو نہ تو دین سکھایا گیا اور نہ قرآن وسنت کی تعلیمات سے ان کو روشناس کرایا گیا۔ اس لیے حضرت والا انسان کے متعلق فرماتے ہیں کہ بظاہر گو کہ وہ انسان اپنے ساحل پر کھڑا ہوا ہے لیکن جب وہ کسی اللہ والے کو باوجود قلت سامانی اور بے کسی و بے بسی اور رات و دن کے مجاہدوں کے دیکھتا ہے اور اس کے پُرسکون جینے کو اور اطمینان و راحت والی حیات کو دیکھتا ہے تو اسے اس پر رشک آنے لگتا ہے۔

کیونکہ میرے دوستو! جس نے یہ سیکھ لیا کہ میری زندگی کا اصل مقصد صرف ایک اللہ کو راضی کرنا ہے اور اس نے اپنی ساری فکروں اور غموں کو چھوڑ کر بس اپنے لیے ایک آخرت کے غم کو اپنا غم بنالیا تو پھر باقی سارے غموں اور فکروں کی طرف سے حق تعالیٰ کفالت و کفایت فرماتے ہیں اور اس کے ذمہ دار ہو جاتے ہیں اور اسے دنیا کی فکروں سے بالکل مطمئن و بےفکر کر دیتے ہیں۔ اس لیے اس کے دل کو اطمینان وسکون نصیب ہوتا ہے کہ اہلِ دنیا کو اس کی ہوا بھی نہیں لگتی ہے۔

اس لیے حضرت والا فرماتے ہیں کہ اہلِ دل اللہ والوں کو جب یہ دنیا میں ڈوبے ہوئے لوگ دیکھتے ہیں اور اہل اللہ کے قلوب میں جو نور وسکون کی بارش برستی ہے جب ان کے پاس بیٹھ کر خود یہ اس کی کرنوں سے روشن ہوتے اور ان کے دلوں سے مہکنے والی عشق ومحبت خداوندی کی خوشبوؤں کو سونگھتے ہیں تب یہ بے چارے رشک کرتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ کاش! یہ دولت ہمیں بھی نصیب ہو جاتی۔

حتیٰ کہ احقر حکیم الامت نور اللہ مرقدہ کے ''تحفۃ العلماء'' میں لکھے ہوئے ملفوظات کی روشنی میں عرض کرتا ہے کہ جب وہ لوگ جو صرف علم نبوت لیے ہوتے ہیں اور قرآن وسنت کو صرف پڑھ کر سند فراغت لیے ہوتے ہیں اور اکابر اہل اللہ اور مشائخ عظام کی صحبت میں رہ کر اس علم پر عمل کی مشق نہیں کرتے اور وہ دردِ محبت اور انوارِ معرفت جو مشائخ کے سینوں میں ہیں ان کے پاس رہ کر ان کو حاصل نہیں کرتے تو پھر وہ بھی اسی رشک میں مبتلا ہوتے ہیں کیونکہ جو حق تعالیٰ سے قوی اور مضبوط تعلق اپنے سینہ میں رکھتا ہو تو اللہ تعالیٰ اسے ایسے علوم اور اسرارِ معرفت عطا فرماتے ہیں کہ جو عام علماء وفضلاء کے دل ودماغ میں نہیں آتے ہیں۔ حکیم الامت تھانوی نور اللہ مرقدہ نے اس کی عجیب مثال پیش فرمائی ہے کہ جیسے ایک بادشاہ کے وزراء مملکت ہوتے ہیں کہ امورِ مملکت رسمی طور پر اور ضابطہ کے طور پر ان کے سپرد ہوتے ہیں اور وہ ان کو انجام دیتے ہیں لیکن ایک وہ شخص ہے کہ جو بادشاہ کی خدمت کر کے اور اسکو راحت پہنچا کر اس کے دل کو اس قدر خوش کر دیتا ہے کہ پھر وہ بادشاہ اپنے ایسے امور بھی اس شخص پر ظاہر کر دیتا

ہے کہ جو اس کے خصوصی اسرار و راز ہوتے ہیں۔ اگرچہ وہ شخص رسمی طور پر اس مملکت کا وزیر نہ ہو لیکن وہ ہر لحاظ سے ان تمام وزراء سے مافوق ہوتا ہے۔

علم وہبی اور چلہ کشی کی دلیل

بس بالکل یہی حال اس بندۂ خدا کا ہے کہ جس نے ہر آن اور ہر گھڑی اللہ تبارک وتعالیٰ پر فدا ہو کر اور اپنی ساری خواہشات کو اللہ تبارک وتعالیٰ کی مرضی پر قربان کر کے اللہ تعالیٰ کو اس قدر خوش کیا ہوتا ہے کہ پھر حق تعالیٰ اپنے غیبی علوم اور اسرار معرفت اس کے سینہ پر کھولتے ہیں اور اس کی زبان پر ان کو جاری کرتے ہیں کہ جو رسمی علماء وفضلاء مدارس ہوتے ہیں وہ ان کو دیکھ کر عش عش کرتے رہ جاتے ہیں۔ اور اس مضمون کی دلیل کے طور پر احقر دو حدیثیں پیش کرتا ہے جن کو حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے التکشف صفحہ: ۴۱۴ پر پیش کیا ہے:

﴿اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا رَأَیْتُمُ الْعَبْدَ یُعْطٰی زُھْدًا فِی الدُّنْیَا وَقِلَّةَ مَنْطِقٍ فَاقْتَرِبُوْا مِنْہُ فَاِنَّہٗ یُلْقَی الْحِکْمَةَ﴾

(مشکوٰۃ المصابیح، ص: ۴۳۸)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور ابی خلاد سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب کسی شخص کو دیکھو کہ زہد فی الدنیا اور قلت کلام اس کو عنایت ہوا ہے تو اس سے نزدیک رہا کرو کیونکہ اس کو حکمت (علم اسرار وہبیہ) کی تعلیم (تلقین منجانب اللہ) کی جایا کرتی ہے۔ روایت کیا ہے اس کو بیہقی نے شعب الایمان میں۔

مسئلہ: اثبات علم اسرار غیر منقولہ اس کو علم اور علم وہبی لدنی بھی کہتے ہیں جس کا عطا ہونا اہل اللہ کو بکثرت وتواتر منقول ہے اور ان حضرات کی کتب بھی ان علوم کی مدون ومحفوظ ہیں جس پر اہلِ تقشّف بے سمجھے بوجھے انکار کر کے اس شعر کے مصداق ہوتے ہیں۔

وَ کَمْ مِنْ عَائِبٍ قَوْلاً صَحِیْحًا
وَ اٰفَتُہٗ مِنَ الْفَھْمِ السَّقِیْمِ

(التکشف ،۴۱۴)

اور دوسری روایت:

﴿مَنْ اَخْلَصَ لِلّٰہِ اَرْبَعِیْنَ صَبَاحًا ظَھَرَتْ یَنَابِیْعُ الْحِکْمَةِ مِنْ قَلْبِہٖ عَلٰی لِسَانِہٖ اَخْرَجَہٗ رَزِیْنٌ﴾

(مرقاۃ المفاتیح - التکشف، ص: ۳۹۹)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص چالیس روز تک اللہ کے لیے خلوص کے ساتھ عبادت اختیار کر لے تو علم کے چشمے اس کے قلب سے جوش زن ہو کر اس کی زبان سے ظاہر ہوتے ہیں۔ روایت کیا اس کو رزین نے۔

(ف) عادۃً چلہ اکثر بزرگوں سے چلہ نشینی کا اہتمام منقول ہے۔ یہ حدیث اس کی اصل ہے۔

(ف) مسئلہ اثبات علم اسرار بزرگوں کے کلام میں منصوص ہے کہ اللہ تعالیٰ کے خاص بندوں کو بعض علوم وہ عطا ہوتے ہیں جو نہ منقول ہیں نہ مکتوب ہیں۔ کبھی اس کو علم وہبی سے تعبیر کرتے ہیں، کبھی علم اسرار کہتے ہیں اور خود ان سے اس قسم کے دقائق وحقائق منقول بھی ہیں جو ان سے پہلے کسی کی زبان سے نہیں نکلے یہ حدیث ایسے علوم کی تحقیق اور اعتبار کی اصل ہے۔ (التکشف ،صفحہ:۴۰۰)

یہ حکیم الامت حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہ نے دو روایات پیش کی ہیں جن سے ایسے علوم کا ملنا ثابت ہوتا ہے۔اس لیے یہ علوم واسرار ومعرفت کی جولانی جب ایسے مٹے ہوئے قلب پر ہوتی ہے تو پھر دوسرے رشک کرتے ہیں۔

حصولِ کیف احسانی کا مرکز خانقاہ ہے

رند پاتا ہے خانقاہوں سے
اپنے ایمان میں کیف احسانی

خانقاہیں اللہ کی محبت کے شراب خانے ہیں یہاں مئے محبت پلا کر اللہ کا دیوانہ بنایا جاتا ہے اور سالک مجاہدے کر کر کے اس مقام پر پہنچ جاتا ہے کہ اسے کیف احسانی پیدا ہوجاتا ہے اور حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے احسانی کیفیت کو دو درجوں میں ذکر فرمایا ہے جن میں سے ایک تو یہ کہ انسان ہر وقت اس حالت میں ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کو دیکھ رہا ہے اور اللہ اس کے سامنے ہے، صرف عبادت ہی کے وقت نہیں بلکہ ہر آن اور ہر گھڑی انسان پر یہ حال طاری ہوجائے اور یا پھر دوسرا درجہ ہے کہ جس کو درجۂ مراقبہ کہتے ہیں کہ انسان اس حالت میں رہنے لگے کہ اسے اللہ تعالیٰ دیکھ رہے ہیں اور جب یہ حالت ہوجاتی ہے تو پھر اس سے گناہوں کا صدور نہیں ہوتا ہے بلکہ اس کو حفاظت من اللہ عطا ہوتی ہے۔اور اگر بدنظری کی نوبت آئے تو اس کا حال یہ ہوتا ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ اَلَمْ یَعْلَمْ بِاَنَّ اللّٰہَ یَرٰی اور دوسرا ارشاد ہے کہ یَعْلَمُ خَآئِنَةَ الْاَعْیُنِ ۔

جو کرتا ہے تو چھپ کے اہلِ جہاں سے
کوئی دیکھتا ہے تجھے آسماں سے

اور یاد رکھئے کہ پورے تصوف کی حقیقت یہی صفت احسانی پیدا ہونا ہے۔اس لیے اگر کوئی تصوف سے چڑتا ہو تو وہ شعبۂ تزکیہ واحسان، شعبۂ زہد واصلاح نفس کہہ سکتا ہے کیونکہ یہی تصوف کی حقیقت ہے۔اور اس کا تعلق زندگی کے ہر شعبہ سے ہے خواہ وہ اجتماعی ہو یا انفرادی، قول ہو یا فعل اس لیے احسان فی العبادات احسان فی المعاملات، احسان فی المعاشرۃ یہ سب شعبوں میں ہے۔اسی لیے اللہ تبارک وتعالیٰ قرآن میں احکام دینے کے بعد جگہ جگہ اس مشاہدہ ومراقبہ کی تعلیم کرتے ہیں۔ کہیں پر فرماتے ہیں کہ اِنَّ اللّٰہَ بِمَا تَعْلَمُوْنَ بَصِیْرٌ اور کہیں پر ہے

وَاللّٰہُ خَبِیْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ظاہر ہے کہ اس کا منشاء ومقصد یہی ہے کہ جو حکم دیا ہے اسے مانو ورنہ ہم تمہیں دیکھ رہے ہیں۔ اس کی سزا بھگتنی ہوگی اس لیے ان احکام پر عمل کرو۔

خونِ حسرت کے بدلے ذوقِ ایمانی

جب ملا دردِ خونِ حسرت سے
کیا کہوں اس کا ذوقِ ایمانی

حضرت والا دامت برکاتہم ارشاد فرماتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ کے راستہ میں غم حسرت برداشت کر کے اور خونِ حسرت کر کے اللہ کے فضل سے ایمانی ذوق عطا ہوا تو میرے بیان سے باہر ہے کہ اس کا صحیح معنی میں تذکرہ کرسکوں اور اس کو بیان کرسکوں اور خونِ حسرت میں یہ سب باتیں شامل ہیں کہ جب کوئی حسین صورت سامنے آجائے تو فوراً اپنی نگاہ بچالے۔ خواہ کتنا ہی زور پڑے اور دل ٹوٹے یا مثلاً کسی نے ایذاء وتکلیف کی بات کہہ دی مگر آپ اللہ کی رضاء کے لیے اسوۂ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سمجھ کر اور حضور کی سیرت سمجھ کر اس کی تلخی وکڑواہٹ کو سہہ جائیں اور برداشت کرلیں تو پھر ان کڑوے گھونٹوں کے بدلے اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتے ہیں کہ ملأ اللہ قلبہ امنًا وایمانًا کہ اللہ تعالیٰ اس کے دل کو امن وایمان سے بھر دیتے ہیں اور یہ حلاوت ایمانی کا وعدہ ہے کہ اس خونِ حسرت سے حلاوتِ ایمانی ملتی ہے۔ بس یہی ذوق ایمانی ہے۔ حضرت تھانوی نوراللہ مرقدہ نقل فرماتے ہیں کہ ایک نبی کا واقعہ التکشف، صفحہ: ۴۱۶ پر فرماتے ہیں کہ:

﴿قَالَ عَبْدُ اللّٰہِ کَأَنِّیْ أَنْظُرُ إِلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَحْکِیْ نَبِیًّا مِّنَ الْأَنْبِیَاءِ ضَرَبَہٗ قَوْمُہٗ فَأَدْمَوْہُ وَھُوَ یَمْسَحُ الدَّمَ عَنْ وَجْھِہٖ وَیَقُوْلُ اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لِقَوْمِیْ فَإِنَّھُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ﴾

(صحیح البخاری، کتاب احادیث الانبیاء، باب حدیث الغار)

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں گویا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ رہا ہوں کہ ایک نبی کی انبیاء میں سے حکایت فرماتے تھے جن کو ان کی قوم نے مارا تھا اور خون آلودہ کر دیا تھا اور وہ اپنے چہرہ سے خون پونچھتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے کہ اے اللہ! میری قوم کو بخش دے کیونکہ وہ جانتے نہیں۔ روایت کیا اس کو بخاری مسلم نے۔

احقر کا منشا اس حدیث شریف کو لا کر یہ ہے کہ ایک طرف قوم کا معاملہ اور ایک طرف نبی کا معاملہ تو یہ شان اہل اللہ اور خاصانِ خدا کی ہوا کرتی ہے، وہ ان سب کو اللہ کے لیے برداشت کرتے ہیں اور پھر اللہ کے نزدیک ان کے درجات بڑھا دیئے جاتے ہیں۔

حضرت میر صاحب دامت برکاتہم نے اس کے ضمن میں یہیں مجلس میں فرمایا کہ حضرت والا کو اللہ تعالیٰ کے راستہ میں جو غم اُٹھانے پڑے تو وہ دونوں لائنوں اور دونوں راہوں کے غم تھے یعنی باطنی بھی اور ظاہری طور پر

حاسدین کے حسد اور دشمنوں کی ایذا رسانی کا بھی سامنا کرنا پڑا حضرت والا نے مجھ سے خود اڑتیس سال پہلے فرمایا کہ میرا مزاج بچپن ہی سے عاشقانہ تھا جب میں جوان ہوا تو خواہشات کا ایک سمندر میرے دل میں تھا۔ میں نے سوچا کہ کسی شیخ کا دامن نہ پکڑا تو میں بہہ جاؤں گا۔ چنانچہ فوراً ہی حضرت پھولپوری رحمہ اللہ سے بیعت ہوگیا۔ پھر فرمایا کہ اس کی برکت سے فائدہ یہ ہوا کہ اس عاشقانہ مزاج کے باوجود بھی مجھ سے زندگی میں ایک بار بھی اس راہ کی لغزش نہیں ہوئی۔

اور دوسرا مجاہدہ یہ تھا کہ حاسدین پیدا ہوگئے تھے کہ سولہ سال تک ہر وقت حضرت والا کو ستاتے رہے اور ان کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ حضرت والا یہاں سے بھاگ جائیں۔ یہ ایک پوری داستان ہے یہاں تک کہ جب حضرت پھولپوری رحمہ اللہ کے ساتھ سفر میں تانگہ میں بیٹھے۔ ایک حصہ آگے ایک پیچھے۔ حضرت پھولپوری پیچھے بیٹھتے تھے اور حضرت والا آگے بیٹھتے تھے تو حاسدین آگے آکر منہ چڑاتے تھے اور کہتے تھے کہ مالٹا چوسی، مرغی کھائی شیخ کو چھوڑ کر کاہے کو جائے۔ یہ طعن وتشنیع کرتے۔ حضرت نے یہ برداشت کیا۔ فرماتے ہیں کہ میں ایک دفعہ بھی حرف شکایت زبان پر نہیں لایا کیونکہ مجھے شیخ سے محبت تھی۔ میں نے سوچا کہ کہیں وہ مجھے شیخ سے دور نہ کردیں اور میں شیخ سے اتنی محبت کرتا تھا کہ میں حضرت کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔ اس لیے ایک دفعہ بھی حرفِ شکایت زبان پر نہیں لایا۔ اس کو حضرت نے اس شعر میں فرمایا ہے کہ ؎

جفائیں سہہ کر دعائیں دینا یہی تھا مجبور دل کا شیوہ
زمانہ گذرا اسی طرح سے تمہارے در پر دلِ حزیں کا

صحبت اہلِ دل کی برکت سے
دل میں اختر ہے کیسی تابانی

بعض حضرات کے ذہنوں میں یہ سوال کھٹکتا رہتا ہے کہ یہ سلسلۂ سلوک کی بیعت جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں ہے اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ایمان کے اوپر بیعت یا جہاد کے اوپر مذکور ہے لیکن اس طرح کسی مسلمان اور مؤمن کو دوسرے اعمال پر بیعت کرنا جیسا کہ مشائخ صوفیاء بیعت کرتے وقت عہد و پیمان کراتے ہیں، یہ حضور سے ثابت نہیں۔ اسی طرح کا دھوکہ بعض عرب علماء کو ہوا اور انہوں نے اس بیعت کے ناجائز ہونے کا حکم لگایا، جبکہ صورتحال ایسی نہیں بلکہ جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اور اسلافِ اُمت سے اس کا ثبوت موجود ہے۔

بیعت لینے کی حقیقت

جیسا کہ حضرت مفتی شفیع صاحب رحمہ اللہ اور حضرت مفتی محمود الحسن گنگوہی رحمہما اللہ کی تحریر سے یہ بات

صاف معلوم ہو جاتی ہے کہ انبیاء علیہم السلام اور ان کے نائب علماء و مشائخ میں بھی جو بیعت لینے کا دستور رہا ہے وہ بھی اسی سنتِ الٰہیہ کا اتباع ہے۔ خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سے معاملات میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بیعت لی جن میں سے ''بیعتِ رضوان'' کا تذکرہ قرآن کریم میں ان الفاظ کے ساتھ موجود ہے: ''لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ'' یعنی اللہ راضی ہو گیا ان لوگوں سے جنہوں نے ایک خاص درخت کے نیچے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ ہجرت سے پہلے انصارِ مدینہ کی بیعتِ عقبہ بھی اسی قسم کے معاہدات میں سے ہے۔

بہت سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ایمان اور عملِ صالح کی پابندی پر بیعت لی۔ صوفیائے کرام میں جو بیعت مروّج ہے وہ بھی ایمان اور عملِ صالح کی پابندی اور گناہوں سے بچنے کے اہتمام کا عہد ہے اور اسی کو سنت اللہ اور سنت الانبیاء کا اتباع ہے۔ اسی وجہ سے اس میں خاص برکات ہیں کہ انسان کو گناہوں سے بچنے اور احکامِ شرعیہ بجالانے کی ہمت اور توفیق بڑھ جاتی ہے۔ بیعت کی حقیقت کے معلوم ہونے سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ جس طرح کی بیعت عام طور پر ناواقف جاہلوں میں رواج پا گئی ہے کہ کسی بزرگ کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دینے ہی کو نجات کے لیے کافی سمجھ بیٹھتے ہیں، یہ سراسر جہالت ہے۔ بیعت ایک معاہدہ کا نام ہے۔ اس کا فائدہ جبھی ہے جب اس معاہدہ کو عملاً پورا کیا جائے ورنہ وبال کا خطرہ ہے۔ (معارف القرآن، جلد:۴، صفحہ:۱۱۲)

کیا بیعت کے بغیر کامل اصلاح نہیں ہو سکتی؟

سوال: کسی بزرگ سے تعلق قائم کیے بغیر کیا براہ راست شریعت پر عمل کر کے کامل اصلاح نہیں ہو سکتی؟

جواب: حامدًا وَّ مصلیًا کسی ولی کامل سے رابطہ قائم کیے بغیر اوّل تو تو عامۃً پوری طرح احکام شریعت پر عمل ہوتا ہی نہیں۔ دوسرے اس میں اخلاص نہیں پیدا ہوتا۔ اسی وجہ سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے پھر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے هَلُمَّ جرًّا رابطہ کیا اور بیعت باطن کے استحکام کے لیے بھی ہوتی تھی اور یہی وجہ ہے کہ ہر زمانہ کے اکابر، علماء رحمہم اللہ اور ان کے خاندان کے علماء کا حال معلوم ہے۔ اخیر دور میں مولانا گنگوہی رحمہ اللہ نے بیعت کی ضرورت سمجھی اور اس بیعت کی بدولت بہت کچھ باطنی منافع حاصل کیے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم (فتاویٰ محمودیہ، باب السلوک، جلد:۱، صفحہ:۱۳۴)

میں نے غم بھی بہت اُٹھائے ہیں

داغِ حسرت سے دل سجائے ہیں
تب کہیں جا کے اُن کو پائے ہیں

قلب میں جب وہ جس کے آئے ہیں
اپنا عالم الگ سجائے ہیں

ان حسینوں سے دل بچانے میں
میں نے غم بھی بہت اُٹھائے

حسنِ فانی کے چکروں میں میر
کتنے لوگوں نے دن گنوائے ہیں

شکل بگڑی تو بھاگ نکلے دوست
جن کو پہلے غزل سنائے ہیں

منزلِ قرب یوں نہیں ملتی
زخمِ حسرت ہزار کھائے ہیں

کام بنتا ہے فضل سے اختر
فضل کا آسرا لگائے ہیں

مشکل الفاظ کے معانی:۔داغِ حسرت: گناہ سے بچنے میں دل پر لگنے والے زخم کا داغ۔**حسنِ فانی:**ختم ہونے والی خوبصورتی۔**منزلِ قرب:**اللہ تعالیٰ کی نزدیکی۔**آسرا:**اُمید۔

داغِ حسرت وخونِ آرزو کا کرشمہ

داغِ حسرت سے دل سجائے ہیں
تب کہیں جا کے اُن کو پائے ہیں

یہ بات ظاہر ہے کہ جب بندہ اللہ تعالیٰ کے کہنے کے مطابق زندگی گزارتا ہے اور اُس کی نافرمانیوں اور گناہوں سے بچتا ہے تو پھر اُسے حسرت وغم تو ہوتی ہی ہے اور اس کے دل پر زور تو ضرور پڑتا ہے کیونکہ حدیثِ پاک کے لحاظ سے جنت کو ایسی چیزوں سے گھیرا ہے جو طبیعت کو ناگوار ہوتی ہے، مگر مؤمن بندہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں ان ناگواریوں اور حسرتوں اور غموں کو اُٹھاتا چلتا ہے جس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ قلب میں حلاوتِ ایمانی عطا فرماتے ہیں۔ جیسا کہ یہ مضمون مختلف اشعار کے ضمن میں تفصیل کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ اسی کو حضرت والا نے یہاں بھی بیان فرمایا کہ میرے دل پر مختلف قسم کی حسرتوں کے داغ لگے ہوئے ہیں جس کی بدولت میں یہ محسوس کر رہا ہوں کہ میں نے اللہ کو پالیا۔ جیسا کہ شاہ محمد احمد پرتا بگڈھی نے فرمایا۔

شکر ہے دردِ دل مستقل ہوگیا
اب تو شاید میرا دل بھی دل ہوگیا

اگر غور سے دیکھا جائے تو تمام مجاہدات وریاضتوں کی حقیقت بس اتنی ہی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لیے ہر قسم کی تکلیف اور غم دل پر سہنا آسان ہوجائے۔ جب اس کی مشق ہوجاتی ہے تو پھر پورے دین پر عمل آسان ہوجاتا ہے اور قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے جہاں بندے کو احکام عطا فرمائے وہیں اپنی کچھ ایسی صفات ذکر فرمائی

ہیں کہ جن سے بندے کے لیے اُن احکام پر عمل کرنا آسان ہوجاتا ہے۔ جیسے جہاں دنیا کی حقیقت کا ذکر فرمایا تو وہیں یہ بھی ذکر فرمادیا کہ میری طرف لوٹ آنے کے بعد آخرت کی نعمتوں کا کیا حال ہے۔ اور جہاں اللہ تعالیٰ نے نامحرم عورت یا بے ریش امرد لڑکے کی طرف دیکھنے کو منع فرمایا ہے وہیں قرآن وحدیث میں یہ بھی بتادیا گیا کہ میں تمہاری آنکھوں کی خیانت کو جانتا ہوں اور تم جو کچھ کررہے ہو سب میں دیکھنے والا ہوں۔ اور کہیں یوں ارشاد فرمایا کہ تمہارا رب گھات میں ہے۔ غرض یہ کہ ان سب مضامین سے سب حکموں پر عمل کرنا آسان ہوگیا۔ حضرت والا نے اس مضمون کو اپنے ایک شعر میں اس طرح ذکر فرمایا۔

سارے عالم میں یہی ہے اختؔر کی آہ و فغاں
چند دن خونِ تمنا سے خدا مل جائے ہے

مہمان کے مناسب مکان کا انتظام

قلب میں جب وہ جس کے آئے ہیں
اپنا عالم الگ سجائے ہیں

یہ بات ہر آدمی جانتا ہے کہ جس شخص کا مہمان جس درجے رتبے کا اور جس شان اور مقام کا ہوتا ہے اُسی کے لحاظ سے میزبان اپنے گھر کو صاف ستھرا اور آراستہ و پیراستہ کرتا ہے اور اچھی طرح اُس کو بناتا اور سنوارتا ہے تو چونکہ دل اللہ تعالیٰ کا گھر ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ اُس دل میں آنے سے پہلے اُسے اپنی شان کے مطابق خوب عمدہ اور صاف ستھرا فرماتے ہیں کہ اُس کے اندر کسی غیر کا نام ونشان بھی باقی نہ رہے۔ مال ودولت کی محبت ہو یا جاہ ومنصب کی، اہل وعیال اور خاندان کا تعلق ہو یا اپنے عمدہ بنگلوں اور بہترین تجارتوں سے وابستگی ہو سب چیزوں سے دل کو صاف کردیا جاتا ہے اور جب اللہ تعالیٰ یہ دیکھ لیتے ہیں کہ اس دل سے ہر غیر نکل چکا ہے تو پھر اُس دل کے مہمان بنتے ہیں۔ اور اس کی دلیل کلمۂ لا الٰہ میں موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ نے الا اللہ سے پہلے لا الٰہ کو رکھا ہے جس سے اس طرف اشارہ مقصود ہے کہ پہلے ہر غیر کو دل سے نکال دو پھر اللہ تعالیٰ کا وصول ممکن ہے۔

حضرت والا کے بعض مواعظ میں ہے کہ ایک عام آدمی سے کسی بادشاہ کی دوستی تھی۔ اُس نے ایک دن عام آدمی سے کہا کہ ہم تمہارے یہاں آئیں گے۔ تو وہ شرم کے مارے کہنے لگا کہ میرا گھر تو اس قابل نہیں ہے کہ بادشاہ کی سواری اُس میں داخل ہوسکے۔ اس پر بادشاہ نے اُس سے یوں کہا کہ تم جانتے نہیں ہو کہ بادشاہ جب کہیں جاتے ہیں پہلے اُس گھر کو اس قابل بناتے ہیں، اس لیے پہلے ہم اُسے اس قابل بنائیں گے پھر ہم اُس طرف آئیں گے۔ سو اللہ تعالیٰ کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔ جب اللہ کسی دل میں متجلی ہوتے ہیں تو پہلے اُسے اس قابل بناتے ہیں اور پھر وہاں جلوہ فرما ہوجاتے ہیں۔ اسی کو حضرت نے فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ کسی دل میں آتے ہیں تو وہاں وہ اپنا الگ عالَم سجاتے ہیں۔

شریعت کی پابندیوں سے کوئی باہر نہیں ہے

ان حسینوں سے دل بچانے میں
میں نے غم بھی بہت اُٹھائے

اگر غیر محرم سے نظر کا بچانا عظیم الشان عمل نہ ہوتا اور اللہ کی نگاہ میں بہت زیادہ قیمتی نہ ہوتا تو اس عمل کی وجہ سے قرآن میں جنت کا وعدہ نہ کیا جاتا۔ جب کہ غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ قرآن یہ اعلان کررہا ہے تم نظر بچاؤ تو تمہاری شرمگاہیں محفوظ رہیں گی جس کی بدولت قلب کی طہارت و تزکیہ حاصل ہوگا۔ اور جو قلب مزکی و مجلی ہو اُس کے لیے جنت میں دخول کا وعدہ ہے۔

اور چونکہ دل پورے بدن کا بادشاہ ہے اس لیے اگر کسی کی محبت دل کے اندر سرایت کر جائے تو سارے بدن کے اعضاء پھر اُس کے کہنے کے مطابق اُس کی خدمت کے لیے گھومتے پھرتے ہیں لہٰذا مؤمن بندے کو چاہیے کہ جن راہوں سے دل پر شیطان کا حملہ ہوسکتا ہے اُن پر پہرہ بٹھا دے اور اُنہیں محفوظ کر لے۔ مثلاً آنکھیں اور زبان اور کان اور ان میں بھی سب سے زیادہ سخت آنکھ ہے۔ اس لیے کہ ایک روایت میں جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نظر کو شیطان کا زہریلا تیر قرار دیا ہے۔ جو نظر بچالے گا اُس کی برکت سے ان شاء اللہ اُس کا دل محفوظ رہے گا۔ اگرچہ یہ بات تو اپنی جگہ مسلّم ہے کہ اس عمل میں طبیعت میں بہت زیادہ زور پڑتا ہے، بالخصوص جبکہ سامنے کوئی حسین یا حسینہ گزر رہی ہو تو دل اُس کو دیکھنے کے لیے بے تاب ہوتا ہے لہٰذا ایسے وقت میں اپنے دل کو بچالینا بہت بڑا مجاہدہ اور دشواری کا کام ہے۔ لیکن اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے انعام بھی بہت کچھ مقرر فرمایا۔ حدیثِ پاک کے الفاظ ہیں یَجِدُ حَلاَوَةَ الْاِیْمَانِ ایسے آدمی کو ایمان کی حلاوت مل جاتی ہے۔ اس لیے حضرت فرماتے ہیں کہ ان حسینوں سے دل کو بچانے کے لیے مجھے غم تو بہت اُٹھانے پڑے لیکن میں نے فیصلہ کر لیا کہ چاہے جان چلی جائے لیکن اپنے اللہ کو ایک لمحہ ناراض نہیں کروں گا۔

کبھی کسی کے ذہن میں یہ بات گزر سکتی کہ اللہ والوں کے لیے یہ کیا مشکل ہے۔ اُن کو تو عورتوں کی طرف دیکھنے کی کوئی رغبت یا خواہش نہیں ہوتی ہوگی کیونکہ وہ تو بزرگ اور اللہ والے ہوتے ہیں اور گویا اُن کی دنیا تو بالکل ہی الگ ہوتی ہے جس میں وہ ہر وقت مست رہتے ہیں، مگر یہ سوچ درست اور صحیح نہیں اور ایسا خیال کرنا بالکل بے بنیاد اور غلط ہے کیونکہ کوئی انسان اپنی بشری فطرت سے جدا نہیں ہوسکتا۔

قرآن پاک میں بھی یہ نہیں فرمایا گیا کہ جو انسان اپنے کو خواہشات سے علیحدہ کردے گا اور اُن کا بالکل ازالہ کردے گا تو اُس کو جنت ملے گی بلکہ یہ فرمایا ہے کہ نفس کو خواہشات کے مقتضیٰ پر عمل سے روک دے یعنی اللہ تعالیٰ کا خوف اتنا غالب آجائے کہ جب نفس شرارتوں اور خباثتوں کی طرف چلے تو فوراً اُس پر بریک لگادے۔

﴿وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰىo فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰىo﴾

(سورۃ النازعات، آیت: ۴۱-۴۰)

ترجمہ: اور جو کوئی ڈرا ہو اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے سے اور روکا ہو اس نے جی کو خوش کرنے سے سو بہشت ہی ہے اس کا ٹھکانہ۔ (معارف القرآن، جلد: ۸، صفحہ: ٦٦١)

اس لیے ابن قیم رحمہ اللہ نے ایک مقام پر لکھا ہے اِنَّ شَهْوَةَ الْمُتَّقِي اَشَدُّ کہ متقی اور نیک لوگوں کی شہوت دوسروں کے مقابلے میں زیادہ ہوتی ہے کیونکہ وہ شہوت رانی میں حرام طریقے میں مبتلا نہیں رہتے بلکہ جائز مقام کے لیے اُس کو محفوظ رکھتے ہیں۔

اس لیے بعض بیچارے بھولے بھالے ذرا تصوف کے راستے میں چل کر صوفی بن جاتے ہیں اور سمجھتے ہیں مجھے زیادہ احتیاط کی ضرورت نہیں ہے یا بعض دوسرے لوگ خیال کرتے ہیں کہ گو ہماری بچی جوان ہو چکی ہے لیکن ہمارے گھر پر آئے ہوئے مہمان تو بزرگ ہیں اُن سے پردے کی ضرورت نہیں۔ یہ بات سراسر بے دینی ہے اور بدفہمی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے حضرت والا اُن تمام متعلقین کو جو تعویذات اور عملیات کے کاموں میں لگے ہیں ان چیزوں سے خاص طور سے بہت زیادہ روکتے اور تنبیہ فرماتے ہیں، یہاں تک کہ اب تو حضرت والا نے اس عملیات کے فن میں اشتغال ہی کو مطلقاً منع فرمادیا، کیونکہ حضرت تھانوی کا ارشاد ہے کہ اس فن میں لگنے سے نسبت مع اللہ باقی نہیں رہتی ہے۔ اس لیے حضرت والا اس سے مطلقاً منع فرمارہے ہیں۔

عشقِ مجازی ایک وبائی مہلک بیماری ہے

حسنِ فانی کے چکروں میں میر
کتنے لوگوں نے دن گنوائے ہیں
شکل بگڑی تو بھاگ نکلے دوست
جن کو پہلے غزل سنائے ہیں

حضرت والا آج کے دور میں جوانوں کے اوپر گزرنے والے اُن حالات کا نقشہ کھینچ رہے ہیں کہ جو گھر گھر کا شکوہ اور شکایت ہے اور نوے پچانوے فیصد خطوط خانقاہوں میں اسی بیماری میں مبتلا لوگوں کے آتے ہیں کہ جنہوں نے حسنِ فانی کے چکروں میں پڑ کر اپنی زندگی کے قیمتی دن گنوا ڈالے۔ اور جب وہ شکل وصورت کے نقشے بگڑے تو پھر یہ حسن پرستی اپنے اصل رنگ کی طرف لوٹ آئی اور جن پر جان دینے کے دعوے کیے جاتے تھے اب اُن کی صورت دیکھنا بھی گوارا نہیں رہی اور جن کو ہر وقت غزل سنائی جاتی تھی اب ان کے قریب جانا بھی منظور نہیں۔ ان اشعار میں ایک خاص سبق اور عبرت ہے کہ جب یہ شکل بدلنے اور بگڑنے والی ہے تو پھر ان کو اپنا دل دینا یہ کتنی

بڑی ناعاقبت اندیشی ہے۔

خود احقر کے علم میں ایسے بے شمار واقعات ہیں جو لوگوں نے اپنے خطوط کے ذریعے بتائے کہ انہوں نے کس طرح سے اپنی جوانی کو ان چکروں میں پڑ کر تباہ و برباد کر دیا۔ بالآخر نتیجہ سوائے افسوس و حسرت کے اور کچھ بھی نہ تھا۔ جیسا کہ احقر کو ایک واقعہ یاد آیا کہ احقر رشتہ داروں میں سے ایک ڈاکٹر ہیں جو سرکاری ہسپتال میں جنوبی افریقہ میں کام کر رہے تھے تو اُن کے پاس ایک ایسا پیشنٹ (Patient) آیا جس نے کانچ کی بوتل کو شراب سمیت توڑ کر چورا کر کے پی لیا تھا۔ جب ڈاکٹر صاحب نے اُن سے صورت حال پوچھی اور اُن سے وجوہات معلوم کی تو انہوں نے یہ بتلایا کہ آج وعدے پر میری گرل فرینڈ (Girl Friend) نہیں پہنچی اور جب میں نے تحقیق کی تو پتہ چلا وہ کسی دوسرے کے ساتھ چلی گئی ہے۔ مجھے یہ خبر ملتے ہی میں پاگلوں کی طرح ہو گیا اور مجھ سے یہ خبر برداشت نہ ہوئی جس کے نتیجے میں میں نے وہ شراب جو مجھے اور گرل فرینڈ (Girl Friend) دونوں کو پینی تھی اُس کو اُس کی بوتل سمیت چورا کر کے اس لیے پینا گوارا کیا کہ مجھ سے یہ غم برداشت نہیں ہو رہا تھا، اس لیے میں خودکشی کر لینا چاہتا تھا، مگر اب اُس کی حالت اس قدر چیخ و پکار کی تھی کہ دیکھنے والے سے دیکھا نہ جائے اور سننے والے سے سنی نہ جائے۔ اس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان چکروں میں پڑ کر جوانوں نے کتنی جوانیاں اور زندگی کے کتنی قیمتی فرصتیں ضائع کر ڈالیں۔

حرام آرزوؤں سے وہ نہیں ملتے

منزلِ قرب یوں نہیں ملتی
زخمِ حسرت ہزار کھائے ہیں

یعنی اللہ تعالیٰ کو پانے اور اس کا قربِ خاص حاصل کرنے کے لیے اُس کے راستے کے غم اور تکلیفیں تو اُٹھانی ہی پڑتی ہیں۔ گویا اس شعر میں اُن لوگوں کے لیے علاج بتایا جا رہا ہے جو اپنی زندگیوں کو حرام کاریوں میں گنوا رہے ہیں اور بے کار و بے فائدہ کاموں میں ضائع کر رہے ہیں کہ تم اگر اس حالت سے نکل کر اللہ تعالیٰ کے قریب لگنا چاہتے ہو تو یہ آرزوؤں اور تمناؤں سے نہیں ہوگا اس کے لیے کچھ تکلیف اور غم اُٹھانا پڑے گا۔

آرزوؤں سے وہ نہیں ملتے
شرط ہے خونِ آرزو پینا

لہٰذا صرف تمناؤں اور آرزوؤں سے اللہ تعالیٰ مل جائیں اور اُس کے لیے خونِ حسرت نہ پینا پڑے یہ ممکن نہیں ہے۔ اس لیے حضرت والا نے وضاحت کے ساتھ یہ بات فرمادی کہ اللہ کے راستے کے شیر بنو اور نفس کی خواہشات اور تقاضوں پر شیر کی طرح دلیرانہ حملہ کرو، پھر یہ راستہ طے ہوگا۔ اور اللہ کے قرب کی دولت کے مل جانے کا خواب ان شاء اللہ شرمندۂ تعبیر ہو جائے گا۔

بخشش صرف فضلِ خداوندی سے ہوگی

کام بنتا ہے فضل سے اختر
فضل کا آسرا لگائے ہیں

کوئی بھی انسان خواہ کتنا ہی بڑا ولی اللہ اور کیسا ہی مجاہدے اور ریاضتیں کیے ہوئے ہو، اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں بخشش کا معاملہ صرف اُس کے فضل و کرم سے ہوگا۔ لہٰذا نہ تو کسی گنہگار کو مایوس ہونا چاہیے اور نہ کسی نیکوکار کو اپنی نیکیوں پر گھمنڈ اور تکبر ہونا چاہیے، بلکہ ہر وقت ڈرتا رہے کہ پتہ نہیں اللہ کا فضل شاملِ حال ہو یا نہ ہو۔

چنانچہ جب حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمہ اللہ کسی آنے والے شخص کو بیعت کی درخواست کرنے پر سلسلے میں داخل فرماتے تو ارشاد فرماتے کہ میں اس نیت سے بیعت کرلیتا ہوں کہ کل قیامت کے دن اگر اس پر اللہ تعالیٰ کا فضل ہوا تو اُس کی برکت سے میں بھی بخش دیا جاؤں اور اگر مجھ پر فضل ہوا تو چونکہ شیخ سے محبت ہوتی ہے اور اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ (آدمی کا حشر اُن کے ساتھ ہوگا جس سے اُس کو محبت ہو) کے اصول اور ضابطے کے مطابق مرید کو اپنے شیخ سے محبت ہونے کی وجہ سے اُس پر بھی فضل ہوجائے۔

اس پر احقر کو ایک بات یاد آئی جو آج ہی حضرت مولانا محمد مظہر صاحب دامت برکاتہم نے عصر کے بعد بائیسویں روزے کو ختم بیان کے دوران سنائی۔ نواب چھتاری صاحب جو علیگڑھ میں رہتے تھے اُن کے ایک بھائی تھے جو کافی بڑے دیندار تھے۔ لیکن ایک زمانے میں اُن کے اوپر خوف کا اتنا غلبہ ہوا کہ اُن کو ہر وقت یہ لگنے لگا کہ میری بخشش نہیں ہوگی۔ یہاں تک کہ یہ حالات اتنے شدت اختیار کر گئے کہ نماز تک پڑھنا اُن کے لیے مشکل ہوگیا۔ نیت باندھتے ہی پھر سے نیت توڑ دیتے تھے اور دل میں قوت سے یہ خیال آتا تھا کہ میری نماز مقبول نہیں ہے۔ اپنے وقت کے بہت سے بڑے بڑے علماء سے ملتے رہے لیکن دل کو تسلی نہیں ہوتی تھی۔ بالآخر بابا نجم الحسن جو حضرت تھانوی کے مجازِ صحبت تھے اور شاعر تھے، اُن سے ان کی ملاقات ہوئی تو انہوں نے اتنی بات کہی کہ کسی کی بھی بخشش اُس کے عمل سے نہیں ہوگی بلکہ اللہ کی رحمت سے ہوگی اور پھر یہ فرمایا کہ جب بھی شیطان تمہارے پاس آکر اس طرح کے وسوسے ڈالے تو تم یہ شعر پڑھ لیا کرو۔

مجھے اُس کریمِ مطلق کے کرم کا آسرا ہے
ارے او گناہ کے بچے مجھے کیوں ڈرا رہا ہے
جنتیں مل گئی ہیں آہوں کی
ایسی تیسی میرے گناہوں کی

چنانچہ اُن کے اس جواب کے بعد اور یہ اشعار سننے کے بعد ایسا اللہ کا فضل ہوا کہ اُن کے وہ سارے

وساوس اور خیالات دور ہو گئے اور بہت اچھی زندگی گزارنے کے بعد ایمان پر خاتمہ والی عبادت کرتے ہوئے موت نصیب ہوئی۔ حدیث پاک میں ہے کہ:

﴿عَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يُدْخِلُ اَحَدًا مِنْكُمْ عَمَلُهُ الْجَنَّةَ وَلَا يُجِيْرُهُ مِنَ النَّارِ وَلَا اَنَا اِلَّا بِرَحْمَةِ اللّٰهِ رَوَاهُ مُسْلِمٌ وَفِيْ رِوَايَةٍ لَنْ يُّنْجِيَ اَحَدًا مِنْكُمْ عَمَلُهُ قَالُوْا وَلَا اَنْتَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ وَلَا اَنَا اِلَّا اَنْ يَّتَغَمَّدَنِيَ اللّٰهُ مِنْهُ بِرَحْمَتِهٖ﴾

(مشكوة المصابيح: ص. ۲۰۷)

یعنی کسی کی بھی بخشش اور جنت میں داخلہ اُس کے عمل سے نہیں ہوگا بلکہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ہوگا حتیٰ کہ جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اپنے متعلق یہ بات ارشاد فرماتے ہیں کہ میری بخشش بھی اللہ کے رحم وکرم سے ہوگی۔ اس لیے خواہ کوئی کتنا ہی بڑا ولی ہو جائے وہ یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ میرے اعمال اتنے اونچے ہیں کہ میں اُن کی وجہ سے جنت میں جاؤں گا۔

ہاں بے شک یہ ایک دوسری بات ہے کہ اللہ کا فضل جنت میں لے کر تو جائے گا مگر اللہ کا فضل اعمالِ صالحہ والوں پر ہی ہوگا کیونکہ قرآن میں اس کا اعلان کر دیا گیا کہ اللہ کی رحمت نیکوکاروں کے قریب ہوتی ہے لہٰذا اس سے گمراہ لوگ استدلال نہ کریں کہ پھر ہمیں اعمالِ صالحہ کی کوئی ضرورت نہیں۔

اُڑ گیا رنگ حسنِ فانی کا

جن کا نقشہ تھا کل جوانی کا ہے لقب آج نانا نانی کا
کیسا دیکھا تھا ہوگئے کیسے کیا بھروسہ ہے اس جوانی کا
مل گئے خاکِ قبر میں کتنے ناز تھا جن کو زندگانی کا
یہ جہاں گر گیا نگاہوں سے جب کھلا حال دارِ فانی کا
میرؔ اب دل کو کس سے بہلائے اُڑ گیا رنگ حسنِ فانی کا
دل لگا بس خدا سے اے ظالم خوف کر موت ناگہانی کا
شیخِ کامل کے فیض سے دل ہے حاملِ کیفِ جاودانی کا
خاکِ تن کو عطا ہوا ان کا غم ہے صلہ ان کی مہربانی کا
حال دیکھو تو اللہ والوں پر مستیِ خمرِ آسمانی کا
سن لو قصہ زبانِ اخترؔ سے اس کے دل کے غم نہانی کا

مشکل الفاظ کے معانی:۔ **زندگانی**: زندگی۔ **دارِ فانی**: ختم ہونے والا گھر یعنی دنیا۔ **ناگھانی**: اچانک۔ **کیفِ جاودانی**: ہمیشہ کا مزا۔ **صلہ**: انعام۔ **خمرِ آسمانی**: آسمان سے اتری ہوئی شراب یعنی اللہ تعالیٰ کی محبت کی شراب۔ **غمِ پنہانی**: دل ہی دل میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے بچنے کا غم اٹھانا۔

ناز و انداز والوں کا رنگ اڑ گیا

جن کا نقشہ تھا کل جوانی کا
ہے لقب آج نانا نانی کا
کیسا دیکھا تھا ہوگئے کیسے
کیا بھروسہ ہے اس جوانی کا
مل گئے خاکِ قبر میں کتنے
ناز تھا جن کو زندگانی کا
یہ جہاں گر گیا نگاہوں سے
جب کھلا حال دارِ فانی کا
میر اب دل کو کس سے بہلائے
اُڑ گیا رنگ حسنِ فانی کا

ان تمام اشعار میں حضرت والا دامت برکاتہم نے دنیا کی فنائیت اور اُس کے نقش و نگار کا عارضی اور اس کے زیب و زینت کا ناپائیدار ہونا ذکر کیا ہے۔ آج جو کھلا ہوا چمن نظر آ رہا ہے کل کو وہی خزاں کے عالَم میں مرجھایا ہوا کھڑا ہے اور جہاں آج باغ و بہار ہے کل کو وہی ننگِ خزاں بنا ہوا ہوگا۔ اور جو نقشے جوانی لیے ہوئے بڑے خوبصورت دکھائی دے رہے تھے آج بڑھاپے کے وقت میں وہ نانا نانی کہلا کر کسی عاشق کے لیے دیکھنے کے قابل بھی نظر نہیں آ رہے ہیں۔

اور یہ سلوک میں قدمِ اوّل ہے کہ یہ عالَم اور اس کی چیزوں کی محبتیں دل سے باہر ہو جائیں اور اِس دارِ دنیا اور دارِ فانی کی حقیقت ہر وقت نظر کے سامنے مستحضر ہو جائے تو پھر انسان اس کے دھوکوں میں اُلجھ نہیں سکتا اور اس کی رنگ رلیوں پر اپنا دل دے نہیں سکتا۔ ہمارا اللہ کس قدر مہربان ہے کہ اس دنیا کا لقب دارالغرور اور متاع الغرور فرمایا ہے۔ یعنی یہ دنیا دھوکے کا گھر اور دھوکے کی ایسی چیز ہے جو محض استعمال کرنے کے قابل ہے دل میں جگہ دینے کے قابل نہیں۔ جس طرح کشتی میں بیٹھے ہوئے لوگوں کے لیے پانی ضرورت کے درجے میں استعمال کی ضرورت تو ہوتا ہے لیکن اندرونِ کشتی سے پانی کا کوئی ربط وضبط نہیں ہوتا۔ تو بس دنیا کی حیثیت اس سے آگے اور کچھ نہیں۔ روئے زمین پر بسنے والے تمام اہل اللہ دنیا کو اسی نظر سے دیکھتے ہیں۔

چنانچہ حضرت مفتی شفیع صاحب نے معارف القرآن میں ایک مقام پر لکھا ہے کہ ایک اللہ والے کہیں سے گزر رہے تھے تو راستے میں اُن کو کوئی بیٹھا ہوا نظر آیا۔ جس کی ایک جانب کوڑا کرکٹ وغیرہ پڑا ہوا تھا اور دوسری جانب قبرستان تھا۔ تو انہوں نے اس کو مخاطب کر کے کہا کہ تم دو خزانوں کے درمیان بیٹھے ہو۔ ایک طرف تو انسانوں کا خزانہ اور ایک طرف مال و دولت کا خزانہ ہے۔ انسانوں کا انجام قبرستان ہے سو یہ انسانوں کا خزانہ ہے اور مال و دولت کا انجام کوڑا کرکٹ کا ڈھیر ہے سو یہ دولت کا خزانہ ہے۔

اڑ گیا رنگ حسنِ فانی کا

یہ رنگ تو اڑنا ہی ہے باقی رہنے والی صرف اللہ کی ذات ہے اگر ہم اللہ کی ذات پر فدا ہوں تو جس دن ہمارا آخری سانس ہوگا وہ اللہ اس دن بھی ساتھ ہوگا، وہ اللہ قبر میں بھی ساتھ ہوگا وہ اللہ میدان محشر میں بھی ساتھ ہوگا وہ اللہ جنت میں بھی ساتھ ہوگا تو کتنی حماقت کی بات ہے کہ مٹنے والوں، مرنے والوں، گلنے سڑنے والوں پر ہم اپنا دل دے کر اپنی زندگی کو تباہ کرلیں ؎

جن کا نقشہ تھا کل جوانی کا
ہے لقب آج نانا نانی کا

حضرت والا توجہ دلا رہے ہیں کہ جن کی خوبصورتی اور چہرے کی رونق اور آب و تاب پر آج تم دل دے

رہے ہو ذرا سوچ لو تصور کر لو کہ کل کو جب یہ بڈھے بڈھی ہو جائیں گے تو پھر کیا عالم ہوگا اپنے ماضی پر پچھتاؤ گے اور بیٹھ کر یہ کہو گے ہائے میں نے کیا کیا، میں نے کتنا غلط کام کیا، کس کے اوپر میں نے اپنا دل دیا؟ ایک دوسرے سے ملتے ہوئے شرم کرو گے۔ کیونکہ دنیا اور اُس کی ہر چیز فنا ہونے والی ہے اور دھوکہ ہی دھوکہ ہے۔

دنیا کی لذتیں دھوکہ ہیں

جیسا کہ قرآن دنیا کی حقیقت کو یوں بیان کرتا ہے:

﴿اعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّزِيْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌۢ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ كَمَثَلِ غَيْثٍ اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُوْنُ حُطَامًا وَفِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيْدٌ وَّمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٌ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ﴾

(سورۃ الحدید، آیت: ۲۰)

ترجمہ: تم خوب جان لو کہ (آخرت کے مقابلہ میں) دنیوی حیات (ہرگز قابل اشتغال چیز نہیں کیونکہ) وہ محض لہو لعب اور (ایک ظاہری) زینت اور باہم ایک دوسرے سے اپنے کو زیادہ بتلانا ہے (یعنی مقاصد دنیوی ہنر و کمال میں) اور اموال اور اولاد میں ایک کا دوسرے سے اپنے کو زیادہ جتلانا ہے (یعنی مقاصد دنیا کے یہ ہیں کہ بچپن میں لہولعب کا غلبہ رہتا ہے اور جوانی میں زینت و تفاخر کا اور بڑھاپے میں مال و دولت، آل و اولاد کو گنوانا اور یہ سب مقاصد فانی اور خواب و خیال محض ہیں جس کی مثال ایسی ہے جیسے مینھ (برستا) ہے کہ اس کی پیداوار (کھیتی) کاشت کار کو اچھی معلوم ہوتی ہے پھر وہ (کھیتی) خشک ہو جاتی ہے سو اس کو تو زرد دیکھتا ہے پھر وہ چورا چورا ہو جاتی ہے (اسی طرح دنیا چندروزہ بہار ہے پھر زوال و اضمحلال، یہ تو دنیا کی حالت ہوتی اور آخرت (کی کیفیت یہ ہے کہ اس) میں (دو چیزیں ہیں ایک تو کفار کے لیے) عذاب شدید ہے (اور دوسری اہل ایمان کے لیے) خدا کی طرف سے مغفرت اور رضا مندی ہے (اور یہ دونوں باقی ہیں، پس آخرت تو باقی ہے) اور دنیوی زندگانی محض (فانی ہے، جیسے فرض کرو کہ دھوکہ) کا اسبب ہے۔ ان آیات میں دنیائے فانی کا نا قابلِ اعتماد ہونا بیان کیا گیا ہے۔

پہلے ابتداء عمر سے آخر تک جو کچھ دنیا میں ہوتا، اور جس میں دنیا دار منہمک و مشغول اور اس پر خوش رہتے ہیں اس کا بیان ترتیب کے ساتھ یہ ہے کہ دنیا کی زندگی کا خلاصہ بترتیب چند چیزیں اور چند حالات ہیں، پہلے لعب پھر لہو پھر زینت پھر تفاخر پھر مال و اولاد کی کثرت پر ناز و فخر، لعب وہ کھیل ہے جس میں فائدہ مطلق پیش نظر نہ ہو، جیسے بہت چھوٹے بچوں کی حرکتیں، اور لہو وہ کھیل ہے جس کا اصل مقصد تو تفریح اور دل بہلانا اور وقت گزاری کا مشغلہ ہوتا ہے ضمنی طور پر کوئی ورزش یا دوسرا فائدہ بھی اس میں حاصل ہو جاتا ہے جیسے بڑے بچوں کے کھیل، گیند شناوری یا نشانہ بازی وغیرہ حدیث میں نشانہ بازی اور تیرنے کی مشق کو اچھا کھیل فرمایا ہے، زینت بدن اور لباس

وغیرہ کی معروف ہے، ہر انسان اس دور سے گزرتا ہے، اس کے بعد اس کو اپنے تن بدن اور لباس کی زینت کی فکر ہونے لگتی ہے اس کے بعد ہمعصروں ہم عمروں سے آگے بڑھنے اور ان پر فخر جتلانے کا داعیہ پیدا ہوتا ہے۔

اور انسان پر جتنے دور اس ترتیب سے آتے ہیں غور کرو تو ہر دور میں وہ اپنے اسی حال پر قانع اور اسی کو سب سے بہتر جانتا ہے، جب ایک دور سے دوسرے کی طرف منتقل ہو جاتا ہے تو سابقہ دور کی کمزوری اور لغویت سامنے آجاتی ہے، بچے ابتدائی دور میں جن کھیلوں کو اپنا سرمایہ زندگی اور سب سے بڑی دولت جانتے ہیں کوئی ان سے چھین لے تو ان کو ایسا ہی صدمہ ہوتا ہے جیسا کہ کسی بڑے آدمی کا مال واسباب اور کوٹھی بنگلہ چھین لیا جائے، لیکن اس دور سے آگے بڑھنے کے بعد اس کی حقیقت معلوم ہو جاتی ہے کہ جن چیزوں کو ہم نے اس وقت مقصود زندگی بنایا ہوا تھا وہ کچھ نہ تھیں، سب خرافات تھیں، بچپن میں لعب، پھر لہو میں مشغولیت رہی جوانی میں زینت اور تفاخر کا مشغلہ ایک مقصد بنا رہا بڑھاپا آیا، اب مشغلہ فی الاموال والاولاد کا ہو گیا، کہ اپنے مال و دولت کے اعداد و شمار اور اولاد و نسل کی زیادتی پر خوش ہوتا رہے ان کو گنتا رہے، مگر جیسے جوانی کے زمانے میں بچپن کی حرکتیں لغو معلوم ہونے لگی تھیں بڑھاپے میں پہنچ کر جوانی کی حرکتیں لغو و نا قابل التفات نظر آنے لگیں، اب بڑے میاں کی آخری منزل بڑھاپا ہے اس میں مال کی بہتات اولاد کی کثرت وقوت اور ان کے جاہ و منصب پر فخر سرمایہ زندگی اور مقصود اعظم بنا ہوا ہے، قرآن کریم کہتا ہے کہ یہ حال بھی گزر جانے والا ہے اور فانی ہے اگلا دور برزخ پھر قیامت کا ہے اس کی فکر کرو وہی اصل ہے، قرآن کریم نے اس ترتیب کے ساتھ ان سب مشاغل و مقاصد دنیویہ کا زوال پذیر ناقص، نا قابل اعتماد ہونا بیان فرمادیا اور آگے اس کو ایک کھیتی کی مثال سے واضح فرمایا کَمَثَلِ غَيْثٍ أَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهُ ثُمَّ يَهِيجُ فَتَرَاهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُونُ حُطَامًا غیث کے معنی بارش کے ہیں، اور لفظ کفار جو مومنین کے مقابلہ میں آتا ہے اسکے یہ معنی تو معروف و مشہور ہی ہیں، اس کے ایک دوسرے لغوی معنی کا شتکار کے بھی آتے ہیں اس آیت میں بعض حضرات نے یہی معنی مراد لیے ہیں اور مطلب آیت کا یہ قرار دیا ہے کہ جس طرح بارش سے کھیتی اور طرح طرح کی نباتات اُگتی ہیں اور جب وہ ہری بھری ہوتی ہیں تو کاشتکار ان سے خوش ہوتا ہے۔

اور بعض دوسرے حضرات مفسرین نے لفظ کفار کو اس جگہ بھی معروف معنی میں لیا ہے کہ کافر لوگ اس سے خوش ہوتے ہیں اس پر جو یہ اشکال ہے کہ ہری بھری کھیتی دیکھ کر خوش ہونا تو کافر کے ساتھ مخصوص نہیں، مسلمان بھی اس سے خوش ہوتا ہے، اس کا جواب حضرات مفسرین نے یہ دیا ہے کہ مومن کی خوشی اور کافر کی خوشی میں بڑا فرق ہے مؤمن جو ہوتا ہے تو اس کی فکر کا رضاء حق تعالیٰ کی طرف پھر جاتا ہے وہ یقین کرتا ہے کہ یہ سب کچھ اس کی قدرت و حکمت اور رحمت کا نتیجہ ہے وہ اس چیز کو زندگی کا مقصود نہیں بناتا پھر اس خوشی کے ساتھ اس کو آخرت کی فکر بھی ہر وقت لگی رہتی ہے اس لیے جو مومن ایمان کے تقاضے کو پورا کرتا ہے دنیا کی بڑی سے بڑی دولت پر بھی وہ ایسا خوش

اور مگن اور مست نہیں ہوتا جیسا کافر ہوتا ہے اس لیے یہاں خوشی کا اظہار کفار کی طرف منسوب ہے۔

آ گے اس مثال کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ کھیتی اور دوسری نباتات پھول پھلواریاں جب ہری بھری ہوتی ہیں سب دیکھنے والے خصوصاً کفار بڑے خوش اور مگن نظر آتے ہیں، مگر آخر کار پھر وہ خشک ہونا شروع ہوتی ہے، پہلے زرد پڑ جاتی ہے پھر بالکل خشک ہوکر چورا چورا ہو جاتی ہے یہی مثال انسان کی ہے کہ شروع میں تر و تازہ حسین خوب صورت ہوتا ہے بچپن سے جوانی تک کے مراحل اسی حال میں طے کرتا ہے مگر آخر کار بڑھاپا آ جاتا ہے جو آہستہ آہستہ بدن کی تازگی و حسن و جمال سب ختم کر دیتا ہے اور بالآخر مر کر مٹی ہو جاتا ہے دنیا کی بے ثباتی اور زوال پذیر ہونے کا بیان فرمانے کے بعد پھر اصل مقصود آخرت کی فکر کی طرف توجہ دلانے کے لیے آخرت کے حال کا ذکر فرمایا۔ وَفِی الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ شَدِیْدٌ وَّمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٌ یعنی آخرت میں انسان دو حالوں میں سے کسی ایک میں ضرور پہنچے گا، ایک حال کفار کا ہے ان کے لیے عذاب شدید ہے، دوسرا حال مومنین کا ہے ان کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مغفرت اور رحمت ہے

یہاں عذاب کا ذکر پہلے کیا گیا کیونکہ دنیا میں مست و مغرور ہونا جو پہلی آیات میں مذکور ہے اس کا نتیجہ بھی عذاب شدید ہے اور عذاب شدید کے مقابلہ میں دو چیزیں ارشاد فرمائیں، مغفرت اور رضوان، جس میں اشارہ ہے کہ گناہوں اور خطاؤں کی معافی ایک نعمت ہے جس کے نتیجہ میں آدمی عذاب سے بچ جاتا ہے مگر یہاں صرف اتنا ہی نہیں بلکہ عذاب سے بچ کر پھر جنت کی دائمی نعمتوں سے بھی سرفراز ہوتا ہے جس کا سبب رضوان یعنی حق تعالیٰ کی خوشنودی ہے،

اس کے بعد دنیا کی حقیقت کو ان مختصر الفاظ میں بیان فرمایا وَمَا الْحَیٰوةُ الدُّنْیَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ یعنی ان سب باتوں کو دیکھنے سمجھنے کے بعد ایک عاقل و بصیر انسان کے لیے اس کے سوا کوئی نتیجہ دنیا کے بارے میں نہیں رہ سکتا، کہ وہ ایک دھوکہ کا سرمایہ ہے اصلی سرمایہ نہیں جو آڑے وقت میں کام آ سکے، پھر آخرت کے عذاب و ثواب اور دنیا کی بے ثباتی بیان فرمانے کا لازمی اثر یہ ہونا چاہیے کہ انسان دنیا کی لذتوں میں منہمک نہ ہو آخرت کی نعمتوں کی فکر زیادہ کرے۔ (معارف القرآن، ج:۸، ص:۳۱۲)

اگر غفلت و امید نہ ہوتیں تو دنیا ویران خانہ بن جاتی

میں آج بیٹھا ہوا سوچ رہا تھا اگر ہم دنیا کے زوال پر غور کریں اور یہ سوچیں کہ ہم منٹوں سیکنڈوں میں دنیا کو کتنی تیزی سے چھوڑ دیتے ہیں، پچاس پچاس سال کی محنت ستر ستر سال کی محنت بڑے بڑے بنگلے اور سب کچھ لیکن اتنی تیزی سے رخصت ہوتے ہیں کہ ابھی انتقال ہوئے چوبیس گھنٹے بھی نہیں گزرے کہ میں اور آپ زمین کے نیچے جا کے مٹی کے ڈھیر بن جاتے ہیں۔ تو میں یہ سوچتا تھا کہ اگر غفلت کے پردے ہمارے دلوں پر پڑے نہ ہوتے تو

میں آپ کو بتاؤں ہمیں یہاں بیٹھ کے تقریریں کرنی پڑتیں کہ اے لوگو! تم چوبیس گھنٹے کیوں سجدے میں پڑے ہو کچھ آؤ ذرا فیکٹری تو لگالو! آؤ ذرا کچھ کام دھام بھی دیکھ لو تو آپ لوگ جواب میں یہ کہتے کہاں کا کام دھام دیکھ لیں! ارے اس دنیا کے کام دھام ہم کریں گے؟ یہ تو بہت جلد ہم سے چھوٹنے والی ہے تو ہمیں اس کے لیے تقریریں کرنی پڑتیں کہ اٹھو ذرا کچھ تو کرلو! دیکھو! دنیا میں جینا بھی تو ہے۔ تو بس اخیر میں آپ یہی کہتے کہ بس جینے کے بقدر ہمیں تو تھوڑا سا کچھ کرنا ہے، باقی ہمارے پاس فرصت کہاں؟ کیا آپ نہیں دیکھ رہے ہیں کہ دنیا سے کیسے منٹوں میں انسان چلا جاتا ہے۔

میرے گھر کے برابر میں ایک شخص تھا۔ کافی مدت سے ہمارا پڑوسی تھا۔ تو میں اچانک گھر پہنچا تو برابر مکان سے رونے کی آواز آئی۔ جب پتہ لگایا گیا تو معلوم ہوا کہ صبح سویرے بالکل ٹھیک ٹھاک ناشتہ کھانا وغیرہ کھایا۔ اور پھر سینے میں کچھ تکلیف محسوس ہوئی اور ہارٹ اٹیک (Heart attack) ہوگیا۔ جس کے نتیجے میں چند منٹوں میں چلتا بنا۔ اس کی بہت سی گاڑیاں، ٹرک، بسیں وغیرہ تھیں اور مختلف پراپرٹی اور زمین و جائیداد تھی، مگر سب کو یکدم چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہوگیا۔ اور اپنے ساتھ کچھ لے کر نہیں گیا۔ ملا علی قاری رحمہ اللہ نے لکھا ہے:

﴿لَوْلَا الْاَمَلُ لَفَاتَ الْعَمَلُ وَ لَوْلَا الْغَفْلَةُ لَخَرِبَ الْعَالَمُ﴾

(مرقاۃ المفاتیح)

اگر انسانوں کے دل میں تھوڑی غفلت نہ ڈالی جاتی تو یہ عالم سارا ویران پڑا ہوا ہوتا۔ دنیا میں کون لگتا سب یہ کہتے ارے بھائی! کاہے میں لگنا چاہتے ہو؟ اسی حقیقت کی ترجمانی کے لیے حضرت والا کا ایک قیمتی ملفوظ ہے ؎

جس جہاں سے ہمیشہ کو جانا
اور کبھی لوٹ کر پھر نہ آنا
یہ ہے ارشادِ قطبِ زمانہ
ایسی دنیا سے کیا دل لگانا

اس کو حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ نے یوں ارشاد فرمایا ہے:

﴿اِعْمَلْ لِلدُّنْیَا بِقَدْرِ مَقَامِکَ فِیْھَا وَ اعْمَلْ لِلْاٰخِرَۃِ بِقَدْرِ مَقَامِکَ فِیْھَا﴾

دنیا کے لیے اتنا کرو جتنا اس میں ٹھہرنا ہے اور آخرت کے لیے اتنا کرو جتنا تمہیں اس میں ٹھہرنا ہے۔

کوئی کمپیوٹر دنیوی واخروی زندگی میں پرسنٹیج (Percentage) نہیں نکال سکتا

تو میرے دوستو! کیا دنیا کا کوئی کمپیوٹر ایسا ہوسکتا ہے جو دنیا کی زندگی کا آخرت کی زندگی کے ساتھ مقابلہ کر کے کوئی Percentage نکال سکے۔ احقر اپنے علم کی حد تک یہ بات کہہ سکتا ہے کہ ایسا کوئی کمپیوٹر آج تک نہ ہی

ایجاد ہوا اور نہ ہی ہوسکتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ غیر محدود کا محدود کے ساتھ کوئی مقابلہ ہی نہیں ہوسکتا۔ سو دنیا کی زندگی محدود ہے اور آخرت کی زندگی لامحدود۔ لہٰذا ان میں تقابل کیسے کیا جا سکتا ہے؟ ذرا کمپیوٹر لا کر ساٹھ سال اور پھر چھ سو اور چھ ہزار اور چھ لاکھ اور چھ کروڑ اور چھ ارب اور چھ کھرب سال وغیرہ وغیرہ ایک لامحدود سلسلے تک آخرت کے دنوں کی گنتی ہے تو پھر کسی بھی کمپیوٹر پر اُس کا پرسنٹیج کیسے نکل سکتا ہے؟

میرے دوستو! یہ بات سن کر یونہی گزر جانے کی نہیں بلکہ عبرت و نصیحت کی ہے کہ دنیا کے لیے اتنا کیجئے جتنا یہاں رہنا ہے اور آخرت کے لیے اُتنا وقت نکالیں جتنا وہاں رہنا ہے۔ آج ہم بیٹھ کر ذرا غور کریں تو چوبیس گھنٹے ہمارے دنیا کے کاموں میں چلے جا رہے ہیں۔ جلدی جلدی تھوڑا بہت وقت دین کے لیے نکال پاتے ہیں کہ چلو جلدی جلدی نماز پڑھ کے آ جائیں، جبکہ ہونا اس کے برخلاف چاہیے تھا کہ چوبیس گھنٹے اللہ کے لیے وقف کیے جاتے۔ اور پھر بقدرِ ضرورت دنیا کی ضرورت اور تقاضوں کو پورا کر لیا جاتا۔ مثلاً ذرا بھوک لگی ہے تو کچھ کھانے پینے کا بھی انتظام کرنا چاہیے۔ چلو ایک دو گھنٹہ کچھ کر کے آ جائیں۔ دس بیس دن مہینے دو مہینے کے لیے کچھ کما لیں، فارغ ہو جائیں گے، پھر اپنا سارا ٹائم اللہ اللہ کرنے میں لگائیں گے۔ اس لیے کہ دنیا کا اتنا بھی تناسب آخرت کے مقابلے میں نہیں ہے۔ اسی لیے حضرت والا نے اس حقیقت کا اظہار فرمایا۔

یہ جہاں گر گیا نگاہوں سے
جب کھلا حال دارِ فانی کا

کیونکہ اللہ والوں پر جب دارِ فانی کا حال کھلتا ہے تو حضرت نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی دنیا کے متعلق جو روایات ہیں اگر ہم انہیں غور سے پڑھیں تو یہ پتہ چل جائے گا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا سے معمولی سی بھی محبت نہیں تھی نہ آپ کے صحابہ کو دنیا کے ساتھ کوئی تعلق اور لگاؤ تھا۔ جیسا کہ مختلف روایات اسی ''عرفانِ محبت'' میں کئی جگہ ذکر کی گئی ہیں اور اوپر قرآنِ کریم کی آیت کی تفصیل کے ذیل میں بھی دنیا کی حقیقت کا مضمون آ چکا ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑا محسن ہمارا کوئی نہیں

تو میرے دوستو! غور سے بتاؤ روئے زمین پر آج تک ہمارا سب سے بڑا محسن، خیر چاہنے والا، بھلائی کا طلبگار، ہماری عافیت و آرام و راحت کے لیے تڑپنے والا، آہیں بھرنے والا کون تھا؟ آپ سب یہی کہیں گے کہ بجز حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور کوئی نہیں۔ تو جب آپ کا حال دنیا کے ساتھ تعلق و محبت کا بالکل نہ تھا تو پھر اُمت کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ دنیا کے ساتھ محبت رکھے اور اُس کو دل میں بسائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے کہ:

﴿مَا لِی وَ لِلدُّنۡیَا وَمَا اَنَا وَالدُّنۡیَا اِلَّا کَرَاکِبٍ اسۡتَظَلَّ تَحۡتَ شَجَرَةٍ ثُمَّ رَاحَ وَتَرَکَهَا﴾
(مشکاۃُ المصابیح، کتابُ الرقاق، ص: ۴۴۲)

میری مثال ایسے مسافر کی ہے جو چلا جا رہا ہو اور ایک درخت کے نیچے ذرا سایہ حاصل کرنے کے لیے کچھ دیر آرام کیا۔ اور پھر تھوڑی ہی دیر بعد وہاں سے آگے چلتا بنا اور اُس کو چھوڑ دیا۔ جیسا کہ ہم لوگ ساؤتھ افریقہ میں دو سو تین سو کلومیٹر چلنے کے بعد اپنی گاڑی کو روک کر بعض ایسے مقامات پر جہاں درختوں کا اچھا سایہ ہوتا ہے ٹھہر جاتے ہیں اور پھر وہاں پندرہ بیس منٹ یا آدھا گھنٹہ ٹھہرنے کے بعد وہاں سے آگے چل دیتے ہیں۔ تو گویا کہ دنیا کا قیام بس اتنا سا ہے جتنا کہ اس درخت کے نیچے سایہ لینے کے لیے ٹھہرنا۔ ایک روایت میں یوں ارشاد فرمایا کہ اگر تم میں سے کوئی سمندر میں اپنی انگلی کو ڈالے اور پھر دیکھے کہ وہ کتنے پانی کے ساتھ لوٹتی ہے، تو دنیا کو آخرت کے مقابلے میں وہ نسبت بھی نہیں ہے جو کہ اس انگلی کے پانی کو سمندر کے پانی کے مقابلے میں ہے۔ بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ کم ہے۔

ہم تھوڑی سی دنیا لینے کے لیے بالفاظ دیگر (از روئے حدیث پاک) یوں کہہ لیجئے کہ مچھر کے پر کا اربوں کھربوں والا حصہ لینے کے لیے اپنا ایمان بھی بیچ دیتے ہیں۔

محبوب و محبوبہ پر جان و ایمان قربان کرنے کی بات کرنا

ایک جگہ میں نے عرض کیا تھا جو لوگ اپنے محبوب و معشوق کی نسبت یوں کہتے ہیں کہ میری جان بھی تجھ پر قربان، میرا ایمان بھی تجھ پر قربان تو ایسی صورت میں ایمان قربان کرنے سے یہ شخص دائرۂ ایمان سے نکل جائے گا۔ کسی مخلوق کی محبت میں یوں کہنا کہ تجھ پر میرا ایمان بھی قربان، ایمان سے ہاتھ دھو بیٹھنے کو مستلزم ہے اور ایسے شخص کو ایمان کی تجدید کرنی چاہیے۔ یہ آجکل کے جوان ان کو پتہ تو ہے نہیں نہ اہل اللہ کی صحبت حاصل ہے اور نہ علماء کرام سے ملنا جلنا۔ اپنے محبوبوں کو ایسے ایسے جملے بولتے پھرتے ہیں کہ میرا دل تجھ پر قربان، میرا سب کچھ قربان۔ ارے ظالم! یہ تو تجھے صرف اللہ کو کہنا چاہیے تھا کیوں کہ اس کی دی ہوئی جان، اس کا دیا ہوا ایمان، اس کی دی ہوئی صحت، اس کا دیا ہوا چین وسکون و راحت اسے کہنا چاہیے تھا کہ اے اللہ! سب تیرے اوپر قربان تب تو یہ جملہ جچتا اور سمجھ میں آتا کہ ہاں تم نے صحیح جگہ قربان کیا ہے، لیکن یہ غیر کے اوپر قربان کرنا کیسی نادانی اور جہالت ہے اور یہ بات یاد رکھیئے کہ جب تک یہ دارِ فانی نگاہوں سے نہ گرے تب تک اللہ کی محبت اور ایمان کامل قلب میں نہیں آتا۔ فرماتے ہیں کہ ؎

یہ جہاں گر گیا نگاہوں سے
جب کھلا حال دار فانی کا

دل بہلانے کا سامان ختم ہوا تو پھر؟

میر اب دل کو کس سے بہلائے
اڑ گیا رنگ حسن فانی کا

اہلِ مجلس میں سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ حضرت میر صاحب کسی کے عاشق تھے اور اس کے حسن کا رنگ اُڑ گیا

اور اب حضرت اُن کے متعلق فرما رہے ہیں بلکہ دراصل حضرت کا یہ تکیۂ کلام ہے۔ میر صاحب کو مخاطب بنا کر پوری امت کو یہ بات پہنچاتے ہیں اور امت کا ہر فرد اس کا مخاطب ہے۔ ہم سب اہل مجلس اس کے مخاطب ہیں اس لیے یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہیے۔ پورے کلام میں جہاں جہاں بھی حضرت والا نے یہ خطاب کیا ہے تو اس کا منشا میر صاحب کو مخاطب بنانا نہیں بلکہ میر صاحب کے عنوان سے دراصل سب کو خطاب کرنا ہے کہ اے وہ انسان! جو کسی کے حسن مجازی پہ عاشق ہے تو کس سے دل بہلائے گا جب اس کا حسن اڑ چکا ہوگا، اس لیے خالق حسن اور خالقِ لذات کائنات کے اوپر فدا ہو جا کہ اُس کے حسن و جمال کو کبھی زوال نہیں اور وہ ذات ہمیشہ باقی رہنے والی ہے۔

دل لگا بس خدا سے اے ظالم
خوف کر موت ناگہانی کا

اس مصرع میں حضرت والا یہ فرمانا چاہتے ہیں کہ جو کچھ ہوا ہے وہ سب گزر گیا۔ اس سب کو دل سے نکال دے اور اللہ سے دل لگالے۔ اب سامعین اور قارئین کو یہ بات ذہن میں آسکتی ہے کہ ہفتے کے بعد جمعہ کو توبہ کرلیں گے یا رمضان میں توبہ کرلیں گے یا کسی اور خاص موقع پر اپنے گناہوں کو چھوڑ کر اللہ والے بن جائیں گے۔ اس لیے حضرت والا نے فوراً دوسرے مصرع میں یہ بات ارشاد فرمائی کہ اللہ سے دل لگانے کے لیے اور مخلوق سے دل ہٹانے کے لیے کسی خاص دن اور وقت کے انتظار میں مت رہ۔ جیسا کہ لوگ سوچتے ہیں جمعرات جمعہ آرہا ہے، بس غسل کر کے توبہ کرلوں گا۔ حضرت فرماتے ہیں ایسا نہ کر! ابھی اسی گھڑی میں جب یہ بات سنی اور دل میں نیکی کی طرف داعیہ پیدا ہوا تو اسی وقت فوراً توبہ کرلے۔ کیونکہ موت کا کچھ پتہ نہیں ہے کہ کب آپہنچے۔ یہ بھی معلوم نہیں کہ یہ رات سر کے اوپر سے صحیح گزرے یا صبح اس حال میں ہو کہ دنیا سے جا چکے ہوں۔ غرض یہ کہ موت کا کوئی ٹھکانہ نہیں تو پھر ہر وقت اس حال میں رہنا چاہیے کہ ہمارا دل اللہ تعالیٰ سے لگا ہوا ہو اور غیر کا دل میں گزر نہ ہو۔ چنانچہ اولیاء اللہ ہر گھڑی اسی طرح زندگی گزارتے ہیں اور اپنے سارے معاملات بالکل صاف ستھرے رکھتے ہیں کہ جب بھی موت کا فرشتہ آئے تو وہ سفرِ آخرت کے لیے تیار ہوں۔

شیخ کامل کے فیض سے دل ہے
حامل کیف جاودانی کا
خاک تن کو عطا ہوا ان کا غم
یہ صلہ ان کی مہربانی کا

اس شعر میں حضرت والا نے اعتدال والا مسلک پیش کیا ہے۔ فرمایا کہ اللہ کی محبت کا درد و غم حاصل کرنے کے لیے اہل اللہ کی صحبت اور ان کا فیض بہت ضروری ہے، لیکن اہل اللہ کی صحبت اور ان کی برکت سے جو کچھ حاصل

ہو رہا ہے اس میں اصل جو دخل ہے وہ اللہ تعالیٰ کے فضل کو ہے۔ اسی لیے خالی مشائخ کو سب کچھ سمجھنا اور بس اُن سے تعلق کر لینے پر تکیہ لگا لینا غلط ہے اور کلی طور پر مشائخ سے بالکل صرفِ نظر کر کے اپنی اصلاح کا تصور کرنا اور قلب میں خاص حلاوتِ ایمانی کے مل جانے کا خواب دیکھنا یہ بھی فضول ہے۔ اس لیے اصل اللہ تعالیٰ کے فضل سے کام بنتا ہے مگر اللہ نے شیخ کو دنیا میں واسطہ بنایا ہے۔ ان دونوں باتوں سے مل کر بندۂ مؤمن حاملِ کیفِ جاودانی ہوتا ہے اور اُسے نورِ ایمانی عطا ہو جاتا ہے۔

دعویٰ وتحدیث نعمت اور اکمل وافضل کا فرق

بظاہر اس شعر میں یہ معلوم ہو رہا ہے کہ حضرت والا اپنے متعلق اپنی اصلاحِ قلب کے ہو جانے کا دعویٰ کر رہے ہیں جو نص صریح کے خلاف ہے، کیونکہ حدیث شریف میں جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اپنے آپ کو خود مزکّی مجلّی ومصفّی مت کہو اور قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے بھی اس بات سے منع فرمایا ہے۔ لہٰذا اپنے متعلق اس طرح کی بات کہنا کہ میرے دل کو کیفِ جاودانی حاصل ہے، بظاہر صحیح معلوم نہیں ہوتا۔

لیکن اس کا جواب یہ ہے جس کو حضرت تھانوی قدس سرہ نے ''انفاسِ عیسیٰ'' اور ''التکشف'' میں ذکر کیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ یہ بات تو کسی کے لیے بھی جائز نہیں ہے کہ وہ آخرت کے اعتبار سے اپنے کو کسی دوسرے کے مقابلے میں افضل کہے اور زیادہ بڑے درجے والا کہے۔ لیکن یہ بات جائز ہے کہ کسی محسوس حاصل ہونے والی نعمت کے متعلق بندہ اپنی زبان سے اظہارِ شکر کے طور پر بطریقِ تحدیثِ نعمت کوئی بات عرض کر دے۔ جیسے مثلاً اگر ایک شخص حافظِ قرآن ہے تو وہ غیر حافظ کے مقابلے میں یہ کہہ سکتا کہ میں حافظ ہوں۔ یا اسی طرح ایک شخص حافظ اور عالم بھی ہے تو وہ صرف حافظ کے مقابلے میں یہ کہہ سکتا ہے کہ میں عالم بھی ہوں۔ مگر یہ بات تحدیثِ نعمت کے طور پر ہونی چاہیے، دعویٰ اور خود پسندی یعنی عُجب اور تکبر کے طور پر نہ ہو جس کی پہچان حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے یہ لکھی ہے کہ اُس نعمت کو بیان کرتے وقت میں یہ خطرہ دل میں لگا رہے کہ نا معلوم میرا یہ وصف اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں قبول بھی ہے یا نہیں؟ اور پتہ نہیں میں اس پر مرتے دم تک قائم رہوں یا نہیں جبکہ میرے مقابل کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس نعمت سے نواز دیا جائے؟ نیز مجھ میں کوئی ایسی بُرائی ہو جس کی وجہ سے میں اللہ کی بارگاہ سے دور کر دیا جاؤں اور سامنے والے میں کوئی ایسا کمال ہو جس کی وجہ سے وہ اللہ کی بارگاہ کا مقرب قرار پائے۔

لہٰذا اس اصول کی روشنی میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان خطرات کے دل میں قائم رکھنے کے ساتھ استحضارِ عظمتِ خداوندی اور خوفِ بے نیازیِ باری تعالیٰ کو سامنے رکھتے ہوئے اگر کوئی شخص اس طرح کی بات کہہ دے تو یہ عین تحدیثِ نعمت ہے جو اللہ کو مطلوب ہے۔ کیونکہ اگر نعمت ملنے کے بعد اُس کے ملنے کا احساس نہ ہو تو اُس پر بندہ شکر ادا نہیں کر سکتا۔ اس لیے اس کا احساس ہونا لازم اور ضروری ہے تا کہ اللہ تعالیٰ کے لیے دل میں جذباتِ شکر پیدا

ہوں۔ جولوگ بظاہر زبان سے یہ کہتے ہوئے ہوتے ہیں کہ میں کچھ نہیں ہوں یعنی رسمی تواضع دکھاتے ہیں اور حقیقی متواضع نہیں ہوتے تو وہ بظاہر اس طرح کی چیزوں کے زیادہ پیچھے پڑے رہتے ہیں۔

شیخ صرف ذریعہ ہے دینے والا اکیلا اللہ ہے

لہٰذا میرے دوستو! اگر اللہ والوں سے ملو گے تو یہ دولتِ معرفتِ خداوندی حاصل ہوگی ورنہ سنت اللہ یہی ہے کہ راہ روتھک کر بیٹھ جاتا ہے مگر اُسے منزل نظر نہیں آتی۔ البتہ منزل تک پہنچانے والا اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم ہی ہوگا، کیونکہ خود کسی شیخِ کامل اور مصلحِ باطن سے تعلق کا پیدا ہو جانا یہ بھی تو اللہ تعالیٰ ہی کے فضل سے ہے جس میں ہمارا ذاتی کوئی کمال نہیں ہے۔ بس اپنے محبوب بندے کے دل کو اللہ تعالیٰ متوجہ فرما دیتے ہیں کہ جاؤ! میرے فلاں بندے کے ساتھ تعلق قائم کرو اور اس سے میرا راستہ پوچھو۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اَلرَّحۡمٰنُ فَسۡئَلۡ بِهٖ خَبِيۡرًا﴾

(سورۃ الفرقان، آیت: ۵۹)

کہ میرے متعلق کسی میرے باخبر بندے سے پوچھ لو۔ اس لیے کسی اللہ والے کے پاس اپنی اصلاح کے لیے پہنچ جانا یہ اس بات کی نشانی ہے کہ اس پر اللہ کا فضل خاص ہو چکا ہے۔

یہ دعا کہ میرا حشر میرے شیخ کے ساتھ ہو

اس موقعہ پر ایک اور اہم بات ہے جس کا ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ یہ دعا کرنا کہ ہمارا حشر حضرت کے ساتھ ہو یا ہم حضرت والا کی طرح ہو جائیں۔ احقر کو پورے قرآن وسنت میں اس طرح کی دعا کی کوئی ایک نظیر بھی نہیں ملتی اور اگر اس کو جائز کہا جائے تو صرف اُن صحابۂ کرام کے متعلق کہا جا سکتا ہے جن کو بزبانِ نبوت جنت کی بشارت دی جا چکی تھی۔ اور اس لحاظ سے اُن کا جنت میں جانا یقینی ہو چکا تھا یا صحابہ کے ایمان اور تقویٰ کے مانند اللہ تعالیٰ سے دعا میں ہم درخواست کر سکتے ہیں کیونکہ خود قرآن میں اللہ تعالیٰ نے صحابہ کے ایمان کو معیار قرار دے کر ہمیں حکم دیا ہے کہ اٰمنوا کما اٰمن الناس یعنی ویسا ایمان لاؤ جیسا ایمان صحابہ لائے ہیں۔ تو یہ تشبیہ اس اعتبار سے درست ہو سکتی ہے۔

یا پھر شیخ ومرشد کے خاص اوصاف وکمالات کو اللہ تعالیٰ سے اپنے لیے مانگنا یہ بھی درست کہا جا سکتا ہے لیکن اپنی ذات کو اُن کی ذات کی طرح کرنے کی دعا کرنا جبکہ اللہ تعالیٰ اُس سے بہت اوپر کے درجات دینے پر پوری قدرت رکھتے ہیں اور دیتے ہیں اور دیتے رہیں گے اور مقامات ودرجاتِ تقربِ خداوندی غیر محدود ہیں تو پھر اللہ تعالیٰ سے بغیر کسی شخصیت کی تشبیہ سے دعا مانگی جائے تو یہ طریقہ سب سے بہتر ہوگا۔

اور سب سے افضل بات تو یہ ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں ہر دنیا وآخرت کی خیر مانگنے کے

لیے دعائیں اور اُن کے الفاظ اور انداز اور اپنی حاجات و مقاصد سب کچھ احادیثِ مبارکہ میں ماثورہ دعاؤں میں پیش فرما دیا ہے۔ تو پھر ہمیں ان چھوٹی چھوٹی چیزوں میں اُلجھنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ زیادہ اہتمام اُنہی دعاؤں کا کرنا چاہیے۔

ہاں! اگر کسی کو اسی طرح کے الفاظ میں دعا مانگنی ہو تو یہی الفاظ معمولی تغیر و تبدل سے بالکل درست اور صحیح ہو سکتے ہیں۔ مثلاً ہم یوں کہیں ''اللہ تعالیٰ میرا اور میری اولاد کا حشر کل قیامت کے دن اپنی جنتوں اور رحمتوں میں میرے شیخ کے ساتھ کر دے۔'' یا مثلاً دعا یوں مانگے ''اللہ تعالیٰ مجھے بھی آپ کی طرح نیک اور صالح اور متقی و پرہیزگار بنا دے۔'' اس جملے میں گویا آپ نے اپنے لیے دعا مانگنے کے ساتھ سامنے والے کے لیے بھی دعا مانگ لی جو ظاہر ہے کہ ہر لحاظ سے بہتر ہی بہتر ہے۔ کیونکہ شیخ کے لیے دعا کرنے اور قبول ہونے کے فوائد آپ کو بھی حاصل ہو گئے۔

اور ہم سب کو اس نقطۂ نظر سے بھی اس پر غور کرنا چاہیے کہ متقدمین اسلاف میں یا ہمارے اکابر علمائے دیوبند میں اُن کی تصنیف و تالیف اور ان کی تحریر و تقریر میں اس طرح کے جملوں کا کتنا استعمال ہوا ہے؟ مثلاً لفظ لفظ میں میرے شیخ کی برکت یا میرے شیخ کا صدقہ یا میں شیخ کی طرح ہو جاؤں وغیرہ وغیرہ الفاظ حکیم الامت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ یا حضرت گنگوہی یا حضرت قاسم نانوتوی اور دیگر ہمارے اکابر کے کلام میں کتنا استعمال ہوا ہے؟

میری ان باتوں سے کوئی شخص اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو جائے کہ میں حضراتِ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین اور اکابر رحمہم اللہ سے فیض حاصل ہونے اور اُن کی برکات کا منکر ہوں، بلکہ مقصد صرف اتنی بات ہے کہ بندۂ مؤمن کو اللہ تعالیٰ کا بندہ ہونے کے لحاظ سے ہر خیر و خوبی کی نسبت اوّلاً اپنے خالق و مالک کی طرف کرنی چاہیے اور پھر ثانوی درجے میں دوسرے حضرات کی طرف نسبت کر دی جائے تو کوئی حرج نہیں اور گفتگو اور تعبیر میں بھی اس کا لحاظ ہو تو بہتر ہو گا۔

میری گفتگو پر ایک شبہہ اور اس کا جواب

اس پر بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ ہماری مراد و مقصد بولتے وقت میں یہی ہوتا ہے کہ اصل تو اللہ تعالیٰ کا فضل ہے اور ہم اس کے منکر نہیں ہیں، صرف بار بار زبان پر اس لفظ کو نہیں لاتے لیکن مراد دل میں یہی ہوتی ہے، مگر ان حضرات کی تاویل درست نہیں ہے کیونکہ جس آیت میں اللہ تعالیٰ نے جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بات ارشاد فرمائی:

﴿وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَیْءٍ اِنِّیْ فَاعِلٌ ذٰلِکَ غَدًا اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ﴾

(سورۃ الکھف، آیت: ۲۳)

کہ آپ ہرگز کسی بات کے متعلق یہ نہ کہیں کہ میں اس کو آئندہ کرنے والا ہوں مگر ان شاء اللہ کے ساتھ۔ ظاہر ہے

اس آیت کے شانِ نزول کے وقت میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم زبان ہی سے تو ان شاء اللہ کہنا بھول گئے تھے ورنہ دل میں تو ان شاء اللہ موجود تھا جو کہ ایک واضح اور یقینی چیز ہے۔ جس کے بارے میں کوئی شک وشبہ نہیں ہوسکتا۔ مگر پھر بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے نزولِ وحی کو روک کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سے باخبر کیا گیا۔

تصویر کا دوسرا رخ اور دو افسوسناک قصے

اس کے بالکل برخلاف بعض لوگ بزرگوں سے تعلق رکھنے کو اپنی نگاہوں میں اتنا معیوب اور خراب سمجھتے ہیں کہ وہ یہ تصور کرنے لگتے ہیں کہ جیسے ہی بزرگوں سے تعلق ہوا تو پھر یہ آدمی ایک طرف کونے میں یکسو ہوکر رہ جائے گا اور دین کی کوئی خدمت نہ کرسکے گا اور نہ قوم کے کسی خاص کام کا رہے گا۔ نہ لوگوں کے ایمان وعمل کی فکر اس کے دل میں برقرار رہے گی۔

جیسا کہ ایک شخص نے اپنی جہالت اور نادانی کی بنیاد پر حکیم الامت تھانوی رحمہ اللہ کے بارے میں یہ بات کہی کہ افسوس مولانا اشرف علی تھانوی ایک خانقاہ کے اندر بند ہوکر رہ گئے۔ قصبہ تھانہ بھون میں خانقاہ سے نکل کر یہ بھی نہ دیکھا کہ لوگوں کا کلمہ صحیح ہے کہ نہیں۔ جو کہ ایسی مہمل اور جاہلانہ بات ہے کہ جس کو دنیا کا ہر ایک اہلِ حق عالم خواہ اس کا کسی شعبے سے تعلق ہو اس شخص کی حماقت اور جہالت پر مبنی جملہ قرار دے گا۔

اور اس سے آگے بڑھ کر ایک قصہ میرے ایک شاگرد نے مجھ کو سنایا کہ وہ ہمارے حضرت والا کے پاس سے جیسے ہی خانقاہ سے باہر نکلے تو کسی شخص کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر حضرت مفتی عبدالرؤف سکھروی صاحب کے یہاں جا رہے تھے اور اتفاق یہ تھا کہ وہ گاڑی والے بھی وہیں جا رہے تھے۔ انہوں نے اس طالبِ علم سے پوچھا ابھی کہاں سے آئے ہو؟ انہوں نے جواب دیا کہ حضرت والا کے پاس سے آیا ہوں۔ تو فوراً بولے کہ حضرت والا نہیں کہنا چاہیے، یہ اللہ تعالیٰ کے وزن پر ہے، جیسے اللہ تعالیٰ ویسے حضرت والا۔ اس لیے انہوں نے بڑے خیر خواہانہ انداز سے نصیحت کی کہ بھئی ایسے لفظ سے بچنا چاہیے۔

بہر حال یہ خاموشی کے ساتھ چلتے رہے۔ جب یہ حضرت مفتی صاحب کے پاس پہنچے، پروگرام سے فارغ ہوکر ملاقات کی تو وہیں مفتی صاحب نے اس طالب علم سے یہ دریافت کیا کہ حضرت والا کی طبیعت کیسی ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا الحمد للہ ٹھیک ہے۔ مگر بڑی سمجھداری اور ہوشیاری کے ساتھ اسی مجلس میں اُن دوسرے معترض صاحب کی موجودگی میں حضرت مفتی صاحب سے اس طالب علم نے یہ مسئلہ پوچھ لیا کہ کیا حضرت والا کا لفظ اپنے شیخ کے لیے استعمال کرنے میں کوئی حرج ہے؟ تو حضرت مفتی صاحب نے جواب دیا کہ اس میں کوئی حرج نہیں۔ تو اس طالب علم نے عرض کیا کہ حضرت بعض لوگ اس طرح سے کہتے ہیں کہ حضرت والا، اللہ تعالیٰ کے وزن پر ہے۔ مفتی صاحب نے ارشاد فرمایا کہ یہ اُن کے دماغ کی خشکی کی بات ہے۔ بالآخر وہ صاحب وہاں سے دُم دبا کر بھاگے۔

ظاہر ہے کہ یہ دوسری جانب مسئلہ میں حد سے تجاوز کی بات ہے جبکہ اسلام اعتدال والا مذہب ہے۔

زندگی کے ہر شعبے میں شریعت کا دیا ہوا ہر حکم اعتدال پر مبنی ہے۔ جیسا کہ قرآن کریم کی اس آیت کی تفسیر پڑھ کر دیکھنے سے پتہ چل جائے گا کہ ہم نے تم کو درمیانی اُمت بنایا ہے:

﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا﴾

(سورة البقرة، آیت: ۱۴۳)

ہر ہر شعبۂ حیات میں دیا جانے والا حکم افراط و تفریط سے خالی ہے اور یہی اس مذہب کی حقانیت کی دلیل ہے۔ لہٰذا افراط و تفریط کی بات کرنے والے دونوں حضرات کو اپنے موقف پر غور اور فکر کرنا چاہیے۔

مستی خمر آسمانی

حال دیکھو تو اللہ والوں پر
مستیِ خمرِ آسمانی کا
سن لو قصہ زبانِ اخترؔ سے
اس کے دل کے غمِ نہانی کا

اللہ والوں کو اللہ کا خاص قرب عطا ہوتا ہے کہ جس کی بدولت وہ عجیب کیف و سرور کے عالم میں رہتے ہیں اور بظاہر دنیا کی شراب سے وہ دور ہوتے ہیں لیکن اللہ کی محبت کی شراب پی کر اُن کے دل میں عجیب مستی چھائی رہتی ہے۔ حضرت والا نے ایک مقام پر یوں فرمایا ۔

میرے پینے کو دوستو سن لو
آسمانوں سے مے اُترتی ہے

جس کا نشہ اُس وقت میں ظاہر ہوتا ہے جب اہلِ دنیا اِن اللہ والوں سے دنیاوی مفادات کے چھوڑ دینے اور آخرت کو ترجیح دینے کے معاملات میں اِن کو پاگل اور مجنون اور دیوانہ وغیرہ کہتے ہیں۔ تو پتہ چلتا ہے کہ واقعی یہ اللہ کی محبت کی شراب پیئے ہوئے ہر وقت اسی نشے میں مست رہتے ہیں۔

پھر حضرت والا اخیر میں یہ بات ارشاد فرماتے ہیں کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے اپنی محبت کا خاص غم عطا فرمایا ہے۔ اس لیے جو کچھ اختر تمہیں سنا رہا ہے یہ محض الفاظ کی جمع و ترتیب نہیں ہے بلکہ اُس کے اندرونِ قلب کا حالِ غم ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے اور بزرگوں کی دعاؤں سے اختر کو عطا فرمایا ہے۔ کہیں حضرت والا اسی کو یوں فرماتے ہیں ۔

میں تھک جاتا ہوں اپنی داستانِ درد سے اخترؔ
مگر میں کیا کروں چپ بھی نہیں مجھ سے رہا جاتا

یہ جتنے مضامینِ عشق و محبت اور مواہبِ علم و حکمت حضرت والا کے قلب پر القا ہوئے ہیں اور پھر اشعار کی شکل میں موزوں ہوگئے۔ نیز حضرت والا کے جملہ مواعظ و بیانات وغیرہ یہ سب اسی دردِ دل کی داستان کی ترجمانی ہیں۔

ہے عجم اس کا پھر مدینے میں

میر رہتا تھا جو نگینے میں دیکھو بیٹھا ہے کس سفینے میں
زندگی گر فدا ہے مالک پر کیا حلاوت ہے اس کے جینے میں
بے بیانی بھی ہے بیاں اس کا دردِ نسبت ہے جس کے سینے میں
ہے خفا جس سے پالنے والا کوئی جینا ہے اس کے جینے میں
دوستو سب کرم ہے مالک کا خوبیاں کیا ہیں اس کمینے میں
راہ سنت پہ جو چلے اختر ہے عجم اس کا پھر مدینے میں

مشکل الفاظ کے معانی:۔ مالک: اللہ تعالیٰ۔ **حلاوت**: مٹھاس۔ **خفا**: ناراض۔ **عجم**: عرب کے علاوہ دنیا کا باقی حصہ۔

میر صاحب کا سفینہ نگینہ سے بہتر

میر رہتا تھا جو نگینے میں
دیکھو بیٹھا ہے کس سفینے میں

اللہ تعالیٰ نے حضرت میر صاحب کو یہ سعادت بخشی ہے کہ بچپن سے لے کے ابھی تک تقریباً چالیس سال سے حضرت والا دامت برکاتہم کے ساتھ خادمانہ طور پر مستقلاً سفر وحضر میں ساتھ رہتے ہیں اور مولد ومسکن کے اعتبار سے ہندوستان کے شہر مرادآباد کے پاس نگینہ ایک قصبہ ہے اس کے رہنے والے ہیں پھر پاکستان ہجرت کر کے تشریف لے آئے تھے تو کراچی آنے کے بعد مختلف بزرگوں کی خدمت میں آتے جاتے مگر اپنے مزاج میں مناسبت صرف حضرت والا کے ساتھ پاتے تھے اس لیے حضرت کے ساتھ مضبوطی سے جم کر رہتے رہے۔

یہاں تک کہ بعض حضرات کو محض اس وجہ سے اعتراض بھی ہوا کہ اس وقت تک حضرت بزرگوں کی صفوں میں اس قدر مشہور نہ تھے تو میر صاحب کو بعض ان کے رشتہ دار حضرت والا کے پاس آنا جانا چھوڑ دینے کو کہا کرتے تھے اور دوسرے بزرگوں کے پاس جانے کا مشورہ دیتے تھے مگر بہر حال یہ حضرت میر صاحب کی بصیرت کہیے کہ مستقبل قریب میں تمام بزرگوں کی نگاہوں کا تارہ اور قلب کی ٹھنڈک بننے والے ہمارے شیخ ومرشد عارف باللہ حضرت مولانا شاہ حکیم محمد اختر صاحب دامت برکاتہم کو اسی وقت سے اپنی اصلاح کے لیے اپنا شیخ بنالیا اور ہر وقت سفر وحضر میں ساتھ رہنے لگے۔

بالخصوص کیونکہ حضرت میر صاحب کے ذمہ بوجہ اہل وعیال نہ ہونے کے گھر والوں کے حقوق واجبہ نہیں تھے اس لیے شب وروز حضرت ہی کے ساتھ رہتے تھے جس کی بدولت میر صاحب کو عالم نہ ہونے کے باوجود اللہ

تعالیٰ نے علماء کا شیخ و مصلح اور مرشد و مربی بنایا ہے خود احقر کے بہت سے خطوط کے جوابات اور مختلف امور کے مشورے حضرت میر صاحب ہی سے ملا کرتے ہیں اور بظاہر حضرت میر صاحب اور حضرت والا کے جوابات اور مشوروں میں کوئی خاص بین فرق نظر نہیں آتا یہ اس بات کی دلیل ہے کہ حضرت میر صاحب نے حضرت والا سے غایت درجہ مناسبت کی بنیاد پر شان استفادہ بہت ہی غالب رہی کہ ہوتے ہوتے حضرت والا کی تعلیمات میر صاحب کے زبان و قلم میں سرایت کرگئی۔

اور چونکہ دین پر چلنا اور اللہ کی محبت سیکھ لینا اور اس کے قرب و معرفت کا حاصل کر لینا انسان کے لیے گناہوں کے سمندر میں ڈوب کر تباہ ہو جانے سے بچانے اور بخیر و عافیت اپنی منزل اور ساحل تک پہنچنے کا ذریعہ ہے اس لیے یہ کہنا بالکل بجا اور درست ہے کہ میر صاحب دین کی ایسی کشتی میں سوار ہیں جو انہیں ان کی منزل یعنی اللہ کی رضا اور خوشنودی اور آخرت میں جنتوں کے حصول تک پہنچانے والی ہے۔

حلاوتِ حیات اور دردِ نسبت

زندگی گر فدا ہے مالک پر
کیا حلاوت ہے اس کے جینے میں

چونکہ انسان کے ظاہر اور باطن کے سکون کا دار و مدار اور بنیاد دل کے سکون اور راحت پانے پر ہے اور اسی طرح بے چینی اور پریشانی کی جڑ دل کی بے چینی اور پریشانی ہے اس لیے جو آدمی اللہ تعالیٰ پر پورے طور پر فدا ہوگا اور اس کا ظاہر و باطن سب اللہ کے احکام کے مطابق ڈھلا ہوا ہوگا اس کے دل و دماغ اللہ تعالیٰ کی یاد میں مست ہوں گے تو روح کے قرار پانے کی جو غذا ہے وہ اسے میسر آرہی ہوگی تو پھر اس کے جینے میں حلاوت کا ہونا یقینی بات ہے حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اَهْلُ اللَّيْلِ فِيْ لَيْلِهِمْ اَلَذُّ مِنْ اَهْلِ اللَّهْوِ فِيْ لَهْوِهِمْ یعنی راتوں میں اللہ کے سامنے عبادت کرنے والے زیادہ مزے اور لطف میں ہیں بہ نسبت کھیل تماشہ کرنے والوں کے ان کے کھیل میں جیسا کہ کتاب میں مختلف مقامات پر یہ موضوع مذکور ہوا ہے۔

بے بیانی بھی ہے بیاں اس کا
دردِ نسبت ہے جس کے سینے میں

مختلف اشعار کے ضمن میں یہ بات آئی ہے کہ اہل اللہ کے پاس محض بیٹھنے سے بیان و تقریر کا نفع حاصل ہوتا ہے کیونکہ وہ اپنے سینے میں اللہ تعالیٰ کی محبت کی ایسی آگ لیے رہتے ہیں یا بالفاظ دیگر یوں کہیے کہ ان کے سینوں میں اللہ تعالیٰ کی تجلیات قرب کے انوارات اس قدر ہوتے ہیں کہ جو دل ان سے قریب ہو تو وہ بھی اس آگ سے جلنے اور ان انوارات سے روشن ہونے لگتا ہے اگرچہ بیان اور تقریر کی نوبت نہ آئی ہو اس لیے بزرگوں کا فیض

تقریر و وعظ پر موقوف نہیں ہوتا جیسا کہ یہ چیز روزانہ ہمارے مشاہدے میں ہے مختلف احادیث بھی اس پر دلیل ہیں کہ جن میں صرف اہل اللہ کے پاس بیٹھنے اور ان سے ملنے نیز محبت رکھنے کو نافع قرار دیا گیا ہے اور اس پر فضیلت و اجر کا وعدہ کیا گیا ہے۔

ہے خفا جس سے پالنے والا
کوئی جینا ہے اس کے جینے میں

یعنی جو شخص اس طرح زندگی گزارتا ہو کہ وہ اپنے پالنے والے کو گناہوں اور نافرمانیوں کے ذریعے ناراض کیے ہوئے ہو تو پھر اس کی زندگی زندگی کہلانے کے قابل نہیں اور اس کا جینا کوئی جینا نہیں یعنی بے مقصد حیات اور بے فائدہ زندگی ہے اور بے وجہ جینا ہے اسی لیے تو قرآن نے کافر کو زندہ بھی تسلیم نہیں کیا بلکہ اس کو مردہ سے تعبیر کیا ہے جیسا کہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنَاهُ ایسا شخص جو کہ پہلے مردہ (یعنی گمراہ) تھا پھر ہم نے اس کو زندہ یعنی مسلمان بنا دیا۔

مومن زندہ اور کافر مردہ کیوں؟

حضرت مفتی شفیع صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ اس تمثیل میں مومن کو زندہ اور کافر کو مردہ بتلایا گیا ہے وجہ یہ ہے کہ انسان اور حیوانات اور نباتات وغیرہ میں اگر چہ حیات اور زندگی کی قسمیں اور شکلیں مختلف ہیں لیکن اتنی بات سے کوئی سمجھدار انسان انکار نہیں کر سکتا کہ ان میں سے ہر ایک کی زندگی کسی خاص مقصد کے لیے ہے، اور قدرت نے اس میں اس مقصد کو حاصل کرنے کی پوری اہلیت اور صلاحیت رکھی ہے، ارشاد قرآنی ہے قَالَ رَبُّنَا الَّذِىٓ أَعْطٰى كُلَّ شَىْءٍ خَلْقَهُ ثُمَّ هَدٰى میں اسی کا بیان ہے کہ اللہ جل شانہ نے کائنات عالم کی ہر چیز کو پیدا فرمایا اور اس کو جس مقصد کے لیے پیدا فرمایا تھا اس تک پہنچنے کی اس کو پوری ہدایات دے دیں، جن کے ماتحت ہر مخلوق اپنے اپنے وظیفۂ زندگی اور اپنی اپنی ڈیوٹی کا حق ادا کر رہی ہے۔

اس عالم میں زمین، پانی، ہوا اور آگ، اسی طرح آسمانی مخلوقات اور چاند، سورج اور کل ستارے اپنی اپنی ڈیوٹی پوری طرح پہچان کر اپنے فرائض ادا کر رہے ہیں اور یہی ادائے فرائض ان میں سے ہر چیز کی زندگی کا ثبوت ہے اور جس وقت جس حال میں ان میں سے کوئی چیز اپنی ڈیوٹی ادا کرنا چھوڑ دے تو وہ زندہ نہیں بلکہ مردہ ہے پانی اگر اپنا کام پیاس بجھا دینا اور میل کچیل دور کرنا چھوڑ دے تو وہ پانی نہیں کہلائے گا، آگ جلنا اور جلانا چھوڑ دے تو وہ آگ نہیں رہے گی، درخت اور گھاس اگنا اور بڑھنا پھر پھل پھول لانا چھوڑ دے تو وہ درخت اور نبات نہیں رہے گی کیونکہ اس نے اپنے مقصد زندگی کو چھوڑ دیا تو وہ ایک بے جان مردہ کی طرح ہو گئی۔

تمام کائنات کا تفصیلی جائزہ لینے کے بعد ایک انسان جس میں کچھ بھی عقل و شعور ہو اس بات پر غور کرنے کے

لیے مجبور ہوگا کہ انسان کی زندگی کا مقصد کیا ہے اور اس کی ڈیوٹی کیا ہے اور یہ کہ اگر وہ اپنے مقصد زندگی کو پورا کر رہا ہے تو وہ زندہ کہلانے کا مستحق ہے، اور اس کو پورا نہیں کرتا تو وہ ایک مردہ لاش سے زیادہ کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔

اب سوچنا یہ ہے کہ انسان کا مقصد زندگی کیا ہے اور اس کے فرائض کیا ہیں اور مذکور الصدر اصول کے مطابق یہ متعین ہے کہ اگر وہ اپنے مقصد زندگی اور ڈیوٹی کو ادا کر رہا ہے تو زندہ ہے ورنہ مردہ کہلانے کا مستحق ہے، جن بے بصیرت لوگوں نے انسان کو دینا کی ایک خودرو گھاس یا ایک ہوشیار قسم کا جانور قرار دیدیا ہے اور ان کے نزدیک ایک انسان اور گدھے، کتے میں کوئی امتیاز نہیں، ان سب کا مقصد زندگی انہوں نے اپنی نفسانی خواہشات پورا کرنا، کھانا پینا سونا جاگنا، پھر مرجانا ہی قرار دے لیا ہے، وہ تو اہل عقل وشعور کے نزدیک قابل خطاب نہیں عقلاء دنیا خواہ کسی مذہب وملت اور کسی مکتب خیال سے تعلق رکھتے ہوں ابتداء عالم سے آج تک انسان کے مخدوم کائنات اور افضل المخلوقات ہونے پر متفق چلے آئے ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ افضل واولیٰ اسی چیز کو سمجھا اور کہا جاسکتا ہے، جس کا مقصد زندگی اعلیٰ وافضل ہونے کے اعتبار سے ممتاز ہو اور ہر سمجھ بوجھ والا انسان یہ بھی جانتا ہے کہ کھانے پینے، سونے جاگنے، رہنے سہنے، اوڑھنے پہننے میں انسان کو دوسرے جانوروں سے کوئی خاص امتیاز حاصل نہیں بلکہ بہت سے جانور اس سے بہتر اور اس سے زیادہ کھاتے پیتے ہیں اور جہاں تک اپنے نفع نقصان کے پہچاننے کا معاملہ ہے اس میں بھی ہر جانور بلکہ ہر درخت ایک حد تک باشعور ہے، مفید چیزوں کے حاصل کرنے اور مضر چیزوں سے بچنے کی خاصی صلاحیت اپنے اندر رکھتا ہے، اسی طرح دوسروں کے لیے نفع رسانی کے معاملہ میں تو تمام حیوانات اور نباتات کا قدم بظاہر انسان سے بھی آگے نظر آتا ہے کہ ان کے گوشت، کھال ہڈی، پٹھے اور درختوں کی جڑ سے لے کر شاخوں اور پتوں تک ہر چیز مخلوق کے لیے کارآمد اور ان کی ضروریات زندگی پیدا کرنے میں بے شمار فوائد کی حامل ہے، بخلاف انسان کے کہ نہ اس کا گوشت کسی کے کام آتا ہے نہ کھال نہ بال نہ ہڈی نہ پٹھے۔

انسان اشرف المخلوقات کیوں؟

اب دیکھنا یہ ہے کہ ان حالات میں پھر حضرت انسان کس بناء پر مخدوم کائنات اور افضل المخلوقات ٹھیرتے ہیں، اب حقیقت شناسی کی منزل قریب آپہنچی۔ ذرا سا غور کریں تو معلوم ہوگا کہ ان ساری چیزوں کے عقل وشعور کی رسائی صرف موجودہ زندگی کے وقتی اور ہنگامی نفع نقصان تک ہے اور اسی زندگی میں وہ دوسروں کے لیے فائدہ بخش نظر آتی ہے اس دنیا کی زندگی سے پہلے کیا تھا اور بعد میں کیا آنے والا ہے اس میدان میں جمادات، نباتات تو کیا کسی بڑے سے بڑے ہوشیار جانور کی عقل وشعور بھی کام نہیں دیتی اور نہ اس میدان میں ان میں سے کوئی چیز کسی کے لیے کارآمد یا مفید ہوسکتی ہے، بس یہی وہ میدان ہے جن میں مخدوم کائنات اور افضل المخلوقات انسان کو کام کرنا ہے اور اسی سے اس کا امتیاز دوسری مخلوقات سے واضح ہوسکتا ہے۔

معلوم ہوا کہ انسان کا مقصدِ زندگی پورے عالم کی ابتداء وانتہاء کو سامنے رکھ کر سب کے نتائج اور عواقب پر نظر ڈالنا اور یہ متعین کرنا کہ مجموعی اعتبار سے کیا چیز نافع اور مفید ہے، اور کونسی چیز مضر اور تکلیف دہ ہے پھر اس بصیرت کے ساتھ خود اپنے لیے بھی مفید چیزوں کو حاصل کرنا اور مضر چیزوں سے بچنا اور دوسروں کو بھی ان مفید چیزوں کی طرف دعوت دینا اور بری چیزوں سے بچانے کا اہتمام کرنا ہے تاکہ دائمی راحت وسکون اور اطمینان کی زندگی حاصل ہو سکے اور جب انسان کا مقصدِ زندگی اور کمالِ انسانی یہ معیاری فائدہ خود حاصل کرنا اور دوسروں کو پہنچانا ہے، تو اب قرآن کی یہ تمثیل حقیقت بن کر سامنے آجاتی ہے کہ زندہ صرف وہ شخص ہے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے اور عالم کی ابتداء وانتہاء اور اس میں مجموعی اعتبار سے نفع ونقصان کو وحی الٰہی کی روشنی میں پہچانے، کیونکہ نری عقلِ انسانی نے نہ کبھی اس میدان کو سر کیا ہے نہ کر سکتی ہے، بڑے بڑے عقلاء وحکماء اور فلسفیانِ عالم نے انجام کار اس کا اقرار کیا ہے، مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ نے خوب فرمایا ہے ؎

زیر کان موشگافان دہی
کردہ ہر خرطوم خط ابلہی

اور جب مقصدِ زندگی کے اعتبار سے زندہ صرف وہ شخص ہے جو وحی الٰہی کا تابع اور مومن ہو تو یہ بھی متعین ہو گیا کہ جو ایسا نہیں وہ مردہ کہلانے کا مستحق ہے مولانا رومی نے خوب فرمایا ہے ؎

زندگی از بہر طاعت و بندگی است بے عبادت زندگی شرمندگی ست
آدمیت لحم وشحم و پوست نیست آدمیت جز رضائے دوست نیست

(معارف القرآن، ج:۳، ص:۴۳۵)

زندگی اللہ تعالیٰ کی اطاعت وبندگی کے لیے ہے اگر یہ زندگی اللہ کی عبادت سے خالی ہو تو پھر باعث شرمندگی ہے آدمیت، گوشت، چربی اور کھال کا نام نہیں ہے حقیقی آدمی وہ ہے جو اپنے دوست کے رضا کے سوا کچھ اور مطلب ہی نہ رکھتا ہو بلکہ اسی کو اپنا مطلب سمجھتا ہو۔

علمی وعملی سب کمالات حق تعالیٰ کی دین ہیں

دوستو سب کرم ہے مالک کا
خوبیاں کیا ہیں اس کمینے میں

یعنی جو بھی کچھ عطا ہوا ہے اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے ہے کسی بھی قسم کی کوئی بھی خوبی بندہ کا اپنا ذاتی کمال نہیں ہے، صرف اور صرف ہمارے خالق ومالک اللہ کا کرم ہے اگر یہ حقیقت سامنے رہے تو پھر تکبر قریب آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا اور عجب وخود پسندی سے حفاظت ہو جائے گی اور یہ ایک سچی حقیقت ہے کیونکہ انسان

جب پیدا ہوتا ہے تو ہر قسم کے علمی و عملی کمالات سے خالی ہوتا ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاللّٰہُ اَخْرَجَکُمْ مِنْۢ بُطُوْنِ اُمَّہٰتِکُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَیْـًٔا وَّجَعَلَ لَکُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَۃَ لَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ﴾

(سورۃ النحل، آیت: ۷۸)

ترجمہ: اللہ تعالیٰ نے تم کو تمہاری ماؤں کے پیٹوں سے اس حال میں نکالا کہ تم کچھ بھی نہ جانتے تھے اور اس نے تم کو کان دیئے اور آنکھ اور دل تا کہ تم شکر کرو۔ (معارف القرآن، ج:۵، ص:۳۶۸)

قولہ تعالیٰ **لَا تَعْلَمُوْنَ شَیْـًٔا** اس میں اشارہ ہے کہ علم انسان کا ذاتی ہنر نہیں، پیدائش کے وقت وہ کوئی علم و ہنر نہیں رکھتا، پھر ضرورتِ انسانی کے مطابق اس کو کچھ کچھ علم اللہ تعالیٰ کی طرف سے بلاواسطہ سکھایا جاتا ہے جس میں نہ ماں باپ کا دخل ہے نہ کسی معلّم کا۔ سب سے پہلے اس کو رونا سکھایا۔ اس کی یہی صفت اس وقت اس کی تمام ضروریات مہیا کرتی ہے۔ بھوک پیاس لگے تو وہ روتا ہے۔ سردی گرمی لگے تو رو دیتا ہے۔ کوئی اور تکلیف پہنچے تو رو دیتا ہے۔ قدرت نے اس کی ضروریات کے لیے ماں باپ کے دلوں میں خاص اُلفت ڈالی ہے کہ جب بچے کی آواز سنیں تو وہ اس کی تکلیف کے پہچاننے اور اس کے دور کرنے کے لیے آمادہ ہو جاتے ہیں۔ اگر بچے کو منجانب اللہ یہ رونے کی تعلیم نہ دی جاتی تو اس کو کون یہ کام سکھا سکتا کہ جب کوئی ضرورت پیش آئے تو اس طرح چلّایا کرے۔ اس کے ساتھ ہی اس کو اللہ تعالیٰ نے الہامی طور پر یہ بھی سکھا دیا کہ اپنی غذا کو ماں کی چھاتی سے حاصل کرنے کے لیے اپنے مسوڑھوں اور ہونٹوں سے کام لے۔ اگر یہ تعلیم فطری اور بلاواسطہ نہ ہوتی تو کس معلّم کی مجال تھی جو اس نومولود کو منہ چلانا اور چھاتی کو چوسنا سکھا دیتا۔ اسی طرح جوں جوں اس کی ضروریات بڑھتی گئیں، قدرت نے اس کو بلاواسطہ ماں باپ کے خود بخود سکھا دیا۔ کچھ عرصہ کے بعد اس میں یہ سلیقہ پیدا ہونے لگتا ہے کہ ماں باپ اور دوسرے آس پاس کے آدمیوں کی بات سن کر یا کچھ چیزوں کو دیکھ کر کچھ سیکھنے لگتا ہے اور پھر اُن سنی ہوئی آوازوں اور دیکھی ہوئی چیزوں کو سوچنے سمجھنے کا سلیقہ پیدا ہوتا ہے۔

اسی لیے آیت مذکورہ میں **لَا تَعْلَمُوْنَ شَیْـًٔا** کے بعد فرمایا **وَجَعَلَ لَکُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَۃَ** یعنی اگرچہ ابتداً پیدائش میں انسان کو کسی چیز کا علم نہیں تھا، مگر قدرت نے اس کے وجود میں علم حاصل کرنے کے عجیب وغریب قسم کے آلات نصب کر دیئے تھے۔ ان آلات میں سب سے پہلے سمع یعنی سننے کی قوت کا ذکر فرمایا، جس کی تقدیم کی وجہ شاید یہ ہے کہ انسان کا سب سے پہلا علم اور سب سے زیادہ علم کانوں ہی کے راستہ سے آتا ہے۔ شروع میں آنکھ تو بند ہوتی ہے، مگر کان سنتے ہیں اور اس کے بعد بھی اگر غور کیا جائے تو انسان کو اپنی پوری عمر میں جس قدر معلومات حاصل ہوتی ہیں ان میں سب سے زیادہ کانوں سے سنی ہوئی ہوتی ہیں۔ آنکھ سے دیکھی ہوئی

معلومات اس کی نسبت سے بہت کم ہوتی ہیں۔

ان دونوں کے بعد نمبر اُن معلومات کا ہے جن کو انسان اپنی سنی اور دیکھی ہوئی چیزوں میں غور وفکر کر کے معلوم کرتا ہے اور یہ کام قرآنی ارشادات کے مطابق انسان کے قلب کا ہے۔اس لیے تیسرے نمبر میں اَفئدۃ فرمایا جو فواد کی جمع ہے جس کے معنی قلب کے ہیں۔فلاسفہ نے عام طور پر سمجھ بوجھ اور ادراک کا مرکز انسان کے دماغ کو قرار دیا ہے،مگر ارشادِ قرآنی سے معلوم ہوا کہ دماغ کو اگر چہ اس ادراک میں دخل ضرور ہے،مگر علم و ادراک کا اصلی مرکز قلب ہے۔

اس موقع پر حق تعالیٰ نے سننے، دیکھنے اور سمجھنے کی قوتوں کا ذکر فرمایا ہے۔گویائی اور زبان کا ذکر نہیں فرمایا کیونکہ نطق اور گویائی کو حصولِ علم میں دخل نہیں بلکہ وہ اظہارِ علم کا ذریعہ ہیں۔اس کے علاوہ امام قرطبی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ لفظ سمع کے ساتھ نطق بھی ضمناً آ گیا کیونکہ تجربہ شاہد ہے کہ جو شخص سنتا ہے وہ بولتا بھی ہے، گونگا جو بولنے پر قادر نہیں وہ کانوں سے بھی بہرا ہوتا ہے اور شاید اس کے نہ بولنے کا سبب ہی یہ ہوتا ہے کہ وہ کوئی آواز سنتا نہیں جس کو سن کر بولنا سیکھے۔واللہ اعلم۔(معارف القرآن، ج:۵،ص:۳۸۱)

راہِ سنت پہ جو چلے اختر
ہے عجم اس کا پھر مدینے میں

کوئی شخص جسمانی طور پر مدینہ منورہ سے دور ہو لیکن اتباعِ سنت کے ساتھ زندگی گزارتا ہو اور اپنے قول و فعل کے ذریعے سے احیائے سنت اور نشرِ دین میں مشغول ہو تو ایسا شخص عجم میں رہتے ہوئے بھی گویا کہ مدینے ہی کا باشندہ ہے اس لیے کہ اگر چہ وہ شخص قربِ جسمِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نہیں رکھتا مگر وہ شخص قربِ کارِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دولت سے مالا مال ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہی مشن اور پیغام کو سارے عالم میں پھیلانے میں مشغول و مصروف ہے تو ایسے شخص کا درجہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں زیادہ بڑھا ہوا ہوگا بنسبت اس شخص کے جو مدینے میں پڑا ہوا تو ہے لیکن دین کی نشر و اشاعت اور سنت کی روشنی پھیلانے میں مشغول نہیں ہے۔

ظاہر ہے کہ یہی نقطہ حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے دل و دماغ میں بیٹھا ہوا تھا جس نے ان کو مدینہ چھوڑ کر دنیا کے مختلف ملکوں میں دین پھیلانے کے لیے جانے پر مجبور کیا اور یہاں تک کہ بے شمار صحابہ کرام کی قبریں اسی دین کو پھیلاتے پھیلاتے دنیا کے مختلف ملکوں میں الگ الگ مقامات پر بن گئیں اور چونکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اٹھائے ہوئے تھے اس لیے جتنا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے منشا اور دین کے مزاج سے یہ حضرات واقف تھے کوئی دوسرا ان کے مقابلے میں کبھی بھی نہیں ہوسکتا ہے۔

اسی لیے غالباً یہی وجہ رہی ہے کہ ہمارے اکابر رحمہم اللہ دینی خدمات انجام دینے کے لیے اور امت مسلمہ

کے ایمان واسلام کی حفاظت وبقا کی خاطر باوجود مدینہ منورہ میں مستقل قیام کے مواقع فراہم ہونے کے بھی ہندو پاک اور دوسرے ممالک میں قرآن وسنت کی تعلیمات کو پھیلانے میں لگے رہے جس کی بدولت مدینے سے دور رہتے ہوئے ان کو مدینہ اور مدینے والے یعنی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قرب کی دولت نصیب ہوگئی اور پھر اللہ تعالیٰ کی منشا کے مطابق بہت سے اخیر میں ہجرت کر کے وہیں پہنچ گئے اور اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کے پڑوس میں قیامت تک کے لیے جابسے اور وہاں کی دائمی نیشنلٹی (Nationality) حاصل کر لی۔

ایں سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

یہ سعادت کسی کے اپنے اختیار سے نہیں ہوتی بس اسی کو ملتی ہے جسے خدائے کریم ورحیم عطا فرمادیتے ہیں اللہ تعالیٰ ہم سب کو بھی اسی طرح زندگی گزارنے کی توفیق دے کہ زندگی بھر سارے عالم میں پھر پھر کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا دین پھیلاتے رہیں اور جب دنیا سے جانے کا وقت قریب آئے تو اللہ تعالیٰ مدینے میں بلا کر جنت البقیع میں ہمارے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کے پڑوس میں دفن کی سعادت میسر فرمائے۔

میر مرنا نہ حسن فانی پر

میر مرنا نہ حسن فانی پر — حسن فانی کے رنگ فانی پر
جس کا پانی بدلنے والا ہو — میر مرنا نہ ایسے پانی پر
ہے گلستاں میں جس سے شادابی — ہوں فدا اس کی باغبانی پر
جو جوانی فدا خدا پر ہو — میں ہوں قربان اس جوانی پر
دل فدا اپنے رب پہ کر اختر — کر بھروسہ نہ زندگانی پر

مشکل الفاظ کے معانی:۔شادابی: ہریالی۔فدا: قربان۔زندگانی: زندگی۔

عشقِ مجازی کا مؤثر علاج

ان تمام اشعار میں حضرت والا دامت برکاتہم نے اپنے ایک خاص موضوع زندگی کے متعلق بڑے مدلل انداز سے گفتگو فرمائی ہے اور وہ یہ ہے کہ دنیا کے حسنِ فانی پر مرنے والا انتہائی نادان اور ناعاقبت اندیش ہے۔ حضرت والا کی زندگی کا یہ خاص موضوع ہے جس پر حضرت والا دنیا بھر میں بیان فرماتے پھرتے ہیں اور بہت سارے مواعظ میں اس مضمون کا تذکرہ ہے کیونکہ جب انسان حسنِ فانی پر دل دے دیتا ہے اور اس پر مرتا ہے تو پھر اللہ تبارک وتعالیٰ سے وہ دور ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس لیے جتنا حسنِ فانی سے دور ہوگا تو حسن باقی سے قریب حاصل ہوگا اور اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات کے ساتھ اُس کا تعلق اتنا ہی گہرا اور قوی اور مضبوط ہوتا چلا جائے گا۔

میرے دوستو! حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ کے کلام میں دعوی مع دلیل موجود ہے۔ اور وہ اس طرح کہ حسنِ فانی پر نہ مرنے کی وجہ خود اُس کا فانی ہونا ہے۔ یعنی مٹنے والا اور ختم ہونے والا ہونا، لہٰذا اگر کسی نے اُس پر دل دیا تو گویا ایسی چیز کا عاشق اور شیدائی بنا جو چند دن کے بعد مٹ کر ختم ہوجائے گی۔ اور بالآخر اِس کو کفِ افسوس ملنے پڑیں گے اور پچھتانا پڑے گا کہ ہائے! کہاں گیا میرا معشوق ومحبوب۔

اور اگر حضرت والا کے اس مضمون میں مزید وسعت پیدا کرتے ہوئے ہم اس اشعار میں پوری دنیا کے ظاہری حسن اور اس کے زیب وزینت، چمک دمک، رنگ و رونق اور سجاوٹ بجاوٹ مراد لے لیں تو یہ ہمارے خوبصورت بنگلے اور اعلیٰ درجے کی عشرت گاہیں ہر ایک کو دل نہ دینا اس کلام کا مصداق ہوگا کیونکہ یہ سبھی فنا ہوکر مٹ جانے والی چیزیں ہیں اور جب انسان دنیا کی ان چیزوں سے محبت نہیں کرے گا بلکہ اُس کا دل ہر غیر اللہ سے خالی ہوگا پھر یقیناً اس کے دل میں اللہ کی محبت پیدا ہوجائے گی کیونکہ حُبُّ الدُّنْیَا رَأْسُ کُلِّ خَطِیْئَۃٍ یعنی دنیا کی محبت ہر خطا اور بُرائی کی جڑ ہے۔ اس لیے عمر کی ہر حالت دوسری حالت میں بدل جانے والی ہے۔ بچپن سے جوانی اور جوانی سے بڑھاپا اور بالآخر فنا ہوکر مٹ جانا اور ختم ہوجانا۔ جس کو ایک موقع پر حضرت والا نے جب وہ نواب

چھتاری کے یہاں مہمان تھے اپنے خاص درد بھرے انداز سے یوں پیش فرمایا۔

بہت خوشنما ہیں یہ بنگلے تمہارے
یہ گملوں کے جھرمٹ یہ رنگین نظارے
ارے جی رہے ہو یہ کس کے سہارے
کہ مرنے سے ہو جائیں گے سب کنارے

معشوق ہوں یا دنیا کی دوسری چیزیں مثلاً مال و دولت، منصب و عہدہ، نام و نمود، عزت و وقار، لوگوں کی نگاہوں میں بڑا بننے کی فکر کی غرض سے تصنیف، تقریر اور وعظ وغیرہ کرنا کہ میں لوگوں میں مشہور ہو جاؤں۔ میرے دوستو! یہ ساری دنیا ہے، سارا غیر اللہ ہے، سب کچھ مٹ کے ختم ہونے والا ہے جب ہم دنیا سے جائیں گے تو خالی ہاتھ ہوں گے۔ سوائے اُن اعمال کے جو اخلاص کے ساتھ کیے گئے ہوں ان کے سوا اور کچھ نافع اور کارآمد نہ ہوگا۔ جیسا کہ حضرت والا کے وعظ میں ہم نے یہ سنا کہ شاہ محمد احمد پرتابگڈھی یہ اشعار پڑھا کرتے تھے۔

مال و اولاد تیری قبر میں جانے کو نہیں
تجھ کو دوزخ کی مصیبت سے چھڑانے کو نہیں
جز عمل گور میں کوئی بھی تیرا یار نہیں
کیا قیامت ہے کہ تو اس سے خبردار نہیں

اسی موضوع پر یہ شعر ہم نے حضرت والا کے وعظ میں سنا۔

کئی بار ہم نے یہ دیکھا
کہ جن کا معطر بدن تھا مبیض کفن
جو قبرِ کہن اُن کی اکھڑی تو دیکھا
نہ عضوِ بدن تھا نہ تارِ کفن تھا

اللہ والوں کے اشعار میں ایسی عجیب تاثیر ہوتی ہے کہ اُن کو سن کر سامعین کے دل کی دنیا بدل جاتی ہے۔

حضرت والا کے اشعار سن کر ایک شاعر کا تأثر

چنانچہ ایک مقام پر احقر ہندوستان کے سفر کے موقع پر حضرت والا کے اشعار سنانے کے لیے بیٹھ گیا اور عشاء کے بعد کافی دیر تک عشقِ مجازی اور حسنِ مجازی کے زوال و فنائیت کے عنوان پر حضرت والا کے کچھ اشعار سنا کر کچھ تشریح پیش کی تو ایک شاعر مجلس سے واپس جا کر بعض احباب کے سامنے یہ تذکرہ کرنے لگے کہ جناب شعر و اشعار تو ہم بھی کہتے اور سنتے ہیں لیکن آج یہ جو ہم نے سنے ہیں یہ تو بالکل الگ قسم کے اشعار ہیں، یہ تو عام اشعار کی

طرح نہیں ہے۔

اور احقر نے خود بارہا مختلف ممالک میں اس نوع کے سفر کرنے کے بعد یہ بات محسوس کی کہ جب حضرت والا کے اشعار کسی بھی جگہ پڑھ کر سنائے گئے تو لوگ اس طرح دیوانہ وار ٹوٹ پڑتے تھے جس طرح شہد کی مکھیاں اپنے امیر وسردار مکھی کے پیچھے گروہ در گروہ جاتی ہیں اور ایسے مجلس میں دل جمعی کے ساتھ بیٹھ کر سنتے تھے کہ جو کبھی وہاں متوقع نہیں ہوتا تھا۔

جس کی وجہ درحقیقت حضرت والا کے اشعار میں اللہ تعالیٰ کی محبت کا خاص درد وغم موجود ہونا ہے۔ اسی لیے اہلِ علم کو حضرت شاہ ابرار الحق صاحب ہردوئی رحمہ اللہ خاص طور پر یہ نصیحت فرماتے تھے کہ علم کا پڑھنا اور ہے اور اس کو عملی طور پر سیکھنا اور ہے۔ علماء کو چاہیے کہ وہ اہل اللہ کے پاس رہ کر دین کو عملی طور پر سیکھیں تاکہ اصل جینے کا مزہ اور حلاوت نصیب ہو۔ اسی لیے حضرت مفتی تقی عثمانی دامت برکاتہم نے نصابِ تعلیم کے موضوع پر لکھی گئی کتاب میں یہ بات لکھی ہے کہ دار العلوم دیوبند میں کوئی بھی مدرس ایسا نہیں رکھا جاتا تھا جس کا کسی اللہ والے سے اصلاحی تعلق نہ ہو اور اس اُم المدارس دیوبند کا دربان اور چپڑاسی بھی صاحبِ نسبت ولی اللہ ہوا کرتا تھا۔

بہرحال حضرت والا کے کلام کا حاصل یہ ہے کہ جو کچھ فنا ہو کر ختم ہو جانے والا ہے اس پر مرنا اور اس کو دل دینا نہیں چاہیے بلکہ وہ اللہ جو ساری کائنات کی تمام خوبصورت اشیاء کو خوبصورتی دینے والا اور تمام حسین چیزوں کو حسن بخشنے والا ہے۔ گلستانوں میں شادابی اور چمن کی رونقیں سب اُس کی عطا ہیں۔ اُسی اللہ پر فدا ہونا چاہیے کیونکہ ہمیں جوانی دے کر تمام صلاحیتیں دینے والا وہی اللہ ہے لہٰذا صرف وہی اس لائق ہے کہ ہم اُس پر اپنی جوانی کو فدا کریں اور فوراً بلا کسی تاخیر ہر غیرِ خدا سے اپنے دل کو پاک وصاف کر لیں۔

اس کے لیے کوئی مدت اور وقت مقرر کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس لیے کہ ہم اپنی زندگی پر ایک لمحہ بھروسہ نہیں کر سکتے جو صبح کو زندہ ہے اُسے اپنی شام کا بھروسہ نہیں اور جو شام کو زندہ ہے اُسے صبح کا بھروسہ نہیں۔ اس لیے اس گفتگو کو پڑھتے اور سنتے ہی فوراً ہمیں اپنے دل میں یہ فیصلہ کرنا چاہیے کہ اب یہ زندگی اور جوانی صرف ایک اکیلے اللہ پر فدا اور قربان کروں گا اور جتنا جو کچھ ہوا ہے اسی لمحے اُس سے تائب ہو جائے، ندامت کے ساتھ اُس کو ترک کر دے اور آئندہ نہ کرنے کا پختہ ارادہ کر لے۔ جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خاص نصیحت ہے:

﴿إِذَا أَصْبَحْتَ فَلَا تُحَدِّثْ نَفْسَكَ بِالْمَسَاءِ﴾

(سنن الترمذی، کتاب الزهد)

جب صبح ہو تو دل میں شام کا خیال نہ لاؤ اور جب شام ہو تو دل میں صبح کا خیال نہ لاؤ یعنی چوبیس گھنٹے میں ہر وقت آخرت کے لیے مستعد رہو۔ سچے پکے مؤمن کی شان یہی ہوا کرتی ہے اور اس پوری نظم کا نچوڑ اور خلاصہ بھی یہی ہے اور اس میں یہی سبق ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی تیاری کی توفیق عطا فرمائے۔

خاک پر منزل آسماں مل گئی

رخصت درد عشق بتاں مل گئی قربت صاحب آسماں مل گئی
نسبت اولیاء زماں مل گئی دولت فیض پیر مغاں مل گئی
ان کی یادوں کی آہ و فغاں مل گئی دوستو! دولت دو جہاں مل گئی
راہ میں صحبت رہبراں مل گئی خاک پر منزل آسماں مل گئی
دامن کوہ میں دامن فقر میں لذت قرب سلطان جاں مل گئی
مل گئی جب سے توفیق ذکر خدا روح کو راحت دوجہاں مل گئی
ربط گلشن کی کیا یہ کرامت نہیں دشت میں راحت آشیاں مل گئی
ان کی خاطر اٹھایا جو حسرت کا غم روح کو عشرت دو جہاں مل گئی
صحبت شیخ کامل سے اختر کو بھی لذت راہ رب جہاں مل گئی

مشکل الفاظ کے معانی:۔ **رخصتِ عشق**: نامحرم حسین لڑکیوں اور امارد کے ناپاک عشق میں ہونے والی تکلیف سے چھٹکارا۔ **قربت**: نزدیکی۔ **صاحبِ آسمان**: اللہ تعالیٰ۔ **پیرِ مغاں**: شیخ کامل۔ **رہبراں**: اللہ والے۔ **خاک**: زمین۔ **کوہ**: پہاڑ۔ **فقر**: غربت۔ **سلطان**: اللہ تعالیٰ۔ **ربط**: تعلق۔ **گلشن**: باغ۔ **دشت**: صحرا۔ **راحت**: سکون۔ **آشیاں**: گھونسلہ۔ **حسرت کا غم**: گناہ سے بچنے کا غم۔ **عشرت**: خوشی۔

عشق بتاں سے رخصت پر صاحبِ آسمان سے قربت ملتی ہے

رخصت درد عشق بتاں مل گئی
قربت صاحب آسماں مل گئی

حضرت والا ارشاد فرماتے ہیں کہ بتوں کا دردِ عشق جب دل سے رخصت ہوا اور نامحرم لڑکیوں یا بے ریش امرد لڑکوں کی محبت سے دل بالکل مکمل طور پر صاف اور خالی ہوگیا تو اللہ تعالیٰ سے تعلق کا مزہ دل میں محسوس ہونے لگا کیونکہ غیر اللہ دل سے نکلتے ہی اللہ تعالیٰ کی محبت دل میں آنا شروع ہوجاتی ہے یہاں تک کہ عشق بتاں میں ایسے چہروں سے محبت بھی شامل ہے کہ جو اگرچہ بہت خوبصورت نہ ہوں یا ان کے چہروں پر ہلکی داڑھی ہو لیکن طبیعت کا ان کی طرف میلان ہوتا ہو جس کو حضرت والا اپنے مخصوص انداز میں یوں بیان فرماتے ہیں کہ جو بخار بدن میں اندر اندر تھوڑا تھوڑا رہتا ہے وہ بھی خطرناک ہوتا ہے کیونکہ وہ ہڈیوں میں سرایت کر جاتا ہے اس سے بھی بے فکر نہیں ہونا چاہیے تو اسی طرح ایسے موقع پر سالک کو دل کے میلان اور طبیعت میں لذت محسوس ہونے کی وجہ سے ایسے تعلقات چھوڑ دینے چاہیے ورنہ خوبصورت چہروں کے مقابلے میں کبھی کبھی ایسی شکلیں ہی خطرناک قسم کے عشق کا باعث بن

کر دین وایمان کی تباہی کا باعث بن جاتی ہے۔

اس میں مدارس کے اہلِ علم اساتذہ کے لیے بھی ایک خاص نصیحت ہے کہ ایسے طلبہ کو بلا کر تنہائی میں خدمت لینا یا بدن دبوانا یا تنہائیوں میں ان کو کمروں میں بلانا اوران سے ملنا یہ زہر قاتل سے کم نہیں کیونکہ حکیم الامت تھانوی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اس کے نقصانات اتنے ہیں کہ میرے احاطہ تحریر سے باہر ہے اور خود حضرت تھانوی نے اپنے متعلق احباب سے یہ سخت تاکید کر رکھی تھی کہ تنہائی میں کبھی کسی بے ریش لڑکے کو میرے پاس ہرگز نہیں بھیجنا۔ یہ ایسی چیزیں ہیں کہ خالی علم پڑھ کر اور مدرسوں سے سندیں لے کر حاصل نہیں ہوتیں بلکہ اس طرف ذہن بھی نہیں جاتا بعض مقامات پر ہندوستان میں حضرت والا دامت برکاتہم کا جب سفر ہوا اور حضرت نے مدارس میں اس موضوع پر بیان کیا تو بعض خاص لوگ حضرت سے بیان کے بعد ملنے کے لیے آئے اور فرمانے لگے کہ حضرت اس مرض کا ہمیں احساس تک نہیں تھا، آپ کے بیان میں توجہ دلانے کے بعد اس کا احساس دل میں پیدا ہوا کیونکہ عام طور پر عورتوں سے بچنا اوران سے پردہ رکھنا تو ذہن میں آتا ہے لیکن امرد لڑکوں سے یہ معاملات نہ کرنا اس طرف ذہن نہیں جاتا۔

بہرحال جب یہ غیر اللہ دل سے نکل جائے گا تو پھر اللہ تعالیٰ کی محبت دل میں داخل ہوجائے گی اور عشق بتاں کے مفہوم میں مزید توسع کرتے ہوئے اگر یوں کہا جائے تو بھی غلط نہیں ہے کہ یہ لفظ اللہ تعالیٰ کے ہر غیر کو شامل ہے خواہ وہ کسی بھی شکل میں دل میں موجود ہو، اس لیے سب کچھ دل سے نکال دیا جائے جیسا کہ حضرت مفتی شفیع صاحب نے تحریر فرمایا ہے ''اور اگر عبادت اصنام کا لفظ صوفیائے کرام کے اقوال کے مطابق اپنے وسیع مفہوم میں لیا جائے کہ ہر وہ چیز جو انسان کو اللہ سے غافل کرے وہ اس کا بت ہے اور اس کی محبت سے مغلوب ہو کر خدا تعالیٰ کی نافرمانی پر اقدام کر لینا ایک طرح سے اس کی عبادت ہے، تو اس دعا یعنی عبادتِ اصنام سے محفوظ رہنے میں تمام گناہوں سے حفاظت کا مضمون آجاتا ہے، بعض صوفیائے کرام نے اسی معنی میں اپنے نفس کو خطاب کر کے غفلت و معصیت پر ملامت کی ہے۔

سودہ گشت از سجدہ ٔ راہ بتاں پیشانیم
چند بر خود تہمت دین مسلمانی نہم

اور عارف رومی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے۔

ہر خیال شہوتے در رہ بتے ست

(معارف القرآن، ج:۵،ص:۲۵۰)

حبِ جاہ بھی ایک بت ہے

اس لیے اپنے کسی عمل سے اپنا مقام و مرتبہ اور نام و نمود اور شہرت و عزت وغیرہ لوگوں کی نگاہوں میں چاہنا یہ بھی ایک طرح کا بت ہے جب تک اس سے دل صاف نہ ہو تو اللہ تعالیٰ کا صحیح قرب حاصل نہیں ہوتا ایک مرتبہ احقر گنگوہ میں حضرت علامہ رشید احمد گنگوہی کے خاندان میں ایک بزرگ حکیم عبد الرشید (ننومیاں) سے ملنے کے لیے حاضر ہوا تو حضرت اس وقت بیمار تھے اور چادر اوڑھے ہوئے لیٹے تھے ہماری نصیحت کی درخواست پر حضرت نے اسی جملے پر تقریر فرمائی:

﴿وَقَدْ قَالَتِ السَّادَةُ الصُّوْفِيَّةُ اِنَّ اٰخِرَ مَا يَخْرُجُ مِنْ رَّأْسِ الصِّدِّيْقِيْنَ مَحَبَّةُ الْجَاهِ﴾

(المرقاۃ، ج: ۵، ص: ۵۴)

اسی جملہ پر تقریر فرمائی کہ صالحین صدیقین کے دلوں سے بھی سب سے اخیر میں نکلنے والی چیز جاہ اور مقام کی محبت ہے کہ مال کو تو ٹھکرا دیا جائے گا لیکن اپنی بڑائی اور عظمت کا چاہنا یہ دل کے نہاں خانوں میں موجود رہتا ہے چنانچہ ایک مقام پر ہمارے ایک دوست نے یہ واقعہ سنایا کہ کسی نے ایک عالم کو ایک گاڑی نئی لا کر اس کی چابی پیش کی اور ان سے عرض کیا کہ یہ گاڑی آپ کے لیے ہدیہ ہے مگر انہوں نے اس کو لینے سے انکار کر دیا لیکن پھر اسی واقعہ کو جگہ جگہ نقل کرتے پھرتے تھے اور کوئی اس کو نقل کرتا تو اس سے خوش ہوتے تھے کہ لوگوں کو یہ اندازہ ہو کہ میں دنیا سے کوئی تعلق نہیں رکھتا ہوں اور ان کے دلوں میں میرا مقام پیدا ہوا اور اب لوگوں نے مجھے پہچانا کہ میں کیسا زاہد انسان ہوں جب کہ اس کی حقیقت اس سے زیادہ اور کچھ بھی نہیں کہ ایک غیر اللہ کو دل سے نکالا اور دوسرے کو دل میں بسا لیا۔

ثناءِ خلق کا ملنا نعمت اور بشارت ہے

البتہ اگر اعمالِ صالحہ اختیار کرنے کی بنیاد پر اور تقویٰ و دین داری کے سبب اللہ تعالیٰ لوگوں میں اچھا نام پیدا کر دیں اور ان کی زبانوں پر تعریفی کلمات اور مدح و ثناء کے جملے جاری ہونے لگیں اور خود اپنے اعمال سے اس کی خواہش اور تمنا نہ کی ہو تو یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مومن کو ملنے والی ایک عطا اور تحفہ اور دنیا میں پیشگی حاصل ہونے والی خوش خبری ہے۔ جس کے بارے میں امام نووی رحمہ اللہ نے یہ حدیث شریف نقل فرمائی کہ:

﴿قِيْلَ لِرَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَرَأَيْتَ الرَّجُلَ يَعْمَلُ الْعَمَلَ مِنَ الْخَيْرِ وَيَحْمَدُهُ النَّاسُ عَلَيْهِ قَالَ تِلْكَ عَاجِلُ بُشْرَى الْمُؤْمِنِ﴾

(صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ والآداب)

ایک صحابی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھتے ہیں یارسول اللہ اگر کوئی اچھا عمل کرے اور پھر لوگ اس پر اس کی تعریف

کریں تو اس کے بارے میں آپ کیا فرمائیں گے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ یہ مومن کو پیشگی ملنے والی بشارت اور خوش خبری ہے اور گویا موت کے بعد پیش آنے والے اچھے حالات کا پیش خیمہ ہے۔

اسی لیے اپنے اعمال سے لوگوں میں تعریف چاہنا تو مذموم اور برا ہے لیکن اسی بات کی اللہ تعالیٰ سے درخواست کرنا اور لوگوں کی نگاہوں میں اپنی عزت اللہ تعالیٰ سے مانگنا برا نہیں ہے چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف دعاؤں میں یہ دعا بھی اللہ تعالیٰ سے مانگی:

﴿اَللّٰھُمَّ اجْعَلْنِیْ فِیْ عَیْنِیْ صَغِیْرًا وَّ فِیْ اَعْیُنِ النَّاسِ کَبِیْرًا﴾

(کنز العمال)

کہ اے اللہ! مجھے میری نگاہ میں چھوٹا کر دے اور لوگوں کی نگاہ میں بڑا کر دے اور دوسری دعا اس طرح سے ہے

﴿وَفِیْ نَفْسِیْ لَکَ رَبِّیْ فَذَلِّلْنِیْ وَفِیْ اَعْیُنِ النَّاسِ فَعَظِّمْنِیْ﴾

(کنز العمال)

کہ اے اللہ! آپ اپنے لیے مجھے میرے دل میں کمتر بنا دے اور لوگوں کی نگاہوں میں مجھے عظمت و عزت عطا فرما دے اس لیے ان دو باتوں میں فرق کرنا ضروری ہے کہ اپنے عمل سے لوگوں کی نگاہوں میں عزت چاہنا عنداللہ ناپسندیدہ ہے اور اللہ تعالیٰ سے اس چیز کو مانگنا یہ مطلوب ہے اور عبادت ہے۔

اولیاء و مشائخ سے للہ محبت کی عظیم فضیلت

نسبت اولیاء زماں مل گئی
دولت فیض پیر مغاں مل گئی

جب کسی سچے اللہ والے سے تعلق قائم ہو جاتا ہے تو اس کے فیض صحبت کی برکت سے اللہ تعالیٰ اسے بھی اولیاء اللہ میں شمار کر لیتے ہیں اور وہی نسبت اولیاء اس شخص کو بھی حاصل ہو جاتی ہے لیکن یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ یہ سارا فیض اصل فیاض حقیقی اللہ تعالیٰ کی ذات سے آتا ہے باقی شیخ اور استاذ صرف دنیا میں ذریعہ ہیں اور اللہ تعالیٰ کی سنت دنیا میں اسی طرح سے ہے کہ وہ اپنے اولیاء کی صحبت میں بیٹھنے والوں کو ان کی صحبت کی برکت سے ولی بنا دیتے ہیں یہی توجہ ہے کہ آپس میں اللہ تعالیٰ کے لیے محبت رکھنے پر اتنی عظیم الشان فضیلت وارد ہوئی ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

﴿قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ مِنْ عِبَادِ اللّٰہِ لَاُنَاسًا مَا ھُمْ بِاَنْبِیَآءَ وَلَا شُھَدَآءَ یَغْبِطُھُمُ الْاَنْبِیَآءُ وَالشُّھَدَآءُ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ بِمَکَانِھِمْ مِنَ اللّٰہِ تَعَالٰی قَالُوْا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ تُخْبِرُنَا مَنْ ھُمْ قَالَ ھُمْ قَوْمٌ تَحَابُّوْا بِرُوْحِ اللّٰہِ عَلٰی غَیْرِ اَرْحَامٍ مَبَیْنَھُمْ وَلَا اَمْوَالٍ یَتَعَاطَوْنَھَا فَوَاللّٰہِ اِنَّ وُجُوْھَھُمْ لَنُوْرٌ وَّاِنَّھُمْ عَلٰی نُوْرٍ لَا یَخَافُوْنَ اِذَا خَافَ النَّاسُ وَلَا یَحْزَنُوْنَ اِذَا حَزِنَ النَّاسُ وَقَرَأَ ھٰذِہِ الْاٰیَۃَ

أَلاَ إِنَّ أَوْلِيَآءَ اللهِ لاَ خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلاَ هُمْ يَحْزَنُوْنَ

(سنن ابی داؤد، کتاب البیوع، باب الرھن)

ترجمہ: ''حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ کے بندوں میں ایسے بھی لوگ ہیں جو نہ پیغمبر ہیں اور نہ شہید ہیں اور پیغمبر اور شہید قیامت کے روز ان پر ان کے ایک خاص رتبے کی وجہ سے جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان کو حاصل ہوگا رشک کریں گے لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہ آپ ہم کو خبر دیجئے کہ وہ کون لوگ ہیں؟ آپ نے فرمایا یہ وہ لوگ ہیں جو محض حق تعالیٰ کے تعلق سے باہم محبت رکھتے ہیں نہ تو آپس میں کوئی رشتہ ناطہ ہے اور نہ کچھ روپیہ پیسے کا لین دین ہے۔ بخدا ان کے چہرے نورانی ہوں گے اور نور کے مکانات پر جلوہ گر ہوں گے جب لوگ مبتلاءِ خوف ہوں گے وہ خائف نہ ہوں گے اور جب لوگ مغموم ہوں گے تو وہ مغموم نہ ہوں گے اور یہ آیت پڑھی أَلاَ إِنَّ أَوْلِيَآءَ اللهِ لاَ خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلاَ هُمْ يَحْزَنُوْنَ

فائدہ: اس سے یہ شبہ نہ کیا جائے کہ یہ لوگ انبیاء سے افضل ہو گئے کیونکہ یہ ایک جزوی معاملہ ہے کبھی کسی خاص وجہ سے اکابر بھی اصاغر کی خاص حالت کی تمنا کیا کرتے ہیں مثلاً انبیاء غم امت میں مشغول ہیں اور یہ عین دلیل ان کی افضلیت کی ہے اور ممکن ہے کہ یہ لوگ اس سے خالی ہوں۔ و نحو ذالک. (التکشف، ص:۳۲۸)

اسی لیے یہ خانقاہ میں آمد و رفت والی محبت کیونکہ اس کی بنیاد اللہ تعالیٰ کی محبت ہے تو ہمیں اللہ تعالیٰ کی ذات سے یقین ہے کہ یہ محبت اس فضیلت کی مصداق ہے اس لیے عام طور پر نہ تو ہمارا خونی رشتہ ہے اور نہ کوئی دنیوی غرض ہے کہ یہاں مال و دولت اور عہدے اور منصب کی تقسیم ہوتی ہو بلکہ اللہ تعالیٰ کی محبت سیکھنے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سچی اتباع کا سیکھنا سکھانا یہی اصل یہاں کے قیام کا مقصود ہوتا ہے اس لیے ان شاء اللہ قیامت کے دن یہاں آنے جانے والے اس فضیلت کے مصداق ہوں گے۔

معرفت ومحبت کا دینا کسی پیر کے بس میں نہیں ہے

ہاں البتہ یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ اللہ کی محبت وعشق اور کمال ایمان وتقویٰ یہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کے دینے سے حاصل ہوسکتا ہے کوئی بڑے سے بڑا بزرگ اور غوث وقطب وابدال بھی اپنے ارادے اور اختیار سے کسی کو بزرگی اور تقویٰ نہیں دے سکتا اور نہ ہی کسی کو محبت خداوندی کی شراب پلا سکتا ہے۔

اس لیے جو لوگ بزرگوں سے اس طرح کی چیزوں کی توقع اور امید رکھتے ہیں یا ان سے درخواست کرتے ہیں جیسا کہ بعض مواقع پر دیکھا گیا ہے احقر کی ناقص رائے میں شرعی طور پر اس کی گنجائش نہیں مثلاً اس طرح کے الفاظ کہ حضرت جو خزانہ آپ کے سینے میں ہے ہمیں عطا کر دیجئے یا یہ کہ حضرت جو شراب محبت کا دریا آپ نے پیا ہے اس میں سے کچھ ہمیں پلا دیجئے وغیرہ وغیرہ اس نوع کے جملے کسی انسان سے ہدایت اور تقویٰ مانگنے کے معنیٰ

میں ہیں اور یہ کام ولی تو کیا نبی کو بھی سونپا نہیں گیا ورنہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اپنے چچا ابو طالب کو موت سے پہلے پہلے ضرور کلمہ پڑھا دیتے کیا کسی میں یہ جرات وہمت ہے کہ وہ یہ کہہ دے کہ کسی ولی میں تو توجہ ڈال کہ مرید کے دل کو بدلنے کی طاقت ہے لیکن العیاذ باللہ حضور کو یہ طاقت میسر نہ تھی تو پھر آخر اس طرح کے غلط معنیٰ کا احتمال لیے ہوئے الفاظ اہل حق حضرات کو اپنے مشائخ کے لیے استعمال کرنے کی کیا ضرورت ہے جب کہ دوسرے عزت و عظمت والے الفاظ موجود ہیں مثلاً حضرت خاص دعاؤں میں یاد فرمائیں، میری جانب خاص توجہ فرمائیں، میری اصلاح فرما دیجئے اور اس ناکارہ کی جانب اپنی نظر عنایت کا رخ پھیر دیجئے وغیرہ وغیرہ۔ اور جو کبھی بزرگوں کے ایسے واقعات ہیں تو حضرت تھانوی قدس سرہ نے فرمایا ہے کہ وہ ان کے اختیار سے نہیں ہے بلکہ وقتی طور پر من جانب اللہ بطور کرامت ان سے صادر ہوا اس لیے اس سے غلط شبہ نہ کیا جائے۔

کبھی کبھی معمولی جملوں کے ہیر پھیر سے ہدایت وضلالت اور حق و باطل کا فرق پیدا ہو جاتا ہے مثلاً اولیا اللہ کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ خدا نہیں مگر خدا سے جدا بھی نہیں اسی کو ذرا لفظ بدل کر کوئی یوں کہہ دے کہ وہ خدا نہیں تو وہ غیر خدا بھی نہیں تو یہ جملہ بولتے ہی انسان نے اپنے آپ کو بہت خطرناک موڑ پر لا کر کھڑا کر دیا جس کا فیصلہ علمائے اہل حق کے فتاویٰ سے کیا جا سکتا ہے اس لیے اس طرح کے معاملات میں توحید کی حفاظت پہلے درجے میں فرض ہے جس کی خاطر ہمیں نہایت احتیاط کی ضرورت ہے اور اگر بعض مواقع پر ہمارے اکابر و اسلاف سے اس طرح کی درخواستیں ثابت ہیں۔ جیسا کہ حضرت والا کے بعض اشعار میں اور ایک موقعہ پر خود حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے حضرت حاجی صاحب سے کچھ اسی انداز سے درخواست پیش کی تو اس کے معانی وہی توجہ کرنا اور اللہ تعالیٰ سے خصوصی دُعائیں کرنا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

ان کی یادوں کی آہ و فغاں مل گئی
دوستو! دولت دو جہاں مل گئی

جس آدمی کو اللہ تعالیٰ کی محبت نصیب ہوگئی ہو اور اس کی یاد میں آہ و فغاں کرنے کی دولت حاصل ہوگئی ہو تو سمجھو کہ اسے دنیا و آخرت کی ساری نعمتیں مل گئی ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کی محبت اتنی اونچی دولت ہے کہ اس کے نتیجے میں انسان اللہ تعالیٰ کو پالیتا ہے اور جو اللہ کو پالے گا تو سمجھو اس نے دونوں جہاں پالیے بلکہ اس سے بھی بڑی دولت پالی ہے کیونکہ دونوں جہاں تو مخلوق ہیں ان کے ملنے میں وہ لطف کہاں حاصل ہو سکتا ہے جو اللہ تعالیٰ کو پالینے سے مومن کو دنیا میں حاصل ہوتا ہے۔

آخر یہی تو وجہ ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب آپ کی قوم کے کفار و مشرکین دعوت توحید و رسالت سے روکنے کے لیے آئے تھے اور آپ کو سب کچھ پیش کرنے کی پیشکش کی تھی اور ہر مطلوبہ تمنا پوری کر دینے

کا لالچ دیا تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی جواب دیا تھا کہ اگر ایک ہاتھ میں چاند اور دوسرے میں سورج رکھ دیا جائے تب بھی میں اس دعوت الی اللہ سے باز نہیں آؤں گا درحقیقت اللہ تعالیٰ سے محبت اور تعلق میں کچھ ایسا ہی مزہ نصیب ہوتا ہے کہ پھر اسے دنیا کے مال و دولت کا کوئی لالچ اور خیال دل میں قائم نہیں رہتا نہ اس کی حرص وطمع دل ودماغ میں باقی رہتی ہے۔ (معارف القرآن، جلد:۳، صفحہ:۴۱۹)

ہمارے استاذ حضرت مولانا وحید الزماں کیرانوی نے ایک مرتبہ تبلیغی جماعت کے ایک پروگرام میں دارالعلوم دیوبند کی چھتہ مسجد میں حضرت مولانا قاسم نانوتوی کا یہ قصہ سنایا کہ جب ان کے بیٹے حضرت مولانا احمد کی شادی ہوئی تو انہوں نے لکڑی کا ایک (سوٹ کیس) بنوالیا تا کہ اس میں اپنے اور بیوی کے کپڑے وغیرہ رکھیں تو اس پر بھی حضرت مولانا قاسم نانوتوی نے یہ بات ارشاد فرمائی کہ احمد اگر قاسم کے ساتھ رہنا ہے تو یہ تکلفات نہیں چلیں گے جاؤ یہ اٹیچی کسی غریب فقیر کو صدقہ کر کے آجاؤ۔

صحبت رہبر سے خاک پر منزل آسماں

راہ میں صحبت رہبراں مل گئی
خاک پر منزل آسماں مل گئی

میرے دوستو! ایک فطری بات ہے کہ جو شخص کسی راستہ پر چل کر اس کے نشیب وفراز کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھے ہوئے ہو اور اس کے جملہ احوال وکوائف سے واقف ہو تو جو راہرو اس کی معیت میں اس راستہ کو طے کرے گا وہ بڑی جلدی سے منزل پر پہنچ جائے گا یہ ایک بالکل واضح اور کھلی ہوئی سی بات ہے لیکن بعض لوگوں کو اس سلسلۂ سلوک وارشاد پر اور شعبۂ اصلاح وتزکیۂ نفس پر طرح طرح کے شکوک وشبہات پیش آتے رہتے ہیں اور وہ پیری مریدی اور خانقاہ کے لفظ سے ایک طرح کی گھبراہٹ اور الجھن محسوس کرتے ہیں حالانکہ پوری دنیا کا کوئی بھی فن بغیر سیکھے اور عملی مشق کئے ہوئے نہ معتبر ہوتا اور نہ ہی مفید ہوتا ہے اس لیے جہاں کتابوں سے ان کو پڑھایا جاتا ہے وہیں ایک مخصوص مدت اس کی عملی پریکٹس (Practice) کی بھی ہوتی ہے جو اپنے بڑوں اور فن کے ماہروں کے ساتھ رہ کر کی جاتی ہے اور بڑی عجیب بات ہے کہ اس پر کسی کو کوئی اعتراض اور اشکال نہیں ہوتا مگر اسی مقصد کے لیے جب مشائخ کے پاس جا کر خانقاہوں میں کچھ وقت گزارنے کی کوئی بات کی جاتی ہے اور کتابوں میں پڑھی ہوئی باتوں کو عملی مشق میں ڈھالنے کا میدان آتا ہے تو اشکالات شروع ہو جاتے ہیں۔

حالانکہ احقر تو یہاں تک عرض کرتا ہے کہ اگر کسی شخص کو تصوف اور پیری مریدی وغیرہ جیسے الفاظ سے طبیعت میں کچھ تکدر اور دوری ہو جو کہ اصلاً تو ہونی نہیں چاہیے مگر پھر بھی اگر ایسا ہے تو پھر وہ تزکیہ واحسان اور اصلاح وسلوک اور زہد وتربیت وغیرہ جیسے الفاظ سے اسی مقصد کو تعبیر کر سکتا ہے جیسا کہ ایک مقام پر حضرت تھانوی رحمہ اللہ

نے یہ بات ارشاد فرمائی کہ ہر معاملہ میں آدمی کو کسی مشیر کی ضرورت ہوتی ہے تو یہ راستہ دین پر چلنے والا بھی ایسا ہے کہ اس میں ایک مشیر دینی کی ضرورت ہے اور ظاہر ہے کہ جو مشیر ہو اس پر اعتماد لازم ہے اور ایسے ہی شخص کو دوسرے لفظوں میں شیخ کہا جاتا ہے یہ درحقیقت الفاظ بدلنے کی بات ہے ورنہ مقصد اور حقیقت وہی ہے جیسا کہ اس مسئلے پر عرفان محبت جلد اول میں تفصیل سے گفتگو کی گئی۔

ورنہ اگر آدمی خود دین کے راستے پر چلتا ہے کہ کبھی تو وہ اتنے جوش میں ہوتا ہے کہ دین کی ہر چھوٹی بڑی بات پر عمل پیرا رہتا ہے اور کبھی کلی طور پر سب کچھ چھوڑ بیٹھتا ہے لیکن جب وہ شیخ کی صحبت میں رہے تو وہ اس کو تدریجاً تدریجاً (آہستہ آہستہ) اس طرح آگے لے کر چلتا ہے کہ پھر وہ محض جوش و جذبہ کی بات نہیں رہتی بلکہ اس کی طبیعت کے اندر استقامت اور جماؤ پیدا ہو جاتا ہے جیسا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

﴿إِنَّ لِكُلِّ شَيْءٍ شِرَّةً وَلِكُلِّ شِرَّةٍ فَتْرَةً فَإِنْ كَانَ صَاحِبُهَا سَدَّدَ وَقَارَبَ فَارْجُوهُ وَإِنْ أُشِيرَ إِلَيْهِ بِالْأَصَابِعِ فَلَا تَعُدُّوهُ﴾

(سنن الترمذی، ابواب صفۃ القیامۃ، ج:۲، ص:۷۲)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہر چیز میں حرص و نشاط ہے یعنی زیادتی وانہماک) اور ہر زیادتی میں سستی ہے (یعنی ہر اس فعل میں جو زیادتی کے ساتھ کیا جاوئے سستی پیدا ہو جاتی ہے) پس اگر عمل کرنے والے نے میانہ روی سے کام لیا اور میانہ روی کے قریب رہا (یعنی افراط و تفریط سے بچا رہا) تو اس کی نجات پا جانے کی امید ہے (یعنی اس کی کامیابی کی امید ہے) اور اگر اس کی طرف انگلیوں سے اشارہ کیا گیا یعنی مشہور ہونے کے لیے اس نے عبادت میں زیادتی اور مبالغہ کیا اور وہ مشہور ہو گیا تو تم اس کو (صالح اور عابد) شمار نہ کرو۔

تشریح: شرۃ میں ش پر زیر ہے اور را پر تشدید و زبر ہے جس کا ترجمہ حرص و رغبتِ شدیدہ ہے۔

حدیث کا مطلب یہ ہے کہ بعض عابد شروع میں عبادت میں اس قدر مبالغہ اور انہماک کرتے ہیں کہ کچھ ہی دن میں تھک کر سست ہو کر بیٹھ جاتے ہیں پس یہ زیادتی سببِ کمی ہی نہیں بلکہ سبب ترکِ عبادت کا بن جاتی ہے اسی لیے دوسری حدیث میں وارد ہے:

﴿فَإِنَّ خَيْرَ الْعَمَلِ أَدْوَمُهُ وَإِنْ قَلَّ﴾

(مسند احمد)

سب سے بہتر وہ عمل ہے جو تھوڑا ہے مگر ہمیشہ ہوتا رہے پس عبادت میں میانہ روی اور اعتدال رکھے تاکہ ہمیشہ اس عمل کا نباہ ہو سکے اور بہت مبالغہ کرنے والا کچھ دن میں صراط مستقیم سے ہٹ جاتا ہے اور بزرگوں کا تجربہ ہے کہ اعمال میں میانہ روی اور اعتدال اہل اللہ اور کاملین کی صحبت اور ان کی مجلس میں حاضری کی برکات سے حاصل ہوتا

ہے اور استقامت کی نعمت اہل اللہ سے تعلق اور مصاحبت ہی سے عطا ہوتی ہے حق تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''**کونو مع الصادقین**'' ترجمہ: صادقین کے ساتھ رہو مراد صادقین سے مشائخ و بزرگان دین ہیں۔ (دنیا کی حقیقت، ص:۲۱۲)

حضرت جلال آبادی کی مجلس کا احقر کا ایک واقعہ

اسی پر احقر کو اپنا ایک واقعہ یاد آیا کہ جب حضرت مسیح الامت جلال آبادی رحمہ اللہ سے بیعت ہونے کی سعادت حاصل ہوئی اور حضرت کی مجلس میں جانا شروع کیا تو حضرت رحمہ اللہ نے ایک مرتبہ مجلس میں یہ بات فرمائی کہ جو تہجد میں نہیں اٹھ سکتے ہیں تو وہ عشاء کے بعد دو چار رکعات تہجد کی نیت سے وتر اور سنتوں کے درمیان پڑھ لیا کریں تو اسی سے تہجد کا ثواب حاصل ہو جائے گا:

﴿فَاِنَّ سُنَّةَ التَّھَجُّدِ تَحْصُلُ بِالتَّنَفُّلِ بَعْدَ صَلٰوۃِ الْعِشَآءِ قَبْلَ النَّوْمِ﴾

(رد المحتار، کتاب الحظر والاباحۃ)

لیکن مجلس میں بیٹھے بیٹھے ہی احقر کے ذہن میں یہ بات آئی کہ نہیں میں تو ایسا نہیں کروں گا کیونکہ اصل تو رات کو اٹھ کر ہی تہجد پڑھنا ہے اس لیے اسی وقت اٹھ کر پڑھا کروں گا ابھی دل میں خیال ہی آیا تھا کہ حضرت والا نے فوراً اس خیال کی تردید کی چونکہ حضرت کو کشف بہت ہوتا تھا اس لیے فوراً یہ بات فرمائی کہ شیخ کی بات پر یہ خیال دل میں نہ لانا کہ یہ تہجد نہیں ہے چنانچہ بظاہر یہ معمولی بات لگتی ہے لیکن اس کا اثر یہاں پڑتا ہے کہ جب آدمی عشاء کے بعد کی تہجد کی پابندی کرنے لگتا ہے اور رات کو اٹھنے کی کوشش بھی جاری رکھتا ہے تو آہستہ آہستہ اس کو اس کی پختہ عادت ہو جاتی ہے اور یوں مستقبل قریب میں وہ تہجد کا پورا پابند ہو جاتا ہے اسی کا نام استقامت ہے ورنہ اپنی رائے پر چل کر چند دن جوش و جذبے میں رات کو اٹھا اور جب وہ جوش ختم ہوا تو نماز چھوڑ کر بیٹھ گیا اس لیے اپنی رائے کا دخل نہ دے کر شیخ کی رائے پر چلنے میں استقامت کی دولت نصیب ہوتی ہے۔

دامن کوہ میں دامن فقر میں
لذت قرب سلطان جان مل گئی

یعنی اللہ تعالیٰ سے تعلق پیدا ہونے کے بعد انسان کو فقیری میں بھی وہی مزہ آتا ہے جو بادشاہی میں آتا ہے اور اُس کی بوریہ نشینی اُس کے لیے محلوں اور بنگلوں میں رہنے والوں کے لیے باعثِ رشک ہو جاتی ہے۔ اس لیے وہ دامنِ کوہ میں ہو اور یا فقر و فاقہ میں اُس کے دن کٹ رہے ہوں لیکن اللہ تعالیٰ کا قرب مل جانے کے بعد اُسے ایسی لذت حاصل ہوتی ہے جو کسی لمحے اُس کے قلب سے جدا نہیں ہوتی اور یہی چین و سکون کی جڑ اور بنیاد ہے۔

اس لیے حضرت والا کا منشا یہ ہے کہ اللہ والا بن جانے کے بعد ظاہری حالت کیسی بھی ہو اور آدمی کہیں بھی ہو اُسے ہر حال میں اور ہر گھڑی اللہ تعالیٰ سے تعلق اور قرب کا مزہ ملتا رہتا ہے۔ جبکہ جو لوگ غیر اللہ کو اپنا دل دیئے

رہتے ہیں اور حسین حسیناؤں کے چکروں میں ساری عمر گزار دیتے ہیں وہ جب تک اُن کے پاس رہتے ہیں تو بظاہر اُنہیں سکون محسوس ہوتا ہے لیکن جب جدا ہو جاتے ہیں اور تنہائیوں میں ہوتے ہیں تو پھر ان کے دل کی بے چینی اور پریشانی دیکھنے کے قابل ہوتی ہے لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات ایسی ہے جو ہر جگہ اور ہر لمحہ اپنے مؤمن بندوں کے ساتھ ہوتی ہے اور اُن کے قلب و روح کی تسکین و تسلی اور اطمینان و انبساط کا ذریعہ ہوتی ہے۔ جیسا کہ یہ مضمون حضرت کے شعروں میں بکثرت آیا ہے۔

مل گئی جب سے توفیق ذکرِ خدا
روح کو راحتِ دوجہاں مل گئی

قرآن و حدیث میں اللہ تعالیٰ کے ذکر پر قلب کو اطمینان میسر ہونا اور دل کو چین و سکون نصیب ہونا مختلف مواقع پر مذکور ہوا ہے کیونکہ اصل اللہ تعالیٰ کا ذکر ہی روح کی غذا ہے تو جس آدمی کو اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے اور اُس کی توفیق کی دولت سے ذکر اللہ میں مشغولی کی نعمت میسر آ گئی ہو یقیناً اُس کی روح کو دو جہاں کی راحت نصیب ہو جائے گی۔

ربطِ گلشن کی کیا یہ کرامت نہیں
دشت میں راحتِ آشیاں مل گئی

اصل میں انسان کو راحت و آرام اپنے گھر میں نصیب ہوتا ہے لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے خاص بندوں کے قلب میں اپنے قرب کی ایسی حلاوت عطا فرماتے ہیں کہ جس کی برکت سے وہ زمین کے جس کونے اور جس حصے پر بھی رہیں حتیٰ کہ ایسے جنگلوں اور بیابانوں اور دریاؤں اور سمندروں کے کنارے جہاں کوئی شاندار محل اور بنگلہ موجود نہ ہو انہیں اس قرب کی بدولت وہاں بھی بنگلوں کا مزہ آتا ہے۔

اور وجہ اُس کی یہ ہے کہ وہ زمین کے ہر حصے پر اپنے اللہ تعالیٰ کو یاد کرنے میں مشغول ہو جاتے ہیں اور ذکر و تسبیح اور تلاوت و مناجات میں لگ جاتے ہیں جو کہ قلبی چین و سکون اور راحت و آرام کا ذریعہ ہے۔ کیونکہ جہاں آپ نے کوئی نیکی کی وہ زمین کل قیامت کے دن آپ کے حق میں اُس کی گواہی دے گی۔ جیسا کہ جس زمین پر کسی نے کوئی گناہ کیا ہو وہ زمین اس کے خلاف گواہی دے گی۔ ہماری زبانیں بند ہو جائیں گی جن اعضاء سے ہم نے کوئی غلط حرکت کی ہوگی وہ اعضاء خود گواہی دیں گے:

﴿اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰۤى اَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَاۤ اَيْدِيْهِمْ وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ﴾

(سورۃ یٰس، پارہ: ۲۳)

ترجمہ: آج ہم مہر لگا دیں گے ان کے منہ پر اور بولیں گے ہم سے ان کے ہاتھ اور بتلائیں گے ان کے پاؤں جو کچھ

وہ کماتے تھے۔

اور دوسری جگہ ہے:

﴿وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا﴾

(سورۃ بنی اسرآئیل، آیت: ۳۶)

ترجمہ: اور جس بات کی تم کو تحقیق نہ ہو اس پر عمل مت کیا کرو (کیونکہ) کان اور آنکھ اور دل ہر شخص سے ان سب سے (قیامت کے دن) پوچھ ہوگی۔ (معارف القرآن، جلد: ۵، ص: ۴۶۹)

ایک اور جگہ پر ارشاد ہے کہ:

﴿يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا﴾

(سورۃ الزلزال، پارہ: ۳۰)

ترجمہ: اس روز زمین اپنی سب (اچھی، بری) خبریں بیان کرنے لگے گی۔

ان کی خاطر اُٹھایا جو حسرت کا غم
روح کو عشرتِ دوجہاں مل گئی

اللہ تعالیٰ کے دین پر چلتے وقت یہ تو یقینی بات ہے کہ دل پر کچھ غم تو اُٹھانے پڑیں گے، کبھی مخلوق کے طعن و تشنیع کی شکل میں تو کبھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے دوسری آزمائشوں کی صورت میں لیکن یہ بھی بالکل سچ اور برحق ہے جس کا اللہ کی طرف سے وعدہ ہے کہ جو شخص اپنی حسرتوں کو پامال کرتا ہے اور آرزوؤں کا خون پی لیتا ہے تو اُس کے دل کو اللہ تعالیٰ باغ و بہار کر دیتے ہیں اور پھر روح کو عشرتِ دوجہاں میسر ہو جاتی ہے۔

صحبتِ شیخ کامل سے اخترؔ کو بھی
لذتِ راہِ ربِ جہاں مل گئی

یہ درحقیقت حضرت شاہ عبدالغنی پھولپوری رحمہ اللہ کے اُس ملفوظ کی تشریح ہے جس میں حضرت نے ہمارے حضرت والا کو مخاطب کر کے یہ بات فرمائی کہ اللہ والوں سے تعلق کے بعد یہ راستہ یعنی راہِ سلوک طے کرنا صرف آسان ہی نہیں بلکہ لذیذ ہو جاتا ہے۔ یعنی خود طے کرتے ہوئے طبیعت پر دشواری محسوس ہونے کے بجائے خوشی خوشی انسان آگے قدم بڑھاتا رہتا ہے اور منزل تک پہنچ جاتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ یہ کہنا غلط نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے راستے پر چلتے وقت ہر قدم پر مؤمن کو اُس کی منزل ملتی ہے کیونکہ جب وہ مضبوطی سے اُس راہ پر چل رہا ہے تو یہی عینِ مقصدِ حیات ہے جس کو وہ انجام دے رہا ہے۔ اس لیے اُسے اللہ تعالیٰ کے راستے کی لذت کا ملنا یقینی بات ہے۔

آہ و نالوں سے مٹ گئے ظلمات

آہ نالوں سے مٹ گئے ظلمات ان کی یادوں کے مل گئے نفحات
ہر نفس میر ان سے باتیں ہیں ان کے عاشق کے ہیں یہی درجات
غیر فانی بہار عشرت ہے تلخ حسرت کے ہیں یہی ثمرات
میر کہتے ہیں سرد آہوں پر گرمی وصل کی ملی سوغات
کس قدر تلخیاں ہیں غیروں میں کاش اپنوں میں رہتے ہم ہیہات
مرنے والوں پہ مرنے والوں پر سینکڑوں غم ہیں سینکڑوں آفات
کاش مرتے ہم اپنے خالق پر اور پاتے ہم ان سے انعامات
نار شہوت کو نور حق سے بجھا پیر رومی کے ہیں یہ ارشادات

مشکل الفاظ کے معانی: ۔ **آہ و نالوں**: اللہ تعالیٰ کو یاد کر کے رونا۔ **ظلمات**: اندھیرے۔ **نفحات**: اللہ تعالیٰ کے کرم کے جھونکے۔ **نفس**: سانس۔ **غیر فانی**: ختم نہ ہونے والی۔ **ثمرات**: ثمر کی جمع یعنی پھل۔ **سرد آھوں**: اللہ تعالیٰ کو یاد کر کے آہیں بھرنا۔ **وصل**: اللہ تعالیٰ سے ملنے کا شوق۔ **سوغات**: تحفہ۔ **تلخیاں**: کڑواہٹیں۔ **غیروں میں**: اللہ تعالیٰ کے علاوہ۔ **ہیہات**: اسم فعل ہے یعنی ہائے ہم اللہ والوں سے دور رہے۔ **آفات**: مصیبتیں۔ **نارِ شہوت**: حرام لذت کی آگ۔

آہ نالوں سے مٹ گئے ظلمات
ان کی یادوں کے مل گئے نفحات

جس آدمی کو اللہ تعالیٰ کے سامنے اُس کے خوف سے یا محبت سے رونا میسر آ جائے اور اس کی آنکھیں اشکبار ہو جائیں اور آہ و زاری کی دولت اُسے حاصل ہو جائے تو یقیناً اُس کے قلب کی ظلمتیں دور ہو کر بالکل ختم ہو جائیں گی اور پھر وہ اللہ تعالیٰ کی محبتوں اور یادوں میں ایسی زندگی گزارے گا کہ اُسے بے شمار خوشیاں محسوس ہوں گی اور ایسا لگے گا جیسے رحمت کی ہوا کے جھونکے اُس کے دل و دماغ کی طرف چل رہے ہیں اور اُس کے قلب و جگر میں اُس کی بہاریں پہنچ رہی ہیں اور قربِ خداوندی کی خوشبو سے اُس کے دل و جان معطر ہو رہے ہیں۔

ہر نفس میر ان سے باتیں ہیں
ان کے عاشق کے ہیں یہی درجات

اللہ تعالیٰ کے جو لوگ سچے عاشق ہوتے ہیں وہ بظاہر دنیا کے مشغلوں میں لگے رہتے ہیں لیکن اندر اندر وہ ایک سانس بھی اللہ سے غافل نہیں رہتے بلکہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص رازدارانہ انداز سے اُسے یاد کرنے میں مشغول رہتے ہیں اور اُس کا ذکر کرتے رہتے ہیں جسے خواجہ صاحب نے اپنے اشعار میں اس طرح بیان کیا۔

تم سا کوئی ہمدم کوئی دم ساز نہیں ہے
باتیں تو ہیں ہر دم مگر آواز نہیں ہے

خاصانِ خدا کا یہ ایسا ذکر ہے کہ جس کا فرشتوں کو بھی پتہ نہیں چلتا اور اُن سے بھی مخفی رہتا ہے۔ جیسا کہ بعض روایات میں اس ذکرِ خفی سے متعلق یہ بات وارد ہوئی ہے کہ اُس کی فرشتوں کو بھی خبر نہیں ہوتی۔

حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم کی موت سے محبت

غیر فانی بہار عشرت ہے
تلخ حسرت کے ہیں یہی ثمرات

جتنے کڑوے گھونٹ پی کر اللہ تعالیٰ کی مرضیات پر جما جائے گا اور جس درجے کا شدید اور قوی مجاہدہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں اختیار کیا جائے گا اور جتنی ایذائیں اور تکلیفیں حق تعالیٰ کے لیے برداشت کر کے اُس کو راضی رکھنے کی فکر کی جائے گی تو اُس کا ثمرہ اور نتیجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مؤمن کو جنت میں اور آخرت میں ایسی بہار عطا فرمائیں گے جس کو کبھی فنا لاحق ہونے والی نہیں ہے، لہٰذا نادانی اور ناعاقبت اندیشی ہے کہ وقتی خواہشات کی تکمیل کے لیے کچھ مزہ اُٹھا کر مجرمانہ لذت کا ارتکاب کیا جائے اور اُسی کو عیش سمجھ لیا جائے۔ بھلا وہ عیش کیا عیش ہے کہ جہاں سب سامانِ عیش ہو لیکن اُس میں فنا ہونے کا داغ لگا ہوا ہو، جو ختم ہونے والی ہو اور جو مٹنے والی ہو اور وہ بہار کیا بہار ہے جسے جلد ہی خزاں لگ کر بے نام و نشان کر دے گی۔ اس لیے دنیا کے ہر عیش اور مزے میں یہ خرابی پائی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضراتِ صحابہ کرام کا دل دنیا سے قطعاً نہیں لگا ہوا تھا کہ اُن کے سامنے دائمی اور ابدی حیات اور وہاں کی جنتیں اور اُس کی باغ و بہار ایسی ہوگئی تھی جیسے وہ آنکھوں سے دیکھ رہے ہوں۔

آخر کوئی تو بات تھی کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک صحابی پوچھتے ہیں کہ میں بازار جارہا ہوں، اگر کچھ لانا ہو تو بتائیے۔ تو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے جواب ارشاد فرمایا کہ اگر موت مل رہی ہو تو لے آنا کیونکہ وہ میرے لیے میرے محبوب سے ملنے کا ذریعہ ہے اور یہی بات ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام صحابہ کو میدانِ جہاد میں جانے کے لیے پکارتے تھے تو وہ حضرات دائیں بائیں نہ دیکھتے بلکہ وہ فوراً لبیک کہہ کر بڑی تیزی کے ساتھ آپ کے حکم کی تعمیل کے لیے دوڑتے ہوئے جاتے تھے اور مزید برآں یہ کہ اس کی کوشش کرتے تھے کہ کاش! میرا نام جانے والے مجاہدین میں آجائے اور میں اپنی جان اللہ کی راہ میں پیش کر دوں اور پھر ایسے لوگوں کے لیے اللہ تعالیٰ کے یہاں ثمرات اور پھل بھی بڑے اونچے ہیں اور وہ جنت کی لازوال نعمتیں ہیں۔

میر کہتے ہیں سرد آہوں پر
گرمی وصل کی ملی سوغات

یہ حضرت والا کی ایک تعبیر و تشبیہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی محبت کے لیے جب آ ہیں بھری جاتی ہیں تو حق تعالیٰ اُسے وصول الی اللہ کی دولت عطا فرما دیتے ہیں، مگر ظاہر ہے یہ اپنی خواہشات کو پامال کرنے کے نتیجے میں بھری جانے والی ٹھنڈی ٹھنڈی آہوں کا ثمرہ اور نتیجہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُس ٹھنڈی آہ کا استقبال گرمیٔ وصل کی سوغات عطا کرنے کے ساتھ ہوتا ہے اور یہ تحفہ اور سوغات لومڑیانہ چال چلنے والوں کو میسر نہیں آتی کہ جیسے ہی دل نے چاہا کہ اِسے دیکھوں فوراً آنکھیں اُدھر دوڑا دیں۔ تمنائیں بہت ہوں اور آرزوؤں سے دل بھرا ہو مگر خدا کا حکم ٹوٹتا ہوا دیکھ کر اللہ کا سچا عاشق ایک ٹھنڈی آہ بھرتا ہے، مگر حکم توڑنا گوارا نہیں کرتا تو اُسے اللہ تعالیٰ کی محبت کی سوغات اور تحفہ عطا کیا جاتا ہے۔

کس قدر تلخیاں ہیں غیروں میں
کاش اپنوں میں رہتے ہم ہیہات

یعنی ہائے افسوس! غیروں کو دل دے کر اور اُن پر فدا ہونے کے نتیجے میں زندگیاں کس قدر تلخ اور کڑوی کر دی جاتی ہیں کہ وہ جینے میں جینا نہیں رہتا۔ چین وسکون کی دولت اللہ تعالیٰ چھین لیتے ہیں اور یہاں دنیا ہی میں جہنم کا سا منظر سامنے آ جاتا ہے۔ جیسا کہ ہم نے اپنی نگاہوں سے بہت سے عشاقِ مجازی کو اس طرح بے چین اور پریشان اور تڑپتے ہوئے اور پاگلوں کی طرح پھرتے ہوئے دیکھا ہے۔

اس لیے حضرت والا ہیہات و شتان فرماتے ہیں کہ غیر اللہ سے بہت دور رہیے ورنہ تلخیاں ہی تلخیاں ملیں گی اور اگر کوئی شخص اہل اللہ میں رہے، اُس کا اُٹھنا بیٹھنا خاصانِ خدا کے ساتھ ہو تو پھر اُس کی زندگی بھی زندگی بن جاتی ہے اور اُسے حسرت وافسوس کا سامنا کرنا نہیں پڑتا۔ جیسا کہ حضرت والا کے آس پاس بیٹھنے والے حضرات کی ایک بڑی تعداد اصلاحی تعلق قائم کرنے کے بعد جب ماضی کی داستانیں اپنی زبانی سنانے پر آتے ہیں تو یہ واضح فرق کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ پہلی زندگی میں کتنی تلخیاں تھیں اور اب ہم کتنے مزے اور لذت میں جی رہے ہیں۔

مخلوق پر مرو تو آفات اور زندۂ خالق پر فدا ہو تو انعامات

مرنے والوں پہ مرنے والوں پر
سینکڑوں غم ہیں سینکڑوں آفات
کاش مرتے ہم اپنے خالق پر
اور پاتے ہم ان سے انعامات

کیا ہی خوب حضرت والا کا یہ شعر ہے کہ ایک طرف یہ نصیحت فرما رہے ہیں کہ تم اُن لوگوں کو دل مت دو جو

عنقریب مرکر ختم ہو جانے والے ہیں اور وجہ بھی خود شعر میں ذکر کی جارہی ہے کہ جب وہ مرنے والے ہیں تو اُن کو دل دینا عقلمندی اور سمجھداری نہیں ہے لیکن جنہوں نے عقل وفہم سے کام نہیں لیا اور ان مرنے والوں کو دل دے کر اُن پر مر گئے ہیں افسوس در افسوس! وہ کتنے غم اور بے چینیوں میں مبتلا ہیں اور آئے دن کیسی آفات و بلیات اور مصائب وحوادث نے اُنہیں گھیر رکھا ہے۔ کہیں خود کشی کی نوبت آرہی ہے، کہیں ڈپریشن اور ٹینشن سے راتوں کی نیندیں اُن پر حرام ہو چکی ہیں اور کہیں غموم وہموم کے ایک عظیم طوفان میں اُن کی کشتی پھنسی ہے تو کہیں دل ودماغ بے چینی اور پریشانی میں مبتلا ہوکر ہر شے سے مایوس ہو چکے ہیں۔

اس لیے نصیحت ہے نصیحت حاصل کرنے والوں کے لیے خدارا! اپنی جوانی کو ان حسین مرنے والوں پر ختم نہ کرو اور تمہیں مرنا ہے تو اللہ کی ذاتِ پاک کے اوپر مرو کہ جس پر مرنے کے نتیجے میں ہمیشہ زندگی والی حیات نصیب ہو جاتی ہے اور جو اپنے ارادہ اور اختیار سے اپنی جان ہتھیلی پر لے کر اللہ تعالیٰ کے دین کی سربلندی کے لیے لڑتے لڑتے اور جدوجہد کرتے کرتے اپنی جان جانِ آفریں کے حوالے کرتے ہیں تو اُن کے بارے میں قرآنِ پاک نے اعلان فرمایا کہ میں اُن کو خاص قسم کی زندگی عطا کرتا ہوں اور مخصوص قسم کے انعامات عالمِ برزخ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُن لوگوں کو عطا کیے جاتے ہیں۔ جیسا کہ قرآن کریم میں اس کا وعدہ کیا گیا ہے۔

﴿وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللهِ أَمْوَاتًا بَلْ أَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ۝ فَرِحِيْنَ بِمَا اٰتٰهُمُ اللهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَيَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا بِهِمْ مِنْ خَلْفِهِمْ أَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝﴾

(سورۃ اٰل عمران، آیت: ۱۶۹)

ترجمہ: اور (اے مخاطب!) جو لوگ اللہ تعالیٰ کی راہ میں (یعنی دین کے واسطے) قتل کیے گئے ان کو (اور مردوں کی طرح) مُردہ مت خیال کرو بلکہ وہ لوگ (ایک ممتاز حیات کے ساتھ) زندہ ہیں (اور) اپنے پروردگار کے مقرب (یعنی مقبول ہیں) ان کو رزق بھی ملتا ہے (اور) وہ خوش ہیں اس چیز سے جو ان کو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل (وکرم) سے عطا فرمائی۔

شہدا کے فضائل اور ان کی خصوصی حیات برزخی

اس آیت میں شہداء کے خاص فضائل کا بیان ہے اور احادیث صحیحہ میں اس کی بڑی تفصیل وارد ہوئی ہے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ شہداء کے بھی درجات اور حالات مختلف ہوتے ہیں، اس لیے روایاتِ حدیث میں جو مختلف صورتیں آئی ہیں، وہ مختلف حالات کے اعتبار سے ہیں۔

یہاں شہداء کی پہلی فضیلت تو یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ مرے نہیں بلکہ دائمی زندگی کے مالک ہو گئے ہیں۔ یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ بظاہر ان کا مرنا اور قبر میں دفن ہونا تو مشاہد اور محسوس ہے۔ پھر قرآن کی متعدد آیات

میں ان کو مردہ نہ کہنے اور نہ سمجھنے کی جو ہدایت آئی ہے اس کا کیا مطلب ہے؟ اگر کہا جائے کہ حیاتِ برزخی مراد ہے تو وہ ہر شخص مؤمن و کافر کو حاصل ہے کہ مرنے کے بعد اس کی روح زندہ رہتی ہے اور قبر کے سوال و جواب کے بعد مؤمنین صالحین کے لیے سامانِ راحت اور کفار فجار کے لیے قبر کا عذاب قرآن وسنت سے ثابت ہے تو یہ حیاتِ برزخی جب سب کے لیے عام ہے تو شہداء کی کیا خصوصیت ہوئی؟

جواب یہ ہے کہ قرآن کریم کی اسی آیت نے یہ بتلایا ہے کہ شہداء کو اللہ کی طرف سے جنت کا رزق ملتا ہے اور رزق زندہ آدمی کو ملا کرتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس دنیا سے منتقل ہوتے ہی شہید کے لیے رزقِ جنت جاری ہو جاتا ہے اور ایک خاص قسم کی زندگی اسی وقت سے اس کو مل جاتی ہے جو عام مُردوں سے ممتاز حیثیت کی ہے۔ (قرطبی)

اب رہا کہ وہ امتیاز کیا ہے؟ اور وہ زندگی کیسی ہے؟ اس کی حقیقت سوائے خالقِ کائنات کے نہ کوئی جان سکتا ہے نہ جاننے کی ضرورت ہے۔ البتہ بسا اوقات ان کی حیاتِ خاص کا اثر اس دنیا میں بھی ان کے ابدان پر ظاہر ہوتا ہے کہ زمین ان کو نہیں کھاتی، وہ صحیح سالم باقی رہتے ہیں۔ (قرطبی) جس کے بہت سے واقعات مشاہدہ کیے گئے ہیں۔

شہداء کی پہلی فضیلت اس آیت میں ان کی ممتاز دائمی حیات ہے۔ دوسری یہ کہ ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے رزق ملتا ہے۔ تیسری فضیلت فَرِحِيْنَ بِمَا اٰتٰهُمُ اللّٰهُ میں یہ بیان کی گئی کہ وہ ہمیشہ خوش وخرم رہیں گے ان نعمتوں میں جو اُن کو اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائی ہیں۔ چوتھی فضیلت یہ ہے مِنْ فَضْلِهٖ وَيَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا بِهِمْ یعنی وہ اپنے جن متعلقین کو دنیا میں چھوڑ گئے تھے ان کے متعلق بھی اُن کو یہ خوشی ہوتی ہے کہ وہ دنیا میں رہ کر نیک کام اور جہاد میں مصروف رہیں تو ان کو بھی یہاں آ کر یہی نعمتیں اور درجاتِ عالیہ ملیں گے اور سدّی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا کہ شہید کا جو کوئی عزیز دوست مرنے والا ہوتا ہے شہید کو پہلے سے اس کی اطلاع کر دی جاتی ہے کہ فلاں شخص اب تمہارے پاس آ رہا ہے، وہ اس سے ایسا خوش ہوتا ہے جیسے دنیا میں کسی دور افتادہ دوست سے بعد مدت ملاقات کی خوشی ہوتی ہے۔

اس آیت کا شانِ نزول جو ابوداؤد رحمہ اللہ نے باسناد صحیح حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے وہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام سے فرمایا کہ جب واقعہ احد میں تمہارے بھائی شہید ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کی ارواح کو سبز پرندوں کے جسم میں رکھ کر آزاد کر دیا۔ وہ جنت کی نہروں اور باغات کے پھلوں سے اپنا رزق حاصل کرتے ہیں اور پھر اُن قندیلوں میں آ جاتے ہیں جو اُن کے لیے عرشِ رحمٰن کے نیچے معلّق ہیں۔ جب ان لوگوں نے اپنی راحت وعیش کی یہ زندگی دیکھی تو کہنے لگے کہ (ہمارے متعلقین دنیا میں ہمارے مرنے سے غمگین ہیں) کیا کوئی ہمارے حالات کی خبر ان کو پہنچا سکتا ہے تا کہ وہ ہم پر غم نہ کریں اور وہ بھی جہاد میں کوشش کرتے رہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم تمہاری یہ خبر اُن کو پہنچا دیتے ہیں۔ اس پر یہ آیت نازل فرمائی گئی۔

(معارف القرآن، جلد:۲، صفحہ:۲۳۷)

اور مشکوٰۃ، صفحہ: ۳۳۳ پر روایت ہے جس میں جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

﴿قَالَ رَسُوْلُ اللہِ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لِلشَّھِیْدِ عِنْدَ اللہِ سِتُّ خِصَالٍ یُغْفَرُ لَہٗ فِیْ أَوَّلِ دُفْعَۃٍ وَیَرٰی مَقْعَدَہٗ مِنَ الْجَنَّۃِ وَیُجَارُ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ وَیَأْمَنُ مِنَ الْفَزَعِ الْاَکْبَرِ وَیُوْضَعُ عَلٰی رَأْسِہٖ تَاجُ الْوَقَارِ الْیَاقُوْتَۃُ مِنْھَا خَیْرٌ مِّنَ الدُّنْیَا وَمَا فِیْھَا وَیُزَوَّجُ اثْنَتَیْنِ وَسَبْعِیْنَ زَوْجَۃً مِّنَ الْحُوْرِ الْعِیْنِ وَیُشَفَّعُ فِیْ سَبْعِیْنَ مِنْ أَقَارِبِہٖ﴾

(سنن الترمذی، کتاب الجھاد، باب فی ثواب الشھید)

جس کا خلاصہ یہ ہے کہ شہید کو اللہ تعالیٰ کے یہاں چھ انعام ملتے ہیں۔ (۱) فوراً اُس کی بخشش کر کے اُس کا ٹھکانہ جنت سے دکھایا جاتا ہے۔ (۲) اُسے عذابِ قبر سے مکمل محفوظ کر دیا جاتا ہے۔ (۳) قیامت کے دن کی بڑی گھبراہٹ سے وہ محفوظ رہے گا۔ (۴) اُس کے سر پر عزت وعظمت کا ایسا تاج رکھا جائے گا کہ جس کا ایک یاقوت دنیا و مافیہا سے بہتر ہوگا۔ (۵) جنت کی بہتر بڑی آنکھوں والی بیبیوں سے اُس کی شادی کر دی جائے گی۔ (۶) ستر رشتہ داروں کے حق میں اس کی شفاعت منظور کی جائے گی۔

نارِ شہوت کو نورِ حق سے بجھاؤ

نارِ شہوت کو نورِ حق سے بجھا
پیر رومی کے ہیں یہ ارشادات

اللہ تعالیٰ کی محبت دل میں پیدا ہونے کے بعد شہوت کے تقاضوں پر عمل کرنے سے بچنا آسان ہو جاتا ہے اور آدمی ذکر اللہ کی پابندی کرے اور دل کو اللہ تعالیٰ کے انوارات اور تجلیات سے منور اور روشن کر دے تو پھر نارِ شہوت بجھ جائے گی، لیکن جو لوگ اس آگ کو اس پر پیٹرول چھڑک کر بجھانا چاہتے ہیں کہ اپنے ذہن میں وہ یہ سوچتے ہیں کہ بس صرف ایک بار اور محبوب ومحبوبہ کی دوبارہ ملاقات یا اُن سے گفتگو اور اُن کے دیدار سے یہ آگ بجھ جائے گی اور مجھے کچھ تسلی مل جائے گی یہ محض شیطان کی چال اور نفس کا دھوکہ ہے۔ بچنے کی آسان صورت یہی ہے کہ ہمت کر کے اللہ تعالیٰ کے ذکر اور یاد میں لگے اور دل کو اُس سے روشن اور منور کرے اور اُدھر سے ذہن کو پوری قوت اور مجاہدہ کر کے بالکل ہٹا لے۔ تب ہی اس سے بچا جا سکتا ہے اور شہوت کی آگ بجھ سکتی ہے۔ جیسا کہ مولانا رومی نے یہی بات ارشاد فرمائی ہے اور یہ مضمون درحقیقت حضرت مولانا رومی کے بعض اشعار کا خلاصہ اور نچوڑ ہے۔

وہی لمحہ بہارِ زندگی ہے

غمِ پنہاں متاعِ زندگی ہے رموزِ عاشقی و بندگی ہے
میری آنکھوں کی ٹھنڈک جانِ عالم تیری چوکھٹ پہ سرافگندگی ہے
متاعِ ہر دو عالم اس کو حاصل جسے حاصل کمالِ بندگی ہے
موانع نذر ہیں دستِ جنوں کے بڑے ہی کام کی دیوانگی ہے
اگر بیگانگی ہے تجھ کو گُل سے چمن میں بھی تجھے افسردگی ہے
جو ان کی یاد میں گذرا ہے اخترؔ وہی لمحہ بہارِ زندگی ہے

مشکل الفاظ کے معانی:۔ غمِ پنہاں: دل ہی دل میں غم اٹھا کر گناہوں سے بچنا۔ **متاع:** ساز و سامان۔ **رموز:** نشانیاں۔ **جانِ عالم:** اللہ تعالیٰ۔ **سرافگندگی:** سر جھکانا۔ **کمالِ بندگی:** اللہ تعالیٰ کی مکمل تابعداری۔ **موانع:** رکاوٹیں۔ **نذر:** قابو میں ہیں۔ **دستِ جنوں:** اللہ تعالیٰ کے عاشق کا ہاتھ۔ **بیگانگی:** انجانا پن۔ **افسردگی:** غمزدہ۔

اللہ تعالیٰ کی محبت کا غم ہی متاع زندگی ہے

غمِ پنہاں متاعِ زندگی ہے
رموزِ عاشقی و بندگی ہے

یہ غم جس کا اس شعر میں ذکر ہے کوئی نئی چیز نہیں ہے بلکہ اس کا حاصل وہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے اُس کے راستے کے اُٹھائے ہوئے غم کہ جن کی بدولت اللہ تعالیٰ راضی ہوتے ہیں اور نفس کی خواہشات پر نہ چلنے سے جو دل پر رنج اور صدمہ پہنچتا ہے یہی دراصل زندگی کی اصل متاع اور سامان ہے اور اسی میں بندۂ مؤمن کی بندگی کا راز چھپا ہوا ہے کیونکہ جو شخص اپنے آقا کے کہنے کو ماننے کو تیار نہ ہو جہاں چاہا جیسا چاہا اپنی مرضی سے کرتا پھر رہا ہو، آقا راضی ہے یا ناراض اس کی کوئی پرواہ نہ ہو تو اُسے غلام بننا نہیں آتا اور وہ آقا کے ساتھ رہنے کا سلیقہ نہیں جانتا۔ پکا اور وفادار غلام وہ ہوتا ہے کہ جیسے آقا کہے اور جو چاہے اور جس وقت چاہے بس وہ اس کے لیے فوراً تیار رہے۔ اُس کی اپنی کوئی تجویز نہ ہو بلکہ ہر معاملے میں تفویض ہی تفویض ہو۔

اس لیے بندگی کا راز یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی حکم نہ ٹوٹے اور نہ چھوٹے، اگرچہ اُس کے لیے دل ٹوٹ ٹوٹ کے چورا ہو جائے اور صدمہ وغم سے دل انتہائی غم زدہ اور رنجیدہ ہو۔ مگر یہ اللہ کا دیوانہ اپنے ہر حال وقال سے اللہ کے فیصلے پر خوش اور راضی نظر آتا ہو اور ہر حکمِ خداوندی بجالانے پر دل و جان سے مسرور ہو۔ یہی صحیح بندگی اور عاشقی کی پہچان اور نشانی ہے۔ بقول حضرت والا ؎

صدمہ و غم میں میرے دل کے تبسم کی مثال
جیسے غنچہ گھرے کانٹوں میں چٹک لیتا ہو

میری آنکھوں کی ٹھنڈک جانِ عالم
تیری چوکھٹ پہ سرافگندگی ہے
متاعِ ہر دو عالم اس کو حاصل
جسے حاصل کمالِ بندگی ہے

خلاصہ یہ کہ میری آنکھوں کو ٹھنڈک اور میرے دل کو چین وسکون اسی صورت میں میسر آتا ہے کہ میرا سر آپ کی چوکھٹ پر پڑا ہوا ہے اور میں ہر وقت آپ کے در پر سجدہ ریز ہو کر آپ ہی کو پکارتا رہوں، ایسی نوبت میری زندگی میں کبھی نہ آئے کہ میرا سر ہو اور کسی اور کا در، کیونکہ خلاصۂ بندگی اور کمالِ طاعتِ خداوندی کا حق یہی ہے اور اسی میں دونوں عالم کی کامیابیوں کا راز چھپا ہوا ہے کہ مسلمان اپنے ہر چھوٹے بڑے معاملے میں اور ہر آرزو اور تمنا میں اللہ تعالیٰ کے در کو کھٹکھٹا رہے ہیں۔ جیسے کہ حضرت والا کا شعر ہے۔

ہمارا مرکزِ اُمیدِ رحمت آپ کا در ہے
کسی کے در پہ تو یاربّ یہ پیشانی نہیں جاتی
سوا تیرے نہیں ہے کوئی میرا سنگِ در اپنا
کوئی حاجت ہو رکھتا ہوں تیری چوکھٹ پہ سر اپنا

دستِ جنوں کی طاقت دیکھئے

موانع نذر ہیں دستِ جنوں کے
بڑے ہی کام کی دیوانگی ہے

اہلِ خرد اپنی عقل کو آڑ بنا کر اللہ تعالیٰ کی ذاتِ عالی پر مکمل طور پر فدا ہونے سے بچتے ہیں اور اہلِ جنوں بغیر کسی کے طعن و تشنیع کی پرواہ کیے ہوئے اپنے مولا کے ہر حکم پر جان قربان کرنے کو تیار رہتے ہیں۔ اس لیے حضرت والا نے یہ بات فرمائی کہ اس راہ کی جتنی رکاوٹیں ہیں وہ دستِ جنوں کی نظر ہیں۔ اس لیے مجھے اس راہ پر چلنے سے کوئی موانع روک نہیں سکتے کیونکہ میں نے اپنے لیے دیوانگی کے طریق کو اختیار کیا ہے، فرزانگی کو نہیں۔ اور پوری تاریخ گواہ ہے کہ جو زیادہ عقل سے سوچنے سمجھنے کے عادی ہو جاتے ہیں تو انہیں ہر بات میں ''اگر، مگر'' نظر آتی ہے۔ اور وہ اپنے مقتداء و رہبر اور شیخ و مرشد کی تعلیمات پر پورے طور پر عمل نہیں کر پاتے اور قرآن وحدیث کے

احکام پر بھی جہاں اپنے ظاہری مصالح اور مادّی منافع کے خلاف کوئی چیز نظر آتی ہے تو وہ اُس سے پہلوتہی کر جاتے ہیں۔کیا ہی خوب خواجہ صاحب کا یہ شعر ہے ؎

فرزانہ جسے بننا ہو جائے وہ کہیں اور
دیوانہ جسے بننا ہو آئے یہاں آئے
سو بار بگڑنا جسے منظور ہو اپنا
آئے وہ یہاں اور بچشم و بسر آئے

اگر بیگانگی ہے تجھ کو گُل سے
چمن میں بھی تجھے افسردگی ہے

پورے چمن کی جان پھول پھلواریاں ہوتی ہیں اگر کسی کو گلشن اور چمن میں رہتے ہوئے انہی سے مناسبت نہ ہوتو پھر اُس کے لیے یہ چمن اور یہ گلشن، گلشن وچمن نہیں رہتا بلکہ دشت و بیابان کے مانند ہو جاتا ہے،لہٰذا اے مردِ مؤمن! اگر کائنات کے اس چمن میں تجھے اللہ تعالیٰ سے تعلق حاصل نہیں ہے تو پھر یاد رکھنا یہ بنگلے اور محلات بھی تیرے لیے دشت و بیابان کی طرح بے چینی و پریشان کا سامان بنیں گے۔ان میں تجھے سکون میسر نہ ہوگا۔لہٰذا اصل بات سکون پانے کے لیے اپنے اللہ سے رابطہ اور تعلق مضبوط پیدا کر کے اُس سے بیگانگی والے رشتے کو ختم کرنا ہوگا۔

جو ان کی یاد میں گذرا ہے اختؔر
وہی لمحہ بہارِ زندگی ہے

یہ کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ انسان کے دنیا میں پیدا ہونے کے بعد اُس کے جو لمحاتِ زندگی اِدھر اُدھر کی چیزوں اور دنیا کے مشغلوں میں گزر جائیں گے وہ دنیا و آخرت دونوں کے اعتبار سے پریشانی اور ناکامی اور حسرت و مایوسی کا سبب ہیں۔حقیقت میں انسان کے لیے زندگی کی بہار وہی لمحاتِ حیات ہوتے ہیں جو اللہ کی یاد میں گزرتے ہیں اور وجہ اُس کی یہ ہے کہ ان لمحاتِ حیات کی بدولت اُسے آخرت میں بھی بالطف زندگی ملتی ہے اور اِس دنیا کے اندر بھی اُسے بڑی حلاوت ولذت والی حیات نصیب ہوتی ہے اس لیے حضرت والا کا یہ فرمانا بالکل بجا اور درست ہے کہ بس وہی لمحۂ حیات بہارِ زندگی ہے جس میں میں نے اللہ کو یاد کیا۔اس لیے آخرت میں اللہ کے خاص بندے بھی اس لمحۂ زندگی پر جو اللہ کی یاد کے بغیر گزرا ہوگا افسوس کریں گے۔اللہ تعالیٰ ہمیں دنیا و آخرت کے افسوس والی صورتحال سے اور ندامت وپشیمانی سے محفوظ فرمالے۔

رشک کرتا ہے زمیں پر آسماں

کیا کہوں میں دردِ دل کی داستاں جس کی برکت سے ملی آہ و فغاں
ہو مبارک تجھ کو اے آہ و فغاں ان کی جانب سے کرم پایا عیاں
جب سنو گے داستانِ عاشقاں پھر ملے گی تم کو بزمِ دوستاں
دوستو یہ دردِ دل کا بوستاں ہے عطائے دوست بہرِ دوستاں
جب زمیں پر روتے ہیں مستغفراں رشک کرتا ہے زمیں پر آسماں
سیکڑوں جاں کی ہے بارش ہر زماں ایسی جاں پر جو فدا ہو تجھ پہ یاں
جب بھی دیکھا ہے سکوتِ عاشقاں ان کی خاموشی ہے رشکِ صد بیاں
جس کے آب و گل میں دردِ دل نہ ہو جسمِ خاکی ہے فقط اے دوستاں
دل مرا مضطر رہے تیرے لیے ہے یہی بس حاصلِ ہر دو جہاں
جب سے تیرا غم ملا ہے اے خدا رہتا ہے ہر وقت اختؔر شادماں

مشکل الفاظ کے معانی:۔ عیاں: کھلا ہوا۔ **داستانِ عاشقاں:** اللہ تعالیٰ کے عاشقوں کی داستان۔ **بزمِ دوستاں:** اللہ تعالیٰ کے دوستوں کی محفل۔ **بوستاں:** باغ۔ **عطائے دوست:** اللہ تعالیٰ کی عنایت۔ **بہرِ دوستاں:** اولیاء اللہ کے لیے۔ **مستغفراں:** اللہ تعالیٰ سے معافی مانگنے والے۔ **ہر زماں:** ہر لمحہ۔ **صد بیاں:** سینکڑوں بیان وتقریریں۔ **آب و گل:** پانی اور مٹی۔ **جسمِ خاکی:** مٹی کا جسم۔ **مضطر:** بے چین۔ **شادماں:** خوش وخرم۔

کیا کہوں میں دردِ دل کی داستاں
جس کی برکت سے ملی آہ و فغاں
ہو مبارک تجھ کو اے آہ فغاں
ان کی جانب سے کرم پایا عیاں

یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ نے مجھے اپنی محبت کا درد عطا فرما دیا، اپنی یاد میں کی جانے والی آہ وفغاں کی دولت عطا فرما دی ہے جو واضح طور پر اللہ تبارک وتعالیٰ کے فضل وکرم کا نتیجہ ہے جب اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ توفیق بخشی کہ میں نے اس کے راستے کے غم اٹھائے تو اس کی برکت سے دل میں ایک خاص تڑپ، اور سوز وگداز حاصل ہوگئی اور اسی کی ترجمانی کے طور پر میری زبان سے آہ وفغاں ہوتی رہتی ہے جس پر اللہ تعالیٰ کی خاص رحمت اور عنایت نازل ہوتی ہوئی نظر آتی ہے۔

عطائے دوست بہر دوستاں

جب سنو گے داستانِ عاشقاں
پھر ملے گی تم کو بزمِ دوستاں
دوستو یہ دردِ دل کا بوستاں
ہے عطائے دوست بہرِ دوستاں

اللہ تعالیٰ نے اپنی سنت دنیا میں اس طرح قائم فرمائی ہے کہ جو شخص خاصانِ خدا اہل اللہ کے ساتھ رہتا ہے اور ان کی صحبت اٹھاتا ہے تو پھر اسے بھی اللہ تعالیٰ کا خاص تعلق نصیب ہو جاتا ہے اور انتہائی گہرے درجے کی محبت دل میں پیدا ہو جاتی ہے اور جب عاشقوں کی داستان ان کی زبانی سننا نصیب ہوتا ہے تو پھر بسہولت بزمِ دوستاں کی نعمت بھی مل جاتی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے خاص بندوں پر جو رحمتیں اور برکتیں نازل فرماتے ہیں تو ان کے ساتھ رہنے والا بھی پھر اس سے محروم نہیں رہتا اس لیے جو شخص دردِ دل کا بوستاں حاصل کرنا چاہے اس کی صورت یہی ہے کہ اللہ والوں کی دوستی حاصل کرلے تو اللہ تعالیٰ اسے بھی یہ چیز عطا فرما دیں گے۔ جیسے ایک روایت میں ہے:

﴿فَعِنْدَ ذِکْرِ الصَّالِحِیْنَ تَنْزِلُ الرَّحْمَةُ﴾
(مرقاۃ المفاتیح، باب الجنازۃ)

کہ اللہ والوں کے تذکرے کے وقت میں رحمت نازل ہوتی ہے اور ظاہر ہے کہ جہاں وہ خود موجود ہوں وہاں کتنی رحمتیں نازل ہوں گی۔ اسی لیے علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ اگر دل کا سوز و گداز تجھے حاصل کرنا ہے تو اللہ والوں کے ساتھ رہ ؎

پیرِ رومی را رفیقِ راہ ساز
تا ترا بخشش خدا سوز و گداز

کہ پیرِ رومی کو راستہ کا ساتھی بنالو تا کہ اللہ تعالیٰ تمہیں بھی دل کا سوز و گداز اور خاص تڑپ اور لگن عطا فرمادے کیونکہ یہ دولت اللہ والوں کی صحبت کے بغیر نصیب نہیں ہوتی ہے تاریخی واقعات اور قرآن و حدیث کے دلائل اس پر شاہد ہیں۔

جب زمیں پر روتے ہیں مستغفراں
رشک کرتا ہے زمیں پر آسماں

جب گناہ گار لوگ اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی معافی چاہتے ہیں اور زمین پر رہ کر آہ و زاری کرتے ہیں تو پھر اللہ تعالیٰ کی بے شمار رحمتیں ان کے اوپر برستی ہیں اور وہ آسمان کے لیے قابلِ رشک بن جاتے ہیں کہ وہ آنکھوں سے گرنے والے آنسو اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں ان ستاروں سے زیادہ وقعت رکھتے ہیں جن سے آسمان مزین ہے اس لیے کہ ان ستاروں سے دنیا کا ظاہر چمکتا ہے اور روشن ہوتا ہے اور آنسوؤں کے ان قطروں سے قلب و جان چمک اٹھتے ہیں۔

سیکڑوں جاں کی ہے بارش ہر زماں
ایسی جاں پر جو فدا ہو تجھ پہ یاں

چونکہ وہ شخص جو کہ اپنی جان اللہ تعالیٰ پر فدا کرتا ہے وہ مقصد حیات میں لگا ہوا ہوتا ہے اس لیے اسے دل میں یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسا کہ سینکڑوں اور ہزاروں جانیں اسے عطا ہو رہی ہوں یعنی ایسے آدمی کو ایک عجیب و غریب قسم کی لطف اندوز حیات نصیب ہو جاتی ہے اس لیے وہ ہر دم خاص مزہ پا تا رہتا ہے لہٰذا یہ کہنا بالکل بجا ہوتا ہے کہ ہر گھڑی سینکڑوں جانوں کی بارش ہو رہی ہو۔

جس کے آب و گل میں دردِ دل نہ ہو
جسم خاکی ہے فقط اے دوستاں

یعنی جو آدمی اللہ تعالیٰ کی محبت اپنے سینے میں نہ رکھتا ہو اور گناہوں سے بچ کر حرام خواہشات قربان کر کے خاص دردِ دل اس کے سینے میں موجود نہ ہو تو وہ مٹی کا محض ایک ڈھیر ہے جس کی اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں کوئی قیمت نہیں ہے اور مر کر مٹی کے ایک ڈھیر میں تبدیل ہونے والا ہے بلکہ اس سے آگے بڑھ کر یہ کہیے کہ عام مٹی کا ڈھیر تو اللہ تعالیٰ کے عقاب و عذاب کا مستحق نہیں ہے لیکن یہ انسان جو اپنے دل میں ایمان کی دولت نہیں رکھتا یہ مرنے کے بعد اللہ تعالیٰ کے عذاب کا مستحق ہوگا اس لیے یہ جسم خاکی دوسری خاک اور مٹی سے بھی بدتر ہوگا۔

اس کی راہ کی بے قراریاں کیا ہی خوب ہیں

دل مرا مضطر رہے تیرے لیے
ہے یہی بس حاصل ہر دو جہاں
جب سے تیرا غم ملا ہے اے خدا
رہتا ہے ہر وقت اختؔر شادماں

یہ اللہ تعالیٰ کی محبت میں اضطراب اور بے قراری ایسی عظیم نعمت ہے کہ اس کی بدولت انسان کو لطف دو جہاں نصیب ہو جاتا ہے اور اس بے قراری میں قرار پوشیدہ ہے اور اس غم خداوندی میں بے شمار خوشیاں مضمر اور پنہاں ہیں اس لیے جس کو یہ دولت مل جائے اسے زندگی میں کبھی بے چین و پریشان نہیں پاؤ گے بلکہ اس کے چہرے کی زیارت کر کے اور چند لمحے اس کے پاس بیٹھ کر دنیا کے بے چین لوگ چین و سکون پا جاتے ہیں اور یہ غم انسان کو بے غم کر دیتا ہے اس لیے جسے یہ عطا ہو تو وہ ہر وقت فرحاں و شاداں رہتا ہے جیسا کہ مختلف اشعار میں یہ مضمون تفصیل سے گزر چکا یہی وجہ ہے کہ حضرت والا فرماتے ہیں کہ جب سے مجھے آپ کا غم مل گیا ہے تو دنیا کا ہر غم مجھ سے رخصت ہو گیا اور میں ہر وقت شادماں رہتا ہوں اس کی واضح سی حکمت یہ ہے کہ پھر اللہ تعالیٰ کا یہ عاشق پیش آنے والی ہر حالت کو اپنے محبوب خداوند تعالیٰ کی طرف سے سمجھتا ہے تو ہر حالت میں راضی اور خوش رہتا ہے۔

تم نے دیکھی برکتِ آہ وفغاں

اہل ظاہر مبتلائے این و آں　　قلب عارف عاشق رب جہاں
ہیں سلامت اہل دل کی کشتیاں　　تم نے دیکھی برکت آہ و فغاں
جس نے دی غیر خدا پر اپنی جاں　　عمر بھر پایا اسے نوحہ کناں
بے اثر ہے اہل ظاہر کا بیاں　　بے زباں عاشق ہے رشک صد بیاں
ہاتھ پھیلائے کھڑے در پر ہیں یاں　　کر نہ خالی ہاتھ واپس شاہ جاں
دوست یاد دوست میں گریہ کناں　　عرش اعظم پر ہے ساکن اس کی جاں
آپ کا بے حد ہے اخترؔ پر کرم　　ورنہ یہ گھر آپ کا اور میں کہاں

مشکل الفاظ کے معانی:۔ **اھلِ ظاھر**: ظاہری حالات کو دیکھ کر چلنے والے۔ **این و آں**: مختلف فکروں میں مبتلا۔ **نوحہ**: روتا ہوا۔ **شاہِ جھاں**: اللہ تعالیٰ۔ **گریہ کناں**: رونا۔ **ساکن**: رہنے والا۔

ظاہری دنیوی علوم حقیقی علم کا مصداق نہیں

اہل ظاہر مبتلائے این و آں
قلب عارف عاشق رب جہاں

قرآنِ کریم میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے ظاہری علم رکھنے والوں کی حالت کا بیان کیا ہے:

﴿یَعۡلَمُوۡنَ ظَاهِرًا مِّنَ الۡحَیٰوةِ الدُّنۡیَا وَهُمۡ عَنِ الۡاٰخِرَةِ هُمۡ غَافِلُوۡنَ﴾

(سورۃ الروم، آیت:۷)

ترجمہ: یہ لوگ صرف دنیوی زندگی کی ظاہر (حالت) کو جانتے ہیں اور یہ لوگ آخرت سے (بالکل ہی) بے خبر ہیں (کہ وہاں کیا ہوگا، اس لیے ان کو دنیا میں نہ اسباب عذاب سے بچنے کی فکر ہے نہ اسباب نجات ایمان اور عمل صالح کی تلاش ہے)

جس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ لوگ دنیا کی زندگی کے ایک پہلو کو تو خوب جانتے ہیں کہ تجارت کس طرح کریں، کس مال کی کریں، کہاں سے خریدیں، کہاں بیچیں اور کھیتی کس طرح کریں، کب بیج ڈالیں کب کاٹیں، تعمیرات کیسی کیسی بنائیں، سامانِ عیش وعشرت کیا کیا مہیا کریں لیکن اسی حیات دنیا کا دوسرا پہلو جو اس کی حقیقت اور اس کے اصلی مقصد کو واضح کرتا ہے۔ اس حیات کا چند روزہ قیام درحقیقت ایک مسافرانہ قیام ہے انسان یہاں کا مقامی آدمی (نیشنل) نہیں، بلکہ دوسرے ملک آخرت کا باشندہ ہے، یہاں کچھ مدت کے لیے ویزا پر آیا ہوا ہے، اس کا اصلی کام یہ ہے کہ اپنے اصلی وطن کے لیے یہاں سے سامان راحت فراہم کر کے وہاں بھیجے اور وہ سامان راحت

ایمان اور عمل صالح ہے اس دوسرے رخ سے بڑے بڑے عاقل کہلانے والے بالکل غافل اور جاہل ہیں۔

قرآن کریم کے الفاظ میں غور کیجئے کہ یعلمون کے ساتھ ظاہرا من الحیوۃ الدنیا فرمایا ہے، جس میں لفظ ظاہر کو تنوین کے ساتھ نکرۃ لاکر قواعد عربیت کی رو سے اس طرف اشارہ ہے کہ درحقیقت یہ لوگ حیات ظاہر کو بھی پورا نہیں جانتے، اس کے صرف ایک رخ کو جانتے ہیں دوسرے رخ سے غافل ہیں اور آخرت سے بالکل ہی غافل و جاہل ہیں۔ (معارف القرآن، ج:۶، ص:۷۲۲)

اس میں ان لوگوں کے لیے سبق ہے جو اپنے ظاہری مادی علوم، جو کہ حقیقت میں فنون ہیں ان پر ناز اور فخر کرتے ہیں اور حقیقت میں علوم سے بے خبر ہیں جس کے نتیجے میں وہ جہل مرکب میں گرفتار ہیں اور ایسے دنیوی علوم تو پہلی کافر قوموں کے پاس بھی رہے اور انہوں نے انبیاء سے اسی بنیاد پر معاندانہ رویہ اختیار کیا اور متکبرانہ انداز سے اپنے ان فنون پر ناز کرنے لگے اور آخرت کے علوم وحی آسمانی پر ایمان نہ لائے جس کو قرآن کریم نے ان الفاظ میں بیان فرمایا اور ان پر آنے والے عذاب کا تذکرہ کیا:

﴿فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَرِحُوْا بِمَا عِنْدَهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ﴾

(سورۃ الغافر، آیت:۸۳)

ترجمہ: جب ان کے پیغمبران کے پاس کھلی دلیلیں لے کر آئے تو وہ لوگ اپنے (اس) علم (معاش) پر بڑے نازاں ہوئے جو ان کو حاصل تھا (یعنی معاش کو مقصود سمجھ کر اور اس میں جو ان کو لیاقت حاصل تھی اس پر خوش ہوئے اور معاد کا انکار کر کے اس کی طلب کو دیوانگی اور اس کے انکار پر وعید عذاب سے تمسخر کیا) اور (اس کے وبال میں) ان پر وہ عذاب آپڑا جس کے ساتھ تمسخر کرتے تھے۔

یعنی ان ناعاقبت اندیش منکرین کے پاس جب اللہ تعالیٰ کے رسول واضح توحید و ایمان لے کر آئے تو یہ لوگ اپنے علم کو انبیاء کے لائے ہوئے علم سے بہتر اور حق سمجھ کر انبیاء کے کلام کا رد کرنے لگے۔ یہ علم جس پر کفار خوش اور مگن تھے اور اس کے مقابلہ میں انبیاء کے علوم کو رد کرتے تھے یا تو ان کا جہل مرکب تھا کہ ناحق اور باطل کو حق و صحیح سمجھ بیٹھے تھے۔ جیسے یونانی فلاسفہ کے بیشتر علوم و تحقیقات جو الٰہیات سے متعلق ہیں اسی نمونہ کی ہیں جن کی کوئی دلیل نہیں۔ ان کو جہل مرکب تو کہہ سکتے ہیں۔ ان کا نام علم رکھنا علم کی توہین ہے۔ یا پھر ان کے اس علم سے مراد دنیا کی تجارت، صنعت وغیرہ کا علم ہے جسمیں یہ لوگ فی الواقع ماہر تھے۔ اور قرآنِ کریم نے ان کے اس علم کا ذکر سورۂ روم کی آیت میں اس طرح فرمایا ہے:

﴿يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ﴾

(سورۃ الروم، آیت:۷)

یعنی یہ لوگ دنیا کی ظاہری زندگی اور اس کے منافع حاصل کرنے کو تو کچھ جانتے سمجھتے ہیں، مگر آخرت جہاں ہمیشہ

رہنا ہے اور جہاں کی راحت وکلفت دائمی ہے اس سے بالکل جاہل وغافل ہیں۔ اس آیت میں بھی اگر یہی علم ظاہر دنیا کا مراد لیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ یہ لوگ چونکہ قیامت اور آخرت کے منکر اور وہاں کی راحت وکلفت سے جاہل وغافل ہیں اسی لیے اپنے اسی ظاہری ہنر پر خوش اور مگن ہو کر انبیاء کے علوم کی طرف توجہ نہیں دیتے۔

(معارف القرآن، جلد: ۷، صفحہ: ۶۲۲)

علم کا مصداقِ حقیقی، علمِ وحی ہے

صاحبو! دنیوی زندگی گزارنے کے لیے کچھ معاشی اور تجارتی فنون جاننا اور سیکھنا اور جدید ٹیکنالوجی (Technaology) حاصل کرنا یا کسی بھی لائن (Line) شعبہ میں انجینئرنگ (Engeering) کا ورس کرنا یا ڈاکٹر وغیرہ بننا اور پھر اپنے متعلق یہ تصور کرنا کہ میں عالم ہوں اور تعلیم کے فضائل اپنے اوپر چسپاں کرنا یا ایسے اداروں پر جہاں یہ دنیوی علوم وفنون پڑھائے جاتے ہوں، علوم کی فضیلت کی حدیثیں لکھنا، تختیاں آویزاں کرنا، یہ بلاشک وشبہ دین میں تحریف ہے۔

علم اللہ کی نگاہ میں صرف وحی آسمانی والا علم ہے جس سے اللہ تعالیٰ کی معرفت اور پہچان حاصل ہوتی ہو اور انسان کو اپنے مقصدِ حیات کا علم حاصل ہو اور اپنی حقیقت سے آشنائی ہو ورنہ دنیا کی زندگی گزارنے کے لیے تو پوری کائنات میں بسنے والے حیوانات بھی اپنے لیے مستقل ایک نظام رکھتے ہیں یہاں تک کہ ایک چھوٹا سا پرندہ جسے ہم اپنی زبان میں ''بوا'' کہتے ہیں جو بظاہر معمولی سا ایک پرندہ ہے مگر وہ اپنے رہنے کے لیے اتنا مضبوط اور شاندار گھر بناتا ہے اور اسے تنکوں سے اتنا عمدہ بُنتا ہے کہ باوجود معمولی معمولی کمزور تنکے ہونے کے وہ گھر مضبوطی کے ساتھ موجود رہتا ہے اور مزید مجھے اس کی تفصیل نہیں بتانی بس مقصدِ گفتگو اتنی بات عرض کرنی ہے کہ دنیا میں جینے کے لیے اپنی ضرورت کے بقدر علم تو حیوانات کے پاس بھی ہے۔ شہد کی مکھی کا مستقل ایک عظیم الشان وزارت وحکومت کا نظام ہے اور دوسرے پرندوں اور دوسرے جانوروں کا بھی اپنے اپنے طور پر اپنی ضرورت کے مطابق اور حفاظت و دفاع کی خاطر کچھ نہ کچھ مخصوص نظام موجود ہے۔

انسان کا وصف امتیازی اور حیوانات کا نظامِ زندگی

احقر کے پاس حکیم الاسلام حضرت قاری محمد طیب صاحب رحمہ اللہ کا ایک بیان کیسٹ میں محفوظ موجود ہے جس میں حضرت نے انسان کے امتیازی وصف اور خصوصی کمال کو ذکر کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان کا وصفِ امتیازی تعلیم وتربیت ہے۔ جیسا کہ حدیث شریف میں ہے کہ:

﴿اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا وَاِنَّمَا بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَکَارِمَ الْاَخْلَاقِ﴾

(السنن الکبریٰ للبیہقی)

کہ مجھ کو دنیا میں معلم بنا کر بھیجا گیا اور اچھے اور پاکیزہ اخلاق کو پورا کروں اس لیے بھیجا گیا۔ اور اسی میں حضرت رحمہ اللہ نے یہ بات ذکر فرمائی ہے کہ دنیا میں زندگی گزارنے کے لیے بقدرِ ضرورت اپنے رہنے سہنے کا انتظام اور اپنے بقا کے لیے دفاع اور حفاظت کی تدابیر تو عام جانوروں کو بھی سونپی گئی۔ چنانچہ حضرت نے مثال دیتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ شہد کی مکھیوں کا نظامِ حکومت و وزارت اتنا مضبوط ہوتا ہے کہ اگر کوئی مکھی کسی غلط جگہ پر بیٹھنے کی وجہ سے کوئی زہریلا مادّہ لے کر چھتے پر آ کر بیٹھے تو اُس کی مخبری اُن کا جاسوس فوراً متعلقہ محکمے کو کرتا ہے اور وہاں سے اُس کو قتل کرنے کا حکم صادر ہوتے ہی فوراً مار کر گرا دیا جاتا ہے۔ اسی لیے شہد کی مکھیوں کے چھتے کے نیچے بہت سی کٹی ہوئی مکھیاں گری پڑی ہوتی ہیں۔ اُس کا راز دراصل یہی ہے۔

اور دوسری ایک مثال میں ارشاد فرمایا کہ ایک موقع پر کسی آدمی نے بندروں سے تنگ آ کر کھانے میں زہر ملا یا اور اُن کے سامنے رکھ دیا۔ چنانچہ ایک دو بندر آئے، انہوں نے یہ صورت حال دیکھ کر اُس کو نہیں چھوا اور ذہن ذہن میں سوچنے لگے کہ روزانہ ایسا نہیں ہوتا تھا آج کیوں ایسا ہے؟ بالآخر اپنے چند ساتھیوں کو بلا کر لائے اور وہاں بیٹھ کر کچھ دیر تک میٹنگ ہوتی رہی جب اُن کی سمجھ میں کچھ نہ آیا تو پھر مزید خاص افراد لائے گئے۔ اُس کے بعد وہاں بیٹھ کر صورت حال کے بارے میں جائزہ لیا اور فوراً سب کے سب وہاں سے تیزی سے رواں دواں ہوگئے۔ تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ دیکھا کہ سب بندر اپنے ہاتھ میں ایک درخت کی شاخ لیے ہوئے چلے آرہے ہیں۔ اور سب نے آ کر وہ زہر ملایا ہوا کھانا کھایا اور اُس کے بعد وہ شاخ چبالی۔ گویا اُن کے محکمہ صحت کی تحقیق کے مطابق یہ شاخ اُس زہر کے لیے تریاق کا کام کرتی تھی کہ اگر اُس کے بعد اسے کھالیا جائے تو وہ زہر کے اثر کو بے اثر کردے۔

بہرحال مجھے اس تفصیل میں نہیں جانا صرف اتنی بات بتانی مقصود ہے کہ انسان کی پیدائش کا مقصد صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ وہ کھائے پیئے، اچھے مکانات تعمیر کرے اور عمدہ گاڑی اور فرنیچر گھر میں لائے اور زندگی گزار کر عالمِ آخرت کی طرف روانہ ہوجائے، بلکہ وہ ایک عظیم مقصد کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ اس لیے یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ دنیا کی ہر چیز کسی نہ کسی کام میں استعمال ہورہی ہے اور نظامِ عالم کا ایک حصہ ہے لیکن یہ حضرتِ انسان کسی مقصد کے لیے نہ ہو۔ جیسا کہ ارشاد فرمایا گیا:

﴿فَاِنَّكُمْ خُلِقْتُمْ لِلْاٰخِرَةِ وَالدُّنْيَا خُلِقَتْ لَكُمْ﴾

(شعب الايمان للبيهقي)

کہ دنیا تمہارے لیے پیدا کی گئی لیکن تم آخرت کے لیے پیدا کیے گئے ہو۔ اسی لیے جو خصوصیت اور امتیاز بنی آدم کو حاصل ہے وہ کسی دوسری مخلوق کو حاصل نہیں ہے۔ اس لیے مقصد بھی یقیناً دونوں کا الگ الگ ہوگا۔

تو بھلا اتنا باشعور اور عقل والا انسان اگر محض اپنے دنیا کے فنون اور دنیوی علوم ہی کو اپنا مبلغ علم قرار دے دے اور اسی کو سب کچھ سمجھ لے اور خود کس لیے پیدا ہوا تھا؟ کس نے پیدا کیا تھا؟ اس سے بالکل غافل ہو جائے شب و روز دنیا میں پورا پورا انہماک اور مشغولی ہو اور مستقبل کی کوئی پرواہ ہی نہ ہو تو پھر آخر اس میں اور دوسرے حیوانوں میں کیا فرق رہے گا اس لیے عقل مند اور سمجھدار انسان وہ کہلاتا ہے جو اپنے ظاہر داری کے چکر کو ایک طرف ڈال دے اور اللہ تعالیٰ کے احکام پر چل کر اپنی ابدی اور ہمیشہ کی سرخروئی کو پانے کے لیے جدو جہد اور کوشش میں لگا رہے اور اپنے خالق و مالک کا دل و جان سے عاشق ہو اور اسی پر فدا ہو اور چونکہ دو چیزوں کی محبتیں ایک ساتھ دل میں جمع نہیں ہوتیں اس لیے جب اللہ کا عاشق اس کے عشق و محبت کو دل میں بسا لیتا ہے تو پھر وہ مبتلائے این و آں نہیں رہتا۔

ہیں سلامت اہلِ دل کی کشتیاں
تم نے دیکھی برکتِ آہ و فغاں

یعنی اللہ تعالیٰ کی محبت کی برکت سے اللہ والے جس راہ پر چلتے ہیں اُس میں سلامتی ہی سلامتی اور عافیت ہی عافیت ہوتی ہے اور اُن کی روز و شب کی جانے والی آہ و فغاں کی برکت سے انہیں ظاہری رنج و غم کی شکلوں میں بھی اطمینان اور سکون ہی میسر رہتا ہے اس لیے بہرصورت اُن کی کشتیاں سلامت ہی رہیں گی۔

قبولیت دعا یقینی مگر شرائط کے ساتھ

ہاتھ پھیلائے کھڑے در پر ہیں یاں
کر نہ خالی ہاتھ واپس شاہِ جاں

اللہ تبارک وتعالیٰ کی شان رحم وکرم کی ہے اور کریم کے کئی معنی بیان کیے گئے ہیں۔ ہر معنی کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ کا در ایسا در ہے کہ جس کو کھٹکھٹانے والا خالی ہاتھ نہیں جا سکتا۔ اللہ تعالیٰ اُس کو اس کی مراد ضرور عطا فرماتے ہیں:

﴿اِنَّ رَبَّکُمْ حَیِیٌّ کَرِیْمٌ یَسْتَحْیِیْ بِہٖ عَبْدُہٗ اِذَا رَفَعَ یَدَیْہِ اَنْ یَّرُدَّھُمَا صِفْرًا﴾
(مشکوٰۃ المصابیح، ص: ۱۹۵)

کہ جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تمہارا اللہ بہت زیادہ شرم کرنے والا اور کریم ہے، اپنے بندے کے ہاتھ جب کہ وہ اُس کے سامنے اُٹھائے خالی لوٹانے سے شرماتا ہے۔

بس یہ الگ بات ہے کہ مراد دنیا ہی میں دے دی جائے یا اُس کے لیے آخرت میں جمع کر دی جائے۔ اس لیے اس مقام پر یہ بات جاننی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کے در پر مانگنے والا محروم تو کبھی نہیں ہوتا لیکن قبولیتِ دعا کے لیے کچھ شرطیں ہیں، اگر وہ شرطیں نہ ہوں تو بندے کو یہ سمجھنا چاہیے کہ کمی مجھ میں ہے نہ کہ اللہ کے وعدوں میں، اللہ تعالیٰ تو ہر دعا کو قبول کر رہے ہیں، مگر میں اُن شرائط کو پوری نہیں کر رہا ہوں جن پر اللہ نے دعا کی قبولیت کا وعدہ فرمایا

ہے۔مثلاً:

(**۱**)...... کھانا، پینا، پہننا سب کچھ حلال ہونا چاہیے ورنہ ملتزم پکڑ کر بھی دعا کی جائے تو قبول نہیں ہوتی۔ جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ایک شخص پراگندہ حال ہے، بال بکھرے ہوئے اور سفر لمبا (بظاہر قابلِ رحم) اپنے ہاتھ آسمان کی طرف اُٹھا کر اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہے اور کہتا ہے کہ یارب! یارب! لیکن اُس کا کھانا حرام، اُس کا پینا حرام اور اُس کا نشو ونما حرام سے ہوا ہے۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ اُس کی دعا اللہ کی بارگاہ میں قبول کرلی جائے؟

﴿عَن أَبِی هُرَیرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلیهِ وَسَلَّمَ أَیُّهَا النَّاسُ إِنَّ اللّٰهَ طَیِّبٌ لا یَقبَلُ إِلَّا طَیِّبًا وَإِنَّ اللّٰهَ أَمَرَ المُؤمِنِینَ بِمَا أَمَرَ بِهِ المُرسَلِینَ فَقَالَ یَا أَیُّهَا الرُّسُلُ کُلُوا مِنَ الطَّیِّبَاتِ وَاعمَلُوا صَالِحًا إِنِّی بِمَا تَعمَلُونَ عَلِیمٌ وَقَالَ یَا أَیُّهَا الَّذِینَ آمَنُوا کُلُوا مِن طَیِّبَاتِ مَا رَزَقنَاکُم ثُمَّ ذَکَرَ الرَّجُلَ یُطِیلُ السَّفَرَ أَشعَثَ أَغبَرَ یَمُدُّ یَدَیهِ إِلَی السَّمَاءِ یَا رَبِّ یَا رَبِّ وَمَطعَمُهُ حَرَامٌ وَمَشرَبُهُ حَرَامٌ وَمَلبَسُهُ حَرَامٌ وَغُذِیَ بِالحَرَامِ فَأَنّٰی یُستَجَابُ لِذٰلِکَ﴾

(صحیح مسلم، کتاب الزکاۃ، باب قبول الصدقة من الکسب الطیب وتربیتها)

(**۲**)...... دعا اللہ تعالیٰ سے اس طرح مانگنی چاہیے کہ اُس کی قبولیت کا دل میں یقین ہو۔

(**۳**)...... دل کو متحضر رکھ کر دعا مانگنی چاہیے۔ غافل دل کی دعا بھی اللہ تعالیٰ قبول نہیں فرماتے۔ ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

﴿قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ ادْعُوا اللّٰهَ وَاَنْتُمْ مُوْقِنُوْنَ بِالْاِجَابَةِ وَاعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ لَایَسْتَجِیْبُ دُعَآءً مِّنْ قَلْبٍ غَافِلٍ﴾

(مشکوۃ المصابیح، ص:۱۹۵)

کہ تم اللہ تعالیٰ سے اس طرح دعا مانگو کہ تمہیں قبولیت کا پورا یقین ہو اور یہ بات جان لو کہ اللہ تعالیٰ غافل دل سے دعا قبول نہیں فرماتے۔

یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ایسی دعا کا مانگنا پسند نہیں ہے کہ اے اللہ! اگر آپ چاہیں تو بخش دیں، اگر آپ چاہیں تو رحم فرمادیں، اگر آپ چاہیں تو روزی دے دیں۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کے سامنے خوب پختگی کے ساتھ اپنی رغبت کا اظہار کرے اور پوری قوت ویقین کے ساتھ دعا مانگے۔

(**۴**)...... استعجال یعنی جلدی مچانا نہ ہو کہ کسی دعا کو مانگ کر جب اپنی آنکھوں سے اپنے مقصد میں کامیابی نظر آتی دکھائی نہ دے تو یہ کہنے لگے کہ میں نے دعا مانگی مگر قبول ہی نہیں ہو رہی ہے۔

(**۵**)...... کسی گناہ کی دعا نہ ہو۔

(**۶**)...... قطع رحمی کی دعا نہ ہو کہ مثلاً اے اللہ! مجھے فلاں کو قتل کرنے کی قدرت دے دے یا فلاں اور فلاں رشتہ دار

میں تفریق پیدا کرادے۔

ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

﴿قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یُسْتَجَابُ لِلْعَبْدِ مَا لَمْ یَدْعُ بِاِثْمٍ اَوْ قَطِیْعَةِ رَحِمٍ مَالَمْ یَسْتَعْجِلْ قِیْلَ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ مَا الْاِسْتِعْجَالُ قَالَ یَقُوْلُ قَدْ دَعَوْتُ وَقَدْ دَعَوْتُ فَلَمْ اَرَیُسْتَجَابُ لِیْ فَیَسْتَحْسِرُ عِنْدَ ذٰلِکَ وَیَدَعُ الدُّعَآءَ﴾

(مشکوٰۃ المصابیح، ص: ۱۹۴)

یعنی حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مؤمن بندے کی دعا جب تک قبول کی جاتی ہے جب تک کہ وہ کسی گناہ یا قطع رحمی کی دعا نہ مانگے، بشرطیکہ جلدی نہ مچائے۔ ایک صحابی نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! جلدی مچانا کیا ہے؟ تو ارشاد فرمایا کہ وہ یوں کہنے لگے کہ میں نے تو بار بار دعا مانگی لیکن مجھے تو نہیں لگ رہا ہے کہ میری دعا قبول ہو رہی ہے اور پھر دعا مانگنا چھوڑ دے۔

(۷)...... جہاں کے علماء، لوگوں کے کھلم کھلا منکرات میں مبتلاء ہونے کے باوجود اُن پر روک ٹوک ونکیر نہیں کریں گے تو اُن کے متعلق یہ ارشاد آیا ہے کہ:

﴿وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ لَتَأْمُرُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ وَلَتَنْھَوُنَّ عَنِ الْمُنْکَرِ اَوْ لَیُوْشِکَنَّ اللّٰہُ اَنْ یَّبْعَثَ عَلَیْکُمْ عِقَابًا مِّنْہُ ثُمَّ تَدْعُوْنَہٗ فَلَا یُسْتَجَابُ لَکُمْ﴾

(سنن الترمذی، کتاب الفتن، باب ماجآء فی الامر بالمعروف والنھی عن المنکر)

اُن کی دعائیں بھی قبول نہیں کی جائیں گی۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ منکر پر نکیر کرنے کو بھی اس بارے میں بہت دخل ہے۔

دوست یادِ دوست میں گریہ کناں
عرشِ اعظم پر ہے ساکن اس کی جاں
آپ کا بے حد ہے اختؔر پر کرم
ورنہ یہ گھر آپ کا اور میں کہاں

قرآنِ پاک میں خود اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کو اپنا دوست قرار دیا ہے۔ پھر اس ولایت اور دوستی کے درجات ہیں ادنیٰ، درمیانی اور اعلیٰ۔ اور جو اہلِ دل اور اہل اللہ ہر لمحہ اپنی جان اللہ پر فدا کرتے رہتے ہیں ان کی اللہ تعالیٰ کے ساتھ دوستی گاڑھی اور مضبوط ہو جاتی ہے۔ تو حضرت والا اللہ تعالیٰ سے بڑے حسنِ ظن اور محبت کی بنیاد پر عاجزانہ اور نیازمندانہ انداز سے یہ بات پیش فرما رہے ہیں کہ اے اللہ! میں محض آپ کی توفیق اور فضل سے آپ کے گھر پر آ کر آپ کے در پر کھڑا ہوا ہوں، گو کہ میں زمین پر ہوں لیکن چونکہ میرا مقصود آپ کی ذاتِ عالی اور آپ

ہی میرے مسجود اور مقصود ہیں اس لیے میں اس حال میں بھی ایسا ہوں جیسا کہ میری جان عرشِ اعظم پر ٹھہری ہوئی ہو اور میں آپ کے سامنے سجدہ ریز ہوں ا ر آپ سے گریہ وزاری کے ذریعے اپنی ادائے بندگی پیش کر رہا ہوں۔ حقیقت یہی ہے کہ جب آدمی اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑے ہوکر اور بڑے خشوع وخضوع اور تضرع و عاجزی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا ہے تو اُس کا حال ایسا ہی ہوتا ہے۔

اسی لیے ایک بزرگ فرماتے تھے جب میں دو رکعت نماز کی نیت باندھ کر اللہ اکبر کہتا ہوں تو مجھے ایسا لگتا ہے کہ میرا جسم تو زمین پر لیکن میں خود عرشِ اعظم پر پہنچ چکا ہوں اور اللہ تعالیٰ کی ذاتِ پاک میرے سامنے ہے اور پھر میں یہ کلمات پڑھ رہا ہوں سُبْحَانَکَ اللّٰھُمَّ وَبِحَمْدِکَ الخ.

صحبتے با اہلِ دل با عاشقاں

طائرِ خستہ کا خستہ آشیاں — کیوں حسد ہے اس سے تجھ کو باغباں
کر نظر اپنے عذابِ ظلم پر — لگ نہ جائے آہ! آہِ بے کساں
طائرِ مسکیں کو گلشن میں نہ چھیڑ — سنگ دل کچھ سن بھی فریاد و فغاں
جو نہیں ڈرتا ہے اپنے ظلم سے — اس کو پایا ہم نے ہر دم سرگراں
روئے زرد و آہ سرد و چشم تر — دوستو یہ ہے نشانِ عاشقاں
دردِ دل کے واسطے درمانِ دل — صحبتے بااہلِ دل باعاشقاں
جو بھی اختؔر صاحبِ نسبت ہوا — اُس کو پایا ہم نے ہر دم شادماں

مشکل الفاظ کے معانی:۔**طائرِ خستہ**: بدحال پرندہ۔**خستہ آشیاں**: بدحال گھونسلہ۔**بے کساں**: لاچار،ضعیف۔ **طائرِ مسکین**: بے کس پرندہ۔**فریاد و فغاں**: پکارنا اور رونا۔**سرگراں**: پریشان۔**روئے زرد**: پیلا چہرہ۔ **درماں**: علاج۔**شادماں**: خوش۔

اللہ والوں سے دشمنی اپنی تباہی و بربادی ہے

طائرِ خستہ کا خستہ آشیاں
کیوں حسد ہے اس سے تجھ کو باغباں
کر نظر اپنے عذابِ ظلم پر
لگ نہ جائے آہ! آہِ بے کساں
طائرِ مسکیں کو گلشن میں نہ چھیڑ
سنگ دل کچھ سن بھی فریاد و فغاں
جو نہیں ڈرتا ہے اپنے ظلم سے
اس کو پایا ہم نے ہر دم سرگراں

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے اعلان فرمایا:

﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْإِنْسِ وَالْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ إِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ﴾

(سورۃ الانعام، آیت: ۱۱۲)

ترجمہ: اور (یہ لوگ جو آپ سے عداوت کرتے ہیں یہ کوئی نئی بات آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے لیے نہیں ہوئی، بلکہ جس طرح یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے عداوت رکھتے ہیں) اسی طرح ہم نے ہر نبی کے دشمن بہت سے شیطان پیدا کیے تھے، کچھ آدمی (جن سے اصل معاملہ تھا) اور کچھ جن (ابلیس اور اس کی اولاد)۔ (معارف القرآن، جلد:۳، صفحہ:۴۱۷)

اس آیت کریمہ اور مختلف دوسری آیتوں میں انبیاءِ کرام علیہم السلام کے قصوں اور واقعات سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر زمانے میں اپنے انبیاء اور اولیاء کے لیے کچھ ایسے خاص دُشمن اپنے تکوینی نظام کے تحت پیدا کیے ہیں جو ان کی مخالفت اور عداوت اور ایذاء وتکلیف میں آگے آگے رہتے تھے اور جن کا کام شیطان کے ایجنٹ بن کر بے دینی اور گمراہی اور مکر وفریب اور کفر وشرک کو پھیلانا رہا اور اللہ کے نبیوں اور ولیوں کو مختلف انداز سے ستانا اور ایذائیں پہنچانا اُن کی عادت بنی رہی۔ بالآخر اللہ تعالیٰ کے عذاب نے اُن کو پکڑ لیا اور یہی اللہ تعالیٰ کی سنت آج بھی ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ ہر اللہ والے کے کچھ ایسے محروم القسمت لوگ دُشمن بن کر اُبھرتے ہیں جو اُس کو بظاہر خستہ حال اور ظاہری ساز وسامان کی قلت وکمی کا شکار دیکھ کر اُس کو ذلیل اور بدنام کرنے کی فکر میں لگ جاتے ہیں اور اُن کا ذہن اس طرف نہیں جاتا کہ میری یہ کارروائی اور سلوک ان اہلِ دل اولیاء اللہ کے ساتھ بہت بڑا ظلم ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں انہیں چھیڑ کر اللہ تعالیٰ کی پکڑ کا شکار ہو جاؤں گا کیونکہ اُن

کے آشیانے سے ہر دم اللہ تعالیٰ کو پکارنے کی آوازیں اور آہ وفغاں سنائی دے رہی ہے۔

تو اے سخت سنگ دل ظالم! اپنے اوپر رحم کھا کر ان مسکین درویشوں کے گلشن کو چھیڑنے کی کوشش نہ کرو ورنہ اگر آہ لگ گئی تو پھر سرگردانی و پریشانی کے سوا کچھ نہ ملے گا۔ کیونکہ جب ظالم کا ظلم زیادہ ہو جاتا ہے اور حد سے بڑھ جاتا ہے تو پھر اُس پر اللہ تعالیٰ کی پکڑ ضرور آتی ہے۔ جیسا کہ حدیث پاک میں یہ وعدہ کیا گیا ہے کہ مظلوم کی دعا رد نہیں ہوتی اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَدَعْوَةُ الْمَظْلُوْمِ يَرْفَعُهَا فَوْقَ الْغَمَامِ وَتُفَتَّحُ لَهَا أَبْوَابُ السَّمَآءِ وَيَقُوْلُ الرَّبُّ عَزَّ وَجَلَّ وَعِزَّتِیْ لَأَنْصُرَنَّکِ وَلَوْ بَعْدَ حِيْنٍ﴾

(سنن الترمذی، کتاب صفة الجنة)

میں ضرور بضرور تیری مدد کروں گا اگر چہ کچھ وقت کے بعد ہو۔ یعنی جب تک میری مصلحت نہیں ہے تو میں اس ظلم کو چلنے دوں گا ورنہ انتقامی کارروائی کر کے ظالم سے تیرے لیے بدلہ ضرور لوں گا۔

اس لیے حضرت والا نے فرمایا کہ آہ! کیسا نادان ہے اللہ والوں کو ستانے والا، اسے یہ پتہ نہیں ہے کہ ان مظلوم اور بےکس و بےبس لوگوں کی آہ نکل کر چیرتی ہوئی آسمانوں پر پہنچتی ہے اور وہاں سے ظالم کے لیے تباہی و بربادی کا پیغام لے کر آتی ہے۔ چنانچہ ایسے لوگ انجام کے اعتبار سے دنیا ہی میں اُس کے بدترین نتائج دیکھ لیتے ہیں اور ہم نے ایسے لوگوں کو ہمیشہ سرگرداں اور پریشان دیکھا ہے اور اس قسم کے لوگ تقریباً ہر دور میں اللہ والوں کے مخالفین اور حاسدین رہے ہیں جو درحقیقت اولیاء اللہ کی باطنی ترقی کے لیے حق تعالیٰ کا ایک تکوینی غیبی نظام ہے اور یہی ان کی ترقی کا راز ہے۔

حضرت والا کی دو خاص ادائیں چشمِ گریاں اور قلبِ بریاں

روئے زرد و آہ سرد و چشمِ تر
دوستو یہ ہے نشانِ عاشقاں

دردِ دل کے واسطے درمانِ دل
صحبتِ با اہلِ دل باعاشقاں

جو بھی اختر صاحبِ نسبت ہوا
اُس کو پایا ہم نے ہر دم شادماں

اللہ والوں کا بدن عام طور پر فکرِ آخرت کی وجہ سے موٹاپا لیے ہوئے نہیں ہوتا بلکہ ظاہری اعتبار سے وہ نڈھال اور کمزور معلوم ہوتے ہیں لیکن باطنی قوت کے لحاظ سے وہ بہت طاقتور اور مضبوط ہوتے ہیں۔ اس لیے

حضرت والا نے اہل اللہ کی یہ تین نشانیاں بیان فرمائی کہ خدا کے سچے عاشقوں کے یہ تین نشان ہیں۔ روئے زرد اور آہِ سرد اور چشمِ تر گو کہ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جس میں یہ باتیں نظر نہ آئیں تو ہم اس کے بارے میں یہ فیصلہ کر دیں کہ یہ تعلق مع اللہ کا حامل نہیں ہے بلکہ مقصود صرف اتنا ہے کہ درحقیقت اگر آخرت کا خوف اور اللہ تعالیٰ کی عظمت واقعی دل میں اُتر جائے تو پھر چہرہ زرد ہونا اور بدن پر موٹاپے کا نہ ہونا اور وقفے وقفے سے آہِ سرد کا نکلنا اور معمولی معمولی باتوں پر آنکھوں کا اشکبار ہو جانا اور آخرت میں اپنی حالت کا استحضار ہونے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے خوف سے کانپتے رہنا یہ تقریباً تمام ہی اہل اللہ کی نشانی ہے اور جس کو یہ باتیں حاصل کرنی ہوں اور دل کو واقعی دل بنانا ہو تو اُسے چاہیے کہ اہلِ دل عاشقانِ خدا کے ساتھ صحبت اختیار کرے۔ تو پھر پتہ چلے گا کہ اس دنیا میں بھی اہل اللہ کس قدر شاد ماں اور خوش رہتے ہیں اور جینے کا وہ مزہ ملے گا کہ اپنی ماضی کی زندگی کی تمام لذتوں پر حسرت و افسوس کیا کرے گا۔

اس ضمن میں احقر یہ عرض کرنا مناسب سمجھتا ہے کہ ہمارے حضرت والا دامت برکاتہم کے ساتھ جو حضرات بیعت وارشاد کا تعلق رکھتے ہیں اور اصلاح وتزکیہ کے شعبے میں حضرت کو اپنا مقتداء اور شیخ ومرشد مانتے ہیں تو انہیں اس مسئلے پر خاص غور کرنا چاہیے کہ ہم نے اپنے شیخ کی خاص ادائیں اپنے اندر منتقل کی ہیں یا نہیں؟ اور یہ کہ وہ خاص ادائیں جو حضرت والا کی عجیب وغریب امتیازی صفات میں سے ہیں کیا ہیں؟ میری مراد اس سے یہ ہے کہ حضرت والا اپنی زندگی کے اکثر اوقات میں اس حال میں رہتے ہیں کہ قلب بریاں وچشم گریاں یعنی اللہ تعالیٰ کی محبت میں جلا بھنا دل اور موسلا دھار بارش کی طرح آنسو برسانے والی آنکھیں۔ اس لیے ہمیں خاص طور پر اپنے اندر یہ دو صفتیں پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے اور اگر اب تک پیدا نہیں ہوئی تو اُن اسباب وموانع پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے کہ جن کی وجہ سے ہمیں یہ دو خاص حضرت والا کی صفتیں اب تک حاصل نہیں ہوسکیں۔ کیونکہ یہ دونوں اللہ والوں کی بڑی عجیب وغریب صفات ہیں جو کہ حق تعالیٰ اپنے خاص مقربین بارگاہ کو عطا فرماتے ہیں۔

حسرتیں دل کی ہیں دل میں میہماں

حسرتوں کے زخم سے ہے خوں رواں عشق کا ہوتا ہے یوں ہی امتحاں
میرے خونِ آرزو کا یہ سماں رو رہا ہے دیکھ کر کے آسماں
ہیں زمیں پر ایسی بھی کچھ ہستیاں رشک جن پر کرتے ہیں کروبیاں
جس جگہ گرتا ہے خونِ آرزو لے نہ لے بوسہ کہیں خود آسماں
بستیاں حسرت زدوں کی دیکھ لو ان کی ویرانی میں ہے جنت نہاں
حسرتوں کے زخم سے ہے خوں رواں اب نہ لو یارو ہمارا امتحاں
عشرتیں اختؔر ہیں دل سے دور دور حسرتیں دل کی ہیں دل میں مہماں

مشکل الفاظ کے معانی:۔ سماں: منظر۔ کرو بیاں: فرشتے۔ خونِ آرزو: حرام خواہشات پر عمل نہ کرنا۔
نہاں: پوشیدہ۔

بعض مجاہدات پر انعامِ ربانی

حسرتوں کے زخم سے ہے خوں رواں
عشق کا ہوتا ہے یوں ہی امتحاں
میرے خونِ آرزو کا یہ سماں
رو رہا ہے کہ دیکھ کر کے آسماں

جب بندے کو اللہ تعالیٰ سے محبت ہو جاتی ہے تو پھر اُس کا قدم بہ قدم اللہ تعالیٰ کی طرف سے امتحان اور آزمائش کا مرحلہ شروع ہوتا ہے۔ جیسا کہ دنیا میں بھی یہ دستور ہے کہ آپس میں عشق و محبت کے امتحان لیے جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ بھی اسی طرح اپنے بندوں سے موقع بہ موقع اُن کی محبت کا امتحان لیتے ہیں مثلاً ایک حسین بے ریش لڑکا یا عورت سامنے سے گزر رہی ہے، اب نفس کا تقاضا ہے کہ ان کو دیکھو اور اللہ کا حکم ہے کہ ہرگز نہ دیکھو تو نفس کے تقاضے اور اللہ تعالیٰ کے حکم میں مقابلہ شروع ہوتا ہے۔ تو بندہ کا امتحان اُسی وقت سے شروع ہو جاتا ہے۔ اگر اس نے اس کی طرف نظر اُٹھا کر دیکھ لیا یا اُس سے باتیں کر کے نفس کو خوش کیا یا اُس سے تعلقات اور محبتیں بڑھانے کی کوششیں کیں تو سمجھو یہ اللہ کے امتحان میں ناکام ٹھہرا۔

اور اگر اُس نے اپنے دل پر ہزار صدمے اور غم اُٹھائے اور اپنی تمام حسرتوں کا خون کر دیا اور گویا دل کے اندر ہی حسرتوں کو لیے ہوئے اُن کے خون کے دریا میں نہا رہا ہے تو یہ وہ امتحان ہے کہ جس کے بارے میں حضرت

فرمارہے ہیں کہ حسرتوں کے زخموں سے خون کا دریا بہہ رہا ہے۔ یہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے آزمائش و امتحان کا ایک طریقہ ہے اوراس میں کامیاب ہونے پر بندے کا جومقام اللہ تعالیٰ کے یہاں ہوتا ہے وہ اتنا عظیم الشان ہے کہ حق سبحانہ وتعالیٰ فرشتوں کے یہاں اُس بندے کا تذکرہ فرماتے ہیں اور پھر فرشتوں کو وہ جملہ یاد دلاتے ہیں کہ جب انہوں نے ابن آدم کی پیدائش پر کہہ دیا تھا کہ یہ تو خون بہانے والی قوم ہوگی۔اوراس امتحان کا ثمرہ اورنتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس دل پرخوب رحمتیں اور برکتیں نازہوتی ہیں۔

چنانچہ حکیم الامت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اللہ تعالیٰ کی محبت اشد ہونے کا اور زیادہ ہونے کا یہی معیار بیان فرمایا کہ دنیاوآخرت کے تقاضوں میں تقابل ہونے کے وقت اللہ تعالیٰ کے حکم کوترجیح دے اور دنیا کے تقاضوں کو پیچھے ڈال دے جسے ایک دوسری مثال سے اس طرح سمجھئے کہ اگرآپ کسی دکان کے اوپر مال بیچنے کے لیے بیٹھے ہوئے ہیں اورنماز باجماعت کا وقت آ گیا۔دوسری جانب بڑے گاہک بڑی مقدار میں زیادہ خریدنے والے آپ کی دکان پرموجود ہیں تو اگرایسی صورت میں آپ دکان کوتالا ڈال کرمسجد کی طرف چل دیتے ہیں اور ہزار، دس ہزار اور لاکھ کی پرواہ نہیں کرتے تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ جو مال و دولت کی آرزوئیں آپ کے دل میں ہیں اُن پر آپ نے اللہ کے حکم کو غالب کردیا۔اسی لیے حضرت مفتی شفیع صاحب قرآن کریم کی اس آیت کہ جس میں مختلف چیزوں کوذکرکرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے ارشادفرمایا اَحَبَّ اِلَیْکُمْ مِنَ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ کے تحت یہ بات ذکرفرمائی ہے کہ جب تک اللہ ورسول کی محبت ساری دنیا اورخود اپنی جان سے زیادہ نہ ہوتو تب تک ایمان کامل نہیں ہوسکتا۔

اس لیے ایک صحیح حدیث میں جوصحیحین میں بروایت انس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا کہ:

﴿لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی اَکُوْنَ اَحَبَّ اِلَیْہِ مِنْ وَّالِدِہٖ وَوَلَدِہٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ﴾

(صحیح البخاری، کتاب الایمان، باب حب الرسول من الایمان، ج:۱، ص:۷)

کوئی آدمی اُس وقت تک مؤمن نہیں ہوسکتا جب تک کہ میں اس کے نزدیک اس کے باپ اوراولاد اور دنیا کے تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہوجاؤں۔

اور ابوداؤد، ترمذی میں بروایت ابوامامہ رضی اللہ عنہ منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے کسی سے دوستی کی تو اللہ کے لیے کی اور دُشمنی کی تو وہ بھی اللہ کے لیے کی اور مال کو خرچ کیا تو وہ بھی اللہ کے لیے اور کسی جگہ خرچ کرنے سے رُکا تو وہ بھی اللہ کے لیے، اس نے اپنا ایمان مکمل کرلیا۔

ان روایاتِ حدیث سے بھی ثابت ہوا کہ ایمان کی تکمیل اس پرموقوف ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت سب محبتوں پرغالب ہواورانسان کی دوستی دُشمنی، دینا یا نہ دینا سب حکمِ خداوندی اور رسول کے تابع ہو۔

(معارف القرآن)

میری حسرتیں تمہاری عشرتوں کے لیے قابلِ رشک ہیں

ہیں زمیں پر ایسی بھی کچھ ہستیاں
رشک جن پر کرتے ہیں کرو بیاں
جس جگہ گرتا ہے خونِ آرزو
لے نہ لے بوسہ کہیں خود آسماں
بستیاں حسرت زدوں کی دیکھ لو
ان کی ویرانی میں ہے جنت نہاں
حسرتوں کے زخم سے ہے خوں رواں
اب نہ لو یارو ہمارا امتحاں
عشرتیں اخترؔ ہیں دل سے دور دور
حسرتیں دل کی ہیں دل میں مہماں

اور ایسے باخدا لوگ اللہ تعالیٰ کے مقرب فرشتوں کے لیے باعث رشک ہو جاتے ہیں۔ جیسا کہ روایات سے پتہ چلتا ہے کہ فرشتے اللہ تعالیٰ کے یہاں ایسے بندوں کا ذکر کرتے ہیں اور پھر اُن کا حال اللہ تعالیٰ فرشتوں سے سنتے ہیں ظاہر ہے اس لیے نہیں کہ اللہ کو علم نہیں ہے بلکہ اپنے اس مخلوق یعنی فرشتوں پر بنی آدم کے اعزاز واکرام کو ظاہر کرنے کے لیے اور یہ وہ مقام ہے کہ جہاں پہنچ کر انسان فرشتوں سے بھی افضل قرار پاتا ہے۔ اس لیے کہ فرشتوں نے عبادت وطاعت تو کی ہے مگر خونِ حسرت میں نہانے کی بات نہیں، کیونکہ اُن کے اندر گناہ کرنے اور نافرمانی کرنے کا مادّہ اور جذبہ رکھا ہی نہیں گیا۔ یہ کمال تو صرف انسان کو ہے کہ یہ بُرائی کا مادّہ ہونے کے باوجود اللہ تعالیٰ کے حکم کو سامنے رکھ کر امتحان میں پاس ہوتا ہے۔

نیز دوسری یہ خصوصیت جو ابنِ حجر رحمہ اللہ نے ذکر فرمائی ہے کہ زمین پر رہنے والے اہلِ ایمان اللہ تعالیٰ کا غیب میں ذکر کرتے ہیں کہ اللہ کی ذات آنکھوں سے نظر نہیں آتی اور فرشتے وہ اللہ تعالیٰ کو دیکھ کر ذکر کرتے ہیں اس لیے فرشتوں کے مقابلے میں اللہ والوں کے ذکر کی زیادہ فضیلت حاصل ہوئی۔

نیز اسی طرح سے ایک خزانہ ایسا ہے جو صرف اللہ کے ایمان والے بندوں کے پاس ہے، فرشتوں کے پاس نہیں ہے۔ وہ یہ کہ اپنے گناہوں پر توبہ کر کے ندامت کے آنسو بہانا چونکہ فرشتے گناہوں سے معصوم ہیں تو اُن کے پاس ندامت کے آنسو نہیں ہیں۔ یہ خزانہ صرف زمین سے آسمان پر پہنچتا ہے اور پھر اس کی وہاں وہ قیمت لگتی

ہے کہ جو کسی ملک میں پہنچنے والے کسی نایاب موتی اور ہیرے جواہرات کی قیمت لگائی جائے۔ حضرت والا نے فرمایا کہ ایسی ہستیوں پر کروبیاں یعنی اللہ کے خاص مقرب فرشتے بھی رشک کرتے ہیں۔

اور بقول حضرتِ تھانوی کہ خواصِ مؤمنین خواص ملائکہ سے **افضل** اور عوام مؤمنین عام ملائکہ سے **افضل** ہیں۔ اگرچہ ظاہر میں دیکھنے والوں کے لیے اللہ والوں کا حال زیادہ عیش وعشرت وناز ونعم میں نظر نہیں آئے گا اور اُن کے چہرے بظاہر کچھ حسرت زدہ ہوں گے اور ظاہری طور پر وہ ویرانوں میں رہنے والے ہوں گے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اُن کی ان ویرانیوں میں جنتیں نہاں اور پوشیدہ ہوتی ہیں اور وہ حسرتوں کا خون کرکے جس امتحان سے گزر چکے ہوتے ہیں اُس کے بعد انہیں دنیا کی عیش وعشرت کا دور دور تک کوئی خواب وخیال ہی نہیں آتا بلکہ دل کے نہاں خانوں میں چھپی ہوئی حسرتیں اپنے اندر ہزار عشرتوں سے بڑھ کر مزے اور لطف رکھتی ہے۔ پھر اہل اللہ کو دنیا کے عیش وعشرت کا خیال بھی نہیں گزرتا بلکہ جو اُمیدیں کبھی خواب وخیال میں رہتی تھیں وہ بھی دل سے ایسی دور ہوتی ہیں کہ بزبانِ حال ہر اہلِ دل یہ کہتے ہوئے ہوتا ہے ؎

یہ پوچھتا ہے میرے دل میں اب تیرا جلوہ
کہاں ہے اور کدھر آرزو کا عالم ہے

اور انہیں اپنے خونِ آرزو کی وجہ سے ایسا مقامِ بلند عطا ہوتا ہے کہ گویا کہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ میرے اور آسمان کے درمیان سارے حجابات اُٹھا دیئے گئے اور تمام پردے اور فضائیں ہٹ کر میں اللہ کے عرش کے سامنے کھڑا ہوں اور اس طرح خود آسمان زمین کا بوسہ لے رہا ہے کیونکہ روتے اور تڑپتے ہوئے ایمان والا بندہ جب سجدے میں پڑا ہوا ہے تو اس کی کچھ کیفیت اسی طرح ہو جاتی ہے اور یہ لوگ ظاہر سے بالکل بے خبر اور ناآشنا رہتے ہیں، صرف اپنے باطن میں ہی حسرتوں کا قیمتی خزانہ دفن کیے رہتے ہیں، کیونکہ عشرتیں تو دُشمنوں کو بھی میسر آتی ہیں مگر یہ حسرتیں اور دردِ دل صرف اللہ اپنے خاص بندوں کو دیتے ہیں۔ چنانچہ حضرت والا کا دوسرا شعر ہے ؎

تیرے ہاتھ سے زیرِ تعمیر ہوں میں
مبارک مجھے میری ویرانیاں ہیں

اور انہی حسرتوں کے طوفانوں میں اللہ والوں کو ساحل کا لطف ملتا رہتا ہے۔ اس لیے یہ کہنا بالکل بجا اور درست ہے کہ اب عشرتیں میرے دل سے دور ہیں کیونکہ میرے دل میں حسرتیں مہمان بنی ہوئی ہیں اور یہ دونوں باتیں اکٹھی اور جمع نہیں ہوتیں۔

چشمِ تر نعرہ ہو چاک گریباں پایا

عشق اصنام سے ہر دل کو پریشاں پایا
شکل بگڑی تو انہیں سخت پشیماں پایا

ذکر کے فیض سے دل رشکِ گلستاں پایا
اور غفلت سے گلستاں کو بیاباں پایا

رہ تقویٰ کے غموں سے نہ تو گھبرا سالک
نفس کو غم ہو مگر روح کو شاداں پایا

نفسِ دشمن کے غموں سے جو تو گھبرائے ہے
لذتِ عشقِ خدا سے تجھے ناداں پایا

جس نے مرشد سے لیا خونِ تمنا کا سبق
اس کے دل میں ہمہ دم جلوۂ جاناں پایا

کیا کہوں آہ وہ مرشد تھا مرا کیا اخترؔ
چشمِ تر نعرۂ ھُو چاپ گریباں پایا

مشکل الفاظ کے معانی:۔ عشقِ اصنام: صنم کی جمع بمعنی بت۔ **پشیماں:** نادم افسردہ۔ **ہمہ دم:** ہر وقت۔ جلوۂ جاناں: اللہ تعالیٰ کا جلوہ۔ نعرۂ ھو: اللہ کا نعرہ۔ گریباں: کنایہ ہے اللہ تعالیٰ کا عشق سے۔

عشقِ اصنام سے پشیمان ہوئے

عشق اصنام سے ہر دل کو پریشاں پایا
شکل بگڑی تو انہیں سخت پشیماں پایا
ذکر کے فیض سے دل رشکِ گلستاں پایا
اور غفلت سے گلستاں کو بیاباں پایا
رہ تقویٰ کے غموں سے نہ تو گھبرا سالک
نفس کو غم ہو مگر روح کو شاداں پایا
نفسِ دشمن کے غموں سے جو تو گھبرائے ہے
لذتِ عشقِ خدا سے تجھے ناداں پایا

جس نے مرشد سے لیا خونِ تمنا کا سبق
اس کے دل میں ہمہ دم جلوۂ جاناں پایا
کیا کہوں آہ وہ مرشد تھا مرا کیا اختؔر
چشمِ تر نعرۂ ھُو چاک گریباں پایا

اس پوری نظم کے تمام اشعار کی تشریح مختلف دوسری نظموں کے اشعار کی تشریح کے ضمن میں تفصیل سے آ گئی جس کا خلاصہ یہ مضامین ہے: حرام ناجائز محبتیں اور اُن کا فنا ہونا، ذکر اللہ سے دل کا باغ و بہار ہو جانا اور اللہ کی یاد سے غافل ہونے سے دل کا بیاباں ہو جانا، راہِ خداوندی کے غم اُٹھانے کے نتیجے میں روح کو ایک خاص نشاط اور سرور اور انبساط و کیف حاصل ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ کے عشق کی لذت بغیر اُس کے راستوں کا غم اُٹھائے حاصل نہیں ہوسکتی، مگر یہ چیز اپنے شیخ و مرشد سے سیکھنے کی ہے۔ اس کے بغیر میسر نہیں ہوتی جسے یہ نعمت لینی ہو وہ اپنے ایسے شیخ کا ساتھ لازم پکڑ لے جو ہر وقت چشم تر رہتا ہو اور اللہ اللہ زبان پر ہو اور اُس کا چاک گریبان رہتا ہو اور خدا کا مست و دیوانہ ہو تو پھر یہ صحبت رنگ لائے گی اور خود انسان زبانِ حال سے یہ کہہ اُٹھے گا ؎

تو نے مجھ کو کیا سے کیا شوقِ فراواں کردیا
پہلے جان پھر جانِ جاں پھر جانِ جاناں کردیا

پھر اس کو بھی یہ کیفیت حاصل ہوگی کہ وہ بزبان حال یوں کہے گا ؎

میری یہ گرمئ ایمان تیرے آتش فشاں سے ہے
میرے کانٹوں پہ شانِ گل بھی تیرے گلستاں سے ہے

دعوتِ حق کے واسطے محفل دوستاں ملی

عشق بتاں کے کرب سے غفلت دوجہاں ملی
ذکر خدا کے نور سے فرحت دو جہاں ملی

اے مرے خالق جہاں تجھ پہ فدا ہو میری جاں
لذت ذکر سے ترے راحت دو جہاں ملی

جو بھی فدا ہے دوستو! خالق کائنات پر
اس کی خزاں میں بھی مجھے خوشبوئے بوستاں ملی

دیکھ کے میری چشم تر سن کے ہماری آہ کو
ان کو ہمارے عشق کی مفت میں داستاں ملی

آپ کی یاد اے خدا حاصل کائنات ہے
آپ کے نام سے مجھے نعمت دو جہاں ملی

اخترؔ بے نوا کو بھی تیرے کرم سے اے خدا
دعوت حق کے واسطے محفل دوستاں ملی

مشکل الفاظ کے معانی:۔ **کلفت**: تکلیف۔ **فرحت**: خوشی، راحت۔ **خالقِ کائنات**: ساری مخلوق کو پیدا کرنے والا۔ **بوستان**: باغ۔ **بے نوا**: بے آواز، عاجزی۔ **دعوتِ حق**: اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دینے کے لیے۔ **محفلِ دوستاں**: متعلقین، اللہ تعالیٰ کی محبت سیکھنے والے۔

عشق بتاں کے کرب سے غفلت دوجہاں ملی
ذکر خدا کے نور سے فرحت دو جہاں ملی

حضرت والا کی یہ پوری نظم کا مضمون بھی قدر مشترک وہی چیزیں ہیں جو دوسرے اشعار کے ضمن میں تفصیل کے ساتھ آئی ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ غیر اللہ کی محبت میں پھنس کر اور خاص طور پر نامحرم لڑکیوں یا حسین بے ریش لڑکوں کی دوستی میں الجھ کر نہ انسان دنیا کا رہتا ہے نہ دین کا رہتا ہے بلکہ دونوں جہاں کی کلفتوں اور مصیبتوں میں مبتلا ہو جاتا ہے کیونکہ اس بیماری سے اس کو دل کی بے چینی شروع ہو جاتی ہے اور جب کسی کا دل بے چین ہو جائے تو پھر اس کے ظاہری جسم کو بھی سکون نہیں مل سکتا بقول حضرت والا دامت برکاتہم ایئر کنڈیشن (air condition) ہماری کھالوں اور جسموں کو تو ٹھنڈا کر سکتا ہے لیکن دل میں ٹھنڈک اور تازگی پیدا نہیں کر سکتا یہ بات صرف اور صرف گناہوں سے بچنے اور ذکر اللہ کرنے سے حاصل ہوتی ہے اور پھر اس کا ثمرہ اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دنیا

کے چین وسکون کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ اس انسان کو آخرت کا چین وسکون بھی عطا فرما دیتے ہیں۔

اے مرے خالقِ جہاں تجھ پہ فدا ہو میری جاں
لذتِ ذکر سے ترے راحتِ دو جہاں ملی
جو بھی فدا ہے دوستو! خالقِ کائنات پر
اس کی خزاں میں بھی مجھے خوشبوئے بوستاں ملی

لیکن فرحتِ دو جہاں ملنے کے لیے شرط کے درجہ کی جو چیز ہے وہ اس شعر میں مذکور ہے کہ بندہ اپنے خالق و مالک پر پورے طور پر فدا ہو اور خواہشات نفس کو مکمل طور پر کنٹرول کر کے ان پر اللہ تعالیٰ کے حکم کو غالب رکھے اس کے بعد ہی ذکر کی حقیقی لذت سے آشنائی حاصل ہوتی ہے اور دنیا وآخرت کا چین وسکون نصیب ہوتا ہے۔

اللہ کے ذکر سے چین وسکون ملنے کی ایک خاص حکمت یہ بھی سمجھ میں آتی ہے کہ ذاکر کا ہم نشین خود اللہ تعالیٰ ہوتا ہے جیسا کہ حدیث قدسی ہے:

﴿اَنَا جَلِیْسُ مَنْ ذَکَرَنِیْ﴾

(شعب الایمان)

میں اس شخص کا ہم نشین ہوں جو مجھے یاد کرے اور اللہ تعالیٰ ہی دنیا وآخرت کی ساری لذتوں اور راحتوں کے خالق ہیں تو جب ذاکر کو خالق لذات عالم مل گئے تو پھر دونوں جہاں کی لذت وراحت کیوں میسر نہ ہوگی۔

اور ان دونوں اشعار میں اللہ تعالیٰ پر فدا ہونے کی نصیحت کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی وجہ بھی ذکر فرما دی گئی ہے کہ جب مجھے پیدا ہی اللہ تعالیٰ نے کیا اور جوانی بھی اسی نے دی ہے تو اس کا تقاضہ یہی ہے کہ میں اللہ تعالی ہی پر اپنے جوانی کو فدا کروں گویا فدا کرنے کی دلیل بھی شعر ہی میں ذکر کر دی گئی۔

حضرت ایوب علیہ السلام خزاں میں خوشبوئے بوستاں پا رہے تھے

اور یہ بھی یاد رکھیے کہ جو اللہ تعالیٰ پر فدا ہوتا ہے تو حق تعالیٰ پھر اس کی خزاں میں بھی بوستاں کی خوشبو مہکا دیتے ہیں کیونکہ وہ اللہ والا مصائب وآلام اور پریشانیوں میں گھر کر بھی اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر اس قدر مطمئن اور پر سکون نظر آتا ہے کہ جیسے تمام حالات اس کے عین مطابق ہوں جیسا کہ حضرت ایوب علیہ الصلوٰۃ والسلام کو جب بیماری کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی طرف سے آزمایا گیا جس کی تفسیر بحوالہ ابن کثیر حضرت مفتی شفیع صاحب رحمہ اللہ نے اس طرح ذکر فرمائی ہے تو اس وقت بھی حضرت ایوب علیہ السلام اپنے اللہ کے ساتھ دل سے خوش اور راضی تھے اس لیے انبیاء واولیاء کی ذات ایسی ہوتی ہے کہ ان کی خزاں میں بھی بوستاں کی خوشبو ملتی ہے۔

حضرت ایوب علیہ السلام کو حق تعالیٰ نے ابتدا میں مال ودولت اور جائیداد اور شاندار مکانات اور سواریاں

اور اولاد اور حشم و خدم بہت کچھ عطا فرمایا تھا پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو پیغمبرانہ آزمائش میں مبتلا کیا، یہ سب چیزیں ان کے ہاتھ سے نکل گئیں اور بدن میں بھی ایسی سخت بیماری لگ گئی جیسے جذام ہوتا ہے کہ بدن کا کوئی حصہ بجز زبان اور قلب کے اس بیماری سے نہ بچا، وہ اس حالت میں زبان وقلب کو اللہ کی یاد میں مشغول رکھتے اور شکرادا کرتے رہتے تھے اس شدید بیماری کی وجہ سے سب عزیزوں، دوستوں اور پڑوسیوں نے ان کو الگ کر کے آبادی سے باہر ایک کوڑا کچرہ ڈالنے کی جگہ پر ڈالدیا کوئی ان کے پاس نہ جاتا تھا صرف ان کی بیوی ان کی خبر گیری کرتی تھی جو حضرت یوسف علیہ السلام کی بیٹی یا پوتی تھیں جن کا نام لیا بنت میشا بنت یوسف علیہ السلام بتلایا جاتا ہے (ابن کثیر) مال و جائداد تو سب ختم ہو چکا تھا ان کی زوجہ محترمہ محنت مزدوری کر کے اپنے اور ان کے لیے رزق کی ضروریات فراہم کرتی اور ان کی خدمت کرتی تھیں۔ حضرت ایوب علیہ السلام کا یہ ابتلاء وامتحان کوئی حیرت وتعجب کی چیز نہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

﴿ اَشَدُّ النَّاسِ بَلَاءً اَلْاَنْبِیَآءُ ثُمَّ الْاَمْثَلُ فَالْاَمْثَلُ ﴾

(مسند احمد)

یعنی سب سے زیادہ سخت بلائیں اور آزمائشیں انبیاء علیہم السلام کو پیش آتی ہیں ان کے بعد دوسرے صالحین کو درجہ بدرجہ۔ اور ایک روایت میں ہے کہ ہر انسان کا ابتلاء اور آزمائش اس کی دینی صلابت اور مضبوطی کے اندازے پر ہوتا ہے جو دین میں جتنا زیادہ مضبوط ہوتا ہے اتنی اس کی آزمائش وابتلاء زیادہ ہوتی ہے (تا کہ اسی مقدار سے اس کے درجات اللہ کے نزدیک بلند ہوں)

حضرت ایوب علیہ السلام کو حق تعالیٰ نے زمرۂ انبیاء علیہم السلام میں دینی صلابت اور صبر کا ایک امتیازی مقام عطا فرمایا تھا (جیسے داؤد علیہ السلام کو شکر کا ایسا ہی امتیاز دیا گیا تھا) مصائب وشدائد پر صبر میں حضرت ایوب علیہ السلام ضرب المثل ہیں۔ یزید بن میسرہ فرماتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت ایوب علیہ السلام کو مال واولاد وغیرہ سب دنیا کی نعمتوں سے خالی کر کے آزمائش فرمادی تو انہوں نے فارغ ہو کر اللہ کی یاد اور عبادت میں اور زیادہ محنت شروع کردی اور اللہ تعالیٰ سے عرض کیا کہ اے میرے پروردگار میں تیرا شکر ادا کرتا ہوں کہ تو نے مجھے مال جائیداد اور دولت دنیا اور اولاد عطا فرمائی جس کی محبت میرے دل کے ایک ایک جز پر چھا گئی پھر اس پر بھی شکر ادا کرتا ہوں کہ تو نے مجھے ان سب چیزوں سے فارغ اور خالی کر دیا اور اب میرے اور آپ کے درمیان حائل ہونے والی کوئی چیز باقی نہ رہی۔

حافظ ابن کثیر یہ مذکورہ روایت نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ وہب بن مُنَبِّہ سے اس قصہ میں بڑی طویل روایات منقول ہیں جن میں غرابت پائی جاتی ہے اور طویل ہیں اس لیے ہم نے ان کو چھوڑ دیا۔

حضرت ایوب علیہ السلام کی دعا صبر کے خلاف نہیں

حضرت ایوب علیہ السلام اس شدید ابتلا میں کہ سب مال و جائیداد اور دولت دنیا سے الگ ہو کر ایسی جسمانی بیماری میں مبتلا ہوئے کہ لوگ پاس آتے ہوئے گھبرائیں، بستی سے باہر ایک کوڑے کچرے کی جگہ پر سات سال چند ماہ پڑے رہے کبھی جزع وفزع یا شکایت کا کوئی کلمہ زبان پر نہیں آیا۔ نیک بی بی لیاز وجہ محترمہ نے عرض بھی کیا کہ آپ کی تکلیف بہت بڑھ گئی ہے اللہ سے دعا کیجئے کہ یہ تکلیف دور ہو جائے تو فرمایا میں نے ستر سال صحیح تندرست اللہ کی بے شمار نعمت و دولت میں گزارے ہیں کی اس کے مقابلے میں سات سال بھی مصیبت کے گزارنے مشکل ہیں۔ پیغمبرانہ عزم وضبط اور صبر وثبات کا یہ عالم تھا کہ دعا کرنے کی بھی ہمت نہ کرتے تھے کہ کہیں صبر کیخلاف نہ ہو جائے (حالانکہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرنا اور اپنی احتیاج وتکلیف پیش کرنا بےصبری میں داخل نہیں)

بالآخر کوئی ایسا سبب پیش آیا جس نے ان کو دعا کرنے پر مجبور کر دیا اور جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے یہ دعا دعا ہی تھی کوئی بےصبری نہیں تھی حق تعالیٰ نے ان کے کمال صبر پر اپنے کلام میں مہر ثبت فرما دی ہے فرمایا أنَّا وجدناه صابرا اس صبر کے بیان میں روایات بہت مختلف اور طویل ہیں اس لیے ان کو چھوڑا جاتا ہے۔

ابن ابی حاتم نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ جب ایوب علیہ السلام کی دعا قبول ہوئی اور ان کو حکم ہوا کہ زمین پر ایڑیاں لگائیے یہاں صاف پانی کا چشمہ پھوٹے گا اس سے غسل کیجئے اور اس کا پانی پیجئے تو یہ سارا روگ چلا جائیگا۔ حضرت ایوب علیہ السلام نے اس کے مطابق کیا تمام بدن جو زخموں سے چور تھا اور بجز ہڈیوں کے کچھ نہ رہا تھا اس چشمہ کے پانی سے غسل کرتے ہی سارا بدن کھال اور بال یکا یک اپنی اصل حالت پر آ گئے تو) اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے جنت کا ایک لباس بھیج دیا وہ زیب تن فرمایا اور اس کوڑے کچرے سے الگ ہو کر ایک گوشہ میں بیٹھ گئے۔ زوجہ محترمہ حسب عادت انکی خبر گیری کے لیے آئی تو ان کو اپنی جگہ پر نہ پا کر رونے لگی، ایوب علیہ السلام جو ایک گوشہ میں بیٹھے ہوئے تھے ان کو نہیں پہچانا کہ حالت بدل چکی تھی۔ انہیں سے پوچھا کہ اے خدا کے بندے (کیا تمہیں معلوم ہے کہ وہ بیمار مبتلاء جو یہاں پڑا رہتا تھا کہاں چلا گیا، کیا کتوں یا بھیڑیوں نے اسے کھا لیا اور کچھ دیر تک اس معاملے میں ان سے گفتگو کرتی رہی۔ یہ سب سن کر ایوب علیہ السلام نے ان کو بتلایا کہ میں ہی ایوب ہوں مگر زوجہ محترمہ نے اب تک بھی نہیں پہچانا، کہنے لگی اللہ کے بندے کیا آپ میرے ساتھ تمسخر کرتے ہیں تو ایوب علیہ لاسلام نے پھر فرمایا غور کرو میں ہی ایوب ہوں اللہ تعالیٰ نے میری دعا قبول فرمالی اور میرا بدن از سرِ نو درست فرما دیا، ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اسکے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کا مال و دولت بھی ان کو واپس دے دیا اور اولاد بھی، اور اولاد کی تعداد کے برابر مزید اولاد بھی دیدی۔ (معارف القرآن، جلد:۶، ص:۲۱۵)

اللہ کے سچے عاشق بیماری اور تکلیف میں بھی بزبان حال یوں کہتے ہوتے ہیں۔

عیادت کو آئے شفاء ہو گئی
علالت ہماری دوا ہو گئی
تماشائے مقتل کو آئے جو وہ
تڑپنے کی لذت سوا ہو گئی

اللہ ہی کے سامنے آہ وزاری ہو

دیکھ کے میری چشم تر سن کے ہماری آہ کو
ان کو ہمارے عشق کی مفت میں داستاں ملی

اللہ تعالیٰ کے سچے عاشقوں کی یہ خاص عادت ہوتی ہے کہ اکثر وبیشتر ان کی آنکھیں اشک بار رہتی ہیں اور وہ اللہ تعالیٰ کی محبت میں آہ وفغاں کرتے رہتے ہیں یعنی بلا تصنع وتکلف دل سے آہ آہ نکلتی رہتی ہے بقول حضرت شاہ عبدالغنی پھول پوری رحمہ اللہ کے اللہ تعالیٰ کی محبت کا درد دل میں آنے کے بعد آنکھوں سے چھلکنے اور چہرے سے جھلکنے لگتا ہے۔ حضرت خواجہ صاحب اسی کو فرماتے ہیں ۔

ہو گئی خشک چشم تر
بہہ گیا ہو کہ خوں جگر
رونے سے دل مرا مگر
ہائے ابھی بھرا نہیں

جو اللہ کے سامنے رونا سیکھ لیتا ہے اور اس کے سامنے جھکنا اور اسی سے مانگنا عادت بنالیتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ دوسرے دروں سے اس کو بے نیاز کردیتے ہیں۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں قحط پڑ گیا تھا تو انہوں نے اپنے ماتحت گورنر کو خط لکھا کہ تم یہاں کچھ غلہ وغیرہ بھیج دو جواب آیا کہ میں اتنا غلہ بھیجوں گا کہ غلے سے لدے اونٹوں کی قطار لگا دوں گا تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خواب میں تشریف لائے اور بطور عتاب فرمایا کہ عمر تجھے کیا ہو گیا ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسی وقت مختلف صحابہ کرام کو جمع کر کے صورت حال بیان کی اور ساتھ میں یہ واقعہ بھی بتایا اور صحابہ سے یہ دریافت فرمایا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو سخت تنبہ ہوا کہ میں نے ان گورنر کو کیوں لکھا مجھے تو اللہ تعالیٰ کے سامنے التجا کرنی چاہیے تھی اور پھر جیسے ہی اللہ تعالیٰ سے آہ وزاری کی تو فوراً آسمان پر بادل آکر برسنا شروع ہو گیا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے کا ایک عجیب واقعہ اپنے بہت سے بزرگوں سے سنا تھا لیکن کسی کتاب میں نظر سے نہیں گذرا تھا۔ آج ابن تغری بردی رحمہ اللہ کی ''النجوم الزاہرۃ'' میں اس کی تفصیلات نظر پڑ گئی، حاضرِ

خدمت ہیں۔ ابن تغری بردی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

جب حضرت عمر بن عاص رضی اللہ عنہ نے مصر فتح کیا اور اس کے گورنر تو کچھ عرصہ بعد بؤونہ کا مہینہ آ گیا (یہ ماہِ جون کا قطبی نام ہے) مہینہ کے شروع ہوتے ہی مصر کے قدیم قبطی باشندوں کا ایک وفد حضرت عمرو رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور کہنے لگا: ''جناب امیر! ہمارے دریائے نیل کو ایک عادت ایسی پڑی ہوئی ہے کہ اگر اسے پورا نہ کیا جائے تو وہ چلنا بند ہو جاتا ہے۔'' حضرت عمرو رضی اللہ عنہ نے پوچھا: ''وہ کیا؟'' کہنے لگے: ''عادت یہ ہے کہ بؤونہ کے مہینہ کی بارہ راتیں پوری ہو جاتی ہیں تو ہم ایک نوجوان دوشیزہ کو تلاش کر کے اس کے والدین کو راضی کرتے ہیں اور اسے بہترین زیور اور کپڑوں سے آراستہ کر کے دریا میں ڈال دیتے ہیں۔ اس کے بعد وہ خوب بہنے لگتا ہے۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اسلام میں ایسا نہیں ہوسکتا، اسلام تمام پچھلی (جاہلانہ) رسموں کو منہدم کرتا ہے۔'' وفد یہ سن کر چلا گیا، لیکن ہوا واقعتاً یہی کہ بؤونہ (جون)، ابیب (جولائی) اور مسری (اگست) تینوں مہینے گذر گئے اور دریائے نیل خشک پڑا رہا، یہاں تک کہ لوگ وہاں سے دوسرے مقامات کی طرف جانے کا ارادہ کرنے لگے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ دیکھا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خط لکھ کر مشورہ طلب کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: ''تم نے ٹھیک کیا، اسلام واقعی پرانی (جاہلانہ) رسموں کو منہدم کرتا ہے، میں تمہارے ایک پرچہ بھیج رہا ہوں، اسے دریائے نیل میں ڈال دینا۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ وہ پرچہ کھول کر دیکھا تو اس میں لکھا تھا ''مِنْ عَبْدِ اللّٰہِ عُمَرَ اَمِیْرِ الْمُؤْمِنِیْنَ اِلٰی نِیْلِ مِصْر اَمَّا بَعْدُ اِنْ کُنْتَ تَجْرِیْ مِنْ قِبَلِکَ فَلاَ تَجْرِ وَاِنْ کَانَ اللّٰہُ الْوَاحِدُ الْقَھَّارُ الَّذِیْ یُجْرِیْکَ فَنَسْأَلُ اللّٰہَ الْوَاحِدَ الْقَھَّارَ اَنْ یُّجْرِیَکَ. اللہ کے بندے امیر المؤمنین عمر کی طرف سے مصر کے دریائے نیل کے نام۔ حمد وصلوٰۃ کے بعد۔ اگر تو اپنی مرضی سے بہا کرتا ہے تو بہنا بند کر دے اور اگر خدائے واحد و قہار ہے جو تجھے چلاتا ہے، تو ہم اسی خدائے واحد وقہار سے دعا کرتے ہیں کہ وہ تجھے بہنے پر مجبور کر دے۔''

حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے یہ پرچہ نصاریٰ کی عید صلیب سے ایک دن پہلے دریا میں ڈال دیا، مصر کے باشندے وہاں سے بھاگنے کی پوری تیاریاں کر چکے تھے، اس لیے کہ ان کی زندگی کا دارومدار نیل کے پانی پر تھا، لیکن عیدِ صلیب کے دن جب صبح کو جا کر دیکھا تو نیل پوری آب وتاب کے ساتھ بہنا شروع ہو چکا تھا اور ایک رات میں پانی کی سطح سولہ ذراع بلند ہوگئی تھی۔ (تراشے، صفحہ: ۳۸-۳۹)

آپ کی یاد اے خدا حاصل کائنات ہے
آپ کے نام سے مجھے نعمت دو جہاں ملی

اختر بے نوا کو بھی تیرے کرم سے اے خدا
دعوت حق کے واسطے محفل دوستاں ملی

ساری کائنات کے وجود کا مقصد اور اس کے بقا کا منتہیٰ اللہ تعالیٰ کا ذکر اور اس کی یاد ہے جس دن روئے زمین سے یہ چیز ختم ہوگی تو یہ کائنات بھی ختم کردی جائے گی اور جو لوگ دنیا میں رہتے ہوئے ذکر اللہ کے ساتھ لگے رہیں گے وہ دنیا میں بھی بامراد اور کامیاب ہوں گے اور آخرت کی عزتیں جنتیں بھی ان کا مقدر بنیں گی پھر اخیر میں حضرت والا فرمارہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنے فضل وکرم سے ایسے دوست احباب عطا فرمادیئے جن میں بیٹھ کر میں اللہ تعالیٰ کی عظمت ومحبت کی باتیں بیان کرتا ہوں اور ان کو خدائے وحدہ لاشریک لہ کی ذات عالی پر مرنے مٹنے کی تلقین کرتا رہتا ہوں اگر یہ نہ ہوتے تو پھر ایسی محفل اور مجمع کیسے میسر آتا جہاں میں اس دعوت حق کا کام انجام دیتا اسی لیے حضرت والا نے بعض اشعار میں اللہ تعالیٰ سے محفل دوستاں باقاعدہ طور پر مانگی ہے۔

اور آثار وقرائن سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں حضرت کی دعائیں قبول ہوئیں کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ پورے عالم میں جہاں بھی حضرت والا تشریف لے جاتے ہیں تو اچھے خاصے احباب حضرت کی محبت میں اپنی مشغولیات اور مصروفیات چھوڑ چھوڑ کر حضرت والا کے پاس جمع ہو جاتے ہیں جن کے سامنے حضرت احیائے سنت اور اللہ تعالیٰ کی محبت اپنے خاص درد بھرے انداز سے بڑی آہ وفغاں کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔

رہ گئی یہ بات کہ حضرت والا کا یہ فرمانا کہ یہ محض آپ کا کرم ہے ورنہ میں اس کا مستحق نہیں تھا، یہ وہی سبق ہے جو ہمارے اہل اللہ اور مشائخ شب وروز خانقاہ کی چہار دیواری میں اپنے متعلقین کو پڑھاتے رہتے ہیں کہ کوئی بھی نعمت اپنا ذاتی کمال نہیں ہے بلکہ صرف اللہ تعالیٰ کی عطا ہے اس سے کبھی ذہول نہیں ہونا چاہیے ورنہ انسان بارگاہ خداوندی میں متکبر قرار پائے گا اور جب تک وہ ہر نعمت کو بلا استحقاق اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرے گا تو تکبر اس کے قریب نہیں آسکتا ہے کیونکہ اسی سے تکبر کی جڑ کٹ جاتی ہے یہ اشعار حضرت والا نے ری یونین میں فرمائے جو حکومت فرانس کے تحت ایک جزیرہ ہے وہاں بھی ماشاء اللہ حضرت والا کے کافی متعلقین ہیں جن کے ذریعے وہاں محفل دوستاں قائم ہوا کرتی ہے۔

اثر ظاہر ہوا آہ سحر کا

ہے بدلا رنگ دشمن کی نظر کا　　اثر ظاہر ہوا آہ سحر کا
وہ آ کر میر مجھ سے پوچھتے ہیں　　میاں کیا حال ہے درد جگر کا
برنگ فق ملے تو میں نے پوچھا　　گیا ہے نور خورشید و قمر کا
ہونق سی وہ صورت سامنے ہے　　کبھی شہرہ تھا جس کے کر و فر کا
پڑا پالا جسے عشق بتاں سے　　نہ پوچھو خون دل خون جگر کا
ملو تو جا کہ اہل درد دل سے　　عجب ہے کیف واں شام و سحر کا
سکون قلب ہے انعام اختر　　حسینوں سے میاں صرف نظر کا

مشکل الفاظ کے معانی:۔ **آہِ سحر**: تہجد کے وقت کی دعا۔ **برنگِ فق**: رنگ اڑ جانا۔ **خورشید وقمر**: سورج و چاند۔ **ہونق**: بیوقوف، احمق۔ **شہرہ**: شہرت۔ **کروفر**: شان وشوکت۔ **کیف**: لذت اور مزا۔ **شام وسحر**: شام وصبح۔ **حسینوں**: حسین کی جمع، تمام نامحرم عورتیں اور امارد۔ **صرفِ نظر**: نظر بچانا۔

آہ سحر کی برکت سے دشمن کی نظر بدل جاتی ہے

ہے بدلا رنگ دشمن کی نظر کا
اثر ظاہر ہوا آہ سحر کا

اللہ تبارک وتعالیٰ کی یہ سنت اور عادت رہی ہے کہ جن بندوں سے اللہ تعالیٰ محبت فرماتے ہیں انہیں ایسے اخلاق اور صفات عطا فرما دیتے ہیں جن کی بدولت ان کے دشمن بھی دوست بننے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور کل تک ان کے راستے میں کانٹے بچھانے والا آج پھول بچھانے والا ہوتا ہے اور جو دشمنی میں ہر وقت تکلیف پہچانے کے در پے رہا کرتے تھے اب وہی سب سے زیادہ راحت رساں بن جاتے ہیں اور قرآن کریم نے اپنے ماننے والوں کو ایسی تعلیمات دی ہیں کہ جن کی بدولت دشمن ضرور دوست بن جائیں گے ارشاد باری تعالیٰ ہے اِدْفَعْ بِا لَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ آپ (مع اپنے متبعین کے) نیک برتاؤ سے بدی کو ٹال دیا کیجئے پھر یکا یک آپ دیکھیں گے کہ آپ میں اور جس شخص میں عداوت تھی وہ ایسا ہو جائے گا جیسا کہ کوئی دلی دوست ہوتا ہے یعنی بدی کا بدلہ بدی سے دینے میں تو عداوت بڑھتی ہے اور نیکی کرنے سے بشرط سلامت طبع دشمن کی عداوت گھٹتی ہے یہاں تک کہ اکثر تو بالکل ہی عداوت جاتی رہتی ہے اور اس معاملہ میں مثل دوست کے ہو جاتا ہے گو دل سے دوست نہ ہوا اور یہ بات انہی لوگوں کو نصیب ہوتی ہے جو اخلاق کے اعتبار سے بڑے مستقل مزاج ہیں اور یہ بات اسی کو نصیب ہوتی ہے جو ثواب کے اعتبار سے بڑا صاحبِ نصیب ہے۔

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ داعیان حق کی خصلت یہ ہونی چاہیے کہ وہ لوگوں کی برائی کو طریق احسن سے دفع کریں۔ وہ یہ کہ برائی کا بدلہ برائی سے نہ لینا اور معاف کر دینا تو عمل حسن ہے اور احسن یہ ہے کہ جس نے تمہارے ساتھ برا سلوک کیا تم اس کو معاف بھی کر دو اور اس کے ساتھ احسان کا برتاؤ کرو۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ اس آیت میں حکم یہ ہے کہ جو شخص تم پر غصے کا اظہار کرے تم اس کے مقابلے میں صبر سے کام لو جو تمہارے ساتھ جہالت سے پیش آوے تم اس کے ساتھ حلم و بردباری کا معاملہ کرو اور جس نے تمہیں ستایا اس کو معاف کر دو (مظہری) بعض روایات میں ہے کہ صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو کسی شخص نے گالی دی یا برا کہا تو آپ نے اس کے جواب میں فرمایا اگر تم اپنے کلام میں سچے ہو کہ میں مجرم و خطاوار اور براہوں تو اللہ تعالیٰ مجھے معاف فرما دے اور اگر تم نے جھوٹ بولا تو اللہ تعالیٰ تمہیں معاف فرما دے۔ (معارف القرآن، ج:۷، ص:۶۴۸)

برائی کا بدلہ اچھائی کے ذریعے سے دیجئے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جو دشمن ہے وہ بھی جگری دوست بن جائے گا چنانچہ ہمارے محبوب نبی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایسے ہی اوصاف تھے کہ گالی کا بدلہ دعا سے اور برائی کا بدلہ بھلائی سے دیا کرتے تھے جس کے نتیجہ میں بڑے بڑے آپ کی جان کے دشمن آپ کے سب سے بڑے عاشق بن گئے چنانچہ بعض ایسے حضرات جو کل تک یہ کہتے تھے کہ آپ روئے زمین پر مجھے سب سے زیادہ مبغوض اور ناپسند تھے وہی آپ سے ملنے کے بعد یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ آپ مجھے روئے زمین پر سب سے زیادہ محبوب ہیں۔

وہ آ کر میر مجھ سے پوچھتے ہیں
میاں کیا حال ہے درد جگر کا

اللہ تعالیٰ اپنے خاص بندوں کو جو محبت عطا فرماتے ہیں اور جو درد دل ان کا حصہ ہوتا ہے وہ کبھی زوال پذیر نہیں ہوتا اور جو دشمن کل تک مخالفت پر اترے ہوئے تھے بالآخر ایک دن ان کو بھی اس کا قائل ہو جانا پڑتا ہے اور وہ بھی اس کو تسلیم کئے بغیر نہیں رہتے جب کہ اس کے برخلاف جو بتوں کے عشق میں مبتلا رہتا ہے اور حسین شکلوں صورتوں کو اپنا دل دیئے ہوا ہوتا ہے اس کا قصہ اور داستان کچھ بالکل اس سے مختلف ہوتی ہے جس کو حضرت والا نے اگلے اشعار میں یوں ذکر کیا ہے۔

برنگ فق ملے تو میں نے پوچھا
گیا ہے نور خورشید و قمر کا
ہونق سی وہ صورت سامنے ہے
کبھی شہرہ تھا جس کے کر و فر کا

چہروں کی سب چمک دمک اڑ کر ختم ہو جاتی ہے اور ظاہری ٹھاٹھ باٹ اور کروفر اور زیبائش و آرائش سب زوال پذیر اور مٹ کر ایسی بے نشان ہوتی ہے کہ جیسا کہ کبھی کوئی رونق و چمک دمک تھی ہی نہیں۔ اس لیے بڑی حواس باختہ حالت اور بالکل بگڑی ہوئی شکل وصورت باقی رہ جاتی ہے کہ یہ کہنا پڑتا ہے اس خورشید وقمر کا ظاہری نور اور روشنی اور چمک و دمک کہاں جاتی رہی اور وہ حسین شکل وصورت جس کا بڑا شہرہ تھا آج اس کا نام ونشان مٹ کر کہاں ختم ہو گیا، نہ وہ رنگ و روغن نظر آرہا ہے، نہ وہ گلاب کی پنکھڑیاں کہیں دکھ رہی ہیں بلکہ شکلیں بگڑ کر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسا دورِ خزاں میں کانٹوں کی جھاڑیاں ہوتی ہیں اس لیے ناسمجھ ہیں وہ لوگ جوان زوال پذیر شکلوں کو دل دینے کی باتیں کرتے ہیں اور ان پر فدا ہو کر اپنی زندگی کو تباہ و برباد کرتے ہیں۔

ترکِ عشقِ مجازی کے انعامات

پڑا پالا جسے عشقِ بتاں سے
نہ پوچھو خونِ دل خونِ جگر کا
ملو تو جا کے اہلِ دردِ دل سے
عجب ہے کیف واں شام و سحر کا
سکونِ قلب ہے انعامِ اختؔر
حسینوں سے میاں صرفِ نظر کا

جس آدمی کو حسین لڑکے یا لڑکیوں کے عشق سے پالا پڑا ہو اور وہ اس میں مبتلا ہوا ہو تو اسے اس کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ ان کی محبت میں پڑ کر قلب و جگر کا کیسا خون ہوتا ہے رات و دن ان کی یاد میں تڑپنا اور بے چین رہنا اور ان کے فراق اور جدائی کے تصور سے نیند اور بھوک اڑ جانا اور رات و دن دل و دماغ پر ان کا خیال چھایا رہنا اور اس محبت کو چھوڑنے اور اس سے بچنے میں دل کا چورا چورا ہو جانا۔

لیکن جو لوگ ہمت کر کے پوری جرأت کے ساتھ آگے قدم بڑھاتے ہیں اور عشقِ بتاں سے نکل کر اللہ تعالیٰ کے عشق و محبت کی طرف پوری جان کی بازی لگا کر چلنا شروع کر دیتے ہیں اور اپنے دل کو حق تعالیٰ کی رضا کے لیے توڑنا منظور کرتے ہیں تو پھر وہ دل اللہ تعالیٰ کی تجلی گاہ بن جاتا ہے اور نظر و قلب کی حفاظت کی بدولت پھر اسے ایسا سکونِ قلب اور دردِ دل نصیب ہوتا ہے کہ وہ صبح و شام عجیب کیف و سرور پاتا ہے اور اسے دل دل میں ایسی بہار میسر ہوتی ہے جس کی لذت بے مثال ہوا کرتی ہے اور یہ قرآن و سنت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے کئے گئے وعدوں کا اثر اور نتیجہ ہے کہ جو لیلیٰ سے نظر اور دل بچالے گا تو مولیٰ کو اپنے دل میں پالے گا بقول حضرت والا ؎

سارے عالم میں یہی اخترؔ کی ہے آہ و فغاں
چند دن خونِ تمنا سے خدا مل جائے ہے

اور یہ وہ دولت ہے کہ انسان کو ایمان پر موت دلانے کا ذریعہ بنتی ہے کیونکہ حسینوں سے نظر بچانے پر دل میں حلاوت ملنے کا وعدہ کیا گیا ہے اور جب کسی کو حلاوت نصیب ہو جاتی ہے تو پھر وہ دل سے نکلتی نہیں ہے۔ اس لیے اس میں اس بات کی طرف بشارت ہے کہ اس کا ایمان پر خاتمہ ہوگا جو ایک مومن کے لیے بہت عظیم دولت ہے اور جو جتنے درجے میں کسی نامحرم عورت یا حسین لڑکے کا عاشق رہا ہو اور بعد میں تائب ہو گیا ہو لیکن اس معشوق کو چھوڑنا اس کے لیے سخت مجاہدہ کا سبب بن رہا ہو وہ یہ بات بغور سن لے کہ اس مجاہدہ سے اس کو جتنی تکلیف ہوگی اس کے دل کو اتنا ہی درجہ کا حلوۂ ایمانی بھی نصیب ہوگا۔ اس لیے کہ حق تعالیٰ کی راہ میں جو بندہ جس قدر مشقت اور تکلیف اٹھاتا ہے اس کو اسی قدر اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اجر و ثواب اور بدلہ مرحمت فرمایا جاتا ہے تو ان لوگوں کو جو اس وادی میں بہت دور جا چکے ہیں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ ؎

ظالم ابھی ہے فرصت توبہ نہ دیر کر
وہ بھی گرا نہیں کہ جو گر کر سنبھل گیا

اور فوراً بغیر کسی تاخیر کے اپنے مالک کو راضی کرنے میں اسی طرح قوت و ہمت کے ساتھ لگ جائیں کہ جس طرح اب تک ان بتوں کے عشق میں رات و دن اور شب و روز دل کو لگائے ہوئے تھے اور بزبانِ حال یہ کہہ رہے ہوں کہ یا اللہ چاہے کچھ بھی ہو جائے اب ان حرام محبتوں سے دور ہونے کا فیصلہ کر چکا ہوں ؎

آرزوئیں خون ہوں یا حسرتیں پامال ہوں
اب تو اس دل کو ترے قابل بنانا ہے مجھے

نہ کر توہین تو تاثیر آہ بے زبانی کی

جسے بخشی ہے دولت حق نے اپنی رازدانی کی
محبت ہو نہیں سکتی اسے دنیائے فانی کی

بدلتا ہے کبھی جغرافیہ ایسا حسینوں کا
کہ تاریخیں بدل جاتی ہیں جس سے حسن فانی کی

جنازہ حسن کا جب دفن ہو پیری کی قبروں میں
سنوں کیا آہ ان کی داستاں عہد جوانی کی

میں اب تاریخ ان کے حسن کی کس طرح دہراؤں
نہیں وقعت ہے کوئی حسن رفتہ کی کہانی کی

نہ ہوتا بد گماں ناداں کبھی اہل محبت سے
جو ہوتی آگہی ظالم کو کچھ درد نہانی کی

رہا تا عمر وہ محروم اہل دل کی صحبت سے
کہ جس نے کبر کے باعث ہمیشہ بدگمانی کی

ہزاروں بستیاں ویران ہیں از آہ مظلوماں
نہ کر توہین تو تاثیر آہِ بے زبانی کی

نہیں پاتا شفا دکتور خود اپنی دواؤں سے
کرے ہے جستجو دکتور بھی دکتور ثانی کی

بدون صحبت مرشد تجھے کیسے شفا ہوگی
نہیں جب شیخ اوّل جستجو کر شیخ ثانی کی

ہمارے پھول پھل جو دیکھتے ہو دیکھنے والو
ہمارے شیخ نے اختؔر کے دل میں باغبانی کی

مشکل الفاظ کے معانی:۔ **فانی:** ختم ہونے والی۔ **جغرافیہ:** ناک ونقشہ۔ **پیری:** بڑھاپا۔ **عہد جوانی:** جوانی کا زمانہ۔ **حسنِ رفتہ:** گیا ہوا حسن۔ **دکتور:** ڈاکٹر۔

دولت راز دانی ہوتو دنیائے فانی پھر کہاں

جسے بخشی ہے دولت حق نے اپنی رازدانی کی
محبت ہو نہیں سکتی اسے دنیائے فانی کی

اللہ تبارک وتعالیٰ جسے اپنے خاص علوم اور اسرار ورموز عطا فرماتے ہیں اس کے دل سے دنیائے فانی کی محبت کونکال دیتے ہیں کیونکہ جب تک دنیائے فانی کی محبت دل میں موجود رہے گی تو اللہ تعالیٰ کی محبت پورے طور پر دل میں نہیں آسکتی ہے اور جب تک دل میں اللہ تعالیٰ کی پورے طور پر محبت نہیں ہوگی تو اللہ تعالیٰ کے خاص علوم اور اسرار ورموز دل کو عطا نہیں ہوتے:

﴿عَنْ اَبِیْ ذَرٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَازَھِدَ عَبْدٌ فِی الدُّنْیَا اِلَّا اَنْبَتَ اللّٰہُ الْحِکْمَۃَ فِیْ قَلْبِہٖ وَاَنْطَقَ بِھَا لِسَانَہٗ وَبَصَّرَہٗ عَیْبَ الدُّنْیَا وَدَائَھَا وَدَوَائَھَا وَاَخْرَجَہٗ مِنْھَا سَالِمًا اِلٰی دَارِ السَّلَامِ﴾

(المشکوٰۃ، کتابُ الرِّقاق، ص: ۴۴۳)

حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس بندہ نے دنیا میں زہد اختیار کیا (یعنی دنیا سے بے رغبتی کی) اللہ تعالیٰ نے اس کے دل میں حکمت پیدا کی اور حکمت کے ساتھ اس کی زبان کو گویا کیا اور دنیا کے عیوب اور اس کی بیماری اور ان بیماریوں کا علاج اس کو دکھایا اور نکالا اس کو حق تعالیٰ نے دنیا اور آفات سے سالم دار السلام کی طرف۔ (دنیا کی حقیقت، ص: ۷۰)

اس حدیث شریف سے یوں تو بہت سے مسائل مستنبط ہوتے ہیں مگر ایک بنیادی بات جس کا اس حدیث شریف سے پتہ چلتا ہے یہ ہے کہ جس بندے کو زہد یعنی دلی طور پر دنیا سے دوری اور بے رغبتی عطا فرمادی جاتی ہے تو حق تعالیٰ اس کے دل میں اپنے خاص علوم وحکم عطا فرماتے ہیں اور ان علوم وحکم کا بیان بھی اس کی زبان پر جاری فرمادیتے ہیں اس لیے اللہ تعالیٰ کی راز دانی کی حقیقت پانے والا مومن دنیا سے محبت کرنے والا نہیں ہوسکتا اور جو دنیا سے محبت کرے گا اسے یہ نعمت نصیب نہیں ہوگی اسی لیے جو اہل اللہ اپنے دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا کر لیتے ہیں اور دنیا کی محبت دل سے نکال دیتے ہیں تو بسا اوقات وہ مدرسے کے اصطلاحی عالم نہ ہونے کے باوجود علوم وھبیہ میں اتنے آگے بڑھ جاتے ہیں کہ ظاہری اصطلاحی عالم ان کا بیان وتقریر سن کر حیران کھڑا رہ جاتا ہے۔

جغرافیۂ حسن کا برا حال وانجام

بدلتا ہے کبھی جغرافیہ ایسا حسینوں کا
کہ تاریخیں بدل جاتی ہیں جس سے حسن فانی کی
جنازہ حسن کا جب دفن ہو پیری کی قبروں میں
سنوں کیا آہ ان کی داستاں عہد جوانی کی
میں اب تاریخ ان کے حسن کی کس طرح دہراؤں
نہیں وقعت ہے کوئی حسن رفتہ کی کہانی کی

حضرت والا دامت برکاتہم اشعار میں حسین چہروں کو دل دینے والے حضرات کے لیے نصیحت آموز انداز سے حسن کے زوال اور مٹ جانے کا تذکرہ فرما رہے ہیں کہ وہی حسن جس پر اپنی جان و دل اور دین وایمان فدا کیا جاتا ہے تھوڑے ہی دنوں میں ان حسینوں کا جغرافیہ ایسا بدلتا ہے کہ اس کی تاریخیں بھی تبدیل ہو جاتی ہیں اور وہ اس لائق بھی نہیں رہتا کہ اسے حسن کہا جائے وہی چہرے جو کل تک بڑے آب وتاب کے ساتھ نظر آتے تھے جیسے ہی ان کو بڑھاپے نے آگھیرا تو اب کوئی عاشق جوانی کی داستان دہرانے کو بھی تیار نہیں ہوتا بلکہ ان سے بھاگ کھڑا ہوتا ہے کیونکہ حسن رفتہ کی کوئی وقعت نہیں ہوتی بلکہ وہ ایک وقتی جوش وجنون ہوتا ہے جس میں پڑ کر اُمّت کے جوان اپنی جوانی کو ضائع کر ڈالتے ہیں اور یہ حال ہر حسین اور حسینہ کا ہونا ہے کہ ان کے حسن کو ایک نہ ایک دن زوال لاحق ہوگا کبھی تو ان کے حسن کا جنازہ پیری کی قبروں میں دفن ہوگا تو پھر وہ سب قصے داستانِ فانیہ بن جائیں گے اور کبھی اس سے پہلے ہی قبر میں گلنے سڑنے والی لاشوں میں تبدیل ہو کر وہاں کے سینکڑوں کیڑے مکوڑوں کی غذا بن جائیں گے۔

اسی لیے ہم نے بارہا دیکھا کہ عشقیہ مزاج رکھنے والے کبھی کسی سے عشق لڑا کر شادیوں کی باتیں کرتے ہیں اور پھر شادی کے بعد چند ہی دن میں طلاق کی نوبت آتی ہے کیونکہ اب ان کا عشق کسی اور چمکتے چہرے کے ساتھ لگ چکا ہوتا ہے جس کے نتیجہ میں وہ صحیح اسلامی نکاح کی ذمہ داری کو نبھانے کا متحمل نہیں ہوتا۔

چنانچہ ایک قصہ اس پر یاد آیا۔ احقر سفر کے دوران اپنے ایک جاننے والے صاحب کے یہاں ایک دن کے لیے مہمان ٹھہرا ہوا تھا تو دوران گفتگو ان صاحب نے اپنی بیٹی کے ساتھ پیش آنے والے پریشان کن واقعات کا تذکرہ کیا جو اس کے شوہر کی طرف سے روز بروز پیش آرہے تھے کہ میری بیٹی کو طلاق دینے کی باتیں کرتا ہے اور کبھی اس کا سامان اٹھا کر لا کر ہمارے گھر چھوڑ دیتا ہے جب کہ کل تک یہ کہتا پھرتا تھا کہ یہ مجھے اتنی پسند ہے کہ میں اس کی خاطر مر جاؤں گا۔

اور صورت یہ پیش آئی تھی کہ ان کی شادی شدہ بیٹی نے اپنے اس شادی شدہ شوہر سے عشق لڑایا اور دونوں میں خوب محبت قائم ہوگئی یہاں تک اس شوہر نے سابقہ بیوی کو طلاق دی اور اس لڑکی نے اپنے سابق شوہر سے زبر دستی طلاق لی اور اس طرح دونوں نے آپس میں نکاح کیا لیکن جن کا مزاج عشق بازی کا ہوتا ہے وہ ہر آنے والے دن ایک نئے چہرے کے اوپر مرنے مٹنے کی باتیں کرنے لگتے ہیں چنانچہ ویسا ہی یہاں ہوا کہ اب اس لڑکے نے کسی اور لڑکی سے عشق لڑایا تو وہ دوسری والی بیوی اس کی طبیعت سے اتر گئی۔ اسی لیے یہ جناب احقر کے سامنے بیٹھے ہوئے اس غرض سے تذکرہ کر رہے تھے کہ کوئی تعویذ وغیرہ ایسا دے دیا جائے کہ جس سے وہ شوہر میری بیٹی کو پھر سے اسی طرح چاہنے لگے جیسے پہلے چاہتا تھا اور نئی لڑکی سے عشق چھوڑ دے۔

افسوس صد افسوس! آج اُمت گناہوں سے بچنا نہیں چاہتی اور نہ اپنی اولاد کو بچانے کی فکر کرتی ہے لیکن جب حالات آ کر پڑتے ہیں اور مصائب میں گھرتے ہیں تو پھر عاملوں کے پاس ایسے تعویذ لینے جاتے ہیں جو ان کے سارے مسائل حل کر دے اور انہیں مشکلات سے نجات دے دے۔

حالانکہ احقر اپنی پوری زندگی کے قرآن وسنت کے مطالعہ اور تاریخی حقائق کے نتیجے میں پورے وثوق کے ساتھ یہ بات کہہ سکتا ہے کہ گناہوں اور حق تعالیٰ کی نافرمانیوں میں لگے رہنے کے باوجود دنیا کے کسی بڑے سے بڑے عامل کے پاس ایسا کوئی تعویذ موجود نہیں ہے جو مصائب اور پریشانیوں سے نجات دلا سکے کیونکہ حق سبحانہ و تعالیٰ نے اس کا صرف اور صرف ایک ہی راستہ رکھا ہے اور وہ یہ کہ بندہ پورے طور پر اللہ تعالیٰ کا فرمانبردار ہو جائے اور مکمل تقویٰ اختیار کر لے اور تمام گناہوں سے توبہ کر لے تو پھر ضرور اس کی ہر مشکل آسان کر دی جائے گی۔

اہل دل سے بدگمانی اپنی ناکامی ومحرومی ہے

نہ ہوتا بدگماں ناداں کبھی اہل محبت سے
جو ہوتی آگہی ظالم کو کچھ درد نہانی کی
رہا تا عمر وہ محروم اہل دل کی صحبت سے
کہ جس نے کبر کے باعث ہمیشہ بدگمانی کی

اللہ تعالیٰ کی محبت کا غم کیا چیز ہے جب تک آدمی کو اس کی خبر نہ ہو تو اہل اللہ کے مقام اور ان کی صحیح حالت سے ناواقف اور بے خبر رہتا ہے جس کی وجہ سے بہت سی مرتبہ اہل اللہ کے اوپر اعتراضات اور اشکالات دل میں آنے لگتے ہیں اور ان سے بدگمانیاں شروع ہو جاتی ہیں جیسا کہ بکثرت یہ بات دیکھنے میں آتی ہے کہ جو مدارس سے صرف ظاہری علوم درس نظامی کی صورت میں پڑھ لیتے ہیں اور وہ اہل اللہ کی صحبت نہیں اٹھاتے تو ان کا یہ علم ان کے لیے حجاب بنا رہتا ہے اور وہ اہل اللہ سے بدگمان رہتے ہیں اور بدگمانی درحقیقت کبر اور بڑائی سے مترشح ہوتی ہے اور

اس طرح یہ کبر ان کو اللہ کی محبت سیکھنے سے مانع بن جاتا ہے۔

چنانچہ احقر کے سامنے بہت سے ایسے واقعات ہیں کہ جو لوگ شروع شروع میں بزرگوں سے بدظن رہے لیکن جب ان کے قریب پہنچے اور حقیقت ان کے سامنے کھلی تو پھر وہ دل و جان اہل اللہ پر فدا کرنے کو تیار نظر آنے لگے جیسا کہ حضرت مولانا عبدالماجد دریا آبادی کے متعلق یہی بات ہے کہ شروع میں حضرت تھانوی رحمہ اللہ سے جب ملنے کے لیے تشریف لائے تو کچھ اعتراضات اور اشکالات دل میں لیے ہوئے تھے حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے ان سے اتنی درخواست کی کہ پہلے چند دن غالباً دس ایام تک آپ میری گفتگو سنیں گے اور اس کے بعد میں آپ کے اشکالات سنوں گا بالآخر ابھی دس دن بھی نہ گزرے تھے کہ اس سے پہلے ہی ان کے تمام اشکالات حل ہو گئے اور پھر جب حضرت نے ان سے فرمایا کہ اب آپ اپنی بات پیش کریں تو انہوں نے یہ عرض کیا کہ حضرت وہ سب اشکالات اور اعتراضات اب ختم ہو چکے ہیں۔

اور پھر ایسے حضرت تھانوی کے عاشق ہوئے کہ حضرت تھانوی کے حالات پر ایک نہایت ضخیم کتاب تحریری فرمائی جس کا نام ''حکیم الامت اور نقوش تاثرات'' ہے جس کو پڑھنے کے بعد ان کے حضرت تھانوی سے والہانہ تعلق اور غایت درجے محبت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے مگر جب تک حضرت تھانوی کے قریب نہیں آئے تھے تو وہ اعتراضات اور اشکالات رہتے تھے اس لیے حضرت والا دامت برکاتہم ارشاد فرمارہے ہیں کہ جس شخص کو تکبر کے باعث اہل اللہ سے بدگمانی ہو وہ ساری عمر ان کے فیض سے محروم رہتا ہے بس اس کی زندگی ان پر تنقیدوں اور تبصروں میں اور اعتراضات اور اشکالات میں گزر جاتی ہے جب کہ دوسرے لوگ ان سے مل کر اللہ تعالیٰ کی محبت سیکھتے ہیں اور اپنی منزلِ مقصود پر پہنچ جاتے ہیں۔

اور حضرت والا نے ایسے شخص کو ناداں اور ظالم کہا ہے جو بالکل ظاہر ہے اس لیے کہ بدگمانی سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مطلقاً منع فرمایا ہے چہ جائیکہ اہل اللہ سے بدگمانی یہ تو اور مزید اللہ تعالیٰ کے عذاب اور پکڑ کا باعث ہے کیونکہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل اللہ سے دشمنی رکھنا یا ان کو ستانا اور تکلیف پہنچانا اللہ رب العزت کی بارگاہ میں اس قدر برا ہے کہ جس پر اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات عالی سے جنگ کا اعلان فرمایا ہے اس لیے اہل اللہ سے بدگمانی کرنا اپنی تباہی اور بربادی کا سبب ہے قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِیْرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ ﴾

(سورۃ الحجرات، آیت: ۱۲)

کہ ایمان والو! بہت سے گمانوں سے بچو، بے شک بعض گمان گناہ ہوتے ہیں اور حدیث پاک میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

﴿ظُنُّوْا بِالْمُؤْمِنِ خَيْرًا﴾
(تفسیر کبیر، ج:۱۴، ص:۱۳۴)

کہ مسلمانوں کے ساتھ اچھا گمان کرو۔

اس لیے جب عام مسلمانوں اور مومنوں کے ساتھ اچھا گمان رکھنے کا حکم ہے تو پھر اہل اللہ سے بدگمانی کتنا بڑا جرم ہوگی اور اس بدگمانی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ سے تعلق اور اس کی محبت سے محروم رہنا یہ خود اس جرم کی ایک سزا ہے۔

آہ بے زبانی کی تاثیر کو ناداں کیا جانے

ہزاروں بستیاں ویران ہیں از آہ مظلوماں
نہ کر توہین تو تاثیر آہِ بے زبانی کی

جس وقت مظلوم کی آہ نکلتی ہے تو وہ آسمانوں کو چیرتی ہوئی جاتی ہے اور اس آہ پر اللہ تعالیٰ کے فیصلے صادر ہو کر کتنی ہی بستیاں اور شہروں کی ویرانی اور بربادی کا سبب بنتے ہیں اور پوری ظالم قوم نیست و نابود کردی جاتی ہے کیونکہ مظلوم کی آہ وفریاد اس حاکم و منصف احکم الحاکمین اور ملک الملوک کے دربار میں سنی جاتی ہے۔ روایات میں آتا ہے کہ مظلوم کی بددعا اور اللہ کے درمیان کوئی حجاب اور پردہ نہیں ہوتا جیسا کہ فارسی کا ایک شاعر کہتا ہے ؎

بہ ترس از آہ مظلوم کہ ہنگامے دعا کردن
اجابت از درِ حق بہر استقبال می آید

کہ مظلوم کی آہوں سے ڈرو کیونکہ جس وقت ان کی آہ وفریاد نکلتی ہے تو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے قبولیت اس کے استقبال کے لیے آتی ہے سو جس طرح مظلوموں کی آہوں میں اللہ نے اثر رکھا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کے راستے میں غم اٹھائے ہوئے اہل اللہ کی آہوں میں بھی اللہ نے بہت زبردست تاثیر رکھی ہے وہ زبان کھولیں یا نہ کھولیں لیکن ان کی آہیں ڈائریکٹ آسمان پر پہنچتی ہیں اور ان کے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان بھی کوئی حجاب اور آڑ نہیں ہوتی جیسے مولانا رومی نے فرمایا ؎

آہ را جز آسمان ہم دم نبود
راز را غیرِ خدا محرم نہ بود

کہ جلال الدین رومی اپنے اللہ کو ایسے جنگل و بیابان اور دامن کوہ اور صحرا میں جا کر پکارتا ہے جہاں اس کی پکار کو سننے والا سوائے اس کے اللہ کے اور کوئی نہیں ہوتا۔

اس لیے ناداں ہیں وہ لوگ جو اللہ والوں کی آہوں کی قدر و قیمت سے واقف نہیں اور ان کی تاثیر بے

زبانی کے قائل نہیں حالانکہ حق اور سچ بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی محبت میں جلا بھنا دل لیے ہوئے اہل اللہ کے پاس محض اٹھنے بیٹھنے ہی سے اور صرف ان کی آہ و نالوں کا حال دیکھنے سے کئی ظلمت سے بھرے ہوئے دل روشن ہو جاتے ہیں اور چمک اٹھتے ہیں اور انہیں حقیقی حیات نصیب ہو جاتی ہے کیونکہ جس طرح ایک آدمی سردی کے موسم میں حرارت اور گرمی کے مقام سے اگر دور بیٹھا ہو تو اسے اس کی گرمی نہیں پہنچتی اسی طرح اللہ والوں کے دلوں سے جو لوگ دور رہیں گے انہیں گرمی کا احساس اس طرح نہیں ہو سکتا جس طرح کہ ان لوگوں کو جو اس کے قریب بیٹھے ہوں کیونکہ ان کے دلوں میں بھی اسی طرح اللہ کی محبت کی آگ لگی ہوتی ہے اور اس کی حرارت و گرمی معنوی اور روحانی شکل میں ظاہر ہوتی رہتی ہے۔

صحبتِ شیخ کی ضرورت کی حکیمانہ وجہ

نہیں پاتا شفا دکتور خود اپنی دواؤں سے
کرے ہے جستجو دکتور بھی دکتور ثانی کی
بدون صحبتِ مرشد تجھے کیسے شفا ہوگی
نہیں جب شیخ اوّل جستجو کر شیخ ثانی کی
ہمارے پھول پھل جو دیکھتے ہو دیکھنے والو
ہمارے شیخ نے اختؔر کے دل میں باغبانی کی

ان تمام اشعار کا خلاصہ یہ ہے کہ ہر شخص کو خواہ وہ جسمانی بیمار ہو یا روحانی کسی طبیب جسمانی و روحانی کی ضرورت ضرور پڑتی ہے حتیٰ کہ خود طبیب بھی اگر کسی مرض میں مبتلا ہو جائے تو دنیائے طب اور فن ڈاکٹری کا یہی اصول ہے کہ وہ خود اپنے مرض کی تشخیص اور دواؤں کی تجویز کے لیے کسی دوسرے طبیب و ڈاکٹر کی خدمت میں جانا ضروری سمجھتا ہے خود اپنے طور پر اپنی بیماری کا علاج کرنا پسند نہیں کیا جاتا اور خود علاج کرنے میں عام طور پر خطا و چوک واقع ہو جاتی ہے۔

تو آخر کیا وجہ ہے کہ روحانی بیمار اپنے علاج کے لیے خود ہی بیماریوں کی تشخیص اور دواؤں کی تجویز پر اکتفاء کرتا ہے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ امراض جسمانی کے مقابلے میں امراض روحانی کا معاملہ سخت ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی تشخیص طبیب ماہر، معالج روحانی، شیخ کامل کے بغیر بالکل ممکن نہیں اسی لیے تو اللہ تعالیٰ کی سنت یہی رہی ہے کہ کتاب اللہ بھیجے جانے کے ساتھ ساتھ اس پر صحیح طور پر عمل کرنے کے لیے امتوں کے لیے رجال اللہ یعنی انبیاء بھی بھیجے گئے۔

اب چونکہ یہ امت آخری امت ہے اس لیے رجال اللہ بشکل انبیاء تو مبعوث نہیں کیے جائیں گے لیکن انبیاء کے نائبین علمائے دین اس فریضے کی انجام دہی میں قیامت تک لگے رہیں گے اس لیے خلاصہ یہ ہے کہ ہر سالک کو اگر چہ وہ اپنے وقت کا شیخ بھی بن گیا ہوا پنے سر کے اوپر کسی اپنے بڑے شیخ و مربی کو رکھنا چاہیے تا کہ نفس و شیطان کی چالوں سے اور اس کی سازشوں سے بسہولت آگاہی حاصل ہوتی رہے ورنہ کئی مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ ہم کسی عمل کو دین سمجھتے رہتے ہیں حالانکہ وہ طریق دین پر نہ ہونے کی وجہ دین نہیں ہوتا اور بسا اوقات بعض اعمال واشغال کو بعض امراض روحانی کا علاج سمجھتے رہتے ہیں جبکہ وہ اس کا علاج نہیں ہوتے۔

احقر کا واقعہ اور علاج وساوس کا آزمودہ نسخہ

مثال کے طور پر احقر خود اپنا واقعہ پیش کرتا ہے کہ ایک مرتبہ وساوس کی کثرت کے علاج کے طور پر احقر نے حضرت والا کو خط لکھا اور اس میں یہ بھی لکھ دیا کہ بندہ اس کے لیے روزانہ دو رکعت نماز پڑھ کر خوب الحاح وزاری کے ساتھ دعا کرتا رہتا ہے کہ یہ وساوس ختم ہو جائیں اور اس طرح اپنے طور پر ازالۂ وساوس کے لیے صلوٰۃ الحاجۃ کو تجویز کر لیا مگر حضرت والا کی طرف سے جب جواب آیا تو پھر اپنے اس علاج کے غلط ہونے پر تنبہ ہوا کیونکہ اس میں حضرت والا نے یہ تحریر فرمایا کہ صلوٰۃ الحاجۃ پڑھنا اور دعائیں مانگنا اپنی جگہ پر درست اور صحیح ہے مگر یہ ازالۂ وساوس کا علاج نہیں ہے بلکہ اس کا علاج وساوس سے مکمل طور پر صرفِ نظر کر لینا ہے اور اس سے بے توجہ ہو جانا ہے ورنہ اگر تم نماز پڑھتے رہے اور اس نماز میں بھی وسوسے آئے تو پھر مزید دو رکعت پڑھنی پڑے گی یہاں تک کہ شیطان وساوس کے ذریعے تم کو تھکا ڈالے گا اور بالآخر تم پریشان ہو کر نماز بھی چھوڑ بیٹھو گے اس لیے اس کا اصل علاج اس طرف سے اپنے ذہن کو ہٹا دینا ہے۔

یہ خط پڑھ کر دل بہت خوش ہوا اور بآسانی وساوس کا علاج ہو گیا چنانچہ احقر نے حضرت تھانوی قدس سرہ کی سوانح میں پڑھا کہ خود حضرت تھانوی علیہ الرحمۃ کو جب ایک زمانے میں وساوس کی بڑی کثرت تھی تو حضرت گنگوہی علیہ الرحمۃ نے یہی جواب ارشاد فرمایا تھا کہ وساوس کا علاج اس طرف سے توجہ ہٹا لینا ہے۔

اسی ضمن میں ایک بات یہ بھی ذہن میں آتی ہے کہ جس شخص کو وساوس آتے ہوں وہ صرف اتنا سوچ لے کہ میں وساوس سے پریشان ہو رہا ہوں؟ یا مطمئن ہوں اور سکون سے بیٹھا ہوں؟ ظاہر ہے کہ تمام ہی سالکین وساوس سے پریشان ہوتے ہیں یہی ان کے صریح اور واضح ایمان کی دلیل ہے ورنہ ان کو وساوس پر مطمئن ہونا چاہیے تھا جیسا کہ حدیث پاک میں رسول اللہ صلی علیہ وسلم سے منقول ہے:

﴿وَعَنْهُ قَالَ جَآءَ نَاسٌ مِّنْ اَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَسَاَلُوْهُ اِنَّا نَجِدُ فِيْ اَنْفُسِنَا مَا يَتَعَاظَمُ اَحَدُنَا اَنْ يَّتَكَلَّمَ بِهٖ قَالَ اَوَ قَدْ وَجَدْ تُمُوْهُ

﴿قَالُوْا نَعَمْ قَالَ ذَاکَ صَرِیْحُ الْاِیْمَانِ﴾
(مشکوٰۃ المصابیح، ص:۱۸)

یعنی خلاصہ یہ ہے کہ بارگاہ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں جب بعض صحابہ نے آ کے یہی بات عرض کی تھی اور فرمایا تھا کہ یا رسول اللہ ہم اپنے دلوں میں ایسے بعض وساوس پاتے ہیں کہ جن کا زبان سے بولنا ہمارے اوپر بڑا دشوار ہے اس پر حضور علیہ الصلاۃ والسلام نے ان سے پوچھا کہ کیا واقعی تم نے اس بات کو اپنے دلوں میں محسوس کیا؟ تو صحابہ نے فرمایا کہ جی ہاں یارسول اللہ تو اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات ارشاد فرمائی کہ ''ذاک صریح الایمان'' کہ یہ تو تمہارے واضح ایمان کی دلیل ہے کیونکہ اگر ایمان نہ ہوتا تو پھر ان وساوس پر مطمئن رہتا، پریشان نہ ہوتا۔

نیز اسی طرح ایک اور حدیثِ پاک میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جب ایک شخص نے آ کر حضور سے یہی وسوسوں کی شکایت کی تھی اور یوں فرمایا تھا کہ میرے دل میں ایسے خیالات آتے ہیں کہ مجھے جل کر کوئلہ ہو جانا اچھا لگتا ہے بنسبت اس کے میں اس کو اپنی زبان سے بولوں۔تو اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر خوشی کا اظہار فرمایا اور یہ ارشاد فرمایا:

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ رَدَّ اَمْرَہٗ اِلَی الْوَسْوَسَۃِ﴾
(مشکوٰۃ المصابیح، ص:۱۹)

کہ شکر ہے اس خدائے پاک کا جس نے اس کے معاملے کو وسوسے کی طرف پھیر دیا یعنی اُس کا جل کر کوئلہ ہو جانے کی تمنا کرنا یہی اس بات کی دلیل ہے کہ اس کے دل میں ایمان موجود ہے ورنہ وہ اس وسوسے کے اوپر پر سکون اور مطمئن رہتا۔اس سے بھی یہ بات ثابت ہوئی کہ سالک کو اس سے ہرگز گھبرانا نہیں چاہیے۔

اور وساوس کی طرف توجہ نہ کرنا اس کا یہ علاج حدیث شریف میں مذکور ہے کہ وساوس میں غور کرنے سے رک جائے اور استعاذہ پڑھے۔اس حدیث شریف سے بھی یہ بات معلوم ہوئی کہ وساوس میں غور وفکر کرنا چھوڑ دینے سے اور اس طرف سے بے التفاتی کے نتیجے میں شیطان بندۂ مؤمن کو پریشان کرنے میں ناکام ہو جاتا ہے۔اس لیے وساوس کا یہ سب سے قیمتی علاج ہے کہ اس طرف توجہ نہ کی جائے۔

اور حضرت والا نے اپنی ایک کتاب میں جہاں حضرت شاہ عبدالغنی پھولپوری رحمہ اللہ کے ملفوظات جمع فرمائے ہیں اس میں یہ بات بھی تحریر فرمائی کہ اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ وَرُسُلِہٖ پڑھ لینے سے بھی وساوس کا علاج ہو جاتا ہے۔جیسا کہ یہ الفاظ ایک روایت میں بھی آئے ہیں۔

نیز یہ بھی ایک بہت قیمتی علاج وساوس کے سلسلے میں حضرت گنگوہی رحمہ اللہ نے ذکر فرمایا ہے کہ جس کو وساوس آتے ہوں وہ یوں غور کرے کہ چور ایسے مکان کی طرف رُخ کرتا ہے جہاں اُسے خزانہ معلوم ہوتا ہو اور جو گھر مال و دولت سے خالی ہو اُس میں چور جا کر اپنا وقت ضائع نہیں کرتا تو شیطان کا اس آدمی کے پاس آ کر دل

میں وساوس ڈالنا یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ اس کے قلب کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے معرفت و محبت کا خزانہ نصیب ہو رہا ہے۔تو یہ اس کے لیے خوش ہونے کی بات ہے، غمگین ہونے کی بات نہیں۔

اور حکیم الامت تھانوی رحمہ اللہ نے بڑی قیمتی بات ارشاد فرمائی ہے کہ وساوس کا اپنے اختیار سے لانا تو بُرا ہے مگر آنا بُرا نہیں۔لہٰذا اگر کسی کو وساوس آتے ہوں تو اُس کی بالکل پرواہ نہ کرے اور اپنی عبادات اُسی طرح جاری رکھے۔ایک مرتبہ میرے شیخِ اوّل حضرت مسیح الامت جلال آبادرحمہ اللہ کے پاس ایک شخص نے آکر اس طرح کی شکایت کی کہ مجھے ایسا لگتا ہے کہ جیسا کہ میں شیطان ہوگیا ہوں اور کبھی یہ لگتا ہے کہ میرے دل میں ایمان نہیں ہے، میں کافر ہو چکا ہوں۔تو حضرت رحمہ اللہ نے اس سے یہ پوچھا کہ کیا تم نماز پڑھتے ہو؟ سجدہ کرتے ہو؟ تلاوت کرتے ہو؟ اللہ کا نام لیتے ہو؟ اس طرح کے چند سوالات کیے۔اس شخص نے جواب دیا جی ہاں! میں یہ سب کچھ کرتا ہوں۔تو حضرت رحمہ اللہ نے ارشاد فرمایا کہ کیا شیطان اور کوئی کافر بھی یہ سب کام کرتا ہے؟ اُس نے کہا کہ نہیں۔تو پھر حضرت نے فرمایا کہ لہٰذا معلوم ہوگیا کہ تم نہ شیطان ہو نہ کافر ہو۔یہ جواب سن کر اُس کی یہ بیماری ختم ہوگئی۔

سایۂ شیخ تاحیات سر پر رکھئے

بہر حال یہ بات ضمناً آگئی تھی کہ اپنے طور پر کسی بیماری کا علاج تجویز کرنے کے بجائے اپنے شیخ و مرشد کے سامنے بیماری رکھ کر اس سے علاج دریافت کیا جائے کیونکہ وہ ان راہوں سے گزرا ہوا تجربہ کار شخص ہوتا ہے اور نفس و شیطان کی چالوں سے زیادہ واقف ہوتا ہے۔

یہاں تک کہ اگر شیخ اوّل دنیا سے رخصت ہوجائے تو شیخِ ثانی سے رابطہ رکھا جائے اور کسی نہ کسی مصلح اور مرشد کو اپنے سر پر رکھنا چاہیے۔جیسا کہ خود حضرت والا سب سے اوّل حضرت شاہ احمد پرتاب گڈھی رحمہ اللہ سے پھر حضرت شاہ عبدالغنی پھولپوری رحمہ اللہ اور پھر حضرت شاہ ابرار الحق ہردوئی رحمہ اللہ سے وابستہ رہے۔اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ مشائخ مقصود نہیں ہوتے مقصود صرف اللہ کی ذات ہوتی ہے۔مشائخ صرف راستہ دکھلانے والے اور اُس کے نشیب و فراز سے آگاہ کرانے والے ہیں اور اس کی ضرورت آدمی کو مرتے دم تک قائم رہتی ہے۔اخیر میں حضرت والا اپنی عادت کے مطابق وہی بات دہرا رہے ہیں جو کتاب میں جگہ جگہ مذکور ہے کہ میرے پھول و پھل اور تقریر و تالیف اور وعظ و بیان اور دین کی محبت کی شکل میں جو پھول و پھل ہیں یہ سب میرے شیخ نے جواختر کے دل میں باغبانی کی تھی اسی کا اثر اور نتیجہ ہے گویا اس میں میرا اپنا کوئی کمال نہیں ہے۔اس شعر میں ہم سب کے لیے تواضع کا سبق ہے کہ آدمی اپنے کمالات کو اصل اور حقیقی طور پر تو اللہ تعالیٰ کی طرف اور سبب کے درجے میں اپنے شیخ اور مصلح کی طرف منسوب کرے۔اپنی کوششوں کا اثر اور کمال نہ سمجھے۔

سیمیں تن کو دے کر سیمیں جاں خریدا
تن دفن ہے لحد میں جاں ہے فلک پہ تاباں
اس تن میں کیا دھرا ہے اک دن اسے فنا ہے
اس جان و تن کو لے کر چل میرے سُوئے جاناں

مشکل الفاظ کے معانی:۔ **سیمین تن**: چاندی جیسا جسم۔ **لحد**: قبر۔ **تاباں**: چمکتی ہوئی۔ **سوئے جاناں**: اللہ تعالیٰ کی طرف۔

خوب گزریں گے تیرے لیل ونہار

حسن سے جس کے میر تھے سرشار
اس کی صورت سے اب ہیں کیوں بے زار
عشق فانی کے لطف خواب ہوئے
سر پہ ہے بار معصیت کا سوار
ان کی نظروں میں میر ہیں رُسوا
دین و ایماں کیا تھا جن پہ نثار
میر رہتے ہیں عشق کے بیمار
مجھ کو پاتے ہیں اپنا وہ تیمار
ان بتوں کو نہ دیکھ تو زنہار
عقل کھو دے گا ورنہ تو اے یار
عشق لے چل بجانب صحرا
حسن والوں سے قلب ہے بے زار
مے کدہ میر کا ہے ٹنڈوجام
اور صحرا وہاں کا ہے گُل زار
میر آفت ہے صورت گلفام
ترک صورت کرو یہ ہیں سب خار
ایسی عشرت کہ جس سے ہو کلفت
اپنی حسرت ہے اس سے بہتر یار
خار کھاتے ہیں میر کیوں گل سے
دے گی کیا ان کو وادی پُرخار
جب ملے مے حلال کی، پی لے
پڑ نہ پیچھے حرام کے زنہار
چند حسرت بھرے دلوں کے ساتھ
خوب گذریں گے تیرے لیل و نہار

مشکل الفاظ کے معانی:۔**معصیت**: گناہ۔ **رسوا**: بدنام۔ **نثار**: قربان۔ **تیمار**: بیمار کی دیکھ بھال کرنے والا۔ **زنہار**: ہرگز۔ **میکدہ**: اللہ تعالیٰ کی محبت کا شراب خانہ۔ **گلفام**: پھول جیسا جسم۔ **ترکِ صورت**: چہرہ نہ دیکھو۔ **خار**: کانٹے۔ **کلفت**: تکلیف۔ **پرخاکی**: کانٹوں سے بھری ہوئی وادی۔

حسن سے بیزاری اور اختر کی تیمار داری

حسن سے جس کے میر تھے سرشار
اس کی صورت سے اب ہیں کیوں بے زار
عشق فانی کے لطف خواب ہوئے
سر پہ ہے بار معصیت کا سوار
ان کی نظروں میں میر ہیں رُسوا
دین و ایماں کیا تھا جن پہ نثار
میر رہتے ہیں عشق کے بیمار
مجھ کو پاتے ہیں اپنا وہ تیمار
ان بتوں کو نہ دیکھ تو زنہار
عقل کھو دے گا ورنہ تو اے یار
عشق لے چل بجانب صحرا
حسن والوں سے قلب ہے بے زار

حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ ان تمام اشعار میں حسنِ مجازی کی فنائیت اور اس میں اپنی زندگی ضائع کرنے والے حضرات کو اپنے ایک خاص انداز میں ایک اہم نصیحت فرما رہے ہیں کہ اے حسنِ مجازی کے عاشق اور اس سے اپنے دل کو خوش کرنے والے تجھے چند ہی دن کے بعد اس سے بیزاری کا اظہار کرنا پڑے گا اور جو بظاہر تو لطف اور مزے اُٹھا رہا ہے وہ عنقریب خواب بن جائیں گے اور اللہ تعالیٰ کی معصیت اور نافرمانی کی وجہ سے تجھے ذلت ورسوائی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ یہاں تک کہ خود وہ شخص جس کے ساتھ عشق لڑایا تھا اور اُس پر اپنا دین وایمان قربان کیا تھا اُس کی نگاہوں میں بھی سوائے ذلت ورسوائی کے اور کچھ باقی نہیں رہتا۔

اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ اُس نے مجھے اس بیماری میں مبتلا لوگوں کے لیے اور عشقِ مجازی کے بیماروں کے واسطے تیمارداری کرنے والا اور معالج بنا دیا اور توفیقِ الٰہی سے اور اپنے مشائخ کی صحبت وخدمت کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے احقر کو ایسے طریقے سکھلائے ہیں کہ جن پر عمل کرکے اس مرض میں مبتلا شخص بہت جلد شفا پا جاتا ہے۔ انہی میں سے ایک سب سے اہم علاج کا حصہ اور جزیہ ہے کہ ہرگز ان حسینوں کو نہ دیکھا جائے اور ان سے اپنی نظروں کو بچالیا جائے تاکہ دل بھی محفوظ رہے اور پھر آگے قدم نہ بڑھ سکے۔ قرآنِ کریم اسی کو یوں ارشاد فرماتا ہے:

تِلۡکَ حُدُوۡدُ اللہِ فَلَا تَقۡرَبُوۡھَا'' کہ یہ اللہ کی حدود ہیں تم ان کے قریب بھی نہ جانا۔ سبحان اللہ! اللہ تعالیٰ کس قدر رحیم و کریم ہیں کہ لا تقربوھا کا حکم دے کر اپنے بندوں پر عظیم الشان احسان فرمادیا ورنہ انسان کی فطرت یہ ہے کہ جب وہ گناہوں کے قریب جاتا ہے تو پھر اُن میں مبتلا ہوجاتا ہے۔ اسی کو حضرت والا اپنے الفاظ میں یوں فرماتے ہیں کہ لا تقربوھا کی لا ہٹنے سے تعملوھا ہوجائے گا یعنی قریب جانے سے اس عمل میں جلد ابتلاء بھی ہوجائے گا۔ اس لیے ان حسینوں کو نہ دیکھو کہ وہ آنکھوں کا زنا ہے اور نہ ان سے گفتگو کرو کہ وہ زبان کا زنا ہے اور نہ ان سے دل دل میں مزے لوٹو کہ دل کا زنا یہی مزے لوٹنا ہے۔

اس لیے اگر اس کا علاج کرنا چاہتے ہو تو اپنی نظر اور دل کو بچا کر رکھو ورنہ نظر پڑتے ہی یہ کیفیت ہوتی ہے جو دیوانِ متنبّی کے اس شعر میں ہے ؎

یَسۡتَأۡسِرُ الۡبُطَلَ الۡکَمِیَّ بِنَظۡرَۃٍ
وَیَحُوۡلُ بَیۡنَ فُؤَادِہٖ وَعَزَائِہٖ

یعنی ایک نظر پڑتے ہی بڑا طاقتور، مضبوط، مسلح بہادر انسان بھی اُس کا قیدی ہوجاتا ہے اور پھر اُس کے صبر اور دل کے درمیان اُس کی وہ محبت اور عشق ایسا حائل ہوتا ہے کہ اگر صبر دل تک پہنچنا چاہتا ہے تو وہ اُسے پہنچنے نہیں دیتا بلکہ بیچ میں محبوب کی محبت کی دیوار کھڑی ہوجاتی ہے۔ یہاں تک کہ اسے ہزاروں لاکھوں ملامتیں بھی کی جائیں تو وہ بھی سب بے اثر ہوکر رہ جاتی ہیں۔ اس لیے یہ نظر بازی معمولی معاملہ نہیں ہے، یہ اتنا سنگین اور بھاری معاملہ ہے کہ جس کی وجہ سے آج بے شمار جوان اپنی جوانیوں کو تباہ و برباد کرچکے ہیں۔

جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان عورتوں کے متعلق یہ ارشاد فرمایا کہ:

﴿مَا رَأَیۡتُ مِنۡ نَاقِصَاتِ عَقۡلٍ وَّ دِیۡنٍ اَذۡھَبَ لِلُبِّ الرَّجُلِ الۡحَازِمِ مِنۡ اِحۡدَا کُنَّ﴾

(صحیح البخاری، کتاب الحیض، باب ترک الحیض الصوم، ج: ۱، ص: ۴۴)

اگرچہ وہ ناقصات العقل ہیں لیکن بڑے سمجھدار اور عقل مند انسان کی عقل کو لے اُڑتی ہیں۔ سو بہت خوش نصیب ہے وہ شخص جو اپنی نظر کو بچا کر دل کی حفاظت کرلے اور ان بتوں کی محبت کو دل میں جگہ نہ دے ورنہ عقل ٹھکانے نہ رہے گی اور دیوانوں اور پاگلوں کی طرح رات و دن بے چین اور پریشان پھرے گا۔ جیسا کہ حضرت والا کا شعر ہے ؎

صلہ عشقِ مجازی کا یہ کیسا ہے ارے ناداں
کہ عاشق روتے رہتے ہیں صنم خود سوتا رہتا ہے

ہاں! اللہ تعالیٰ کی محبت اور اُس کا عشق جو کہ پاکیزہ اور صاف ستھرا ہے اُسی شخص کو حاصل ہوسکتا ہے جو کہ ان ظاہری حسن رکھنے والوں کو اپنا دل دیئے ہوئے نہ ہو اور اُن سے اس کا دل بے زار ہو تو پھر یہ ظاہری رونق اور چمک دمک کو

چھوڑ کر جنگلوں و بیابانوں اور دریاؤں اور صحراؤں کے کنارے جا کر اپنے اللہ کو پکارتا ہے۔ جس کو حضرت فرمارہے ہیں اے میرے عشقِ مولا مجھے صحرا کی جانب لے چل کیونکہ میرا دل حسن والوں سے بیزار ہے۔

حضرت والا کی تربیت کی اہم باتیں

مے کدہ میر کا ہے ٹنڈو جام
اور صحرا وہاں کا ہے گُل زار
میر آفت ہے صورت گلفام
ترک صورت کرو یہ ہیں سب خار
ایسی عشرت کہ جس سے ہو کلفت
اپنی حسرت ہے اس سے بہتر یار
خار کھاتے ہیں میر کیوں گل سے
دے گی کیا ان کو وادیٔ پُرخار
جب ملے مے حلال کی، پی لے
پڑ نہ پیچھے حرام کے زنہار
چند حسرت بھرے دلوں کے ساتھ
خوب گذریں گے تیرے لیل و نہار

ان اشعار کی تشریح سمجھنے سے پہلے یہ بات ذہن میں رکھیئے کہ حضرت میر صاحب نے تحریر فرمایا ہے یہ اشعار حضرت والا دامت برکاتہم پر ریل گاڑی میں وارد ہوئے جبکہ حضرت اپنے بعض خاص احباب کی دعوت پر ٹنڈو جام تشریف لے جارہے تھے جو سندھ میں ایک جگہ کا نام ہے۔ اسی لیے شعر میں حضرت والا نے اس طرح خطاب فرمایا کہ ٹنڈو جام یا اس جیسی رہنے کی جگہیں ہیں یہ تو اُن لوگوں کا میکدہ ہے اور بسنے اور رہنے کی جگہ ہے جن کو دنیا کی عمارتوں اور بلڈنگوں اور شاندار مکانات اور بنگلوں کے ساتھ تعلق اور وابستگی ہے اور اسی جگہ پر جو صحرائی علاقہ ہے جہاں ظاہری دنیاوی علائق اور روابط سے کنارہ کشی اور یکسوئی حاصل ہوتی ہے اور دل دنیا کی ظاہری چیزوں کے ساتھ مربوط نہیں رہتا، اس کے متعلق حضرت فرماتے ہیں کہ وہاں کا صحرا گلزار ہے۔

پھر حضرت والا وہی نصیحت ارشاد فرماتے ہیں کہ صورت کے عشق کو چھوڑ دو ورنہ اس کی بدولت کلفت و زحمت مقدر بنے گی اور ایسی ظاہری عشرت کہ جس کی بدولت مستقبل تاریک ہوتا ہو اور زحمت و تکلیف کا سامنا کرنا

پڑتا ہو اُس کو چھوڑ دینا ہی بہتر ہوا کرتا ہے بلکہ اس کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ کے راستے کا وہ غم وحسرت کہ جو عارضی اور وقتی ہوتا ہے لیکن اس کی بدولت دائمی اور ہمیشہ کی خوشی اور راحت میسر آتی ہے۔ وہ اس عشرت و راحت کے مقابلے میں ہزار درجہ بہتر اور اُس سے بڑھ کر ہے۔ بقول حضرت والا ؎

میں نے مانا ہے بہارِ عارضی تجھ کو لذیذ
دائمی راحت کی خاطر عارضی راحت کو چھوڑ

بھلا عقل سے سوچنے کی بات ہے کہ جو شخص کانٹوں اور پھولوں میں سے کانٹوں کا انتخاب کر رہا ہو اور اپنے مستقبل کو ایک وادیٔ پُر خار بنا رہا ہو تو یہ کوئی عقل مندی اور سمجھداری کی بات ہے؟ جبکہ اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کو گل اور پھول عطا فرمائے ہیں کہ وقتی حسرت اور غم راہِ خداوندی کا اُٹھا کر اللہ تعالیٰ کے قرب کے پھول اپنے دل میں کھلا لو اور عارضی لذتوں میں پڑ کر جو صورتِ گل نظر آ رہی ہے جبکہ حقیقت میں وہ جھاڑیوں کا جنگل ہے اُس میں اپنے کو مت ڈالو ورنہ ہمیشہ کے لیے تباہی اور بربادی اور حسرت وافسوس مقدر بنے گا۔

جہاں اللہ تعالیٰ کی صحیح محبت کی شراب تقسیم کی جاتی ہو اور اُس کے راستے کے غم اُٹھانے کی لذتیں میسر آتی ہوں وہاں جا کر شریک ہو جاؤ اور اُس شرابِ محبتِ خداوندی سے جتنا جی چاہے اُتنا پی لو اور جو بھی حق تعالیٰ کی جائز کردہ خوشیاں اور لذتیں ہیں اُن میں دل کھول کر اپنے ارمان نکال لو لیکن جیسے ہی حرام سامنے آئے تو اُس سے فوراً پیچھے ہٹ جاؤ اور یہ فیصلہ کر لو کہ کسی حرام لذت اور خوشی کی شراب کو پینا گوارا نہ کروں گا چاہے جان جاتی رہے۔

اور اس فیصلے کو عملی جامہ پہنانے اور شب و روز اللہ تعالیٰ کی محبت میں گزارنے کے واسطے یہ بات ضروری ہے کہ تم کچھ اللہ والوں کے ساتھ رابطہ پیدا کرو اور اُن کے ساتھ اپنے رات و دن گزارو تو تم دیکھ لوگے کہ پھر اس راستے کی آسانی ہی نہیں بلکہ لذتوں سے لطف اُٹھاؤ گے اور بڑی خوبی سے تمہاری دنیاوی زندگی دین پر پابندی کے ساتھ گزر جائے گی مگر شرط یہی ہے کہ تمہیں اللہ تعالیٰ کے کچھ سچے عاشق حسرت بھرے دل لیے ہوئے نصیب ہو جائیں اور اُن کا ساتھ میسر آ جائے اور بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت والا کی یہ تمنا خود حضرت والا اور میر صاحب اور دوسرے متعلقین کے حق میں منجانب اللہ قبول ہوئی ہے کہ ہر وقت حسرت بھرے دل لیے ہوئے اللہ تعالیٰ کی محبت کے طلبگار عشاقِ خداوندی ہر وقت حضرت والا کے ساتھ نظر آتے ہیں اور سب مل کر اللہ تعالیٰ کی محبت وعظمت کے ترانے گاتے رہتے ہیں۔ جیسا کہ اس شعر میں حضرت کی یہی تمنا ہے ؎

سارے عالم کو مجنوں بنا کر
میرے مولا تیرے گیت گائیں

مقامِ مؤمن

یہ زمین و آسمان شمس و قمر
میری خاطر ہے جہانِ بحر و بر
ہے میرے ہی واسطے ان کا وجود
میں نہ ہوں گا ہوں گے یہ زیر و زبر

میر رکھا ہے کیا نظاروں میں

میر آؤ بھی گلعذاروں میں ہے کہاں چین بے قراروں میں
اِک حسیں ہو تو دل اسے دے دوں سخت مشکل ہے ان ہزاروں میں
خونِ ارماں سے قلب رنگیں کر میر رکھا ہے کیا نظاروں میں
ایک پل کو سکوں نہیں ملتا دیکھ بلبل کو ان بہاروں میں
اپنے قلب و نظر بچا لینا کون جیتا ہے ان سہاروں میں
دل خدا پر فدا کرو اختر کچھ نہیں عارضی بہاروں میں

حسن فانی کے عاشق کو حرم میں بھی سکون نہیں ملتا

میر آؤ بھی گلعذاروں میں
ہے کہاں چین بے قراروں میں
اِک حسیں ہو تو دل اسے دے دوں
سخت مشکل ہے ان ہزاروں میں
خونِ ارماں سے قلب رنگیں کر
میر رکھا ہے کیا نظاروں میں
ایک پل کو سکوں نہیں ملتا
دیکھ بلبل کو ان بہاروں میں
اپنے قلب و نظر بچا لینا
کون جیتا ہے ان سہاروں میں
دل خدا پر فدا کرو اختر
کچھ نہیں عارضی بہاروں میں

اس نظم کے اشعار کا مضمون بھی تقریباً حضرت والا کے باقی نظموں کے اشعار کے مفہوم کی طرح ہے۔ ارشاد فرما رہے ہیں کہ اے میرا! یعنی اے مردِ مؤمن و مسلم اور اے اللہ کے چاہنے والے! اور دین پر چلنے کا شوق رکھنے والے! اگر تجھے دنیا و آخرت کا قرار اور سکون چاہیے تو گلعذاروں یعنی اللہ والوں میں آ جا اور ایک ذاتِ وحدہ لاشریک لہ کو دل دے دے۔ اپنے سب ناجائز ارمانوں کا خون کر کے اپنے قلب کو خون میں رنگ دے کیونکہ ان مردہ حسینوں کو دل دینے میں اس پہلو سے بھی سخت مشکل کا سامنا ہوتا ہے کہ آج کسی ایک حسین و حسینہ پر فریفتہ اور عاشق ہوئے تو کل کو دوسرے رنگ و شکل والا سامنے ہوتا ہے اور پھر اگلے دن ایک تیسرا سامنے ہوتا ہے۔ غرض یہ کہ اسی طرح شکلوں کا عاشق ان ہزاروں مختلف شکلوں میں پریشان ہوتا رہتا ہے۔ اور اُن کے نظارے کر کے اپنے دل و دماغ کو بے چین کر کے رکھ دیتا ہے۔ اسے ایک لمحہ سکون میسر نہیں آتا۔

حضرت والا کے اس شعر کی پوری تشریح سمجھنی ہو تو حرمین میں جا کر ایسے شخص کے حالات کا پتہ لگایا جائے کہ جو وہاں پہنچ کر بھی بیت اللہ کے سامنے بیٹھے ہونے کے باوجود دنیا بھر سے آنے والی مختلف رنگ و شکل کی حسین و جمیل عورتوں کے حسن و جمال کا مشاہدہ کرتا رہتا ہے۔ اور وہ اس قدر بے چین ہو جاتا ہے کہ نہ اُس کا عبادت اور تلاوت میں دل لگتا ہے اور نہ ذکر و مناجات سے لذت حاصل ہوتی ہے۔ جیسا کہ بعض حضرات نے حضرت والا کو خطوط لکھ کر اپنی اس بیماری کا علاج کرایا اور شفایاب ہونے کے بعد اُن کے دل کو ایسا سکون و قرار میسر آیا اور ایسی بہار ملی جسے بہارِ بے خزاں کہا جا سکتا ہے۔ بلبل کو موسمِ بہار میں عارضی بہار اور خوشی مل جاتی ہے لیکن وہ بچاری موسمِ خزاں آتے ہی اُس بہار کے جانے سے اور اُس کو دل دینے کی وجہ سے ہونے والی تکلیف کی بدولت روتی پھرتی اور آنسو بہاتی ہے۔ یہی حال اُس شخص کا ہوتا ہے جو اپنی نظر نہیں بچاتا اور اِدھر اُدھر نظریں ڈالتا پھرتا ہے اور ایک کو دل میں بسانے کے بجائے ہزاروں شکلوں کی طرف للچاتا رہتا ہے۔

غور سے سن لیجئے! یہ دنیا کے سارے سہارے چاہے وہ معشوق و معشوقہ کے ہوں یا مال و دولت کے ہوں ایک دن سب چھوٹ جائیں گے۔ یہ سب عارضی اور فانی ہیں، لہٰذا اللہ تعالیٰ پہ دل دینا چاہیے اور اسی پر فدا ہونا چاہیے کہ اُسے کبھی فنا لاحق نہیں ہوتی۔ جو دنیا کی عارضی رنگت و چمک دمک پر دل دیتا ہے تو جب مرتے وقت میں وہ سب سہارے اُسے چھوٹتے نظر آتے ہیں جن پر وہ سہارا لگائے ہوئے تھا تو پھر اُس کی پریشانی کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔ بالکل وہی بلبل والا حال اُس کا ہوتا ہے۔ جیسا کہ حضرت والا کے اس شعر میں اس کی ترجمانی ہے ؎

درسِ عبرت ہے چشمِ عنادل
کس طرح نم ہے غم سے خزاں میں

لبِ دریا ہے کوہ کا دامن

جو حسیں کل تھے رونقِ گلشن لگ رہے ہیں وہ آج دشت و دمن

میں فدا قلب و جان سے اُن پر ہوں جن کی صحبت سے دل ہوا روشن

رب ہے کافی میری حفاظت کو لاکھ چاہے بُرا اگر دُشمن

کر حفاظت نظر کی اے ظالم کر نہ ویراں قلب کا گلشن

حسن فانی ہے گر نہ مانے تو حسن کو جا کے دیکھ درِ مدفن

یاد ان کی ہے چشم بھی ہے نم لبِ دریا ہے کوہ کا دامن

مری قسمت کا میر کیا کہنا ہاتھ میں گر نبی کا ہو دامن

راہِ حق کا ہر ایک خار اخترؔ رشکِ ریحان و سنبل و سوسن

مشکل الفاظ کے معانی:۔ رونقِ گلشن: باغ کی رونق۔ دشت: جنگل۔ دمن: کوڑا پھینکنے کی جگہ۔ دامن: اتباع سنت مراد ہے۔ خار: کانٹا۔ ریحان و سنبل و سوسن: پھولوں کے نام ہیں۔

آج رونقِ گلشن چہرے کل ننگِ دشت و دمن ہو جائیں گے

جو حسیں کل تھے رونقِ گلشن
لگ رہے ہیں وہ آج دشت و دمن
میں فدا قلب و جان سے اُن پر ہوں
جن کی صحبت سے دل ہوا روشن
رب ہے کافی میری حفاظت کو
لاکھ چاہے بُرا اگر دُشمن
کر حفاظت نظر کی اے ظالم
کر نہ ویراں قلب کا گلشن
حسن فانی ہے گر نہ مانے تو
حسن کو جا کے دیکھ درِ مدفن

ان تمام اشعار میں حضرت والا اُسی مہلک بیماری اور وبائی مرض کی طرف اشارہ فرما رہے ہیں اور اُس کے نقصانات بھی بیان فرما رہے ہیں۔ خاص طور پر یہ حسین اور خوبصورت چہرے جو کل تک رونقِ گلشن نظر آتے ہیں چند

دن گزرنے کے بعد جنگل کی جھاڑیوں اور کوڑے کرکٹ کے ڈھیر کی طرح بے حیثیت ہو جاتے ہیں جن کی طرف کسی کو کوئی التفات نہیں رہتا۔

اس کے برخلاف وہ اللہ کے نیک صالح بندے کہ جن کے قلوب ایسے منور اور روشن ہوتے ہیں کہ ان کی صحبت میں بیٹھنے والے اور ان کے ساتھ خاص استفادے کا تعلق رکھنے والے لوگ اپنے دل میں ایک خاص جلا اور روشنی پاتے ہیں اور ان کی صحبت تاریک دلوں کے لیے اجالے اور روشنی کا کام دیتی ہے ایسے لوگوں سے دوستی رکھنا اور ان پر فدا ہونا سمجھداری اور عقل مندی کی نشانی ہے کہ ان کی بہار کبھی خزاں کا شکار نہیں ہوتی اور ان کے چمکتے چہرے دشت و دمن کے مانند نہیں ہوتے بلکہ دن بدن ان کے چہرے کی ضیاء اور تابانی بڑھتی جاتی ہے۔

ہاں کبھی ایسی صورت پیش آ جاتی ہے کہ ان اولیاء اللہ کے ساتھ رہنے کی صورت میں جب ان کی نظرِ عنایت اور نظرِ التفات زیادہ پڑنے لگتی ہے تو بعض حاسدین دشمن وہاں سے ہٹانے اور اولیاء اللہ سے دور کرنے کے لیے کوششوں میں لگ جاتے ہیں جیسا کہ حضرت والا کے ساتھ اس طرح کی باتیں پیش آئی تھیں لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی کی حفاظت فرمائیں تو پھر کسی بڑے سے بڑے دشمن کی دشمنی نقصان نہیں پہنچا سکتی قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے اعلان فرمایا ہے ''الیس اللہ بکاف عبدہ'' کہ کیا اللہ اپنے بندے کو کافی نہیں یعنی ضرور بضرور تن تنہا اللہ اپنے بندے کو کافی ہے اور حدیث شریف میں آیا ہے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر ساری امت کسی ایسی چیز سے نقصان پہچانے پر جمع ہو جائے جو اللہ نے تمہارے لیے مقدر نہیں کی ہے تو وہ نقصان نہیں پہنچا سکتی اور اگر ساری امت کسی ایسی چیز سے نفع پہنچانے پر اکھٹی ہو جائے جو اللہ نے تمہارے لیے مقرر نہیں فرمائی تو وہ نفع نہیں پہنچا سکتی:

﴿وَلَوِ اجْتَمَعُوْا عَلٰی اَنْ یَّضُرُّوْکَ بِشَیْءٍ لَمْ یَضُرُّوْکَ اِلَّا بِشَیْءٍ قَدْ کَتَبَهُ اللّٰهُ عَلَیْکَ﴾

(سنن الترمذی، کتاب صفۃ القیامۃ)

اور قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا لَا یَضُرُّکُمْ کَیْدُهُمْ شَیْئًا﴾

(سورۃ آل عمران، آیت: ۱۲۰)

ترجمہ: کہ اگر تم صبر اور تقویٰ اختیار کرو گے تو دشمنوں کی سازش تم کو کچھ بھی نقصان نہیں پہنچا سکے گی اس لیے آدمی کو دشمنوں کی دشمنی اور حاسدین کے حسد سے ڈرنا نہیں چاہیے۔

اس کے بعد حضرت والا وہی بات ارشاد فرماتے ہیں کہ اپنی نظر کی حفاظت کر لو ورنہ دل کا گلشن ویران ہو جائے گا اور حسن فانی پر اپنا دل دینے سے سوائے حسرت و افسوس کے کچھ حاصل نہیں ہوگا کیونکہ اس کا انجام ایک دن قبر میں جا کر دفن ہو جانا اور مٹ کر فنا ہو جانا ہے۔

راہِ حق کے کانٹے رشکِ ریحان و سنبل ہیں

یاد ان کی ہے چشم بھی ہے نم
لب دریا ہے کوہ کا دامن
مری قسمت کا میر کیا کہنا
ہاتھ میں گر نبی کا ہو دامن
راہ حق کا ہر ایک خار اختر
رشک ریحان و سنبل و سوسن

یعنی میں اللہ تعالیٰ کو یاد کرنے کے لیے ایسی جگہوں کا انتخاب کرتا ہوں کہ جیسا دریا کے کنارے پر کسی پہاڑ کے دامن میں بیٹھ کر تمام دنیا کے علائق اور روابط سے یکسو ہو کر ایسی فضاؤں میں اللہ کو پکارنا اور وہاں آنکھوں کو آنسوؤں سے تر کرنا کہ گویا خلوت و یکسوئی اس درجہ نصیب ہو کہ غیر اللہ کے ساتھ دل کا کسی طرح کا کوئی تعلق ہی قائم نہ رہے جس کو حضرت والا نے اپنے ایک خاص انداز میں یوں ذکر فرمایا۔

خلوت غار حرا سے ہے طلوع خورشید
کیا سمجھتے ہو تم اے دوستو ویرانوں کو

اسی لیے اس طرح کے کلام کا منشا خلوت و یکسوئی کی پر فضا جگہیں جہاں اللہ تعالیٰ کے ساتھ پورے اخلاص اور حضوری کو لیے ہوئے عبادت کی جائے اور اسے یاد کیا جائے اور کبھی کبھی حضرت والا ایسے مقام پر باقاعدہ تشریف لے جایا کرتے تھے۔

لیکن اس سے کوئی شخص اس غلط فہمی کا شکار نہ ہو جائے کہ اسلام میں رہبانیت نہیں ہے پھر ایسے طریقوں کو اختیار کرنا ایک مسلمان کے لیے کس طرح درست ہوسکتا ہے کیونکہ یہاں رہبانیت سے وہ عیسائیوں والی رہبانیت مراد نہیں ہے بلکہ ایسی تنہائی، خلوت و یکسوئی ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقوں کی اتباع کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دامن کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے اختیار کی جائے یعنی جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اپنے گھر والوں اور متعلقہ افراد کے جملہ حقوق اور ضروریات پوری کرتے ہوئے گاہ بگاہ ایسی جگہوں پر جا کر اپنے اللہ کو یاد کرنا یہ نہ رہبانیت ہے اور نہ اسلام میں ممنوع ہے بلکہ ایسا شخص خوش قسمت اور خوش نصیب ہے جو اپنی خلوتوں اور جلوتوں میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کو لیے ہوئے ہو اور دین کے راستے پر مضبوطی سے گامزن ہو اور اس کی ہر مشقت و تکلیف کو آسانی کے ساتھ برداشت کرتا ہوا یہ راستہ طے کر رہا ہو اگرچہ راستے میں کانٹوں سے بھی گزرنا پڑے لیکن

انہیں بھی وہ پھول سمجھ کر گوارا کر جاتا ہو کیونکہ یہ ایک سچی حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دین کے راستے کا ہر کانٹا دنیا کے مختلف قسم کے پھولوں کے لیے باعثِ رشک ہے یہاں تک کہ راہِ حق کا وہ خار رشکِ ریحان و سنبل و سوسن ہو جاتا ہے کیونکہ ان کانٹوں سے گزر کر جنت کی ابدی اور ہمیشہ باقی رہنے والی خوشیوں کو پالینا میسر ہوتا ہے جب کہ ان پھولوں کی خوشبو اور رونق اور ان کی آب و تاب محض ایک وقتی اور عارضی ہوتی ہے جو موسم کے بدلنے کے ساتھ بدل جاتی ہے جیسا کہ حضرت والا کے اسی نظم سے متصل یہ دو شعر ہیں ؎

جہانِ رنگ و بو میں رنگ گوناگوں کا منظر تھا
مگر ہر اہلِ رنگ و بو کا حال رنگ ابتر تھا
نظامِ رنگ و بو سے ہو کے جو ما فوق جیتا تھا
اسی مست خدا کا رنگ ہر دم رنگ خوشتر تھا

اس لیے جو سمجھ دار انسان ہے وہ اللہ کے راستے کی تکلیفوں کو راحت سمجھ کر برداشت کر جاتا ہے اور اس کے تلخ اور کڑوے گھونٹوں کو شیر و شکر کی طرح پی جاتا ہے کیونکہ اس کی انجام پر نظر ہوتی ہے اسی لیے حسینوں سے نظریں بچانے میں بھی کتنے ہی کانٹوں سے گزرنا پڑے اور کیسے ہی دل پر صدمے اٹھانے پڑیں مگر اللہ کے سچے عاشق کے لیے یہ سب کچھ بالکل آسان اور سہل ہو جاتا ہے بلکہ حق تو یہ ہے کہ لذیذ اور لذیذ تر بن جاتا ہے ؎

خوشی کو آگ لگا دی خوشی خوشی ہم نے
خوشا نصیب کسی کا ملا ہمیں غم ہے

اور حضرت والا کا اسی مضمون پر دوسرا ایک شعر ؎

نفس کے گندے تقاضوں سے جو ان بن ہو گئی
روح میری سنبل و ریحان و سوسن ہو گئی

مبارک مجھے میری ویرانیاں ہیں

زباں سے تو اے دوست شہبازیاں ہیں
بہ باطن مگر آہ خفاشیاں ہیں

حقارت سے مت دیکھ ان عاصیوں کو
کہ توبہ کی برکت سے درباریاں ہیں

جو پرہیز کرتا نہیں معصیت سے
انہیں راہ میں سخت دشواریاں ہیں

گناہوں کے اسباب سے دور ہو گے
تو منزل میں ہر وقت آسانیاں ہیں

دوائے دل سالکاں عشق حق
دلوں میں بہت گرچہ بیماریاں ہیں

رہ حق میں ہر غم سے کیوں ہے گریزاں
رہ عشق میں کب تن آسانیاں ہیں

یہ خون تمنا کا انعام دیکھو
جو ویرانیاں تھیں وہ آبادیاں ہیں

فدا ان کی مرضی پہ اپنی رضا کر
فقیری میں دیکھے گا سلطانیاں ہیں

ترے ہاتھ سے زیر تعمیر ہوں میں
مبارک مجھے میری ویرانیاں ہیں

جو پیتا ہے ہر وقت خون تمنا
اسی دل پہ نسبت کی تابانیاں ہیں

تجلی ہر ایک دل کی اختر الگ ہے
مہربانیاں، جیسی قربانیاں ہیں

مشکل الفاظ کے معانی: **شہبازیاں**: نفس اور شیطان۔ **باطن**: مراد دل ہے۔ **خفاشیاں**: چمگادڑ جیسی خصلتیں۔ **عاصیوں**: گنہگار۔ **معصیت**: گناہ۔ **راہ**: اللہ تعالیٰ کا راستہ۔ **سالکاں**: اللہ تعالیٰ کا راستہ طے کرنے والا۔ **گریزاں**: بچنا۔ **آسانیاں**: بدن کی راحتیں۔ **سلطانیاں**: بادشاہتیں۔ **تابانیاں**: روشنیاں۔ **تجلّی**: چمک، روشنی۔

ظاہر میں شاہبازیاں اور باطن میں خفاشیاں

زباں سے تو اے دوست شہبازیاں ہیں
بہ باطن مگر آہ خفاشیاں ہیں

قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا تَكْتُمُوْنَ﴾
(سورة المائدة، آيت: ۹۹)

اللہ تعالیٰ اس کو بھی جانتے ہیں جو تم ظاہر کرتے ہو اور اس کے بھی جانتے ہیں جسے تم چھپاتے ہو اور دوسرے مقام پر ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاِنَّ رَبَّكَ لَيَعْلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُوْرُهُمْ وَمَا يُعْلِنُوْنَ﴾
(سورة النمل، آيت: ۷۴)

بے شک آپ کا رب اس کو بھی جانتا ہے جس کو ان کے سینے چھپاتے ہیں اور اسے بھی جسے وہ ظاہر کرتے ہیں اس مضمون کی قرآن کریم میں مختلف آیتیں نازل ہوئی ہیں کہ تم جن چیزوں کو چھپاتے ہو وہ اللہ تعالیٰ کے لیے ویسی ہی ہیں جیسا کہ وہ چیزیں جن کو تم ظاہر کرتے ہو اور اللہ تعالیٰ کے لیے کوئی چھپی ہوئی چیز چھپی ہوئی نہیں اور کوئی مخفی اور پوشیدہ شے پوشیدہ نہیں ہے اس لیے انسان کے دل میں گزرنے والے خیالات اور اس کی دل کی دھڑکنوں میں آنے والی کوئی نقل وحرکت ہر ایک سے اللہ تعالیٰ بخوبی واقف ہوتے ہیں۔

پس وہ لوگ جو بظاہر زبان سے ایسی باتیں کرتے ہیں جن سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا عاشق ہے اور حی وقیوم ذات خداوندی پر فدا ہونے والا اور مر مٹنے والا ہے اور اپنے اندر شہباز کی خصلت رکھتا ہے کہ جس کا کام زندہ جانوروں پر گرنا اور ان کا شکار کرنا ہوتا ہے اور وہ مردار کی طرف قطعاً مائل نہیں ہوتا اور اپنی پرواز بلند رکھتا ہے اور اپنا شیوہ وعادت بلندی میں رہنے کو بنائے ہوئے ہوتا ہے۔

لیکن یہ لوگ اندر اندر سے بالکل اس سے مختلف ہوتے ہیں اور اپنے دل میں مردار کو رچائے اور بسائے رہتے ہیں اور ان پر گرتے ہیں اور انہیں کو اپنا دل دے کر خود اپنی تباہی اور بربادی کو دعوت دیتے ہیں اور اپنی چمگادڑ والی خصلت سے باز نہیں آتے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات عالی کی تجلیات اور انوارات سے اپنے قلب کو منور وروشن کرنے کے بجائے مردہ لاشوں پر مر کر اپنے دل کو ظلمت کدہ بنا دیتے ہیں اور پیشاب و پاخانے کے مقام پر اپنے دین و ایمان اور عقل و دماغ کو لگا کر ان کو گندگی اور غلاظت سے بھر دیتے ہیں جو کہ اللہ تعالیٰ کی پاکیزہ اور صاف شفاف ذات کے متجلی ہونے کا مقام ہے اور اس طرح اپنی روشنی اور اجالے کے دشمن بن کر ظلمت وتاریکی میں پڑ جانا پسند کرتے ہیں اگر یہ بات ظاہر ہے کہ محض زبانی جمع خرچ اور قیل وقال باطن کو منور اور روشن کرنے کے لیے کارآمد اور

کافی نہیں، ہیں بلکہ اصل یہ ہے کہ دل اللہ تعالیٰ کی محبت والفت کا مرکز ہو اور اس کو صرف حق تعالیٰ کے لیے سارے غیر سے خالی کرلیا گیا ہو تب کہیں جا کے شہبازی کا فن اور ہنر حاصل ہو سکتا ہے۔

عاصیوں کی تحقیر حرام ہے

حقارت سے مت دیکھ ان عاصیوں کو
کہ توبہ کی برکت سے درباریاں ہیں

خلاصہ شعر یہ ہے کہ کسی گناہگار پر ایک لمحہ کے لیے بھی حقارت کی نظر ڈالنا جائز نہیں اس لیے کے جس دم گناہگار کو توبہ کی توفیق مل جاتی ہے تو وہ اسی لحظہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ کا مقرب بندہ بن جاتا ہے اور حق تعالیٰ کی نگاہوں میں محبوب قرار پاتا ہے جب کہ دوسری جانب کتنا ہی بڑے سے بڑا عابد وزاہد انسان ہو وہ اپنے متعلق یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس کی عبادات اللہ کے یہاں قبول ہیں یا نہیں؟

ثانیاً وہ یقین سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں ان اعمال پر مرتے دم تک قائم رہ سکتا ہوں کیونکہ اس کا علم کسی کو نہیں۔

ثالثاً یہ بات کہ ممکن ہے اس گناہ گار کا کوئی عمل اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اتنا محبوب اور پسندیدہ ہو کہ وہ اس کی بخشش اور مغفرت کا سامان ہو جائے جب کہ اس کے برخلاف مجھ سے کوئی ایسا نامناسب اور غلط کام ہوا ہو جس کی وجہ سے میں اللہ کے دربار میں مستحق سزا اور عقاب قرار دیا جا چکا ہوں لہٰذا ایک مومن کے لیے جس کو حق تعالیٰ نے دین کی سمجھ عطا فرمائی ہے کسی بھی قیمت پر اپنے مسلمان گناہگار بھائی کو حقیر سمجھنا جائز نہیں ہے ہاں البتہ یہ الگ بات ہے کہ ان کو گناہوں اور معصیتوں پر نکیر ضرور کی جائے گی مگر بقول حضرت شاہ ہردوئی رحمہ اللہ کے منکر پر نکیر بلا تحقیر ہونی چاہیے بالفاظ دیگر یوں کہیے کہ اس عمل سے تو ناپسندیدگی ہو مگر عامل سے نہیں یعنی معصیت سے نفرت ہو عاصی سے نہیں ہونی چاہیے۔ باقی توبہ کے عنوان پر مختلف دوسرے مقامات پر آیات وآحادیث ذکر کی جا چکی ہیں۔

معصیتوں سے راہ میں دشواریاں ہوتی ہیں

جو پرہیز کرتا نہیں معصیت سے
انہیں راہ میں سخت دشواریاں ہیں
گناہوں کے اسباب سے دور ہو گے
تو منزل میں ہر وقت آسانیاں ہیں

صاحبو! کسی کے پاس کتنا ہی بڑا شیخ اور مرشد ہو اور وہ کیسا ہی خانقاہوں اور تبلیغ میں چلے لگا رہا ہو لیکن اگر وہ گناہوں اور گناہوں کے مقدمات واسباب سے پرہیز نہیں کرے گا تو اسے منزل تک پہنچنے کے لیے راستے میں

سخت دشواریوں کا سامنا ہوگا ہاں اگر گناہوں سے بچا جائے اور گناہوں کے اسباب سے بھی دور رہا جائے تو پھر بڑی آسانی سے بہت جلد یہ راستہ طے ہو جاتا ہے اور سالک اپنی منزل مقصود یعنی اللہ کا قرب پالیتا ہے۔

کئی لوگ ایسے دیکھے جاتے ہیں کہ جو پوری زندگی دین دار کہلاتے رہتے ہیں اور دین کی محنتوں میں ہر وقت بہت آگے نظر آتے ہیں لیکن ان کی گھر بار کی زندگی مختلف قسم کے گناہوں میں گھری ہوتی ہے تو وہ دین کے اعتبار سے جہاں شروع میں تھے وہاں کے وہاں رہتے ہیں اور آئے دن مصائب اور حوادث اور ذہنی الجھنوں اور پریشانیوں کا شکار ہوتے رہتے ہیں کیونکہ اللہ کی نافرمانیوں کے وجود میں آنے کے سبب وہ اپنے اوپر خصوصی رحمت خداوندی کے نزول سے مانع اور رکاوٹ بن جاتے ہیں اور بسا اوقات ان کی یہ پریشانی حد سے بڑھ کر دین میں شکوک وشبہات کا سبب بن جاتی ہے۔

اس لیے میرے بھائیو! میری یہ نصیحت کبھی نہ بھولنا کہ قرآن کریم کے بالکل شروع سے لے کر اخیر تک ایک یا دو جگہ نہیں بلکہ بہت بڑی تعداد میں ہمارے دنیا وآخرت کے جملہ مسائل کا حل پیش کرنے والی آیات نازل ہوئی ہیں اور ان سب کی جڑ تقویٰ قرار دیا گیا ہے اور یہ خوب سمجھ لینا چاہیے کہ تقویٰ کی بنیاد اللہ تعالیٰ کی ہر قسم کی نافرمانی اور گناہ سے بچنے پر ہے خواہ زیادہ نوافل اور مستحبات نہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں دین کی صحیح سمجھ عطا فرمائے، آمین۔

عشق حق دوائے دل سالکاں ہے

حق عشق سالکاں دل دوائے
ہیں بیماریاں گرچہ بہت میں دلوں

یہ حضرت مولانا رومی والا طریق ہے کہ اگر کسی جنگل کو قابلِ کاشت بنانا ہو تو بجائے اس کے کہ ایک ایک جھاڑی اور درخت کو اکھاڑ کر صاف کیا جائے اور پھر قابل کاشت بنایا جائے زیادہ بہتر صورت یہ ہے کہ جنگل میں آگ لگا دو یہاں تک کہ سب جھاڑ جھنکاڑ جل کر راکھ ہو جائیں، اس طریقہ میں زیادہ محنت بھی خرچ نہیں ہوگی اور راکھ کھاد کا کام بھی دے گی۔

ٹھیک اسی طرح جن کے دلوں میں بہت سی بیماریاں ہیں اگر ان کو ایک ایک کرکے نکالنا شروع کیا جائے تو اس کے لیے بڑی محنت ومشقت اٹھانی پڑے گی اس لیے عمدہ اور بہتر صورت یہ ہے کہ دل میں اللہ کی محبت کی آگ لگا دو تا کہ سب بیماریاں اس آگ میں جل کر راکھ ہو جائیں اور کھاد کا کام بھی دیں جس کی صورت یہ ہوگی کہ جب دل میں حق تعالیٰ کی محبت پیدا ہوگی تو کل تک جس دنیوی معشوق کے لیے تڑپتا تھا اور اس کے لیے غم اٹھاتا تھا آج اس کا اِمالہ ہو جانے اور رخ پھر جانے کی صورت میں اپنے محبوبِ حقیقی اللہ رب العزت کی ذات کے لیے

راتوں کو اٹھ کر روئے گا اور تڑپے گا اور اس کو راضی کرنے کے لیے اس کی راہ کے غم برداشت کرے گا۔ اس لیے حضرت والا فرماتے ہیں کہ سالکین کے دلوں کی سب سے بہترین دوا اللہ تعالیٰ کا عشق ہے جس کی بدولت دل کی ساری بیماریاں بہت جلد آسانی کے ساتھ ختم ہو جاتی ہیں۔

میری ویرانیاں ہی میری آبادیاں ہیں

فدا ان کی مرضی پہ اپنی رضا کر
فقیری میں دیکھے گا سلطانیاں ہیں
ترے ہاتھ سے زیرِ تعمیر ہوں میں
مبارک مجھے میری ویرانیاں ہیں
جو پیتا ہے ہر وقت خونِ تمنا
اسی دل پہ نسبت کی تابانیاں ہیں
تجلی ہر ایک دل کی اختر الگ ہے
مہربانیاں، جیسی قربانیاں ہیں

دنیائے عشق و محبت کا یہ اصول اور ضابطہ ہے کہ اس میں بڑے ناز اٹھانے پڑتے ہیں اور محبوب کے قرب کو حاصل کرنے کے لیے بہت سے غموں کا بوجھ اٹھانا پڑتا ہے، تن آسانی کے ساتھ عشق کا راستہ کبھی طے نہیں ہوتا۔ پس وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ کے حقیقی عشاق بننا چاہتے ہیں ان کو حق تعالیٰ کے راستے کے غم اٹھانے پڑیں گے اور اپنی دنیوی ناجائز اور حرام تمناؤں کا خون کرنا پڑے گا کیونکہ اس کے نتیجے میں دل ٹوٹ کر چورا ہو جائے گا اور دنیا کا بھی یہ ضابطہ ہے کہ جو گھر گر جاتا ہے یا بستیاں ویران ہو جاتی ہیں تو پھر ان کو نئے سرے سے جدید نقشوں کے ساتھ نہایت عمدہ اور اچھے انداز میں تعمیر کیا جاتا ہے اور وہی جو کل تک ویرانیاں تھی اب آبادیوں کی شکل میں نظر آتی ہیں۔

پس وہ دل جس کو کسی نے اللہ کے لیے توڑا ہو اور وہ اللہ کے لیے ویران ہوا ہو اور اس کے در و دیوار ٹوٹ ٹوٹ کے چورا چورا ہو چکے ہوں تو پھر حق تعالیٰ شہنشاہِ کائنات اسے اپنے خاص دست کرم و عنایت سے اپنی شایانِ شان تعمیر فرماتے ہیں اور اسے اس قابل بناتے ہیں کہ اس میں پھر اللہ تعالیٰ سما سکے اور اپنی تجلیات خاصہ کے ساتھ متجلی ہو سکے جس کی بدولت اس مردِ مومن کو اللہ تعالیٰ پر فدا ہونے اور اپنا دل توڑنے کے نتیجے میں خدا تعالیٰ مل جاتے ہیں اور ظاہر ہے کہ جسے خدا مل جائے تو پھر اس کے متعلق یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اس کی فقیری میں بھی بادشاہی کا مزہ نصیب ہوگا اور اس کی نگاہ میں دنیا کی ظاہری سلطنت و حکومت کی کوئی وقعت اور اہمیت نہ رہے گی۔

اسی کو حضرت والا نے بڑی عمدہ مثال سے یوں سمجھایا کہ اگر کبھی کسی ملک میں کوئی آسمانی آفت آجانے کی وجہ سے کسی گاؤں یا شہر کے کچھ مکانات گر گئے ہوں تو حکومتِ وقت کی طرف سے یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ ہم ان گرے ہوئے مکانوں کی تعمیر شاہی خزانے سے کرائیں گے لہٰذا وہ دل جس کو بندۂ مومن اللہ تعالیٰ کی خوشی کے لیے توڑ رہا ہو یعنی کہ دل کے ناجائز ارمانوں اور حرام تمناؤں کو پورا نہ کر کے اس کا خون کر رہا ہو تو پھر اللہ تبارک وتعالیٰ اس ٹوٹے ہوئے دل میں خود اپنی شان کے مطابق موجود ہو جاتے ہیں جیسا کہ روایت میں ہے:

﴿اَنَا عِنْدَ الْمُنْكَسِرَةِ قُلُوْبُهُمْ لِاَجْلِیْ﴾

(المرقاة، كتاب الجنائز، باب عيادة المريض)

کہ میں ٹوٹے ہوئے دلوں کے پاس ہوتا ہوں۔

اس لیے مسلمانوں کو اور بالخصوص سالکین کو دل توڑ دینے والی چیزوں سے کبھی گھبرانا نہیں چاہیے مثلاً کسی کی طرف سے طعن وتشنیع ہو یا دین کی بنیاد پر ملامت کا سامنا ہو اور نفرت وحقارت کا سلوک ہو یا اپنی نظر اور دل بچانے میں اور حسین شکلوں کو بازاروں اور ٹی وی، وی سی آر اور انٹرنیٹ وغیرہ پر نہ دیکھنے سے جتنا بھی دل پر زور پڑے اسے گوارا کر لینا چاہیے اور خوش ہونا چاہیے کہ اس کی بدولت مجھے میرے خالق ومالک کی رضا حاصل ہو رہی ہے کیونکہ جو جس قدر خونِ آرزو پیتا ہے اسے اتنی ہی نسبتِ خداوندی میں جلا اور روشنی نصیب ہوتی ہے اور قرب ومعرفتِ خداوندی کا خاص مقام ملتا ہے اور ایمان میں عجیب قسم کی حلاوت ومٹھاس نصیب ہوتی ہے جس کو الفاظ میں بیان نہیں کیا جاسکتا صرف جو چکھنے والا ہے وہی اس کی کیفیت کا صحیح ادراک کرسکتا ہے۔ جیسا کہ عربی کا مشہور مقولہ ہے: ''مَنْ لَّمْ يَذُقْ لَمْ يَدْرِ'' کہ جو نہ چکھے وہ نہ جان سکے گا۔

یہی وجہ ہے کہ خود اہل اللہ کے مقاماتِ قرب جدا جدا ہوتے ہیں کیونکہ جیسی جس کی قربانیاں اور مجاہدات ہوتے ہیں ویسی ہی حق تعالیٰ کی طرف سے مہربانیاں اور انعامات عطا کیے جاتے ہیں یہی تو راز ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کا کہ لوگوں میں سب سے زیادہ آزمائش انبیاء کی ہوتی ہے اور پھر جو ان سے جتنا قریب ہو درجہ بدرجہ معاملہ ہوتا ہے اسی کو حضرت والا نے یوں فرمایا کہ ہر ایک دل کی تجلی اور قرب جدا جدا ہے کیونکہ جیسی جس نے قربانیاں پیش کی ہیں ویسی اسے اللہ کی طرف سے مہربانیاں حاصل ہوئی ہیں۔

مگر اس موقع پر ہرگز یہ دھوکہ نہیں کھانا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی مہربانیاں ہماری قربانیوں کا نتیجہ ہے کیونکہ پورے عالم میں جس بندے کو بھی جو کچھ خیر وخوبی اور نیکی وبھلائی حاصل ہو رہی ہے قرآن وسنت کی روشنی میں صرف اسے اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم کی طرف ہی منسوب کیا جانا صحیح اور درست ہے اور وجہ یہ ہے کہ خود وہ قربانیاں بھی تو اللہ تعالیٰ کی مہربانی ہی کا نتیجہ ہے کیونکہ اسی کی توفیق سے انسان کو دین پر استقامت اور جمنا نصیب ہوتا ہے اور مجاہدات

کی ہمت عطا ہوتی ہے ورنہ اگر فضل الٰہی شامل نہ ہوتو ہمارے بس میں ایک معمولی سی نیکی کرنا بھی نہیں ہے اس لیے یہ جملہ محض سبب کے درجے میں سنتُ اللہ کا بیان ہے یعنی جسے اللہ تعالیٰ دنیا میں قربانیاں پیش کرنے کی توفیق دے دیتے ہیں پھر اسی پر اللہ کی مہربانیاں بھی اترتی ہیں۔

جیسا کہ احقر کو حضرت شاہ عبدالقادر جیلانی کا واقعہ یاد آیا کہ ایک دن شیطان ان کو بہکانے کے لیے آیا اوران سے یوں کہا کہ تم ہماری بارگاہ میں مقرب اور محبوب قرار پا چکے ہو اس لیے اب تم سے تمام عبادات معاف کر دی گئیں ہیں، تو وہ فوراً بولے، کہ مردود یہاں سے دور ہوجا، جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے تاحیات عبادات معاف نہیں کی گئیں تو مجھ سے کیسے معاف کردی گئیں اس پر شیطان بولا، کہ جا عبدالقادر تمہیں تمہارے علم نے بچالیا، تو شاہ عبدالقادر بولے کہ مردود جاتے جاتے بھی مجھے بہکانا چاہتا ہے کون کہتا ہے کہ مجھے میرے علم نے بچایا میرے اللہ کے فضل نے مجھے بچایا ہے اوراس طرح شیطان ناکام ہوگیا۔

اس لیے جو بھی خیر وجود میں آئے اس سب کی نسبت حقیقی معنیٰ کے لحاظ سے صرف اللہ کے فضل کی جانب کی جانی چاہیے چنانچہ حضرت والا کی کتابوں میں بحوالہ یہ بات موجود ہے کہ:

﴿اِنَّ بَعْضَ الْمُغْتَرِّیْنَ مِنَ الصُّوْفِیَآءِ وَالسَّالِکِیْنَ یَنْسِبُوْنَ کَمَالَاتِھِمْ اِلٰی مُجَاھَدَاتِھِمْ فَھٰذَا عَیْنُ الْکُفْرَانِ﴾

(بیان القرآن، مسائل السلوک)

جو بعض سالکین اپنے کمالات کو اپنے مجاہدات کی طرف منسوب کرتے ہیں یہ عین اللہ کی نعمت کی ناشکری ہے۔

زمیں کو کام ہے کچھ آسماں سے

کیا ہے رابطہ آہ و فغاں سے
زمیں کو کام ہے کچھ آسماں سے

ندامت تجھ پہ ہو رحمت خدا کی
دلا دی مغفرت ربِ جہاں سے

تو کرلے خوش خدائے گلستاں کو
نہیں پالا پڑے گا پھر خزاں سے

وہ چھا جاتا ہے ہر اہلِ لغت پر
بیاں کرتا ہے جو دردِ نہاں سے

اگر مطلوب ہے دردِ محبت
تعلق کر گروہ عاشقاں سے

ہزاروں غم اٹھا کر جانِ سالک
مقرب ہو گئی مولائے جاں سے

سنو پیغامِ اختر گوشِ دل سے
فدا ہو تم خدا پر قلب و جاں سے

مشکل الفاظ کے معانی:۔ **اہلِ لغت**: زبان کا ماہر۔ **دردِ نہاں**: اللہ تعالیٰ کی محبت کے درد کے ساتھ۔ **مطلوب**: چاہت۔ **گروہِ عاشقاں**: اللہ والوں کا طبقہ۔ **سالک**: اللہ تعالیٰ کا راستہ طے کرنے والا۔ **مقرب**: قریب۔ **مولائے جاں**: اللہ تعالیٰ۔ **گوشِ دل سے**: دل کے کان سے۔

اس نظم کے اشعار کے مضامین قدرے مشترک ما قابل میں ذکر کردہ مضامین سے ملتے جلتے ہیں۔ چنانچہ حضرت والا ارشاد فرماتے ہیں کہ جب بندۂ مؤمن اللہ تعالیٰ کی یاد میں زمین پر رہتے ہوئے آہ وفغاں کرتا ہے تو اس کا رابطہ آسمان سے جڑ جاتا ہے۔ اور اس سے بھی آگے یہ کہیے کہ عرش تک پہنچ جاتا ہے اور درمیان کے جتنے حجابات اور پردے ہیں وہ اس کے درمیان سے اور اللہ کے درمیان سے اُٹھا دیئے جاتے ہیں۔ اسی کو حضرت والا نے بعض مقامات پر اس طرح ارشاد فرمایا کہ یہ زمین رشکِ آسمان بن جاتی ہے۔ کیونکہ آسمان میں ستارے سجے ہوئے ہیں اور یہ زمین ندامت کے آنسوؤں سے مزین ہوتی ہے۔ جن کی قیمت آسمان کے ستاروں سے کہیں بڑھ کر ہے۔ اسی طرح یہ زمین ندامت کے آنسوؤں سے لبریز ہوتی ہے اور آسمان میں ملائکہ اور فرشتے گو کہ عبادت کرتے ہیں مگر ندامت کے آنسوؤں کے خزانے سے آسمان خالی ہے۔ یہ ایسا قیمتی موتی ہے جو صرف زمین کے پاس ہے، آسمان کے نہیں۔ بہر حال یہ آہ وفغاں انسان کو عالمِ بالا سے جوڑ دیتی ہے اور اس طرح زمین پر رہتے ہوئے بندۂ مؤمن آسمانوں کی رفعتوں اور بلندیوں میں پہنچ جاتا ہے۔

اس کے بعد حضرت والا فرماتے ہیں کہ میری گناہوں پر حاصل ہونے والی ندامت کس قدر قیمتی چیز ہے کہ اُس کی برکت سے ربِ جہاں سے مغفرت کا تحفہ حاصل ہوتا ہے۔ اور سب سے بڑا عقل مند اور سمجھدار وہی انسان ہے کہ جو ربِ جہاں کو راضی کرلے اور خدائے گلستاں کو خوش کرلے تو پھر اُسے کبھی خزاں کا سامنا نہ کرنا پڑے گا۔ اور جب وہ ہر لمحہ اللہ تعالیٰ کو راضی کرکے اُس کی راہ کے غم اُٹھائے گا کہ جس کی بدولت اُس کے قلب کو دردِ محبتِ خداوندی حاصل ہوجائے گا تو پھر اس کے بیان اور تعبیر اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا ہوگی کہ تمام اہلِ لغت سن کر حیران رہ جائیں گے۔ لیکن یہ بات یاد رہنی چاہیے کہ اگر یہ نعمت حاصل کرنی ہو تو سوائے اس کے کوئی راستہ نہیں ہے کہ گروہِ عاشقاں سے تعلق قائم کیا جائے اور اللہ والوں کی صحبت اُٹھائی جائے اور ان کی خدمت کے موقع کو غنیمت سمجھا جائے۔ ہاں لیکن یہ شرط ضرور ہے کہ اہل اللہ کی صحبت کے ساتھ ساتھ گناہوں سے بچنے کا غم اُٹھانا پڑے گا۔ ورنہ کسی کا خوب تعلق گروہِ عاشقاں سے رہا ہو اور وہ راہِ خداوندی کے غم اُٹھانے سے بچتا ہو، جہاں جی چاہے اپنی خواہشات کی تکمیل کرلیتا ہو تو پھر ایسے سالک کی جاں مولائے جاں کی مقرب نہیں بن سکتی۔ جیسا کہ حضرت والا نے یہ بات کئی جگہ فرمائی کہ شیخ کامل کے ہونے کے ساتھ ساتھ سالک کے لیے یہ ضروری ہے کہ دل و جاں سے اللہ پر فدا ہوجائے اور ایک لمحہ حق تعالیٰ کی مرضی کے خلاف گناہوں اور نافرمانیوں میں نہ گزارے۔ یہی حقیقت ہوتی ہے اللہ پر دل و جاں سے فدا ہونے کی۔ کیونکہ جب تک یہ بات حاصل نہ ہو تو اگرچہ درمیانی درجہ کا مؤمن رہتا ہے مگر خاص قربِ خداوندی کی حلاوت اور لذت سے آشنا نہیں ہوسکتا۔

کیا ہے ربط اپنے آسماں سے

گلوں سے ہے نہ ہم کو گلستاں سے
ہمارا کام ہے آہ و فغاں سے

لرزتی برق بھی ہے آشیاں سے
پڑا پالا ہے طائر کی فغاں سے

مری فریاد ہے اے ربِ عالم
بچا مجھ کو بلائے دو جہاں سے

دلِ عشاق میں ہے آگ پنہاں
یقیں کرتا ہوں آہوں کے دھواں سے

یہ کیوں ہے سُرخ سجدہ گاہ عاشق
دعا کرتے ہیں چشم خونفشاں سے

یہ ہے انعام تسلیم و رضا کا
کہ ہیں آزاد فکر این و آں سے

بہت خونِ تمنا سے زمیں نے
کیا ہے ربط اپنے آسماں سے

یہ ہے توفیق بس اُن کے کرم سے
کہ ہے صرفِ نظر حسنِ بتاں سے

کرم ہے آپ کا اخترؔ پہ یارب
فدا ہوں آپ پر گر جسم و جاں سے

مشکل الفاظ کے معانی:۔طائر: پرندہ، مراد اللہ والا۔**بلائے**: مصیبت۔**پنہاں**: چھپی ہوئی۔**خونفشاں**: خون برساتی ہوئی۔**تسلیم و رضا**: اللہ تعالیٰ کی مرضی کے آگے اپنی مرضی کو چھوڑ دینا۔**فکرِ این و آں**: طرح طرح کی فکریں۔**زمیں**: مراد اللہ والے ہیں۔**آسماں**: مراد اللہ تعالیٰ ہیں۔**صرفِ نظر**: نظر پھیر لینا۔

اللہ کے عشاق کو دنیا کے رنگ و بو سے کیا مطلب

گلوں سے ہے نہ ہم کو گلستاں سے
ہمارا کام ہے آہ و فغاں سے

جن کے دل میں اللہ تعالیٰ اپنی محبت عطا فرماتے ہیں تو پھر اُن کا دل دنیا کے رنگ و بو میں اٹکا نہیں رہتا اور نہ اُنہیں یہاں کے گلوں اور گلستانوں سے کوئی مطلب رہتا ہے۔ بلکہ میں بڑی بصیرت سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر وہ گلوں اور گلستان کے بیچ میں رہتے ہوں تب بھی اُن کا دل خالقِ گلستاں سے وابستہ رہتا ہے۔ اور یہ سب کچھ باہر کی کائنات ہوتی ہے۔ لیکن اُن کے دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت کی گرمی اُسی طرح قائم رہتی ہے جس کا اثر آہ و فغاں میں ظاہر ہوتا رہتا ہے۔

لرزتی برق بھی ہے آشیاں سے
پڑا پالا ہے طائر کی فغاں سے

جہاں کوئی اللہ والا رہتا ہو اور اُس آشیانے سے اُس کی آہ و فغاں نکلتی ہو تو ظالم ظلم کرتے وقت اور حاسد حسد کرتے وقت کانپ اُٹھتا ہے، کیونکہ جب وہ اس آشیانے سے آہ و فغاں کی آواز سنتا ہے تو اُسے یہ پتہ چل جاتا

ہے کہ اِس میں کوئی خدا کا دیوانہ ہے،جس کو ایذا اور تکلیف پہنچانا اپنی تباہی و بربادی کو دعوت دینا ہے۔اس لیے ظالم کے ظلم کی برق اور بجلی بھی ایسے آشیانے پہ گرنے سے لرزتی ہے۔

ربِ دو جہاں ہی بلائے دو جہاں سے بچا سکتا ہے

مری فریاد ہے اے ربِ عالم

بچا مجھ کو بلائے دو جہاں سے

آگے حضرت والا دنیا و آخرت میں ہر قسم کی برائی اور مضرتوں کے نقصان سے بچنے کے لیے اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی پناہ میں دے رہے ہیں اور اُس خدائے وحدہ لاشریک لہ سے فریاد کر رہے ہیں کہ جس کی ذات ایسی ہے جس کے متعلق آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں میں یہ جملہ منقول ہے: ''یااحد من لا احد له ویاسند من لا سندله'' کہ جس کا کوئی نہ ہو وہ ذات اُسی کی حامی و مددگار ہو اور جس کا کوئی سہارا نہ ہو وہ ذات اُس کا سہارا ہے۔ اور کیوں نہ ہو جبکہ کائنات کی ہر مخلوق کی رب اور پالنے والی ذات وہی ایک اکیلے اللہ کی ہے۔جس کی تعریف یہی ہے کہ رب اُسے کہا جاتا ہے جو اپنے بندے کو ہر قسم کی مضرت اور نقصان سے بچاتے ہوئے اور اُس کے منافع اور مصالح عطا کرتے ہوئے اُسے اُس کی منزل تک پہنچادے۔اس لیے اللہ تعالیٰ کی ذات ہی اس لائق ہے کہ اسی سے بلائے دو جہاں سے پناہ چاہی جائے اور حاسدین کے حسد اور دُشمنوں کی دُشمنی سے اُسی سے فریاد کی جائے اور اُس کی پناہ حاصل کی جائے کیونکہ سوائے اُس کے کوئی محفوظ اور بچا ہوا نہیں کہ جس کو اللہ نے بچایا ہو اور سوائے اس کے کوئی مبتلا نہیں کہ جس کو اللہ کی طرف سے ابتلاء اور آزمائش میں ڈال دیا جائے۔ہمیں اللہ تعالیٰ سے دونوں جہاں کی ابتلاء اور مصیبت سے پناہ مانگنی چاہیے اور عافیت کی درخواست کرنی چاہیے۔ چنانچہ قرآن کریم نے ہم کو یہی سکھایا ہے۔ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَا اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ﴾

(سورۃ البقرۃ، اٰیۃ: ۲۰۱)

ترجمہ: اُن میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اپنی دعاؤں میں اللہ تعالیٰ سے دنیا کی بھلائی اور بہتری مانگتے ہیں اور آخرت کی بہتری بھی اور عذابِ جہنم سے پناہ مانگتے ہیں۔

اس میں لفظ حَسَنَةً تمام ظاہری اور باطنی خوبیوں اور بھلائیوں کو شامل ہے۔مثلاً دنیا کی حسنہ میں بدن کی صحت، اہل و عیال کی صحت، رزق حلال میں وسعت و برکت، دنیوی سب ضروریات کا پورا ہونا، اعمالِ صالحہ، اخلاقِ محمودہ، علم نافع، عزت و وجاہت، عقائد کی درستی، صراطِ مستقیم کی ہدایت، عبادات میں اخلاص کامل سب داخل ہیں۔اور آخرت کی حسنہ میں جنت اور اس کی بے شمار اور لازوال نعمتیں اور حق تعالیٰ کی رضا اور اس کا دیدار یہ سب

چیزیں شامل ہیں۔

الغرض یہ دعا ایک ایسی جامع ہے کہ اس میں انسان کے تمام دنیوی اور دینی مقاصد آ جاتے ہیں۔ دنیا و آخرت دونوں جہان میں راحت وسکون میسر آتا ہے۔ آخر میں خاص طور پر جہنم کی آگ سے پناہ کا بھی ذکر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بکثرت یہ دعاء مانگا کرتے تھے کہ **رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّفِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً وَّقِنَا عَذَابَ النَّار** اور حالتِ طواف میں خصوصیت کے ساتھ یہ دعا مسنون ہے۔ اس آیت میں ان جاہل درویشوں کی بھی اصلاح کی گئی ہے جو صرف آخرت ہی کی دعا مانگنے کو عبادت جانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمیں دنیا کی کوئی پرواہ نہیں ہے کیونکہ درحقیقت یہ اُن کا دعویٰ غلط اور خیالِ خام ہے۔ انسان اپنے وجود اور بقاء اور عبادت وطاعت سب میں ضروریاتِ دنیوی کا محتاج ہے، وہ نہ ہوں تو دین کا بھی کوئی کام کرنا مشکل ہے، اسی لیے انبیاء علیہم السلام کی سنت یہ ہے کہ جس طرح وہ آخرت کی بھلائی اور بہترین اللہ تعالیٰ سے مانگتے ہیں۔ اسی طرح دنیا کی بھلائی اور آسائش بھی طلب کرتے یں۔ جو شخص دنیوی حاجات کے لیے دعا مانگنے کو زہد و بزرگی کے خلاف سمجھے وہ مقامِ انبیاء سے بے خبر اور جاہل ہے۔ ہاں! صرف دنیوی حاجات ہی کو مقصدِ زندگی نہ بنائے، اس سے زیادہ آخرت کی فکر کرے اور اس کے لیے دعا مانگے۔ (معارف القرآن، جلد:۱ صفحہ:۴۹۲)

دلِ عشاق میں ہے آگ پنہاں
یقیں کرتا ہوں آہوں کے دھواں سے
یہ کیوں ہے سُرخ سجدہ گاہ عاشق
دعا کرتے ہیں چشم خونفشاں سے
یہ ہے انعام تسلیم و رضا کا
کہ ہیں آزاد فکر این وآں سے
بہت خون تمنا سے زمیں نے
کیا ہے ربط اپنے آسماں سے
یہ ہے توفیق بس اُن کے کرم سے
کہ ہے صرفِ نظر حسنِ بتاں سے
کرم ہے آپ کا اخترؔ پہ یارب
فدا ہوں آپ پر گر جسم و جاں سے

ان اشعار میں بھی قدرِ مشترک وہی مضامین ہیں جو دوسرے اشعار کے تحت گزر چکے ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے کہ ہر وقت اللہ والوں کی آہ وفغاں سن کر بآسانی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ان کے دلوں میں اللہ تعالیٰ کی محبت کی آگ کی پوری بھٹی گرم ہے کہ جہاں سے آہ وفغاں کی شکل میں دھواں نکل کر آرہا ہے۔ اور میں جب بھی کہیں زمین پرخون پڑا دیکھتا ہوں تو میں سمجھ جاتا ہوں کہ یہ کسی اللہ والے سچے عاشق کی سجدہ گاہ ہے کہ جس نے یہاں سجدے میں گرکر اپنے اللہ کے سامنے چشم خونفشاں سے خون بہایا ہے کیونکہ یہ آنسو جو اللہ کی محبت اور خوف سے نکلتے ہیں شہیدوں کے خون کے برابر ہیں۔ اور یہ بات جب تک حاصل نہیں ہوتی جب تک کہ آدمی اپنی تمناؤں کا خون نہ کرلے اور اپنے دل کو حق تعالیٰ کے لیے غم اُٹھا کر ریزہ ریزہ نہ کرڈالے۔ بس جب یہ مقام حاصل ہوتا ہے تو پھر وہ ہر وقت اِدھر اُدھر کی تمام فکروں سے آزاد اور محفوظ کر دیا جاتا ہے۔ اور وہ ہر گھڑی اللہ تعالیٰ کے ہر فیصلے پر تسلیم ورضا کا انعام لیے ہوئے رہتا ہے کہ اے اللہ! میں آپ کے ہر فیصلے سے خوش ہوں اور اُس کے سامنے سر جھکائے ہوئے ہوں نہ میری اپنی کوئی خوشی ہے اور نہ اپنا کوئی غم ہے۔ بس آپ جو کچھ مجھے عطا فرمائیں میں اُسی پر خوش ہوں۔ آپ اگر راضی ہوں تو چاہے فقیر بنا کر رکھیں یا امیر، غلام بنا کر رکھیں یا بادشاہ، خادم بنا کر رکھیں یا مخدوم، گمنام کرکے رکھیں یا شہرت عطا فرما کر، صحت کی نعمت عطا فرمادیں یا مرض وبیماری میں مبتلا کردیں، گو کہ میں تو آپ سے صحت وعافیت کا طالب ہوں مگر آپ کے ہر فیصلے پر راضی بھی ہوں۔ بس میری زندگی کی بنیاد آپ کا راضی ہونا ہے۔ اور مجھے جو بھی کچھ حاصل ہوا یہ سب آپ کا کرم ہے۔ ہر وقت میرا دل وجان آپ کے حکم پر قربان ہے۔ یہ بھی آپ کے کرم کا صدقہ ہے اور جس طرح آپ نے مجھے بتوں یعنی حسین معشوق اور معشوقاؤں سے نظر بچانے کی توفیق عطا فرمائی ہے یہ بھی آپ کے فضل وکرم سے ہے۔ ورنہ اختر سے یہ کبھی ممکن نہ تھا۔

جیسا کہ قرآن کریم میں یہ مضمون متعدد جگہ پر ذکر ہوا ہے کہ ہر نعمت اور بھلائی اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم کی بدولت ہے اور ہمارے دل کا پاکیزہ کردیا جانا اور نفس کا مزکّٰی اور مجلّٰی ہوجانا یہ بھی صرف توفیقِ الٰہی اور فضلِ خداوندی کا ثمرہ اور نتیجہ ہے۔

نہیں کچھ فائدہ اس گلستاں سے

ہٹایا جس نے سر اُس آستاں سے
وہ ٹکرایا بلائے ناگہاں سے

گناہوں سے اگر توبہ نہیں کی
تو وہ محروم ہے دونوں جہاں سے

نہیں کرتا ہے جو رب کی اطاعت
وہ جیتا ہے حیاتِ رائیگاں سے

اگر ناراض ہے وہ خالقِ کُل
تو کیا حاصل اُسے کون و مکاں سے

جہاں ہو گُل کے بدلے خارِ صحرا
نہیں کچھ فائدہ اس گلستاں سے

نہ بلبل ہو نہ گُل ہو جس چمن میں
تو باز آیا میں ایسے بوستاں سے

خدا سے گر نہیں ہے ربط اخترؔ
عبث ہے ربط ماہ و اختراں سے

مشکل الفاظ کے معانی:۔**آستاں**: اللہ تعالیٰ کا در۔**ناگھاں**: اچانک۔ **رائیگاں**: بیکار۔ **خالقِ کُل**: ہر چیز کا پیدا کرنے والا۔ **کون ومکاں**: دنیا۔ **گل**: پھول۔ **خارِ صحرا**: ریگستان کا کانٹا۔**بوستاں**: باغ۔**ربط**: تعلق۔ **عبث**: بےکار۔**ماہ**: چاند۔ **اختراں**: ستارے۔

اللہ کے در کو مضبوطی سے پکڑنا تمام مسائل کا حل ہے

اس پوری نظم میں چند باتوں کی طرف حضرت والا نے توجہ دلائی ہے۔سب سے پہلی یہ ہے کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کے در کو مضبوطی سے نہیں پکڑتے ہیں اور اُس خالقِ کائنات سے اپنا تعلق مضبوط نہیں کرتے تو اُنہیں ایسی مصیبتوں اور پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے جن سے بچ نکلنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی اور اُس کی وجہ یہ ہے کہ پوری کائنات کے تمام مسائل کا حل صرف اللہ تعالیٰ کے فیصلوں سے ہوتا ہے۔ جو شخص اللہ تعالیٰ کی ذات سے تعلق توڑ کر خود اپنے مسائل حل کرنے میں لگے گا تو وہ بدیہی اور واضح طور پر انتہائی درجہ کی جاہلانہ اور غیر دانشمندانہ حرکت میں مبتلا ہے۔عقلمندی یہ ہے جس کے ہاتھ میں ہمارے مسائل ہیں اور دنیا و آخرت کی تمام مصیبتیں اور راحتیں ہیں اُس سے مضبوط رشتہ جوڑا جائے اور اپنا سر اُس آستاں سے نہ ہٹایا جائے۔جس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت چھوڑ دی جائے اور گناہوں میں مبتلا ہو جائے۔ یہی نافرمانی اور گناہوں میں مشغول رہنا رحمتوں اور برکتوں کے اُٹھ جانے کا سبب ہے۔ ہاں! اگر گنہگار بھی توبہ کر کے پھر سے اللہ کی طرف لوٹ جائے تو بھی اُسے دو جہاں کی سرخروئی اور عزت حاصل ہو جاتی ہے۔ ورنہ بصورتِ دیگر اُسے دونوں جہاں کی راحتوں سے محروم کر دیا جاتا ہے اور اُسے ایسی زندگی ملتی ہے کہ وہ بالکل رائیگاں اور بےکار اور بےفائدہ ہوتی ہے۔جس کو احقر بعض مقامات پر لکھ چکا ہے کہ وہ زندگی، زندگی کہلانے کے قابل بھی نہیں ہوتی، بلکہ آگے بڑھ کر یہ کہیے کہ خالق کائنات کی ناراضگی سے اُسے نہ دنیا سے کچھ حاصل اور نہ آخرت سے۔اُس کی دنیا بھی برباد اور آخرت بھی تباہ ہو جاتی ہے۔

خار و گل اور ظلمت و روشنی میں فرق کیجئے

افسوس صد افسوس! اُن لوگوں پر کہ جن کو اللہ تعالیٰ نے خار اور گل کی تمیز بخشی ہو اور اتنا شعور عطا فرمایا ہو کہ حقیقت میں یہ دنیا اور چمک دمک اور کھلے ہوئے پھول اور رنگ و روپ جو حسین اور حسیناؤں کی شکل میں دکھائے دے رہے ہیں یہ تمہارے لیے خار ہیں۔ اور ان کو چھوڑ کر دل کو حاصل ہونے والا رنج و غم اور تھوڑی دیر کی تکلیف و پریشانی یہ تمہارے لیے حقیقت میں انتہائی اعلیٰ درجے کی خوشبو رکھنے والے پھول ہیں۔ اس لیے دنیا میں وہی شخص جینے کا لطف اُٹھاتا ہے اور مقصدِ حیات میں کامیاب ہوتا ہے کہ جو اس فرق کو سمجھ کر خارِ صحرا لینے کے بجائے گلستاں کے عمدہ پھول چنتا اور اختیار کرتا ہے۔ اور وہ یہ جانتا ہے کہ جن پھولوں پر آج بلبل چہچہا رہی ہے، موسمِ خزاں میں یہ بلبل رو رہی ہوگی اور وہ گل اور پھول بے نام و نشان ہو جائیں گے اور سارا چمن اُجڑا ہوا نظر آئے گا۔ اس لیے اپنے کو اُس بلبل کی حالت سے فائدہ پہنچاتا ہے اور اُس سے اپنے لیے سبق نکال لیتا ہے اور ہمیشہ کے لیے ایسے گلستاں اور بوستاں سے باز رہتا ہے۔ بس اُس کے سامنے ایک ہی ہدف اور نشانہ ہوتا ہے کہ میرے اللہ سے میرا ربط کتنا قوی ہے۔ اور خالقِ گل و گلشن، اور مالکِ ماہ و انجم سے میں کتنا جڑا ہوا ہوں اور اُس کے حکموں کی کتنی اتباع کر رہا ہوں، کیونکہ اگر مجھے اللہ تعالیٰ سے ربط نہ ہو تو پھر ماہ و انجم سے میرا تعلق بالکل بے کار اور خسارے اور ناکامی کا باعث ہے۔

زمیں میری ہو جیسے آسماں میں

کہاں پھرتے ہو فکرِ این و آں میں
کبھی آؤ تو بزمِ دوستاں میں

اگر ہے برق و باراں اس جہاں میں
کرو فریاد اپنے آشیاں میں

مزہ پاتے ہو کیوں اس کے بیاں میں
کوئی تو بات ہے دردِ نہاں میں

مزہ پایا جو صحرا کی فغاں میں
نہیں پایا مزہ وہ گلستاں میں

وہ ظاہر ہوگیا اس کی زباں میں
اثر پنہاں تھا جو زخمِ نہاں میں

نہیں پایا چراغِ راہِ منزل
مگر بس عاشقوں کی داستاں میں

عطائے خالقِ دونوں جہاں ہے
اثر پاتے ہو جو میرے بیاں میں

رہے لپٹا گلوں کے دامنوں سے
اگرچہ خار ہے وہ گلستاں میں

سنا تو سب نے میری داستاں کو
اثر پایا نگاہِ دوستاں میں

نہ پوچھو لذتِ فریادِ سجدہ
زمیں میری ہو جیسے آسماں میں

کوئی پوچھے یہ جاکر باغباں سے
گذرتی ہے تری کیسے خزاں میں

اگر ہے ربط خلّاقِ چمن سے
تو اختؔر گل لیے ہوگا خزاں میں

مشکل الفاظ کے معانی:۔فکرِ این و آں: طرح طرح کی فکریں۔**دوستاں**:اللہ تعالیٰ کے دوستوں کی محفل۔ **برق وباراں**: بجلی چمکنا اور بارش ہونا۔ **آشیاں**: گھونسلہ۔**فُغاں**: رونا۔ **گلستان**: باغ۔**پِنہاں**: چھپا ہوا۔**زخمِ نہاں**: چھپا ہوا زخم۔**خلاّق**: پیدا کرنے والا۔**چمن**: باغ۔

بزمِ دوستاں کون سی بزم ہے

کہاں پھرتے ہو فکرِ این و آں میں
کبھی آؤ تو بزمِ دوستاں میں
اگر ہے برق و باراں اس جہاں میں
کرو فریاد اپنے آشیاں میں

حضرت والا نصیحت فرما رہے ہیں کہ دنیا کی فکروں کو چھوڑ کر اور اِدھر اُدھر کی مجلسوں اور محفلوں میں قیل و قال اور بے فائدہ گفتگو میں نہ پڑ کر کبھی اللہ والوں کی محفل میں آ کر دیکھو تو تمہیں پتہ چل جائے گا کہ اس محفل کا مزہ کچھ اور ہی ہوتا ہے۔ اور تم پر یہ واضح ہو جائے گا کہ حقیقت میں دوستی رکھنے کے قابل صرف اللہ والے ہی لوگ ہوتے ہیں، کیونکہ دوستی کا حق یہی لوگ ادا کرتے ہیں جو کہ اپنے دوست کو بُرے انجام اور تباہی و بربادی سے بچاتے ہیں۔ یہ بات صرف اللہ والے نیک صالح لوگوں میں ہوتی ہے کہ وہ اپنے ساتھ رہنے والے کے لیے قبر و حشر اور جنت تک کی بھلائیوں کی سوچ اور فکر میں لگے رہتے ہیں۔ اس لیے تمہیں آنے کے بعد یہ پتہ چلے گا کہ حقیقت میں بزمِ دوستاں کہلانے کے قابل اہلِ دل اولیاء اللہ کی مجلسیں ہیں۔ اور میں تم کو یہ بھی نصیحت کرتا ہوں کہ ذرا اپنے آشیاں میں بیٹھ کر دنیا بھر کی مختلف فکروں اور اُلجھنوں سے یکسو ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ کو یاد کرو اور اُسی سے فریاد کرو تو اس کفر و شرک اور ظلمت و بدعت اور جہالت وضلالت کے دور میں بھی تمہیں یہ اندازہ ہو جائے گا کہ امن اور سکون کی جگہ وہ اپنی جھونپڑی اور معمولی سا گھر ہے جہاں ایک بندہ بیٹھ کر اپنے خالق و مالک سے فریاد کرتا ہے۔ اور اس کے نتیجہ میں تم سارے عالم میں پھیلی ہوئی برق و باراں کی زد میں آنے سے محفوظ ہو جاؤ گے۔

میرا بیاں ترجمانِ دردِ نہاں

مزہ پاتے ہو کیوں اس کے بیاں میں
کوئی تو بات ہے دردِ نہاں میں
وہ ظاہر ہوگیا اس کی زباں میں
اثر پنہاں تھا جو زخمِ نہاں میں

یعنی ایک بیان صرف زبانی جمع خرچ ہوا کرتا ہے کہ آدمی لغت کے اوپر قادر ہوجائے اور کچھ ظاہری علوم سے واقفیت ہوجانے کے بعد فصاحت و بلاغت کے قواعد سیکھ لینے سے منبر ومحراب سے ایک عمدہ قسم کا بیان لوگوں کو سنا دیا جاتا ہے۔لیکن ایک وہ بیان ہے کہ جو اپنے دل میں گزرنے والے حالات کی ترجمانی کرتا ہے اور جو اُس کے دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت کا دردِ نہاں ہے اُس کی تعبیر کرتا ہے جسے بالفاظِ دیگر یوں کہنا چاہیے کہ ؎

لغت تعبیر کرتی ہے معانی
محبت دل کی کہتی ہے کہانی

اس لیے اللہ والوں کے بیان میں سامعین کو ایسا سرور اور لطف حاصل ہوتا ہے کہ کئی کئی گھنٹے بیان سننے کے باوجود وہ لوگ اُکتاتے نہیں جبکہ بارہا یہ دیکھا گیا کہ ایسی جگہ پر کسی اللہ والے کا بیان ہوا جہاں کے لوگوں کے بارے میں یہ بات مشہور ہے کہ زیادہ دیر تک بیان سننا پسند نہیں کرتے اور درمیان سے اُٹھ کر جانا شروع کر دیتے ہیں۔لیکن وہی لوگ ایسے جڑ کر بیٹھے رہے جیسے زمین کے ساتھ ان کو کسی چیز کے ذریعہ چپکا دیا ہو۔درحقیقت یہ سب کچھ اسی دردِ نہانی کا اثر ہوتا ہے۔اور اس کو ٹھیک اسی طرح سمجھئے کہ جیسے بدن کا زخمی انسان جب ڈاکٹر کے سامنے حالت بیان کرتا ہے تو بغیر سیکھے ہوئے وہ اتنے صاف اور واضح طریقے سے بیان کر دیتا ہے کہ ڈاکٹر کو اس کی حالت جاننے میں کوئی شک وشبہ نہیں رہتا۔تو اللہ کی محبت بھی دل پر لگا ہوا ایک زخم ہے، لہٰذا محبتِ خداوندی کا گھائل انسان جب اس زخم کو بیان کرے گا تو وہ اپنے دل کی کہانی کہے گا، اس لیے اس کی تاثیر ہی جدا ہوگی۔

مزہ پایا جو صحرا کی فغاں میں
نہیں پایا مزہ وہ گلستاں میں

اللہ والوں کو دنیا کے مکانات و بلڈنگوں اور ظاہری ٹیپ وٹاپ والی چیزوں میں نہ مزہ آتا اور نہ ہی چین و سکون نصیب ہوتا ہے، بلکہ وہ لوگ خلوتوں میں رہ کر جو اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے ہیں اور وہاں آہ وفغاں کرتے ہیں اُس میں اُن کو وہ حلاوت میسر آتی ہے کہ جو دنیا کی چیزوں اور ساز وسامان میں نصیب نہیں ہوتی۔اسی لیے وہ لوگ آہِ صحرا کا مزہ اُٹھانے کو اپنے لیے زیادہ ترجیح دیتے ہیں۔وہ ایسی عیش وعشرت کی جگہوں سے اپنے کو دور رکھتے ہیں۔

داستانِ عاشقاں چراغِ راہِ منزل ہوا کرتی ہے

نہیں پایا چراغِ راہِ منزل
مگر بس عاشقوں کی داستاں میں

یہ مضمون اس سے پہلے بھی بعض مقامات پر گزر چکا ہے کہ اللہ والوں کی داستانِ دردِ دل جب لوگوں کے سامنے بیان کی جاتی ہے تو اُس سے عشاقِ خداوندی کے لیے راہِ منزل کے بہت سے چراغ جل جاتے ہیں۔اور

اُن کے قصوں میں اس قدر عبرتیں اور نصیحتیں اور ہدایت کا اتنا سامان جمع ہوتا ہے کہ اُن کو دیکھ کر اور پڑھ کر اللہ تعالیٰ کی محبت اور رضا کا طالب انسان اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ قرآن نے انبیاء و رسل کے قصوں کو بیان کرنے کے فوائد کا تذکرہ قرآنِ کریم کی اس آیت میں کچھ اس طرح کیا ہے:

﴿وَكُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ أَنْۢبَآءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ وَجَآءَكَ فِيْ هٰذِهِ الْحَقُّ وَمَوْعِظَةٌ وَّذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ﴾

(سورة هود، اٰية: ۱۲۰)

ترجمہ: اور پیغمبروں کے قصوں میں ہم یہ سارے (مذکورہ) قصے آپ سے بیان کرتے ہیں جن کے ذریعہ سے ہم آپ کے دل کو تقویت دیتے ہیں (ایک فائدہ بیانِ قصص کا تو یہ ہوا جس کا حاصل آپ کو تسلی دینا ہے) اور ان قصوں میں آپ کے پاس ایسا مضمون پہنچا ہے جو خود بھی راست (اور قطعی) ہے اور مسلمانوں کے لیے (بُرے کاموں سے روکنے کے لیے) نصیحت ہے اور (اچھے کام کرنے کے لیے) یاد دہانی ہے۔ (یہ دوسرا فائدہ بیانِ قصص کا ہوا، ایک فائدہ نبی کے لیے، دوسرا اُمت کے لیے)

گلوں کے دامنوں سے لپٹے رہنے کے فائدے

رہے لپٹا گلوں کے دامنوں سے
اگرچہ خار ہے وہ گلستاں میں

ہم سب جانتے ہیں کہ جو لوگ تھوڑی بہت کنکریاں گندم اور غلّے میں ملی ہوتی ہیں وہ غلّے کے بھاؤ سے فروخت ہوتی ہیں جبکہ اُن کو اگر الگ کر دیا جائے تو پھر اُن کی کوئی قیمت نہیں رہتی۔ اور ٹھیک اسی طرح پھولوں کے دامن میں جو کانٹے بسے ہوتے ہیں اُن کو پھولوں کی صحبت مل جانے کی وجہ سے انہی پھولوں کی قیمت میں فروخت کیا جاتا ہے۔ اور جب پھول کی شاخ کسی کو پیش کی جاتی ہے تو ساتھ میں وہ کانٹے بھی چلے جاتے ہیں۔ ہاں! یہ الگ بات ہے کہ پھر ان کو صاف کر دیا جائے۔

لہٰذا اے وہ انسان! جو اللہ والوں کے بغیر مثلِ ایک کانٹے کے ہے اُسے یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اہل اللہ کی صحبت کا کس قدر عظیم الشان فائدہ ہے کہ ان شاء اللہ قیامت کے دن اہل اللہ کے دامن میں ہمارے عیوب کو چھپا دیا جائے گا اور ہمارا حشر بھی اُنہی کے ساتھ کر کے اللہ تعالیٰ وہی قیمت لگا دیں گے۔ اور اگر بظاہر دیکھا جائے تو دنیا میں بھی اہل اللہ کے خادموں کے ساتھ ساری دنیا وہی معاملہ کرتی ہے اور وہی سب کچھ عنایات اور توجہیں اُن کے ساتھ ہوتی ہیں جو کہ اہل اللہ کے ساتھ ہوتی ہیں۔ اس لیے حضرت والا نصیحت فرماتے ہیں کہ گلوں کے دامنوں سے لپٹے رہنا کیونکہ کانٹا بھی گلستان میں رہ کر جب گلوں کے دامن سے لپٹا ہوتا ہے تو مالی اور باغبان اُن کو نکال کر باہر

نہیں پھینکتا۔ اور اس مضمون پر وہ تمام احادیث دلیل ہیں جن میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات ارشاد فرمائی کہ جس کو جس سے محبت ہوگی قیامت کے دن اُس کا حشر اُسی کے ساتھ ہوگا۔ اور اُس محبت کی بناء پر اللہ وہاں اُن کو اکٹھا جمع فرما دیں گے۔ جیسا کہ اَلْمَرءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ کہ جس کو جس سے محبت ہوگی اس کا حسر اس کے ساتھ ہوگا۔

نفع کا مدار باہمی مناسبت پر ہے

سنا تو سب نے میری داستاں کو
اثر پایا نگاہِ دوستاں میں

جس کو جس شیخ سے مناسبت ہوتی ہے اُس کی تعلیمات اور تقریرات اُس کے لیے زیادہ نافع ثابت ہوتی ہیں۔ اور جب وہ اللہ والوں سے محبت و مناسبت اور عقیدت وعظمت کے ساتھ ملتا ہے تو وہ اُن اللہ والوں کی زندگی سے بہت سے قیمتی موتی چن لیتا ہے۔ اور صاف پتہ چل جاتا ہے کہ ایسے لوگ کسی صاحبِ دل کی صحبت اُٹھائے ہوئے ہیں۔ اور اس کے فیضِ صحبت سے مستفید ہیں۔ لیکن جس کو نہ تو مناسبت ہو اور نہ وہ محبت وعقیدت کے ساتھ تعلق رکھتا ہو تو پھر ایسے لوگ پورے طور پر بزرگانِ دین کی صحبت سے نفع نہیں اُٹھا پاتے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت سے معترضین اور معاندین کو نفع نہ پہنچ سکا۔ اور حقیقت یہی ہے کہ محض تنقید وتبصرہ کو اپنی عادت بنانے والے لوگ ہر جگہ محروم ہی رہتے ہیں اور اسی طرح محض حسنِ کلام کے عادی حضرات جو کہ عمل سے دور ہوں تو وہ بھی محض باتوں کا ہو کر رہ جاتا ہے اور راہِ سلوک طے کر کے ساری زندگی منزل تک نہیں پہنچ پاتا ہے۔ بقول حضرت خواجہ عزیز الحسن مجذوب رحمۃ اللہ علیہ ؎

کامیابی تو بس کام سے ہوگی
نہ کہ حسنِ کلام سے ہوگی
ذکر کے التزام سے ہوگی
فکر کے اہتمام سے ہوگی

خلاّقِ چمن سے ربط ہو تو ہر وقت چمن کی بہار ملے گی

کوئی پوچھے یہ جاکر باغباں سے
گذرتی ہے تری کیسے خزاں میں
اگر ہے ربط خلاّقِ چمن سے
تو اختؔر گل لیے ہوگا خزاں میں

جس طرح دنیا کے گلستان کا باغبان موسمِ خزاں میں فرحاں وشاداں نہیں رہتا اور اُس کے دل بہلانے کا سامان جو کہ اُس گلستان میں بہار کے موسم میں رہتا ہے وہ اُس وقت اُس کے پاس موجود نہیں ہوتا تو وہ پریشان حیران نظر آتا ہے۔لیکن جس آدمی کا تعلق خلاّقِ چمن سے ہو تو اُس کو کسی وقت بھی خزاں کا سامنا کرنا نہیں پڑے گا بلکہ اُس کے دل کا گلستان ہر وقت پُر بہار رہے گا اور اُس میں پوری زندگی ہر حالت اور ہر وقت میں پھول اور پھل کھلتے رہیں گے۔اس لیے کہ وہ ایسی ذات ہے کہ جو چمن کو چمن بناتی ہے اور موسمِ بہار کو موسمِ بہار بنانے والی ہے تو اس سے تعلق ہو جانے کی صورت میں یہ کیسے ممکن ہے کہ خزاں کا سامنا کرنا پڑے۔ہاں اگر خلاّقِ چمن سے ربط کٹ جائے اور تعلق ٹوٹ جائے تو پھر یہ سارا چمن ہی اُجاڑ اُجاڑ معلوم ہوتا ہے اور اُس کی زندگی زندگی نہیں رہتی۔کیا ہی خوب حضرت والا نے فرمایا ؎

کس قدر ظلمت کدہ تھی انجمن اُن کے بغیر
اُن کے آتے ہی سراپا بزمِ روشن ہوگئی

ذرا دیکھو تو فیضِ خانقاہی

مچادے گی وہ باہی میں تباہی ۔۔۔ نہ کرے اے دوست ہر گز بدنگاہی
چٹائی پر ملے گا تختِ شاہی ۔۔۔ اگر حاصل کرو عشقِ الٰہی
غضب سے تو اگر مغلوب ہوگا ۔۔۔ بکے گی پھر زباں واہی تباہی
حسینوں سے اگر ملنا نہ چھوڑا ۔۔۔ نہیں پہنچے گا دربارِ الٰہی
وہی پہنچا ہے دربارِ خدا میں ۔۔۔ ملی ہے جس کو آہِ سحر گاہی
ہوئے ہیں رند کتنے اولیاء بھی ۔۔۔ ذرا دیکھو تو فیضِ خانقاہی
کھلا کیا راز سلطانِ بلخ پر ۔۔۔ فقیری لی ہے دے کر تاجِ شاہی
غذا اس نفسِ سرکش کی تو کم کر ۔۔۔ نہ کھا ہر روز ظالم مرغ و ماہی
جو اہلِ دل کی صحبت میں رہے گا ۔۔۔ وہی پائے گا بس عشقِ الٰہی
ملی اختؔر جسے نسبت خدا کی ۔۔۔ مٹادی اس نے باہی اور جاہی

مشکل الفاظ کے معانی:۔ **باهی**: مردانہ قوت۔ **آہِ سحر گاهی**: تہجد میں رونا اور دعا کرنا۔ **رند**: دنیا کی شراب کے عادی۔ **سلطانِ بلخ**: سلطان ابراھیم ابن ادھم مراد ہیں۔ **مرغ و ماهی**: مرغی اور مچھلی۔ **باهی**: شہوت کے گناہ۔ **جاهی**: لوگوں کے دلوں میں اپنا مقام چاہنا۔

قوتِ شہوت وغضب پر کنٹرول کے فوائد

مچادے گی وہ باہی میں تباہی
نہ کرے اے دوست ہرگز بدنگاہی
چٹائی پر ملے گا تختِ شاہی
اگر حاصل کرو عشقِ الٰہی
غضب سے تو اگر مغلوب ہوگا
بکے گی پھر زباں واہی تباہی

حضرت والا کے کلام میں بدنظری کے نقصانات اور اُس سے ہونے والی تباہی و بربادی کا ذکر جا بجا کیا جارہا ہے۔ یہاں اس موقع پر ایک خاص انداز سے حضرت نے اُس کے نقصان کو پیش کیا ہے کہ وہ قوتِ شہوانی جو انسانوں میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے فطری طور پر رکھی گئی ہے بدنظری کرنے سے اُس کے استعمال کی غلط صورتیں اور شکلیں دل و دماغ سوچنے لگتا ہے اور بالآخر ایک آدھ واقعات نہیں بلکہ سینکڑوں واقعات ہیں کہ جوان اس کا شکار ہوکر اپنی اس قوت کو اس حد تک تباہ کرچکے ہوتے ہیں کہ وہ صحیح طریقہ یعنی نکاح کے طور پر اپنی خوشگوار زندگی کسی مناسب رفیقۂ حیات کے ساتھ گزارنے کے قابل نہ رہتے۔ جس کے نتیجے میں اُن کی یہ دنیا اُن کے لیے جہنم کی طرح بن جاتی ہے۔ اس لیے حضرت والا کی یہ نصیحت سن لینی چاہیے کہ انسان اِدھر اُدھر حسینوں کو تانکتا اور جھانکتا نہ پھرے۔

میرے شیخِ اوّل مسیح الامت جلال آبادی رحمہ اللہ کا بڑا پیارا جملہ ذہن میں آیا۔ ایک مرتبہ ارشاد فرمایا کہ نظر اُٹھی اُٹھی نہ رہے اور زبان چلی چلی نہ رہے۔

اور اگر ان حسیناؤں کو چھوڑ کر کوئی آدمی اللہ تعالیٰ کی محبت حاصل کرلے اور اُس کے عشق میں اپنی ساری خواہشاتِ نفس کو قربان کردے تو میرے دوست وہ چٹائی پر بیٹھا ہوا ہوگا لیکن اُسے وہیں تختِ شاہی کا مزہ مل رہا ہوگا۔ اور وہ فقیری میں گدڑی پوش ہوگا لیکن تاجِ سلطانی سے زیادہ عزت وعظمت حق تعالیٰ کی طرف سے اُسے حاصل ہورہی ہوگی۔

اور جس طرح قوتِ شہوت کو محفوظ رکھنا چاہیے اور بدنگاہی کے ذریعے اُسے غلط راستوں پر ڈال کر برباد نہ کرنا چاہیے۔ اسی طرح ایک قوت انسان میں اللہ تعالیٰ نے فطری طور پر غضب اور غصے کی رکھی ہے۔ جس کو پی جانے اور برداشت کرجانے کے متعلق روایات میں اس کثرت سے فضیلتیں وارد ہوئی ہیں کہ یہ اندازہ ہوتا ہے کہ جو غصہ پینے کی اپنی عادت بنالے اور ہر اپنے اور پرائے سے حلم و بردباری سے کام لے تو اُس کے لیے جنت ضروری

قرار دے دی گئی۔ جیسا کہ ایک روایت میں آیا ہے کہ جو اپنے غصے کو قابو میں کر لے گا تو اللہ تعالیٰ اپنے عذاب کو قیامت کے دن اُس سے ہٹالیں گے۔

﴿عن أنس بن مالک يقول: قَالَ رَسُوْلُ اللہِ صَلَّی اللہُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ خَزَنَ لِسَانَهٗ سَتَرَ اللہُ عَوْرَتَهٗ وَمَنْ كَفَّ غَضَبَهٗ كَفَّ اللہُ عَنْهُ عَذَابَهٗ وَمَنِ اعْتَذَرَ إِلَى اللہِ قَبِلَ اللہُ مِنْهُ عُذْرَهٗ﴾

(مسند أبي يعلى الموصلي، كتاب سعيد بن نسان، باب من خزن لسانه ستر الله عورته، ومن كف غضبه)

جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جس نے اپنی زبان کو محفوظ رکھا اللہ تعالیٰ اُس کے عیوب کو چھپادیں گے اور جس نے اپنے غصے کو روک لیا اور اس پر کنٹرول کیا تو اللہ تعالیٰ اُس سے اپنے عذاب کو روک لیں گے۔ اور جس نے اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنا عذر پیش کیا تو اللہ تعالیٰ اُس کے عذر کو قبول فرمالیں گے۔

اے ابن آدم! اگر غصے کے وقت تو مجھے یاد رکھے گا یعنی میرا حکم مان کر غصہ پی جائے گا تو میں بھی اپنے غصہ کے وقت تجھے یاد رکھوں گا۔ (ابن ابی حاتم)

ایک اور حدیث میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں جو شخص اپنا غصہ روک لے اللہ تعالیٰ اُس پر سے اپنے عذاب کو ہٹالیتا ہے اور جو شخص اپنی زبان (خلافِ شرع باتوں سے) روک لے اللہ تعالیٰ اُس کی پردہ پوشی کرے گا اور جو شخص اللہ تعالیٰ کی طرف معذرت لے جائے اللہ تعالیٰ اس کا عذر قبول فرماتا ہے۔ یہ حدیث غریب ہے اور اس کی سند میں بھی کلام ہے۔ (مسند ابویعلیٰ)

حدیث شریف میں ہے آپ فرماتے ہیں پہلوان وہ نہیں جو کسی کو بچھاڑ دے بلکہ حقیقتاً پہلوان وہ ہے جو غصے کے وقت اپنے نفس پر قابو رکھے۔ (مسند احمد)

صحیح بخاری و صحیح مسلم میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں تم میں سے کوئی ایسا ہے جسے اپنے وارث کا مال اپنے مال سے زیادہ محبوب ہو؟ لوگوں نے کہا: حضور (صلی اللہ علیہ وسلم)! کوئی نہیں۔ آپ نے فرمایا میں تو دیکھتا ہوں کہ تم اپنے مال سے زیادہ اپنے وارث کا مال چاہتے ہو، اس لیے کہ تمہارا مال تو درحقیقت وہ ہے جو تم راہِ للہ اپنی زندگی میں خرچ کردو اور جو چھوڑ کر جاؤ وہ تمہارا مال نہیں بلکہ تمہارے وارثوں کا مال ہے تو تمہارا راہِ اللہ کم خرچ کرنا اور جمع زیادہ کرنا، یہ دلیل ہے اس امر کی کہ تم اپنے مال سے اپنے وارثوں کے مال کو زیادہ عزیز رکھتے ہو۔ پھر فرمایا تم پہلوان کسے کہتے ہو؟ لوگوں نے عرض کیا: حضور صلی اللہ علیہ وسلم! اُسے جسے کوئی پچھاڑ نہ سکے۔ آپ نے فرمایا نہیں! بلکہ حقیقتاً طاقت ور پہلوان وہ ہے جو غصے کے وقت اپنے جذبات پر قابو رکھے۔ پھر فرمایا: بے اولاد کسے کہتے ہو؟ لوگوں نے کہا: جس کی اولاد نہ ہو۔ فرمایا: نہیں! بلکہ فی الواقع بے اولاد وہ ہے جس کے سامنے اس کی کوئی اولاد مری نہ ہو۔ (صحیح مسلم)

ایک اور روایت میں یہ بھی ہے کہ آپ نے دریافت فرمایا کہ جانتے ہو مفلس کون ہے؟ لوگوں نے عرض کیا: جس کے پاس مال نہ ہو۔ آپ نے فرمایا بلکہ وہ جس نے اپنا مال اپنی زندگی میں راہِ اللہ میں نہ دیا ہو۔ (مسند احمد)

حضرت حارثہ بن قدامہ رضی اللہ عنہ سعدی رضی اللہ عنہ خدمتِ نبوی میں حاضر ہو کر عرض کرتے ہیں کہ حضور! (صلی اللہ علیہ وسلم) مجھے کوئی نفع کی بات بتایئے اور مختصر ہوتا کہ میں یاد بھی رکھ سکو۔ آپ نے فرمایا: غصہ نہ کر۔ اُس نے پھر پوچھا: آپ نے پھر یہی جواب دیا۔ کئی کئی مرتبہ یہی کہا سنا۔ (مسند احمد)

کسی شخص نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: مجھے کچھ وصیت کیجئے۔ آپ نے فرمایا غصہ نہ کر۔ وہ کہتے ہیں میں نے جو غور کیا تو معلوم ہوا کہ تمام بُرائیوں کا مرکز غصہ ہی ہے۔ (مسند احمد)

ایک روایت میں ہے کہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ تعالیٰ عنہ کو غصہ آیا تو آپ بیٹھ گئے اور پھر لیٹ گئے۔ ان سے پوچھا گیا یہ کیا؟ فرمایا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے آپ فرماتے تھے جسے غصہ آئے وہ کھڑا ہو تو بیٹھ جائے، اگر اس سے بھی غصہ نہ جائے تو لیٹ جائے۔ (مسند احمد)

مسند احمد کی ایک روایت میں ہے کہ عمروہ بن محمد کو غصہ آیا۔ آپ وضو کرنے بیٹھ گئے اور فرمانے لگے میں نے اپنے استادوں سے یہ حدیث سنی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ غصہ شیطان کی طرف سے ہے اور شیطان آگ سے پیدا ہوا ہے اور آگ بجھانے والی چیز پانی ہے۔ پس تم غصہ کے وقت وضو کرنے بیٹھ جاؤ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ بھی ارشاد ہے کہ جو شخص کسی تنگدست کو مہلت دے یا اپنا قرض اسے معاف کردے، اللہ تعالیٰ اسے جہنم سے آزاد کر دیتا ہے۔ لوگو! سنو! جنت کے اعمال سخت اور مشکل ہیں اور جہنم کے کام آسان اور سہل ہیں، نیک بخت وہی ہے جو فتنوں سے بچ جائے، کسی گھونٹ کا پینا خدا کو پسند نہیں جتنا غصہ کے گھونٹ کا پی جانا۔ ایسے شخص کے دل میں ایمان رَچ جاتا ہے۔ (مسند احمد)

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں جو شخص اپنا غصہ اُتارنے کی طاقت رکھتے ہوئے پھر بھی ضبط کر لے اللہ تعالیٰ اس کا دم امن وامان سے پُر کر دیتا ہے۔ جو شخص باوجود موجود ہونے کے شہرت کے کپڑے کو تواضع کے پیش نظر چھوڑ دے اُسے اللہ تعالیٰ قیامت کے روز کرامت اور عزت کا حلہ (سوٹ) پہنائے گا۔ اور جو کسی کا سر چھپائے اللہ تعالیٰ اُسے قیامت کے دن بادشاہت کا تاج پہنائے گا۔ (ابوداؤد)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں جو شخص باوجود قدرت کے اپنا غصہ ضبط کر لے اُسے اللہ تعالیٰ تمام مخلوق کے سامنے بلا کر اختیار دے گا کہ جس حور کو چاہے پسند کر لے۔ (تفسیر ابنِ کثیر اُردو، سورۂ آل عمران: آیت ۳، صفحہ: ۴۷۹)

اور بہت سی روایات غصہ پینے کی فضیلت پر وارد ہوئی ہیں اور عام طور پر غصہ کا اثر یہ ہوتا ہے کہ جب آدمی غصے میں مغلوب ہوتا ہے تو پھر وہ زبان کو قابو میں نہیں رکھ پاتا اور اس سے واہی تباہی بکنا شروع کرتا ہے جس کے

نتیجے میں جھگڑے اور لڑائیاں وجود میں آتی ہیں حدیث شریف میں ہے کہ دو شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے لڑ جھگڑ رہے تھے اور ایک شخص غصے میں بے قابو ہو رہا تھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو دیکھ کر فرمایا کہ میں ایسا کلمہ جانتا ہوں کہ اگر یہ شخص وہ کلمہ کہلے تو اس کا یہ اشتعال جاتا رہے فرمایا وہ کلمہ یہ ہے "اَعُوْ ذ با اللہ من الشیطان الرجیم" اس شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سن کر فوراً یہ کلمہ پڑھ لیا تو فوراً ہی سارا غصہ اور اشتعال ختم ہو گیا اور شیطان کو انسانی جھگڑوں سے خاص دلچسپی ہے جہاں جھگڑے کا کوئی موقع پیش آتا ہے شیاطین اس کو اپنی شکار گاہ بنا لیتے ہیں اور بڑے سے بڑے بردبار باوقار آدمی کو غصہ دلا کر حدود سے نکال دینے کی کوشش کرتے ہیں اس کا علاج قرآن شریف میں یہی بتایا گیا ہے کہ جب غصہ قابو میں نہ آتا دیکھیں تو سمجھ جائیں کہ شیطان مجھ پر غالب آرہا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع ہو کر اس سے پناہ مانگے۔ (معارف القرآن، جلد:۴، صفحہ:۱۵۸)

دربارِ الٰہی اور آہِ سحر گاہی کا گہرا ربط ہے

حسینوں سے اگر ملنا نہ چھوڑا
نہیں پہنچے گا دربارِ الٰہی
وہی پہنچا ہے دربارِ خدا میں
ملی ہے جس کو آہِ سحر گاہی
ہوئے ہیں رند کتنے اولیاء بھی
ذرا دیکھو تو فیض خانقاہی

اگر حضرت والا کی نصیحت نہ سنی اور دنیا کے معشوق اور معشوقہ اور حسین وخوبرو چہروں سے ملنا جلنا اور دوستی نہ چھوڑی اور دل میں ان کو بسائے رکھا تو یہ یاد رکھ لینا چاہیے کہ کلمہ لا الٰہ الا اللہ ہمیں یہ سکھا رہا ہے کہ دل سے ہر غیر اللہ کو باہر کر کے ہی دربار الٰہی تک رسائی ممکن ہے اس کے بغیر وصول الی اللہ کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا کیونکہ خاص اہل اللہ کی جو ایک صفت ہے یعنی آہِ سحر گاہی وہ اسے کبھی بھی میسر نہیں آسکتی ہے اس لیے کہ جو دل اپنے اندر مردے بسائے ہوئے ہو تو پھر اس دل میں خدا کی تجلیات قرب نہیں آتی ہیں جس کی بدولت دل میں انوارات اور روشنی نہیں رہتی تو پھر آہ سحر گاہی سے بھی محرومی رہتی ہے اور دل کو غفلت گھیر لیتی ہے اس لیے غفلت سے بچنے اور قرب خداوندی کے حصول کے لیے کسی خانقاہ میں اللہ والے کی صحبت اٹھانا لازم اور ضروری ہے تاریخ اس پر گواہ ہے کہ کتنے ہی رند خانقاہ کے فیض سے اولیاء کی صفوں میں شامل ہو گئے جو کل تک دنیا کی حرام شراب کے نشہ میں مست تھے آج وہی اللہ کی محبت کی صاف شفاف شراب کے نشے میں مزے لوٹ رہے ہیں۔

سلطان بلخ نے شاہی کے بدلے فقیری کیوں لی؟

کھلا کیا راز سلطان بلخ پر
فقیری لی ہے دے کر تاج شاہی

حضرت سلطان بلخ شاہ ابراہیم بن ادھم رحمہ اللہ کا واقعہ ہمارے حضرت والا کے مواعظ وتصنیفات میں مختلف جگہ پر آیا ہے یہاں اس موقع پر اختصار کے ساتھ معارف مثنوی صفحہ:۴۱ سے نقل کیا جا رہا ہے جیسا کہ ایک دوسرے مقام پر بھی بعض اشعار کی تشریح میں گزر چکا ہے، کہ جب حق تعالیٰ کی رحمت وعنایت سلطان ابراہیم بن ادہم رحمہ اللہ کی طرف متوجہ ہوئی تو صورت یہ پیش آئی کہ حضرت ابراہیم بن ادھم رحمہ اللہ رات کو بالا خانے پر سو رہے تھے کہ اچانک پاؤں کی آہٹ محسوس ہوئی گھبرائے کہ رات کے وقت شاہی بالا خانے پر کون لوگ ایسی جرأت کر سکتے ہیں دریافت فرمایا کہ اے واردین کرام آپ کون لوگ ہیں؟ یہ فرشتے تھے جو حق تعالیٰ کی طرف سے غفلت زدہ دل پر چوٹ لگانے آئے تھے۔ فرشتوں نے جواب دیا کہ ہم یہاں اپنا اونٹ تلاش کر رہے ہیں۔ بادشاہ نے کہا کہ حیرت ہے کہ شاہی بالا خانہ پر اونٹ تلاش کیا جا رہا ہے۔ ان حضرات نے جواب دیا کہ ہمیں اس سے زیادہ حیرت آپ پر ہے کہ اس ناز پروری اور عیش میں خدا کو تلاش کیا جا رہا ہے اور شاہی تخت پر حق تعالیٰ کی ملاقات کی تمنا کر رہے ہو یہ کہہ کر وہ رجال غیب تو غائب ہو گئے لیکن بادشاہ کے دل پر ایسی چوٹ لگ گئی کہ ملک وسلطنت سے دل سرد ہو گیا اور عشق حقیقی نے حضرت ابراہیم ابن ادہم رحمۃ اللہ علیہ کو ترک سلطنت پر مجبور کر دیا اور عشق کائنات کی تمام لذتوں سے دل کو بیزار کر دیا آخر کار آدھی رات کو بادشاہ اٹھا کمبل اوڑھا، اور اپنی سلطنت سے نکل پڑا سوز عشق کی ایک آہ نے زندان سلطنت کو پھونک دیا اور دست جنوں کی ایک ضرب نے گریبان ہوش کے پرزے اڑا دیئے اور سلطنت بلخ ترک کر کے حضرت ابراہیم بن ادہم نیشا پور کے صحرا میں ذکر حق اور نعرہ ہائے عاشقانہ بلند کرنے میں مشغول ہو گئے۔

سن لے اے دوست جب ایام بھلے آتے ہیں
گھاٹ ملنے کی وہ خود آپ ہی بتلاتے ہیں

جب حق تعالیٰ کی رحمت وعنایت حضرت ابراہیم ابن ادھم رحمہ اللہ کی طرف متوجہ ہوئی تو بغیر ریاضت و مجاہدے کے شاہ بلخ کا کام بن گیا بلخ کی سلطنت تو چھڑا دی لیکن ایسی باطنی سلطنت عطا فرما دی کہ جس کے سامنے ہفت اقلیم کی سلطنت بلکہ خَزَائِنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ بے حقیقت ہو گئے۔ شاہ کو خود بھی خبر نہ تھی کہ سلطنت کا سر سبز وشاداب باغ آتشِ عشقِ حقیقی کی نذر ہونے والا ہے، کوڑیاں چھن کر جواہرات عطا ہونے والے ہیں اور خارستان سوختہ ہو کر چمنستان بے خزاں بننے والا ہے۔

چنانچہ حضرت ابراہیم ابن ادھم رحمہ اللہ دس برس تک صحرائے نیشا پور میں دیوانہ وار عبادت میں مصروف رہے اور ترک سلطنت کے نتیجہ میں جو نعمت ملی اور صحرا میں دریا کے کنارے ذکر وعبادت کی جو حلاوت ان کے باطن کو عطا ہوئی اس کا لطف انہی سے پوچھنا چاہیے حقیقت یہ ہے کہ ظاہری سلطنت کے ترک سے حق تعالیٰ کے قرب کی سلطنت لازوال حاصل ہوگئی۔ (معارفِ مثنوی،صفحہ:۱۴۱ تا ۱۴۵)

شہوت کے گناہ سے حفاظت کا طبی علاج

غذا اس نفس سرکش کی تو کم کر
نہ کھا ہر روز ظالم مرغ و ماہی

حضرت والا ایک ظاہری تدبیر نفس سرکش کی شرارتوں سے حفاظت کے لیے بیان فرما رہیں ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حضرت والا کو جسم وروح دونوں کا حکیم بنایا ہے خلاصہ کلام یہ ہے کہ جب گرم غذائیں کھائیں جائیں گی تو انسان کی طبیعت میں شہوت کے جذبات اور مادے زیادہ پیدا ہوں گے اور طبیعت میں جوش اور ابھار کا سبب بنیں گے پھر اس کے نتیجہ میں شہوت کے گناہ کا واقع ہوجانا بہت ہی ممکن ہوگا اس لیے اس ظاہری جسمانی تدبیر کو بھی اختیار کرنا چاہیے۔

مگر یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس طرح کسی حلال اور پاکیزہ غذا کو اپنے اوپر حرام کرلینا کہ میں گوشت یا مرغی یا انڈا و مچھلی نہ کھاؤں گا، شرعی طور پر اس کو اسلام میں جائز رکھا گیا ہے؟ ظاہر ہے کہ جس چیز کو اللہ تعالیٰ نے حلال کیا ہو اُس کے متعلق ہمارے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ ہم اُسے حرام کردیں یا اُس کے ساتھ حرام جیسا برتاؤ کریں۔ جیسا کہ قرآن کریم کی اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ مَاۤ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ﴾

(سورة المائدة، اية:۸۷)

ترجمہ: اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ نے جو چیزیں تمہارے واسطے حلال کی ہیں (خواہ وہ کھانے پینے اور پہننے کی قسم سے ہوں یا منکوحات کی قسم سے ہوں) ان میں لذیذ (اور مرغوب) چیزوں کو (قسم وعہد کرکے اپنے نفسوں پر) حرام مت کرو اور حدود (شرعیہ) سے (جو کہ تحلیل وتحریم کے باب میں مقرر ہیں) آگے مت نکلو بے شک اللہ تعالیٰ حدِّ (شرعی) سے نکلنے والوں کو پسند نہیں کرتے۔ (معارف القرآن، جلد:۳، صفحہ:۲۱۹)

اس سوال کا جواب اس آیت کی تفسیر دیکھ کر صاف سمجھ میں آجائے گا کہ علاجاً وقتی طور پر کسی چیز سے بچنا یہ تحریمِ حلال میں داخل نہیں۔ اس لیے وہ شرعی طور پر گناہ نہیں۔ چنانچہ حضرت مفتی شفیع صاحب رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ مذکورہ آیات میں یہ بتلایا گیا ہے کہ اگرچہ ترکِ دنیا اور ترکِ شہوات ولذات ایک درجہ میں محبوب وپسندیدہ ہے، مگر

اس میں بھی حدودِ الٰہیہ سے تجاوز کرنا مذموم اور حرام ہے۔ جس کی تفصیل یہ ہے:

کسی حلال چیز کو حرام قرار دینے کے تین درجے ہیں۔ ایک یہ کہ اعتقاداً اس کو حرام سمجھ لیا جائے۔ دوسرے یہ کہ قولاً کسی چیز کو اپنے لیے حرام کر لے۔ مثلاً قسم کھالے کہ ٹھنڈا پانی نہ پیوں گا یا فلاں قسم کا حلال کھانا نہ کھاؤں گا، یا فلاں جائز کام نہ کروں گا۔ تیسرے یہ کہ اعتقاد قول تو کچھ نہ ہو محض عملاً ہمیشہ کے لیے کسی حلال چیز کو چھوڑ دینے کا عزم کر لے۔

پہلی صورت میں اگر اس چیز کا حلال ہونا قطعی دلائل سے ثابت ہو تو اس کا حرام سمجھنے والا قانونِ الٰہی کی صریح مخالفت کی وجہ سے کافر ہو جائے گا۔

اور دوسری صورت میں اگر الفاظِ قسم کھا کر اس چیز کو اپنے اوپر حرام قرار دیا ہے تو قسم ہو جائے گی۔ قسم کے الفاظ بہت ہیں، جو کتب فقہ میں مفصل مذکور ہیں۔ ان میں ایک مثال یہ ہے کہ صراحۃً کہے کہ میں اللہ کی قسم کھاتا ہوں کہ فلاں چیز نہ کھاؤں گا یا فلاں کام نہ کروں گا۔ یا یہ کہے کہ میں فلاں چیز یا فلاں کام کو اپنے اوپر حرام کرتا ہوں۔ اس کا حکم یہ ہے کہ بلاضرورت ایسی قسم کھانا گناہ ہے، اس پر لازم ہے کہ اس قسم کو توڑ دے اور کفارۂ قسم ادا کرے۔

تیسری قسم جس میں اعتقاد اور قول سے کسی حلال کو حرام نہ کیا ہو بلکہ عمل میں ایسا معاملہ کرے جیسا حرام کے ساتھ کیا جاتا ہے کہ دائمی طور پر اس کے چھوڑنے کا التزام کرے۔ اس کا حکم یہ ہے کہ اگر حلال کو چھوڑنا ثواب سمجھتا ہے تو بدعت اور رہبانیت ہے، جس کا گناہ عظیم ہونا قرآن وسنت میں منصوص ہے۔ اس کے خلاف کرنا واجب اور ایسی پابندی پر قائم رہنا گناہ ہے۔ ہاں! اگر ایسی پابندی بہ نیتِ ثواب نہ ہو بلکہ کسی دوسری وجہ سے ہو مثلاً کسی جسمانی یا روحانی بیماری کے سبب سے کسی خاص چیز کو دائمی طور پر چھوڑ دے تو اس میں کوئی گناہ نہیں۔ بعض صوفیائے کرام اور بزرگوں سے حلال چیزوں کے چھوڑنے کی جو روایات منقول ہیں وہ سب اسی قسم میں داخل ہیں کہ انہوں نے اپنے نفس کے لیے اُن چیزوں کو مضر سمجھا، یا کسی بزرگ نے مضر بتلایا، اس لیے بطور علاج چھوڑ دیا، اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔

آیت کے آخر میں فرمایا کہ وَلَا تَعْتَدُوْا إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ یعنی اللہ کی حدود سے آگے نہ بڑھو کیونکہ اللہ تعالیٰ ایسے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتے۔

حد سے بڑھنے کا مطلب یہی ہے کہ کسی حلال چیز کو بلا کسی عذر کے ثواب سمجھ کر چھوڑ دے، جس کو ناواقف آدمی تقویٰ سمجھتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ تعدی اور ناجائز ہے۔ (معارف القرآن، جلد: ۳، صفحہ: ۲۲۰-۲۲۱)

باہی و جاہی مٹاؤ تو پھر عشقِ الٰہی پاؤ

جو اہلِ دل کی صحبت میں رہے گا
وہی پائے گا بس عشقِ الٰہی
ملی اخترؔ جسے نسبت خدا کی
مٹادی اس نے باہی اور جاہی

اللہ والوں کی صحبت میں رہ کر ہی انسان کو کمالِ عشقِ خداوندی حاصل ہوسکتا ہے اس لیے حضرت نے فرمایا ہے کہ بس! وہی شخص عشقِ الٰہی پائے گا یعنی اس میں حصر مقصود ہے جیسا کہ ایک موقع پر میرے شیخ اول حضرت مسیح الامت جلال آبادی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ تبلیغ تشویق کا کام دیتی ہے اور خانقاہ تکمیل کا کام دیتی ہے یعنی تبلیغ میں لگ کر آدمی کو دین کا شوق پیدا ہوجاتا ہے لیکن اس کی تکمیل خانقاہ کے ذریعے سے ہوتی ہے۔

اور اسی بات کو ایک مرتبہ حضرت شاہ ابرار الحق ہردوئی رحمہ اللہ نے ایک تبلیغی اجتماع کے موقع پر وہیں اجتماع میں ایک بیان کیا کیونکہ کہ حضرت جی مولانا انعام الحسن صاحب اور حضرت ہردوئی رحمہ اللہ دونوں دوست تھے اس لیے حضرت جی نے موقع دلوایا، وہاں یہ بات ارشاد فرمائی کہ تبلیغ نافع تو ہے کافی نہیں اور اس کو خوب وضاحت سے بیان فرمایا اسی لیے اس دور کے اہل حق علماء کے متفق علیہ بزرگ مجدد وقت حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہ نے اہل اللہ کی صحبت کو فرض عین قرار دیا ہے اور فرمایا ہے کہ اس کے بغیر اصلاح کا کوئی امکان ہی نہیں ہے یوں درمیانی درجے کا مومن بن کر زندگی گزارنا کہ کبھی اچھے کام کر لیے کبھی برے یا زیادہ نیکیاں کر لی اور کچھ تھوڑے بہت گناہ بھی کر لیے یا طاعات بھی خوب کرتے رہے اور معاصی سے بھی بچتے بھی رہے مگر صرف ظاہری معاصی سے بچے اور باطنی معاصی کی طرف نظر ہی نہ گئی جب کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں وَ ذَرُوْا ظَاهِرَ الْاِثْمِ وَ بَاطِنَهٗ اور چھوڑ دو تم ظاہری اور باطنی دونوں طرح کے گناہوں کو ان باطنی گناہوں کا پتہ اہل دل کی صحبت میں رہے بغیر نہیں چلتا اس لیے عشق خداوندی کی تکمیل اہل اللہ کی صحبت کے بغیر ممکن نہیں ہے جن لوگوں کو بھی یہ نسبت مع اللہ حاصل ہوئی ہے انہیں صرف اہل دل کی صحبت ہی کی برکت سے ہوئی البتہ یہ شرط ہے کہ ہر قسم کے گناہوں سے مکمل پرہیز ہو بالخصوص جاہی اور باہی گناہوں سے یعنی شہوت کے گناہوں سے اپنی پوری حفاظت کر رہا ہو اور جاہ اور مقام و منصب کی ہوس دل سے نکل چکی ہو ورنہ اس کے بغیر صحبت اہل دل بھی کار آمد نہیں ہے۔

دشت کو خواب گاہ کرتا ہوں

جب کبھی دل سے آہ کرتا ہوں　　منزلیں پیش راہ کرتا ہوں
عشق کی نامراد وادی میں　　اپنے غم سے نباہ کرتا ہوں
صبر کو شکوہ و گلہ کیوں ہے　　ضبطِ غم بے پناہ کرتا ہوں
گریۂ اشک عشق میں کیا ہیں　　گریۂ خون بھی گاہ کرتا ہوں
ساری خلقت سے دور ہو کے کبھی　　دشت کو خواب گاہ کرتا ہوں
دردِ دل جب شدید ہوتا ہے　　یاد میں ان کی آہ کرتا ہوں
لذتِ ذکر کیا کہوں اخترؔ　　جھوم کر واہ واہ کرتا ہوں

مشکل الفاظ کے معانی:۔**نامراد**: اللہ تعالیٰ کے عشق میں اپنی حرام خواہشات کو نامراد کرنا۔ **نباہ**: دوستی۔ **ضبطِ غم**: گناہوں سے بچنے میں غم کو برداشت کرنا۔ **اشک**: آنسوؤں سے رونا۔ **گریۂ خون**: خون کے آنسو رونا۔ **خلقت**: مخلوق۔ **دشت**: جنگل۔ **دردِ دل**: دل پر دردِ غم اٹھا کر گناہ سے بچنا۔

جب کبھی دل سے آہ کرتا ہوں
منزلیں پیش راہ کرتا ہوں

یعنی جب میں اللہ تعالیٰ کی محبت میں آہ کرتا ہوں تو ہر آہ مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف بڑھا کر لے چلتی ہے اور میری منزلیں میرے سامنے کر کے مجھے اس تک پہنچنے کی خوشی کا پتہ دیتی ہے اس لیے اہل اللہ کی آہ وفغاں اور گریہ و زاری یہ اس راہ کی ترقی کا بہت بڑا سامان ہے جسے یہ چیز حاصل ہوتی ہے تو اسے قرب کی خاص لذت ملتی ہے اور سامعین کو بھی اس کی آہوں کے نتیجے میں منزلیں نظر آنے لگتی ہیں اور انہیں بھی قربِ حق تعالیٰ کا مزہ ملنے لگتا ہے کیونکہ وہ آہ دل سے نکل کر سامعین کے دلوں میں جا کر اثر کرتی ہے۔

عشق کی نامراد وادی میں
اپنے غم سے نباہ کرتا ہوں

اس میں حضرت والا جس کو عشق کی نامراد وادی فرما رہے ہیں یہ نامرادیاں دراصل اللہ کی مراد ہوا کرتی ہیں کیونکہ بندہ اسی نامراد وادی سے گزر کر اللہ تعالیٰ کا خاص قرب پالیتا ہے اگر سالک اپنی تمام مرادوں کو پاتا ہوا چل رہا ہو اور بظاہر وہ جو کچھ چاہتا ہے اسے سب کچھ مل جاتا ہو تو وہ اپنی ان دنیوی مرادوں اور تمناؤں کے پورے ہو جانے کی وجہ سے دنیا کے عیش و عشرت کی طرف کھنچتا چلا جاتا ہے لیکن جسے نامراد وادی سے گزارا جاتا ہے اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے اپنی طرف جذب کرنا چاہتے ہیں اور اپنا بنانا چاہتے ہیں تو ہر اس کی وہ مراد جو مراد

خداوندی کے علاوہ ہوتی ہے اس سے اس کو محروم کر دیا جاتا ہے اور اسی کی برکت سے پھر دل پر اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے حسرتیں اور تمنائیں پورا نہ ہونے کا عجیب و غریب قسم کا غم ہوتا ہے جو خوشی سے بھرا ہوتا ہے اور جو عجیب و غریب لذتوں کا حامل ہوتا ہے۔ اسی کو حضرت والا نے فرمایا ہے کہ میں عشق کی نامراد وادی میں اپنے مولیٰ کی محبت کے غم سے نباہ کرتا رہتا ہوں۔ یہ محبتِ الٰہیہ کی راہ میں دل پر گذرنے والی وہ عجیب و غریب کیفیات ہیں کہ جنہیں اللہ تعالیٰ کے عشاق ہی سمجھ سکتے ہیں۔

صبر کو شکوہ و گلہ کیوں ہے
ضبطِ غم بے پناہ کرتا ہوں
گریۂ اشک عشق میں کیا ہے
گریۂ خوں بھی گاہ کرتا ہوں

یعنی اللہ تعالیٰ کی محبت میں میں اس درجہ اس کے راستے کے غم اٹھاتا ہوں اور انہیں اپنے دل میں لیے رہتا ہوں کہ خود صبر کو یہ شکایت ہونے لگتی ہے کہ آخر کب تک ضبطِ غم کیا جائے گا اور کتنی خوشیوں کو پامال کیا جائے گا کچھ نہ کچھ تو دنیا کی خوشیاں بھی منالینی چاہیے اور تھوڑے بہت تو مزے اٹھا لینے چاہیے لیکن مجھے یہ منظور نہیں ہوتا بس میں رضائے مولیٰ کے لیے ہر خوشی کو اللہ پر قربان کر دیتا ہوں اور اس کے بدلے اس کے راستے غموں کو لے لیتا ہوں جس کے نتیجے میں صبر کو بھی شکوہ و گلہ ہونے لگا ہے کیونکہ اس قدر برداشت کرنا اور اس کے لیے ہمت کر کے آگے بڑھنا یہ خاص اولیاء اللہ کا حصہ ہوا کرتا ہے جیسا کہ ہمارے اکابر اور اسلاف کے واقعات اللہ کے لیے دل پر ہر قسم کی ایذاؤں اور تکلیفوں کو برداشت کرنے اور سہنے کے کثرت سے تاریخ میں موجود ہیں اور اسی کا یہ اثر ہے کہ میری آنکھیں ہی اشک باری کر کے اس بے پناہ غم کی ترجمانی نہیں کرتی بلکہ جس طرح میں اللہ کے عشق میں آنکھوں سے آنسو بہاتا ہوں اسی طرح کبھی کبھی خون کا رونا بھی روتا ہوں۔

اس کو یوں سمجھئے کہ ایک شخص آنکھوں کے آنسوؤں سے تو رو لیتا ہے لیکن جب وہ بازاروں اور دوسرے مقامات پر جاتا ہے تو نامحرموں کو خوب دل بھر کر دیکھتا ہے اور وہاں عشق بازی بھی کرتا ہے تو گو کہ یہ شخص اشک باری تو کر رہا ہے لیکن اپنی آرزوؤں کا خون کر کے اور حرام تمنائیں چھوڑ کر ناجائز خواہشات کے خون کے سمندر بہانے کے لیے تیار نہیں ہے تو ایسے شخص کو اللہ تعالیٰ کے قرب کا وہ مزہ نصیب نہیں ہوگا۔ اسی کو حضرت والا نے یوں ارشاد فرمایا۔

ساری خلقت سے دور ہو کے کبھی
دشت کو خواب گاہ کرتا ہوں
دردِ دل جب شدید ہوتا ہے
یاد میں ان کی آہ کرتا ہوں

لذتِ ذکر کیا کہوں اختؔر
جھوم کر واہ واہ کرتا ہوں

خلاصہ ان اشعار میں ذکر کردہ مضمون کا یہ ہے کہ حضرت والا کبھی خلق خدا سے دور دراز جا کر جہاں مکمل خلوت ویکسوئی حاصل ہو کسی جنگل و بیابان میں یا دریا کے کنارے اور یا کسی دامنِ کوہ میں اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے ہیں اور وہاں جا کر یکسوئی کے ساتھ آرام فرما ہوتے ہیں اور اس جگہ کو خواب گاہ بناتے ہیں جیسا کہ ایک مرتبہ حضرت والا کے ساتھ ایسا ہی معاملہ ہوا تھا اور جب اللہ تعالیٰ کی محبتِ شدیدہ دل میں زور مارتی ہے اور مجبور بیان کرتی ہے تو کبھی اس دردِ دل کی شدت اللہ کے عشاق میں بیان فرما کر سکون حاصل کرتے ہیں اور کبھی تنہائیوں میں اللہ تعالیٰ کی یاد میں آہ آہ کر کے اس شدید محبتِ خداوندی کو پیش کرتے ہیں اور آگے فرماتے ہیں کہ جب میں اللہ کا ذکر کرنے بیٹھتا ہوں تو حق تعالیٰ کے نام میں ایسی لذت ملتی ہے کہ بس اس کی ترجمانی کے لیے الفاظ نہیں ہیں میں مست ہو کر اپنے اللہ کے نام لیتے ہوئے جھوم جاتا ہوں اور سوائے واہ واہ اور خوشی میں جھومنے کے اور کچھ نہیں کہہ سکتا ۔

نام لیتے ہی نشہ سا چھا گیا
ذکر میں تاثیر دورِ جام ہے
اللہ اللہ کیسا پیارا نام ہے
عاشقوں کا مینا اور جام ہے

پھرتا ہوں دل میں دردِ محبت لیے ہوئے

ظاہر میں اہلِ دل ہیں گو حسرت لیے ہوئے
باطن مگر ہے دولتِ نسبت لیے ہوئے

مانا کہ میر گلشنِ جنت تو دور ہے
عارف ہے دل میں خالقِ جنت لیے ہوئے

صحراؤں میں کبھی، کبھی دامانِ کوہ میں
پھرتا ہوں دل میں دردِ محبت لیے ہوئے

اک قلب شکستہ کے اور آہ فغاں کے ساتھ
میں چل رہا ہوں مشعلِ سنت لیے ہوئے

روئے زمیں پہ جو بھی ہے عہد وفا کے ساتھ
وہ ہر نفس ہے سایۂ رحمت لیے ہوئے

جو بے وفا کہ نفس کا اپنے ہوا غلام
جیتا ہے سر پہ سینکڑوں لعنت لیے ہوئے

اپنے تو کیا ہیں غیر بھی کرتا ہے احترام
چہرہ پہ جو ہے داڑھی کی زینت لیے ہوئے

اک میر خستہ حال بھی اخترؔ کے ساتھ ہے
گذرے ہے خوب عشق کی لذت لیے ہوئے

مشکل الفاظ کے معانی:۔ **عارف:** اللہ والا۔ **دامانِ کوہ:** پہاڑ کے دامن۔ **عہدِ وفا کے ساتھ:** اللہ تعالیٰ سے گناہ نہ کرنے کے وعدے کے ساتھ۔ **نفس:** سانس۔

گلشن جنت دور مگر خالق جنت دل میں موجود

ظاہر میں اہلِ دل ہیں گو حسرت لیے ہوئے
باطن مگر ہے دولتِ نسبت لیے ہوئے
مانا کہ میر گلشنِ جنت تو دور ہے
عارف ہے دل میں خالقِ جنت لیے ہوئے

عام طور پر ظاہر میں اہل اللہ کی حالت اتنی اچھی اور خوشگوار نہیں ہوتی اور وہ ظاہری زیبائش اور آسائش کے ساتھ دلچسپی نہیں رکھتے نہ ہی اُنہیں ظاہری دنیاوی خوشیوں کے ساتھ قلبی تعلق ہوتا ہے بلکہ اُن کا دل حقیقت میں اِن سے گھبراتا ہے۔ بظاہر تو وہ بجھے بجھے اور ہلکی پھلکی شکل وصورت والے ہوتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کمالِ تعلق اور نسبتِ خاصہ حاصل ہونے کی وجہ سے اُن کا باطن اور اندرونِ قلب دنیا کے ظاہری گلستان اور گلشنوں سے زیادہ پُر کیف اور پُر بہار ہوتا ہے۔ اُس کی وجہ یہ ہے کہ اگر چہ وہ گلشنوں اور ظاہری زیبائش اور آرائش سے دور ہیں لیکن دنیا کے سارے پھولوں میں خوشبو ڈالنے والا اور حسینوں کو حسن دینے والا اور گلشنوں و گلستانوں کو مختلف پھولوں سے سجانے والا اللہ ان اہل اللہ کے دل میں موجود ہوتا ہے۔ کیونکہ بمقتضائے حدیث شریف اللہ تعالیٰ اولیاء اللہ کے دل میں موجود ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کسی وقت بھی بے چین اور بے سکون نظر نہیں آتے۔ تو اس لیے اسی دنیا میں رہتے ہوئے نقد اور کیش اُن کو خالقِ جنت سے تعلق کا لطف ملتا رہتا ہے۔ رہ گئی آخرت کی جنت اور اُس کی بہاریں تو اگر چہ وہ دور ہیں اور دیر سے ملنے والی ہیں لیکن وہ بھی یقینی ہیں اور اُن جنتوں کے خالق کے دل میں ہونے کی وجہ سے یہ کہنا غلط نہیں ہے کہ اہل اللہ کو دنیا میں رہتے ہوئے جنت اور خالقِ جنت دونوں کا مزہ حاصل ہوتا رہتا ہے۔

صحرا ہو یا دامنِ کوہ میری جنت میرے ساتھ ہے

صحراؤں میں کبھی، کبھی دامانِ کوہ میں
پھرتا ہوں دل میں دردِ محبت لیے ہوئے
اک قلب شکستہ کے اور آہ فغاں کے ساتھ
میں چل رہا ہوں مشعلِ سنت لیے ہوئے

اللہ والوں کو دنیا کے بنگلوں اور شاندار عمارتوں سے دلچسپی نہیں ہوا کرتی بلکہ وہ خلوتوں کی جگہوں کو اور دنیا سے دوری اور بے رغبتی والے مقامات کو زیادہ ترجیح دیتے ہیں۔ گو کہ کبھی ان عمارتوں میں ان کا مسکن ہو مگر کبھی صحراؤں میں اور کبھی دامنِ کوہ میں اللہ تعالیٰ کی یاد سے بھرا دل لیے پھرتے ہیں۔ اور وہ دل وہی ہوتا ہے کہ جس کو اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر مختلف ارمانوں اور حسرتوں کا خون کر کے توڑ دیا گیا ہو۔ اور جب کوئی اس دل کے ساتھ پھرتا ہے تو پھر اس کی تجلّی اور اس کی آہ و فغاں کا رنگ بھی الگ ہوتا ہے۔ ہمارے مشائخِ اہلِ حق اور خاص طور پر ہمارے حضرت والا دامت برکاتہم اللہ تعالیٰ کی محبت میں تڑپتا ہوا دل لیے ہونے کے ساتھ ہر وقت اپنے شیخ والی فکر فکرِ احیائے سنت بھی ساتھ لیے پھرتے ہیں۔ جیسا کہ حضرت نے اس پر ایک رسالہ بھی تحریر فرمایا جس کا نام ہے ''پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری سنتیں'' اور حضرت والا کا کیا ہی خوب شعر ہے ؎

نقشِ قدم نبی ﷺ کے جنت کے راستے
اللہ جل جلالہ سے ملاتے ہیں سنت کے راستے

مشعلِ سنت ہو تو پھر راہ بھٹکنا ممکن نہیں

اور یہی مشعلِ سنت لیے پھرنا ہمارے مشائخ اہلِ حق کا خاص امتیازی وصف ہے اور یہی معیارِ بزرگی اور للّٰہیت ہے۔

حضرت مجدد الف ثانی رحمہ اللہ نے اپنے مکتوبات میں جگہ جگہ اتباعِ سنت پر بڑی شد و مد کے ساتھ توجہ دلائی ہے۔ چنانچہ ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ میں نے بڑے بڑے مقامات طے کیے اور علومِ ظاہرہ، فقہ وتفسیر وحدیث وغیرہ بھی حاصل کی ہے۔ اور پھر چاروں سلسلوں کے مجاہدات اور ریاضتیں برداشت کیں۔ اور پھر سب کچھ سے فارغ ہوکر عجیب عجیب مقامات حاصل ہوئے۔ یہاں تک کہ میں ایک ایسے مقام پر پہنچ گیا کہ اگر میں علمائے ظاہر پر ظاہر کردوں تو مجھے کافر کہہ دیں گے۔ اور اگر اُن اسرار و رموز کو علمائے باطن پر کھول دوں تو وہ مجھے زندیق کہیں گے۔ لیکن پھر سب سے گذر کر ایک اگلا مقام آیا جہاں پہنچ کر جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے خلعت و لباس پہنایا۔ اور اب میں کہتا ہوں کہ اُن سارے مقامات کی میری نگاہ میں کوئی حیثیت باقی نہیں رہی۔ بس اب ایک ہی دعا کرتا ہوں اور جو بھی اُس پر آمین کہے تو وہ بھی فلاح پائے اور کامیاب ہو اور پھر ارشاد فرماتے ہیں کہ اے اللہ! مجھے اتباعِ سنت کی توفیق عطا فرما اور آگے فرماتے ہیں کہ سارے مجاہدات اور ریاضتوں کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہو کہ مقامِ ولایت کا نچوڑ اور لبِّ لباب اتباعِ سنت ہے کہ سنت پر زندہ رہنا اور سنت ہی پر مرنا نصیب ہو۔ اس لیے احقر مختلف مقامات میں یہ بات لکھ چکا ہے کہ کشف و کرامت بزرگی کی دلیل نہیں۔ اور ایک مقام پر حضرت مجدد الف ثانی لکھتے ہیں کہ اگر کوئی ساری رات نفلیں پڑھتا رہے لیکن صبح کی نماز جماعت کے ساتھ نہ پڑھے تو اُس کی لاکھوں کروڑوں تہجد سے بہتر فجر کی نماز باجماعت پڑھنا ہے۔ اسی طرح کروڑوں صدقات دینے سے بڑھ کر زکوٰۃ کے ایک درہم کی ادائیگی ہے۔ اور تائب صاحب نے اسی کو اپنے خاص انداز سے یوں ذکر فرمایا ؎

ہواؤں میں اُڑنا نہ پانی پہ چلنا
شریعت و سنت کے سانچے میں ڈھلنا
یہی کچھ سکھاتے ہیں مرشد ہمارے
یہی سب ہیں اُن کی کرامت کی باتیں

اللہ کے باوفا بندے ہر سانس اُس کے سایہ کے نیچے ہیں

روئے زمیں پہ جو بھی ہے عہد وفا کے ساتھ
وہ ہر نفس ہے سایۂ رحمت لیے ہوئے
جو بے وفا کہ نفس کا اپنے ہوا غلام
جیتا ہے سر پہ سینکڑوں لعنت لیے ہوئے

کتاب میں بعض مقامات پر یہ مضمون بھی گزر چکا ہے کہ جو بندے دنیا میں اللہ تعالیٰ کے احکام کی پابندی کرتے ہوئے اور اُس کی نافرمانی اور گناہوں سے بچتے ہوئے زندگی گزارتے ہیں تو اُن کے اوپر حق تعالیٰ کی خاص رحمت کا سایہ ہوتا ہے۔ جیسے ارشادِ باری تعالیٰ ہے: "ان رحمت اللہ قریب من المحسنین" کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت نیکوکاروں کے قریب ہے۔ اس لیے ایسے لوگ سایۂ رحمت میں ہونے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے عذاب اور آگ سے دنیا و آخرت میں محفوظ ہو جاتے ہیں کہ نہ وہ دنیا میں بے چین ہوں گے اور نہ آخرت میں پریشان ہوں گے۔ اور شعر میں جس عہدِ وفا کا تذکرہ کیا گیا ہے ظاہر ہے اس سے وہی عہد الست مراد ہے جو تمام بنی آدم سے لیا گیا تھا کہ صرف میری ہی عبادت کرنا۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے: "الست بربکم قالوا بلیٰ" اللہ تعالیٰ نے سب ارواح کو اکٹھا جمع فرما کر وہیں عالمِ ارواح میں یہ سوال پوچھا تھا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ تو سب نے کہا تھا کہ بے شک کیوں نہیں آپ ہی ہمارے رب ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "الم أعهد اليكم" اے بنی آدم! کیا میں نے تم سے یہ عہد نہیں لیا تھا کہ تم شیطان کی عبادت نہ کرنا کیونکہ شیطان تمہارا صریح دشمن ہے اور صرف میری ہی عبادت کرو، بس یہی سیدھا راستہ ہے۔ اس لیے عہد کی پابندی اور پاسداری یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا فرمانبردار بندہ بن کر زندگی گزارے اور جو نفس کی فرمانبرداری اور اُس کی غلامی میں زندگی گزارتا ہے اور اللہ کا بے وفا بن کر رہتا ہے تو اُس کے سر پر سینکڑوں لعنتیں برستی رہتی ہیں، کیونکہ بہت سے گناہ تو ایسے ہیں جن پر صراحتاً جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اور اللہ اور فرشتوں کی لعنت کا تذکرہ فرمایا ہے اور باقی دوسرے گناہوں کے کرنے کے وقت بھی انسان کے اوپر سے رحمت کا سایہ ہٹ جاتا ہے تو وہ خود بخود لعنت کے زیرِ سایہ پہنچ جاتا ہے۔

اولیاء اللہ کی صورت ہو تو اپنے تو اپنے غیر بھی احترام کرتے ہیں

اپنے تو کیا ہیں غیر بھی کرتا ہے احترام
چہرہ پہ جو ہے داڑھی کی زینت لیے ہوئے

ایک میر خستہ حال بھی اختؔر کے ساتھ ہے
گذرے ہے خوب عشق کی لذت لیے ہوئے

حضرت والا دامت برکاتہم دین کی پابندی اور اپنے ظاہری و باطن کو اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے کے مطابق سجا لینے اور کر لینے کا ایک خاص فائدہ بیان فرما رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے دین میں یہ اثر رکھا ہے کہ جو پکا دیندار ہوجاتا ہے تو اپنے اور پرائے سب اُس کا احترام کرنے لگتے ہیں۔ بالخصوص جس شخص کا چہرہ ڈاڑھی کی سنت کے ساتھ آراستہ ہوجائے تو حق سبحانہ وتعالیٰ اُس کی برکت سے اُس شخص کو لوگوں میں معزز فرما دیتے ہیں۔

ڈاڑھی کی شرعی حیثیت احادیث مبارکہ کی روشنی میں

بخاری شریف کی حدیث ہے:

﴿عَنِ ابْنِ عُمَرَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ خَالِفُوا الْمُشْرِكِيْنَ وَفِّرُوا اللُّحٰى وَأَحْفُوا الشَّوَارِبَ وَكَانَ ابْنُ عُمَرَ إِذَا حَجَّ أَوِ اعْتَمَرَ قَبَضَ عَلٰى لِحْيَتِهٖ فَمَا فَضَلَ أَخَذَهٗ﴾

(صحیح البخاری، باب تقلیم الاظفار، ج: ۲، ص ۸۷۵)

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مشرکین کی مخالفت کرو، ڈاڑھیوں کو بڑھاؤ اور مونچھوں کو کٹاؤ اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں جب حج یا عمرہ کرتے تھے تو اپنی ڈاڑھی کو اپنی مٹھی میں پکڑ لیتے تھے پس جو مٹھی سے زائد ہوتی تھی اس کو کاٹ دیتے تھے۔

اور بخاری شریف کی دوسری حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

﴿قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ انْهَكُوا الشَّوَارِبَ وَأَعْفُوا اللُّحٰى﴾

(صحیح البخاری، باب اعفاء اللحی، ج: ۲، ص: ۸۷۵)

یعنی مونچھوں کو خوب باریک کتراؤ اور ڈاڑھیوں کو بڑھاؤ۔

پس ایک مٹھی ڈاڑھی رکھنا واجب ہے جس طرح وتر کی نماز واجب ہے، عیدالفطر کی نماز واجب ہے، بقرعید کی نماز واجب ہے، اسی طرح ایک مٹھی ڈاڑھی رکھنا واجب ہے اور چاروں اماموں کا اس پر اجماع ہے۔ کسی امام کا اس میں اختلاف نہیں۔ علامہ شامی تحریر فرماتے ہیں:

﴿اَمَّا اَخْذُ اللِّحْيَةِ وَهِيَ مَادُوْنَ الْقُبْضَةِ كَمَا يَفْعَلُهٗ بَعْضُ الْمَغَارِبَةِ وَمُخَنَّثَةُ الرِّجَالِ فَلَمْ يُبِحْهُ اَحَدٌ﴾

(فتاویٰ شامیۃ، ص: ۱۲۳)

﴿وَاَمَّا الْاَخْذُ مِنْهَا وَهِيَ دُوْنَ ذٰلِكَ كَمَا يَفْعَلُهٗ بَعْضُ الْمَغَارِبَةِ وَمُخَنَّثَةُ الرِّجَالِ فَلَمْ يُجِزْهُ اَحَدٌ وَاَخْذُ كُلِّهَا فِعْلُ الْيَهُوْدِ الْهِنْدِ وَمَجُوْسِ الْاَعَاجِمِ﴾

(فتح القدیر، الدر المختار)

یعنی ڈاڑھی کا کترانا جبکہ وہ ایک مٹھی سے کم ہو جیسا کہ بعض اہلِ مغرب اور ہیجڑے لوگ کرتے ہیں کسی کے نزدیک جائز نہیں۔

حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں کہ ڈاڑھی کا منڈانا یا ایک مٹھی سے کم پر کترانا دونوں حرام ہیں اور ڈاڑھی ڈاڑھ سے ہے اس لیے ٹھوڑی کے نیچے سے بھی ایک مٹھی ہونی چاہیے اور چہرہ کے دائیں اور بائیں طرف سے بھی ایک مٹھی ہونا چاہیے یعنی تینوں طرف سے ایک مٹھی ڈاڑھی رکھنا واجب ہے۔ بعض لوگ سامنے یعنی ٹھوڑی کے نیچے سے تو ایک مٹھی رکھ لیتے ہیں لیکن چہرہ کے دائیں اور بائیں طرف سے کترا دیتے ہیں۔ خوب سمجھ لیں کہ ڈاڑھی تینوں طرف سے ایک مٹھی رکھنا واجب ہے۔ اگر ایک طرف سے بھی ایک مٹھی سے چاول برابر کم یعنی ذرا سی بھی کم ہوگی تو ایسا کرنا حرام اور گناہِ کبیرہ ہے۔ (بہشتی زیور، جلد:۱۱، صفحہ:۱۱۵)

کسریٰ کے قاصدوں سے حضور ﷺ کا منہ پھیر لینا اور ہمارے لیے عبرت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کسریٰ بادشاہ کے دو قاصد آئے، اُن کی ڈاڑھیاں منڈی ہوئی تھیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے چہرہ مبارک پھیرلیا، ان کی صورتوں کو دیکھنا تک گوارا نہ فرمایا اور ان سے پوچھا کہ تمہیں ڈاڑھی منڈانے کا حکم کس نے دیا؟ وہ بولے کہ ہمارے ربّ کسریٰ نے۔ عجمی لوگ اپنے بادشاہوں کو رب کہتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مجھے تو میرے رب نے ڈاڑھی بڑھانے اور مونچھیں کاٹنے کا حکم فرمایا ہے۔'' (البداية والنهاية وغيرهما)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میرے رب نے تو یہ حکم فرمایا ہے کہ ڈاڑھی بڑھاؤ۔ اب جو لوگ ڈاڑھی منڈاتے ہیں وہ کہنے کو تو مسلمان ہی ہیں مگر تنہائی میں بیٹھ کر ذرا غور کریں اور دل کی گہرائیوں سے سوچیں کہ اپنا رشتہ کس سے جوڑ رہے ہیں؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف طور پر فرمادیا ہے: ''میرا رب اللہ ہے جس نے مجھے ڈاڑھی بڑھانے اور مونچھیں کاٹنے کا حکم فرمایا ہے۔'' آتش پرست مجوسیوں نے کہا کہ ہمارا رب کسریٰ جس نے ڈاڑھی منڈانے اور مونچھیں بڑھانے کا حکم دیا ہے۔

اب ڈاڑھی منڈے ذرا انصاف سے بتائیں ان کا رب اللہ ہے یا کسریٰ؟ یا اللہ! تو ہمارا رب ہے، ہمیں دل و جان سے ظاہر و باطن سے صورت و سیرت سے اپنی ربوبیت کا تابع کردے، کفار کی مشابہت سے دُور رکھ۔

کسریٰ سے متعلق جانتے بھی ہیں یہ کون تھا؟ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا بدترین دُشمن، جس ملعون نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نامۂ مبارک چاک کردیا تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں حد درجہ گستاخی کرتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قاصد کو جواب دیا: ''وہ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) میرا غلام ہو کر مجھے خط لکھتا ہے؟''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بات پہنچی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''مزق الله ملكه''، یعنی اللہ تعالیٰ اس کے ملک کو یونہی ٹکڑے ٹکڑے کردیں گے۔'' (صحيح البخاری)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد حرف بحرف سچا ثابت ہوا۔ اس ملعون کو اس کے بیٹے نے قتل کر دیا اور خود تخت نشین ہو گیا۔ اس ملعون کا ملعون جانشین بھی چھ ماہ سے زائد زندہ نہ رہ سکا۔ تمام مؤرخین نے لکھا ہے کہ چار سال کے اندر اندر دس بادشاہ تبدیل ہوئے۔ آخر چند سال بعد یہ ملک مسلمانوں کے زیرِ نگین آ گیا۔ اس صدیوں پرانی سلطنت کا نام ونشان مٹ گیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادِ گرامی (اذا هلك كسرىٰ فلا كسرىٰ بعدهٗ (مسلم) ''اس کسریٰ کے مرنے کے بعد کوئی اور کسریٰ نہیں ہوگا۔) کی تصدیق پوری دنیا نے آنکھوں سے دیکھ لی۔

ڈاڑھی منڈے اس ملعون کا انجام سامنے رکھ کر سوچیں کہ اپنا رشتہ کس سے جوڑ رہے ہیں؟ اپنا رب کس کو تسلیم کر رہے ہیں؟ اگر کسی نے اب تک اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر ایسے شیطان سے ناتا جوڑے رکھا تو اب بھی کچھ گیا نہیں کہ ابھی وقت ہے ؎

ظالم ابھی ہے فرصتِ توبہ نہ دیر کر
وہ بھی گرا نہیں جو گرا پھر سنبھل گیا

اس قصہ میں چند باتیں سوچنے کی ہیں:

(۱)...... ایک یہ کہ دونوں قاصد کافر تھے اور قاعدہ یہ ہے کہ کسی بھی کافر کو سب سے پہلے اسلام کی دعوت پیش کی جاتی ہے، اسے احکامِ اسلام کی تلقین نہیں کی جاتی کہ نماز پڑھو، روزہ رکھو بلکہ اسے تو یہی کہا جاتا ہے کہ اسلام قبول کرو، اگر کرلے تو اب اَحکام کی تبلیغ کی جائے گی، وہ دونوں ڈاڑھی منڈے کافر تھے۔

(۲)...... دوسری بات یہ کہ مہمان تھے، مہمان کوئی بھی ہو اس کی خاطر داری کی جاتی ہے۔

(۳)...... تیسری بات یہ کہ بادشاہ کے قاصد تھے۔ قاصدوں کا ویسے ہی احترام کیا جاتا ہے خواہ دُشمن کے ہی بھیجے ہوئے ہوں۔ یہ احترام اس پہلو سے بھی ضروری ہے کہ شاید ان کی اور ان کے بھیجنے والے سلاطین کی ہدایت کا ذریعہ بن جائے۔

ان تمام باتوں کو ذہن میں رکھ کر سوچیں کہ وہ مسلمان نہیں، ہیں بھی مہمان اور بادشاہ کے بھیجے ہوئے قاصد! لیکن رعایت کے ان سب اسباب کے باوجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی طرف التفات نہیں فرماتے۔ ایک نظر دیکھنا بھی گوارا نہیں فرماتے۔

صورت شفاعت کے قابل نہ ہوئی تو

اس سے اندازہ لگائیں کہ جو مسلمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک صورت اختیار کرنے سے بھی گریز کرتے ہیں وہ خود کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کے امیدوار کیوں کر سمجھتے ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جن کا چہرہ دیکھنا بھی گوارا نہ فرمائیں، ان کی سفارش کیوں کر فرمائیں گے؟

حدیث میں ہے کہ قیامت کے روز جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی اُمت کو حوضِ کوثر پر پانی پلا رہے ہوں گے ایک قوم حوضِ کوثر پر آنا چاہے گی لیکن فرشتے انہیں روک دیں گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرمائیں گے کہ یہ تو میری اُمت کے لوگ ہیں اُن کو آنے دو۔ فرشتے عرض کریں گے اِنَّکَ لَا تَدْرِیْ مَا اَحْدَثُوْا بَعْدَکَ آپ کو معلوم نہیں کہ انہوں نے آپ کے بعد کیا بدعات ایجاد کیں۔ یہ بظاہر آپ کو اپنے اُمتی نظر آ رہے ہیں مگر آپ کو معلوم نہیں کہ آپ کے بعد ان لوگوں نے دین میں کیسی نئی نئی باتیں داخل کر دیں؟ یہ جنہیں آپ اپنی اُمت سمجھ رہے ہیں بدعتی ہیں۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمائیں گے سُحْقًا سُحْقًا لِمَنْ غَیَّرَ بَعْدِیْ جن لوگوں نے میرے بعد لایا ہوا دین تبدیل کر دیا انہیں دُور ہٹاؤ، دور ہٹاؤ۔ (صحیح البخاری)

یہاں سوچنے کی بات یہ ہے کہ ان بدعتیوں کی شکل وصورت تو مسلمانوں کی سی ہوگی، اسی لیے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اشتباہ ہوگا، ان کی ڈاڑھیاں اور معصوم چہرے دیکھ کر فرشتوں سے فرمائیں گے انہیں کیوں ہٹاتے ہو؟ یہ تو میرے اُمتی ہیں۔ پھر حقیقت کھلنے پر انہیں دفع کر دیں گے لیکن جن کے چہرے پر ڈاڑھی ہی نہیں، شکل وصورت ہی مسلمانوں سے مختلف ہے، ان کو حوضِ کوثر تک رسائی کیسے ہوگی؟ بدعتیوں کی صورت تو مسلمانوں کی سی ہوگی اس لیے وہ کسی طرح حوضِ کوثر تک پہنچ جائیں گے لیکن قریب پہنچنے پر انہیں دھکیل کر دور کر دیا جائے گا، اور جن کی صورت ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صورتِ مبارکہ سے مختلف ہوا نہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کیسے بلائیں گے؟ انہیں دیکھ کر تو کسی قسم کا اشتباہ بھی نہیں ہوسکتا۔ یہ ڈاڑھی منڈے ابھی سے سوچ لیں کہ اگر خدانخواستہ! دور سے ان کی شکل دیکھ کر ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرما دیا کہ سُحْقًا سُحْقًا انہیں دور ہٹاؤ، دور ہٹاؤ۔ لے جاؤ جہنم میں، تو کیا بنے گا؟ (خطبات الرشید، ''اللہ کے باغی مسلمان''، صفحہ ۳۵-۳۸)

ایرانی اور مرزا قتیل کا واقعہ

دِلی کے مشہور شاعر مرزا قتیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح وثناء میں بہت اعلیٰ درجے کی نعتیں کہا کرتے تھے۔ عشق ومحبت میں ڈوبا ہوا ان کا فارسی کلام کسی ایرانی نے سنا تو اسے خیال گزرا کہ شاید کوئی بڑے عارف اور صاحبِ نسبت بزرگ ہیں۔ اس لیے ایران سے سفر کر کے دِلی ان کی زیارت کو پہنچا۔ ان کے گھر جا کر پتا کیا تو گھر والوں نے بتایا کہ مرزا صاحب حجام کی دکان پر گئے ہیں۔ حجام کی دکان پر گیا وہاں دیکھا کہ عاشق رسول شاعر صاحب ڈاڑھی

منڈوار ہے ہیں۔ یہ گریہ نظر دیکھ کر اس کے نادیدہ عاشق بے چارے ایرانی کے تو پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ ورطۂ حیرت میں ڈوب گیا اور پوچھا کہ ''آغا! ریش می تراشی؟'' اے عاشقِ رسول! یہ کیا؟ ڈاڑھی منڈا رہا ہے؟ اس نے بھی شاعرانہ انداز سے جواب دیا'' بلے ریش می تراشم ولے دل کسے نمی خراشم''۔ ہاں ڈاڑھی ہی منڈا رہا ہوں کسی کا دل تو نہیں دُکھا رہا۔ آگے اس ایرانی کا جواب بھی سنیئے! یا اللہ! تجھے تیری اس رحمت کا صدقہ تو اس ایرانی کا جواب ہم سب کے دلوں کی گہرائی میں اُتار دے۔ وہ بولا: ''نادان! دلِ سید دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم می خراشی۔'' ارے نادان! تو کہتا ہے میں کسی کا دل نہیں دُکھا رہا تو تو دونوں جہانوں کے سردار صلی اللہ علیہ وسلم کا دل دُکھا رہا ہے۔

جادوگروں پر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے مشابہت کا اثر

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ میں جادوگر اپنی رسیاں اور چھڑیاں لے کر آئے۔ انہیں پھینکنے کی دیر تھی کہ وہ سب کے سب سانپ بن گئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے عصا پھینکا جو بہت بڑا اژدھا بن گیا اور جادوگروں کے تمام سانپوں کو نگل گیا۔ یہ معجزہ دیکھ کر تمام جادوگر ایمان لے آئے۔ ایمان بھی کتنا پختہ کہ فرعون نے جب دھمکی دی کہ تمہارے ہاتھ پاؤں کٹوا دوں گا، تمہیں سولی پر لٹکا دوں گا تو وہ للکار کر کہتے ہیں:

﴿فَاقْضِ مَا اَنْتَ قَاضٍ اِنَّمَا تَقْضِیْ هٰذِهِ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا﴾

(سورۃ طٰہٰ، آیۃ: ۷۲)

ترجمہ: اے مردود! تو کس چیز سے ہمیں ڈرا رہا ہے؟ جو چاہے فیصلہ کر دے تو ہمارا کر کیا لے گا؟ زیادہ سے زیادہ ہماری جان لے لے گا، دنیوی زندگی ختم کر دے گا۔

انداز ہ لگایئے! دنیوی زندگی کی قدر و منزلت ان کے نزدیک مچھر کے پر کے برابر بھی نہ رہی تھی، دنیا کی زندگی ختم بھی ہوگئی تو کیا ہو گیا وطن پہنچ جائیں گے۔ بس اِدھر ایمان لائے اور اُدھر انہیں اتنا اونچا مقام حاصل ہو گیا، وقت کے سب سے بڑے جابر کی آنکھوں میں آنکھیں ملا کر کہتے ہیں کہ ہمارا جو چاہے کر لے، جادوگروں کو تو اللہ تعالیٰ نے اتنا اونچا مقام عطا فرمایا، مگر ان کے مقابلہ میں فرعون جو سالہا سال موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ رہا بلکہ انہیں اپنی گود میں پالا، راندۂ درگاہ ہی رہا۔ ہوتا تو سب اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ہے لیکن حضراتِ مفسرین رحمہم اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے کہ اس کا ایک ظاہری سبب یہ تھا کہ جادوگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لباس میں آئے تھے۔ اس زمانہ میں یہ مقابلہ کا ایک طریقہ تھا۔ شاید اب بھی دنیا میں کہیں اس کا رواج ہو۔ بہر حال اس وقت یہی دستور تھا کہ مقابلہ کے دونوں فریق ایک لباس میں ہوں۔ جادوگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تو پابند نہ کر سکتے تھے کہ ہمارے جیسا لباس پہنیں، اس لیے انہوں نے خود حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسا لباس پہن لیا، بس لباس میں مشابہت پر ہی اللہ کی رحمت کو جوش آ گیا اور ایک لمحہ میں ہی ان کی کایا پلٹ دی۔ اندازہ لگایئے! محبوب کی صورت اختیار کرنے کا کیا اثر ہوتا ہے؟ (خطبات الرشید ''اللہ کے باغی مسلمان'' صفحہ ۵۱-۵۷)

جب نبی ﷺ محبوب تو آپ کی ہر ادا بھی محبوب

اور ڈاڑھی کٹانے والے حضرات کو اس اعتبار سے بھی اپنے اس عمل پر غور کرنا چاہیے کہ جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے سب سے زیادہ محبوب اور پیارے نبی تھے تو آپ کی ظاہری اور باطنی جتنی خوبیاں اور کمالات ہیں وہ بھی اللہ کو سب سے زیادہ پسند ہیں۔ اس لیے آپ کی شکل وصورت اور آپ کے اخلاق وعادات بھی اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ محبوب تھے۔ اور ہم سب جانتے ہیں کہ شادی وغیرہ کے موقع پر اکثر جوان اپنی محبوب بیوی کے لیے خوبصورت اور عمدہ قسم کا لباس ڈھونڈتے پھرتے ہیں اور اپنی پسند اور چاہت کے مطابق اُس کا رنگ اور مٹیریل (Material) پسند کر کے لاتے ہیں اور بیوی کو پیش کرتے ہیں کہ میں تمہیں جس صورت میں دیکھنا چاہتا ہوں اور جو لباس مجھے پسند ہے تم میری پسند کے مطابق اس کو پہنو۔ ٹھیک اسی طرح اللہ تبارک وتعالیٰ بھی اپنے بندے کو اُسی صورت میں دیکھنا چاہتے ہیں جو اللہ کی بارگاہ میں سب سے زیادہ محبوب اور پیاری صورت ہے۔ اور وہ وہی صورت ہے جو جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا ہوئی۔ اور آپ کے بعد آپ کے صحابہ، تابعین اور تبع تابعین اور علمائے صالحین کو عطا کی گئی۔ یعنی جس میں ایسا چہرہ شامل ہے جو ڈاڑھی کی خوبصورت زینت اپنے اوپر سجائے ہوئے ہے لہٰذا اے وہ لوگو! جو اللہ کی نگاہ میں محبوب اور پیارے بننا چاہتے ہوں تو پھر اللہ کے پیارے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت بنا لو۔ تو ان شاء اللہ ہم اور آپ بھی اللہ کے محبوب بن جائیں گے۔

ڈاڑھی کٹا کر کھلم کھلا اللہ کا باغی بننا

اور اے ڈاڑھی کٹانے والے قابلِ رحم بھائیو! کیا آپ نے اس مسئلہ پر غور کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں دو قسم کے گنہگاروں میں بہت بڑا فرق ہے۔ ایک وہ گنہگار جو کسی گناہ کو چھپ کر کرتا ہے اور اگر توبہ کی توفیق ہو جائے تو توبہ کر لیتا ہے وگرنہ کم سے کم اُسے حجاب اور شرم محسوس ہوتی ہے۔ اور دوسرا وہ گنہگار جو کھلم کھلا اور برسرِعام گناہوں کو کرتا پھرتا ہے اور اُن پر اُس کی جسارت ودلیری اس درجہ بڑھ جاتی ہے کہ اُسے کسی کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی۔ اور نہ اُس کے کرنے میں کوئی عار اور شرم لاحق ہوتی ہے۔ تو ایسے گنہگار کے اوپر جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سخت ترین وعید وارد ہوئی ہے۔ چنانچہ ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

﴿كُلُّ أُمَّتِيْ مُعَافًى اِلَّا الْمُجَاهِرِيْنَ﴾

(متفق علیہ)

کہ میری ساری اُمت قابلِ معافی ہے اور اللہ کی شانِ رحمت سے کچھ بعید نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ سب کو بخش دے۔

یعنی اگر اللہ کی رحمت جوش میں آئے تو وہ پھر کسی ضابطے کی پابند نہیں بلکہ ہر ایک کو اللہ کی معافی شامل ہو جائے گی۔ گو کہ ضابطہ اور قانون کی بات تو شریعت میں صاحبِ شریعت نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام سے یہ بتائی گئی ہے کہ بڑے گناہ توبہ کے بغیر معاف نہیں ہوتے اگر چہ صغیرہ گناہ دوسرے نیک اعمال کے ذریعے معاف ہوتے رہتے ہیں۔

لیکن کس قدر قابلِ رحم ہیں وہ لوگ جو اللہ کے اس عام معافی کے اعلان میں شامل ہونے سے بھی بزبانِ نبوت مستثنیٰ اور علیحدہ کر دیے گئے کہ اس عام معافی کے اعلان سے بھی وہ لوگ مستثنیٰ جو کھلم کھلا گناہ کرنے والے ہیں اور سر عام اللہ کی نافرمانی کرنے والے ہیں۔ یعنی ایسے گنہگاروں کا ٹولہ اور گروہ جو نہ خالق سے شرماتے ہیں اور نہ مخلوق سے اُنہیں یہ والی معافی بھی نہیں ملے گی۔ اب آپ غور سے اس معاملے میں سوچیں کہ ڈاڑھی کٹا کر مسلمان کھلے عام اللہ تعالیٰ سے بغاوت کا اعلان کرتا پھرتا اور وہ ایک ایسے جرم کا مرتکب ہوتا ہے کہ جو کسی سے ڈھکا چھپا نہیں۔ اور دوسرے گناہ اگر چہ گناہ ہیں اور باعثِ عذابِ خداوندی ہیں مگر یہ ایسا گناہ ہے کہ چلتے پھرتے، اُٹھتے بیٹھتے، کھاتے پیتے، سوتے جاگتے اور جیتے مرتے ہر حال میں انسان کے ساتھ چپکا ہوا ہے۔ یہاں تک کہ وہ جب قبر میں اُتر رہا ہے تو اس گناہ کو ساتھ لے کر اُتر رہا ہے۔ اس پہلو سے اس گناہ کی شدت اور سنگینی بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے۔

چنانچہ احقر کے ایک دوست جنوبی افریقہ میں رہتے ہیں اور زندگی بھر ڈاڑھی کٹاتے رہے تو ایک دن ملاقات کے دوران جب اُن سے اس موضوع پر بات کی گئی تو مسکرا کر کہنے لگے کہ ہاں! یہ بات بالکل صحیح ہے اور ڈاڑھی رکھنی چاہیے۔ لیکن جب احقر نے اس کھلم کھلا گناہ کے پہلو اُن پر واضح کیا اور یہ کہ اس گناہ کے ذریعے سے مسلمان ہر وقت عملی طور پر اللہ تعالیٰ کے باغی ہونے کا اعلان کرتا رہتا ہے تو وہ یہ سن کر یکلخت چونک اُٹھے اور کہنے لگے کہ اس انداز سے میں نے کبھی اس پر سوچا ہی نہیں تھا۔ بہت ہی نادم اور شرمندہ ہوئے اور اپنی حالت پر انتہائی افسوس کا اظہار کیا۔

اس لیے احقر ہر شخص کو یہ دعوت دیتا ہے کہ وہ آخری لمحۂ حیات آنے سے پہلے اپنی حالت پر سنجیدگی سے غور کریں اور محض ان باتوں کو مولوی یا صوفیوں کی بات کہہ کر ایک طرف نہ ڈال دے بلکہ یہ جو کچھ لکھا جا رہا ہے یہ سارا قرآن وحدیث ہے اور صرف اللہ اور رسول کی بات ہے۔ کوئی بھی مولوی یا عالم اپنی کسی فیکٹری میں کسی بات کو بنا کر پیش نہیں کرتا بلکہ وہ صرف بتاتا ہے۔ یعنی بنانا اللہ کا کام ہے اور انبیاء و علماء کا کام بتانا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں دین کی صحیح فہم اور سمجھ عطا فرما کر اُس پر عمل استقامت کے ساتھ نصیب فرما دے۔

حضرت میر صاحب دامت برکاتہم کو لذتِ حیات مل گئی

اس کے بعد حضرت والا فرماتے ہیں کہ احقر کے ساتھ رہنے کی برکت سے جو میر عشرت جمیل صحبتوں اور خدمتوں کے ذریعے سے دل خوش کر کے عشقِ خداوندی کی لذت اُٹھا رہے ہیں تو کوئی خود اُن سے پوچھ کر دیکھے کہ وہ کیسی بہاروں میں ہیں۔ اور گویا اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کے پیرائے میں حضرت والا نے اس کو ذکر کیا ہے۔ اور حضرت میر صاحب کے اس وصفِ خاص محبتِ خداوندی کو ایک خاص انداز سے ذکر فرمایا ہے۔ اور اس طرف بھی اشارہ کر دیا کہ جو کسی اللہ کے عاشق کے ساتھ رہے گا اُسے خود بخود عشق کی دولت حاصل ہو جائے گی۔

انعامِ خونِ آرزو

جہانِ رنگ و بو میں ہر طرف بس آب و گل پایا
مگر عاشق کے آب و گل میں ہم نے دردِ دل پایا
ہمارے خونِ حسرت پر فلک رویا زمیں روئی
مگر اے دل مبارک ہو کہ تو نے دردِ دل پایا

پھرتا ہوں دل میں درد بھرا دل لیے ہوئے

پھرتا ہوں دل میں درد بھرا لیے ہوئے
اور ہر نفَس میں قربِ منازل لیے ہوئے
پھرتا ہے مجھ کو عشق لیے چاک گریباں
گرچہ خرد ہے طوق و سلاسل لیے ہوئے
جی چاہتا ہے ایسی جگہ میں رہوں جہاں
جیتا ہو کوئی درد بھرا دل لیے ہوئے
مانا کہ ہے طوفاں میں محبت کا سفینہ
لیکن ہے ساتھ لطف سوا حل لیے ہوئے
غفلت کا ان کے دل پہ نہ کرنا کبھی گماں
ہنستے ہیں ایک درد بھرا دل لیے ہوئے
میں ڈھونڈتا ہوں تجھ کو محبت کہاں ہے تو
اک قلب شکستہ ترے قابل لیے ہوئے
اخترؔ اُسی کا فیض ہے عالم میں چار سُو
پھرتا ہے جو بھی درد بھرا دل لیے ہوئے

مشکل الفاظ کے معانی:۔ منازل: اللہ تعالیٰ کے محبت کے درجات۔ **چاک گریباں**: کنایہ ہے اللہ تعالیٰ کے عشق سے۔ **خرد**: عقل۔ **طوق**: کڑا۔ **سلاسل**: زنجیریں۔ **سفینہ**: کشتی۔ **سواحِل**: ساحل۔ **قلبِ شکستہ**: ٹوٹا ہوا دل۔ **چار سُو**: چاروں طرف۔

میرا سفر و حضر اور خلوت و جلوت اللہ پر فدا ہے

پھرتا ہوں دل میں درد بھرا لیے ہوئے
اور ہر نفَس میں قربِ منازل لیے ہوئے
پھرتا ہے مجھ کو عشق لیے چاک گریباں
گرچہ خرد ہے طوق و سلاسل لیے ہوئے

لوگ دنیا میں مختلف اپنے دنیوی اغراض و مقاصد کے لیے ہر طرف سفر کرتے اور چکر لگاتے پھرتے ہیں۔ کوئی اپنی تجارت کو فروغ دینے کے لیے اپنے مال و دولت کے نشے میں اور کوئی کسی حسین و حسینہ کے چکر میں

مختلف دور دراز ملکوں کے سفر کرنا گوارا کرتا ہے۔ کوئی وزارتوں وحکومتوں اور منصبوں اور عہدوں کی خاطر صبح سے شام اور شام سے صبح سفر واسفار میں سرگرداں و پریشان پھرتا رہتا ہے، تو کوئی اپنے نام ونمود اور شہرت وعظمت کی چاہت میں ہر سمت بھاگا پھرتا ہے، مگر اللہ کے وہ نیک بندے جو اپنے سینے میں ایسا دل رکھتے ہیں جو حقیقت میں دل کہلانے کے قابل ہے یعنی جو اللہ کی محبت کے درد سے بھرا ہوا ہے، اُن کے چلنے پھرنے اور اُن کی نقل وحرکت کا مقصد اور غرض وغایت بس ایک بات ہوتی ہے کہ ہر قدم پر اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کی تدبیریں اور طریقے سالکین کو بتائے جائیں اور ہر سانس قدم بہ قدم لحہ بہ لحہ منزلِ مقصود کی طرف خود بھی بڑھ رہے ہوں اور لوگوں کو بھی بڑھایا جارہا ہو، کیونکہ ظاہر ہے کہ ان لوگوں کا ہر سانس اللہ تعالیٰ کی یاد میں رچا بسا ہوتا ہے۔ چاہے خلوتوں میں اللہ کا ذکر ہو یا جلوتوں میں اللہ تعالیٰ کی محبت وعظمت کے تذکرے ہوں۔ اسی لیے ایسے لوگوں کی زندگی ہی زندگی کہلانے کے قابل ہے اور یہی وہ لوگ ہیں جن کا جینا، جینا ہے اور مرنا، مرنا ہے۔

اور جب یہ دولت کسی کے دل کو میسر آجاتی ہے اور وہ عشقِ خداوندی کے رنگ میں رنگ جاتا ہے تو پھر مال ودولت کی محبت اور اولاد وگھر بار کے ساتھ تعلق اور لگاؤ اُس کو اللہ کی راہ میں چلنے پھرنے سے پاؤں کی زنجیر نہیں بنتا۔ اس سے تو انکار نہیں ہے یہ محبتیں انسان کے اندر فطری طور پر رکھی گئی ہیں لیکن ''والذین اٰمنوا اشد حبًا لِلّٰہ'' کے اعلان کے مطابق اللہ تعالیٰ کا سچا عاشق ان محبتوں پر حکمِ الٰہی کو غالب کرکے آگے بڑھتا ہے۔ اور بظاہر عقل وخرد کے تقاضوں اور چاہتوں کو ٹھکراتا ہوا اپنے مولا کے راستے میں دیوانہ وار اللہ تعالیٰ کی محبت پھیلاتا ہوا پھرتا ہے۔ جیسا کہ دیوانگی اور عقل وخرد کے عنوان سے کئی جگہ مضمون گزر چکا ہے کہ اہلِ ایمان کی نظر ظاہری مفادات پر نہیں ہوتی اور اُن کا نقصان کوئی نقصان نہیں سمجھا جاتا اور اہلِ خرد اپنی دنیا کے بننے اور بگڑنے کو ہی سب کچھ سمجھتے ہیں۔ اور اُسی اصول پر اپنے ہر فیصلے کی بنیاد رکھتے ہیں۔

اہل دل اللہ والوں کے بعض خاص احوال کا تذکرہ

جی چاہتا ہے ایسی جگہ میں رہوں جہاں
جیتا ہو کوئی درد بھرا دل لیے ہوئے

مانا کہ ہے طوفاں میں محبت کا سفینہ
لیکن ہے ساتھ لطف سواحل لیے ہوئے

غفلت کا ان کے دل پہ نہ کرنا کبھی گماں
ہنستے ہیں ایک درد بھرا دل لیے ہوئے

میں ڈھونڈتا ہوں تجھ کو محبت کہاں ہے تو
اک قلبِ شکستہ ترے قابل لیے ہوئے
اختؔر اسی کا فیض ہے عالم میں چار سُو
پھرتا ہے جو بھی درد بھرا دل لیے ہوئے

ارشاد فرماتے ہیں کہ میرے قلب کو صرف ایسی جگہوں سے اور وہاں کے رہنے والوں سے مناسبت ہے کہ جہاں کچھ اللہ کا نام لینے والے اُس کی یاد میں اپنے مولا کو پکار رہے ہوں، کیونکہ فطرت کا اصول ہے کہ **اَلْجِنْسُ یَمِیْلُ اِلَی الْجِنْسِ** کہ جنس جنس کی طرف مائل ہوا کرتی ہے۔ اس لیے حضرت والا ایسی جگہوں کو ڈھونڈتے اور تلاش کرتے پھرتے ہیں جہاں کوئی درد بھرا دل لیے ہوئے رہتا ہو کیونکہ خود حضرت کے سینے میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے ایسا ہی درد بھرا دل عطا فرمایا ہے۔

پھر آگے ارشاد فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی محبت کا معاملہ اگرچہ ظاہری مشکلات اور پریشانیوں کا ہوا کرتا ہے اور ہر سمت مخالف ہواؤں کا طوفان ہے جس میں محبت کا سفینہ پھنسا ہوا ہے، مگر یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ اللہ کے عاشقوں کو اپنے مولا کے راستے میں جس طرح موافق حالت میں مزہ ملتا ہے اسی طرح ناموافق حالت میں بھی ان کے دل میں کیف و سرور کا عجیب عالم رہتا ہے۔ اور جس طرح وہ ساحل پر پہنچ کر خوش رہتے ہیں اسی طرح وہ اپنے مولا کے اوپر اپنی تمناؤں اور آرزوؤں کو قربان کرنے کی صورت میں اگرچہ منزلِ مقصود حاصل نہ ہو رہی ہو اور ساحل بظاہر نظر نہ آ رہا ہو مگر اُن کو پھر بھی ساحل کا مزہ ملتا ہے۔ کیونکہ اللہ کے راستے میں چلنے والا مؤمن اور ہر قدم پر اللہ کو راضی کرنے والا وہ ہر آن اپنی منزل ہی پر ہوا کرتا ہے۔ اس لیے ایسے لوگوں کو حق تعالیٰ ساحل ہی کا لطف عطا فرما دیتے ہیں۔

اس کے بعد حضرت والا ارشاد فرماتے ہیں کہ اللہ والوں کو اگر کبھی ہنستا ہوا دیکھو تو یہ یاد رکھنا کہ اُن کی ہنسی بھی عبادت ہے۔ اس لیے کہ وہ ہنسنا اس لیے نہیں ہوتا کہ وہ ہنسنے کی حالت میں آخرت سے غافل ہیں بلکہ مولا کی یاد تو ہر وقت اُن کے قلب میں رچی بسی ہوتی ہے۔ صرف ظاہر میں اپنے اردگرد رہنے والے انسانوں سے اُنس اور تعلق اور بے تکلفی کی خاطر وہ کبھی کبھی ہنسی خوشی والا معاملہ کرتے ہیں۔ جیسا کہ خواجہ صاحب نے ایک مشہور موقع پر کئی بڑے علماء کی موجودگی میں یہ شعر پڑھا تھا ؎

ہنسی بھی ہے گو لبوں پہ ہر دم
اور آنکھ بھی میری نم نہیں ہے

مگر جو دل رو رہا ہے پیہم
کسی کو اُس کی خبر نہیں ہے

اُس کے بعد اشعار میں حضرت والا فرماتے ہیں کہ اے محبت! میں تجھے ڈھونڈتا پھر رہا ہوں کیونکہ میں یہ جانتا ہوں کہ تو صرف اُسی دل میں آتی ہے جو ٹوٹا ہوا اور تیری خاطر شکستہ ہو تو میں نے تو اپنی ساری آرزوؤں کا خون کر کے دل کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے ہیں لہٰذا میں تیرے قابل دل لیے پھر رہا ہوں۔ اور ہم دیکھ سکتے ہیں کہ واقعتاً آثار و قرائن سے یہی پتا چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت والا کے قلب میں اپنی عظیم محبت کا خزانہ عطا فرما دیا ہے۔ اور جس کے دل میں یہ محبت اور درد بھرا دل نہ ہو تو پھر گو کہ وہ مقرر و واعظ بن جائے اور مصنف و مدرّس بن جائے لیکن صاحبِ فیض اولیاء اللہ کی جماعت میں اُس کا شمول نہیں ہوتا۔ چنانچہ تاریخ پر نظر ڈالنے سے ہی پتا چلتا ہے کہ اطرافِ عالَم میں جن اکابر و مشائخ کا فیض ہے وہ وہی ہیں جو اپنے سینے میں اللہ کی محبت سے بھرا ہوا دل لیے ہوئے پھر رہے ہیں۔

نفس کے بندے

چین اک پل کو بھی دلوں میں نہیں
گردنوں میں عذاب کے پھندے
دفن کر کے جنازہ عزت کا
خوار پھرتے ہیں نفس کے بندے

آہ وفغاں کا آسرا لیتی ہے جانِ ناتواں

دونوں جہان کی خوشی تیری خوشی میں ہے نہاں
دونوں جہان کا الم تیرے غضب میں ہے عیاں

دیکھ جہاں بھی تو دھواں آگ بھی ہے وہاں نہاں
کہتا ہوں بار بار میں سنتا نہیں ہے بدگماں

آشیاں اہلِ دل کا ہے دیکھ نہ برق گر یہاں
تجھ سے وگرنہ انتقام لے گا ضرور آسماں

اے مرے خالقِ حیات تجھ پہ فدا ہو میری جاں
تیرے بیانِ حمد سے قاصر ہے یہ مرا بیاں

دیکھ کے اپنے ضعف کو اور قصورِ بندگی
آہ و فغاں کا آسرا لیتی ہے جانِ ناتواں

میری وفا ہے ناتمام دونوں جہاں میں اے خدا
آپ کے نام پر اگر کردوں فدا میں دو جہاں

دل میں خدائے پاک کی لذت قرب کیا کہوں
جیسے مری زمیں ہے اور، اور ہے میرا آسماں

یارب ہماری آہ کو فضل سے کردے باثر
سارے جہاں میں نشر ہو اختر کی آہِ بے زباں

مشکل الفاظ کے معانی: اَلَمْ: تکلیف۔ **عیاں**: ظاہر۔ **قاصر**: کوتاہ یعنی نہیں کرسکتا۔ **ضعف**: کمزوری۔ **قصور بندگی**: اللہ تعالیٰ کی اطاعت نہ کرپانا۔ **ناتمام**: نامکمل۔

اللہ کی خوشی میں دنوں جہاں کی خوشی ہے

دونوں جہان کی خوشی تیری خوشی میں ہے نہاں
دونوں جہان کا الم تیرے غضب میں ہے عیاں
دیکھ جہاں بھی تو دھواں آگ بھی ہے وہاں نہاں
کہتا ہوں بار بار میں سنتا نہیں ہے بدگماں
آشیاں اہلِ دل کا ہے دیکھ نہ برق گریہاں
تجھ سے وگرنہ انتقام لے گا ضرور آسماں

قرآن وحدیث میں ایک یا دو جگہ نہیں بلکہ متعدد آیات وحدیث میں دنیا وآخرت کی چین وسکون اور راحت وآرام اسی طرح دونوں جہاں کی زحمت وعذاب اور تکلیف ومصیبت اللہ تعالیٰ کی رضا اور عدمِ رضا میں منحصر ہے۔ یعنی جو حق تعالیٰ کو راضی کر دے اور اللہ تعالیٰ اُس سے خوش ہوں تو اُسے دنیا وآخرت میں خوشی حاصل ہوگی۔ اور جو اپنے اعمالِ بد میں مبتلا ہو کر اور معصیت ونافرمانی میں پڑ کر اللہ کا نافرمان بنے گا اور اُس کی لعنت وغضب کو دعوت دے گا تو اُس کی جس طرح آخرت برباد ہوگی اسی طرح یہ دنیا بھی اُس کے لیے جہنم کدہ بن جائے گی۔ جیسا کہ آئے دن سامنے آنے والے واقعات اور خط وکتابت سے بھیجے جانے والے حالات سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

آہ وفغاں کے آشیاں پر برق نہ گراؤ ورنہ

اس کے بعد حضرت والا ارشاد فرماتے ہیں کہ جس طرح دھوئیں کو دیکھ کر یہ پتہ چل جاتا ہے کہ یہاں آگ ہے میں بھی یہ بات کہتا ہوں کہ جہاں تم آہ آہ کی آوازیں سنو اور دردِ دل سے نکلنے والی آہ وفغاں کانوں میں پڑے تو یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ یہاں کوئی اپنے سینے میں عشق ومحبتِ خداوندی کی آگ لیے ہوئے ہے۔ افسوس! اُس شخص پر کہ شب وروز کی آہ وفغاں سننے کے باوجود وہ بدگمانی کا شکار ہوتا ہے اور اُسے یہ سمجھ نہیں آتی کہ وقفے وقفے سے نکلنے والی آہیں اندر گرمیٔ محبت کا پتہ دے رہی ہے۔

اور ایسے بدگمانوں اور ناعاقبت اندیشوں سے یہ نصیحت کرتا ہوں کہ اپنے ظلم وستم اور حسد وکینہ اور بغض وعداوت کا نشانہ اہلِ دل کو نہ بناؤ اور اُن کا آشیاں تمہارے ظلم کا شکار نہ ہو جائے ورنہ پھر آسمان والا رب العرش خود اُن کا حامی ہو کر اُن کی طرف سے بدلہ لے لے گا۔ درحقیقت یہ شعر اُسی روایت کی ترجمانی ہے کہ جو پہلے کئی اشعار کے ضمن میں پیش کی جا چکی ہے کہ جو اللہ کے کسی ولی سے دُشمنی رکھے اور اُسے ستائے تو اللہ تعالیٰ اُس سے اعلانِ

جنگ کردیتے ہیں اور خود اُس کی طرف سے حامی ہوکر خود اس سے بدلہ لے لیتے ہیں۔ اس لیے اگر مناسبت نہ ہو، عقیدت نہ ہو، عظمت و محبت نہ ہو تو کوئی حرج کی بات نہیں، لیکن کم سے کم بغض و کینہ اور عداوت و دُشمنی تو نہیں رکھنی چاہیے، بلکہ حسنِ ظن کا معاملہ کر کے نیکی کمانی چاہیے۔

خالقِ حیات پر فدا ہو کر اعترافِ قصور بڑا عالی وصف ہے

اے مرے خالقِ حیات تجھ پہ فدا ہو میری جاں
تیرے بیانِ حمد سے قاصر ہے یہ مرا بیاں
دیکھ کے اپنے ضعف کو اور قصورِ بندگی
آہ و فغاں کا آسرا لیتی ہے جانِ ناتواں
میری وفا ہے ناتمام دونوں جہاں ہیں اے خدا
آپ کے نام پر اگر کردوں فدا میں دو جہاں

اے میرے اللہ! آپ ہی نے مجھے زندگی بخشی ہے تو آپ ہی اس کے حق دار ہیں کہ جو خالقِ حیات ہو اُسی پہ یہ حیات فدا ہونی چاہیے اس لیے میں ہر دم اپنی جان آپ پر فدا کرنے کا جذبہ رکھتا ہوں اور گو کہ میں آپ کی کیسی ہی عظمت و بڑائی بیان کردوں اور میری زبان ہر وقت کتنا ہی آپ کی حمد و ثناء میں رطب اللسان رہے مگر حقیقت یہی ہے کہ آپ کی عظمتوں کے شایانِ شان میری زبان سے کیے جانے والے بیان میں یہ طاقت ہی نہیں کہ وہ کماحقہٗ آپ کی حمد بیان کر سکے۔ میں اس بات کا اقرار کرتا ہوں کہ میں آپ کی کماحقہٗ حمد بیان کرنے میں قاصر و کوتاہ ہوں۔

اور ایسا کیوں نہ ہو کہ میں بہت کمزور ہوں اور آپ بہت قوی ہیں اور میں آپ کا ایک ناکارہ بندہ ہوں جو ادائے بندگی میں بھی کمال کا مدعی نہیں بلکہ اس میں بھی اپنے قصور کا اقرار کرتا ہوں، اور جب اس قصورِ بندگی کو اور طاعت کی کمی کو سوچتا ہوں تو رہ رہ کے میرا دل بھر آتا ہے۔ اور پھر زبان سے آہیں نکلنا شروع ہو جاتی ہیں کیونکہ اُس ادائیگیٔ بندگی میں کمی کی وجہ سے اور ادائے حقوقِ محبت میں کوتاہی کی وجہ سے دل پر جو ایک غم آتا ہے میری جانِ ناتواں اُسے اندر سہنے کی طاقت نہیں رکھتی۔ جس کی وجہ سے وقفے وقفے سے میری جانِ ناتواں کو آہ و فغاں کا سہارا لینا پڑتا ہے۔

واہ کیا کہوں! کہ حضرت والا نے اس شعر میں اللہ والوں کے قلب کی کس عجیب و غریب حالت کا کیسے بالطف انداز میں تذکرہ فرمایا ہے جس کو اللہ تعالیٰ کی محبت سے ذرا واسطہ پڑا ہو اور اس راہ کے غم اُٹھائے ہوں تو وہ

بہت جلد اس کو سمجھ لے گا کیونکہ یہ وہ حقیقت ہے جو ہر اللہ کے عاشق پر ضرور گزرتی ہے کہ جب سب کچھ کرنے کے باوجود اور ہر لمحہ خدا پر فدا ہونے کے بعد بھی عاشقِ حقیقی کا دل نہیں بھرتا تو پھر وہ آہوں کا سہارا لے کر ایک نہایت عمیق اور گہرے انداز سے اپنے اللہ کو یاد کرتا ہے کہ اُسے یہ محسوس ہوتا ہے کہ جس وقت وہ آہ بھر رہا ہے تو بدن کا رواں رواں نہایت درجہ حلاوت ومٹھاس محسوس کر رہا ہے۔

اے میرے مالک اللہ میں اگر سب کچھ آپ پر قربان کر دوں اور دونوں جہان کی نعمتیں آپ کو پانے میں لٹادوں تب بھی میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں نے آپ سے وفاداری کا حق ادا کر دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ سب کچھ کرنے کے باوجود بھی آپ سے وفاداری کا حق ادا نہیں ہو سکے گا کیونکہ جو کچھ بھی توفیق ملے گی وہ بھی آپ کے کرم کا صدقہ ہے۔ اس لیے یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے کہ بندہ یہ دعویٰ کردے کہ میں نے پورا پورا حق ادا کر دیا ہے اور مکمل وفاداری پیش کر دی ہے۔

بس اے سالکو! یاد رکھو! یہ قصور و عجز ہی اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں وفا کا انتہائی مقام ہے۔ اور اس کے حاصل ہونے پر حق تعالیٰ اُس بندے سے بے انتہا خوش ہوتے ہیں اور یہی ہمارے ابا حضرت آدم علیہ السلام کی سنت ہے۔ اور آدمی کے آدم زاد ہونے کی فطری خصوصیت ہے۔ چنانچہ قرآن کریم کی اس آیت میں یہی مضمون مذکور ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَا اٰتَوْا وَّ قُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ اَنَّهُمْ اِلٰى رَبِّهِمْ رٰجِعُوْنَ اُولٰٓئِكَ يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ وَهُمْ لَهَا سٰبِقُوْنَ﴾

''اور جو لوگ اپنے رب کے ساتھ شرک نہیں کرتے اور جو لوگ (اللہ کی راہ میں) دیتے ہیں جو کچھ دیتے ہیں اور (باوجود اللہ کی راہ میں دینے اور خرچ کرنے کے) ان کے دل اس سے خوفزدہ رہتے ہیں کہ وہ رب کے پاس جانے والے ہیں (دیکھئے وہاں جا کر ان صدقات کا کیا ثمرہ ظاہر ہو، کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ دینا حکم کے موافق نہ ہو، مثلاً مال حلال نہ ہو یا نیت اللہ کے لیے خالص نہ ہو اور نیت میں اخلاص کامل نہ ہونا یا مال کا حرام ہونا ہمیں معلوم نہ ہو تو اُلٹا اس پر مواخذہ ہونے لگے تو جن لوگوں میں یہ صفات ہوں) (معارف القرآن، جلد: ۶، صفحہ: ۳۱۷)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتے ہیں کہ میں نے اس آیت کا مطلب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ یہ کام کر کے ڈرنے والے لوگ وہ ہیں جو شراب پیتے یا چوری کرتے ہیں؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے صدیق کی بیٹی! یہ بات نہیں بلکہ یہ وہ لوگ ہیں جو روزے رکھتے اور نمازیں پڑھتے ہیں اور صدقات دیتے ہیں، اس کے باوجود اس سے ڈرتے ہیں کہ شاید ہمارے یہ عمل اللہ کے نزدیک (ہماری کسی کوتاہی کے سبب قبول نہ ہو، ایسے ہی لوگ نیک کاموں میں مسارعت اور مسابقت کیا کرتے ہیں۔ (رواہ احمد والترمذی وابن ماجہ، مظہری)

اور حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ہم نے ایسے لوگ دیکھے ہیں جو نیک عمل کر کے اتنے ڈرتے تھے کہ تم بُرے عمل کر کے بھی اتنا نہیں ڈرتے۔ (معارف القرآن، جلد: ۶، صفحہ: ۳۱۷)

اہلِ دل کی زمین وآسمان جدا ہوتے ہیں

دل میں خدائے پاک کی لذتِ قرب کیا کہوں
جیسے مری زمیں ہے اور، اور ہے میرا آسماں
یارب ہماری آہ کو فضل سے کردے باأثر
سارے جہاں میں نشر ہو اختر کی آہِ بے زباں

اس شعر میں حضرت والا اللہ تعالیٰ کے قرب کی لذت کے بیان کو ایک خاص انداز میں ذکر فرما رہے ہیں کہ گویا یہ ایسی کیفیت ہے کہ جس کا حقیقی بیان تو نہیں کیا جاسکتا ہے مگر مختصرا اتنا کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ سے تعلق ہونے کے بعد اور اُس کا قرب ملنے کے بعد متقی بندے کی زمین بھی اور ہو جاتی ہے اور اُس کا آسمان بھی کچھ اور ہوتا ہے۔ اور گو کہ وہ اس دنیا کی زمین پر چل رہا ہو اور یہی دنیا کا آسمان سایہ فگن ہو مگر وہ حق تعالیٰ کی عظمتوں میں ایسا دل سے مٹا ہوا اور مستغرق ہوتا ہے کہ سب کچھ میں رہتے ہوئے سب کچھ سے بے خبر رہتا ہے۔ اُس کی نگاہ میں ہر وقت جلوۂ حق ہی بسا رہتا ہے، اُس کا غیر دل ودماغ میں گزر ہی نہیں پاتا۔

اخیر میں حضرت والا دعا فرما رہے ہیں کہ اے اللہ! میں کوئی رسمی مقرر وواعظ نہیں ہوں، لیکن جس طرح تو نے مجھ پر فضل فرما کر میرے سینے میں اپنی محبت عطا فرمائی اور اُس کی برکت سے مجھے آہ وفغاں نصیب ہوئی ہے اے اللہ! تو ایسی صورت پیدا کردے کہ میری آہِ بے زبان سارے جہان میں نشر ہو اور اس آہ کی ایسی تاثیر کردے جو اسے سن لے تیرا دیوانہ بن جائے۔ یہاں تک کہ حضرت والا کے سارے اشعار بھی درحقیقت اُسی آہِ سحر کی ایک جھلک ہے۔

جو بشر بھی سن لے میری آہ کو
بس تڑپ جائے وہ تیری چاہ کو

بظاہر ایسا معلوم ہوتا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت والا کی اس دعا کو قبول فرمایا اور سارے عالَم میں آج حضرت والا کی آہِ بے زباں نشر ہو کر لوگوں کو آہ وفغاں کا حامل بنا رہی ہے اور اللہ کی محبت اور عشق میں بسمل ہو رہے ہیں۔

تدفینِ عشق

جس کے چہرے پہ میر مرتے تھے
سرد آہیں بھی میر بھرتے تھے
کس نے جغرافیہ بدل ڈالا
عشق کو اپنے دفن کرتے تھے

میری آہ دل کے یہی ہیں منازل

پہاڑوں کا دامن سمندر کا ساحل
مری آہ دل کے یہی ہیں منازل
جنازہ ہوا قبر میں آج داخل
ہوئی خاک تن آج مٹی میں شامل
ترا فیض ہے صحبت شیخ کامل
ہوا سب کا دل دردِ نسبت کا حامل
نہیں کوئی رہبر ہے راہِ جنوں کا
مگر سایۂ رہبرِ شیخ کامل
مرے دوستوں ذکر کی برکتوں سے
سکینہ ہوا دل پہ ہم سب کہ نازل
عجب درد سے کس نے تفسیر کی ہے
کہ قرآن ہوا آج ہی جیسے نازل
خدا شیخ کو میرے رکھے سلامت
کہ ناقص ہوئے ان کی صحبت سے کامل
یہ امید ہے تیرے لطف و کرم سے
کہ اخترؔ بھی ہو اہلِ جنت میں شامل

مشکل الفاظ کے معانی:۔ راہِ جنوں: اللہ تعالیٰ کی دیوانگی کا راستہ۔ سکینہ: سکون رخاص رحمت۔

آہِ عاشق کو لبِ دریا اور دامنِ کوہ کی تلاش ہے

پہاڑوں کا دامن سمندر کا ساحل
مری آہ دل کے یہی ہیں منازل

اس شعر میں حضرت والا اسی مضمون کی ترجمانی کر رہے ہیں کہ اللہ والوں کا دل شہر کے اعلیٰ درجے کے مکانات اور بنگلوں کے بجائے کہیں ایسی جگہ جا کر جہاں مکمل یکسوئی اور اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی غیر سامنے موجود ہی نہ ہو اور پھر وہاں اللہ تعالیٰ کی یاد سے دل کو خوش کیا جائے، اب میرے دل کی یہی تمنا ہے اور آرزوئیں ہیں۔ گو کہ اللہ کی محبت حاصل ہونے سے پہلے انسان کے دل میں سینکڑوں تمناؤں کے طوفان بپا رہتے ہیں۔ لیکن جب حق تعالیٰ سے محبت حاصل ہو جاتی ہے تو پھر صرف اللہ تعالیٰ کی یاد ہی دل کی ایک تمنا بن کے رہ جاتی ہے۔ بقول حضرت والا ؎

یہ پوچھتا ہے میرے دل میں اب تیرا جلوہ
کہاں ہے اور کدھر آرزو کا عالَم ہے

خاکِ تن خاکِ ارض میں شامل

جنازہ ہوا قبر میں آج داخل
ہوئی خاک تن آج مٹی میں شامل
نہیں کوئی رہبر ہے راہِ جنوں کا
مگر سایۂ رہبر شیخ کامل

عنقریب انسان کو اس صورتحال کا سامنا کرنا ہے کہ اُس کا جنازہ قبر میں داخل ہو رہا ہوگا اور یہ بدن کی خاک دوسری خاک میں مل کے اُسی طرح مٹی ہو جائے گی لیکن اگر خاکِ تن میں دردِ دل شامل کرلیا جائے تو پھر اللہ تعالیٰ کے یہاں یہ قیمتی بن جاتی ہے۔ ورنہ محض ایک مٹی کا ڈھیر ہے۔ اس لیے اس شعر میں حضرت والا اس طرف توجہ دلانا چاہتے ہیں کہ یہ آہِ دل حاصل کرنے کی چیز ہے اور یہی کام آنے والی ہے۔ باقی جو کچھ ظاہری ساز و سامان اور تن پروری ہے یہ عنقریب مستقبل میں مٹی کا ڈھیر بنا ہوا ہوگا۔ جس کے حصول کا طریقہ جگہ جگہ حضرت والا نے اپنے کلام میں ذکر فرمایا ہے کہ بلا صحبتِ شیخ کامل کے کسی انسان کو دردِ نسبت کا حامل دل نصیب نہیں ہوتا۔ اور جو بھی اللہ کے راستے کو طے کرتا ہے اُس کا رہبر صحبتِ شیخ کامل کا سایہ ہی ہوا کرتا ہے۔ اس کے بغیر تکمیل حاصل نہیں ہوتی۔

جیسا کہ آپ اگر انجینئر بننا چاہتے ہیں اور آپ نے انجینئرنگ کالج میں پوری تعلیم حاصل کی ہے لیکن پھر کسی ماہر انجینئر کے تحت آپ کو پریکٹس کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر آپ نے امریکا و برطانیہ وغیرہ بڑی یونیورسٹی میں جا کر ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کی ہو تب بھی آپ جب تک کسی ماہر ایکسپرٹ ڈاکٹر کے ماتحت پریکٹس نہیں کریں گے تو آپ مسلّم ڈاکٹر نہیں مانتے جاتے اور نہ کوئی حکومت آپ کو مطب کھولنے کی اجازت دے گی۔ معلوم ہوا دنیا کا نظام بھی اس طرح سے جو کہ محض پڑھ لینا کافی نہیں ہے بلکہ کسی تجربہ کار کے ساتھ رہ کر آگے بڑھا جائے۔ اسی لیے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ والوں کے قریب رہنے کا باقاعدہ حکم دیا ہے۔ حدیث شریف میں آیا ہے:

﴿إِذَا رَأَيْتُمُ الرَّجُلَ قَدْ أُعْطِيَ زُهْدًا فِي الدُّنْيَا وَقِلَّةَ مَنْطِقٍ فَاقْتَرِبُوْا مِنْهُ فَإِنَّهُ يُلَقَّى الْحِكْمَةَ﴾

(سنن ابن ماجة، كتاب الزهد، باب الهم بالدنيا)

جب تم دیکھو کہ کسی کو زہد عطا ہوا ہے یعنی وہ دنیا دار نہیں ہے۔ دنیا کی محبت سے اس کا قلب خالی ہے اور قِلَّةَ مَنْطِقٍ بہت کم بولنے والا صرف اللہ کی باتیں بولتا ہے، اِدھر اُدھر کی باتوں سے اس کو دلچسپی نہیں ہے۔ فَاقْتَرِبُوْا مِنْهُ تو اس سے قریب رہا کرو۔ ایک دن میں نے عرض کیا تھا کہ کسی کے ذہن میں آتا ہے کہ بھائی سب ہی علماء اور سب ہی اللہ

والوں کے پاس جایا کریں اور سب ہی کی باتیں سنا کریں، لیکن آپ خود دیکھئے اگر جسم کو کوئی بیماری لگی ہو، فرض کیجئے کہ کوئی ہارٹ کا پیشنٹ ہے، ہارٹ دل کی بیماری ہے اور کراچی میں پچاس ہارٹ اسپیشلسٹ ہوں۔ کیا آپ اپنے دل کی بیماری کا علاج کروانے کے لیے پچاسوں ہارٹ اسپیشلسٹ کے پاس جا کر اپنی چوائس وانتخاب (Choice) سے دوائی کو استعمال کریں گے؟ اگر مریض ایسا کرے گا تو وہ اپنے پیروں پر خود کلہاڑی مار رہا ہے اور اپنے کو ہلاک کر رہا ہے۔ بے شک اگر وہ ان کے پاس گیا اور کچھ مفید باتیں سن لیں تو ٹھیک ہے لیکن ایک کو اپنے لیے مقرر کرنا ضروری ہے جس کی رائے اور مشورے پر اُس کو چلنا ہوگا جس کی میڈیسن اور دوائی مریض کو لینی ہوگی۔ اس سے بالکل ہرگز یہ نہ سمجھیں کہ دوسروں کے پاس جانا حرام ہے یا ناجائز ہے یا اللہ کے غضب کو دعوت دینا ہے، لیکن یہ ایک نظام اور طریقہ ہے۔ پوری تاریخ گواہ ہے کہ اس کا بھی ایک نظام اور طریقہ ہے کہ کسی ایک اللہ والے سے جس سے مناسبت ہو، تعلق قائم کیا جائے اور پھر وہ جو کچھ بتائے، اس کی بتائی ہوئی باتوں پر عمل کیا جائے۔ صرف آ کے پڑ جانا کافی نہیں عمل ضروری ہے۔

دوستو! جب تک عمل نہ ہو تب تک کوئی خاص فائدہ نہیں ہوتا، لیکن اتنے فائدہ سے یہ بھی خالی نہیں ہے کہ صحبت عمل پر اُبھارتی ہے۔ اللہ والوں کی صحبت سے طاعات کی طرف طبیعت راغب ہوتی ہے اور معاصی و نافرمانیوں سے طبعاً نفرت ہونے لگتی ہے۔ اس لیے دل میں اس نوع کی باتیں آتی ہیں جو درحقیقت شیطانی وساوس ہوتے ہیں اور یہ نفس اور شیطان ہمیں آگے چلنے نہیں دینا چاہتے۔ صحیح بات یہ ہے کہ یہ راہ راہِ جنوں ہے اس راہِ جنوں اور محبتِ خداوندی میں اگر سفر کرنا اور چلنا ہو تو کسی ایک کو ساتھ لے لو اور پھر اس کے بعد چل کر دیکھو کیا مزہ آتا ہے۔ حضرت کا ایک دوسرا شعر ہے۔

دردِ دل سیکھنا ہے اگر دوستو
ساتھ میرے رہو تب سکھائیں گے ہم

دوستو! ذرا ان سے جا کر پوچھو ان کو کیا ملا؟ کیا کھویا؟ اور کیا پایا؟ میں ہمیشہ طلبہ سے کہتا رہتا ہوں کہ فراغت کے بعد صرف کم از کم چالیس روز غیر اللہ کو چھوڑ کر کسی اللہ والے کی صحبت میں لگا کر دیکھو کہ کیا چین پاؤ گے اور تم جو یہ سمجھتے ہو کہ اگر تقویٰ کی لائن میں آئیں گے تو سارے مزے چھوٹ جائیں گے، ساری لذتیں چھوٹ جائیں گی۔ ایسا ہرگز نہیں ہے بلکہ تم خود مجھے بتانا "چالیس" دن کے بعد جو تم نے چھوڑا وہ لذت والا راستہ تھا یا جو تم نے پایا وہ لذت والا ہے۔ میں ان سے کہتا ہوں کہ میں نے مولانا رومی کا مضمون کہیں پڑھا ہے کہ یہ میرا جوتا لے کر میرے سر پر بجانا اگر لذت حاصل نہ ہو بلکہ اتنا ہی نہیں، یہ کہے گا وہ کہنے والا کہ ہائے افسوس! جن کو میں نے لذت سمجھا تھا وہ تو تلخیاں اور کڑواہٹ کے گھونٹ تھے، لیکن وہ لذت کیوں محسوس ہوتی تھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ

جب بدن میں زہر پھیل جاتا ہے تو نیم کی کڑوی پتی کڑوی نہیں لگتی ہے اور جب ملیریا بخار ہوتا ہے تو بریانی و کباب کا ذائقہ اچھا نہیں لگتا ہے اور حضرت مثال دیتے ہیں کہ گندگی کا جو کیڑا ہوتا ہے اُسے خوشبو سونگھاؤ تو اُسے احساس نہیں کیونکہ اس کو گندگی کی عادت پڑ چکی ہوتی ہے اور وہ اس کا اتنا عادی ہو جاتا ہے کہ وہی اس کی کائنات عطریات بن جاتی ہے۔

مجالس ذکر اللہ کے چند فوائد

مرے دوستو ذکر کی برکتوں سے
سکینہ ہوا دل پہ ہم سب کے نازل

میرے دوستو! جن مجالس میں اللہ تعالیٰ اور ایمان کی باتیں ہوں اور اللہ کی طرف بلانے کی باتیں قرآنی آیات اور نبوی ارشادات کی صورت میں بیان کی جارہی ہوں تو ان کے متعلق حدیث شریف کا مضمون ہے کہ اس کے اوپر خاص سکینہ نازل ہوتا ہے اور اس میں بیٹھنے والوں کو، خاص اطمینان ملتا ہے اور حَفَّتۡهُمُ الۡمَلَائِکَةَ اور ملائکہ ان کو گھیرے ہوئے ہوتے ہیں۔ یہ مجلس ہم یقین رکھتے ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے روشنی میں کہ ملائکہ ان کو گھیرے ہوئے ہیں اور ذَکَرَهُمُ اللّٰهُ فِیۡمَنۡ عِنۡدَهٗ آسمانوں پر فرشتوں میں اللہ ان مجالس کا تذکرہ فرماتے ہیں کہ میرے بندے کس طرح سے لگے ہوئے ہیں اور ایک روایت میں تو یہاں تک آیا۔ فرشتے پوچھتے ہیں کہ اے اللہ! آپ کا فلاں بندہ وہ تو گزر رہا تھا اور سوچا کہ چلو یہاں گزرتے ہوئے کچھ دیر بیٹھ لوں، اصل میں تو مجھے کچھ اور کام تھا لیکن چلو وہ سب بیٹھے ہیں، میں بھی بیٹھ جاتا ہوں۔

حدیث شریف کا مضمون ہے کہ یہ ایسی مجلسیں ہوتی ہیں اور اللہ والوں کے پاس بیٹھنا ایسا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو بھی محروم نہیں کرتے۔ هُمُ الۡقَوۡمُ لَا یَشۡقٰی جَلِیۡسُهُمۡ یہ ایسے لوگ ہیں کہ ان کا جو ہم نشین ہوتا ہے وہ بھی محروم نہیں رہتا۔ اسی لیے روایت میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی بھی مغفرت فرما دیتے ہیں۔ اگرچہ وہ ایسے ہی آیا تھا لیکن جب بیٹھ گیا ہے تو جب ان کی مغفرت ہوتی ہے تو ساتھ میں اس کی بھی مغفرت ہو جاتی ہے اور جو باقاعدہ اس نیت سے آتا ہے کہ میں اللہ کے دین کی باتیں سنوں گا اور ملتا ہے، ملاقات کرتا ہے، بیٹھتا ہے، سنتا ہے تو اس کے لیے تو بہت زبردست ثواب اور فضیلت کی بات ہے۔ ہمارے ہاں بیٹھنا اور اسی طرح دوسری جماعتوں کا آپس میں ایک دوسرے سے ملنا یہ سب اس میں داخل ہے تو اس کی فضیلت تو بہت ہی اونچی ہے۔ حضرت فرماتے ہیں جب ذکر ہوتا ہے تو ذکر کی برکتوں سے عجیب سکینہ نازل ہوتا ہے۔

صفائی قلب کے بعد قرآن کا مزہ ہی الگ ہے

میرے دوستو! جب اہلِ دل اولیاء اللہ کسی مضمون کو بیان کرتے ہیں اور اپنا دردِ محبت پیش کرتے ہیں اور جب قرآن کی کسی آیت کی شرح کرتے ہیں وہ ایسے دردِ دل سے کرتے ہیں کہ سننے والوں کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ

جیسے ہم نے کبھی یہ مضمون قرآن میں سنا اور پڑھا ہی نہیں تھا اور حضرت جو مضمون بیان کرتے ہیں میں آپ کو اس کا ریفرنس اور حوالہ دے کر بتا تا ہوں کہ علامہ سید سلیمان ندوی جو کہ اپنے وقت کے اتنے بڑے عالم گزرے ہیں کہ جو عرب و عجم کے علماء و مشائخ ہیں، ان سب میں وہ برابر درجہ کی مقبولیت کے حامل تھے اور عرب بھی ان کے علم کا لوہا مانتے تھے اور ان کے صاحبزادہ پروفیسر سلمان صاحب جو اس وقت ڈربن جنوبی افریقہ میں مقیم ہیں ہمارے حضرت والا کے مجاز خلیفہ ہیں، اتنے بڑے عالم وہ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس جب ان کی خانقاہ میں حاضر ہوئے تو کیا عالم ہوا۔ جا کر کہتے ہیں غور سے پڑھنے کی چیز ہے، بار بار پڑھی جا چکی ہے لیکن تذکیر مؤمن کے لیے نافع ہے اس لیے دوبارہ ذکر کرتا ہوں۔ فرمایا کہ حضرت مجھے کچھ نصیحت فرمادیں۔ حضرت تھانوی فرماتے ہیں کہ میں ایک طالبعلم اور آپ کو نصیحت؟ پھر سے یہی فرمایا کہ حضرت نہیں کچھ نصیحت ضرور فرمادیں۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ نے دوبارہ سے یہی بات فرمائی کہ میں ایک طالبعلم اور آپ کو نصیحت؟ تیسری یا چوتھی مرتبہ میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے نصیحت فرمائی، تو اس وقت میرے شیخِ اوّل حضرت مسیح الامت جلال آبادی رحمہ اللہ اس مجلس میں موجود تھے۔

اور میں نے خود حضرت مسیح الامت جلال آبادی کی زبان سے مجلس میں سنا تو بیچ میں صرف ایک واسطہ ہے۔ فرماتے ہیں کہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے نصیحت کی اور یہ ارشاد فرمایا کہ ''ہم نے تو اپنے حضرت حاجی صاحب سے ایک ہی سبق سیکھا ہے اور وہ ہے اپنے کو مٹانا۔''

جتنا اپنے کو مٹا سکے، خلق میں شہرت اور جاہ اور نام اور بلندی اور ہر طرف آؤ بھگت یہ سارا غیر اللہ ہے سب غیر ہے۔ سارا دل سے نکل جائے اور اپنے کو بالکل مٹادے اور مثل مٹی کے متواضع ہو جائیں تو پھر ہم ایسے زرخیز ہوں گے جیسا کہ مٹی زرخیر ہے کہ اس کے اندر سے قیامت تک کی نسلوں کے لیے رزق نکلتا ہی رہے گا اور جو لباس ہم نے پہنا ہے وہ بھی مٹی کی دین ہے، جو گھر کھڑا ہے، یہ گاڑی، یہ کھانے پینے کی چیزیں، یہ کُرتے، یہ لباس، یہ کتابیں ساری مٹی کی دین ہے۔ اگر یہ مضمون جاننا اور سیکھنا ہو تو القراۃ الراشدۃ میں بعنوان "أنا ترابٌ" دیکھیں جو کہ حضرت مولانا علی میاں ندوی کی مدرسہ میں پڑھائی جانے والی کتاب ہے۔ اس میں پورا مضمون ہے۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ جب علامہ نے یہ سنا تو سنتے ہی آنکھوں سے آنسو کے دریا بہنے لگے۔ اتنے بڑے علامۂ وقت نے فرمایا مٹانا اور اس کے بعد جو چند اشعار پڑھے تھے ان میں سے ایک یہ تھا کہ

آج وہ آیا مزہ قرآن میں
جیسے قرآں آج ہی نازل ہوا

عالم و معلم ہو کر بھی عالم و معلم نہ ہوئے

دین کی خدمتیں عمر بھر بھی اگر کسی نے کی ہوں اور اپنے کو یہ سمجھتا ہو یا دوسروں کے سامنے ظاہر کرتا ہو یا عنوان بعنوان لوگوں میں پھیلاتا ہو، میں نے اتنا یہ کام کیا، میں نے اتنا یہ کام کیا، میں یہ کررہا ہوں، میں وہ کررہا ہوں، مگر اللہ کے یہاں اس کی کوئی قیمت نہیں ہے اور اللہ والوں سے ملے بغیر اخلاصِ کامل کا پتہ بھی نہیں چلتا۔ آدمی سمجھتا ہے میں دین کا کام کررہا ہوں، مگر وہ دین نہیں ہوتا ہے کیونکہ صحیح حدیث شریف میں ہے کہ ریاکار جو شہید ہوگا تو شہادت بظاہر کتنا بڑا عمل ہے اور سخی کی سخاوت بظاہر کتنا بڑا عمل ہے اور قاری اور عالم تینوں کو سب سے پہلے جہنم میں منہ کے بل گھسیٹ کر ڈالا جائے گا، کیا ان کا عمل نہیں۔ کیا عمر بھر انہوں نے مال خرچ نہیں کیا۔

تو دوستو! معلوم یہ ہوا کہ عمل کو مقبول بنانے کے لیے اخلاص کی ضرورت ہے اور اخلاص اللہ والوں سے سیکھنے کی چیز ہے، انہی اللہ والوں کے پاس بیٹھ کر اخلاص سمجھ میں آتا ہے۔ ورنہ تو انسان سمجھتا رہتا ہے کہ میں بہت دین کا کام کررہا ہوں اور فخر یہ بیان بھی کرتا رہتا ہے کہ میں یہ کررہا ہوں، میں وہ کررہا ہوں، میں نے یہ کیا، وہ کیا اور شیطان اُسی میں اس کو مار ڈالتا ہے، کیونکہ وہ دکھا رہا ہے، شہرت چاہ رہا ہے، نام چاہ رہا ہے، بس گیا اس کا یہ عمل۔ اسی لیے حضرت شاہ ہردوئی رحمہ اللہ فرماتے تھے وجودِ عمل مطلوب نہیں، قبولِ عمل مطلوب ہے اور قبولِ عمل کی دو شرطیں ہیں۔ ایک یہ ہے کہ وہ عمل شریعت کے مطابق ہو اور دوسری شرط یہ کہ وہ عمل اخلاص کے ساتھ ہو۔ اگر شریعت کے مطابق نہ ہو تو بھی قبول نہیں اور اگر اخلاص نہ ہو تو وجودِ عمل تو ہوا لیکن قبول عمل نہیں ہوا۔

یہی مضمون حضرت والا بیان فرماتے ہیں ؎

عجب درد سے کس نے تفسیر کی ہے
کہ قرآں ہوا آج ہی جیسے نازل

مولانا منصور الحق ناصر صاحب کا اسی کے اوپر ایک شعر ہے کہ ؎

میرے پیارے مرشد سے ملنے سے پہلے
کیا کرتے تھے جو شقاوت کی باتیں
میرے پیارے مرشد سے ملنے کے بعد اب
کیا کرتے ہیں وہ سعادت کی باتیں

یہ جو امرد لڑکوں اور لڑکیوں کے تعلقات ہیں اور آج کا جوان ان میں پڑ کر اپنی زندگی ویران کررہا ہے، کبھی فون پر بات کررہا ہے تو رات کو نیند نہیں آرہی ہے۔ کبھی انٹرنیٹ سے سلسلہ جاری ہے، بس یہ ہے وہ شقاوت کی زندگی اور یہ ہے وہ شقاوت کی باتیں اور اس میں انسان اپنا ایمان اپنی صحت، اپنے قلب اور دل کا ستیاناس کرلیتا ہے جوان

راہوں میں پھنسے اور پھر اللہ نے حضرت شیخ کی برکت سے اور دوسرے مشائخ کی برکت سے ان کو اس راہ سے نکالا۔

خدا شیخ کو میرے رکھے سلامت
کہ ناقص ہوئے اُن کی صحبت سے کامل

یہ امید ہے تیرے لطف و کرم سے
کہ اختر بھی ہو اہل جنت میں شامل

اور حضرت والا دامت برکاتہم کا مقطع ہے۔ اس میں ہم سب کے لیے سبق ہے کہ اصلاح کرانے کا یہ معنی نہیں ہوتا کہ ہم اپنے کو اللہ والا اور بڑا مقام والا اور مرتبے والا سمجھیں۔ میرے دوستو! اصلاح کی حقیقت یہ ہے کہ اپنے اوپر اپنی حقیقت کھل جائے کہ یا اللہ! میں کچھ نہیں ہوں، میرے اعمال کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اگر میری بخشش ہوگی تو صرف تیرے فضل سے ہوگی۔ اکثر حضرت والا ہر کلام کے اخیر میں یہ مضمون رکھتے ہیں اور منشاء یہ ہوتا ہے کہ اے اللہ! جو کچھ بھی ہوا یا آگے بخشش کی اُمیدیں قائم ہیں، وہ صرف تیرے فضل سے وابستہ ہیں، اپنے عمل پر کوئی نظر نہیں۔ یہ اُمید ہے کہ تیرے لطف کرم سے اختر ہو اہل جنت میں شامل۔

ایک نہایت مجرب اور آزمودہ عمل

از مرتب وشارح ''عرفان محبت''، حضرت مولانا مفتی محمد امجد صاحب فاضل دیوبند، استاذ حدیث دارالعلوم آزادول، جنوبی افریقہ

مختلف علاقوں میں دین کی نسبت سے سفر کرنے کے بعد اپنے مسلمان بھائیوں کی جو حالتیں اور پریشانیاں سامنے آئیں اُن کو دیکھتے ہوئے احقر کے دل میں یہ داعیہ پیدا ہوا کہ اپنی زندگی کا ایک انتہائی مفید اور مجرب عمل لکھ دیا جائے تا کہ لوگ غیر شرعی عملیات سے محفوظ رہیں اور قرآن وحدیث کے دائرے میں رہ کر اپنی ہر مشکل اور پریشانی کا حل تلاش کریں کیونکہ قرآن کریم کو اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے لیے شفا قرار دیا ہے۔ لوگوں کی طرف سے شدید تقاضے اور اصرار کی وجہ سے نفع عام کی خاطر اس کو اس کتاب کے ضمیمہ کے طور پر آخر میں شائع کیا جارہا ہے۔

نوٹ: جس طرح انسان کو بیماری کی وجہ سے پریشانی اور طبعی اُلجھن پیش آتی ہے اسی طرح قرآن و سنت سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ بسا اوقات سحر یعنی جادو اور شیطانی اثرات یا نظرِ بد کی وجہ سے بھی بچوں اور بڑوں کی طبیعت میں نہایت شدید قسم کا تغیر آجاتا ہے۔ اکثر لوگ اس کو بیماری سمجھ کر ڈاکٹروں سے علاج ومعالجہ میں مشغول رہتے ہیں مگر کوئی خاص معتد بہ نفع نہیں ہوتا کیونکہ اُس طبعی تغیر اور تبدیلی کی بنیادی وجہ بیماری نہیں ہوتی بلکہ دوسری وجوہِ ثلاثہ میں سے کوئی وجہ ہوتی ہے، مگر اس کی طرف عام طور پر ذہن نہیں جاتا۔ اس لیے سالہا سال تک پریشانی کا شکار رہ کر بالآخر ذہنی ٹینشن اور ڈپریشن میں ابتلاء کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور پھر پریشان ہو کر یہ دیکھا گیا کہ بہت سے غیر شرعی عملیات میں مبتلاء ہو جاتے ہیں اور بعض نامناسب جملے بھی زبان پر آجاتے ہیں۔

اس حالت کی بعض علامات

(۱) ذہنی کسی سوچ اور فکر میں بغیر کسی خاص وجہ کے ہر وقت مشغول رہنا، یہاں تک کہ دماغی طور پر حد درجہ تھکاوٹ اور گراوٹ پیدا ہو جائے۔

(۲) سینے پر ایک قسم کا بھاری پن اور خاص بھوک محسوس نہ ہونا بلکہ بظاہر پیٹ کے اندر گیس کی کیفیت رہنا۔

(۳) دل میں بلا کسی وجہ کے ہر وقت گھبراہٹ کا رہنا۔

(۴) کسی ناگوار واقعہ پیش آنے مثلاً کسی کی موت یا ہارٹ اٹیک وغیرہ کی خبر سن لینے سے طبیعت کا انتہائی بے چین ہو جانا اور ایسا لگنا کہ جیسے یہ چیزیں مجھ ہی کو پیش آنے والی ہیں۔ کسی بیمار کی عیادت یا جنازے میں شرکت یا کسی نومولود بچے کے گھر پر آمد ورفت وغیرہ سے طبیعت میں ایک طرح کی بے چینی اور پریشانی پیدا ہونے لگے۔

(۵) سوتے وقت میں دیر تک نیند نہ آنا اور اُس وقت خاص طور پر دل ودماغ پر کسی سوچ وفکر کا مسلط ہو جانا۔

(۶) سر میں عام طور پر درد اور بے چینی کی کیفیت رہنا۔

(۷) ڈراؤنے خواب نظر آنا، بالخصوص اوپر سے نیچے گرنا یا نجاستوں اور مردوں کا نظر آنا، یا کفن دفن کے معاملات خواب میں زیادہ دیکھنا۔

(۸) طبیعت میں ایسی اُداسی رہنا کہ کسی کام میں دل نہ لگتا ہو، جو بھی کام شروع میں شوق و ذوق سے شروع کیا جاتا ہو اُس کی طرف سے جلد ہی طبیعت میں نفرت پیدا ہو کر اُس کو چھوڑ دینا۔

(۹) اندھیرے میں رہنے یا لیٹنے یا سونے سے طبیعت میں وحشت اور گھبراہٹ پیدا ہونا۔

(۱۰) ہنسی خوشی کی مجلسوں اور محفلوں میں طبیعت میں انبساط اور سرور اور نشاط کا پایا جانا اور یکسوئی اور خلوت سے گھبراہٹ اور بے چینی کا محسوس کرنا۔

اگرچہ ان میں سے بعض علامات بیمار کے اندر بھی ہوتی ہیں مگر مجموعی طور پر یہ علامتیں ان تینوں چیزوں میں سے کسی ایک کے شکار کو بھی رہتی ہیں۔ اس لیے اپنے علاج معالجے سے بھی غفلت نہ برتی جائے اور صحیح ڈاکٹر کی تجویز اور تشخیص پر اعتماد کر کے اس کو جاری رکھا جائے۔

مگر اس کے ساتھ ساتھ اس عمل کو بھی کم سے کم چالیس دن تک پابندی کے ساتھ معمول بنالیا جائے جس میں الحمدللہ بیماری اور نظر بد اور سحر و جادو تمام چیزوں کا علاج موجود ہے۔ اور احقر بڑے وثوق اور اعتماد اور اپنے اوپر گذرے ہوئے سخت حالات میں کیے ہوئے تجربے کی بنیاد پر عرض کرتا ہے کہ ان قرآنی آیات کو جس قدر اعتماد اور بھروسے کے ساتھ پڑھا جائے گا، ان شاء اللہ اُتنا ہی نفع ہوگا۔

عمل یہ ہے:

۷ مرتبہ درود شریف ۷ مرتبہ سورہ فاتحہ ۷ مرتبہ آیت الکرسی

۷ مرتبہ فَلَمَّآ اَلْقَوْا قَالَ مُوْسٰی مَاجِئْتُمْ بِهِ السِّحْرُ ط اِنَّ اللّٰهَ سَيُبْطِلُهٗ ط اِنَّ اللّٰهَ لَا يُصْلِحُ عَمَلَ الْمُفْسِدِيْنَo وَيُحِقُّ اللّٰهُ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَo (سورۃ یونس، پارہ ۱۱)

۷ مرتبہ اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّ اَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَo فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِo وَمَنْ يَّدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ لَا بُرْهَانَ لَهٗ بِهٖ فَاِنَّمَا حِسَابُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ط اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَo وَقُلْ رَّبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰحِمِيْنَo (سورۃ المؤمنون، پارہ ۱۸)

۷ مرتبہ وَاِنْ يَّكَادُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَيُزْلِقُوْنَكَ بِاَبْصَارِهِمْ لَمَّا سَمِعُوا الذِّكْرَ وَيَقُوْلُوْنَ اِنَّهٗ لَمَجْنُوْنٌo وَمَا هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَo (سورہ القلم، پارہ: ۲۹)

۷ مرتبہ سورۃ الفلق ۷ مرتبہ سورۃ الناس ۷ مرتبہ درود شریف

طریقہ: صبح بعد نمازِ فجر اور شام بعد نمازِ مغرب اور اگر نیند نہ آنے کا معاملہ ہو تو پھر بجائے مغرب کے

رات کو سوتے وقت میں ان آیتوں کو مذکورہ ترتیب سے پڑھیں اور اپنے او پر دم کریں اور ایک گلاس پانی پر دم کر کے پی لیں اور اُس کے کچھ چھینٹیں اپنے چہرے پر ڈال لیں اور سوتے وقت میں ہاتھوں پر دم کر کے اپنی چار پائی یا بیڈ وغیرہ کا حصار کر لیں اور پھر سو جائیں۔ اور بچوں پر بھی دم کرنا ہو تو زیادہ پانی لے کر اُس میں سے خود پئیں اور اُن کو بھی پلا دیں۔

نوٹ: اور اگر اس دعا کا بھی اضافہ کر لیں تو بہتر ہوگا اور اس کو صبح و شام تین مرتبہ مذکورہ عمل کے ساتھ پڑھا کریں۔ حضرت کعب احبار رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے جو موطا مالک میں مذکور ہے کہ اگر یہ کلمات مجھے یاد نہ ہوتے جن کو میں پابندی سے پڑھتا ہوں تو یہودی مجھے گدھا بنا دیتے۔

أَعُوْذُ بِوَجْهِ اللهِ الْعَظِيْمِ الَّذِیْ لَيْسَ شَیْءٌ أَعظَمَ مِنْهُ وَ بِكَلِمَاتِ اللهِ التَّامَّاتِ الَّتِیْ لَايُجَاوِزُهُن بَرٌّ وَّلَا فَاجِرٌ وَ بِاَسْمَاءِ اللهِ الْحُسْنٰى كُلِّهَا مَا عَلِمْتُ مِنْهَا وَ مَالَمْ أَعْلَمْ مِنْ شَرِّ مَاخَلَقَ وَذَرَأَ وَبَرَأَ. (موطا امام مالک، معارف القرآن: جلد اول، صفحہ: ۲۷۶)

مسئلہ: کسی متبع سنت و شریعت عامل سے اپنی حالت بتانے کے بعد آیات قرآنیہ اور ادعیہ نبویہ کے ذریعے علاج کرانا ممنوع اور حرام نہیں ہے مگر چونکہ آج کل ایسے عاملوں کا تقریباً فقدان ہے اور وہ نہ پائے جانے کے برابر ہیں اس لیے یہ ایک مختصر سا عمل لکھ دیا گیا ہے۔